مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— پارہ 30 (مکمل) —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— پارہ 30 (مکمل) —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	اگست 2006ء
مطبع	....	وقار پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

4

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھراُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراج انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفرؔ]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست پارہ 30

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ 20

اظہارِ تشکر 27

باب: سورۃ النباء (آیات 1 تا 5)

انسانی شعور کے لیے وحی کی روشنی 31

داستانِ آدم کیا ہے اور داستانِ شیطان کیا؟ 32

انسانی زندگی میں مذہبی پیشوائیت کا کردار سب سے بڑی رکاوٹ 33

ہمارے ہاں شیطان کا مروّجہ تصور 34

قدم قدم پہ رکاوٹ پیدا کرنے والا جذبہ محرکہ 35

خدا کے مقابلے میں دوسری قوت کا تصور غلط ہے 35

خوابیدہ قوت کی نمود کے لیے ٹکراؤ ضروری ہے 36

انسان کی خود فریبی نے خدا کو بھی بت بنا رکھا ہے 37

عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں 39

یہ تمام تر فسادات من و تو کے تصور کے پیدا کردہ ہیں 40

چھوٹے اور بڑے کا باہمی ٹکراؤ 41

ربوبیتِ عالمینی کا دوسرا نام ہی دین ہے 42

حضور ﷺ کی سیرت کا پہلا دور 43

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیاں 43

شکست کی پہلی نشانی: پروگرام کے متعلق غیر یقینی کیفیت 44

پاکستان کے حسین مقاصد میں زہر ملا دیا گیا 45

ابدی حقائق کی اہمیت اور ہماری کوتاہ نظری 46

آنے والے کا تصور خلافِ قرآن ہے 47

قیامت ظہورِ نتائج کا زمانہ ہے 48

دوسرا باب: سورۃ النباء (آیات 6 تا 22)

سابقہ درس کا خلاصہ 50

لفظ نبا کی وضاحت 50

پیش گوئیوں کی حقیقت 52

ایمائیت کی اہمیت 53

ہمارے ہاں قیامت کا تصور اور اس کی آمد کی تواریخ 53

صدیوں پہلے قرآنی حقائق کا انکشاف 55

زمین کی ہیئت کے متعلق مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر کا فتویٰ 56

قرآن کا ہر دعویٰ سچ ثابت ہوگا 57

عورتوں کی پیدائش اور ان کے حقوق کے متعلق ہماری سوچ 57

زوج کا لفظ عورت اور مرد دونوں کے لیے آتا ہے 58

زوج کا مفہوم سمجھے بغیر معاشرہ غیر قرآنی رہے گا 54

رات کی اہمیت 59
سورج کا خزینہ اور عصر کا مفہوم 61
یوم الفصل کیا ہے؟ 62
مہلت کا وقفہ کیوں؟ صور پھونکنے کا مفہوم 63
فکرِ قرآنی کا ماحصل 65
تدبر فی القرآن کا اصل طریق 65
جہنم ہر وقت دیکھ رہی ہے 66

تیسرا باب: سورۃ النباء (آیات 23 تا اختتام)

جہنم کی نوعیت 69
وقت کے تعین کی حقیقت 70
دنیا بھر میں ہماری صورت گری 71
جہنم کے شعلوں کی نوعیت 72
وقت کے ساتھ ساتھ قرآنی حقائق کا انکشاف 73
ترقی پذیر اقوام پر ترقی یافتہ اقوام کا ''احسان'' 74
کیا یہ جہنم نہیں؟ 75
زعمِ باطل میں گرفتار انسان 76
جنت کا حصول اتنا سستا نہیں ہے 77
نجات کا مفہوم 77
تصوف کی ریاضتیں اور ان کا ماحصل 79
تکمیل انسانیت کے لیے ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا 80
انسانیت کی منزل ''رکاوٹوں کو دُور کرنا ہے'' 81
وَکَوَاعِبَ اَتۡرَابًا کا مفہوم 81
رزق کی مختلف خصوصیات 82
کائنات کی لامحدود وسعتوں کے اندر مہذب
قوموں کا وجود اور نظامِ ربوبیت 83
اِرض پر خدا اور ملائکہ کے نزول کی حقیقت 84
اہلِ مغرب کی جہنمی زندگی کی وجہ جواز 85
کائناتی قوتوں کا وحی کے ساتھ ربط 85
عمل پہلے، نتیجہ بعد میں 86

چوتھا باب: سورۃ النازعات (آیات 1 تا 5)

فرد کی انفرادیت سے لے کر ایک ایک قوم کی انفرادی سوچ کا ماحصل 89
نبی آخر الزمان ﷺ اور اس کی امت کا فریضۂ حیات
نوعِ انسانی کو ہر نوعِ غلامی سے نجات دلانا ہے 90
رزق کی محتاجی ہر قسم کی محکومیت کو جنم دیتی ہے 91
پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لیے پہلے قدم کی تفصیل 92
مملکت پاکستان کی پارلیمان میں کم از کم ایک لونڈی کا مطالبہ 93
اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد امت کا فریضہ 95
الفاظ کے انتخاب کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا
اسلوبِ بیان بھی ایک معجزہ ہے 96
محکومی اور غلامی کے لیے ''غرق'' کے لفظ کا استعمال 96
محکوم قوموں کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ 97
قدم بقدم منزل کی طرف رواں دواں مصروفِ کار رہنے کا مقصد 98
مردِ مومن کے لیے آزادی کا تصور 99
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ 100
قرآن حکیم کے نزدیک مقامِ مومن کے سامنے اعلون
ہی اس کی منزل ہے 101

صدرِ اوّل کا دورِ زرّیں 102
مالک یوم الدین کا مفہوم 102

پانچواں باب: سورۃ النازعات (آیات 6 تا 26)

محکوموں کے بغیر حاکم چہ معنی دارد؟ 106
دوسروں کو آزادی دلانے کا فریضہ 107
حق و باطل کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ کا نقشہ 107
تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر کی ترجمانی 108
اسلام بزورِ شمشیر پھیلا: مودودیؒ مرحوم کا ارشاد 110
داستانِ بنی اسرائیل بطورِ شہادت 111
وحی اور عقل میں فرق 113
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون 114
قرآنِ حکیم کا سیاسی نظام 115
مذہبی پیشوائیت کا ہتھیار 117
روٹی کی محتاجی 119
کسی غلط عمل کے نتیجہ کا دوسرا نام سزا ہے 120

چھٹا باب: سورۃ النازعات (آیات 27 تا 30)

سابقہ درس کا خلاصہ 122
کائنات کے کرّوں کی کیفیت 123
قرآن اور سائنس کے باہمی رشتے کی نوعیت 124
یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ 125
ہماری ناکامی کی وجہ 127
ڈاکٹر مورس بکائے کی قرآنِ حکیم پر سائنٹیفک تحقیق 129
موجودہ عربی زبان سے قرآن کو سمجھنے میں مشکلات 130
ڈاکٹر مورس بکائے کے نزدیک قرآنی حقائق کی اہمیت 130
آزادانہ علمی تحقیق کے بغیر قرآن فہمی ناممکن ہے 133
وضعی روایات اور بائبل کا تقابل 133
بغداد کی گلیوں میں خونِ مسلم کی شہادت 134
فکرِ قرآنی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور اس کا نتیجہ 135
مذہبی پیشوائیت کے فتوے قانون بن گئے 135

ساتواں باب: سورۃ النازعات (آیات 31 تا اختتام)

ہمارے ہاں ہر چیز تقلیدی ہے 138
قرآنِ حکیم میں الفاظ کا چناؤ 140
کوئی لفظ دوسرے لفظ کی جگہ نہیں لے سکتا 140
لفظ متاع میں قرآنِ حکیم کا پورا معاشی نظام مضمر ہے 142
قرآنِ حکیم کا معاشی انقلاب طبقاتی تفریق کے لیے پیغامِ موت ہے 144
محنت کے معاوضہ کی کیا صورت ہوگی 145
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے ٹکراؤ کا مقصد 146
قوموں کی جہنمی زندگی کی نشان دہی 147
الجحیم کہاں واقع ہے 148
ھویٰ کا قرآنی مفہوم 150
عربی زبان کی رفعتِ پرواز اور اس کی عظمت 151
قربِ قیامت کے پوسٹر 152

آٹھواں باب: سورۃ عبس (آیات 1 قصہ شانِ نزول)

قرآنِ حکیم کے سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ شانِ نزول کا عقیدہ 154
وحی واقعات کی رہینِ منت نہیں ہوتی 155
شانِ نزول کے واقعات ڈھائی سو سال کے بعد اکٹھے کیے گئے 156
تہمت تراشی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی واضح ہدایات 156
قرآنِ حکیم میں تہمت تراشی کے سلسلے میں کسی کا نام نہیں آیا 157

نشتر کی زد میں آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی	158
معاذ اللہ معاذ اللہ	160
ناموسِ پیغمبر ﷺ پر تہمت تراشیاں	161
شانِ نزول کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کا کردار	162
معیار کا ترازو	163
خدا کی طرف سے عطا کردہ سرٹیفکیٹ	163
نواں باب: سورۃ عبس (آیات 1 تا 16)	
آخر یہ سب کچھ کیوں کر ہوا؟	164
حقائق کی اصل نوعیت	166
سوچنے کا مقام	167
عربوں کے اندر نسلی تفاخر کی نوعیت	169
تصویر کا دوسرا رخ	169
حضور کی خدمت میں متکبرانہ انداز میں ایک نمائندے کی آمد	170
عبس وتولّٰی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت	170
مساواتِ انسانیہ کا ہی دوسرا نام دین کا فروغ ہے	171
بات تو واضح ہی تصریفِ آیات سے ہوتی ہے	173
ماتھے پہ تیوری کس نے چڑھائی؟	174
کیا اب بھی کسی شک کی گنجائش ہے	178
قرآنِ کریم کے متعلق گہری سازش	178
دسواں باب: سورۃ عبس (آیات 17 تا اختتام)	
قرآنِ حکیم کے متعلق شکوک وشبہات	181
رجم اور رضاعت کی آیات کی تلاش	182
آیات بکری کھا گئی	183
قرآن کی اپنی شہادت	184
قرآنِ حکیم کے متعلق شکوک وشبہات کی ایک دوسری وجہ	185
دوسو سال تک کی پھیلی ہوئی کڑیاں	186
اختلافات رفع کرنے کا واحد طریق	187
نسلی تفاخر کوئی چیز نہیں، کوئی شے نہیں	188
عالم گیر تصور کی بجائے قومیت کے تصور کا نتیجہ	191
سب سے بڑا ابلیسی نظام	191
ذرائع رزق کا پیدا کرنا	192
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کا بنیادی اصول متاع کے ایک لفظ میں مضمر ہے	194
قرآنی لفظ صآخۃ کا مفہوم	195
کالے دھن کا دوزخ	196
قرآنی لفظ فجرہ کا مفہوم	197
گیارھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 1 تا 7)	
قرآنی الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت	198
جہانِ نو کا دَور اور فہمِ قرآن	199
شق القمر کی حقیقت	199
اپنی طرف سے مجازی معنی لینے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے	201
چاند اور سورج کا اکٹھے ہونا	201
سورج کا رات کو عرش کے نیچے چھپ جانا	203
قرآن کے اسلوبِ بیان کے متعلق ایک اہم خبر	204
اما تو چیزے دیگری	204
قوت کا تیسرا درجہ، ملوکیت کے تمام نشان ماند پڑ گئے	206
تجرباتی طور پر زمانے کی سست رفتاری کے بعد بتدریج اگلا قدم	207
ناکام تجارب کے بعد انسانیت کا ہر قدم قرآنی نظام کی طرف اٹھتا ہے	208

قرآنِ حکیم کا دَورِ حکومت اب دُور نہیں رہا 208
اونٹ کیسے بے کار ہو جائیں گے؟ 209
افریقہ کی آبادی میں مملکت کا تصور 210
کشتیوں کی جگہ جہازوں سے سمندر بھر جائیں گے 210
مواصلاتی نظام 211
بیٹی کی پیدائش پر کیا ہوتا؟ 212

بارھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 8 تا 12)

قرآن کا اسلوبِ بیان 213
قرآنِ حکیم کی حجازی اور مصری قرأت کے محرکات 213
ہمارے ہاں صدیوں سے بغیر سمجھے اور بغیر سوچے
قرآن کی تلاوت کا عمل چلا آ رہا ہے 214
ایک روایت کا غلط مفہوم 215
عہدِ جہالت میں عورت کا مقام 216
قرآن نے عورت کو مرد کا ہم دوش بنا دیا 217
صدرِ اوّل کے اسلام کے بعد عورت کی حالت زار 218
عورت کے متعلق وضعی روایات 218
روایات کی روشنی میں عورت کا مقام 220
جنت میں اکثریت فقیروں کی اور دوزخ میں اکثریت عورتوں کی 221
فوجداری کیس میں عورت کی شہادت قبول نہیں 222
قرآن کے ماننے والوں کی حالتِ زار 222
فتووں کو قانون بنا دیا گیا 223
اس انقلاب میں مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ ایسا کیوں ہوا 223
تقاضوں کی رو سے اسلام کا نفاذ 224
حضرت عمرؓ کے زمانے میں قرآن کے ایک لاکھ نسخے موجود تھے 225
پچاس سال قبل انسانی ذہن کی پستی 225
ذرائع مواصلات کا دَور 228

تیرھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 13 تا 24)

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ 228
انقلابِ قرآنی کے دَور کا عکس 228
قرآن حکیم کے دور میں ظہور پذیر ہونے والے دو اہم معاشرتی پہلو 229
ہمسفر کے پاؤں میں زنجیریں پہنانے کا نتیجہ 229
عورت کے ہاتھوں آنے والا ایک انقلابِ عظیم 230
قرآنی نظام کے قیام کا ماحصل جنتی زندگی کا حصول ہے 230
علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات کے دوران قرآن فہمی
کے سلسلہ میں ایک گفتگو 231
وحی کے دیئے گئے کائناتی تصور کو اپنائے بغیر مشرق و مغرب
کی حالتِ زار 232
اقدارِ خداوندی اور فطرت کی قوتوں کو یک جا کرنے
کا نام ہی مملکتِ اسلامیہ ہے 323
قرآن حکیم کا اپنے دعاوی کی صداقت کے لیے منفرد انداز بیاں 233
قرآنِ حکیم میں شاعری جیسی لطافت اور فلسفے جیسے حقائق
یکجا نظر آتے ہیں 234
صاحب علم کے لیے ستاروں کی گزرگاہیں بطور شہادت ہیں 234
ستاروں کی دو مختلف اقسام 235
الفاظ کے انتخاب میں قرآنِ حکیم کا اعجاز 236
فکرِ قرآنی، انسان کو مایوس ہی نہیں ہونے دیتی 236
نبی اکرم ﷺ کے لیے رسول کے الفاظ کی حقیقت 238
قوانین کے علم میں بڑی قوت ہوتی ہے 239

نبی کو وحی کے ذریعے ہی قوانینِ فطرت کی قوت کا علم حاصل ہوتا تھا	239
اہل قرآن کی نظر میں مقامِ نبوت	240
رسالت کا فریضہ وحی کے مطابق ایک نظام قائم کرنا ہوتا تھا	240
قرآنی نظام کی دو خصوصیات: امن اور امانت	241
رسول ﷺ خدا کی طرف سے صرف ایک لفظ "سوچا کرو" کی تلقین	241
مقامِ نبوت اور آپ ﷺ کا فریضۂ حیات	242
تصوف کی حقیقت اور علم لدنی کا دعویٰ	243
تصوف سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے: اقبالؒ	
ہمارے ہاں کی خودساختہ روایات	245

چودھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 25 تا اختتام)

جس قسم کا راستہ، اس قسم کی منزل	248
اسلام کے خلاف پہلا غلط عقیدہ	248
عقیدۂ تقدیر کی کیفیت	249
قرآن کے مفہوم کو ہی بدل دیا گیا	250
قرآن میں بالکل تضاد نہیں ہے	251
مشیت خداوندی سے کیا مراد ہے	252
تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے	254
ہمارے ہاں کی مروجہ تفاسیر اور تراجم	255

پندرھواں باب: سورۃ الانفطار (آیات 1 تا 17)

کائنات کے متعلق دو مختلف تصورات	256
قرآن کے نظامِ عدل کی خصوصیت	257
الفاظ کے مجازی معنیٰ بلند حقائق بیان کرتے ہیں	257
دین کے معنی جزا اور نتائج کے بھی ہیں	259
کراماً کاتبین کا مفہوم	260
آج کے علم النفس یعنی سائیکالوجی کی تحقیق	261
سب کچھ انسانی ذات خود کرے گی	262
قرآن کا ایک ایک لفظ اپنے اندر الگ الگ مفہوم لیے ہوئے ہے	263
سب سے بڑا جرم اور سب سے احسن عمل	265
قومیت کا تصور ہی جنگ کی بنیاد ہے	266
بہاریوں کی زبوں حالی	266
سیکولر والوں سے بھی بدتر سلوک	267
ہمارے ہاں فاجر اور فجار کا عمل جاری ہے	267
آج کا دانش مند چیخ اُٹھا ہے	268
موجودہ وعظ کبھی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے	269
اس کے باوجود مسلمان قیامت کی جہنم کے منتظر ہیں	270
سوال یہ ہے کہ آخر یہ ہوگا کیا؟	271
جہنم کے بے نقاب پہلو	272

سولھواں باب: سورۃ الانفطار (آیات 18 تا اختتام)

دین کا مفہوم نظامِ زندگی ہے	275
اس نظام میں نہ کوئی محکوم ہوگا، نہ حاکم، نہ محتاج، نہ محروم	276
قرآنی معاشرہ میں صرف جوہرِ انسانی کا تقابل ہوگا	276
ملوکیت اور خلافت میں فرق	277
ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ	278
دورِ محکومی میں قرآنی اصطلاحات کا رنگ ہی بدل دیا گیا	278
آج انسان حقیقی آزادی کے لیے ترساں ہے	279
اس دَور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی	280

سترھواں باب: سورۃ المطففین (آیات 1 تا 4: تمہید)

یہ ایک غلط سوچ ہے کہ قرآن میں ربط نہیں	282
اس شکست کے اسباب کیا تھے؟	283
شکست کی وجہ تکریم آدمیت کا فقدان ہوتا ہے	284
خدا کسی کو ذلیل نہیں کرتا	285
للمطففین کا مفہوم	286
نظام سرمایہ داری کا دوسرا نام ہی نظام تطفیف ہے	287
عملِ تطفیف کی وضاحت	287
(امیدوار) Candidate کے ساتھ حسنِ سلوک	288
نظامِ مطففین میں انسان کا کچومر نکال دیا جاتا ہے	289
قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنا ہوگا	289
قرآنی نظام کی اصل جنگ مطففین اور مترفین کے ساتھ ہے	290

اٹھارواں باب: سورۃ المطففین (آیات 1 تا 13)

قرآنی نظام میں نظامِ سرمایہ داری کی رکاوٹ	292
مغربیت آج بھی وہیں کھڑی ہے	293
نزولی ترتیب کی ایک اہم بات	294
عالمگیر تحریکوں کی شکل میں نظام ربوبیت کا اشارہ	295
قومیں اُٹھ کھڑی ہوں گی	296
الناس کے امراضِ کہن کا علاج صرف اُمتہ الکتب میں ہے	297
رسول خدا ﷺ کی شخصیت الناس کے لیے ہے	298
جہاں کعبہ وحج کا ذکر ہے وہاں الناس سے خطاب ہے	299
مقامِ ابراہیمی کیا تھا؟	299
قرآن کے شروع میں بھی الناس اور تکمیل پر بھی الناس	300
فاسق اور فاجر کون؟	301
آخر تم کون سے فرقے کے مسلمان ہو؟	302
سپر پاور کی نشانی	304
مگر ہم اپنی خُو کیوں چھوڑیں، وضع کیوں بدلیں	304
عاصی کا ترجمہ	305
محنت نہ کرنے کی بنا پر انسانی صلاحیتیں ہی تباہ ہوتی ہیں	306

انیسواں باب: سورۃ المطففین (آیات 14 تا 25)

کیا غیر مسلموں کے اعتراضات حقیقت پر مبنی ہیں؟	310
جو پہلے ہی متقی ہے اس کے لیے ہدایت چہ معنی دارد؟	310
غور طلب پہلو	311
قرآن کو سمجھنے کا طریق صرف تصریفِ آیات ہے	312
انسان کو سزا نہیں ملتی، یہ تو اُس کا اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہے	314
کسی مقام پر رُک جانا ہی عذاب ہے	315
روایات کی روشنی میں آسمان کا تصور	316
ملتِ اسلامیہ کے بحرِ زخار کی ناگفتہ بحالت	317
آخر کار قرآنی نظام ہی غالب آئے گا	318
ابرار کا قرآنی مفہوم	319
لفظ مقرب کا مفہوم	319
لفظ نعیم کا مفہوم	321
چہرے پر قلبی کیفیات کا عکس	323
قرآن کی پیش کردہ شراب کی کیفیت	324

بیسواں باب: سورۃ المطففین (آیات 26 تا 33)

قرآنی شراب کی مزید وضاحت	326

شرابِ طہور یعنی توحید کا دین، قرآن کی تعلیم، خدا کا کلام 328
شراب میں کافوری کی امیزش نرمی 329
شراب میں زنجبیل کی آمیزش 329
خدا نے ہمیشہ اپنی بات انسان سے شروع کی ہے 330
قرآن کی شراب گرتوں کو تھام لیتی ہے 331
زندگی کا مختلف مقامات پر رکنا نہایت ضروری ہے 332
جنت میں پیشانی کا نور 333
طبعی زندگی کی شراب اور قرآنی شراب میں فرق 333
پست سے پھر پست تر کی طرف 334
پیالے کے مطابق شراب کا حصول 335
مقرب اور فاصلے میں فرق 336
حدودِ بشریت میں صفات خداوندی کو منعکس کرنا 336
خدا کے ساتھ تصوف والوں کا قرب 337
ایک روشن منزل سے غافل کر دینے والا جذبہ 338
تکاثر اور تنافس کا قرآنی مفہوم 338
دل کی چٹانوں سے نکلنے والا چشمہ 339
قرآنِ حکیم کی روشنی میں مجرم کا مفہوم 340
خرد کے عمل کا نتیجہ اور جنون کا ماحصل 341

اکیسواں باب: سورۃ الانشقاق (آیات 1 تا اختتام)

موجودہ دور کی تاریکی میں جہانِ نو کی امید کے آثار 334
بنی آدم کے سامنے صراطِ مستقیم تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں 344
قوانین فطرت اور انسانی زندگی کے لیے وحی خداوندی کا مقام 345
نظامِ فطرت کی محسوس مثال 347
نظریہ ارتقا کی مسافت ایک نہ ختم ہونے والا سفر 347
مذہب کے اندر قرأت کے دوران لا یسجدون کا غلط مفہوم 349
سجدہ نہ کرنے اور کرنے والی کیفیت 349
جنت بطورِ بخشش نہیں ملتی بلکہ انسانی اعمال کی اجرت ہوتی ہے 351

بائیسواں باب: سورۃ البروج (آیات 1 تا اختتام)

کائنات کی ہر شے قانون کے دائرے میں ہے 352
صحرانوردوں کے لیے ستاروں کی رہنمائی 353
لفظِ برج کی حقیقت 354
قرآن حکیم کا اعجاز 355
ہمارے ہاں کے مروجہ تراجم اور تفاسیر کا بیان 356
اصل حقائق 356
خدا کی دو صفات میں پورا نظامِ حیات ہے 358
غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے فطری نتیجہ کا نام عذاب ہے 359
نجات کا تصور اور فوز الکبیر کا مفہوم 360
الحاد کیا ہے؟ 361
بطش کا مفہوم 362
قرآنِ حکیم کے الفاظ کی وسعت 362
لفظ یبدی کا مفہوم 364
قرآن ایک نصاب کی کتاب ہے 364
سامانِ مغفرت کی کیفیت 365
لفظ عرش اور مجید کا مفہوم 365
کائنات کے تین گوشے 366
تیسرا گوشہ انسان کا ہے 367

لوحِ محفوظ کیا ہے؟ 369
لفظ طارق کا مفہوم 370
ستاروں کی طرح انسانی عمل کا مشہور ہو کر سامنے آ جانا 371
انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ایک دوسری مثال 371
انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالودود کی تشریح 373
قرآنِ حکیم کا ایک اور ضمنی گوشہ 374
اعمال نامہ تو گردن پر لٹک رہا ہے 374
دوسروں کی نگاہوں سے چھپنے کے لیے عمر بھر کی کوشش کا عذاب 375
ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ 377
مکافاتِ عمل انسان کی گھات میں ہوتا ہے 378
تیئسواں باب: **سورۃ الاعلی** (آیات 1 تا اختتام)
احترامِ آدمیت کا راز 381
اقتدارِ اعلیٰ کا مفہوم 381
خدا کے پروگرام کی چار اہم ترین کڑیاں 382
عربی زبان کی وسعت 382
اگلی چیز تخلیق ہے 383
ارتقائی منازل کا سلسلہ 384
ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے گئے 385
تقدیر کا غلط اور صحیح مفہوم 386
خارجی کائنات کے لیے ہدایت اس کے اندر رکھ دی گئی ہے 386
ہر شے کے لیے پیمانے مقرر ہیں 387
گھاس کی مثال 388
انسان کے لیے ہدایت کا ضابطہ 388
انسان کے لیے اختیار و ارادہ کی نعمت 389
انسان کے لیے ہدایت کا طریق کار 389
قرآنِ حکیم کے متعلق تاریخی روایات 390
قرآنِ حکیم کے لغوی معنی 390
قرآنِ حکیم کے مطابق خدا کی حیثیت 391
استثناء بالمشیت کا استعمال اور اس کا مفہوم 392
ختم نبوت کے معنی 393
قانونِ خداوندی کا مقصد 395
قرآن کی ایک اہم راہنمائی 395
میں چلا اپنے رب کی طرف کا مفہوم 396
جہنم کی آگ سے مراد کون سی آگ ہے؟ 397
زندگی کے لیے زندگی کی نعمت 398
تزکی کا مفہوم 398
انسانی ذات کی نشو و نما کا پیمانہ خدا کی صفات ہیں 399
ذکر اور صلوٰۃ کا مفہوم 399
مستقبل کی زندگی کے مقابلے میں مفاد عاجلہ 400
تمام آسمانی صحیفوں میں ایک ہی تعلیم تھی 400
آج قرآن کے علاوہ کوئی صحیفہ اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے 401
انقلاب کی خصوصیت 402
دوسری قوموں کی طرف سے بخشش میں ملنے والے سامان کی حالت 403
دوسرے گروہ کی حالت 404
بادلوں کی مثال 406
کروں کی، پہاڑوں کی اور زمین کی مثالیں 406
اجارہ داری کا نظام 407
کمیونزم کا نظام 407

انسان کو آخر کار اسی نظام کی طرف آنا پڑے گا	408
جنت آخری منزل نہیں ایک پڑاؤ ہے	408
چوبیسواں باب: سورة الفجر (آیات 1 تا اختتام)	
مذہبی پیشوائیت کا نظام' چار آیتوں میں	411
کعبہ کے متولیوں کا معاشرتی مقام	411
مقامِ کعبہ اور اس کا پیغام	412
تاریخی شہادتیں	415
ہر واقعہ کے پیچھے ایک علت ہوتی ہے	415
قومِ عاد کی مثال	416
اجڑی ہوئی بستیوں کی مثال	417
فساد اور خرابی اپنے زورِ دروں سے تیز تر ہو جاتی ہے	418
خدا کا قانونِ مکافات ہر آن گھات میں رہتا ہے	419
مذہب کی تراشیدہ ذہنیتوں کی ایک خوبصورت مثال	420
لفظ بلا کا مفہوم	421
اگلی بات	422
یہ انکساری گردنِ فراواں کی انکساری نہیں ہوتی بلکہ اہانت ہوتی ہے	423
تمہارے ذلیل ہونے کا سبب کیا ہے؟	423
ذلت کا مدار چار چیزوں پر ہے	424
گڑھا کھودنا کہ سب کچھ اس میں جمع ہو جائے	426
انسان اپنے بنائے ہوئے نظام کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے	426
چین کی کامیابی پر امریکی جرنلسٹ کا تجزیہ	427
خدا اور ملائکہ صف در صف انسانوں کی طرف آئیں گے	429
دین کیا ہے؟ فطرت کی قوتوں مستقل اقدار کے تابع ہونا	430
جہنم کیا ہے؟	430
نفس شماری کوئی زندگی نہیں ہوتی' عمر ہوتی ہے	431
پہلے عمل پھر نتیجہ	432
ایک اہم سوال کہ نفس مطمئنہ کیا ہے	432
آخری منزل	433
بدھ مت کا مسلک: تصوف کا چربہ	433
اطمینان کی تعریف	434
یہ بھیڑ کا طریق ہے	435
مومن کے اطمینان کی پہچان	435
اطمینانِ قلب کیسے حاصل ہوتا ہے؟	436
امن کے مقابلے میں خوف	437
ذکر کیا ہوتا ہے؟	437
راضیۃ اور مرضیہ	438
جنت میں اجتماعی طور پر جانا ہوگا	438
پچیسواں باب: سورة البلد (آیات 1 تا اختتام)	
سابقہ درس کا پس منظر	440
عربوں کا اندازِ گفتگو	441
قرآنِ حکیم میں سطح بین نگاہوں کو ربط نظر ہی نہیں آ سکتا	442
غلط نظام کا نتیجہ جلد ہی معلوم ہو جائے گا	443
اختیار و ارادہ کے ساتھ دو آنکھیں اور دو ہونٹ بھی دیئے ہیں	444
زندگی کا سفر کرنے کے لیے راہنمائی	444
عربی ایک زندہ زبان ہے	445
دونوں راستوں کا فرق	446
یہ راستہ گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے	446

انسان کوانسان کی غلامی سے آزاد کرانا ہے 448
غلامی کی مختلف شکلیں 448
قرآن کا پیغام: موت ہے ہر نوع غلامی کے لیے 449
نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد 450
مسکین کا مفہوم 451
قرآن کے اس نظام سے ایک جہانِ نو پیدا ہوگا 451
نظام کو قائم کرنے والے لوگ کون ہوں گے؟ 451
اس نظام سے انکار کرنے والوں کی حالتِ زار 452
نظامِ کائنات کی شہادت 454
چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے 454
باہمی کشش کے فرق سے سلسلہ کائنات پاش پاش ہو جائے 455
قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بنیادی غلطی 456
ضمیر ہوتا کیا ہے؟ 457
یہ نیکی نیکی نہیں ہے 458
وحی کا دوسرا نام ہم نے الہام رکھ لیا 459
نبوت کے بعد براہ راست کسی کو علم نہیں ملتا 459
انسانی ذات ایک بیج کی مانند ہے 459
ذات کے لیے تباہ کن نظریہ 460
شکل تو چقماق کی ہوگی لیکن حرارت نہیں رہتی 461
خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی 461
حسب نصب کی بنیادوں پر قائم ہونے والا معاشرہ 462
آخر کار قانون مکافات نے روڈ رولر پھیر کر رکھ دیا 462
عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی حضور ﷺ کی ایک بے نظیر مثال 463
ظلم کو ختم کیے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا 465

چھبیسواں باب: **سورۃ الیل** (آیات 1 تا 21)

کائنات کے اندر قدم قدم پر تنوع ہے 466
اس قدر تنوع کے ساتھ ساتھ وحدت بھی 467
قرآن نے انسانوں کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے 467
انسانوں کی ایک شق: متقی 468
متقی، جو کسی کو بلا مزد و معاوضہ دے 469
انسانوں کی دوسری شق: بخل 470
ذات کی نشوونما سوسائٹی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی 471
دولت تباہی سے نہیں بچا سکتی 472
صحیح راہنمائی دینا خدا کے ذمہ ہے 472
خدا کا قانون انسان کی مستقبل کی زندگی کے متعلق سوچتا ہے 473
مذہب کی دنیا میں متقی کا تصور 474
متقی اور تزکیہ کا قرآنی مفہوم 474
ان اصطلاحات کا مفہوم ہی بدل دیا گیا 475

سورۃ الضحیٰ (آیات 1 تا اختتام)

داعیٔ انقلاب کی زندگی 476
ابتدائی ہمت طلب مراحل اور خدا کی طرف سے ثابت قدمی کی تاکید 477
حضور کے دل کی آواز 478
حضرت ابراہیم ﷺ کی تمنائے بے تاب 478
نبوت سے پہلے کی زندگی 479
ہمارے ہاں کے غلط تراجم 479
صحیح راہنمائی کے لیے پہلی شرط تجسس ہے 479
کامیابی شدتِ آرزو کی رہینِ منت ہوتی ہے 480
نبی بھی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے 480

حضور کی سیرت قرآن سے مرتب ہوگی 481
یتیم خانے کھولنے کی بجائے نظام بدلنا ہوگا 481
قہراور تَنۡهَرۡ کے معنی 482
کشادکی راہ حاصل کرنے کا طریق 482

سورۃ الم نشرح (آیات 1 تا اختتام)

ہمارے ہاں کے غلط تراجم 484
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا 484
آپ ﷺ کی مکی زندگی مصائب والام کی زندگی تھی 486
جنت بھی آخری منزل نہیں 486
نبوت اور فراغت دو متضاد چیزیں ہیں 487

سورۃ التین (آیات 1 تا اختتام)

خدا قسمیں نہیں کھاتا بلکہ شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے 488
تاریخ انسانیت کی شہادت 489
تقویم کا مفہوم اور باطل عقائدِ مذہب 490
تصوف کی پستیں جنہیں بلندیں سمجھا جاتا ہے 491
انسان کی بلندیوں کی بھی انتہا نہیں اور پستیوں کی بھی پستی نہیں 491
انسان ہمیشہ نقصان میں رہا ہے 492
جنت بطورِ بخشش نہیں بلکہ بطورِ استحقاق ہے 493
سپریم اتھارٹی صرف خدا ہے 494

ستائیسواں باب: **سورۃ العلق** (آیات 1 تا اختتام)

یہ پہلی وحی نہیں ہوسکتی 495
باہمی طور پر کافرگری کے فتوے 496
نزولِ وحی کے سلسلہ میں روایت 496
تصوف کی دنیا کی غیر قرآنی سیڑھی 496
غیر اسلامی تصورات 497
قیامت در قیامت 497
وحی کے متعلق ورقہ بن نوفل کا بیان 498
نبوت کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ 498
اگر کوئی پادری ورقہ بن نوفل کی بات کو چال کہہ دے تو
پھر آپ کا کیا جواب ہوگا 499
ان روایات سے انکار کرنے والا کافر 500
لفظ قرآن کے معنی 500
حیوانی سطح پر انسانی زندگی کی جبلتیں 501
لفظ اکرم کے معنی ومفہوم 502
بیان کرنے کی قوت، سننے کی قوت اور لکھنے کی قوت 502
انسان کو نظامِ ربوبیت کی طرف آنا ہے 503
صلوٰۃ کا مفہوم 504
قانونِ مکافاتِ عمل ہر آن دیکھ رہا ہوتا ہے 504
انسانوں کی دنیا میں انسانوں کا انتظام 505
لفظ زبانیہ کا قرآنی مفہوم 506
غیروں کے ساتھ مفاہمت نہیں 506

سورۃ القدر (آیات 1 تا اختتام)

شب رات کے مہینے میں نزول قرآن کا تصور 508
قرآن نے انسان کو اقدار دیں 509
حیوان کے سامنے پیمانے نہیں ہوتے 509
عصمت کا تحفظ، قدر یا پیمانہ یا Value کہلاتی ہے 509
نزولِ قرآن کے لیے لیل کے لفظ کا استعمال کیوں 510
قدر کا تقاضا 510

کائنات میں سب سے زیادہ قیمتی انسانی ذات ہے 511
اقدار کے بغیر یہ ''تُو'' بدل نہیں سکتی 512
اقدار کے بغیر قوتوں کا حصول قتل گاہ کو جنم دیتا ہے 512
قرآن میں روحانیت کا لفظ تک نہیں 512
انسانی ذات توانائی کا ایک شاہے 513
مادی قوت اور وحی دونوں لازم و ملزوم ہیں اور انہیں ملانا زندگی کا منتہیٰ 513

سورۃ البینۃ (آیات 1 تا اختتام)

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد 515
اہل کتاب میں اور ہم میں فرق کیا ہے؟ 515
لاریب کتاب کو ماننے والے فرقوں میں نہیں بٹ سکتے 517
اہل کتاب کے خلاف جرمِ عظیم 517
کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے 517
فرقوں کا نصب العین مختلف ہوتا ہے 518
قرآنی تعلیم کا ماحصل 518
خدا کی ساری خدائی میں بدترین مخلوق 518
اس کے مقابلے میں بہترین مخلوق 519
سب سے بڑا نفسیاتی کمپلیکس 520

سورۃ الزلزال (آیات 1 تا اختتام)

ارض کا لفظ معاشی نظام کے لیے ہے 522
آج تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے 522
باطل نظام میں معاشرے کی کیفیت 522

سورۃ العدیٰت (آیات 1 تا اختتام)

سورۃ العدیٰت کی ابتدائی آیات کا مروجہ ترجمہ 524
اقدار کے تحت جتنی بڑی قربانی' اتنا ہی بڑا انسان کا درجہ 525
دولت مند کی حالت کا تجزیہ 527
سینوں کے اندر چھپا ہوا بھی ظاہر ہو جائے گا 528

اٹھائیسواں باب: سورۃ القارعۃ (آیات 1 تا اختتام)

القارعۃ کا مفہوم 529
جوا' حرام لیکن قرعے ڈالنا' لاٹریاں نکالنا اور استخارے کرنا' حلال 530
عقل و فکر سے فیصلے کرنے کی بجائے استخارے کرنا 530
عربوں کے ہاں تیروں سے فالیں نکالنے کا رواج تھا 530
فراش المبثوث کا مفہوم 532
قرآنِ حکیم کا ایک عظیم اصول 533
قرآنی جنت کا غلط تصور 534
جنت میں داخل ہونے کا صحیح تصور کیا ہے؟ 534
ایک غلط تصور کے مضمرات 535
قرآن حقائق پیش کرتا ہے 535
معاشرتی زندگی کا اہم اصول:
ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ اور خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ 536
انسان کو انسان تصور کیجیے' فرشتہ نہیں 536
جنتی زندگی کی کیفیت صرف ایک لفظ میں 537
تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے 537
اس طرح تمہیں اس سے کہیں زیادہ ملے گا جو تم چاہو گے 538
اس کے برعکس تصور کا دوسرا رخ 539
جہنم کی اصل حقیقت 539

سورۃ التکاثر (آیات 1 تا اختتام)

انسانی مصائب و آلام 540

تکاثر کا قرآنی مفہوم 540
الٰہی ایسی جاذبیت جو مقصدِ حیات سے غافل کردے 541
انسان کی تین جبلتیں ہوتی ہیں 542
تکاثر کے جذبے کا استعمال 542
گدھا اور گاجر کی ایک انمول مثال 543
جذبات سے ہٹ کر سوچو 544
قرآنی حقائق کو تسلیم کرنے کے تین درجے 544
یہ پوچھا جائے گا کہ یہ سب کچھ کہاں سے آیا تھا 545
قرآن کی بلاغت 546
سلب ونہب کا نتیجہ 547

سورة العصر (آیات 1 تا اختتام)

قرآن پوری انسانیت کی تاریخ ہے 548
ہر دور اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے 548
یقین عمل کی بنیاد بنتا تو ہے مگر کچھ اور بھی چاہتا ہے 549
لفظ ''تواصوا'' کا مفہوم 550
معاشرتی فرائض اور حقوق لازم وملزوم ہیں 550
انسانی تاریخ میں چند چمکتے ہوئے لمحات 551
الفاظ کے انتخاب میں قرآن کا اعجاز 551
بھیڑ اور قوم میں بنیادی فرق ہوتا ہے 552

سورة الهمزة (آیات 1 تا اختتام)

اس سے ایک ذہنیت جنم لیتی ہے 553
کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتے: ایک ذہنیت ہے 554
اس ذہنیت میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھا جاتا 55
یہ ذہنیت بزدلی کی بھی شکار ہوتی ہے
ہر وقت دوسروں سے نفرت اور حقارت کے جہنم میں جلنا 555
دولت کی بنا پر خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے 556
قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ بے مثل اور محکم ہوتا ہے 556
آخر کار اس کا انجام یہ ہوتا ہے 556
قلب اور فواد کا مفہوم اور فرق 557
طلوع اسلام کے لغوی معنی 557

انتیسواں باب: سورة الفیل، القریش، الماعون، الکوثر اور الکافرون

سورة الفيل (آیات 1 تا اختتام)

سورۃ الفیل کے متعلق ایک افسانہ 559
اس قسم کی تاریخ کے راوی عجمی تھے 560
اصل حقیقت 560
ان کی تمام خفیہ تدبیریں ناکام ہوجائیں گی 561
سب سے پہلی کتاب قرآنِ حکیم تھی جو لکھی گئی 562
غداری کا عمل اور اس کا نتیجہ 562
پرندوں کی پرواز نشاندہی کا باعث ہے 562
مکہ والوں کا سامانِ حفاظت 563
یہ ابابیل کیا تھے؟ 564
یہ عمل چڑیوں کا نہ تھا 564
حضور کے خلاف سازش 564

سورة القريش (آیات 1 تا اختتام)

حج کے وقت نوعِ انسانی کو دعوت عام 566
ہر نظام کا ایک محسوس قومی مرکز ہوتا ہے 567

کعبہ تو انسانیت کا مرکز تھا 567
مہانتوں کی عزت بدرجہ اتم اور آمدنی بے شمار 567
جتنا زیادہ مفاد اتنی ہی زیادہ دین کی مخالفت 568
یہ سب کچھ تم سے واپس لے لیا جائے گا 568
نسبت پیکنگ سے اور ماسکو سے مگر نظام سرمایہ داری کا: یہ ناممکن ہے 568
ایک سبق آموز مثال 569
یادرکھو! خدا کے قوانین بڑے ہی اٹل ہیں 569

سورۃ الماعون (آیات 1 تا اختتام)

قرآن کا خطاب براہِ راست ہم مسلمانوں سے ہے 571
دین کو جھٹلانے کی عملی شکل 572
قرآنِ حکیم کے لفظ ساھون کا مفہوم 573
یہ رزق کے چشموں پر بند لگا دیتے ہیں 574
نشوونما کی کسی چیز پر بند نہیں لگایا جاسکتا 575
حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ 576
خلافت وملوکیت میں فرق کیا ہے؟ 576
صلوٰۃ قرآنِ حکیم کے مکمل نظام کا نام ہے 577

سورۃ الکوثر (آیات 1 تا اختتام)

فرائض منصبی کی تکمیل کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے 578
اونٹ کو ذبح کرنے میں بھی مصلحت تھی 580
ایک عظیم مقصد کے تحت باوقار ہجرت 581
خدا کی رہنمائی اور تمہارا عمل دشمن کی جڑیں کاٹ دے گا 581
اس طرح خیر کثیر ملتا ہے 582

سورۃ الکافرون (آیات 1 تا اختتام)

یہ ہے اللہ اکبر کا وہ مفہوم کہ فتح آخر کار حق کی ہوتی ہے 593
نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد زندگی میں ہم آہنگی 584
دین کے معنی ہیں: اعمال کا نتیجہ 584
دین کا لفظ نہایت ہی جامع لفظ ہے 585
رب کی طرف جانے کے معنی 585

تیسواں باب: النصر، اللھب، الاخلاص

سورۃ النصر (آیات 1 تا اختتام)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو اور خدا تعالیٰ کا فرمان 589
ذہنوں میں پیدا ہونے والا باطل تصور 590
نصرت کا مفہوم 590
سماوی اقدار اور انسان کی محنت کا ماحصل 591
فتح کا لفظ اپنے اندر بلیغ مفہوم رکھتا ہے 591
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا 592
لفظ فوج کا مفہوم 592
زبانی تبلیغ کچھ کام نہیں دیتی 593
حج کی تو پکار ہی یہ تھی 594
اگلی منزل: فوج در فوج کی تعلیم و تربیت اور استحکام ہے 595
قوموں کی تباہی تو کامیابیوں کے بعد ہوتی ہے 595
حقیقی کامرانی کا راز اقدارِ خداوندی میں مضمر ہے 596

سورۃ اللھب (آیات 1 تا اختتام)

قرابت داری کوئی معنی نہیں رکھتی 598
مقامِ نبوت ہوتا ہی یہ ہے 598
مذہبی پیشوائیت کا کردار 599
کعبہ کے متولیوں کی بندر بانٹ 600

محنت نہ کرنے والا ہمیشہ بے حمیت اور بزدل ہوتا ہے 600
ایسے لوگوں کے ساتھ اولاد کا رویہ 601
انسان بیوی بچوں کی خاطر کیا کچھ کرتا ہے 602
علامہ اقبال کی نظر میں جہنم کا تصور 602

سورة الاخلاص (آیات 1 تا اختتام)

اسباب وعلل کی حقیقی بنیاد 604
اصل چیز خدا پر ایمان نہیں بلکہ خدا کا صحیح تصور ہے 604
مذہب کے ہاں خدا کا تصور 605
تخت پہ بیٹھا ہوا خدا' وسیلوں' شفارشوں اور نذر و نیاز
قبول کرنے والا خدا ہے 605
دین میں خدا کا تصور اور افراد سے لے کر اقوام
تک کی موت وحیات کے پیمانے 606
انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق ہے 607
صفاتِ خداوندی اور ذاتِ انسانی کا باہمی ربط اور حدود 607
''واحد'' اور ''احد'' میں بنیادی فرق ہے 608
خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے' Unique ہے 609
صفاتِ خداوندی کی حامل قوم بھی دنیا میں Unique ہوتی
ہے' احد ہوتی ہے 608
ذات کی دوسری بنیادی خصوصیت: صمدیت 609
ذاتِ انسانی تولید کی پیداوار نہیں ہوتی 609
انسانی ذات جسم کا حصہ نہیں بلکہ خدا کی توانائی کا ایک شمہ ہے 610
شرفِ انسانیت تخلیق کے اندر ہے 611
اقبالؒ کا اندازِ بیاں 611
عالمی نظامِ ربوبیت کا تصور تولید نہیں تخلیق ہے 612
صفاتِ خداوندی کی حامل قوم ہی قوموں کی امامت کے قابل ہوگی 612
آخر میں حفاظتی تدابیر کی تاکید 613

سورة الفلق (آیات 1 تا اختتام)

قرآنی لفظ اَعُوْذُ کا قرآنی مفہوم 614
لفظ فلق کا قرآنی مفہوم 615
لفظ خیر اور شر کی حقیقت 615
شر کا دوسرا پہلو محتاجی ہے 617
دولت کی فراوانی سے بھی انسان بدمستیوں کا شکار ہو جاتا ہے 617
جہالت میں منافقین کا کردار 617
حسد کا قرآنی مفہوم اور اس کی تباہ کاریوں کے اثرات 618

سورة الناس (آیات 1 تا اختتام)

نوع غلامی کے وہ تین شعبے جنہوں نے پوری انسانیت
کو اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے 620
نصاب تعلیم کے ذریعہ وسوسہ کے خطرناک جراثیم جنہوں نے
صدور الناس کو صدیوں سے اپنی گرفت کر رکھا ہے 621
رب العزت کی بارگاہ میں دل سے نکلنے والی دعا 623

پیش لفظ

قرآن پاک کا حقیقی منشا یہ ہے کہ وہ ذہنِ انسانی میں، اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالقِ کائنات سے ہے، اعلیٰ اور بہتر شعور پیدا کرے۔ دنیا میں یہی ایک بے مثال کتاب ہے، جس کے حروف اعراب تک شمار کر لیے گئے۔ اس سلسلے میں مختلف محققین نے انکشاف کیا ہے کہ قرآن کریم وہ پہلی نثر کی کتاب ہے، جو زبان عربی میں لکھی گئی۔ اس کی زبان زمانۂ نزولِ قرآن سے قبل ہی بہت منجھ چکی تھی۔ اس میں بے حد امکانی وسعتیں ہیں۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ ''مشہور معتزلی امام واصل بن عطاء حرف را (ر) ادا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک نئے فرقے کے امام کی حیثیت سے واصل کو عمر بھر تقریریں کرنا پڑیں، مباحثوں اور مناظروں میں سرگرم تکلم رہنا پڑا لیکن اس نے کہیں، کسی جگہ، کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس میں حرف را (ر) آتا ہو۔'' [قرآنی فیصلے، حصہ اول ص 267...... پرویز]

اسلوبِ قرآنِ کریم

قرآن کریم عربی زبان میں عربوں کے اسلوبِ کلام کے مطابق نازل ہوا تھا۔ اس کے تمام الفاظ عربی ہیں، باستثنا ان قلیل التعداد الفاظ کے جو غیر عربی یعنی دوسری زبانوں سے لیے تھے لیکن عربوں نے انہیں اپنا لیا تھا اور ان پر اپنے قواعد جاری کر دیئے تھے۔ قرآن پاک کے اسلوب بیان کے ضمن میں ابن قتیبہ کہتے ہیں: ''عرب کے لوگ کلام میں مجازی معنی بھی لیتے ہیں یعنی ان کے ہاں بات کہنے کے کئی طریقے اور کئی اسلوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، حذف، تکرار، خفاء، اظہار، تعریض، افصاح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے، خاص لفظ سے عام معنیٰ مراد لینا اور عام لفظ سے خاص، غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں، جو آپ کو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں...... قرآن کریم کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا۔''

[لغات القرآن جلد اوّل ص 26 پرویز]

فتوحاتِ اسلام کے بعد کے اثرات

جب اسلام کو فتح ہوئی تو مختلف ممالک کے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ عرب و عجم کا ملاپ ہوا، عربی الفاظ کے معانی میں فرق آ گیا، اس کی متعدد مثالیں علامہ محمد امین مصری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''فجر الاسلام'' میں بیان کی ہیں۔ اسلام کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔

اس طرح دولتِ ساسانیہ نے دینی اور ادبی ہر جہت سے مسلمانوں پر براہ راست اثر ڈالا تھا! ''زردشتی دین ایران کا سربرآوردہ مذہب تھا۔ اسلام میں بہت سے عقائد یہاں سے آئے۔ مثلاً جبر و اختیار کے بارے میں معتزلہ کے اقوال، روح اور نفس کے اقسام کے بارے میں صوفیوں کے ارشادات'' [فجر الاسلام، ص: 311-326]

ایران کا دوسرا مشہور مذہب مانویت تھا اس کے ماننے والے اسلام کے پردے میں چھپ چھپ کر اپنے ہی مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ اسی طرح صنعاء کا ایک یہودی تھا، جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں بظاہر مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے مختلف شہروں میں بہت سے عقیدے پھیلا دیئے تھے، جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے ضرر رساں تھے۔ عباسیوں کے زمانہ میں عجمی تصورات حیات ساری فضا میں پھیل گئے تھے اور ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ [فجر الاسلام، ص ص 343-378]

لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآن پاک کے الفاظ کے وہ معانی متعین کیے جائیں جو زمانہ نزول قرآن میں رائج تھے اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق قرآن کریم کا مفہوم از سرِ نو متعین کیا جائے۔ یہ کام علامہ پرویزؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب لغات القرآن (چار جلد) اور مفہوم القرآن (تین جلد) کے ذریعے پیش کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ دروس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

علامہ پرویزؒ کے دروسِ قرآن کے ادوار

علامہ پرویزؒ نے تعلیماتِ قرآن کو سمجھانے کے لیے اپنے نیپئر بیرکس کراچی والے مکان سے درس قرآن کریم کا آغاز 1950ء میں کیا۔ 1958ء میں لاہور شفٹ ہو گئے تو یہاں سے از سرِ نو ہفتہ روزہ درس قرآن کا پہلا دور 1960ء میں شروع کیا۔ یہ دور دسمبر 1967ء کو اختتام پذیر ہوا۔ پھر درسِ قرآن کا دوسرا دور، پہلے دور کی نسبت زیادہ مفصل انداز میں شروع کیا۔ یہ سلسلہ 15 اکتوبر 1984ء تک تیسویں پارے کی سورۃ مطففین کی آیت 26 تک ہی پہنچ سکا تھا کہ آپ بیمار ہو گئے اور آخر کار 24 فروری[1] 1985ء کو فکر قرآنی کا یہ روشن چراغ راہی ملک بقا ہوا۔ ان دروس کی تفصیل ''مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ النحل'' کے ''پیش لفظ'' اور ''تعارف'' میں دی جا چکی ہے۔

دروسِ قرآن کو صفحۂ قرطاس پر لانے میں حائل مشکلات

پرویز رحمۃ اللہ علیہ کے دروسِ قرآن کی پنچو ایشن کے جملہ مراحل طے کرنا، ایک دشوار گزار کام تھا۔ خطاب کے دوران مقرر اشاروں کنائیوں سے

---

[1] مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل کے صفحہ 17 پر پرویز صاحب کی تاریخ وفات غلطی سے 24 فروری کی بجائے 26 فروری 1985 لکھ دی گئی تھی قارئین کرام اس کی تصحیح فرمالیں۔

بھی کام لیتا ہے اور لب ولہجہ سے بھی' آواز کے اتار چڑھاؤ سے بھی اور چہرے کے تاثرات سے بھی۔ دوران خطاب اپنی شخصیت کا اثر سامعین کی شخصیت پر بھرپور انداز میں ڈالنے کے لیے اسے پوری پوری آزادی ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے اس کی آنکھیں بھی کام ود ہن ہوتی ہیں' مسکراہٹیں بھی اور پیشانی پر اُبھرنے والی شکنیں بھی' مسرت آگیں آواز بھی اور رندھا ہوا گلا بھی' آنکھوں کی چمک بھی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی' بلکہ یوں کہیے کہ مقرر کا پورا جسم' انہاک کے ساتھ' قارئین کے دل ودماغ پر اپنی بصیرت اور فہمِ قرآن کے اثرات ثبت کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کے وہ جملوں کی ساخت کا بھی پابند نہیں ہوتا۔ لہٰذا آواز کی یہ روانی وتسلسل' تحریر سے مختلف ہوتی ہے اور پھر اس آواز کو ریکارڈ کرنے کا طریقہ' آلاتِ ریکارڈ اور بجلی کا اتار چڑھاؤ' جہاں آواز کی جامعیت کو چار چاند لگا تا ہے' وہاں اسے کبھی کبھار محروح بھی کرتا ہے۔ پھر کیسٹ اور سی ڈیز کی تکنیکی مہارتیں' کہیں آواز کا زیروبم' کہیں بجلی کی آنکھ مچولی اور کہیں ایمائیت کا انداز' کہیں اختصار اور پھر دوران تقریر الفاظ کا انتخاب اور شخصیت کا اثر' ان تمام کو کیونکر ہمہ گیر الفاظ میں مقید کر کے قارئین تک' اسی جذب وانہاک سے' پہنچایا جائے تاکہ وہ تاثر بھی قائم رہے اور الفاظ بھی ذہن وفکر میں ثبت ہوتے چلے جائیں' اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاسکتا ہے اور پھر تحریر میں تقریر کی لطف اندوزی کو قائم ودائم رکھنا بذاتِ خود ایک مشکل ترین مسئلہ ہے۔

پرویز رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوبِ نگارش وخطابت

پرویز رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب نگارش وخطابت میں متعدد خصوصیات لائق ذکر ہیں۔ وہ عقل انسانی کے لیے وحیٔ خداوندی کو اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا آنکھ کے لیے سورج کی روشنی۔

(۱) ان کی تحریر وتقریر دل کش اور جادۂ مقصد کی توضیح میں مد ہوتی ہے۔ جہاں مجرد حقائق کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے ان کا طرزِ نگارش وخطابت تشبیہات واستعارات پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک مجرد حقائق تشبیہات واستعارات کے پیرائے میں ہی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ قرآن کی روشنی میں انہوں نے ''زندگی'' کو ''کھیتی'' اور ''اعمال انسانی'' کے ماحصل کو کھیتی کے ''ثمرات'' سے تشبیہ دی ہے۔ آپ جب مقامِ انسانیت کی طرف آتے ہیں تو جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہوتا ہے' اس سے عالمِ انفس پر دلیل لاتے ہیں۔

(۲) اپنی تحریر وتقریر کو زُود اثر بنانے کے لیے اشعار کا استعمال جس انداز ے سے کرتے ہیں وہ نظر وفکر کی ایک خاص دل موہ لینے والی چیز ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے وہ شعر خاص اسی موقع ومحل کے لیے موزوں کیا تھا۔ ان کی تقریر وتحریر میں یہ اشعار نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور بیان فرمودہ مواد کے بہترین ترجمان۔

(۳) پرویز رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ ایک اعلیٰ وارفع پیغامِ حیات کے لیے ایک بلند پایہ زبان کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر قسم کی امکانی صلاحیتوں کی امین ہو۔ لہٰذا وہ اپنے پیغام کی نشر واشاعت میں قوم کے نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ کے لیے بلند پایہ ادیبانہ اندازِ بیان وتقریر

اختیار کرتے ہیں۔ جو آسان فہم ہونے کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی بھی رکھتا ہے۔ ان کے سامنے مغربی مفکرین برگسان، جوڈ، لیس لی پال کانٹ، ایرک فرام وغیرھم کی بلند پایہ تصانیف موجود ہیں اور انہوں نے ان مفکرین و مادیین کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی مایہ ناز کتاب ''انسان نے کیا سوچا''؟ زندگی کے اہم حقائق کے متعلق، اڑھائی ہزار سالہ انسانی فکر کی کاوشیں، اس کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔

(۴) سائنسی زبان میں، فلسفیانہ اور سائنسی موضوعات کو، ادیبانہ اندازِ تحریر وتقریر میں، آسان فہم بنانا آسان کام نہیں۔ ان موضوعات کی اصطلاحات اور دقیق وثقیل الفاظ کی خاردار جھاڑیوں سے بڑے بڑے محقق و عالم بھی اپنا دامن نہ بچا سکے لیکن جس اسلوب سے پرویز رحمۃ اللہ علیہ نے اس زبان کا استعمال کیا وہ انہی کا نشانِ امتیاز ہے۔ اس میں اثر آفرینی آہنگ (Rythm) کے انداز سے پیدا کی گئی ہے جس کے لیے انہوں نے ''معلّمانہ طریقہ'' اختیار کیا ہے۔ ان کی تحریر وتقریر میں سادگی اور پختگی کے علاوہ علمیت کی شان ہے۔ اپنے عالمانہ خیالات وافکار کو ایسے الفاظ میں ادا کرتے ہیں جن میں درسی اور ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ خشک مضامین کو بھی اپنے طرزِ تقریر اور ادائیگی سے دل چسپ بنادیتے ہیں۔

(۵) قرآنی آیات کا رواں، برمحل استعمال، ان کی تحریر وتقریر کا ایک نمایاں وصف ہے۔ جملے میں استعمال کی ہوئی قرآن کی آیات ان کے جملے کا جزو لاینفک ہوتی ہیں۔ ان سے کماحقہ مستفیض ہونے کے لیے، اگر قاری تھوڑا بہت عربی زبان سے واقف ہے تو وہ ان کے لسان عربی پر عبور رکھنے کی صلاحیتوں کا گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور عربی مبین (جس میں قرآن پاک کا نزول ہوا) سیکھنے کی آرزو اس کے قلب ونگارہ میں مچلنے لگتی ہے۔

(۶) ان کی تحریر وتقریر میں اثر آفرینی صوتی اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ صوتی اثرات دو طرح سے پیدا کیے جاتے ہیں:

(الف) خیال وتصور کو الفاظ کے موزوں ارتباط سے۔ اس سے وہ چیز ایک حسین وجمیل متوازن منظر کی صورت میں جاذبِ قلب و نگاہ بن جاتی ہے اور (ب) الفاظ کو الفاظ کے موزوں ملاپ سے۔ خیال وتصور میں گہرائی اور جذبات عقلی میں شدت (Intensity) پیدا ہوجاتی ہے۔ اس شدتِ جذبات (جو فہم بصیرت قرآنی لیے ہوتا ہے) میں تنفس کے ساتھ فقرات کا زیر وبم اثر آفرینی پیدا کیے چلا جاتا ہے۔ ایسے مقامات پر ان کی نثر وخطاب، کام کی چیز سے بڑھ کر، نفس انسانی کی نشو ونما کے لیے مزے کی غذا بن جاتا ہے۔

(۷) مغربی اور خال خال مشرقی مفکرین و مادیّین (Materialists) کا ترجمہ وتلخیص ان کا خاص میدان ہے۔ اپنے پیش کردہ پیغامِ قرآن کی وضاحت وتائید میں پرویز رحمۃ اللہ علیہ کو جو کچھ بھی ملتا ہے، اسے اپنے قرآنی سرمائے میں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔

(۸) پرویز رحمۃ اللہ علیہ اپنی تحریر وتقریر میں مزاح بھی پیدا کرتے ہیں جو بڑا مدھم، شیریں اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ وضعی روایات ان کا ہدف وموضوع بھی ہے۔ ان کے نزدیک ایسی روایات واحادیث جو قرآنِ کریم کے خلاف ہیں یا جن سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی شان میں طعن پایا جاتا ہے، وضعی فلہٰذا غلط ہیں۔ انہیں اور ان کے ''کار پردازان'' کو وہ موضوع بناتے ہیں اور قرآن کریم کی تعلیمات کی

روشنی میں صحیح بات کہہ جاتے ہیں۔ دورانِ تقریر تو ان کی آواز تک رندھ جاتی ہے' گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ: بارالہا! یہ ہمارے ساتھ کیا ہوا!!!

پرویز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان ولسان سے پیغام قرآن تو اس سلسبیل کی مانند ایک ایسی ندی ہے' جو قلب ونگاہ کے دروازوں کے آگے سے گزرتی اور پکارتی' راستہ کاٹتی' پوچھتی چلی جاتی ہے۔ او بھائیو! جنہیں آبِ حیات کی ضرورت ہے' وہ لے لیں''۔ جو ذہن وفکر کے دروازوں کے پاس سے گزرتی ہوئی' آوازیں دیتی ہے: ''لے لو' جس کو جتنی ضرورت ہے''۔ بصارت وبصیرت کے ہموار راستوں پر چلنے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ علم وآگہی کے دلاوروں کے لیے بھی' جو دانش قرآن کی راہنمائی میں ارتقاء اور بلندیوں کی طرف لے جانے والے رخ پر' شاداں وفرحاں' جادہ پیما ہونے کے متمنی ہیں۔

المختصر' پرویز رحمۃ اللہ علیہ ہر مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر قرآن کریم کی روشنی میں غور وخوض کرتے ہیں۔ پھر نہایت ٹھنڈے دل ودماغ سے اسے فاضلانہ رنگ میں ہدیۂ قارئین کرتے ہیں' ہالینڈ کے ایک غیر مسلم محقق بالجن (J.M.S. Baljon) نے سچ کہا تھا کہ:

''پرویز رحمۃ اللہ علیہ کی خوبی یہی نہیں کہ اس نے قرآنی حقائق کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے یا انہیں اس قدر بلند پایہ ادیبانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درحقیقت ایک عمدہ معلم ہیں جسے فطرت نے اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان نوجوانوں کے لیے جو مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی زندگی کی کشتی کو لنگر کی ضرورت ہے' وہ ان کے لیے ایک مشفق دوست ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ وہ جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں' اس کے متعلق نہایت محکم اور آزادرائے رکھتے ہیں اور نہایت معقول نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ عصر حاضر کے تقاضوں پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں لہٰذا اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا' اس کا اثر بڑھتا چلا جائے گا۔''

ان اوصاف کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کے آخری دو پاروں میں آپ کو تین قسم کے انقلابات کا ذکر ملے گا۔ ایک ہے ''خارجی کائنات میں رونما ہونے والا انقلاب'' دوسرا ہے ''دنیائے انسانیت میں عالمگیر انقلاب'' اور تیسرا انقلاب وہ ہے جو مرنے کے بعد آئے گا۔ ان انقلابات کی کچھ تفصیل پرویز رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے الفاظ میں یوں ہے:

قرآن ایک پیغام آفریں کتاب ہے

قرآنِ حکیم نے آخری پاروں میں جو انقلابات پیش کیے ہیں وہ قریباً تین قسموں کے ہیں: ایک انقلاب تو وہ ہے جو خارجی کائنات میں واقع ہوگا۔ اس میں کُرے آپس میں ٹکرائیں گے' سورج کی روشنی مدھم ہوجائے گی' چاند تاریک ہوجائے گا' ستارے جھڑ جائیں گے۔ یہ کچھ خارجی کائنات میں تبدیلیاں آئیں گی یا کوئی انقلاب آئے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسا ہوگا' مغرب کے جو

Scientists (سائنسدان) ہیں وہ اس تحقیق میں لگے ہیں اور آہستہ آہستہ اس طرف آ رہے ہیں کہ نظامِ کائنات ایک دن درہم برہم ہوجانے کو ہے۔ وہ تو ابھی سے کہہ رہے ہیں کہ سورج کی حرارت میں فرق آ رہا ہے۔

یہ کُرے ایک دوسرے کی کشش کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معلق ہیں

ان کا اندازہ یہ ہے کہ اگر حرارت میں کچھ زیادہ فرق آیا تو اس کی جو کششِ ثقل ہے جس سے یہ کُرے اپنی اپنی جگہ معلق ہیں پاش پاش ہوجائیں گے۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ اگر کسی ایک کُرے کی کشش میں کسی ایک بال کے کروڑویں حصے کا بھی فرق آ گیا تو یہ ٹکرا کے پاش پاش ہوجائیں گے۔ اس انقلاب کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے' اور پھر خوامخواہ ہم کیوں سر کھپاتے پھریں، ہم تو اس وقت ہوں گے بھی نہیں اور ہوں گے بھی تو ایک ٹکڑا آیا اور ہم ختم ہوئے۔ بس ٹھیک ہے قصہ ختم۔

قرآن دوسرا انقلاب کچھ عالمگیر قسم کا انقلاب بتا رہا ہے۔ یہ اس انسانی دنیا کے اندر' اقوام کے اندر' ایک قسم کا انقلاب ہے اور بڑا عالمگیر انقلاب ہے۔ وہ ایسا انقلاب ہے جس کے متعلق یہ مترشح ہوتا ہے کہ آخر میں انسانیت' جس نظام پہ آئے گی' وہ وہی نظام ہوگا' جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ یہ دوسرا انقلاب عالمگیر انسانیت کے لیے ہے اور تیسرا انقلاب وہ ہے جو مرنے کے بعد آئے گا' جسے ہمارے ہاں آپ قیامت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان آخری دو پاروں کے اندر' جو کچھ آئے گا' وہ ان میں سے ہی کسی نہ کسی انقلاب کی طرف اشارہ کرے گا۔ فکرِ قرآنی کو سمجھنے کے لیے قرآنی الفاظ کے مجازی معنی کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے پرویزؒ لکھتے ہیں:

''الفاظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں جو ہم روزمرہ کی زبان میں لیتے ہیں اور ایک انہی الفاظ کے مجازی معنی ہوتے ہیں...... مثلاً ارے! اس کا کیا پوچھتے ہو' وہ تو شیر ہے۔ تو وہ یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ سچ مچ کا Animal (حیوان) ہے جو شیر ہے' وہ حیوان ہے۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ وہ بڑا بہادر ہے۔ یہاں شیر کے معنی مجازی ہیں۔ قرآنِ کریم کے استعارات اور تشبیہات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی لیے جائیں یا مجازی معنی لیے جائیں۔ لغوی معنی کے لیے بھی لغت موجود ہے...... قرآن کی جو زبان ہم تک جس شکل میں منتقل ہوئی ہے' عربوں کے ہاں ان الفاظ کے جو مجازی معنی لیے جاتے تھے' وہ بھی ہمارے ہاں مل جاتے ہیں۔ میں نے جو لغت مرتب کیا اس میں مجھے بڑا لمبا عرصہ لگا تھا۔ میں نے اس میں ان کے لغتوں کی تائید سے قرآن کے ان الفاظ کے لغوی معنی بھی دیئے ہیں اور مجازی معنی بھی دیئے ہیں جو عرب اس کے لیتے تھے یا جو آج ہم لے سکتے ہیں۔ جو مجازی معنی ہیں وہ کسی خاص دَور تک محدود نہیں ہوتے' جوں جوں دنیا میں اور انکشافات ہوتے جائیں گے' انقلاب آتے جائیں' مجازی معنی کی فہرست اور زیادہ لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ جو مجازی معنی لیے جاتے ہیں انہیں تو اپنے دَور کی علمی سطح پر سمجھانے سے مراد ہوتی ہے' تو وہاں ان میں مجازی معنی لیے جائیں گے اور چونکہ یہ ایسے الفاظ آئیں گے جس میں' میں نے عرض کیا ہے کہ حقائق Concentrated form میں' مرتکز شکل میں'

دیئے گئے ہیں، بیشتر معنی مجازی لیے جائیں گے لیکن میں کبھی کسی کو ذہنی طور پر مجبور نہیں کرتا کہ جو مجازی معنی میں پیش کروں وہ انہی کو قبول کریں لہٰذا جی چاہے ان کو قبول کریں، نہ چاہے نہ کریں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے آپ قرآن کا کوئی بھی ترجمہ اٹھالیں، اس میں ان کے معنی لغوی طور پہ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں سے بات تو سمجھ میں نہیں آتی لیکن بہرحال جو احباب یہ دیکھنا چاہیں کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کیا ہیں تو وہ میرے ہی لغت کے اندر دیکھ لیں وہاں لغوی معنی بھی دیئے ہوئے ہیں یا کوئی ترجمہ قرآنِ کریم کا اٹھا کے دیکھ لیں، اس میں معنی اس اعتبار سے دیئے ہوئے ہیں۔ تو اس لیے جو میں عرض کرونگا وہ بیشتر مجازی معنی کے اعتبار سے ہی مفہوم پیشِ خدمت کرونگا۔

عزیزانِ من یہ یاد رہے کہ واقعات ہنگامی ہوتے ہیں اور اصول ابدی۔ اس لیے کہا کہ ''قرآن قیام تک تمام اقوامِ عالم کے انسانوں کے لیے ایک ضابطہ موعظت اور نصیحت ہے۔ وہ آج بھی یہ بتا رہا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے اصول کیا ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اصول ابدی ہوتے ہیں، مگر واقعات ہنگامی ہوتے ہیں۔ تاریخ میں مورخین ہمیشہ واقعات بیان کرتے ہیں، ان کے اسباب و علل بیان نہیں کرتے۔ وہ یہ تو بتائیں گے کہ فلاں قوم کو شکست ہوگئی، وہ بتائیں گے کہ اتنی فوج تھی، اتنا اسلحہ تھا، اتنی کمزوری تھی، ان کے ہاں یہ Strategic Weakness (حکمتِ عملی کی خامی) تھی وغیرہ وغیرہ قرآن یہ بتائے گا کہ ان کے نظام میں کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے وہ قوم تباہ ہوئی ہے اور یہ ہے وہ چیز جس کا تعلق قیامت تک آنے والے انسانوں سے ہے کہ ہر قوم یہ دیکھ لے کہ ہمارا نظام اس قسم کا تو نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اس کا تعلق ہمارے ساتھ بھی ہے اور آنے والی قوموں کے ساتھ بھی ہے۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قرآنی نظام کے قیام کے لیے ملتِ اسلامیہ کب اپنا سامانِ سفر باندھتی ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے آسمان کی آنکھ صدیوں سے منتظر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق
حیدرآباد، سندھ، پاکستان
جون 2006ء

اظہارِ تشکر

خالقِ کائنات نے عالمگیر سطح پر نوعِ انسانی کو زندگی کی تاریک راہوں کے تباہ کن نتائج سے روشناس کرانے کی خاطر قرآنِ حکیم جیسا بے مثل ضابطہءحیات عطا کرتے ہوئے اُس کی اہمیت اور قدر و منزلت کو اپنے ہاں اس طرح واضح کیا کہ

''انسان جو کچھ بھی اکٹھا کرتا ہے اُس کے مقابلے میں یہ خزینہءحیات اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور لازوال ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اِس آبِ حیات کے بلا مزد و معاوضہ مل جانے پر خوشیاں منائے کیونکہ خدائے حکیم نے اس نسخہءکیمیا میں حضرتِ انسان کی تمام اجتماعی اور انفرادی نفسیاتی بیماریوں کے علاج کی نشاندہی بڑے ہی واضح اور دوٹوک انداز میں کر رکھی ہے''۔

عزیزانِ من! اس سلسلہ میں اگر قرآنِ حکیم کے پیش کردہ صرف معاشی نظام کے خدوخال کو ہی دیکھ لیا جائے تو اس کے لیے اُس نے اپنے ہاں لفظ متاع، ربوٰ، قل العفو، الارض للہ اور زکوٰۃ جبکہ اس کے معنی مملکتِ اسلامیہ کی طرف سے ایسا انتظام کرنا کہ جس کے تابع بتدریج (نوعِ انسانی کی حد تک) ہر شعبہءزندگی کے سلسلہ میں سامانِ نشوونما پہنچانے کے ہیں۔ لہٰذا اس جیسے کئی ایک الفاظ اور بھی ہیں جنہیں قرآن کے معاشی نظام کا ستون کہا جائے گا اور پھر قرآنِ حکیم نے ان الفاظ کو بڑی وضاحت و بلاغت کے تابع ایک صدف کے اندر سچے موتیوں کی مانند اپنی آغوش میں محفوظ کر رکھا ہے۔ اور یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ علم و عرفاں کے لحاظ سے قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کی مثال بلند ترین پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر پیدا ہونے والے اُن رنگا رنگ سرخ و سفید پھولوں کی مانند ہے کہ جو اپنی اپنی ذات میں آخری حد تک تابندگی و تر و تازگی کی لازوال اور بے مثل مہک اپنے اندر سموئے ہوئے ہوں تا کہ وہ اس سے تقلید پرستی و توہم پرستی کے اندھیروں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر روشن ستاروں کی طرح اُسے جلا بخشے اور اس طرح آدمِ خاکی کے ذہن کو اپنے ساتھ مانوس کرتے ہوئے جہانِ نو کی اُن سدا بہار وادیوں تک لے جائے جہاں کسی انسان کو نہ تو کسی قسم کا خوف ہوتا ہے اور نہ حزن، نہ اُسے موسم کی گرمی ستاتی ہے اور نہ سردی۔ عزیزانِ من! یہ وعدہ اُس خالقِ کائنات کا ہے جو ربِ کریم بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، علیم و خبیر بھی ہے اور رب العٰلمین بھی۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ انسان کا یہ جمِ غفیر ثواب الدنیا اور ثواب الآخرۃ کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے عقل کے تجرباتی طریق ہی کو جاری رکھتا ہے یا زندگی بھر کی مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے وحی کی رہنمائی قبول کرتا ہے؟۔ یاد رہے کہ ذاتِ خداوندی ذاتِ انسانی کے اِس اختیار و ارادہ کو کبھی سلب نہیں کرے گی۔

برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کی یہی وہ عظمت اور یہی وہ رفعتِ پرواز ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویزؒ صاحب زندگی بھر ملتِ اسلامیہ کے اس اجڑے ہوئے گلستان کے گھٹاٹوپ اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کی فکر لئے قندیلِ آسمانی کی روشنی کو عام کرنے کے پیشِ نظر ہر آن اور ہر لحہ مصروفِ کار رہے۔ اور پھر اس پروگرام کی آبیاری کے لیے تقریباً 40 کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ دروسِ قرآن کے ذریعے قرآن فہمی کو عام کرنے کا یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رکھا۔ تا آنکہ رموزِ قرآنی کو دوٹوک الفاظ میں زبان زدِ عام کر دیا جائے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ دروسِ قرآن کے اِس طویل سلسلہ کو اگر آپ کی فکرِ قرآنی کا ماحصل کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا......لہٰذا

ان دروسِ قرآن کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ضروری خیال کیا گیا کہ مذکورہ سات سو سے زائد قرآنی دروس پر پھیلی ہوئی اس قرآنی تفسیر کو اگر صفحہءقرطاس پر منتقل کرنے کے بعد کتابی شکل دیدی جائے تو یہ قرآن کے طالبعلموں کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس خیال کے مدِ نظر

اس عظیم پروجیکٹ کا آغاز کر دیا گیا اور اس طرح 334 صفحات پر پھیلی ہوئی 15 دروس پر مبنی سورۃ النحل کی تفسیر اکتوبر 2003ء میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ اور اُس کے یکے بعد دیگرے سورۃ بنی اسرائیل صفحات 396 اپریل 2004ء میں، سورۃ الکھف اور سورۃ مریم صفحات 511 مئی 2004ء میں، سورۃ طٰہٰ صفحات 416 جولائی 2005 میں، سورۃ الحج صفحات 380 جولائی 2005ء میں اور سورۃ انبیاء صفحات 336 ستمبر 2005ء میں ھدیہء قارئین ہوئیں۔

ترتیب کے لحاظ سے سورۃ الحج کے بعد سورۃ المؤمنون اور اُس کے بعد سورۃ النور کی اشاعت ہونی چاہیے تھی۔ لیکن مختلف حلقوں کی طرف سے علامہ پرویزؒ مرحوم کے پیش کردہ 29 ویں اور 30 ویں پارہ کی سورتوں کے مفاہیم کو جو اُنہوں نے مفہوم القرآن میں پیش کیے ہیں اُنہیں سخت طعن وتنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ بالغ نظر قارئین اور قرآنِ حکیم کے طالب علموں کی خواہش پر یہ ضروری خیال کیا گیا کہ سورۃ المؤمنون اور سورۃ النور سے قبل مذکورہ دو پاروں کی وہ تفسیر جو آپؒ نے دروس کی شکل میں بالوضاحت پیش کی اُنہیں پہلے صاحبِ علم حضرات کی نذر کر دیا جائے۔ تاکہ محترم پرویزؒ صاحب نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق ان حقائق کو جس انداز سے واضح کیا وہ بحسن خوبی قارئین کے سامنے آ سکیں۔

آج ہمارا سر ایک بار پھر بارگاہِ خداوندی کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز ہے کہ جس کے فضل و کرم سے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ محترم پرویزؒ صاحب کے دروسِ قرآن کے اس عظیم تفسیری پروجیکٹ کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کی ایک اور جلد جو 29 ویں پارے سے متعلق ہے قرآنِ حکیم کے طالبعلموں کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

راقم اس سلسلہ میں محترم پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی شخصیت کا دل کی گہرائیوں سے مشکور وممنون ہے کہ جن کی شب وروز اعصاب شکن علمی اور ادبی سعی وکاوش اس تفسیر کو تکمیل تک پہنچانے میں مدومعاون بنی رہی۔ لہٰذا ہم اُن کی ذات کو کسی شکل میں بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

مزید برآں محمد علی فاروق صاحب جیسی پرخلوص اور بے لوث شخصیت کی علمی اور تحقیقی خدمات کے تذکرہ کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ جنہوں نے ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کے نام پر شائع ہونے والی ہر جلد کے مسودے کو اشاعت سے پہلے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہوئے اپنی عالمانہ رہنمائی سے نوازا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ موصوف، محترم پرویزؒ صاحب کی وفات کے بعد سے ہی طلوع اسلام کے متعلقین کی توجہ پرویز صاحب کے دروس کو کتابی شکل میں لانے کے لیے مبذول کرتے رہے لیکن افسوس کہ اس عظیم منصوبہ کی پذیرائی کے لیے کوئی اقدام نہ کیا گیا۔

میں اِس مبارک موقعہ پر چوہدری پرویز بشیر صاحب کی قابلِ صد احترام شخصیت کا بھی شکر گذار ہوں کہ جن کی مخلصانہ رفاقت اور بھرپور مالی معاونت نے اشاعت کے مراحل کو ہمارے لیے آسان کر دیا۔

جیسا کہ قارئین جانتے ہیں کہ سی ڈی سے دروس کی کمپوزنگ ایک مشکل مرحلہ ہے۔ میں اس سلسلہ میں محترم محمد ہارون ریاض صاحب اور رضا اللہ ساجد صاحب کا دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں جبکہ یہ حضرات شکریہ کے بھی متمنی نہیں۔

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
جون 2006ء

پہلا باب: سورۃ النباء (آیات 1 تا 5)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1984ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز تیسویں پارے کے شروع کی سورۃ النباء سے ہو رہا ہے:(78:1)

انسانی شعور کے لیے وحی کی روشنی

آپ کو یاد ہوگا کہ انتیسویں پارے کے شروع سے ہی میں یہ دہراتا چلا جارہا ہوں کہ کشمکشِ حق و باطل اُس زمانے سے چلی آرہی تھی، جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی اور اسے وحی کی روشنی کی احتیاج ہوئی۔ قرآنِ کریم نے انبیائے کرام کی جو داستانیں بیان کی ہیں ان کا یہ سلسلہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور آپ دیکھیے کہ پورے قرآن میں انبیائے سابقہ یا اقوامِ گزشتہ کی کشمکش ہی کی داستانیں ہیں۔ شروع میں ان کا دائرہ محدود ہوتا تھا، انسانوں کی بستیاں بھی محدود ہوتی تھیں: ایک ایک قریہ میں رسول، ایک ایک بستی میں رسول، اسی نسبت سے ان کی اس کشمکش کی بھی وسعت ہوتی تھی۔ آبادیاں بڑھتی گئیں، ان رسولوں کے دائرہ کار بھی وسیع ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ نبی اکرم ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک آپہنچے کہ جو کَآفَّةً لِّلنَّاسِ [1] (34:28) رسول تھے۔ تو گویا اب اس کشمکش کی بھی اور اس انقلاب کی بھی وسعت عالمگیر ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ زندگی اسی کشمکش کی داستان ہے جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی۔ قرآنِ کریم نے بھی اسی طرح سے جستہ جستہ اس کا بیان کیا۔

عزیزانِ من! آخری پاروں میں آکر تو یوں نظر آتا ہے کہ اس کشمکش کی داستاں بھی اب آخری مرحلے میں داخل ہوگئی ہے کیونکہ قرآن نے اسے یوم الفصل کہا ہے، جو Decisive Moment (فیصلہ کن لمحہ) ہوتا ہے: فیصلے کا دن ہے، الگ الگ ہو جانے کا دن ہے۔ تو یہ جو آخری پارے اور بالخصوص یہ جو تیسواں پارہ ہے اِس میں تو اس داستان کے آخری مرحلے کی سرگزشت، نہایت ارتکاز کے ساتھ، Consentrated (ارتکاز شدہ) طریقے پر بیان کی گئی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں، ہر سورۃ میں چھوٹی چھوٹی آیات ہیں،

---

[1] تمام نوعِ انسان کی طرف

بعض آیات تو دو دو الفاظ پر مشتمل ہیں لیکن ان دو دو الفاظ کے اندر پوچھو نہیں کہ کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں۔ آج ہم وہاں سے آغاز کر رہے ہیں جس کے لیے میں نے عرض کیا ہے کہ اس کی ابتدا اس دن سے ہوگئی تھی جس دن سے انسان نے وحی خداوندی کی روشنی میں کچھ قدم اٹھایا تھا اور اس کے مقابل میں وہ قوتیں آ گئی تھیں، جن کے ساتھ یہ تصادم، یہ تزاحم ہونا تھا۔

داستانِ آدم کیا ہے اور داستانِ شیطان کیا؟

آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآنِ کریم میں آدم کی داستان ہے۔ اب اتنے سالوں کے قرآنی دروس کے بعد آپ کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ داستان کسی ایک فرد کی یا کسی میاں بیوی کی داستان نہیں ہے۔ وہ خود آدمی کی داستان ہے، انسان کی داستان ہے، میری آپ کی داستان ہے۔ قرآن نے اسے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور اس میں نمایاں بات یہ ہے کہ آدم اور شیطان یا ابلیس دونوں بیک وقت اسٹیج پہ سامنے آتے ہیں، اِدھر سے آدم کی نمود ہوتی ہے یا وہ دَور آ رہا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى** (2:38) تمہاری طرف ہمارے خدا کی طرف سے وحی آتی رہے گی۔ تم اس کی روشنی میں چلتے رہو گے تو **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** ❶ (2:38)۔ اور اُدھر سامنے سے پھر وہ ابلیس یا شیطان ہے۔ وہ کھڑا ہے اور اس کے بعد، جسے یہ ہبوطِ آدم کہتے ہیں، جب انسان کی ارضی زندگی شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی شیطان یا ابلیس نے یہ چیز کہہ دی کہ مجھے اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک کہ یہ آدم صفحۂ ارض پر زندہ رہے گا اور اسے کہا گیا کہ ہاں، تمہیں اس کی مہلت دی جاتی ہے۔ گویا آدم کی نمود کا جو اولیں دن تھا وہاں سے ابلیس کی نمود ہوتی ہے اور آخری دن، آخری انسان تک، وہ اس کرّہ ارض پہ رہے گا۔ اسے اس وقت تک مہلت دی گئی ہے۔ گویا یہ کشمکش ایسی ہے جو پہلے دن سے شروع ہوئی ہے اور آخری انسان تک جاری رہے گی۔

میں ابھی یہ عرض کرونگا کہ جسے ہم کشمکشِ حق و باطل کہتے ہیں، یہ ہے کیا؟ ہم بھی الفاظ دہراتے چلے جاتے ہیں، کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ یہ بات ہے کیا؟ اور جو بات ہے وہ ٹھوس ہونی چاہیے، عملی ہونی چاہیے، محسوسات میں ہونی چاہیے، Abstract نہیں ہونی چاہیے، نظری نہیں ہونی چاہیے، Academic نہیں ہونی چاہیے تاکہ پتہ چلے کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا؟ تصادم کیا تھا؟ ٹکراؤ کیا تھا، یہ کیوں ٹکراؤ تھا، یہ کیوں ہوا کہ اِدھر سے آدم اسٹیج پہ آتا ہے، اس کے ساتھ ہی شیطان یا ابلیس اسٹیج پر آ جاتا ہے؟ وہ اعتراض جو لوگ، خاص طور پہ اہرمن کی طرف سے کیا کرتے ہیں، پھر عیسائیوں کیطرف سے بھی یہ آیا کہ یہ Evil ہے، شر ہے، تو خدا نے ساتھ ہی شر کو بھی Create (پیدا) کر دیا تو خدا خالقِ شر بھی ہے۔ پھر اس پر بحثیں چلیں۔ بات سمجھنے کی ہے کہ آدم اور ابلیس اکٹھے ہی اسٹیج پر کیوں کھڑے ہیں؟ کیوں قیامت تک کے لیے اس کو مہلت دی گئی؟

---

❶ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہو گے۔

عزیزانِ من! میں قیامت تک کے الفاظ محاورے کے اعتبار سے بول رہا ہوں کہ ابلیس یا شیطان کو جب تک ارض پر آخری انسان ہے' اس وقت تک کیوں اس کو بھی مہلت دی گئی ہے۔ آخر یہ کیا بات ہے؟ اس چیز کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ہے وہ چیزیں جو کھڑے ہو کر سوچنے کی ہیں۔ قرآن کا پیغام' دین کی لم' اس بات سے سمجھ میں آئے گی۔ یہ بات ہے کیا' عجیب چیز ہے! شیطان یا انگریزی میں جس کو Satan کہتے ہیں' یہ بنیادی طور پر عبرانی (Hebrew) زبان کا لفظ ہے' عربی والوں نے تو اسے اپنے ہاں ''شطن'' کے مادے سے لیا یعنی بھڑکیلا' آتش بھڑکانے والا' مشتعل' اشتعال دلانے والا۔ یہ اسے اس لفظ ''شطن'' سے اپنے ہاں لائے۔ لیکن اوریجنل عبرانی (Hebrew) میں یہ جو Satan (سیٹن) ہے یہ بڑا ہی بنیادی نقطہ ہے۔ عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کے صحیح معنی ہیں۔ میں عرض کرونگا کہ قرآن نے بھی یہی کہا ہے۔ اس انگریزی زبان کے لفظ کے معنی ہیں: The Hindrer یعنی راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والا' روک بن کر کھڑا ہو جانے والا۔ اس سے ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ روک بن کر کھڑے ہو جانے والا ہے' انہوں نے انگریزی میں اس کا ترجمہ The Hindrer کیا۔

انسانی زندگی میں مذہبی پیشوائیت کا کردار' سب سے بڑی رکاوٹ

قرآنِ کریم نے ان الفاظ کا جو مفہوم لیا ہے' وہ آپ بار بار دیکھیں گے کہ یہ آیا ہے: **يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (7:45) اللہ کی طرف جانے والے راستے میں روک بن جاتے ہیں۔ سب سے بڑی روک کون ہیں؟ یہ احبار اور رہبان' مذہبی پیشوائیت' علما اور مشائخ (9:35) ہیں۔ سورۃ التوبہ (9:35) میں اور دیگر مقامات میں بھی آیا ہے۔ کہیں سرمایہ پرستوں کے متعلق کہا گیا ہے' کہیں ان کے متعلق کہا گیا ہے جو بغیر الحق قوت کے زور پر' دھاندلی سے' تلوار کے بل بوتے پر' اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ سارے قرآن میں دیکھیے گا کہ جہاں جہاں **يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (7:45) آیا ہے کہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہونے والے ہیں' یہ مذہبی پیشوا ہیں۔ اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے ان میں نمایاں حیثیت مذہبی پیشواؤں کی ہے' سب سے بڑی رکاوٹ ہی یہ ہیں۔ یہ ملوکیت' یہ سرمایہ داری' یہ تو ان کے سہارے زندہ رہتی ہے ورنہ کوئی انسان بھی دوسرے انسان کا محتاج اور محکوم بن کر جینا ہی نہیں چاہتا۔ انسان کے اندر کی ایک آواز ہے جو اس کے خلاف سرکشی کے لیے ابھرتی ہے۔ وہ یہ لوگ ہیں جو اس آواز کے خلاف ان کو مطمئن کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے' تم دل کے اندر بھی اس کے خلاف ذرا سی کبیدگی بھی محسوس نہ کرنا' یہ اللہ کے خلاف چیلنج ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم میں آپ یہ کچھ دیکھیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ **يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ** [1] (7:146) بھی اس نے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ **وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (9:34) وہ بھی راہِ خدا میں روک ہوتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے متعلق بھی کہا

---

[1] وہ نوعِ انسانی کے لیے تعمیری کام کیے بغیر' دنیا میں بڑائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہے۔اسی سورۃ التوبہ کی یہی 34ویں آیت میں کہا ہے کہ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ❶ (9:34) لیکن بنیادی طور پر قرآن نے احبار ور ہبان کو کہا ہے کہ یہ ہیں روک بن کر کھڑے ہو جانے والے۔اور دین اور مذہب کی ساری تاریخ یہی کشمکش ہے۔

کاروانِ انسانیت کو خدا کی طرف جانے والے راستے پہ چلانے کے لیے دین آیا۔ مذہب کے یہ علمبردار اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم تمہیں خدا کی طرف لے جائیں گے' یعنی جرأت سے' بے باکانہ صداقت کے ساتھ' دھڑلے کے ساتھ' یہ بات کہنے کی نہیں ہے۔ یہ نہیں کہیں گے کہ ہم تمہیں خدا کی طرف جانے والے راستے میں روکیں گے' منافقت سے یہ کہیں گے کہ ہم تمہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں لے جائیں گے اور قرآن کہتا ہے کہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں یہی سب سے بڑی روک ہیں اور یہ The Hindrer شیطان کا عبرانی زبان والا ترجمہ ہے' اس سے بات صاف ہو گئی۔قرآن نے کس طرح اس کا مفہوم بیان کر دیا۔یہی ساری بات ہے' پہلے یہ جو شیطان کا تصور ہے اس کی ایک بات ذہن میں آ گئی۔ وہ عرض کر دوں۔

ہمارے ہاں شیطان کا مروّجہ تصور

عزیزانِ من! پہلے یہ سوچ لیجیے کہ یہ جو ہمارا مروّجہ اسلام چلا آ رہا ہے' یہ عجمی اسلام ہے' یہ ایرانی تصورات ہیں۔اس تصور میں اہرمن ویزداں دو برابر کی قوتیں ہیں' گویا ایک خدا ہے اور ایک شیطان ہے۔سو ہمارے ہاں بھی جو شیطان کا تصور آتا ہے وہ ایک ہی شیطان ہوتا ہے لیکن کبھی کھڑے ہو کر ہم یہ سوچتے نہیں کہ ہم کرتے کیا ہیں۔اس ایک شیطان میں جو خصوصیت یا جو صفت بتائی جا رہی ہے اس نے اس کو (معاذ اللہ) خدا بنا دیا ہے۔تصور یہ ہے کہ ایک شیطان دنیا میں ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے' ہر جگہ ہوتا ہے۔آپ نے دیکھا کہ شیطان کی یہ خصوصیت یہ قوت ہے کہ یہ دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ہر جگہ ہے اور یہ خصوصیت اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی کہی ہے: هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوگا۔گویا جو خدا کی صفت تھی وہ ہم نے شیطان کی صفت بنا دی اور کبھی نہ سوچا کہ قرآن تو شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ❷ (6:112) کہتا ہے یعنی یہ ایک نہیں ہے' یہ شیاطین ہیں' محسوس شکل میں سامنے آنے والے (الانس) بھی اور نگاہوں سے پوشیدہ (الجن) بھی۔اور سب سے بڑا شیطان جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہ تو خود اس کے اندر ہوتا ہے۔اس اعتبار سے کہہ لیجیے کہ یہ ہر فرد کے لیے ہے جہاں کہیں بھی وہ ہے' اسے اس کا شیطان کہیے لیکن وہ ایک شیطان نہیں ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ یہ شیطان سیدھے صاف راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ذہن کی نگاہ اس شیطان کو ڈھونڈ رہی ہے' جو رکاوٹ بنتا ہے۔

---

❶ وہ سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے عام نہیں کرتے۔

❷ بڑے بڑے سرغنے' خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد ہوں یا باہر بدویت کی زندگی بسر کرنے والے' غیر مہذب ہوں' سب راستہ روکنے والے ہیں۔

ہزار حیف نہ بنی قیامتِ موجود

قدم قدم پہ رکاوٹ پیدا کرنے والا جذبہ محرکہ

ایک منٹ کے بعد آپ کے ذہن میں آجائے گا کہ ہمارا تو سارا معاشرہ ہی شیطانی ہے۔ کیا آپ کا کوئی کام آج کل قاعدے قانون کے مطابق ہو رہا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ کوئی معاملہ جو آپ کا کسی دوسرے کے ساتھ پڑ جائے' اس میں پھر رکاوٹ ہی رکاوٹ ہے۔ یہاں تو خود شیطان کے جنود ہوتے ہیں۔ آپ حق کو تو چھوڑ دیجیے یہ بہت بڑی چیز ہے۔ آج آپ کا کوئی کام کسی قاعدے قانون کے مطابق بغیر کسی قسم کی Hinderances (رکاوٹوں) کے ہو رہا ہے' رکاوٹ رکاوٹ رکاوٹ قدم قدم پہ رکاوٹ ہے۔ دیکھا یہ شیطان کے ایک مفہوم نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ❶ (6:112)۔ راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے' کوئی کام طریقے اور سلیقے سے نہ ہونے دینے والے۔ ابھی عرض کرونگا کہ یہ جو دین اور مذہب کی کشمکش تھی' جو حضراتِ انبیائے کرام کی اور ان شیطانوں کی کشمکش تھی' وہ کیا تھی؟ عزیزانِ من! یہ آخری پارہ آ گیا ہے۔ معلوم نہیں میری زندگی کی کیا صورت ہو' ان سورتوں کے یہ درس بھی شاید آپ کے سامنے آخری بار ہی آئیں' تو جو چیزیں بھی ایسی آتی ہیں جن کو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی قرآنی تشریح ضروری ہے' وہ ساتھ کے ساتھ ہوتی چلی جانی چاہیے' خدا جانے اس کے بعد کیا صورت ہو۔

خدا کے مقابلے میں دوسری قوت کا تصور غلط ہے

عزیزانِ من! یہ کیوں تھا کہ آدم کے ساتھ ہی شیطان بھی آیا؟ عجمی یعنی ایرانی تصور نے یہ بات تو کہہ دی کہ دنیا کے اندر تاریکی اور روشنی' یزداں اور اہرمن' دو مستقل بالذات قوتیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی کہ یہ ثنویت یا Dualism شرک ہے۔ کہا کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ خدا اور اس کے بالمقابل اسی جیسی ایک دوسری قوت ہو' وہ خیر کی قوت ہو' وہ شر کی قوت ہو' وہ اہرمن ہو' یہ یزداں ہو' یہ یزداں ہو' وہ اہرمن ہو' اور اہرمن اور یزداں دونوں کی جنگ چلی آ رہی ہو۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قرآنِ حکیم نے اس کی تردید کی۔ اس تردید کی بڑی ضرورت تھی۔ یہاں پھر آپ کا ذہن طلسمِ پیچ و تاب ہو گیا کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ اس کی بڑی ضرورت تھی۔ ابھی بات سمجھ میں آ جائے گی۔

---

❶ بڑے بڑے سرغنے' خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد ہوں یا باہر' بدویت کی زندگی بسر کرنے والے' غیر مہذب ہوں' سب راستہ روکنے والے ہیں۔

خوابیدہ قوت کی نمود کے لیے ٹکراؤ ضروری ہے

انسان کے اندر اس کی بہت سی قوتیں، بہت سی صلاحیتیں، مضمر ہیں، جسے کہتے ہیں کہ Potential Form کے اندر ہیں، چھپی ہوئی ہوتی ہیں، ان کا اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔ ان کی نمود ٹکراؤ سے ہوتی ہے۔ چقماق ❶ کے اندر سویا ہوا شعلہ، پتھر کے ساتھ رگڑتے ہیں تو پھر اس کی نمود ہوتی ہے، بربط کی تاروں کے اندر خوابیدہ نغمہ ہے جو مضراب کی ضرب سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے تو ابھرتا ہے۔ ہر خوابیدہ قوت کے لیے ایک ٹکراؤ کی ضرورت ہے کہ وہ محسوس و محدود شکل کے اندر سامنے آئے۔ انسان کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ میرے اندر کتنی کتنی بڑی قوتیں اور صلاحیتیں مضمر ہیں، Potential Form (غیر مشہود صورت) کے اندر ہیں۔ انہی کا عملی زندگی کے اندر محسوس شکل (Concrete Form) میں نمود ہو جانا مقصود و مطلوب ہے۔ اس کے لیے وہ لفظ تو خودی ہے آپ اسے انسانیت ہی کہہ لیں۔ انہی خوابیدہ صلاحیتوں کے نمود پانے سے انسانیت کی آہستہ آہستہ تکمیل ہوتی ہے۔ کہیں یہ باہر سے نہیں آتی ہیں، اس کے اندر ہی ہوتی ہیں، اس کی رگوں میں پنہاں ہوتی ہیں، لیکن ان کی نمود ٹکراؤ سے ہوتی ہے۔ ٹکراؤ بڑا ضروری ہے۔ اس ٹکراؤ سے ایک اور چیز بھی پیدا ہوتی ہے، یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو آزماتا رہتا ہے، یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے جی، اللہ آزماتا رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ آزمانا ہوتا کیا ہے؟ ایک شخص کو آپ کے ساتھ دوستی کا بڑا گمان ہے۔ آپ بھی سمجھتے ہیں دوست ہے۔ کسی وقت پڑنے پر پھر آپ اس دوست کو آزماتے ہیں کہ اس کی دوستی سچ مچ اخلاص پہ مبنی ہے، دیانت پہ مبنی ہے یا یوں ہی بنا ہوا تھا۔ اس کو آزماتے ہیں یعنی وہ چیز، جو آپ کو معلوم نہیں ہوتی، آپ اس طریقے سے معلوم کرتے ہیں کہ وہ کیسے Behave (برتاؤ) کرتا ہے۔ آپ کو جس دوست کا معلوم نہ ہو تو آپ یہ کچھ کرتے ہیں۔ اگر آپ کو پتہ ہو کہ وہ ہر موقع پر، ہر واقعہ پر، آپ کا ساتھ دیتا چلا آ رہا تھا تو آپ اسے نہیں آزماتے، آزماتے صرف اسے ہیں جس کے متعلق آپ کو معلوم کرنا ہو کہ یہ کیا Behave (برتاؤ) کرے گا۔ خدا کے متعلق یہ کہ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ کس طرح Behave (برتاؤ) کرے گا، بجا نہیں ہے۔ وہ تو غیب السمٰوٰت والارض کا عالم ہے۔ خدا انسان کو نہیں آزماتا بلکہ مختلف مواقع بہم پہنچتے ہیں تاکہ انسان اپنے آپ کو آزمائے کہ میرے اندر کتنی قوت ہے۔ یہ اس کی اپنی آزمائش کے مواقع ہوتے ہیں اور یہ بڑی ضروری بات ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کے اندر کتنی قوت ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ آپ فریب میں ہی مبتلا رہیں، ذہن میں ہو کہ میرے سامنے بڑی قوت ہے، وقت پہ معلوم ہو کہ نہیں صاحب! وہ تو فریب تھا، ایسی تھی نہیں، یا ایسی صورت میں ہو کہ میرے اندر تو یہ قوت نہیں ہے اور اسی طرح سے آپ Inferiority Complex (احساسِ کمتری) کے اندر مبتلا رہتے ہیں، احساسِ کمتری آپ کے اندر پیدا ہو، حالانکہ وہ قوت آپ کے اندر موجود ہے، اس کی نمود نہیں ہوئی۔ ان مواقع پہ جہاں ٹکراؤ ہوتا ہے، جہاں تزاحم ہوتا ہے، یہ جو ہر نمود پا جاتے

---

❶ ایک قسم کا پتھر جس سے آگ نکلتی ہے۔

ہیں۔ یہ وہی تصادم، تزاحم، ٹکراؤ کے الفاظ ہیں۔ اس سے آپ کو اپنے متعلق علم ہو جاتا ہے۔ یہ وہی ہے: ''اوجنوں کیندے نیں پئی اسی کنے پانی اچ کھلوتے آں۔''❶ کہ میں کہاں ہوں، کتنی قوت ہے میرے اندر، کہیں فریب میں تو مبتلا نہیں۔

اب میں یہاں تک آیا تو وہ لطیفہ یاد آ گیا۔ شاید پہلے بھی آ چکا ہو۔ قریباً تیس سال سے درس کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ معلوم نہیں کتنی چیزیں تکرار کے ساتھ آتی ہیں۔ کسی نے کہا کہ ایک زمانے میں وہ پہلوانی کرتے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا بولا کہ میاں صاحب! اس زمانے کی بات اور تھی، آپ میں بڑی قوتیں تھیں، آج آپ پہ بڑھاپا آ گیا ہے۔ لہٰذا اب وہ بات نہیں۔ کہنے لگے: لو جی، کیا کہہ رہے ہو اب بھی وہی بات ہے، کوئی کمی نہیں آئی۔ کہنے لگے: جی نہیں۔ وہ کہنے لگے: آزما کے بتا دو۔ کہنے لگے: چلو۔ وہ اکھاڑے پہ لے گیا۔ اکھاڑے کے ایک کنارے پر ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا، اس پہلوان نے صدری و دری اتاری۔ اسے ایک طرف رکھا، اور اکھاڑے میں پتھر کے اوپر پہنچا اور اس کے اوپر ایک طرف سے یہ جنبش کی، دوسری طرف سے یہ جنبش کی۔ وہ پتھر ہلا ہی نہیں۔ اس نوجوان نے کہا: کیوں میاں صاحب! آپ تو کہتے تھے کہ کوئی فرق نہیں آیا، دیکھا۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے کوئی فرق نہیں آیا۔ جوانی میں بھی نہیں ہلا کرتا تھا، اب بھی نہیں ہلتا۔ فرق کیسے آ گیا۔

انسان کی خود فریبی نے خدا کو بھی بت بنا رکھا ہے

انسان اس خود فریبی میں بھی مبتلا رہتا ہے، پھر تو سامنے پتھر کی ضرورت رہتی نہیں ہے کیونکہ پتھر کچھ کہتا نہیں۔ اسی لیے بت پرستی چلی ہوئی تھی کہ وہ بت سامنے سے کہتا کچھ نہیں ہے۔ انسان کی خود فریبی کو بت پرستی بڑی راس آتی ہے، اور پھر ہم نے تو خدا کو بھی بت بنا رکھا ہے۔ ہمارا خدا بھی تو سامنے سے کچھ نہیں کہتا۔ لفظ ہی مختلف ہیں، عزیزانِ من! ہمیں جو کچھ جی میں آئے کہہ دیا، خود ہی اپنے آپ کو اطمینان دلا کر چلے آتے ہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! آج بھی ہمارے اندر وہی قوت ہے۔ نہیں، اس کا ٹیسٹ بڑا ضروری ہے۔ احتساب خویش بڑی چیز ہے کہ کتنی قوت ہے، تو یہ تو اسی صورت میں ہوگا کہ ایک مخالف قوت آپ کے سامنے ہو، تزاحم والی ہو، تصادم والی ہو، ٹکراؤ والی ہو، پھر پتہ چلے گا کہ کتنی قوت ہے۔ زندگی کی ساری کشمکش ہی یہ ہے۔ مخالف قوت نہ ہو تو وہ خوابیدہ جوہر نمود نہیں پاتے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے آپ کی زندگی میں یہ صلاحیتیں خوابیدہ ہیں۔ ان کی نمود ٹکراؤ سے ہوتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ یہ اسکی بڑی عجیب نظم ہے۔ جبریل اور ابلیس کی ہے۔ وہ ابلیس جبریل سے کہتا ہے کہ

---

❶ جسے کہتے ہیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو !

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اور اگر فارسی کا شعر بھی ذہن میں آ جائے وہ اس سے بھی بلند ہے کہ

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطان ندارد

جہانِ کوروذوق! جہاں تصادم نہیں، جہاں تزاحم نہیں، جہاں آپ کو اپنی قوتوں کی نمود کا احساس دلانے کی کوئی چیز نہیں ہے، یہ زندگی بے ذوق و بے رنگ ہے۔ ذرا سوچیے، مذہب اور دین کا تقابل اس اقبالؒ (1877-1938) نے اس انداز میں یہ کیا۔ وہ جبریل سے کہتا ہے کہ

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہ ھوٗ اللہ ھوٗ اللہ ھوٗ !

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

کوئی تصادم نہیں، کوئی تزاحم نہیں، کوئی ٹکراؤ نہیں، اہرمن کی قوتیں چڑھتی چلی آئیں۔ کوئی بات نہیں: بابا تیرا! بھلا ہوٗ تو ایک اور مار جا سائیں۔ ہو جا ککھ ❶ مسیت ❷ دا۔ ایک تو ویسے ہی وہ تنکا ہی اتنا کمزور ہوتا ہے، پھر وہ مسجد کا، پھر وہ مقدس تنکا۔ نتیجہ یہ کہ اہرمن کی اور Satan کی، باطل کی ساری قوتیں، اوپر چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جھکتا چلا جاتا ہے۔ یہ مذہب ہے۔ وہ دین ہے جو للکار کر، پکار کر، دوسروں کو کہتا ہے کہ آؤ کون آتا ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ پھر انسان کے ساتھ کیوں اسی اسٹیج' پہ اسی زمانے میں، آدم کے ساتھ ابلیس آیا اور آخر تک اس کی ضرورت ہے۔ کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں کہ یہ اس سے خالی ہو۔ یہ تو الگ چیز ہے کہ ایسا زمانہ ہے کہ جس میں شیطان ہی غالب آیا ہوا ہے۔ اس کو اس لیے تو نہیں بنایا تھا کہ غالب آئے۔ انسان کے اندر اتنی مضمر قوتیں رکھی ہوئی تھیں کہ ایک شیطان کیا، شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (6:112) ان سب کے اوپر یہ غالب آ سکتا ہے، اور غالب آنے کی بات اس کے اندر نہ رہے تو پھر تو یہ اپنے شیطان سے بھی مغلوب ہوا ہوتا ہے اور ہم تو سب اپنے ہی شیطان سے مغلوب ہیں، باہر کے شیطان تو آگے جا کر آتے ہیں، اور پھر سارے معاشرے کے اندر شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (6:112) جنودِ شیاطین، لشکر شیاطین ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟ پھر وہی بات کہ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (7:45) انسانیت کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں: تمہارا کوئی کام ہم قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہونے دینگے، دیکھ لو کر کے۔

---

❶ تنکا، حقیری چیز ❷ مسجد کا

عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں

عزیزانِ من! یہ کچھ بتا کر اب مجھے آگے بڑھ جانا چاہیے کہ یہ کشمکش ہے کیا؟ میں نے کہا کہ لفظی طور پہ یہ کشمکش حق اور باطل کی کشمکش ہے۔ یہ قرآن کی بڑی جامع اصطلاحات ہیں۔ حق کے اندر پورے کا پورا دین اور اسلام آ جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل باطل کی ساری دنیا کی قوتیں ہیں، تمام دنیا کے جتنے بھی نظامہائے انسان ہیں، وہ اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ کہنے کو یہ دو ہی الفاظ ہیں: حق اور باطل۔ ان کی تشریح سارا قرآن ہے، لیکن اس حق یا باطل کی جو سرگزشت ہے "جنوں کیندے ناں تت کڈیا ہویا اوہدا۔" [1] نچوڑ اس کا جو ہے وہ تو قرآن کے انداز میں ہے اور قرآن کی ابتدا بھی اس سے ہوتی ہے، اس کی انتہا بھی اس پہ ہوتی ہے۔ ابتدا کس سے ہوتی ہے؟ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ** [2] (1:1)۔ انتہا کس پہ ہوتی ہے؟ **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ** [3] (114:1)۔ یہ ربوبیت عالمینی ہے۔ نوعِ انسان کی ربوبیت کے لیے قرآن کا دین یہیں سے شروع ہوا، یہیں پہ اختتام ہوا۔ اب بات کیا ہوئی؟ اب تو ہر فرد اپنے اپنے فائدے کی سوچتا ہے۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! وہ جس کو اپنے بھی نفع نقصان کی فکر نہیں، وہ پاگل ہوتا ہے۔ پاگل کے متعلق بھی سعدی [4] نے ٹھیک کہا ہے کہ

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار

تمہیں پتہ نہیں ہے "وہ اپنا مطلبی بڑا ہوندا ہیگا۔ ساڈے وی کیندے نیں پئی بڑا مطلبی ہوندا ہیگا۔" [5] لیکن بہر حال دیوانے کو چھوڑ دیجیے صاحبِ عقل و ہوش تو اسے کہا جاتا ہے جو اپنے فائدے کی سوچے، دوسرے کے فائدے کی نہیں۔ اپنا فائدہ نکالے۔ اب اس کو فائدے کے دائرے سے بڑھاتے چلے جایئے: ایک فرد کا، اپنے خاندان کا، اپنے قبیلے کا، اپنی قوم کا فائدہ سوچو۔ آج انسانیت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ اس تصور نے اپنا فائدہ جانا ہے، دوسرے کا فائدہ نہیں۔

---

1. جسے اس کا نچوڑ نکالا ہوا کہتے ہیں۔
2. جب انسان اس کارگہہ کائنات کے نظم و نسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آ جاتی ہے کہ اس میں ہر شے کو سامانِ نشو و نما کس طرح بلا مزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے جس سے وہ اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر، ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلماتِ تحسین و آفرین آ جاتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ)
3. اعلان کر دو کہ ہمیں اس خدا کے قانون سے اور زیادہ قریب ہو جانا چاہیے جس کے پیش نظر (کسی خاص گروہ، جماعت، یا قوم کی نہیں بلکہ) پوری کی پوری انسانیت کی نشو و نما ہے۔ (1:1) وہ رب الناس ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ)
4. سعدی شیرازی (1184-1291)
5. وہ اپنے مطلب کے حصول کے لیے بڑا پختہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہی کہتے ہیں کہ بڑا مطلب پرست ہوتا ہے۔

یہ تمام تر فسادات من وتو کے تصور کے پیدا کردہ ہیں

عزیزانِ من! آج دنیا کے اندر یہ جتنے بھی فساد اور خوں ریزیاں ہو رہی ہیں وہ صرف اس تصور پہ ہیں کہ ہر فرد، ہر قبیلہ، ہر خاندان، ہر قوم، صرف اپنا فائدہ سوچتی ہے، دوسرے کا نہیں سوچتی۔ یہ ہے باطل۔ حق کیا ہے؟ ربوبیت عالمینی، ربوبیتِ انسانیت، صرف اپنا ہی نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کا عالمگیر فائدہ۔ ابتدا اس کی یوں ہے کہ اپنا فائدہ سوچتے وقت، جو ساتھ کھڑا ہے، اس کا بھی فائدہ ہو، اپنے گھر کا سوچتے وقت پڑوس کا فائدہ ہو، اپنے قبیلے کا سوچتے وقت دوسرے قبیلے کا فائدہ بھی ہو، اپنی قوم کا فائدہ بھی ہو۔ جب آپ نے دوسروں کا سوچنا شروع کر دیا تو قبیلہ اور قوم تو رہے گی نہیں۔ یہ لکیریں تو اس وقت تک ہیں جب تک آپ نے میں اور تو کی تمیز قائم کی ہوئی ہے۔ جب یہ مَن وتُو درمیان میں نہیں رہے گا تو پھر اپنے اور غیر کا سوال نہیں ہے۔ اپنے گھر کے اندر تو آپ یہ نہیں کرتے کہ یہ میرا فائدہ ہے اور یہ اس طرح میرے بیٹے کا فائدہ ہے، وہ تو سارے گھر کا مشترک فائدہ ہوتا ہے۔ اس گھر کو قرآن پوری انسانیت پر محیط کر دینا چاہتا ہے۔ بات اتنی سی ہے۔ وہ رب العالمین ہو جاتا ہے، وہ رب الناس ہو جاتا ہے۔ ایک طرف یہ ربوبیتِ عالمینی سب کا فائدہ ہے۔ جسے آپ عملِ صالح کہتے ہیں یہ وہ ہے جو پائیدار ہے، جو دنیا میں رہ سکتا ہے جس کو بقا نصیب ہے۔ اسی کے لیے قرآن کہتا ہے کہ **اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ** (13:17) جو عمل، جو نظریہ، جو تصور، جو نظام بھی نوعِ انسانی کی منفعت اپنے سامنے رکھتا ہے اسی کو بقا ہے۔ اب غور فرما رہے ہیں قرآن کیا کہتا جا رہا ہے۔ اب اس نقطہ نگاہ سے آپ پورے قرآن پہ نظر ڈالیے، سارا قرآن پڑھ جایئے تو یہ نظر آ جائے گا کہ اپنا فائدہ دراصل انسانیت کا فائدہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) دو شعروں میں ساری بات کہہ جاتا ہے:

عقلِ خود بیں ، غافل از بہبودِ غیر

یہ عجیب شخص تھا۔ یہ یہاں، عقلِ خود بیں یعنی عقل کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پھر رہا۔ اس نے دو قسم کی عقل کہی ہے۔ یہ پیامِ مشرق میں ہے، جہاں وہ مغرب کی اقوام کو مخاطب کرتا ہے، وہاں یہ کہتا ہے:

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است

کیا بات ہے اس شخص کی! یہاں دو چیزیں ہیں۔ عقل کو تسلیم کیا۔ ایک عقل خود بیں اور دوسری عقلِ جہاں بیں۔ یعنی وہ جو جہاں بینی یا ربوبیت عالمینی ہے وہ عقل وفکر کے دیئے گل کر کے نہیں آتی، عقل ہی کی رو سے وہ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ عقل وحی الٰہی کی روشنی میں کام کرے۔ وہ عقلِ جہاں بیں ہو جاتی ہے۔ پھر عقلِ خود بیں کیا سوچے گی؟ عقل نے سوچنا ہے کہ میرا فائدہ کس طرح ہے، کیسے حاصل ہو سکتا ہے، میرے بچوں کی منفعت کس طرح سے ہے، کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ سب کچھ عقل ہی کر رہی ہے۔ اس وقت یہی عقل یہ سوچے گی

کہ نوعِ انسانی کا فائدہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ اس وقت یہ عقل خود بین حقیقت میں عقل جہاں بیں بن جائے گی۔ عزیزانِ من! قرآن کا سارا پیغام' وحی کی روشنی میں عقلِ جہاں بیں کرتی ہے' سمجھتی ہے اور پھر جو کچھ سمجھا ہے اس کی تلقین اس نے کی ہے۔ یہ دین اسلام ہے۔ یہ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں یہی چیز ہے:

عقلِ خود بیں غافل از بہبود غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحی حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

بات ختم ہوگئی' یہ ہے اسلام' اور یہ ہے ٹکراؤ جو چلا آ رہا تھا۔ اب اس نقطہ نگاہ سے یہ جتنی انبیائے کرام علیہم السلام کی' اقوامِ سابقہ کی' داستانیں آپ کے سامنے آئیں گی' اب پڑھیے گا تو قرآن میں آپ کو نظر آئے گا کہ وہاں درمیان میں تزاحم کا' تصادم کا' کیا نقطہ تھا۔ پہلے ہی Scene (منظر) میں پردہ اٹھنے کے بعد جو چیز آتی ہے' وہ حق و باطل کا یہی تزاحم و تصادم ہے۔

چھوٹے اور بڑے کا باہمی ٹکراؤ

عزیزانِ من! حضرتِ نوح ❶ علیہ السلام کے ہی دَور کی بات ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جو چھوٹے چھوٹے طبقے کے لوگ ہیں' یہ جو کام کرنے والے ہیں' یہ جو محنت کرنے والے' کمی کمین' وغیرہ ہیں تم ان کو سر پہ چڑھا رہے ہو' ان کی اس طرح سے بہبود کر رہے ہو۔ ہم ان کے مقابل میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ہم لوگوں کو تم ان کے برابر میں بٹھا رہے ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ٹکراؤ یہ تھا۔ ہر دَور میں یہی ٹکراؤ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے اندر تو یہ ٹکراؤ شدت تک پہنچ چکا تھا: قبائلی' نسبی' سرمایہ دارانہ' مذہبی پیشوائیت' مزید برآں قریش کے اندر مفادِ خویش کی ساری چیزیں جمع ہوگئی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ ٹکراؤ بھی آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ تیئیس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت یا اس دَور کی تاریخ اسی ٹکراؤ کی تاریخ ہے' انبیائے سابقہ کی ساری تاریخ اسی ٹکراؤ کی تاریخ ہے۔ انسانیت کی یہی تاریخ ہے۔ اس دَور کو تو چھوڑ دیجیے۔ ہم آگے بڑھ جائیں گے۔ آج کے اس دور کے اندر یہی مسئلہ ہے۔ ہر شخص اپنے فائدے کے لیے' دوسرے کو کچل کر چلا جائے گا۔ کسی میلے میں' میلے میں نہیں' مقدس مقام پہ آیئے اس میں بھی۔ میں میلے کا پہلے بیان کر دوں کہ اگر کوئی شخص میلے کے اندر کہیں گر جاتا ہے پیچھے سے آنے والے اس کو اٹھاتے نہیں ہیں' روندتے چلے جاتے ہیں۔ اب مقدس مقام کی بات کر دوں' اگر بھول نہ گیا ہو تو میں آپ کو بتا دوں کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد' اسی شاہی مسجد ❷ کے' میرا خیال ہے' رمضان کے مہینے میں' جمعۃ الوداع کی نماز کے

---

❶ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ قریباً 5000 ق۔م کا ہے۔

❷ یہ اشارہ لاہور کی بادشاہی مسجد کی طرف ہے۔

بعد، جو وہاں سے نکلے ہیں، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بڑے دروازے میں چھبیس انسان، دوسرے انسانوں کے پاؤں کے نیچے آ کر کچلے گئے تھے: سودِ خود بینڈ نہ بیند سودِ غیر۔ اور پھر آج تو ہر شخص اس فکر میں ہے کہ دوسرے کی جیب کیسے کاٹنی ہے، اور وہ اسی طرح ہوتا ہے کہ اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرے۔ اگر اس کا کام، قاعدے قانون، صحیح طریقے کے مطابق، ہوتا چلا جائے تو کوئی اس کی جیب نہیں کاٹ سکتا، کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا۔ وہ تو ہوتا یہ ہے کہ پہلے رکاوٹ کھڑی کرے تا کہ وہ رُک جائے۔ یہ جو کسی کا کسی مقام پہ رُک جانا ہے، عزیزانِ من! یہ قرآن کی رو سے جحیم ہے۔ قانونِ ارتقاء، جسے آپ Evolution Theory (نظریہ ارتقاء) کہتے ہیں، اب سائنس بن گئی ہے۔ اس قانون کی رو سے ہر نوع کا اس کے خلاف دوسری نوع کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے، اگر اس نوع میں مدافعت کی اتنی قوت ہے کہ وہ Stand (مقابلے کا پختہ عزم) لے لے تو وہ صرف زندہ رہتی ہے اور اگر اس میں اتنی قوت ہے کہ وہ اس کو مغلوب کر لے، تو یہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ آگے بڑھنے کا جو سلسلہ ہے یہ ہے دین، یہ ہے اسلام۔ حق کے راستے میں آگے بڑھ جانا، رکاوٹ کی قوتوں کو مغلوب کر کے آگے بڑھتے چلے جانا، یہ دین ہے اور جہاں رک جائے وہاں:

مگر کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اور اسی لیے قرآنِ کریم نے جہنم کے لیے **جحیم** کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ربوبیتِ عالمینی کا دوسرا نام ہی دین ہے

عزیزانِ من! **جحیم** [1] کے معنی ہیں ''جہاں کوئی رک جائے، آگے نہ بڑھ سکے۔'' قرآنِ کریم نے اہل جنت کے متعلق کہا ہے کہ یہ **السٰبقون السٰبقون** ہیں: آگے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو آگے بڑھنے والے ہیں، انہیں **مقربون** بھی کہا ہے۔ یہ جو دین اور نظام کفر ہے وہ یہ چیز ہے۔ حق کے راستے میں آگے بڑھنا، انسانیت کی راہیں کشادہ کرتے چلے جانا، ربوبیت عالمینی کے سامان کو عام کرتے چلے جانا، یہ اسلام ہے۔ یہ دین ہے۔ یہاں آگے بڑھنا ہے۔ یہ قانونِ ارتقاء ہے۔ یہ سائنس کی یا کائنات کی تھیوری (نظریہ: Theory) ہے۔ یہ حق ہے۔ اور اسکے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے چلے جانا، یہ باطل ہے۔ پھر جس معاشرے کے اندر ہر شخص کے راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو تو وہ سارا معاشرہ جہنم ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! وہ **جحیم** ہوتا ہے۔ جہاں رکے ہوئے کھڑے ہیں۔ اپنے ذہن کے اندر سوچو کہ آپ کے کتنے کتنے کام، کتنے

---

[1] قرآنِ کریم نے جہنم اور جحیم دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہنم کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیر نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص۔ 275 (فٹ نوٹ 2) یہ عبرانی الاصل ہے۔ کتابت کی غلطی سے عربی الاصل لکھا گیا ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ (لغات القرآن، پرویز ص۔ ۴۵۴)

پروگرام رکے ہوئے ہیں' آپ کھڑے ہوئے ہیں' آپ چیخ رہے ہیں' آپ کو کچھ نہیں سوجھتا' مایوس ہو گئے ہوئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ قرآن میں ابلیس کے لیے شیطان کا لفظ بھی ہے یعنی رکاوٹ کھڑی کرنے والا۔ ابلیس کے معنی ہی مایوسی ہے۔ جب آپ کے سامنے اتنی رکاوٹیں آ جاتی ہیں کہ آپ کو نہیں Remove (ہٹانے) کرنے کا' ان کو ہٹانے کا' کوئی طریقہ نہیں سوجھتا تو وہاں آپ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ یہ ابلیس اور شیطان ایک ہی Coin (سکہ) ہے' ایک ہی سکہ ہے جس کے دو رخ ہیں: شیطان بھی' اور ابلیس بھی۔ رکاوٹیں اتنی پڑتی ہیں کہ انسان مایوس ہو جاتا ہے پھر معاشرے پر ابلیسیت وشیطانیت چھا جاتی' اور یہ سب کس طرح سے' سودِ خود بیند ہے' آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جو رکاوٹیں پیدا کرنے والا ہے' اسے یونہی کوئی چاؤ نہیں ہوتا' کھیل نہیں ہوتا' وہ رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ وہ سودِ خود بیند ہے کیونکہ اس میں اس کا اپنا فائدہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کی سیرت کا پہلا دَور

عزیزانِ من! ہم نبی اکرم ﷺ کے دورِ ہمایوں پر آتے ہیں۔ حضور ﷺ کی سیرت کا پہلا دَور مکی زندگی کا تھا۔ یہ تصادمات کا دَور تھا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا دَور آیا۔ تصادمات نے میدانِ جنگ کی شکلیں اختیار کر لیں۔ وہاں 7 ہجری تک ٹکراؤ ہی ٹکراؤ تھا لیکن ہر ٹکراؤ میں ان کی مضمر قوتیں اور زیادہ شدت کے ساتھ ابھریں۔ **اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ** (48:29) کے معنی یہی ہیں کہ ہر ٹکراؤ میں ان کی مضمر قوتیں اور شدت سے آگے بڑھ کر اوپر آ گئیں تا آنکہ ہم آخری دَور میں آ گئے۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیاں

عزیزانِ من! میں پہلے بھی کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآن کے حقائق تو بے مثل و بے نظیر ہیں' اس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ اس کا چیلنج ہے کہ انسانیت مل کر بھی اس کے مقابل میں کوئی چیز مرتب نہیں کر سکتی۔ اس کا جو اسلوبِ بیان ہے وہ بھی بجائے خویش منفرد ہے۔ اس اعتبار سے بھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکا' اس کی کوئی مثل نہیں بنا سکا۔ معرّی [1] نے اپنے ہاں رسالۃ البحران لکھ کر دعویٰ کیا تھا کہ ادبی

---

[1] ابو العلآ معری عربی کا ایک مشہور شاعر ہے۔ رسالۃ البحران کے علاوہ رسالۃ الغفران اس کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے۔ لزومات اس کے قصائد کا مجموعہ ہے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے اپنی کتاب بال جبریل میں ابو العلآ معری کے عنوان سے یہ نظم لکھی ہے:

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا معری　　پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اِک دوست نے بھونا ہوا تیتر اُسے بھیجا　　شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا　　کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مرغک بیچارہ ! ذرا یہ تو بتا تو　　تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس ' صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو　　دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

اعتبار سے اس کو دیکھو۔ہم ہی نہیں خود ان کے ہاں کے جو امامِ ادب ہیں مثلاً طٰہٰ حسین جیسے لوگ' انہوں نے بھی یہ کہا کہ اس کا یہ دعویٰ تو بڑا تھا لیکن قرآن کا انداز کوئی اور ہی ہے۔ اما تو چیزے دیگری۔ اس لیے اگر ادبی اعتبار سے بھی اسے دیکھا جائے تو یہ عجیب چیز ہے۔ یہ کتاب عربی زبان کی آسان ترین کتاب ہے۔ گرامر کے ابتدائی مبادیات سمجھنے کے بعد اگر میں عربی زبان کی کوئی کتاب کسی طالبعلم کو شروع کراؤں تو وہ قرآن شروع کراؤنگا۔ یہ اتنی آسان کتاب ہے اور اس کے بعد اسلوبِ بیان اس قدر پیارا اور وجہ کشش و جاذبیت ہے کہ بڑے سے بڑا ادیب بھی ادبی اعتبار سے وجد میں آجائے۔

شکست کی پہلی نشانی: پروگرام کے متعلق غیر یقینی کیفیت

عزیزانِ من! اب قرآنِ کریم نے بات یہ کہی ہے کہ اب اسٹیج وہ آ گئی ہے جہاں مخالفین نے مکہ کے اندر جتھہ بنایا۔ اس چیز کے متعلق قریش متحد تھے کہ دو چار ٹکراؤ کے بعد اِس ذرہ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر' کو کچل کر رکھ دیں گے۔ نہ ان کی تعداد ہے نہ ان کے پاس ساز و سامان ہے۔ یہ اس بات کے اندر متحد تھے۔ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی۔ قرآن کا انداز دیکھیے کہ کیا کہتا ہے۔ بات اس نے یہ کہی ہے کہ وہ جو پہلے اتنی یقینی چیز تھی کہ ہم یعنی مخالفین واقعی اس مٹھی بھر جماعت پر غالب آجائیں گے' یہ وہی شے ہے' جسے کہتے ہیں کہ ان مخالفین کے ہاں ایک آواز بھی اختلاف کی نہیں تھی۔ ان کا اس پر اتنا محکم یقین تھا کہ کوئی بات ایسی نہیں تھی جو کی جائے۔ اسٹیج وہ آ گئی ہے عزیزانِ من! سنیے اور جھومیے۔ کہا کہ عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ❶ (78:1) ان کی آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی ہیں کہ یار! پتہ نہیں' غالب آ بھی سکیں گے' یا نہیں آسکیں' پتہ نہیں کل کو کیا ہو جائے۔ کہا کہ اندازہ لگائیے۔ قرآنِ کریم کی بات کہنے کی یہ تھی کہ اس لمبی کشمکش کے اندر میدان وہ آ گیا ہے کہ انہیں بھی خود اپنے پروگرام کے متعلق وہ یقین نہیں رہا۔ عزیزانِ من! کوئی ادب پسند ہے تو وہ غور کرے کیا بات ہے جو کہی ہے کہ یہ ''ایک دوسرے سے پوچھنے لگ گئے کہ یار ذرا سوچیے تو سہی کہ ہم ہیں بھی ٹھیک حق پہ یا نہیں؟ کیا یہ ہو بھی جائے گا؟ جب کسی دشمن میں یہ اسٹیج آجائے تو سمجھ لیجیے کہ شکست آ گئی۔ اور یہ اتنی ہی اسٹیج نہیں ہے بلکہ کہا ہے کہ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (78:3) اب اختلاف بھی ان کے اندر پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ غور فرما رہے ہیں قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! جب بھی دشمن کی صفوں میں یہ بات ہو کہ اپنے مقصد کے متعلق ان میں چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں تو سمجھ لو کہ اس کے متعلق ان کے دلوں میں شکوک ابھرنے شروع ہو جاتے ہیں' ان کے یقین میں اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اب اس اصول کا اطلاق جہدِ پاکستان پر کیجیے۔ اب یہاں یہی طے نہیں ہوا کہ پاکستان مانگا کیوں تھا۔ تشکیلِ پاکستان تک کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا تھا۔ وہاں عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ کی یہ صورت نہیں تھی۔ کسی اور کو تو چھوڑیئے ہم موجود ہیں۔ میرے سامنے

---

❶ (اے رسولؐ! تمہیں معلوم ہے کہ) یہ لوگ' ایک دوسرے سے' کس چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آج ایک دوست بھی موجود ہیں۔ اللہ ان کو زندہ رکھے: چوہدری عطاء اللہ۔ یاد ہے کبھی کسی طرح، کبھی بھی، ہم نے آپس میں یہ بات نہیں کی تھی کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ ہم یہ کیوں کر رہے ہیں؟ بھئی ہوگا بھی یا نہیں ہوگا؟ اس کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ہمارا چٹان کی طرح یہ محکم یقین تھا کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ کبھی یہ شک وشبہ کی بات تک نہیں ہوئی تھی، اختلاف تو بات ہی بڑی ہے۔

پاکستان کے حسین مقاصد میں زہر ملا دیا گیا

عزیزانِ من! تشکیل پاکستان کے بعد یہ پہلا سوال ہی عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ (78:1) کا ہوا۔ پوچھ رہے ہیں کہ یہ پاکستان مانگا کیوں تھا۔ اب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں: هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ❶ (78:3) وہ کہہ رہا ہے صاحب! اصل میں یہ تو ہندو کی تنگ نظری تھی جس کی وجہ سے ہم مجبور ہو گئے۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہوکر ہم نے پیمانِ وفا بدلا

ہم بڑے مجبور ہو گئے تھے، ہندو اگر ذرا بھی شفقت کا ہاتھ رکھتا تو کہاں کا پاکستان، کہاں کا اسلام صاحب! ہم اس کے ساتھ اسی طرح مفاہمت کرتے اور اگر آج بھی وہ یہ کر لے تو ٹھیک ہے جی، کہ جی، نہیں یہ تو معاشی مسئلہ تھا، یہ بڑے بڑے جاگیردار، بڑے بڑے سرمایہ دار جو ہندوستان میں رہتے تھے ان کے پاس معاش کے میدان بڑے محدود تھے۔ انہوں نے یہ کچھ کرا دیا صاحب! کسی نے کہا کہ نہیں جی، یہ انگریز کی سازش تھی، وہ ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا تھا۔ وہی بات کہ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ❶ (78:3) یعنی پہلے یتسآءلون ہوا کہ آپس میں چہ میگوئیاں سی شروع ہوئیں۔ عزیزانِ من! ہماری ساری داستان یہ ہے۔ ہم نے وہاں کبھی ایک دوسرے سے یہ پوچھا تک نہیں تھا کہ ہم یہ کیوں کر رہے ہیں۔ ہم وہ باتیں یہاں آ کر سن رہے تھے۔

قرآن کہتا ہے: عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ❷ ......اور پھر اس کی وجہ سے آپ کی جو حالت ہوئی ہے وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔...... هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ❶ (78:3)

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ہندو اور انگریز دونوں کی غلامی سے جو ہماری یہ زنجیریں کٹی تھیں وہ ذوقِ یقین کی بنا پر تھیں۔ وہاں يَتَسَآءَلُوْنَ کی صورت ہمارے تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ ہم نے ایک دوسرے کے متعلق کبھی پوچھا ہو کہ کیوں بھائی! کچھ ہوگا بھی۔ اس مختلفون کا تو سوال ہی نہیں

---

❶ اس کی بابت ان کے خیالات مختلف ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔

❷ (اے رسولؐ! تمہیں معلوم ہے کہ) یہ لوگ ایک دوسرے سے، کس چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟

تھا۔ ہمارے سامنے آج دونوں شکلیں آ گئیں اور نظر آ رہا ہے کہ ہر شخص کانپ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ یار! پاکستان کا کیا بنے گا؟ آ گئے اس مقام پہ کہ صاحب! یہ باقی بھی رہے گا یا نہیں رہے گا؟ کس وجہ سے اس چیز پہ آ گئے؟ وہاں تو جون جولائی 1947ء تک بھی کسی نے ہم میں سے یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب! پتہ نہیں پاکستان ملے گا یا نہیں ملے گا۔ یہاں ملنے کے بعد اتنی بڑی مملکت کے مالک ہونے کے بعد اتنے عرصے کے بعد یہ خیال آج کیوں پیدا ہو رہا ہے کہ پاکستان رہے گا بھی یا نہیں۔ اس لیے کہ پہلے **یتسآء لون** ہوا' پھر **مختلفون** ہوا' اور آج اختلاف کا تو پوچھیے نہیں: کوئی کہہ رہا ہے کہ سیکولر حکومت قائم کرنے کے لیے بنایا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! دو قومی نظریہ ہی بالکل غلط تھا۔ یہ تھی **مختلفون** کی صورتِ حال۔ آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ بات تو یوں ایسی شروع ہوئی ہے جیسے اس زمانے کی کوئی بات ہو رہی ہے لیکن ہے ابدی صداقت لیے ہوئے۔

ابدی حقائق کی اہمیت اور ہماری کوتاہ نظری

عزیزانِ من! یہ ابدی حقائق ہیں۔ قوموں کی زندگی کے اندر شکست کے آثار اس سے نظر آتے ہیں کہ پہلے اپنے مقصد کے تیقن میں چہ میگوئیاں ہونی شروع ہو جائیں' پھر اختلاف پیدا ہو جائے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ** [1] (78:1)۔ کتنے خوبصورت سے یہ دو الفاظ ہیں اور پھر استفہامیہ انداز کے اندر ہیں۔ یہ کس بات کے متعلق آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں؟ کونسی بات ہے جس کے متعلق ان کے دلوں میں شکوک ابھر رہے ہیں' اضطراب پیدا ہو رہا ہے؟ کاہے کے متعلق ہے؟ کہا کہ **عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ** [2] (78:2) **اَلنَّبَاِ الْعَظِيْمِ** ابھی میں صرف لفظ نبا کے متعلق ہی عرض کروں گا۔ کہیں ترجمہ دیکھ لیجیے۔

بہت بڑی خبر کے متعلق یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ پھر جب اس کی تفسیر میں جاتے ہیں تو پھر وہ یہ کچھ قیامت کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ ان کی تو بات ہی وہاں آ جاتی ہے۔ کہیں کسی جگہ سن لیجیے' یہ فوراً کہتے ہیں کہ قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ آپ کے ہاں کب آئے گی' ایک تو یہ جو ہماری Physical World (طبعی دنیا) ہے' جو ہماری یہ کائنات (Universe) ہے' اس کے انجام کے متعلق ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایک دن اس نے ختم ہونا ہے' کرّوں کے اندر ٹکراؤ ہونا ہے' یہ سارا کچھ اور وہ کچھ بھی' جو قرآن کے اندر ہے' ختم ہو جانا ہے۔ اس کا تعلق ہم سے' ہمارے اعمال سے' کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ یعنی اگر وہ اپنے وقت پر جو Nature (فطرت) کا متعین پروگرام ہے یا Nature (فطرت) کے قانون کے مطابق انہوں نے ٹکرانا ہے تو ہم کیا کر لیں گے؟ ہم اپنی اصلاح کے لیے کیا کریں کہ وہ نہ ٹکرائیں۔ وہ تو ٹکرانا ہے۔ ایک قیامت وہ ہے' اس کی صورت یہ ہے۔ ایک قیامت مرنے کے بعد آنے کی ہے۔ اس میں آج کے جو ہمارے اعمال کے نتائج ہیں وہ سامنے آئیں گے۔ اسے یوم الفصل بھی کہا ہے۔ جو بویا تھا اسے کاٹنا ہے۔ کیا بات ہے اس فصل کے لفظ کی! اس کے

---

[1] (اے رسولؐ! تمہیں معلوم ہیں کہ) یہ لوگ' ایک دوسرے سے' کس چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟

[2] یہ دریافت کرتے ہیں اس عظیم واقعہ کے متعلق............

کاٹنے کا وہ وقت بھی آئے گا۔اس پر ہمارا ایمان ہے۔ایک قیامت اور بھی ہے۔حق اور باطل کی قوتوں کا جو باہمی ٹکراؤ ہے'اس ٹکراؤ کا جو آخری مرحلہ ہے' اسے بھی قرآن نے قیامت کہا ہے: يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) جس دور میں پوری انسانیت ربوبیت عالمینی کے لیے کھڑی ہوگی: يَقُوْمُ النَّاسُ ۔عربی زبان کے گرامر کی رو سے ''قَامَ'' سے ''قیام'' کا لفظ ہے۔اس میں اگر آخر میں ۃ گول لگادی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں یک لخت' انقلابی طور پہ' کسی چیز کا By revolution ہو جانا۔عربی زبان عجیب ہے۔یہ ہے وہ انقلاب وہ قیامت جس کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے۔یہاں یہ کہا ہے کہ یہ اس قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں' ورنہ وہ جو آنے والی قیامت ہے اس کا ذکر ہر مذہب میں موجود ہے' قیامت اور اس کے ساتھ جو آنے والا ہے' اس کا ہر مذہب میں انتظار ہے' کیا چیز ہے جو اس میں دلچسپی پیدا کی گئی کہ ایک آنے والے نے آنا ہے' اور یہاں آنے کے بعد اس نے کچھ کرنا ہے۔ ❶

آنے والے کا تصور خلافِ قرآن ہے

عزیزانِ من! میں ابھی عرض کرونگا کہ اس آنے والے نے جو کچھ کرنا ہے تو پھر اس کے بعد وہ قیامت آجانی ہے۔یعنی وہ آئے گا ہی اس لیے کہ اس کے بعد پھر وہ قیامت آجائے گی۔ہر ایک مذہب والا انتظار میں ہے۔آنے والے کی یہ بات مجوسی مذہب سے چلی۔ مجوسیوں سے ایران کے ہاں یہ تصور پیدا ہوا کہ ایک مترا ❷ یا مصرا 'Mithra' ہے' وہ آخری زمانے میں پھر دنیا میں آئے گا۔یہ جو عیسائیت کا تصور ہے کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پہ گئے' وہ پھر آئیں گے۔یہ سارا مترا کے متعلق ہے۔ میری جو کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں ❸ ہے' اس میں آپ پڑھیے گا۔ان کا تصور یہ تھا کہ ان کے ہاں کا مترا آسمان پہ چلا گیا ہے' اس مترا نے آخری زمانے میں' قیامت کے قریب یہاں آنا ہے۔ہندوؤں نے اپنے ہاں کہا کہ ہم کیوں کسی سے پیچھے رہ جائیں۔انہوں نے کہا کہ نہیں جی' آخری زمانے میں کلنکی اوتار آئے گا۔بدھ والوں نے کہا کہ تمہارا آئے گا' ہمارا بھی آئے گا: بدھ والوں کا متیا آئے گا۔یہ صورت پیدا ہوگئی آخری زمانے میں۔وہ سارے آخری زمانے کے ہیں۔یہودی کہنے لگے کہ صاحب! وہ اب تک انتظار میں ہیں کہ مسیح آئے گا۔وہ آکر

---

❶ ان نکات کی مزید تشریح و تفہیم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام' رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 355-349' نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

❷ بقول The Christian Platonists of Alexandria کے مصنف Charles Bigg: ''مترا قدیم دنیا کی آرین نسل اقوام کا خدا تھا۔ ویدوں نے اسے نور و صداقت دینے والا قرار دیا ہے۔پلوٹارک کا بیان ہے کہ وہ اہرمزد اور اہرمن کے درمیان واسطہ ہے......مترا کے معتقدین' توسل اور شفاعت' کفارہ اور ایک نجات دہندہ پر ایمان رکھتے تھے۔'' (حوالہ پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوعِ اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ)' لاہور' 1996' ص۔66)

❸ اس کا پہلا ایڈیشن 1966ء میں چھپا تھا۔1996ء تک اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اس مسیح نے کہا کہ میں تو آ گیا ہوں مگر بقول ان کے اس کو صلیب دیدیا۔ کہا کہ وہ آئے گا۔ پھر بیٹھے ہیں' انتظار کر رہے ہیں۔ عیسائیت والے عیسیٰ علیہ السلام کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ آئے گا۔ ہر ایک آنے والے کا انتظار کر رہا ہے۔ ہم بھی ان کی دیکھا دیکھی انتظار کر رہے ہیں حالانکہ' وہ جتنے کسی آنے والے کے انتظار میں تھے' وہ تو سرزمینِ حجاز میں آ گیا: محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبین آ گیا۔ پچھلے جتنے انتظار کرنے والے تھے' ان کے لیے بھی وہ المنتظر بن کر آ گیا اور آ گے آنے والے کے عقیدے کو ختمِ نبوت نے ختم کر دیا لیکن ہم بھی انتظار میں بیٹھے ہیں' سب انتظار میں بیٹھے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ آ کر کیا کریں گے۔ ہر ایک یہ کہتا ہے کہ جو ہمارا مذہب ہے وہ اس کو زندہ کریں گے۔ اب سوچیے' عزیزانِ من! کہ مجوسیوں والا مجوسیوں کے مذہب کو زندہ کرے گا' کلنکی اوتار ویدت دھرم کو زندہ کرے گا' متیا بدھ مت کو زندہ کرنے کے لیے لڑائی لڑے گا' یہودیت کا مسیح یہودیت کو' عیسائیوں کا عیسیٰ علیہ السلام وہ عیسائیت کو زندہ کرے گا' مسلمانوں کے یہ جو ہیں اسلام والے یہ سارے بیک وقت اکٹھے ہو جائیں گے اور ہر ایک کے ہاتھ میں' اپنے اپنے مذہب کو زندہ کرنے کے لئے' تلوار ہوگی "تے قیامت تے آ ہی گئی۔ اوتے آپے ای آ جانی ہیگی قیامت"[1] بیٹھے ہیں اس انتظار کے اندر۔ آنے والا آ بھی گیا اور یہ ابھی تک انتظار کر رہے ہیں۔ یہ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ (78:2) اس آنے والی قیامت کے متعلق نہیں ہے' نہ تو مرنے کے بعد کی قیامت کے متعلق ہے اور نہ ہی یہ جو اس ارضی یا طبعی کائنات کے اختتام پہ وہ جو سارے آ کر اکٹھے ہونگے' پھر یہ سارا کچھ جو ہوگا' یہ اس کے متعلق بھی نہیں ہے۔ میں یہ کچھ خود نہیں کہہ رہا' عزیزانِ من! یہ قرآن کی بصیرت ہے۔ دو لفظ کہنے کے بعد یہ کہا کہ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (78:4) اوہ! یہ تو ابھی دیکھ لیں گے وہ قیامت کیا ہے جو آ رہی ہے: سَيَعْلَمُوْنَ ۔ یہ عربی زبان کا "س" دیکھیے' کیا کہہ رہا ہے؟ ابھی' ابھی نظر آ جائے گا' ابھی دیکھ لیں گے' اور پھر یہ چیز اتنی زیادہ یقین کے ساتھ کہی گئی کہ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (78:3-4) نہیں سمجھا تو پھر سمجھ لو' ابھی تمہاری سمجھ میں آ جائے گا کہ وہ قیامت کیا ہے؟ آ رہی ہے صاحب! اللہ اکبر!! سمجھ میں آ گیا کہ يَتَسَآءَلُوْنَ کیا بات تھی؟ اس سے ان کے یقین کی بنیادیں ہل گئی تھیں' قوم کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور اس کے بعد کہا کہ جب تمہاری یہ حالت ہوگئی تو اب کونسا لمبا انتظار ہو گیا؟ نہیں' وہ تو سب چیزیں تیار ہیں: كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (78:4-5)

قیامت ظہورِ نتائج کا زمانہ ہے

عزیزانِ من! اس سیعلمون پر کسی کی نگاہ نہیں جاتی کہ وہ عربی زبان میں کیا کہہ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ بات ابھی تمہارے سامنے آ رہی ہے' ابھی تم دیکھ لو گے۔ انہوں نے اپنے سامنے یہ سارا کچھ دیکھا کہ قیامت آ رہی تھی۔ یہ جو چیز ہے' عزیزانِ من!

---

[1] قیامت تو آ ہی گئی۔ وہ تو خود بخود آ ہی جاتی ہے۔

سامنے کی قیامت' اور سامنے کا جہنم' یہ نہ دیکھا جائے تو پھر انسان تمام عمر اس اضطراب میں رہتا ہے:

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے ❶ وہ دو شعر بڑے ہی دلچسپ ہیں۔

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت

کیا بات ہے اس شخص ❶ کی! واعظ جو دوسروں کو کافر بناتا جاتا تھا اور ہر کافر کے متعلق یہ کہتا تھا: یہ بھی جہنم میں' یہ بھی جہنم میں' وہ یہ کہتا چلا جا رہا تھا:

حدیثِ خوش تر از وے کافرے گفت

اس سے بھی زیادہ ایک خوش تر بات ایک کافر نے کہہ دی' جو یہ کہہ رہا تھا:

نداند آں غلام احوالِ خود را

کہ دوزخ را مقامِ دیگراں گفت

یہ خود دوزخ کے اندر کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ دوزخ دوسروں کا مقام ہے۔ اپنے دوزخ کو نہیں دیکھ رہا' جس میں یہ کھڑا ہے۔ ہم سب اپنے اپنے دوزخ میں کھڑے ہیں' عزیزانِ من! اور دوسروں کے متعلق فتوے صادر کر رہے ہیں: یہ بھی جہنمی' یہ بھی جہنمی' یہ بھی جہنمی' اور جس جہنم میں یہ کھڑا ہے' اسے یہ نہیں پتہ کہ **كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ** ❷ (78:4-5)۔ ہم تو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! مجھے خوشی ہوئی کہ آج اس سورۃ کی ابتدا ہم نے کر لی۔ اب آگے سمجھنے کے راستے کھل جائیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

❷ لیکن ان کی یہ تذبذب اور اختلاف کی کیفیت زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی۔ انہیں اس کے متعلق جلد معلوم ہو جائے گا۔ پھر سن لیجیے کہ یہ حتمی اور یقینی بات ہے کہ انہیں اِس کے متعلق جلد معلوم ہو جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دوسرا باب: سورۃ النباء (آیات 6 تا 22)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1984ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النبا کی آیت 6 سے ہو رہا ہے: (78:6)

سابقہ درس کا خلاصہ

''النبا'' کے متعلق میں نے سابقہ درس میں عرض کیا تھا کہ حق و باطل کی وہ کشمکش، جس کا سلسلہ دراز حضرتِ نوح علیہ السلام سے شروع ہوا تھا، نبی اکرم ﷺ کے دَور میں آ کر وہ یوں کہیے کہ آخری مراحل میں داخل ہوا۔ خود حضور ﷺ کی تئیس سالہ نبوت کی زندگی میں اور پھر ان کے آخری ادوار میں تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ جو قرآنِ کریم کی آخری سورتیں ہیں، بالخصوص انتیسویں اور تیسویں پارے کی سورتیں ہیں، ان میں تو نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں اس کشمکش کے جو آخری مراحل تھے یہ ان سے متعلق ہیں، اور انہی کے لیے میں نے پہلے کہا تھا کہ تیسویں پارے کی یہ، جو **عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ** آیتیں ہیں، ان میں یہ النبا العظیم وہ انقلابِ عظیم ہے جو نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے رفقا رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں برپا ہونے والا تھا۔ اس کے متعلق ویسے تو تفصیلاً میں نے عرض کیا تھا لیکن آج میں ایک لفظ ''نبا'' سے اس درس کا آغاز کرتا ہوں۔

لفظ نبا کی وضاحت

عزیزانِ من! اِس ایک لفظ ''نبا'' کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔ عربی زبان کی رو سے اس کے دو مادے (Roots) ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان تو چلتی ہی مادوں پہ ہے۔ یوں سمجھیے کہ جیسے یہ پودوں کی جڑیں ہوتی ہیں۔ ایک مادہ تو ہے

''ن ب ا'' اور دوسرا ہے ''ن ب وٗ''۔ اس کا جو مادہ ''ن ب اٗ'' ہے' اس کے معنی ہوتے ہیں ''خبر''۔ اسی سے جو لفظ ''نبی'' بنا ہے' اس کے معنی ہیں ''خبریں دینے والا''۔ یہودیوں کے ہیکل میں ایک منصب تھا' ایک پروہت تھا۔ وہ قسمت کے حال بتایا کرتا تھا' پیشگوئیاں کیا کرتا تھا' خبریں دیا کرتا تھا۔ اس کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ جو قسمت کا حال بتانے والا ہوتا ہے اس کا تو مقام بلند ہوتا ہی ہے۔ وہ لوگ اس کو نبی کہا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا ترجمہ پیشگوئیاں کرنے والا ہوا۔ جب ہمارے ہاں اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوا تو نبی کو Prophet کہنے لگے اور نبوت کو Prophecy یا Prophethood۔ آپ جانتے ہیں کہ Prophecy پیشین گوئی کو کہتے ہیں تو اس طرح Prophet پیشین گوئیاں کرنے والا ہوا۔ یہ اس کا منصب آ گیا۔

قرآنِ کریم نے اپنے ہاں جو یہ لفظ استعمال کیا ہے' یہ ''ن ب وٗ'' کے مادے سے ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: مقامِ بلند پر کھڑا ہونے والا۔ اور یہ عجیب چیز ہے۔ صرف ایک لفظ سے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ مقامِ نبوت کیا ہے اور منصب نبوت کیا ہے؟ اس کی عملی تشریح تو نبی اکرم ﷺ نے جب قریش کے سامنے اپنا پہلا پیغام پیش کیا ہے اُسی میں کر دی تھی۔ آپ اس کا انداز دیکھیے کہ کس طرح عملِ رسول اللہ ﷺ قرآن کے ان نکات کی وضاحت کر جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر ان کو آواز دی تھی اور چونکہ آپ امین کے اعتبار سے مشہور و مقبول تھے تو ان کی آواز پر یہ قریش بھاگے ہوئے وہاں چلے آئے کہ ایک امین کی آواز ہے' معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ گویا نبوت سے پہلے ہی آپ ﷺ کو مقام تو یوں حاصل ہو گیا ہوا تھا۔ بہر حال وہ آئے تو آپ نے یہ فرمایا کہ اگر میں تم لوگوں سے کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک بہت بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے اور تم تباہ ہو جاؤ گے تو کہو تم میری بات مانو گے' اسے تسلیم کرو گے کہ میں ٹھیک کہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' ہم تسلیم کریں گے۔ ایک تو یہی بات تھی کہ حضورؐ امین اور صدیق تو تھے ہی۔ دوسری بات کے لیے انہوں نے کہا: اس لیے یہ مانیں گے کہ آپؐ اس مقام پہ ہیں جہاں سے آپ دوسری طرف بھی دیکھ سکتے ہیں اور اِدھر بھی دیکھ سکتے ہیں اور ہم اس مقام پہ ہیں جہاں ہم صرف اس طرف دیکھ سکتے ہیں' دوسری طرف نہیں دیکھ سکتے۔ عزیزانِ من! تو نبی وہ ہے۔ جو اس مقامِ بلند پہ کھڑا ہوتا ہے جہاں ایک طرف وہ عالمِ امر کے متعلق معلومات' وحی کے ذریعے' حاصل کرتا ہے اور پھر وہ ان کو عالمِ خلق کی طرف Convey (پہنچاتا) کرتا ہے۔ سو اس اعتبار سے پہاڑی کی یہ سمت ہو گئی۔ نبی اکرمؐ نے تو اپنے پہلے ہی پیغام میں نبوت کے معنی واضح کر کے رکھ دیئے۔ ہمارا نبی پیش گوئیاں کرنے والا یا Prophet نہیں ہوتا لیکن ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ انگریزی زبان کے قرآنِ کریم کے جتنے ترجمے آپ لیں گے ان میں نبی کو Prophet' نبوت کو Prophecy یا Prophethood' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو Prophet Muhammad ﷺ کہا گیا ہے۔ انگریزی کے یہ الفاظ آپ ہر ایک کی زبان پہ سنیں گے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم یہ کس چیز کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ہم تو یہودیوں کے نبی کا یہ ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ تو مقام ہی اور ہے۔ اس مقام کے لیے' تو بہر حال' جب میں نے سیرت نبی اکرم ﷺ رقم کی تو اس کا نام معراجِ انسانیت رکھا تھا: بلند ترین مقام۔ میرے ذہن میں یہی

آ سکتا تھا اگرچہ حضور ﷺ کا مقام تو اس سے کہیں بلند ہے۔ بہرحال قرآنِ کریم کی رو سے جہاں نبی کے متعلق ذکر آئے گا تو وہ Prophet نہیں ہوگا' وہ Prophecy کرنے والا نہیں ہوگا' پیشین گوئیاں کرنے والا نہیں ہوگا بلکہ وہ انسانیت کے مقامِ بلند پہ کھڑے ہونے والا ہوگا۔ یہ Prophecies پیشن گوئیاں ہی تو ہیں جس نے مرزا غلام احمد (1835-1908) جیسے کو نبی بنا کر رکھ دیا۔ وہ اپنی نبوت کا سارا مدار ہی پیشین گوئیوں پہ رکھ رہا ہے اور برملا یہ کہتا سنائی دے رہا ہے کہ دیکھیے' یہ پیشین گوئی پوری ہوئی' وہ پیشین گوئی پوری ہوئی' اگرچہ پیشین گوئیاں یہی ہوتی ہیں کہ زلزلہ آئے گا' طوفان آئے گا' سیلاب آئے گا۔

پیش گوئیوں کی حقیقت

آپ کے ہاں یہ جتنے بڑے بڑے اولیا کرام ہیں' ان کی کرامات میں بات ہی یہی ہے کہ وہ صاحب آنے والے حالات کا پتہ بتا دیتے ہیں' قسمت کا حال بتا دیتے ہیں' غیب کی خبر بتا دیتے ہیں۔ Prophecies (پیش گوئیاں) تو ہمارے ہاں یہودیوں کے ہیکل کے ایک منصب کے حوالے سے چلی آ رہی تھیں۔ اسلام میں Prophecy (پیش گوئی) کا سوال نہیں ہے۔ اگر وہ مستقبل کی ایسی چیز ہے کہ جس کا علم' انسانی ذرائع علم کی روسے' حاصل نہیں کیا جا سکتا تو وہ علمِ غیب ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تھی بہرحال **اَلنَّبَاِ الْعَظِيْمِ** (78:1)۔

عزیزانِ من! یہ جو 'نبا' ہے' یہ ''ن ب ا'' سے ہے۔ اس کے معنی ہیں خبر' انقلابی خبر۔ تو اس کے متعلق یہ بات چلی آ رہی تھی کہ یہ کشمکش اب آخری دور میں داخل ہو گئی ہے۔ قرآنِ کریم کا یہ انداز مسلسل چلا آ رہا ہے۔ جہاں وہ اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے کہ تمہاری غلط روش قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اس قسم کے تخریبی نتائج پیدا کرے گی تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہاں تمام سلسلہ قانون کے تابع چل رہا ہے اور قانون یہ ہے کہ گندم از گندم بروید جو ز جو' گندم بوؤ گے تو گندم اُگے گی' جو بوؤ گے تو جو اُگے گی' جس قسم کا بیج ڈالو گے اسی قسم کی وہ فصل ہوگی' وہی اس کا پھل ہوگا' جس قسم کا تمہارا عمل ہوگا اسی قسم کا نتیجہ ہوگا' جیسا تمہارا نظام ہوگا اسی قسم کا معاشرہ مرتب ہوگا۔ یعنی یہ ہے اصولی چیز جو قرآن بیان کرتا ہے۔ اسے یاد رکھیے' شروع سے آخر تک یہی ایک چیز ہے جو قرآن دہرائے جا رہا ہے۔ اس کے لیے اس کے دلائل دینے کے انداز و اسالیب مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کا نقطہ ماسکہ' بنیادی نقطہ' یہی ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اب انسانی زندگی میں جہاں دھوکا لگتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی اس طبعی زندگی میں تو بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات نتائج سامنے نہیں آتے تو اس نے اس کے لیے یہ کہا کہ انسان کی زندگی اسی طبعی دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے' یہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور جو آگے چلتی ہے تو وہ اپنے اعمال کا پشتارہ اپنی کمر پہ لادے' یوں کہیے' آگے بڑھتی ہے۔ وہ مرتب ہی ہوتی ہے اس کے اعمال سے جو اس دنیا میں اس نے کیے ہوتے ہیں اور ان کا محسوس مظہر اخروی زندگی یا قیامت کی زندگی میں سامنے آئے گا۔ یہ ہے ملخص قرآن کی تعلیم کا۔ پہلی آیات میں قرآن

نے یہ بتا دیا کہ اب یہ خود اپنے متعلق ڈھلمل یقین ہو گئے ہیں۔ بڑی عجیب چیز تھی۔

ایمائیت کی اہمیت

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ ادبی اعتبار سے بھی، ادب میں اور خاص طور پہ شاعری میں، ایک چیز ہوتی ہے جسے Suggestiveness (ایمائیت) کہتے ہیں یعنی بات واضح الفاظ میں نہ کہنا بلکہ اشارے میں بات کہنا اور یہ تمہارے اپنے شعور پہ چھوڑ دینا کہ تم خود صحیح نتیجے پہ پہنچ جاؤ۔ ادب میں یہ بڑی لطیف چیز ہوتی ہے اور بڑی ہی ایسی گویا ذوقِ سلیم کو جا کر اپیل کرنے والی ہوتی ہے۔ اگر ایمائیت کسی شعر میں یا کسی ادب کے فقرے میں آئے تو لطف آتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ادبی اعتبار سے بھی قرآن کی کوئی مثل نہیں ملتی۔ قرآن نے ایمائیت کا جو انداز بیان کیا تھا وہ بڑا ہی عجیب اور لطیف انداز تھا۔ کہا تھا کہ **عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ** (78:1) اب یہ کس بات پہ چہ میگوئیاں ہیں؟ کہنا اس نے یہ تھا کہ اب وہ جوان کا پہلا یقین تھا جس کو لیے ہوئے یہ مقابل میں آئے تھے کہ ''یہ ہیں کیا''، ہم انہیں مسل کر رکھ دیں گے، کچل کر رکھ دیں گے، ہم حق پر ہیں، ہمارے پاس قوت ہے اور اس میں انہیں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا، کوئی تذبذب نہیں تھا، یہ ایک چٹان کی طرح سامنے آئے تھے۔ قرآن کہہ یہ رہا ہے کہ اتنے عرصے کے بعد جو متعدد طور پر ان کو شکستیں ہوئیں، خود ان کے اپنے اندر حالات نے تبدیلی کی، اب یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ یہ اس کے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے ہیں کہ یار! بات کچھ ٹھیک بھی ہے، یہ سچے ہی نظر آتے ہیں۔ تو قرآن نے بات یہ کہی ہے کہ جب کسی قوم کی زندگی میں یہ مرحلہ آئے کہ اس کے اپنے مقصد کے متعلق تذبذب پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ اس قوم کو شکست ہو گئی۔ یہ کتنی بڑی عظیم چیز ہے، اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ **الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ** [1] (78:3)۔ چہ میگوئیاں اور تذبذب ہی نہیں ہے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ بس کسی قوم کے اندر کسی مقصد کے متعلق، کسی محاذ کے متعلق، جونہی اختلاف ہوا بس یہ سمجھیے کہ یہ اسکی شکست کا پیش خیمہ ہے۔ دیکھا آپ نے قرآن نے بات کیا کہی ہے! اور اصول کتنا بڑا عظیم دیا ہے، لیکن انداز وہی Suggestiveness (ایمائیت) کا استعمال کیا ہے۔

ہمارے ہاں قیامت کا تصور اور اس کی آمد کی تواریخ

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں قیامت کا تصور یہ ہے کہ اس دنیا کے آخری وقت میں کہتے ہیں کہ پہاڑ ٹکرائیں گے، زمین پھٹ جائے گی، آسمان ٹوٹ جائے گا۔ ٹھیک ہے وہ تو ہونا ہے لیکن یہ وہ قیامت نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ** (78:4) یہ اس انقلاب کو ابھی دیکھ لیں گے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ ابھی ہے کیونکہ قرآن اسے

---

[1] (اس عظیم واقعہ کے متعلق) اُن کے خیالات مختلف ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔

سیعلمون کہتا ہے اور اتنے زور سے یہ کہا ہے کہ **ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ** (78:5) ارے! اس بات کو پھر سن لو کہ یہ ابھی ہے، یہ کوئی دُور کی بات نہیں ہے، ابھی آنا چاہتی ہے۔

جہاں تک اُس آنے والی قیامت کا تعلق ہے، ہمارے ہاں تو یہ سلسلہ بعد میں ہوا، عیسائیوں کے ہاں ایک دَور آیا جس میں کہا گیا کہ قیامت آنے والی ہے۔ یہ 1740ء میں آئے گی۔ جرمنی کا ایک پادری تھا۔ اس نے حساب لگا کر یہ کہا کہ 1836ء میں قیامت آ جائے گی۔ اب جناب وہ جو 1836ء کے قریب قریب آنے کے دن تھے، لوگوں نے گھر بار چھوڑا، شہر چھوڑا، باہر جنگلوں میں چلے گئے، گویا قیامت شہروں میں ہی تو آنی ہے۔ جنگلوں میں چلے گئے، وہ بیچارے اور کیا کرتے۔ اس قوم کے اندر، ان ملکوں کے اندر، یورپ کے اندر، عجیب افراتفری مچ گئی۔ وہ 1836ء گزر گیا تو پھر دوسرے پادری اٹھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، حساب میں کوئی تھوڑی سی غلطی لگ گئی تھی، یہ اصل میں 1843ء میں آئے گی اور پھر وہی قیامت کا سماں بندھ گیا۔ وہ 1843ء کی تاریخ بھی گزر گئی۔ انہوں نے پھر حساب لگایا تو کہا کہ یہ 1847ء میں آئے گی۔ وہ سال بھی گزر گیا۔ انہوں نے پھر کہا کہ یہ فلاں سال میں آئے گی۔ اب جو ایک پہلا غلطی کر گیا ہے اس کو لیے چلے جا رہے ہیں۔ اس کو جھوٹا کیسے کہہ دیں۔ کہنے لگے کہ 1861ء میں آئے گی، اور جب وہ 1861ء میں بھی نہ آئی تو تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا، پھر کسی اور نے کوئی پیشین گوئی نہیں کی۔ آج کل وہ بات نہیں رہی۔ ہم سے پوچھیے، ہر دوسرے سال، تیسرے سال، شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے ہیں، لوگ جمع ہیں، دیکھ رہے ہیں میری عمر کے بڑے بوڑھے اس کی تائید کریں گے اور ان میں لکھا ہوتا ہے خادمِ حرمین الشریفین نے یہ لکھا ہے۔ ''کہ قیامت آنے والی ہے، طوفان آئے گا، پہاڑ ٹوٹیں گے۔ یہ ہوگا وہ ہوگا'' یہ بڑا لمبا چوڑا ہوتا تھا۔ پھر نیچے ہوتا تھا کہ یہ کچھ خواب آیا ہے۔ وہ کوئی احمد تھا انہیں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت سے کہہ دو کہ اب وہ نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں یعنی وہ قیامت جو آنے والی ہے اس کو کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر رہے ہیں۔ یہ کچھ ہوا کرتا تھا پھر وہ بھی کئی سال ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ سلسلہ بھی اب ختم ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! قربِ قیامت کے متعلق یا قیامت کے متعلق جو ساعت ہے اس پہ آپ کے ہاں، قربِ قیامت کی نشانیاں نام کی کئی کتابیں ہیں اور ان میں یہی کچھ رقم ہے۔ قرآن کی النبا العظیم یا اس کشمکش حق و باطل کی جو آیات ہیں، ان پہ کسی کی نگاہ نہیں گئی۔ اس نے تو کہا ہے کہ **كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ** [1] (78:5)۔ آج سے چودہ سو سال پہلے اس نے قریش سے یہ کہا ہے اور ہم اس آنے والی قیامت کے متعلق یہ نشانیاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ بہر حال یہ وہ انقلابِ عظیم تھا۔ اب یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن پھر اسی انداز کی طرف، اسی اسلوب کی طرف آ گیا۔ وہ خارجی کائنات میں جو سلسلہ جاری و ساری ہے وہ قانون کے زور پہ چلتا ہے، اس لیے وہ ہمیشہ پہلے خارجی کائنات کے

---

[1] لیکن ان کی یہ تذبذب اور اختلاف کی کیفیت زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی۔ انہیں اس کے متعلق جلد معلوم ہو جائے گا۔

شواہد پیش کرتا ہے اور دوسرے تاریخی شواہد اقوامِ سابقہ کی زندگیوں کے ہوتے ہیں۔ تو یہاں اتنا کچھ کہنے کے بعد پھر کہا کہ **کَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ** ❶ (78:5)۔ اب وہ اپنے اس انداز پہ آیا کہ ان سے کہو کہ اُس آنے والے انقلاب کو سمجھنے کے لیے' ذرا نظامِ کائنات پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس میں ہمارا قانون کس حسن وخوبی سے کارفرما ہے۔ سب سے پہلے یہ **اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا** (78:6) ذرا اس زمین پہ نگاہ ڈالیں جس پہ یہ بستے ہیں۔ یہ گول ہے اور نہایت تیزی سے گھوم رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہم نے اسے ان کے لیے گھوارۂ آسائش بنادیا ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قانون کی زنجیریں کتنی محکم ہیں۔

صدیوں پہلے قرآنی حقائق کا انکشاف

میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا' شاید پچھلی دفعہ بھی کہا تھا' کہ آج سے چودہ سوسال پہلے' جب پورے کرّہ ارض میں زمین کے متعلق ابھی یہ تصور نہیں تھا کہ زمین گھومتی ہے (اور وہ بھی) عرب کی سرزمین میں جہاں عام نوشت وخواند کا ذریعہ بہت ہی محدود تھا' علم تو ایک طرف رہا' ارض کے متعلق یہ کچھ کہنا' کچھ بعید از قیاس سا تھا۔ قرآن میں اس کے گھومنے کے متعلق تین چار مرتبہ یہ چیز آئی ہے' کم از کم ایک حوالہ تو ابھی میرے سامنے ہے۔ وہ (31:10) ہے۔ اس میں کہا ہے کہ **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ** ❶ (31:10)۔ اس آیت میں ”تمید“ کے ساتھ ”بکم“ عجیب چیز ہے: ”وہ تمہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے گھوم رہی ہے۔“ کسی گھومنے والی چیز کے اوپر ہم بیٹھے ہوئے ہوں تو ہمیں ایسا چکر آئے گا' اور پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ گھوم رہے ہیں' لیکن قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تمہیں ساتھ لیے ہوئے گھوم رہی ہے اور ہے بھی گھوارۂ آسائش (78:6)۔ چودہ سوسال پہلے عرب کی سرزمین میں ایک شخص جو نبوت ❷ سے پیشتر ان پڑھ تھا' وہ یہ بات کہہ رہا ہے کہ زمین گھوم رہی ہے اور ”بکم“ ہے یعنی تمہیں ساتھ لیے

---

❶ پھر سن لیجیے کہ یہ حتمی اور یقینی بات ہے کہ انہیں اس کے متعلق جلد معلوم ہوجائے گا۔

❷ اس کی قوتوں اور محکم تدبیروں کا اندازہ لگانا ہو تو کارگہہ کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح' فضا کی پہنائیوں میں' اس عظیم الجثہ کرّوں کو' بغیر ایسے ستونوں کے جو کسی کو نظر آسکیں' تھام رکھا ہے (یعنی غیر مرئی کشش ثقل کے ذریعے) اور زمین میں اتنے اتنے بڑے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں' لیکن اس کے باوجود' وہ اپنی رفتار کیمطابق گھومتی رہتی ہے اور تم اس پر اطمینان سے بیٹھے رہتے ہو (16:15)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے پڑھے لکھے (Unlettered) تھے؟ اس سلسلے میں ایک گروہ کا کہنا ہے کہ (ا) آپ بالکل لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اس کے خلاف دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نبوت سے پہلے آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس کی شہادت خود قرآن کریم (29:48) میں موجود ہے: ”تو (اس قرآن کے نزول) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔“ قرآنِ کریم میں خود عربوں کو بھی امی کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ لوگ جنہیں قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں دی گئی تھی۔ اس لیے یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے (دیکھیے 3:74; 3:19) عرب میں یہود ونصاریٰ اہل کتاب کہلاتے تھے اور وہ لوگ جو کوئی [باقی اگلے صفحے پر]

ہوئے ہے۔ یہ دو تین مرتبہ قرآن کے اندر دہرایا گیا ہے۔ یہاں اس تَمِیۡدَبِکُمۡ (31:10) کی بجائے لفظ ''مھدً ا'' (78:6) لایا گیا ہے۔ بات وہی ہے: بچے کا پنگوڑا حرکت میں بھی ہے، جنبش میں بھی ہے، سکون بخش رہا ہے، اس کی نیند میں خلل بھی نہیں آتا بلکہ اس کو اس حرکت سے نیند آجاتی ہے۔ آپ کی یہ زمین رات کو پنگوڑا بنتی ہے۔ یہ اس تیزی سے گھوم رہی ہے کہ اگر آپ کو اس کا احساس ہو جائے تو سونا تو ایک طرف رہا، آپ زندہ بھی نہ رہ سکیں، لیکن قرآن نے اس کو تَمِیۡدَ بِکُمۡ (31:10) کہا ہے۔ وہ اسے مھدًا (78:6) بھی کہتا ہے۔

عزیزانِ من! زمین کو مَھٰدًا کہنے کے فوراً بعد کہا کہ وَالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ❶ (78:7)۔ ہمارے ہاں ابھی تک اس نکتہ پہ زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ ہمارے ہاں اس سے مراد دنیا کے سائنس دان ہیں جنہوں نے علم الارض (Geology) پر بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے متعلق وہ اب تحقیق کرنے شروع ہوئے ہیں، کہ زمین کی اس ساخت یا ہئیت میں پہاڑوں کا کیا رول (Role۔ کردار) ہے۔ یہ پہاڑ جو Role play (کردار ادا) کر رہے ہیں، ابھی تک اس پر پوری تحقیق نہیں ہو سکی۔ وہ اس تحقیق پر لگے ہوئے ہیں۔ قرآن نے جہاں بھی ارض کے متعلق کہا ہے کہ یہ اس طرح گھومتی ہے، وہاں ساتھ ہی پہاڑوں کا بھی ذکر کیا ہے اور کچھ یوں کیا ہے کہ جیسے یہ اس میں میخیں گڑی ہوئی ہیں اس کا بیلنس (توازن) قائم رکھے ہوئے ہیں۔

زمین کی ہیئت کے متعلق مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر کا فتویٰ

میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں تو اس تحقیق کی صورتِ حال کچھ یوں دگرگوں سی ہے۔ شاید تھوڑا ہی عرصہ ہوا، مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر بن باز نے یہ فتویٰ شائع کیا تھا کہ کوئی شخص جو یہ کہے کہ زمین گھومتی ہے یا گول ہے تو پہلی چیز یہ ہے کہ اس کی بیویوں پہ طلاق ہو گئی یعنی کہے وہ اور طلاق پڑے بیوی پہ۔ اور پھر دوسری چیز یہ کہ اس کے بعد وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، وہ مرتد ہوا۔ آج بھی آپ کے ہاں اسلام کی تعلیم کا جو مرکز ہے اس کی یونیورسٹی کا چانسلر یہ کہہ رہا ہے تو آپ سوچیے کہ اس زمانے میں اگر یہ بن باز صاحب کے اسلام کے مطابق چلیں اور یہ تسلیم کریں کہ زمین گھومتی ہے، تو وہ جو شادی شدہ نہ ہوں، وہ تو مان لیں، ان کا کچھ نہیں بگڑے گا، مگر شادی شدہ کا تو کچھ رہتا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو چھوڑ دیجیے ہم تو وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ ابھی تک یورپ کے سائنسدان بھی، علم الارض کے متعلق،

[گزشتہ سے پیوستہ] ---------------------------------------

آسمانی کتاب رکھنے کے مدعی نہیں تھے، ان کے مقابلہ میں ''غیر اہل کتاب''، یعنی امی کہلاتے تھے۔ (حوالہ کے لیے دیکھیں: پرویزؒ لغات القرآن (جلد اول)، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1960ء ص۔ 262) اور (3) تیسرے گروہ کا اس پر یقین ہے کہ آپ پہلے ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عربی النسل ہونے کے ناطے عربی دان بھی تھے۔ آپ کو ان لوگوں کے درمیان مبعوث فرمایا جو امیین کہلاتے تھے یعنی جاہل یا ان پڑھ نہیں تھے بلکہ جن کے پاس اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی (حوالہ کے لیے دیکھیں: منظور احمد: النبی الامی بہ حیثیت معلم عالمین، ونکو پبلشرز، کراچی 2005۔)

❶ اور پہاڑوں کو اس قدر محکم، گویا وہ میخیں گڑی ہوئی ہیں۔

اس مقام پہ نہیں پہنچے جہاں وہ پہاڑوں کا کردار توازن قائم رکھنے کے لیے محکم طور پر بتا سکیں۔ وہ یہ ساری چیزیں بتائیں گے۔

قرآن کا ہر دعویٰ سچ ثابت ہوگا

عزیزانِ من! قرآن نے کہا یہ ہے کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) خارجی کائنات اور انسانوں کی اپنی دنیا کے اندر ہماری آیات پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے۔ ہر پردہ جو اٹھے گا' وہ اس حقیقت کی دلیل بن جائے گا کہ قرآن نے جو کہا تھا سچ تھا۔ خدا تو قرآن کے حقائق کے ثبوت میں بات ہی یہ پیش کر رہا ہے کہ خارجی کائنات کے حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جائیں گے اور اس کے تمام دعاوی سچ ثابت ہوتے چلے جائیں گے۔ وقت آئے گا جب یہ چیزیں بھی سامنے آجائیں گی کہ یہ جو ارض کے ساتھ' قرآن نے جبال کا یا پہاڑوں کا ذکر کیا ہے' ان کا کیا رول (کردار) ہے۔ بہرحال ہم تو یوں ہی گزر جائیں گے' ہمارا تو ابھی یہ میدانِ خصوصی مہارت (Field of Specialization) بھی نہیں ہے۔

عورتوں کی پیدائش اور ان کے حقوق کے متعلق ہماری سوچ

عزیزانِ من! اب ہماری اگلی بات آگئی' آپ قانون ملاحظہ فرمایئے: وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ❶ (78:8)۔ اس آیت میں دو الفاظ ہیں۔ پہلے جو کچھ ہوا' اس کو تو چھوڑ دیجئے' اب اِسے دیکھیے۔ آج آپ کے اِس دور میں اس مسئلے نے بے حد شدت اختیار کر لی ہے کہ عورتوں کے حقوق کیا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج اس پہ کس قدر بحثیں' مذاکرے' سیمینار ہوتے ہیں اور پھر اس کے مطابق قوانین بن رہے ہیں مگر ان کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ آپ حقوق بتا رہے ہیں' مگر یہاں جان کا ذکر کیا' یہاں تو دھڑ ہی غائب ہے گریباں سے۔ وہ انسان ہی نہیں ہے۔ اس کی شہادت ہی معتبر نہیں اور اگر کہیں ''قیمت'' دینی پڑ جائے' جسے دیت کہتے ہیں' تو مرد کی قیمت سے عورت کی آدھی قیمت ہوگی۔ آج کل ❷ آپ کے ہاں یہ مسائل ہیں' آپ کے ہاں قوانین بن رہے ہیں' میرے پاس بھی بہرحال یہ آتی رہتی ہیں تو میں نے تو یہ کہا کہ صاحب! یہ اس مسئلے کو جو لیے پھر رہے ہیں ان سے پہلے تو یہ پوچھیے کہ یونائیٹڈ نیشن (اقوامِ متحدہ) کا 'UNO' کا' جو چارٹر ہے' اس کے جو Basic Human Rights ہیں' بنیادی حقوقِ انسانیت ہیں' تو بتایئے کہ کیا اس ہیومن (Human) میں عورتیں شامل ہیں یا نہیں؟ آپ کی حکومت نے اس چارٹر پہ دستخط کیے ہوئے ہیں۔ تو میں نے بیبیوں سے کہا تھا کہ آپ خواہ مخواہ کے لیے یہ جلوس نکال رہی ہیں اور اس قسم کے احتجاج پیش کر رہی ہیں' وہ جو انسانیت کے حقوق ہیں ان میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پہ داخل

---

❶ (پھر ان سے کہو کہ تم اس خارجی کائنات سے ہٹ کر' خود اپنی دنیا کی طرف آؤ اور دیکھو کہ) ہم نے تمہیں کس طرح جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ یعنی نر (Male) اور مادہ (Female)' جن سے تمہاری نسل کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔

❷ مئی 1984ء کی بات ہے۔

ہیں۔ UNO (یواین او) نے تو یہ چیز کی۔ انہوں نے دستخط کر دیئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ حقوق آپ کو یہاں نہیں مل رہے تو ان سے کچھ کہنے کی بجائے UNO (یواین او) سے کہیے کہ بحیثیت انسان انہیں جو حقوق حاصل ہیں' یہ اس پہ عمل نہیں کر رہے۔ اب یہ تو یہ کرنے سے رہے کہ انسان کی شق سے عورت کو الگ کر دیں' انسان تو ماننا پڑے گا اور وہ جو حقوق ہیں وہ متعین کر دیئے ہیں۔ یہ آپ کی کسی شرعی عدالت نے نہیں کیے' UNO (اقوامِ متحدہ) نے کر دیئے ہیں' انہوں نے دستخط کیے ہوئے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ ایک تو اس کے اندر بحیثیت عورت یہ برابر کے حقوق ہیں' اور دوسرے حقوق ہیں بحیثیت بیوی۔ قرآن نے نکاح کو معاہدہ قرار دیا ہے۔ یہ معاہدہ کرتے وقت جو بھی حقوق آپ چاہتی ہیں اس میں لکھوالیجیے۔ اس کے لیے آپ کو اس طرح سے مذاکرے کرنے کی' جلوس نکالنے کی' Demonstration کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل ہمارے ہاں Women Rights Commission (خواتین حقوق کمیشن) بیٹھا ہوا ہے۔

قرآنِ کریم میں دو الفاظ میں بات آئی تھی کہ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً [1] (78:8)۔ یہ ''ازواجاً'' دراصل زوج کی جمع ہے۔ پہلے یہ دیکھیے کہ یہاں خَلَقْنٰكُمْ آیا ہے یعنی پوری نوعِ انسانی سے یہ کہا گیا ہے: تمہیں ہم نے ازواج پیدا کیا۔ اب اس انسانیت میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں یعنی ان کو ازواج پیدا کیا ہے۔

زوج کا لفظ عورت اور مرد دونوں کے لیے آتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ ازواج دراصل زوج کی جمع ہے۔ ہمارے ہاں تو اب زوج کا یہ لفظ زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتا' صرف زوجہ ہی ہوتا ہے اور زوجہ بیوی ہوتی ہے' مرد ہوتا نہیں' مثلاً زوجہ فلاں۔ عربی زبان میں زوج ان دو چیزوں کو کہتے ہیں کہ جس ایک کے بغیر دوسری کی تکمیل نہ ہو سکے' وہ ناکارہ رہ جائے۔ ٹانگے کے دو پہیوں میں سے ہر پہیہ ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے۔ خلقنٰکم میں پوچھیے کہ یہ ''کُمْ'' کے کیا معنی ہیں۔ یہ پوری انسانیت کے لیے آیا ہے۔ تم لوگوں کو کیسے پیدا کیا؟ ازواجاً ہی پیدا کیا ہے۔ تم کو عورت اور مرد کو اس طرح سے خلق کیا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی' وہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان پہیوں کا یکسر برابر ہونا' مساوی ہونا' ایک انچ کا بھی فرق نہ پڑ جائے ضروری ہے۔ ایک پہیے کا دوسرے پہیے کے مقابلے میں یکسر مساوی ہونا ضروری ہے۔ اگر نہ ہوا تو گاڑی بہر حال چلتی نہیں ہے' اک پاسے جنوں کیندے پاس پے جاندی اے۔ پوچھونئیں اوس گڈی دا ہوندا کی اے۔ [2] اور اگر پہیہ ہی ایک ہو تو گاڑی نہیں چلتی اور اگر ایک پہیہ گول ہو دوسرا پہیہ چوکور ہو تو کر لو جو کرنا ہے' چلا لو گاڑی' نہیں چلے گی۔

---

[1] ہم نے تمہیں کس طرح جوڑے جوڑے پیدا کیا یعنی نر (Male) اور مادہ (Female) جن سے تمہاری نسل کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے (78:8)۔

[2] وہ ایک طرف الٹ جاتی ہے۔ پھر تو اس کا پوچھو ہی نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔

انہوں نے یہ چوکور پہیے رکھے ہوئے ہیں۔ چلتی ہیں گاڑیاں آپکی؟ نہیں۔ آپ کے ہاں تو پوری قوم کی گاڑیاں رکی ہوئی ہیں۔

زوج کا مفہوم سمجھے بغیر معاشرہ غیر قرآنی رہے گا

عزیزانِ من! جو عورت کے ساتھ انہوں نے یہ کچھ کیا ہے، وہ عورت کے ساتھ نہیں بلکہ خدا کی تخلیق کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا تو پوچھو ہی نہیں۔ قرآن کہتا ہے **خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً** ❶ مگر یہ کہتا ہے کہ نہیں تم اُن کو آپس میں، ایک دوسرے کو، مرد اور عورت کو زوج بناتے پھرو، ہم تو نہیں زوج بنائیں گے۔ نہ بناؤ بھئی، ان کا کیا بگاڑ لو گے، پھر دیکھ لو گے جو حشر ہوتا ہے۔ مگر قرآن کہتا ہے **خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً** ❶ (78:8)۔ عزیزانِ من! اس "کُم" سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ قرآن ہے، اس کا اپنا انداز ہے۔ یہاں سوال ہی نہیں ہے کہ الگ الگ حقوق کا تعین کیا جائے۔ نہ دو ان کو حقوق، دوسرا پہیہ ہے نہیں، چلا لو گاڑی! آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کس انداز سے اتنے اتنے بڑے مسائل اور معاملات کو ایک لفظ ازواج سے حل کر کے رکھ دیتا ہے۔ قرآن نے یہ "زوج" کا لفظ خود خاوند کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآن میں یہ ہے، تو وہ تو کرنا ہی تھا جب اس نے دونوں کو ازواج کہا ہے تو، بس، جس آئین میں، جس نظام میں، جس معاشرے میں، یہ ایک دوسرے کے زوج نہیں ہیں وہ غیر قرآنی معاشرہ ہے، وہ خدا کی مشیت کے خلاف ہے۔ اس کی تخلیق کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے: **خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً** ❶۔ قوموں پر عذاب یونہی نہیں آ جاتا، خدا کو چیلنج دینے سے عذاب آتا ہے۔ یہ چیلنجز ہیں۔ عزیزانِ من! یہ مسائل نہیں ہیں، فقہی قوانین ہیں، زندگی کے بنیادی حقائق ہیں، بنیادیں ہیں زندگی کی۔ **خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً** ایک بنیاد ہے زندگی کی۔ اس کے خلاف کرنا خدا کو چیلنج دینا ہے، نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ ایسا نہ کرنے یا ماننے سے اس کا کیا بگڑتا ہے۔ اس نے تو **خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجاً** کہا ہے۔ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔

رات کی اہمیت

عزیزانِ من! ارض کو خدا نے پنگوڑے کی طرح کہا ہے۔ **وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ○ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاساً ○ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا** ❷ (78:9-11)۔ رات آتی ہے تو تاریکی ایک قسم کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ دیکھا ہے کہ عام طور پہ سامنے لیمپ روشن ہو یا

---

❶ ہم نے تمہیں کس طرح جوڑے جوڑے پیدا کیا یعنی نر (Male) اور مادہ (Female) جن سے تمہاری نسل کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے (78:8)۔

❷ پھر رات اور دن کے تغیرات پر غور کرو۔ دن میں تم تلاش معاش (کاروبار) کرتے ہو۔ اُس سے تھک جاتے ہو تو رات کی تاریکی ایک بسیط چادر بن کر فضا پر چھا جاتی ہے اور تم اس میں چین کی نیند سوتے ہو۔ اس طرح، تمہاری صرف شدہ توانائیاں لوٹ آتی ہیں اور تم دوسرے دن پھر کام کاج کرنے کے قابل ہو جاتے ہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بلب جلتا ہوتو نیند نہیں آتی' تاریکی میں نیند آجاتی ہے۔وہ روشنی کا پردہ بن جاتی ہے۔وہ ایک ایک گھر میں' ایک ایک بلب کے اوپر' پردہ نہیں ڈالتا' وہ پورے کرہ ارض پہ یا اس حصہ پہ جس میں رات آتی ہے' تاریکی کا پردہ ڈال دیتا ہے تاکہ تم آرام سے سوجاؤ۔ **سباتاً** یعنی نیند میں یہی چیز نہیں ہوتی بلکہ صرف شدہ توانائیاں لوٹ آتی ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ کرنا ہے کہ اب سوجانا ہے' مگر دن میں تگ و تاز سے یہ جتنی طاقتیں' جتنی توانائیاں صرف ہوتی ہیں' نیند میں انسان آرام کرلیتا ہے' تو اس سے وہ لوٹ آتی ہیں۔ وہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ صاحب! رات اچھی طرح سے نیند نہیں آئی' میں تھکا ہوا اٹھا ہوں' اٹھنے کو جی نہیں چاہتا' کیا ہوا؟

نیند کیا کرتی تھی جو نیند نہیں آئی تو یہ کیفیت پیدا ہوگئی؟ ہم نے کبھی اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا کہ اگر رات کو Sound Sleep (پرسکون نیند) آگئی ہو تو آدمی کس قدر Fresh (تروتازہ) اٹھتا ہے۔ یہ Freshness (تازگی) کیا ہوتی ہے؟ وہ جو دن میں توانائیاں صرف ہوگئی ہوتی ہیں' وہ لوٹ آتی ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ **وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا** (78:11) دن کام کاج کے لیے بنایا۔اس میں جتنی توانائی صرف ہوتی ہے وہ رات کی Sound Sleep (پرسکون نیند) میں' گہری نیند میں' دوبارہ حاصل ہوجاتی ہے' توانائیاں واپس آجاتی ہیں' انسان Fresh اٹھتا ہے' تروتازہ اٹھتا ہے' پھر وہ کام کاج کے قابل ہوجاتا ہے۔آپ اس **وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا** (78:11) میں ترتیب دیکھتے ہیں کیسی خوبصورت ہے! نوم کو سبات' لیل کو لباس' اور نھار کو معاش کہا ہے اور یہ سب کچھ اٹل قانون کے مطابق ہوتا ہے' وہ قوانین جو کروں کو بھی اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔اس کے فوراً بعد کہا کہ **وَ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا** (78:12) ❶ تمہارے ہاں اس فضا کی پہنائیوں کے اندر متعدد کُرّے ہیں' یہ ان کا باہمی نظم و نسق ہے کہ جس سے یہ دن اور رات کی گردشِ دولابی جاری ہے' یہ اتنی Exactness (قطعیت) سے ہوتی ہے کہ یہاں ہم حسابی قاعدے سے بتادیتے ہیں کہ سورج اتنے منٹ' اتنے سیکنڈ' پر طلوع ہوگا' اتنے پہ غروب ہوگا' یہ سورج ہمارے حساب کی رو سے یوں نہیں ہوتا' بلکہ سورج کے حساب کی رو سے ہم اپنے ہاں یہ Calculation (حساب شمار) کرتے ہیں۔یہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔آپ کے ہاں کے انسانوں کی گاڑی کی طرح کبھی نہیں۔آپ کے ہاں گاڑی کے معنی اب ٹرین ہے۔یہ نہ وقت پہ آتی ہے' نہ وقت پہ جاتی ہے۔جب پوچھو یہ کیا ہے جو یہ لیٹ ہے' کہتے ہیں کہ ''جی ہوا پانی دا کھیل ہیگا۔کسے دے اختیار اچ تھوڑا ہیگا۔اختیار اچ ای نہیں ہیگا۔ ❷ ٹھیک ہے' وہ غنیمت ہے کہ وہ چیزیں تمہارے اختیار میں نہیں رکھیں۔ اگر کہیں سورج چاند بھی ان کے اختیار میں ہوجاتا تو پوچھو ہی نہیں کہ کیا حشر برپا ہوتا! **وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا** (78:13) ایک ہی چیز سورج میں روشنی بھی دی' حرارت بھی دی۔ہم نے دو لفظ پڑھے' زیادہ سے زیادہ ان کے یہ دو معنی لیے۔اور آگے سوچا ہی نہیں۔

---

❶ اور تمہارے سر پہ فضا کی پہنائیوں میں کیسے محکم اور مضبوط کُرّے پھیلا دیئے ہیں

❷ یہ ہوا اور پانی کا کھیل ہے۔یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

سورج کا خزینہ اور عصر کا مفہوم

سائنسدان سے پوچھو کہ حرارت کا اور روشنی کا زندگی کے ساتھ کتنا گہرا تعلق ہے۔ اب تو اس کتاب کا نام بھی شاید کہیں نہیں آئے گا جو ہمارے ہاں بچپن میں ہوتی تھی: ''زندگی، روشنی، صفائی۔'' شاید میرے معاصرین کے ذہن میں آ جائے۔ وہ نصاب کی کتاب تھی۔ پتہ نہیں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس میں روشنی، خاص طور پہ ''زندگی اور روشنی'' کا جو تعلق اس زمانے میں سمجھایا جاتا تھا، وہ دیا ہوا تھا اور پھر حرارت کا تعلق بھی دیا ہوا تھا۔ پودوں کے متعلق تو عام سیدھی سی بات ہے کہ اگر ان میں روشنی نہ پہنچے، اگر ان کو حرارت نصیب نہ ہو، تو ان میں نمود ہی نہیں ہوتی، نشو ونما ہی نہیں ہوتی۔ گویا نشو ونما کے لیے ان دو چیزوں کا ہونا نہایت ضروری ہے: روشنی اور حرارت۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ ایک ہی سرچشمہ سے، روشنی اور حرارت دونوں، تمہیں مل جاتی ہیں، وہ متعین وقت پر ابھرتا ہے، وہ متعین وقت پہ متعین راستہ ہے، جو طے کرتا ہے، متعین وقت میں جا کر غروب ہوتا ہے۔ کہا کہ کہو یہ کس قانون کی شہادت دیتا ہے؟ کیا یہ نظام ایسا ہے کہ اس میں لاقانونیت ہو، ظالم ظلم کرتا رہے کوئی پکڑ ہی نہ سکے۔ جواب میں کہا کہ نہیں، اس میں لاقانونیت نہیں ہے۔ **وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ○ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا** [1] (78:13-14)۔ کیا بات ہے! عربی زبان میں بادلوں کے لیے کئی لفظ تھے۔ مگر یہاں بادلوں کو معصرات کہنا تھا، معصرات! اس کا مادہ ''ع ص ر'' ''عصر'' ہے۔ یہ کسی چیز کو نچوڑ کر اس کے ہاں سے جتنی چیزیں ایسی ہوں جو ناکارہ ہوں، ناکامیاب ہوں، ان کو الگ کر دینا ہے اور جو کشید کیا ہوا پانی ہے اس کو اٹھانا ہے۔ کشید کیے ہوئے پانی کو بادل کہنے کی بات آج سمجھ میں آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاں سارا نظام جو فطرت کا Water works (آب رسانی) کا، چل رہا ہے، اس کی بنیاد ہی یہ ہے۔ آپ سمندر کا پانی تو ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے۔ وہ تو ہلاکت ہوتی ہے، پھر اس کے اندر جو کثافتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں، وہ ایسی نہیں ہوتیں کہ Filtration (عمل تقطیر) سے دُور ہو جائیں۔ وہ اُن کثافتوں کا محلول (Solution) کہتے ہیں۔ وہ اس میں ایسی حل ہوئی ہوتی ہیں کہ صرف کشید کرنے سے الگ ہو سکتی ہیں، Filteration (عمل تقطیر) سے نہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی ململ کا کپڑا یا اس قسم کی چیز لی، اس میں پانی ڈال دیا وہ الگ ہو گئیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جن کو گردرے [2] مادے کہتے ہیں وہ تو اس کے اندر آ جائیں گے لیکن جو اس کا حل ہوا مادہ ہے وہ اس میں نہیں آئے گا۔

---

[1] ان میں ذرا اس جگمگاتے چراغ کو دیکھو جسے سورج کہا جاتا ہے۔ اسے ہم نے کس طرح، بیک وقت روشنی اور حرارت کا سرچشمہ بنا دیا۔ اور بادلوں کو دیکھو۔ ہم ان میں سے کس طرح موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] Dusty Particles غبار اور دھول کے ذرات۔

عزیزانِ من! نظام یہ ہے کہ سورج کی روشنی، سمندر کے جتنے بھی ہلاکت آمیز زندگی کے خلاف جانے والے مادے ہیں، وہ سمندر ہی میں رہنے دیتی ہے، سورج کی کرنیں مصفی پانی کو کشید کر کے اوپر لے جاتی ہیں۔ قرآن اسے معصرات کہتا ہے جن کے ذریعے نچوڑا ہوا پانی اوپر جاتا ہے۔ یہ ہیں معصرات، اور عربی زبان کے مرادفات کیا کام دیتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ قرآن آ ہی اس زبان میں سکتا تھا۔ یہاں جو محیر العقول قانون کا نظام بتایا ہے اس کے لیے معصرات کا لفظ آ رہا ہے ورنہ اس معصرات کے لیے عربی زبان میں کوئی دوسرا لفظ بھی تو تھا۔ اس طرح سے کشید کر کے **مَآءً ثَجَّاجًا** (78:14) لے جاتے ہیں اور پھر تمہارے اوپر اچھلتا ہوا صاف مقطر پانی برستا ہے تاکہ **لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا o وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا** (78:15-16) اس میں سے اجناس بھی اُگیں، سبزیاں، ترکاریاں بھی اگیں، پھل بھی پیدا ہوں۔ ایک ہی قسم کے پانی سے مختلف اقسام کی چیزیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو چیزیں پیدا ہوتی جاتی ہیں ان کو تم دیکھتے ہو کہ یہ کیا نظام ہے، جو بیج بوتے ہو اس قسم کا پھل آتا ہے۔ بات ساری یہ کہنی تھی۔ کہا کہ اگر خارجی کائنات میں ہمارے ہاں کا یہ اصول و قانون جاری و ساری ہے تو کیا تم کہیں اس کائنات سے الگ ہو، کیا تم پہ یہ قانون نافذ نہیں ہوگا؟ اب وہ وہاں آ گیا کہ جس کے لیے یہ اتنا کچھ کہا گیا تھا لہٰذا یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ کہا کہ **اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا** [1] (78:17)۔ یہ سب کچھ ہم نے تمہیں اس لیے کہا ہے کہ یہ **یَوْمَ الْفَصْلِ** ہے۔

عزیزانِ من! کیا خوبصورت باتیں ہیں۔ چونکہ وہ نباتات، پودے، جنسیں، فصلیں، اجناس، پھل کہہ رہا تھا، فصل تو آپ کے ہاں بھی کہتے ہیں، ہمارے ہاں اسے Harvest بھی کہتے ہیں مگر عربی زبان میں "فصل" کہتے ہیں: الگ الگ کر دینے والا۔ فصل کہتے ہی اس نتیجہ کو ہیں جو عمل سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان تمام چیزوں کے بعد بتاؤ کہ تم کس نتیجے پہ پہنچتے ہو؟

یوم الفصل کیا ہے؟

قرآنِ کریم نے کہا کہ جو یوم الفصل ہے، جو Harvest کا وقت ہے، جو بونے کے بعد کاٹنے کا وقت ہے، وہ **کان میقاتًا** ہے یعنی قانون کی رو سے وہ مقرر ہے، متعین ہے۔ کسی کام کے لیے جو مقرر وقت ہوتا ہے، جو کسی چیز کا معین وقت ہوتا ہے، وہ میقات کہلاتا ہے، اور وہ مقرر ہوتا ہے۔ فصل والوں سے یہ پوچھیے کہ وہ جو وقتِ مقرر ہوتا ہے وہ کس طرح آتا ہے! اب تو معلوم نہیں کہ خارجی کائنات میں بھی

---

[1] (جب تم دیکھ رہے ہو کہ خارجی کائنات میں، ہمارے قوانین کس طرح ٹھیک ٹھیک کام کر رہے ہیں، اور کس طرح گیہوں سے گیہوں اور جو سے جو پیدا ہوتا ہے، تو اس سے تمہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خود تمہاری دنیا میں بھی ہمارا قانونِ مکافات اسی طرح کارفرما ہے۔ لہٰذا) یہ یقینی بات ہے کہ وہ انقلاب، جو کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر دے گا...... واقع ہو کر رہے گا۔ تم اسے اپنے اعمال کی فصل کاٹنے کا دن سمجھو۔ پھر جس طرح فصل کے پکنے کا ایک وقت معین ہوتا ہے، اسی طرح اس کی بھی ایک مدت مقرر ہے۔ وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یہ کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوگئی ہیں؛ ابھی اس کے متعلق یہ سائنسدان بھی کسی حتمی نتیجے پہ نہیں پہنچے ہیں۔ اس وجہ سے، یہ جو موسموں کی تبدیلیاں پہلے بالکل لگے بندھے قانون کے مطابق ہوا کرتی تھیں اب یہ بھی "Ordinances" کے ذریعے ہونی شروع ہوگئی ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کتنے عرصے تک یہ گرمی کا موسم رہے گا، کس درجہ پہ یہ خشک گرمی رہے گی، کب وہ بارش آئے گی، کب وہ ہوا چلے گی، ورنہ ہمارے ہاں کا زمیندار یوں آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ دیتا تھا کہ چوتھے دن ''پُروا''❶ آئے گا اور اس میں یہ ہوگا اور ٹھیک چوتھے دن وہ ''پُروا'' آتا تھا۔ وہ اس کی دانشمندی نہیں تھی، اس کا تجربہ تھا۔ وہ قانون تھا جس کے ماتحت یہ کچھ ہوتا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ **یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا** یہ اس میں جواب آ گیا کہ یہ جو کچھ ہمیں ڈرا رہے ہو کہ یہ ہوگا، وہ ہوگا، یوں تباہی آئے گی، تم ختم ہو جاؤ گے، وہ ہوتا کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس میں تاخیر کیوں ہے؟

مہلت کا وقفہ کیوں؟ صور پھونکنے کا مفہوم

قرآن نے کہا ہے کہ وہ جو ہم نے درمیان میں مہلت کا وقفہ رکھا ہوا ہے، تمہاری ہزار بیتابیوں کے باوجود، تمہارے طعن واعتراض کے باوجود بھی، ہم اس میں تبدیلی نہیں کرتے، ورنہ غصہ آ جاتا ہے کہ یہ جو روز آ آ کر اس طرح کی تنبیہات دیئے جاتے ہو، تو پھر وہ تباہی آتی کیوں نہیں، تم وہ تباہی لاتے کیوں نہیں ہو۔ یہ مہلت کا وقفہ بڑی چیز ہے۔ حضور ﷺ سے تو یہ کہا کہ **وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ** (73:19) برداشت کرو جو کچھ یہ کہتے ہیں۔ خود اللہ میاں کو اس میں غصہ نہیں آیا کہ اچھا! یہ کہتے ہو تو لو، یوں تو یوں ہی سہی۔ بھئی! نہیں، وہ قانون والا خدا ہے، جذباتی خدا نہیں ہے۔ اسے غصہ نہیں آتا، اسے خوشی نہیں ہوتی۔ اس نے ایک لفظ میقات کہا ہے کہ یہ جو یوم الفصل ہے وہ میقات ہے۔ قانون کی رو سے وہ وقت متعین ہے۔ اس کی خلاف ورزی ہم بھی نہیں کرتے، اور جو بھی خدا کے نام پر اس دنیا میں نظامِ اقتدار قائم کرے گا خدا کی صفات میں اس کی یہ صفت ہوگی کہ قانون کے خلاف وہ کبھی نہیں کرے گا۔ قانون غیر متبدل ہوگا۔ قانون خدا کا مقرر کردہ ہوگا اور وہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی تو ایک طرف، وقت بھی نہیں بدل سکے گا۔ یہ ہے میقات: **یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا** (18:17)

جب وہ وقت آ جائے گا تو اس میں کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ **یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا** ❷ (78:18)۔ لفظ ینفخ الصور قرآن میں آیا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے: جب صور میں پھونکا جائے گا۔ اس کے بعد وہ تصور لیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن ایک فرشتہ نرسنگا پھونکے گا۔ صور، دراصل، نرسنگا ہوتا ہے جسے آج آپ بگل کہتے ہیں۔ جنگ کے لیے، جنگ کے زمانے

---

❶ پروا۔ پورب کی ہوا، صبا۔

❷ جس دن (جنگ کا) بگل بجے گا اور تم فوج درفوج میدانِ کارزار میں آ ؤ گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں، بگل بجایا جاتا ہے۔ یہ بگل آج بھی بگل کا کام دیتا ہے اور اس زمانے میں تو بگل ہی کی بڑی آواز ہو سکتی تھی، لاؤڈ اسپیکر ہوتے نہیں تھے۔ اسے بھی عرب ''نُفِخَ فِی الصُّوْرِ'' کہتے تھے۔ نفخ فی الصور کے معنی ہوتے تھے: نرسنگے میں پھونکنا، اور اس کے معنی لیے جاتے تھے: جنگ کا میدان۔ قیامت میں یہاں والوں کے متعلق یہ لفظ نہیں استعمال کرتے تھے۔ ہمارے ہاں کے مفسر کہتے ہیں کہ قیامت میں ایک فرشتہ صور پھونکے گا، نرسنگا پھونکے گا اور پھر یہ مردے قبروں سے اٹھیں گے اور اٹھ کر وہ وہاں میدانِ حشر میں جائیں گے۔ یہ ہمارے ہاں صور کا تصور مروّج ہے۔ معاف رکھیے گا، میں بار بار دہرائے چلا جا رہا ہوں، آخرت کی زندگی کے متعلق جو کچھ بھی قرآن نے کہا ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے، لیکن وہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح سے بلند چیز ہے۔ وہ ایسے حقائق ہیں کہ اس وقت ہم ان کو بیان سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہ کیا ہیں، انہیں قرآن نے مثال کے ذریعے بیان کیا ہے، ہم انہیں تشبیہاً تمثیلاً ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہے، حقیقتاً نہیں سمجھ سکتے کہ ان کی کنہ اور حقیقت کیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے، ایسا بھی کچھ ہوگا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اِس کا تعلق صرف اخروی زندگی سے نہیں ہے، قرآن کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے ہے۔ وہ اس لیے یہ چیزیں منواتا ہے کہ اس کا آپ کی اس دنیا کی زندگی پر، انفرادی زندگی پر، اجتماعی زندگی پر، عالمگیر انسانیت کی زندگی پر، اثر پڑتا ہے ورنہ اگر یہ بات نہ ہو اور اس کا نتیجہ صرف قیامت تک ہی ہو تو اس کا ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال، عربی زبان کی رو سے بھی ان کے ہاں یہ عجیب چیز ہے۔

عزیزانِ من! ''صورت'' تو آپ جانتے ہیں۔ ''ص'' کے ساتھ جو ''صورت'' ہوتی ہے یعنی جس کو آپ شکل و صورت کہتے ہیں، صورت وہ پیکر ہوتا ہے جسے آپ کسی چیز کا Figure کہتے ہیں، اس کی جمع بھی صور ہے۔ یہاں (78:18) میں کہا گیا ہے کہ پیکر، وہ پیکر، جن میں توانائیاں نہیں رہتیں، ان میں نئی توانائیاں پھونک دی جائیں گی، وہ قومیں جنہیں کمزور کر دیا گیا تھا، بے بس کر دیا گیا تھا، ناتواں بنا دیا گیا تھا، وہ انقلاب ایسا آئے گا تو ان کے جسدِ ناتواں کے اندر نئی توانائیاں پھونکی جائیں گی۔

عزیزانِ من! میں یہ مفہوم لیا کرتا ہوں۔ اور اس کے لیے اگلی سورۃ جب آئے گی وہاں اس کی تفسیر ملے گی کہ یہ جو انقلاب لانے والے ہیں ان کے متعلق یہی بات نہیں ہے کہ یہ خود اپنی کامیابی اور اپنی فتح چاہتے ہیں، اپنا غلبہ چاہتے ہیں۔ عام طور پہ تو سلطنتوں کا بھی، افواج کا بھی، مقصود یہی ہوتا ہے کہ اپنا غلبہ ہو، اپنی Victory (فتح) ہو۔ وہاں کہا ہوا ہے کہ یہ بات نہیں ہے، انہیں اپنا غلبہ واقتدار نہیں چاہیے، انہیں اپنی فتح نہیں چاہیے۔ یہ بات تو میں وہاں تفصیل سے عرض کرونگا۔ یہاں ایک مثال ہے پہلے وہ عرض کر دوں۔ بچپن کی پڑھی ہوئی یہ چیزیں بھی کام آ جاتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تصوف والوں اور شریعت والوں کی تو آپس میں کھٹ پٹ چلی آتی ہے۔ تصوف والے شریعت والوں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ شریعت والے تیرنا جانتے ہیں دریا میں چھلانگ لگاتے ہیں، تاکہ خود دوسرے کنارے جا لگیں اور ہم تصوف والے لوگ بھی دریا میں چھلانگ لگاتے ہیں تاکہ ہم ڈوبنے والے کو بچا کر لے جائیں۔ یہ بڑی چیز ہے۔

فکرِ قرآنی کا ماحصل

عزیزانِ من! بات غلبہ کی ہو رہی تھی' فتح کی ہو رہی تھی۔ قرآن آگے چل کر بتاتا ہے کہ یہ جو اپنا غلبہ چاہتے ہیں' اپنی کامیابی چاہتے ہیں' یہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ خود دریا کے پار ہو جائیں۔ یہ اس لیے چاہتے ہیں کہ وہ جو خود پار نہیں ہو سکتے یہ انہیں ساتھ لے کر پار ہو جائیں۔ یہ بات اگلی سورۃ میں آئے گی۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ تو غالب آئیں گے ہی' ان کے غلبہ سے وہ قومیں جنہیں کچل کر رکھ دیا گیا ہے' کمزور بنا دیا گیا ہے' ناتواں بنا دیا گیا ہے' جنہیں جسدِ بے جان بنا دیا ہے' ان کے ان پیکروں میں از سرِ نو توانائیاں پھونکی جائیں گی اور کیفیت یہ ہو گی کہ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ❶ (78:18)۔ اس بات نے یہ واضح کر دیا کہ وہ جو ایک قدم نہیں چل سکتے وہ فوج درفوج آئیں گے۔ پھر یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ❷ (110:3) مگر یہ ہو گا اس وقت جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ❸ (110:1) اس کا نتیجہ یہ ہو گا: یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ❷ (110:3) تو یہ جو "نفخ الصور" ہے میں ان دونوں مفاہیم میں سے اس کو ترجیح دیا کرتا ہوں۔

تدبر فی القرآن کا اصل طریق

عزیزانِ من! یہ جو سیاق و سباق (References to the Context) کہلاتے ہیں جن میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو موضوع یا مضمون چلا آتا ہے اس کی بات اس میں کیسے Fit in (موزوں و مناسب) ہوتی ہے۔ یہی تدبر فی القرآن ہے۔ اسے یاد رکھیے کہ یہ جو مختلف مرادفات کی رو سے مختلف معانی ہوتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک معنی' آپ نے منتخب کرنا ہوتا ہے' کہ یہاں کونسا معنی ہو۔ یہ بات دیکھنی ہوتی ہے کہ سیاق و سباق اور مفہوم کے اعتبار سے ان میں سے کونسا معنی Fit in (موزوں و مناسب) ہوتا ہے۔ اب یہاں (78:18) میں دیکھیے۔ یہ ہے تدبر فی القرآن۔ یہاں آیا ہے فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (78:18) یہ ذہن کو اس طرف لے آتا ہے کہ یہ ان کے لیے ہے جو اپنے پاؤں پہ چل نہیں سکتے تھے انہیں اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ فوج درفوج آئیں گے۔ اس سے کیا ہو گا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ اَبْوَابًا ❹ (78:19)۔ یہ جو بلندیاں ہیں' ان کے بارے میں آج تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان بلندیوں میں چاند پہ بھی گئے اور مریخ پہ بھی گئے۔ یہ نہ بھی ہوں تو بھی اگر سماوات کے معنی مرادفات کی رو سے یہ لیے جائیں کہ یہ بڑے

---

❶ تم فوج درفوج میدانِ کارزار میں آؤ گے۔
❷ لوگ فوج درفوج اس میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔
❸ جب قانونِ خداوندی کے مطابق' تجھے غلبہ و نصرت حاصل ہو جائے اور ان لوگوں کی مخالفت ختم ہو کر' دین کے دروازے ہر طرف سے کھل جائیں۔
❹ اور ان جاہ و حشمت کی مالک جماعتوں کی سربلندیاں' کھلے ہوئے پھاٹک کی طرح چوپٹ ہو جائیں گی۔ (یا فضائی کُرّے پھٹ جائیں گے۔)
(مفہوم القرآن۔ پرویز)

بڑے اپنے آپ کو بلندیوں پر سمجھنے والے جو لوگ تھے، آسمانوں پہ چڑھے ہوئے، آسمانوں کی بلندیوں پہ چڑھے ہوئے، ان کے ہاں کے دروازے چوپٹ کھول دیئے جائیں گے۔ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا [1] (78:20)۔ میں پھر عرض کر دوں کہ عربی زبان میں یہ جو بڑے بڑے سردار ہوتے تھے ان کو جبال کہا کرتے تھے، جن کے کھونٹے گڑے ہوئے ہوں، جن کو زعم یہ ہو کہ ہمیں کون اٹھا سکتا ہے، ہمیں کون اپنے مقام سے ہلا سکتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ یہ اپنے مقام سے ہل جائیں گے، یہ ایسی ریت بن جائیں گے۔ یہاں ''سراب'' کی کیا بات ہے، ''سُيِّرَتْ'' ہی بات بڑی عمدہ تھی۔ پہاڑ اپنے مقام سے ہل کر ریت کے ذروں کی طرح ہوں، اور وہ ذرے ایسے ہوں جیسے سراب (Mirage)۔

آپ کو معلوم ہے سراب کیا ہوتا ہے؟ یہ یکسر فریب ہے۔ یہاں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں وہ ریت ہوتی نہیں جس میں یہ مظہر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ابھی یہ جو گرمی کا موسم ہے، اس میں یہ جو ہمارے ہاں سڑکیں ہیں، ان میں دوپہر کے وقت دُور سے آپ دیکھیے تو دور سے آپ کو سڑک پہ پانی نظر آتا ہے، وہ پانی نہیں ہوتا، فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔ تو یہاں تو یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ صحرا میں تو یہ فریب عام ہوتا ہے۔ دُور سے کھڑا ہوا اور وہاں پانی کی تلاش مسافر کے لیے پوچھو نہیں زندگی موت کا سوال ہوتا ہے۔ وہ دُور سے دیکھتا ہے کہ دُور تک پانی ہی پانی ہے، وہ اس طرف لپکتا ہے۔ قریب جاتا ہے تو نظر آتا ہے کہ پانی نہیں، وہ بھی صحرا ہی تھا۔ جو چیز اس طرح سے فریب دے کہ ہو تو صحرا اور پانی بن کر دکھائی دے، اسے سراب کہتے ہیں۔ قرآن کی کیا تشبیہیں ہیں کہ یہ جو اتنے اتنے بڑے نظر آ رہے ہیں، ان کے قریب جا کر دیکھو گے تو یہ پانی نظر نہیں آئے گا، یہ نخلستان کا چشمہ نہیں ہوگا، فریب کا دریا اور سمندر ہوگا۔ یہ جو بڑے بڑے ہیں، ان کی جو طرہ بازیاں ہیں، ان کے پیچ و خم کھل جائیں گے۔ یہ ہے ابواب کا کھل جانا۔ اور ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ اپنے مقام سے ہل جائیں گے اور فریبِ نگاہ بن جائیں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا [2] (78:21) کیا بات ہے اور کیا لفظ استعمال کیا ہے!

جہنم ہر وقت دیکھ رہی ہے

عزیزانِ من! یہاں (78:21) میں کہا ہے کہ جہنم ان کی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہاں مرنے کے بعد جو جہنم آئے گی وہ وہاں دیکھی جائے گی مگر یہاں تو یہ ہے کہ وہ گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ یعنی جہنم ان کی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور جہنم کے معنی تو آپ کو معلوم

---

[1] اور پہاڑوں جیسے مستحکم سردارانِ قوم (جبال) کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور وہ بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔ (یا پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے۔) (20:105; 56:5; 77:10; 81:3)

[2] جہنم ان سرکشوں کی گھات میں ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہیں: جہاں انسانیت کو جلایا جائے۔ زمانہ قدیم میں ایک وادی ❶ تھی' اُس وادی میں ان کے ہاں ایک دیوتا تھا' ❷ اس دیوتا کے سامنے زندہ انسان کو جلایا جاتا تھا اور قربانی دی جاتی تھی۔ اس وادی کا نام ہی جہنم ❸ تھا کہ جس میں انسانیت کو جلایا جائے۔ ہر وہ معاشرہ جس میں انسانیت کو جلایا جائے جہنم ہے' اور جلایا اس طرح جاتا ہے کہ وہ جحیم ہو جاتا ہے' وہ ایک مقام پہ رک جاتا ہے' آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہاں جہنم کہا ہے اور کہا ہے کہ وہ جہنم ان کی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ دو تین حوالے ہیں' انہیں لکھ لیجیے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہ جو ہمارا تصور ہے کہ جہنم وہیں' مرنے کے بعد' جا کر آئے گا' اس کے بارے میں' میں پھر بار بار یہ عرض کر دوں پچھلی دفعہ بھی شاید یہ شعر پڑھا تھا:

ہزار حیف نہ بنی قیامتِ موجود

یہ جو اس وقت جہنم ہے' جس کے اندر ہم ہیں' اس طرف ہماری نگاہ نہیں جاتی اور قرآن کہتا ہے کہ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (29:54) وہ جو مکافاتِ عمل کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کو تو چاروں طرف سے جہنم گھیرے ہوئے ہے۔ محیط اس چیز کو کہتے ہیں جو اس وقت احاطہ کیے ہوئے ہو' گھیرے ہوئے ہو۔ اس کا ایک اور ریفرنس (حوالہ) (82:16) ہے جس میں جہنم کے متعلق کہا ہے۔ بات تو دور سے چلی آتی ہے لیکن یہی کافی ہے۔ وہ ہے وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (82:16) یہ تو اسے نہیں دیکھ رہے' وہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ اِس سے غائب نہیں ہیں' وہ ان کی نگاہوں سے غائب (Unseen) ہے' مگر یہ اس کی نگاہوں میں غائب نہیں ہیں' یہ سب یہاں موجود ہیں۔ آپ دیکھیے کہ قرآن جہنم کو کہاں لا رہا ہے۔ اگر آپ قرآن کی اگلی آیتوں پر آئیں تو میں سمجھتا ہوں کہ تڑپ اٹھیں گے۔ ایک اور ریفرنس (حوالہ) (79:36) ہے۔ اس میں کہا ہے کہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ❹ (79:36) جحیم تو آج بھی اسی طرح سے موجود ہے' لیکن یہ اس صورت میں ہے جسے ہم اپنی زبان میں Latent (پوشیدہ) کہتے ہیں' جسے چھپا ہوا کہتے ہیں' جسے مضمر کہتے ہیں۔ یہ لِمَنْ يَّرٰى ہے یعنی دیکھنے والوں کے سامنے ابھر کر جہنم آ جائے گا۔ دیکھنے والوں کے سامنے جن کو بصیرت

---

❶ یہ وادی یروشلم کے جنوب میں واقع تھی۔

❷ اس کا نام مولوک (عَمُّوْ نِيِّيْنَ کا دیوتا) تھا۔

❸ محیط المحیط نیز غریب القرآن (از مرزا ابوالفضل) میں لکھا ہے کہ جَهَنَّمُ اپنی اصل کے اعتبار سے عبرانی زبان کا لفظ ہے اور دو الفاظ سے مل کر بنا ہے: جِیْ (جس کے معنی ''وادی'' ہیں) اور ''هَـنُّوم'' (ایک آدمی کا نام تھا) یہ جِیْ هَـنُّوم جَهَنَّم میں تبدیل ہوا۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2004' ص 275' فٹ نوٹ 2۔

❹ اُس وقت جہنم ابھر کر سامنے آ جائے گا۔ لیکن صرف دیدۂ بینا کے لیے۔ یعنی اس کے لیے جس میں حقائق کے مشاہدہ کی صلاحیت ہو۔ (جہنم تو آج بھی موجود ہے لیکن غیر مرئی (Unseen) ہے۔ اُس وقت وہ ابھر کر سامنے آ جائے گا۔) (29:54; 39; 48; 82:16) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

حاصل ہے‘ ان کے سامنے تو جہنم ابھر کر آ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ جہنم جس کے متعلق کہا کہ **اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا o لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا** ❶ (78:21-22)۔

عزیزانِ من! اب وقت نہیں رہا۔ یہاں سے ہم یوں کہیے کہ سورۃ النبا کی آیت 22 تک آ گئے۔ اس سے آگے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ جہنم ان سرکشوں کی گھات میں ہے۔ وہی ان کا ٹھکانہ ہوگا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تیسرا باب: سورة النباء (آیات 23 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1984ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النبا کی آیت 23 سے ہوگا: (78:23)

جہنم کی نوعیت

حق اور باطل کی کشمکش کے بعد جہنم کی زندگی کا بیان چلا آ رہا تھا' جس کی وضاحت میں نے متعدد درسوں میں کی کہ جہنم کے متعلق قرآن میں یہ چیز ہے کہ وہ آج بھی تمہاری گھات میں ہے' تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے' وہ تمہیں دیکھ رہی ہے' تم جہنم کی آگ میں جھلس رہے ہو' اتنا ہی ہے کہ ایک وقت پر وہ واضح ہو کر سامنے آ جائے گی' تم بھی دیکھ لو گے' وہ تو آج بھی تمہیں دیکھ رہی ہے' اور اس عذاب کے اندر تم مبتلا ہو۔ میں نے عرض کیا تھا اور بار بار یہ عرض کیا تھا کہ قیامت کے یا مرنے کے بعد کی جنت دوزخ اور جہنم پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن نے جو اس کی تفصیلات بیان کی ہیں' شعور کی موجود سطح پر اس کی کنہ اور حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ وہ وہیں جا کر معلوم ہوں گی لیکن جنت اور جہنم اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے جنت کے متعلق تو ہمیں پتہ نہیں ہے کہ ہم بدنصیب ہیں' کبھی اس کے نظارے سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک ہی نہیں پہنچی' جہنم کے متعلق تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک جہنم کے اندر

زندگی بسر کر رہا ہے بشرطیکہ اس کا احساس ہو کہ وہ کیا ہے۔قرآنِ کریم نے اس کے متعلق کہا ہے کہ وہ لِّلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا (78:23) سرکشوں کا ٹھکانہ ہے اور لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا (78:23) اب وہ وہاں رہیں گے، راحت وآرام نہیں پائیں گے۔

عزیزانِ من! اب پھر وہی بات آ گئی کہ جہنم میں، یا جنت میں کتنی مدت تک رہیں گے۔ مدت یا زمانہ یا ٹائم کا احساس، اس کا تعین، شعور کی اس سطح، پر آج کی سطح سے مختلف ہوگا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر یہ چیزیں اس فلسفہ کے انداز سے دیکھی جائیں تو یہ الگ چیز ہو جائے گی لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مرنے کے بعد کی جنت، جہنم، قیامت، حشر نشر، میزان وغیرہ کا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے تمثیلاً بیان کیا ہے، اس کی کنہ حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔

وقت کے تعین کی حقیقت

یہ سوال کہ جنت یا جہنم میں کب تک رہیں گے، وقت سے متعلق سوال ہے۔ یہ چیز اور وقت تو اس دنیا میں بھی شعور کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ دن میں ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ اب مثلاً گھڑی ہے تو اتنے بجے ہیں یا دوپہر آ گئی یا سورج ڈھل گیا، زوال کا وقت ہو گیا، سورج غروب ہو گیا۔ جب سو جاتے ہیں تو سونے کے بعد ہمیں اٹھنے کے وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ تو وقت جو ہے وہ تو ہمارے شعور کے ساتھ جاگتا ہے۔ اگر ہمارا شعور کسی طرح سے سویا ہوا ہے، معطل ہے تو اس دَور میں تو وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ میں نے یونہی ایک مثال دی ہے ورنہ یہ تو مسئلہ طول طویل اور عمیق ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن نے جو یہاں کہا ہے کہ وہ وہاں رہیں گے اس کے لیے اس نے ''احقاباً'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ احقاب عربی زبان میں ایسی مدت کو کہتے ہیں جو معین نہ ہو، Determined (تعین شدہ) نہ ہو۔ اور ویسے تو قرآن میں خٰلِدِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا بار بار آیا ہوا ہے: جنت کے لیے بھی جہنم کے لیے بھی، بلکہ ایک جگہ تو یہ اَبَدًا کی بجائے اور الفاظ بھی آئے ہیں، وہ بھی عجیب وغریب ہیں۔ (11:107) میں جہنم کے متعلق بھی اور جنت کے متعلق بھی ہے کہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (11:107) جب تک ارض وسما باقی رہے گی وہ بھی باقی رہے گی۔ اس کے بعد ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ (11:107) یہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اب یہ چیز کہ ما دامت السمٰوٰت وَالْاَرْضَ [1] (11:107)۔ یہ بھی عجیب حقیقت ہمارے سامنے لا رہی ہے کہ یہ اس وقت تک رہے گی، جب تک ارض وسما باقی ہے۔ بہرحال جیسا میں نے عرض کیا ہے ان بحثوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، ہماری عملی زندگی سے اس کا تعلق نہیں ہے، یہ کچھ حقیقتیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسی صفحہ ارض پر انسانی علم کی سطح اور بلند ہوتی چلی جائے تو اس کے بعد یہ حقائق بھی سمجھ میں آ جائیں کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں تو یہ حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے، لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ان کا تعلق ہماری عملی زندگی

---

[1] جب تک ارض وسما باقی رہے گی۔

سے نہیں ہے۔ان پر تو ہمارا یقین ہے۔ایمان ہے کہ مرنے کے بعد زندگی ہے اور اس دنیا کے اس زندگی کے ہمارے جتنے بھی اعمال ہیں ان کے نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ ہے وہ ایمان جس کی آج ضرورت ہے کہ یہ حساب ضرور ہوگا اور دین اسلام کی ساری عمارت اسی قانونِ مکافاتِ عمل پر اٹھتی ہے اور اس میں اسی دنیا کے اندر نہیں بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی یہ چیز جاری رہے گی۔ یہ ہے وہ سلسلہ ایمان جو ہمیں لانا ہوتا ہے اس لیے یہ چیز کہ کتنا عرصہ ہوگا کیسی کیفیت ہوگی ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

دنیا بھر میں ہماری صورت گری

ہماری صورت یہ ہے کہ ہم اس بحث میں تو یوں پڑتے ہیں کہ ہمارے ہاں وہ جنت کے آب خوروں کی تعداد بھی گنتے ہیں حوضِ کوثر کی لمبائی چوڑائی بھی ماپتے ہیں لیکن ہزار حیف نہ بنی قیامتِ موجود جس قیامت سے آج اُمت گزر رہی ہے وہ کسی کے سامنے نہیں ہوتی۔ یہ کوئی چھوٹا جہنم نہیں ہے جس کے اندر صرف ہم ہی نہیں بلکہ اس وقت تو بدقسمتی سے دنیا کی جتنی بھی مسلمان کہلانے والی قومیں ہیں وہ ساری جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اور یہاں قرآن نے کہا تھا کہ وہ جہنم آج بھی نظر آ جائے گی مگر صرف انہیں جو دیکھ سکیں۔ہم اگر دیکھ سکیں تو ہم میں سے ہر ایک شخص جہنم کی زندگی گزار رہا ہے۔وہ جہنم جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ جس کی آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں جس کے انگارے اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں انسان اپنے ساتھ اپنی پیٹھ پہ لاد کر لے جاتا ہے۔ وہاں انگارے نہیں ہوتے یہ انسان کے اپنے اعمال کی ہی تپش ہے جس کے اندر یہ جھلستا ہے جلتا ہے۔بہرحال یہ کیفیت کسی اور کی نہیں ہے یہ تو ہم سب کی ہے آپ سوچیے تو سہی کہ مثلاً حسد کی آگ ہے۔کبھی آپ نے سوچا ہے کہ سب کچھ میسر ہے جس کی وجہ سے زندگی کو بڑا خوشگوار بن جانا چاہیے تھا لیکن ایک حسد ہے جو کہتا ہے کہ اسے اتنا زیادہ ملا ہے مجھے کیوں نہیں ملا۔اُسے جتنا کچھ ملا ہوا ہوتا ہے وہ جہنم کے انگارے بن جاتے ہیں۔یہیں ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی آگ کیسے دلوں کو لپیٹتی ہے اسے چین ہی نہیں پڑتا۔ یہ ایک حسد ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس حسد کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں ہوتی ہیں۔ قرآن وسوسہ اندازیاں بھی کہتا ہے اور حسد تو میں نے اس لیے کہا ہے کہ یہ اتنی بڑی آگ ہے کہ قرآنِ کریم کی آخری سورتوں میں اس کا تذکرہ آتا ہے اور اس کے بعد قرآن ختم ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کس کس سے پناہ مانگی جائے؟ حسد کرنے والے سے وسوسہ اندازی کرنے والوں سے۔تو یہ تو وہ جہنم ہے جو یہاں Create (پیدا) ہو جاتا ہے پھر وہ جو اس نے جہنم کے انسان بتایا ہے۔وہ ہے: انسانوں کا محکوم جہنم کا داروغہ مالک ماسٹر یہ اس کے غلام اور وہ اس کا آقا۔پھر جہنم کے اندر کی جو کیفیات ہیں وہ یہ ہیں **لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝ اِلَّا حَمِیْمًا وَّ**

غَسَّاقًا (78:24-25) ❶ ۔ یہ تمثیلی طور پر ہی سہی لیکن قرآن نے یہی کچھ بتایا ہے۔

جہنم کے شعلوں کی نوعیت

عزیزانِ من! اگر اسے ہم دیکھیں کہ جس جہنم میں ہم اس وقت مبتلا ہیں کس طرح اس پر یہ چیزیں منطبق ہوتی ہیں تو بات سمجھ میں آجائے گی کہ واقعی ہمارے دلوں میں جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ہم تو آج آخری پارے میں پہنچ چکے ہیں۔ مگر سورۃ المزمل میں قرآنِ کریم نے قوانین خداوندی کی تکذیب کرنے والوں کی بدلگامیوں کو روکنے کے لیے ان کو دیئے جانے والے طعام کے متعلق کہا تھا **طَعَاماً ذَا غُصَّةٍ** (73:13) وہ کھانا ایسا ہے کہ جو حلق میں اٹک جائے' نہ نگلا جائے نہ اگلا جائے۔ سوچتے ہیں کہ یہ کیا کیفیت ہے! یہ اس قسم کی روٹی ہے کہ جو نہ نگلی جائے نہ اگلی جائے۔ اور اس پر اس سے کہا جائے کہ **ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ** (44:49) اب اسے کھا' معاشرے کے اندر بہت بڑا صاحبِ اقتدار بنا پھرتا تھا' بڑا معزز تھا' اپنے آپ کو صاحبِ عزت کہتا تھا' صاحبِ قوت و اقتدار بھی کہتا تھا' تیری یہ کیفیت تھی اور یہ رزق جو تم نے حرام طریقے سے کمایا ہوا تھا' اب کھاؤ' یہ تمہارے گلے میں اٹک جائے گا' نہ نگلا جائے گا' نہ اگلا جائے گا۔ یہ اِس قسم کی جو کمائی والے ہیں' بظاہر نظر آتا ہے کہ بڑے آسائش میں ہیں' رزق کی کشادگی ہے' بڑی دولت ہے' یہ سب کچھ ہے لیکن ان کے قلب کے اندر کوئی جھانک کر دیکھے کہ قلب میں کیفیت کیا ہے تو یہ کیفیت ان کے چہرے سے بھی نمودار ہو جاتی ہے کہ وہ کس قسم کی آگ میں جل رہے ہوتے ہیں۔ یہ جتنے آپ کو بڑے بڑے نظر آتے ہیں' انہوں نے خلافِ قانون حرام کی کمائی سے اتنا کچھ جمع کیا ہوتا ہے کہ وہ دولت کے انبار نظر آتے ہیں' مگر وہ حقیقت میں جہنم کے انگار ہوتے ہیں' جن میں وہ جل رہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی زندگی بھی اندر سے پوچھ کے دیکھیے تو حقیقت حال ابھر کر سامنے آجائے گی۔

عزیزانِ من! بھوکے کو تو صرف وہ روٹی نہیں ملتی۔ یہ ایک طبعی سی چیز ہے جس کی اُسے تکلیف ہے' مگر سب کچھ ہوتے ہوئے ان حرام کی کمائی سے جمع کیے ہوئے دولت کے انبار والوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جہنم کی آگ میں جل رہے ہوتے ہیں۔ ایک ایک سمگلر کو آپ دیکھیے۔ میں آج کی اصطلاح میں یہ بات کرتا ہوں' ورنہ یہی بات نہیں ہے کہ یہ سمگلنگ اور یہ بلیک مارکیٹنگ صرف یہی حرام کے ذریعے ہیں' آج تو ساری فضا حرام سے بھری ہوئی ہے' سانس لینا مشکل ہو رہا ہے لیکن اس کے ذریعے جو رزق حاصل ہوتا ہے' جو روٹی حاصل ہوتی ہے' اس روٹی کے متعلق پوچھیے کہ کس کس طرح ان کو چھپانا پڑتا ہے۔ اس دولت کو لیے بھاگے بھاگے پھر رہے ہوتے ہیں' ہر طرف سے قرآن کے الفاظ میں کہ ''موت آتی دکھائی دیتی ہے' پر موت آتی نہیں ہے۔'' وہاں نہ زندگی ہوتی ہے' نہ موت

---

❶ پینے کی بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جس سے سکون حاصل ہو۔ اس کے بجائے انہیں یا تو کھولتا ہوا پانی ملے گا جو پیاس بجھانے کے بجائے اسے اور بھڑکا دے اور یا ایسا یخ بستہ (Ice-Cold) جس کی ٹھنڈک سن کر دے (یہ دونوں انسانی امیدوں کی کھیتی کو جھلسا دیں گے (38:57)۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوتی ہے' دولت کے انبار موجود ہوتے ہیں۔ ان کو چھپانے کے لیے ان کے اوپر اتنا عذاب مسلط ہوتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ غیر قرآنی معاشرے کے اندر' یہ جتنے بھی آپ رزق کے ذرائع سمجھتے ہیں' ان کو بھی آپ دیکھیے۔ اگر تھوڑا سا احساس بیدار ہو جائے' پھر دیکھیے کہ ایک ایک رزق' ایک ایک انگارہ' نظر آتا ہے جو قرآن ان کے سامنے بتا رہا ہے۔ یہ تو انفرادی طور پہ بھی اس نے بتایا ہے۔ اجتماعی طور پر تو ایک دوسری ہی چیز آتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ قرآنی حقائق کا انکشاف

عزیزانِ من! میں نے جب قرآن کی روشنی میں اس دوسری چیز پہ غور کیا تو نظر آ گیا کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ ہر دور کے اندر اس کے حقائق بے نقاب ہونگے' وہ حقیقت و صداقت پر مبنی ہے۔ قرآن کی بعض ایسی اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم ہمارے دَور میں آ کر بے نقاب ہوا ہے' وہ شاید پہلے سمجھ میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ قرآنِ کریم میں بڑی عجیب و غریب آیت ہے کہ **لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ o لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ** [1] (88:6-7)۔ اس قوم کا جو رزق ہے' قرآنِ حکیم نے اس کے لیے ایک لفظ ''ضریع'' کا کہا ہے۔ آپ اس لفظ کی جامعیت پہ غور کیجیے اور پھر آج اقوام کے جو سیاسی حالات ہیں' ان پر نگاہ ڈالیے' سمجھ میں آ جائے گا کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ سمندر کے کنارے پہ یہ ''ضریع'' نظر آیا کرتا ہے۔

سمندر کی سطح پر اس قسم کی جو جھاڑ جھنکار بے کار چیزیں ہوتی ہیں' وہ اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اس وقت جب سمندر کی چھل [2] خشکی کی طرف آتی ہے تو اس کے ساتھ وہ چیزیں خشکی پہ آ جاتی ہیں اور پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کراچی کے ساحل پہ بھی' جب ہم وہاں تھے' تو دیکھتے تھے کہ وہاں اس میں کم از کم کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تک بھی ہوتے تھے۔ وہاں بھیک منگوں' غریبوں' محتاجوں کے بچے اور لڑکیاں' ساحل پر اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے اور وہ ان چیزوں کے اندر سے' جو کچھ وہ سمندر چھوڑ جاتا تھا' یہ چیزیں اکٹھی کرتے تھے۔ اسی کے اندر ایک اس قسم کی وہ جھاڑی بھی ہوتی ہے کہ جسے مویشی بھی نہیں کھاتے تھے۔ عربوں کے ہاں یہ چیز ''ضریع'' [3] کہلاتی تھی۔

اب اس میں دو چیزیں ہیں۔ یاد رکھیے! سمندر کے بحرِ ذخار نے' اپنے طوفان سے' اپنی موج سے' بہت سی بے کار نکمی چیزیں' جو کسی

---

[1] کھانے کو وہ بدبودار جھاڑیاں جنہیں سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے (یعنی بڑی بڑی قوموں کا پس خوردہ جنہیں وہ بھیک کے ٹکڑوں کی طرح پس ماندہ اقوام کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ ایسی ذلت کی روٹی؟) جس سے جسم کا نشو و نما حاصل کرنا تو ایک طرف' بھوک بھی نہ مٹے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] موج' لہر' Wave

[3] الضریع۔ حجاز میں کانٹوں والا پودہ ہوتا ہے۔ چوپائے اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ اگر اسے کھا لیتے ہیں تو اس سے کمزور ہو جاتے ہیں یا ایک قسم کی بدبودار گھاس کو کہتے ہیں جو ٹھہرے پانی میں پیدا ہوتی ہے اور مویشی اسے نہیں کھاتے (تاج العروس)۔ بعض اوقات سمندر اس قسم کی گھاس کو باہر پھینک دیتا ہے اور جو مویشی اسے کھاتا ہے وہ لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے (لین کا عربی لغت) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کام نہیں آ سکتیں، وہ ساحل پہ پھینک دیں اور ان محتاج اور غریب بچوں نے ان بے کار سمجھی ہوئی فاضلہ چیزوں کو جو سمندر کی چھل نے باہر پھینک دیا تھا، چن لیا۔ میں یہ بار بار اس لیے کر رہا ہوں کہ آگے بات سمجھ میں آ جائے گی' یہ اس طرح کی چیزیں ضریع ہیں۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ قرآنی حقائق سامنے آ رہے ہیں۔

ترقی پذیر اقوام پر ترقی یافتہ اقوام کا ''احسان''

آج اس دنیا کے اندر جو Developed Nations (ترقی یافتہ قومیں) ہیں' جنہیں سپریم پاورز بھی کہا جاتا ہے' وہ غریب مفلس محتاج Undeveloped (غیر ترقی یافتہ) اقوام کو ایڈ (امداد) دیتی ہیں۔ وہ ایڈ (امداد) کیا ہے؟ بس یہی کہ جو ان کے اپنے ہاں کی بچی کھچی چیزیں ہیں' جو ضریع ہے' جو ان کے ہاں کے سمندر کی موجیں بے کار سمجھ کر باہر پھینکتی ہیں اور ہم ساحل پر کھڑے ان میں سے چن چن کر اپنے لیے رزق لیتے ہیں۔ یہ جہنم ہے۔ وہ اپنے ہاں کی بہترین چیزیں کبھی آپ کو نہیں دیتے خواہ وہ اسلحہ ہو خواہ وہ خوراک ہو۔ کچھ چیزیں جو ان کے ہاں فالتو ہوتی ہیں' بچی کھچی ہوئی ہوتی ہیں' ان کو پھینکتے ہیں' ہم لپک کر انہیں چنتے ہیں۔ یہ ضریع ہے۔

کیا بات ہے ایک لفظ ضریع کی! کیا کہہ گیا ہے قرآن! آج کے دَور کی سیاست میں اس کے معنی بے نقاب ہو کر سامنے آتے ہیں کہ قرآن یہ کیا چیز کہہ گیا ہے۔ یہ قومیں جو جہنم کے اندر ہیں' جن کو اب Third World Countries (تیسری دنیا کے ممالک) کہا جاتا ہے' جن کو محتاج اور مفلس بنایا جاتا ہے' جو کچھ ان کی طرف پھینکا جاتا ہے اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ذلت' خواری اور محتاجی تو ایک طرف رہی' طبعی طور پر جو کچھ ملتا ہے' وہ ان کے ہاں کا پھینکا ہوا رزق ہے' جو ہم چنتے ہیں اور پھر اس رزق کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ** (88:7) نشوونما دینا تو ایک طرف رہا' اس سے بھوک بھی پوری نہیں مٹتی۔ وہ دیتے ہیں تو اس طرح سے' مگر وہ مالک کی حیثیت سے' سپر پاور بن کر' لیتے ہیں۔ اور جو دیتے ہیں وہ تو محتاجوں کی طرح ہے۔ وہ سمندر کے کنارے سے چن کر' جو جھاڑ پونچھ ہے' وہ دیتے ہیں اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں' بھوک نہیں مٹتی' فربہی نہیں آتی۔ ہم آجکل کیا کھا رہے ہیں کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ جسے جو کچھ کہہ کر میں کھا رہا ہوں وہ خالصتاً وہی کچھ ہے۔ آٹا آٹا نہیں ہے' گھی گھی نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اب اس کا نام ہی وہ ہے جو چند سال پہلے تک قابلِ عزت نہیں تھا۔ جسے آج ڈالڈا کہا جاتا ہے' وہ ایسا تھا کہ اگر کوئی شخص ڈالڈا لینے جاتا تھا تو وہ اپنا کٹورا چھپا کر جاتا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے یعنی اسے لینا بے عزتی سمجھا جاتا تھا۔ گھی عام تھا اور ڈالڈا یہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ ڈالڈا نہیں رہا' اب اس کا گھی نام ہو گیا۔ جو آپ کے ہاں کبھی تھا وہ ناپید ہو گیا۔ دین کا پتہ ہی نہیں ہے' مذہب کو ہی دین کہہ رہے ہیں۔ ہمارے ان بچوں کو اب کوئی سمجھائے کہ صاحب! گھی سے طاقت آتی ہے فربہی آتی ہے' اس میں یہ فائدے ہوتے ہیں' وہ فوراً کہنے لگتے ہیں کہ آپ لوگوں کی مت ماری گئی۔ او گھی سے تو زکام ہوتا ہے' کھانسی لگتی ہے' بخار ہوتا ہے۔ اب انہیں کیا پتہ کہ جسے گھی کہا جا رہا

ہے' وہ یہ گھی نہیں ہے۔ گھی کیوں نہیں ہے؟ کہ جی! اس کو گھی کہا جاتا ہے' گھی لکھا جاتا ہے' اس کو گھی کہہ کر خریدا اور کھایا جاتا ہے۔ میرے دادا مرحوم حکیم طبیب بھی تھے۔ انہوں نے میری تعلیم کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ بیٹا! میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ جو آج کا گھی ہے یہ طبیبوں کے نسخوں میں لکھا جایا کرے گا۔ صد افسوس کہ اب وہ نسخوں میں بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ نسخوں میں حکیم جو دوائیاں لکھتے ہیں اب تو وہ بھی کہیں خالص نہیں ملتیں۔

کیا یہ جہنم نہیں؟

عزیزانِ من! اب جو دوائیں باہر سے آتی ہیں ان کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ روز یہ ہوتا ہے کہ اتنی دوائیوں میں زہریلا مادہ ملا ہوا ہے۔ پہلے وہ دس بیس برس تک اس دوائی کو کھلاتے ہیں۔ جب کوئی دوسری کمپنی اس کے مقابلے میں کوئی دوسری دوائی ایجاد کر لیتی ہے تو اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو نہ کھانا' بڑا زہر پیدا کرتی ہے۔ قوموں کی قوموں کو تباہ کرنے کے بعد وارننگ دے رہے ہوتے ہیں۔ ضریع بھی اس قسم کی ملتی ہے۔ کیا اس کے جہنم ہونے میں پھر کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ یہ ہے ضریع جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ **لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِىْ مِنْ جُوْعٍ** [1] (88:6)۔ یہ دیکھنا ہو کہ **لَا يُسْمِنُ** کیا ہے کہ جس سے نشو و نما بھی نہیں ہو سکتی' آپ غریبوں کے بچوں کی تو پوچھیے نہیں وہ جو قرآن نے **لَا يُغْنِىْ مِنْ جُوْعٍ** کہا ہے کہ بھوک بھی نہیں مٹتی' آپ کھاتے پیتے گھرانے کے بچوں کو کسی اسکول میں دیکھیے۔ یہ جو آپ کے ہاں انگریزی اسکول کہلاتے ہیں' تین تین چار چار سو روپیہ [2] مہینہ ان کی فیس ہے' آپ چھٹی کے وقت جو بچے وہاں سے نکلتے ہیں ان کو دیکھیے' ان کے چہروں کو دیکھیے' سو بچوں کے چہروں کو نچوڑو تو اس میں ایک قطرہ خون کا نہیں نکلتا۔ زرد رو ہڈیاں ہیں۔ یہ کیفیت ہے۔ وہ بیچاری مائیں ان کو کچھ میک اپ کر کے بھیج دیتی ہیں تو کچھ نظر آتا ہے ورنہ ان کے چہروں میں ایک قطرہ خون کا نہیں ہوتا۔ یہ ہے **لَا يُسْمِنُ** (88:7)۔ دیکھا کس جہنم میں ہم جی رہے ہیں اور ہم ہی نہیں میں نے کہا ہے کہ اب تو یہ پوری دنیا اس جہنم کے اندر جی رہی ہے۔ جہنم کے جو داروغے ہیں بس انہی کے ہاں ہے جو کچھ ملتا ہے۔ باقی قوموں کی کیفیت یہ ہو رہی ہے۔ قرآن **حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا** [3] (78:25) کہتا ہے۔ قرآن کی تشبیہات عجیب ہیں۔ وہ عام طور پہ کھیتی کی تشبیہ دیتا ہے اور بڑی محسوس اور بڑی مؤثر تشبیہ ہوتی ہے۔ کھیتی کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے ان کو پانی تو ملتا ہے اگر پودے پر کھولتا ہوا پانی

---

[1] جس سے جسم کا نشو و نما حاصل کرنا تو ایک طرف' بھوک بھی نہ مٹے۔

[2] آج ان اسکولوں کی فیس تین تین چار چار ہزار روپے ماہانہ وصولی کی جاتی ہے۔

[3] انہیں یا تو کھولتا ہوا پانی ملے گا جو پیاس کو بجھانے کے بجائے' اسے اور بھڑکا دے' اور یا ایسا یخ بستہ' جس کی ٹھنڈک سن کر دے۔ (یہ دونوں' انسانی امیدوں کی کھیتی کو جھلسا دیں گے: 38:57)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ڈال دیا جائے اسی وقت جھلس جاتا ہے اور اگر یخ بستہ پانی ڈال دیا جائے تب بھی جھلس جاتا ہے' پانی کے اعتدال پر ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملے گا تو یہ سب کچھ' لیکن ملے گا اس طرح سے کہ وہی چیز جھلس جائے۔ دونوں ہی Extreme (انتہائی حد) ہیں۔ اگر کھولتا ہوا ہو' تب بھی جھلس جائے' اگر وہ یخ بستہ ہے تب بھی جھلس جائے' اس پانی سے پودا نشو ونما نہیں پا سکتا۔ یہ پانی بتایا گیا۔ اور وہ بھی آج کل اس گرمی کے زمانے میں ملے' تو ورنہ کئی کئی دن تک تو اب پانی بھی بند رہتا ہے۔ یہاں **غَسَّاقًا** (78:25) آیا ہے۔ یہ ذہن میں آیا کہ غالباً ان کو باندھ کے' بھیڑوں بکریوں کی طرح' اس طرح سا کچھ کھانا پینا دیا جاتا ہوگا مگر یہ قرآن ہے' فوراً کہا کہ **جَزَآءً وِّفَاقًا** (78:26) تمہارے عمل خود نتیجہ بن کر یہ کچھ سامنے لے آئیں گے۔ یہ ''وفاق'' عجیب چیز ہے: وہ جو کسی چیز کے اوپر بالکل فٹ ہو جائے۔ صحیح عمل کا نتیجہ یہ کچھ ہوگا۔ یہ اس لیے تھا کہ **اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا** [1] (78:27)۔ وہ ایک بات کہتے تھے: کون پوچھ سکتا ہے' ہمیں کون پوچھنے والا ہے؟ ہمیں کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے ذہن میں یہ خناس سمایا ہوا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ انہوں نے یہاں اس کا انتظام کر رکھا ہوتا ہے۔ غلط نظام کے اندر یہ چیزیں ہیں۔ یہ لوگ اپنا انتظام کر رکھتے ہیں۔

زعمِ باطل میں گرفتار انسان

عزیزانِ من! جس کے پاس اتنی دولت ہوتی ہے' اس کے لیے وہ انتظام کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ہمیں کون پوچھ سکتا ہے۔ کہا: یہ اس زعمِ باطل میں گرفتار تھے کہ ہمیں کون پوچھ سکتا ہے' اس لیے **وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا** [2] (78:28)۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ وہ مسکرا دیتے تھے: کیا کہہ رہے ہو' یہ کھیتی تو دن بدن پنپتی چلی جا رہی ہے۔ یہ تھی ان کی کیفیت اور یہی وہ تصور ہے جو ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ مجھے کوئی کہیں پوچھ نہیں سکتا۔ ایمان تمام حسنات کا سرچشمہ ہے کہ نہیں' اگر کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو پھر بھی ایک دیکھنے والا ہے' کوئی پوچھنے والا نہ ہو' تو پھر بھی ایک پوچھنے والا ہے' اور کسی باہر سے دیکھنے والے اور پوچھنے والے کی ضرورت ہی نہیں ہے' جو کچھ میں کرتا ہوں بلکہ سوچتا ہوں' میری آرزوؤں تک بھی جتنی چیزیں ہیں' وہ ایک نتیجہ مرتب کرتی ہیں اور وہ میرے اندر نتائج جمع ہوتے رہتے ہیں' اپنے وقت پر وہ باہر آئیں گے' جیسے وہ خون کا سرطان ہے کہ مریض کو ساری عمر پتہ نہیں چلتا' پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ لاعلاج ہو چکا ہوتا ہے' یہ اعمال کے وہ نتائج ہوتے ہیں جو انسان کے خون میں حلول کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ مجھے کوئی نہیں پوچھ سکتا اور جو کچھ کہہ رہے ہو کہ ''مکافاتِ عمل ہے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہے'' یہ سب غلط ہے' کوئی بات نہیں ہے' ہم دیکھ لیں گے اور وہ جو قرآن کی آیت ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ صاحب! یہاں تو تم موج کرتے ہو' مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! یاد ہے

---

[1] یہ لوگ ہمارے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ انہیں توقع ہی نہیں تھی کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں' انہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

[2] اِسی لیے وہ ہمارے قوانین کو بری طرح جھٹلاتے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آپ کو وہ آیت: وہ کہتا ہے: کوئی بات نہیں، یہ سب ڈرانے کی باتیں ہیں، میں نے انتظام کر رکھا ہے کہ وہاں بھی ہم عیش کریں گے، ایک مسجد بنا دیں گے، ایک یتیم خانہ کھول دیں گے، لاکھوں کا خون چوسنے کے بعد اس میں سے چند قطرے زکوٰۃ کے طور پہ دیدیں گے، جنت میں گھر بن جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے انتظام کر رکھا ہے۔ یہ ہیں جنہیں احساس نہیں ہوتا کہ واقعی ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہوگا۔

جنت کا حصول اتنا سستا نہیں ہے

عزیزانِ من! یہ لوگ خود فریبی میں بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ خدا فریبی میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہاں بھی ہم عیش کریں گے۔ آپ کسی وقت کسی واعظ سے وعظ سن دیکھیے۔ وہ بتائے گا کہ امیروں کی جو دولت ہے وہ اگر یہاں خرچ کریں، وہاں درسگاہ میں دیں، دارالعلوم میں دیں، فلاں یتیم خانے میں دیں، وہ جتنے بھی انہوں نے اپنے یتیم خانے کھولے ہوئے ہوتے ہیں وہ انہیں دیتے چلے جائیں وہ ایک ایک پیسے کے عوض جنت میں گھر کی ایک ایک اینٹ ان کے عوض لکھ دیتے ہیں۔ یہاں ہی انہوں نے پٹے کرا لیے ہوتے ہیں لیکن یہ سب خود فریبی ہے، عزیزانِ من! اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں تو یہ خدا فریبی بھی ہے، اس کی ساری چیز یہ ہے کہ مجھے کسی کو اس کا حساب نہیں دینا، حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا (78:29) جو کچھ بھی کوئی کرتا ہے ہم اسے ایک اعمال نامے کے اندر ساتھ ہی ساتھ درج کیے جاتے ہیں، محفوظ کیے جاتے ہیں۔ تو جا، کہاں سکتا ہے؟ بھاگ، کہاں بھاگ سکتا ہے؟ اس لیے وہاں یہ کہا جائے گا ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (44:49) اپنے کیے کا اب بدلہ چکھ۔ تو بہت بڑا معتبر، صاحبِ عزت اور صاحبِ اقتدار بنا پھرتا تھا۔ اور یہاں ہے کہ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا (78:30) چکھو اپنے اعمال کے نتائج، بھگتو نتیجہ، چیخو، چلاؤ، اب تو سوائے اس کے کہ یہ عذاب زیادہ ہو کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا [1] (78:31)

نجات کا مفہوم

عزیزانِ من! اگرچہ یہ بحثیں بھی تفصیل سے پہلے آ چکی ہیں لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ آخری پارہ ہے۔ اس میں جب بھی کوئی بات آئے گی تو میں چاہتا ہوں کہ آخری بار بھی اس کو ایسی تفصیل سے بیان کر دیا جائے کہ وہ ثبت ہو کر رہ جائے۔ دنیا بھر کے مذاہب کا جو غلط تصور تھا، قرآن کی ایک اصطلاح نے، ایک لفظ نے، ان پر خطِ تنسیخ کھینچ کر بتا دیا کہ حقیقت کیا ہے۔ ساری دنیا میں مذہب یا اچھے اعمال کا نتیجہ نجات کہا گیا ہے۔ نجات کے معنی ہوتے ہیں: کسی عذاب، کسی مصیبت، میں مبتلا ہو جانے کے بعد، اس سے چھٹکارا حاصل ہو جانا، صبح اچھا بھلا تھا، لو لگی، بخار ہوا، بہر حال کچھ وقت تک وہ رہا، علاج کیا، اس کے بعد پھر اسی حالت میں پلٹ کر آ گیا جیسا صبح کو تھا۔

---

[1] جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، ان کے لیے ہر قسم کی کامیابی و کامرانی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اسے کہتے ہیں نجات: ایک حالت' اس کے بعد کوئی اس سے غیر حالت' خرابی کی حالت' مصیبت کی حالت' اس کا دُور ہو جانا' پھر ویسے کا ویسا ہو جانا جیسا وہ صبح پہلے تھا۔ یہ ہے مذہب کا ماحصل۔

سوال یہ ہے کہ یہ جتنی مشقتیں' مذہب کی ریاضتیں' قربانیاں ہیں' یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہے؟ ہر مذہب میں یہ تصور ہے کہ پہلے انسان اچھا بھلا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس پر کوئی عذاب آتا ہے۔ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جانا۔ یہ ہے مذہب کا منتہیٰ۔ عبادتیں' خدا کی راہ میں دینا' نیک عمل' یہ سارے اس لیے ہیں کہ وہ جو بخار ہوا تھا' اس کے لیے یہ دوائیاں ہو رہی ہیں' بخار اتر جائے' اترنے کے بعد کیا ہوگا: جیسا یہ پہلے تھا' ویسا ہو گیا۔ یعنی کچھ حاصل نہیں ہوا' پھر ویسا ہو گیا۔ دنیا کے تمام مذاہب یہی کہتے ہیں۔ ہندومت کا چکر تو پوچھیے نہیں: پچھلے جنم میں جو غلط کام کیے تھے' اس کی سزا بھگتنے کے لیے اس جنم کے اندر' پھر وہ پوچھو نہیں کس کس طرح سے گرفتار ہوتا ہے' کتنے کروڑ اس قسم کے چکر اس کو دیئے جاتے ہیں' کاہے کے لیے؟ تاکہ جیسا یہ اس سے پہلے تھا' ویسا ہو جائے۔ عیسائیت میں ہر انسانی بچہ اپنے ماں باپ کے اولیں گناہ کا پشتارہ اپنی پشت پہ لاد کر یہاں آتا ہے اور وہ اسے جہنم میں پھینک دیتا ہے۔ اس سے بچنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں سوائے اس کے کہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لایا جائے۔ ایمان لایا جائے تو پھر وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ نہیں کیا تھا: As you were (جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا)۔ یہودیوں کے ہاں پہلی تو چیز یہ ہے کہ جنت بنی اسرائیل کے لیے ہی ہے' دوسرا کوئی نہیں جا سکتا' انہوں نے' ان کے بڑے بوڑھوں نے' سبت کے زمانے میں' کچھ گستاخیاں کی تھیں' اس کی سزا بھگتنے کے لئے' کچھ دنوں کے لئے' یہ جہنم کے اندر ڈالے جائیں گے' پھر ان کے بڑے بزرگ آئیں گے اور وہ خدا سے سفارش کریں گے' ان کو وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے' پھر وہ As you were' جیسے پہلے تھے ویسے ہی ہو گئے۔

عزیزانِ من! مسلمانوں کے ہاں بھی نجات کا یہی تصور ہے: حساب کتاب ہوگا' جہنم میں پھینکے جائیں گے۔ اب اس جہنم کے متعلق پھر بزعمِ خویش بڑا فلسفہ بھگارتے ہیں کہ جی! وہ جہنم میں بس ایسے ہے جیسے Sanitorium (سینی ٹوریم) میں' کسی تپ دق کے مریض کو' ڈال دیا جائے۔ وہاں کچھ وہ علاج بھی کرائے' مشقتیں اٹھائے' احتیاط ہو' سب کچھ ہو' آخر میں پھر کیا ہو؟ بخار ہونے سے پہلے جیسا تھا ویسا ہو جائے۔ یہی نجات ہے۔ کوئی کہتے ہیں کہ دھوبی کی وہ بھٹی جہنم ہے' کپڑوں پہ جو آلائش وغیرہ لگ گئی تھی' میلے ہو گئے تھے' بھٹی چڑھا دیا' اس میں سے یہ میل کچیل نکل گئی' کپڑا پھر ویسا ہی سفید ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ یعنی یہ ہے وہ ظلم جو میں بار بار دہرا رہا ہوں کہ یہ ساری گردشیں' یہ سارے چکر' یہ دنیا میں آنا' عبادات' مذہب کی مشقتیں' ریاضتیں' خدا کے احکام کی اطاعت' یہ سارا اس لیے ہے کہ جیسا یہ پہلے تھا کسی طرح سے ویسا بن جائے۔ تصوف والے آئے۔ انہوں نے کہا: یہ اہلِ شریعت والے بات ہی جانتے نہیں ہیں۔ اصل میں بات کچھ اور تھی: تصوف تو ویدانت ہے' ویدانت سے بات شروع کیجیے۔ پہلی بات جو میں نے ہندو دھرم کی کہی ہے وہ ان کی شریعت ہے۔ ان کے ہاں ویدانت میں یہ ہے کہ انسان کی روح خدا کی روح کا ایک حصہ ہے۔ وہاں کسی طرح سے یہ چھٹ کر الگ ہو گئی اور آ کے

یہاں مادے کے دلدل میں پھنس گئی۔ اب یہاں پھنسی ہوئی ہے چیخ رہی ہے، یہ جتنی ریاضتیں ہیں، اسے اس دلدل سے نکالنے کے لیے ہیں۔ مقصد و منتہی وہی کہ جیسے پہلے تھے ویسے ہی ہو جائیں۔

تصوف کی ریاضتیں اور ان کا ماحصل

عزیزانِ من! تصوف کی ریاضتیں تو اہل طریقت سے بھی بڑی سخت ہوتی ہیں، مثلاً یہی رمضان کا ایک مہینہ ہے۔ اس گرمی کے موسم میں دیکھ لیجیے کہ اس میں یہ کتنی مشقت طلب ہیں۔ یہ سارا کچھ کس لیے کیا جائے؟ اس لیے کہ یہ جو خدا کی روح کا ایک حصہ دلدل میں پھنس چکا ہے، وہ دلدل کی کثافتوں سے نکل کر پھر خدا کی روح کے اندر واپس چلا جائے۔ چلیے جی، ملاحظہ فرمائیے خدا کا یہ سارے کا سارا کاروبارِ حیات اور کائنات کا نظم و نسق اور وحی کا نزول، پیغمبروں کا آنا، شریعتیں لانا، احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا، موت، زندگی، حساب کتاب، یہ سب اس لیے کہ جیسے پہلے تھے، کسی طرح سے ویسے ہو جائیں۔

کیا خیال ہے آپ کا؟ اس قسم کے خدا کے متعلق کیا تصور ہے؟ یہی کہ یہ سارا دھندہ اس لیے کیا ہوا ہے کہ جیسا یہ پہلے تھا پھر ویسا ہی ہو جائے۔ تو جیسا یہ پہلے تھا، اسے ویسا رہنے کیوں نہ دیا؟ پھر اللہ میاں کی کاریگری کا ہے کی ہوئی، بھئی! یعنی آخر الامر وہ جو خدا کے اس سارے نظام کا (بقول ان کے) منتہیٰ ہے وہ تو یہ ہے کہ کسی طرح سے پھر ویسا ہی ہو جائے جیسا بخار سے پہلے تھا۔ ان کو بخار چڑھن ای کیوں دتا بھئی۔ اوایس واسطے چڑھنا چاہیے کہ فیر ساڈی ڈاکٹری کیویں چلے۔ او اللہ میاں اپنی ڈاکٹری چلان ڈئے ہوئے نیں۔ بخار چڑھاندے نیں پھر بخار اتاردے نیں، تے او کیندے نیں: چل بھئی، ہن تو ٹھیک ہو گیا۔ [1] کیا ہو گیا یہ؟ کچھ حاصل نہیں ہوا، سعی بے حاصل ہے۔ کتنی بڑی لذت ہے: کیا بات ہے غالب کی:

بس ہجومِ نا اُمیدی، خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

ان اعتقادات سے، اس سعی بے حاصل میں انسان کو ایک لذت ملتی ہے، ملتا ملاتا کچھ نہیں ہے۔ اور بقول ان کے یہ سارے کا سارا خدا کا نظام، خدا کا دین، اس کا اسلام، اس کے پیغمبر، اس کی وحی، الغرض یہ سارا کچھ، اس مقصد کے لیے ہے کہ یہ پھر ویسا ہو جائے، جیسا پہلے تھا۔

عزیزانِ من! قرآن نے آ کر ایک ایک دو دو الفاظ میں یہ سارے تصورات، جتنے بھی چلے آ رہے تھے، باطل قرار دیدیئے۔ اسلام

---

[1] بھئی! اسے بخار چڑھنے ہی کیوں دیا؟ وہ اس لیے چڑھنے دیا کہ ہماری ڈاکٹری چلے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنی ڈاکٹری ہی چلا رہے ہیں: بخار چڑھاتے ہیں پھر اتار دیتے ہیں اور کہتے ہیں: چل بھئی! اب تو ٹھیک ہو گیا۔

میں نجات (Salvation) کا تصور نہیں ہے مفازاً Achievement (تحصیل و تکمیل) ہے' کچھ حاصل ہو جانا ہے' مصیبت سے چھٹکارا نہیں ہے' کچھ حاصل ہونا ہے۔ جیسا پہلے تھا' اس کے بعد' بخار کے بعد' ویسا ہو جانا نہیں ہے۔ یہ کچھ حاصل ہو جانا ہے۔

تکمیل انسانیت کے لیے ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

یہ زندگی کی ارتقائی منازل کے اندر چلے جانا ہے اور ہر منزل میں پہلی منزل سے اونچا ہو جانا ہے' بلند ہو جانا ہے' نشو ونما پا جانا ہے اور حاصل کر لینا ہے۔ یہ مفازاً کا تصور ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ فوز وفلاح کہتے ہیں۔ میں نے' Achievement (تحصیل و تکمیل) کا ایک لفظ ذہن میں آتا ہے' جو کہا ہے' ورنہ مفازاً تو بہت گہری چیز ہے۔ یہ بالآخر تکمیلِ انسانیت کے لیے جو کچھ انسان کو بننا ہے' اس کا وہ کچھ بن جانا ہے۔ یہ ویسے کا ویسا رہ جانا نہیں ہے۔ یہ ساری زندگی' زندگی کی منازل' اس میں یہ اعمال' یہ وحی الٰہی' یہ ریاضتیں' یہ سارا جو کچھ ہے' وہ سب اس لیے ہے کہ انسان کے اندر کی مضمر صلاحیتیں نشو ونما پاتی جائیں۔ اس زندگی میں بھی اس کی یہ سطح بلند ہوتی جائے اور یہ زندگی جوئے رواں ہے' آگے بڑھے' تو پھر ارتقائی منازل طے کرتا ہوا' ہر اگلی منزل' پچھلی منزل' سے ایک درجہ اونچا ہوگا' بلند ہوگا' آگے بڑھے گا۔ یہ ہے جو قرآن کا مفہوم ہے۔

آپ تصور فرمائیے کہ اس ایک عقیدے سے' قرآن نے کس قدر بڑے باطل کے عقائد کی تنسیخ کر کے رکھ دی اور آپ کو یہ ایک مثبت چیز دی ہے کہ ''زندگی کا مقصد کچھ حاصل ہونا ہے۔'' یہ مفازاً (Achievement) (تحصیل و تکمیل) ہے۔ اور پھر اسکی بھی' قرآن کی اسی انداز سے' وہ سمجھانے کے لیے تشریحات ہیں۔ بہرحال یہ اسی دنیا کی چیزیں ہیں' جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس دنیا میں اسی شکل میں حاصل ہونگی' وہاں جانے کے بعد اس کی کیا شکل ہوگی' جیسا میں نے عرض کیا' ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اس دنیا کے لیے کہا ہے کہ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ❶ (78:32-33)۔ حدائق اور اعناب تو بہرحال وہاں ضرور ہوں گے۔ انگور جیسے پھل بھی ہوں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ قرآن نے اس جنت کی تشریحات یہ بھی کی ہیں۔ ٹھیک ہے' یہاں بھی جن قوموں کو یہ چیزیں باافراط اور صالح انداز میں' خالص انداز میں' مل جائیں' ان کی جسمانی نشو ونما تو ان قوموں سے بہتر ہی ہوگی کہ جن کو وہ کچھ جسے قرآن نے ضریع کہا ہے کھانے کو ملے۔ پھر اس نشو ونما کو استعمال کرنے کا جو طریقہ ہے وہ آگے جا کر آئے گا جہاں فرق پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کو صحیح طریقے میں استعمال کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں کاہے کے لیے استعمال کیا جائے؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

---

❶ باغات رہنے کو' انگوروں (جیسے پھل) کھانے کو اور خواتین' تندرست وتوانا' شرف ومجد کی پیکر' ان میں حسد ورقابت کے جذبات نہیں ہوں گے۔ وہ سب ہم مزاج اور ہم گل ہوں گی۔ اس معاشرہ میں' میاں بیوی کے تعلقات بھی کامل ہم آہنگی اور یک گلی کے ہوں گے (56:37)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

انسانیت کی منزل ''رکاوٹوں کو دُور کرنا ہے''

عزیزانِ من! یہ چیز پچھلے دروس میں آ گئی تھی' جب میں نے کہا تھا کہ شیطان کے معنی ہیں: رکاوٹ پیدا کرنے والا' The Hindrer۔حق کے راستے میں جتنی رکاوٹیں آتی ہیں' ان رکاوٹوں کو دُور کرتے چلے جانا تاکہ کاروانِ انسانیت' انسانیت کی منزل تک جا پہنچے۔ یہ ہے دین کا مقصود۔ یہ جو افراد' مومن' جماعت' قوم نشوونما پاتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ وہ جنہیں پسماندہ کہا جاتا ہے' مفلس و محکوم کہا جاتا ہے' ان کے راستے میں جو تم اتنی اتنی رکاوٹیں ڈالتے ہو' یہ قوم ان رکاوٹوں کو دُور کرے تاکہ یہ زندگی کی شاہراہ پہ چلتے ہوئے آگے چلے جائیں۔ یہ ہے دین کا مقصود۔ یہ جو چیزیں یہاں جنت کی زندگی میں بھی ملیں گی ان کا استعمال اس مقصد کے لیے کیا جائے گا۔ **حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا** (78:32) باغات اور انگوروں جیسے پھل اس مقصد کے لیے ہوں گے۔

وَ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا کا مفہوم

عزیزانِ من! آگے بڑھیے۔ اگلی آیت ہے: **وَ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا** (78:33)۔ اس آیت کے تراجم اور تفاسیر میں' تو یوں ہے کہ گویا ان بیچاروں کے اعصاب پہ عورت سوار ہے' ان کی ہر چیز جنسیات کی طرف ہے حالانکہ کواعب وہ چیز تھی' جس کے معنی ہوتا ہے: بڑی تکریم اور عزت کی نہایت معزز خواتین۔ اگر وہ یہ آیت صرف عورتوں کے لیے ہی لینا چاہتے ہیں تو اس ایک لفظ کواعب کے اندر ہی شرافت' عزت' تکریم' یہ سب کچھ' پوشیدہ ہے۔ اس طرح یہ شرف و مجد کی پیکر ہیں اور اسی آیت میں اگلی چیز ہے: **اَتۡـرَابًـا**۔ یہ وہی ہے جو میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ آج جتنا طوفان عورتوں کے حقوق کے متعلق برپا ہو رہا ہے' قرآن کا ایک لفظ ان تمام مسائل کو حل کر دیتا ہے یعنی قرآن کا ''**اَتۡرَابًا**'' کا لفظ۔ ایک مثال سے بات سمجھ لیجیے۔ کمہار کے ہاں کچھ مٹی گوندھی ہوئی رکھی ہوتی ہے۔ اسی مٹی سے وہ آدھا حصہ لیتا ہے' چاک پہ چڑھا دیتا ہے' تو اس سے وہ آب خورے بنا لیتا ہے یا اس سے کوئی دوسرے برتن بنا دیتا ہے' دوسری مٹی جو اسی قسم کی رکھی ہوتی ہے' اس کو چاک پہ چڑھا لیتا ہے۔ وہ صراحی بنا لیتا ہے۔ ان دونوں کی شکلوں کے اندر تو فرق ہوگا مگر مٹی دونوں کی ایک ہوگی۔ فارسی والے ہم گل کہہ کر اس کا ترجمہ کر لیتے ہیں یعنی ایک ہی مٹی۔ اب اگر یہ الفاظ **کَوَاعِبَ اَتۡـرَابًا** ۔ مرد اور عورت دونوں کے متعلق ہیں تو ایک ہی مٹی تھی جس سے کچھ حصہ مرد کے پیکر میں چاک پہ چڑھ کر آ گیا' دوسرا حصہ عورت کے پیکر میں آ گیا' مٹی تو دونوں کی ایک تھی: یعنی یکساں مٹی۔ سوچیے کہ اس طرح سمجھنے سے مرد اور عورت کی مساوات کا کوئی مسئلہ باقی رہتا ہے۔ وہ تو اس پیکر میں میٹریل ہی ایک ہے' شناخت کے لیے آپ کہہ لیجیے شکلیں دوسری ہو جائیں گی۔ یعنی قرآن کا **اَتۡـرَابًـا** کہنا یہ ہے کہ مٹی ایک ہی ہے جس سے یہ بنے ہوئے ہیں۔ اور اگر فرض کرو کہ یہ صرف عورتوں کے متعلق ہے تو میری بیٹیاں سنیں کہ یہ جتنی بھی باہم' آپس میں' عورتوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت اور حسد اور چہ میگوئیاں ہیں' یہ سب کچھ صرف یہی ایک مسئلہ حل کر دیتا ہے کہ ''تم تو ساری ایک ہی مٹی کی بنی ہوئی ہو اس لیے ایک دوسرے

کے متعلق یہ کیا کہتی ہو۔ بیٹیو! تم ایک ہی مٹی کی بنی ہوئی ہو تم سب کی مٹی ایک ہے۔ کسی کو اپنے سے حقیر نہ سمجھو۔ اسے حقیر سمجھو گے تو اپنی مٹی کو حقیر سمجھو گے کیونکہ وہ تو وہی ہے۔ اس مٹی کی عزت کرو گے تو تمہاری مٹی کی بھی عزت ہو جائے گی۔ جیسا اس مٹی کو سمجھو گے ویسی تمہاری پوزیشن ہو جائے گی''۔ کیا بات ہے اَتۡـرَابًـا کی! یہ ایک ہی مٹی مرد اور عورت کے اندر آئے گی تو اس کے اندر مساوات آئے گی۔ اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے۔ یہی تو قرآن کہتا ہے کہ تم اس کی مثل لا ہی نہیں سکتے' اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ **كَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ۝ وَّ كَاۡسًا دِهَاقًا** ❶ (78:33-34)۔ اب ان دو میں سے ایک آیت میں لفظ ''کَـاسـاً'' آیا ہے اور دوسرا ''دھـاقـاً''۔ ''کاس'' تو خیر تشبیہاً پیالے کو ہی کہتے ہیں' یہ ایک عجیب قوم تھی۔ لفظ ''دھاق'' کے اندر خوبیاں ہوتی ہیں: وہ چھلکتا ہوا بھی ہو' یعنی لبریز بھی ہو اور پاکیزہ و مصفیٰ بھی ہو۔ اس پیالے کے اندر یہ دو صفتیں ہوں' یعنی پیالے میں جو کچھ مشروب ہے تو اس کے لیے یہ لفظ آئے گا کہ یہ لبریز بھی ملے اور مصفیٰ پاکیزہ بھی ملے' رزق ملے پاکیزہ ملے اور بھرپور ملے۔ جنت اسے کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بھرپور ملے مگر پاکیزہ نہ ہو۔ اسے عرب ''دھاقا'' نہیں کہتے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکیزہ ہو مگر اس سے ضرورت نہ پوری ہوتی ہو تو پھر بھی عرب اسے ''دھاق'' نہیں کہے گا۔ ان کے ہاں تو جو لفظ رزق ہے اس کے اندر بھی انہوں نے خصوصیت رکھ دی ہے کہ وہ بروقت ملے اور ضرورت پوری کرے۔

رزق کی مختلف خصوصیات

عزیزانِ من! رزق کے معنی تو ''روزی'' ہوتے ہیں۔ مگر اس شرط کے ساتھ یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ بروقت ملے اور ضرورت پوری کرنے کے لیے ملے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ اس کے لیے رزق کا لفظ استعمال کریں گے۔ کیا قوم تھی! کیا قرآن ہے کہ وہ یوں ملے: **كَاۡسًا دِهَاقًا** ❷ (78:34)۔ اور پھر اس میں **لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا كِذّٰبًا** ❸ (78:35)۔ جب انسان ہر قسم کی دولت کے نشے میں آتا ہے تو پھر پوچھو نہیں کہ وہ کیا کیا بکتا ہے۔ مگر یہاں یہ ہے کہ وہ جو رزق ملے گا بھرپور ملے گا اور مصفّٰی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر وہ لغویات میں نہیں الجھے گا' ہمارے ان قوانین کو نہیں جھٹلائے گا' نشہ دولت میں بدمست نہیں ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ رزق حلال بھی تھا اور مطہر اور مصفّٰی بھی تھا' پاکیزہ بھی تھا اور پھر ضرورت کے لیے پورا پورا ملے گا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ ایسا حلال' مطہر و مصفیٰ اور بھرپور ''رزق''

---

❶ خواتین' تندرست و توانا' شرف و مجد کی پیکر' ان میں حسد اور رقابت کے جذبات نہیں ہوں گے۔ وہ سب ہم مزاج اور ہم گل ہوں گی۔ اس معاشرے میں' میاں بیوی کے تعلقات بھی کامل ہم آہنگی اور یک گلی کے ہوں گے (56:37)۔ اور (حیات بخش توانائیوں کا) پاک اور صاف' لبالب' چھلکتا ہوا پیالہ (جو بھرپور اور پاکیزہ زندگی کا ضامن ہوگا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ پاک اور صاف' لبالب' چھلکتا ہوا پیالہ ہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ نہ کوئی بے معنی بات ہوگی' نہ غلط اور جھوٹی گفتگو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کس کے بدلے میں ملے گا؟ اس کے لیے کہا کہ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا ❶ (78:36)۔عزیزانِ من! یہاں پھر لفظ حساب آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا بڑا جامع لفظ ہے۔ کہا کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے ملا ہے۔ حِسَابًا کے معنی ہوتا ہے کہ ''جس کے مل جانے کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہے۔'' کیا بات ہے! جنت کی تفصیلات بیان ہو رہی ہیں: بھرپور رزق' بروقت رزق' مصفیٰ' پاکیزہ' حلال کی کمائی' اتنا ملے کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہ رہے اس لیے کہ دینے والے کی یہ صورت نہیں ہے کہ وہ دے اور پھر دیکھے کہ ''اوہو! آج تو اتنا کم ہو گیا: بھئی! ذرا ہاتھ کو سنبھال کے دو' میاں! دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح سے کمی ہو رہی ہے''۔ یہاں کہا ہے کہ ہم دیتے ہیں تو وہ دینے والا بھی ساتھ ہوتا ہے' کیوں کہ وہ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (78:37) ہے۔تمہاری ہی ربوبیت کا نہیں' ساری کائنات کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ اس کے نظامِ ربوبیت سے جو کچھ ملے گا اس میں کسی بھی وقت یہ کہہ کر کمی نہیں کی جائے گی کہ صاحب! اس دفعہ فصل کم ہوئی ہے' حاصل کم ہوا ہے' یہی ہمارے ہاں کے ڈیمز (Dams) کے اندر پانی کم رہ گیا ہے تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا کیا کاروبار بند ہو رہے ہیں۔ روز یہ ہو رہا ہے' سنبھال کے برتو' کفایت کرو' یہ ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری ربوبیت کے اندر تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ او پوری کائنات کی ربوبیت ہمارے ذمہ ہے' اس میں سے کچھ کم نہیں ہوتا' تم کتنا لے جاؤ گے اس کے اندر سے! اس نے تو رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (78:37) کائنات کی ہر شے کے لیے سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے۔ اس آیت میں بَيْنَهُمَا بہت غور طلب ہے۔

کائنات کی لامحدود وسعتوں کے اندر مہذب قوموں کا وجود اور نظامِ ربوبیت

عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ سائنسدان بھی اس سے پیشتر تصور نہیں کرتا تھا کہ یہ خلا جو کرّوں کے اندر واقع ہوا ہے' وہ یہی نہیں ہے جو ہمیں نظر آتا ہے بلکہ اس کائنات کی پہنائیوں کے متعلق تو پوچھو نہیں کہ یہ کس قدر لاحساب ہیں' ان پہنائیوں کے اندر خلا کو سمجھنے کے لیے اسے محض خلا ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس دور کے اندر اس پہ تحقیق ہو رہی ہے اور اسی لیے یہ کرّوں پہ جا رہے ہیں۔ ان کروں کے اندر بھی آبادی ہے۔ قرآن نے چودہ سو سال پیشتر کہا تھا کہ ان میں آبادی ہے۔ میں نے تو غالباً آج ہی صبح ❷ کے اخبار میں یہ دیکھا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے حساب کے اندر ایسے ایسے کرّے آ رہے ہیں کہ جن میں سینکڑوں صدیوں کی تہذیبیں مضمر ہیں۔ یعنی ہم جو اس ارض کے اتنے سے خطے کے اوپر یہ کچھ کر رہے ہیں اور پھنے خاں بنے ہوئے ہیں کہ ہم نے تہذیب و تمدن میں کمال حاصل کیا' وہ آج کہہ رہے ہیں کہ اس تحقیق کا سلسلہ 1988ء میں شروع ہو گا لیکن جتنا Data' مواد و معلومات کے اعداد و شمار اس وقت تک ہمارے ہاں آیا ہے اس

---

❶ یہ سب' تیرے نشو و نما دینے والے کی طرف سے' ان کے اعمال کا نتیجہ ہو گا اور ان کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ بات جون 1984ء کی پہلی تاریخ کو کہی گئی ہے۔

سے نظر آتا ہے کہ وہ مہذب قومیں ہیں اور بڑی کہنہ مہذب ہیں' پتہ نہیں کب سے وہ اس طرح سے چلی آ رہی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کے الفاظ میں ایک ایک حقیقت پہ پڑا ہوا پردہ جب اٹھے گا تو قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتا چلا جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ ❶ (78:37)۔ آپ کو معلوم ہے کہ جو رحیمیت اور رحمانیت ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں' مسلسل دینے والا' یہاں کہا کہ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ارض وسما کا نشو ونما دینے والا۔ رحمیت میں وہ ربوبیت کے اندر لے کر آ گیا۔ ہنگامی ضرورتوں کے مطابق کچھ دینے والا وہ رحمٰن کے اندر آ گیا۔ نارمل یعنی معمول کے مطابق بھی یہ ہوتا جائے گا' ہنگامی طور پر ضرورت پڑے گی تو اس میں بھی ربوبیت ہوتی چلی جائے گی اور پھر اس کی کیفیت یہ ہے کہ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ❷ (78:37)۔ اس میں Interfere (مداخلت) کرنے کی کسی کو اجازت نہیں' کوئی اس میں دخل نہیں دے سکے گا' کیونکہ وہی ان تمام چیزوں کا مالک اور وہی ان تمام چیزوں کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ اس لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (78:37) میں بہت بڑی بات آ گئی۔

اِرض پر خدا اور ملائکہ کے نزول کی حقیقت

عزیزانِ من! وقت کم رہ گیا ہے۔ مختصراً آگے بڑھتا ہوں۔ اگلی آیت ہے کہ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ❸ (78:38) قرآن نے یہ ایک عجیب دَور بتایا ہے کہ وہ اس ارض پر آئے گا۔ وہ آیت غالباً آپ کے ذہن میں ہو جہاں قرآن نے کہا ہے کہ خدا اور اس کے ملائکہ اس ارض کے اوپر' اس دَور میں آئیں گے۔ یہ جو ہم جائیں گے' وہ تو الگ بات رہی۔ قرآن تو کچھ اس قسم کا تصور دے رہا ہے کہ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ ❸ (78:38) روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ ملائکہ تو یہ کائناتی قوتیں ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ قرآنِ کریم میں الروح' وحی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ باطل کے نظام میں اس دنیا کا اس وقت جو کچھ بھی جہنمی نقشہ ہے' اس میں کس چیز کی کمی ہے؟ سارا کچھ ہے۔ کائناتی قوتیں بے حساب چلی آ رہی ہیں لیکن وہ وحی کی راہنمائی کے اندر کام نہیں کر رہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان روحانیت والے یا شریعت والے لوگوں کے تصور کے مطابق یہ ہو کہ ہم وحی کی راہنمائی میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں یہ کائناتی قوتیں نہیں ہوتیں۔ ان کے ہاں کائناتی قوتیں اور وحی کی رہنمائی دونوں الگ الگ چل رہی ہوتی ہیں۔

---

❶ اُس نشو ونما دینے والے کی طرف سے ہے' جس نے کائنات (ارض وسما اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) کی ہر شے کے لیے سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے۔

❷ وہ ایسا صاحب اقتدار ہے کہ کائنات کی کسی شے کو اس کی مجال نہیں کہ وہ اس کے کسی کام میں دخل دے سکے یا اس سے باز پرس کر سکے۔

❸ اُس دور میں (یعنی ظہور نتائج کے وقت) الوہیاتی توانائی (جو عالم امر میں کارفرما ہے) اور کائناتی قوتیں (جو عالم خلق میں کارفرما ہیں) صف بستہ کھڑی ہوں گی (تا کہ وہ انسانی اعمال کے نتائج سامنے لائیں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اہل مغرب کی جہنمی زندگی کی وجہ جواز

عزیزانِ من! صحیح نظامِ خداوندی وہ ہے کہ جس میں کائناتی قوتیں اور وحی کی راہنمائی دونوں ایک صف میں کھڑے ہو کر سامنے آ جائیں۔ یہاں کہا ہے کہ **يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا** (78:38) اُس دَور میں ایک صف میں' آگے پیچھے بھی نہیں' وحی کی راہنمائی کا' کائناتی قوتوں کے ساتھ' طبعی قوتیں جتنی بھی ہیں' کا امتزاج ہوگا۔ مغرب نے ساری دنیا کو اس لیے جہنم بنا دیا ہے کہ کائناتی قوتوں کو مسخر کرتے چلے گئے اور پھر ان کو اپنی قومیت کے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے دنیا کو مذبحہ بنا دیا' جیل خانہ بنا دیا' عقوبت خانہ بنا دیا' قومیں تباہ کر کے رکھ دیں اور یہ اس لیے ہوا کہ اُن کے پاس وحی کی راہنمائی نہیں جبکہ مذہب اس چیز کا مدعی ہے کہ ہم وحی کی راہنمائی میں کام کر رہے ہیں' مگر اس نے کائناتی قوتوں کو ترک کیا' اس کے خلاف نفرت پیدا کی' اس کے خلاف سرکشی کو جنم دیا اور الگ رہ گیا۔ ایک پر سے تو کوئی پرندہ بھی نہیں اڑ سکتا' ہوائی جہاز تک نیچے آ گرتا ہے' لہٰذا وہ دو پر نہایت ضروری ہیں۔ آدم کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز ہوتے ہیں تو اس کے بعد اسے کہا جاتا ہے کہ **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** [1] (2:38)۔ ملائکہ کا سجدہ ریز ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ یاد رکھو! اس سے تمہیں ابلیس ذرا سا بہکائے گا تو وہ جاؤ گے جنت سے باہر۔ خدا کی راہنمائی ساتھ ہونی چاہیے۔ پھر ملائکہ کی یہ قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ یہ ہے جو قرآن یہاں کہہ گیا ہے کہ وہ دَور جس میں اس دنیا کے اندر جنتی نقشہ برپا ہوگا' اس میں یہ صورت ہوگی کہ کائناتی قوتیں اور وحی کی راہنمائی دونوں ایک صف میں کھڑی ہونگی۔

کائناتی قوتوں کا وحی کے ساتھ ربط

عزیزانِ من! جب کائناتی قوتیں اور وحی کی رہنمائی ایک صف میں کھڑی ہوں گی تاکہ وہ انسانی اعمال کے نتائج سامنے لائیں تو **لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا** [2] (78:38)۔ اس کے اندر' جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کوئی اور Interfere (مداخلت) نہیں کر سکے گا' صرف وہ ہوگا جو خدا کے قانون کے مطابق بات کرے اور وہ بات موقع محل کے لحاظ سے مفید ہو۔ وہ یہ لوگ ہونگے' جن کے متعلق ذکر آ رہا ہے کہ جو اس کائناتی قوتوں اور وحی کی راہنمائی کے امتزاج سے معاشرہ متشکل کریں گے۔ ان کی اپنی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ کوئی بات بھی وہ ایسی نہیں کریں گے جس میں خدا کا قانون اس کے ساتھ نہ چلے۔ خدا کے قانون کے مطابق یہ

---

[1] ہماری طرف سے' ہمارے رسولوں کی معرفت (7:35) تمہاری طرف رہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے (20:123-24) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] کسی کو یارائے تکلم نہ ہوگا (بات کرنے کی مجال نہیں ہوگی) بجز اُس کے جو خدائے رحمٰن کے مقرر کردہ قاعدے کے مطابق درست بات کہے۔ (ایضاً)

کچھ کریں گے۔ ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ ❶ (78:39) یہ الحق کا دَور ہوگا۔ غور فرمالیا' اسے الحق کا دَور کہا ہے۔ یہ ہے الحق کا دَور۔ لہٰذا اس کے لیے دروازے کھلے ہیں کہ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا (78:39) جس قوم کا جی چاہے آ کر داخل ہو جائے' کسی کے لیے دروازے بند نہیں ہیں لیکن اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا ❷ (78:40)۔ یہاں پھر دیکھ لیجیے کہ لفظ ''قریبًا'' آ گیا: تمہارے لیے عذاب' تباہی اور بربادی قریب ہے۔ ہم نے تمہیں اس کے متعلق Warn (آگاہ) کر دیا ہے۔ کیا بات ہے اس خدا کی! پہلے وہ Warn (آگاہ) کرتا ہے کہ اس کے قریب نہ جانا' تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے' مر جاؤ گے۔ یہ قریباً کا لفظ ہے۔ وہ قریب آنے والا دن کیا ہوگا؟ اس کے فوراً بعد کہا کہ یہ وہ دن ہے یَوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰہُ (78:40) جس دن ہر فرد دیکھ لے گا۔ کیا چیز دیکھ لے گا؟ وہ سب کچھ جو اس نے پہلے بھیجا ہوا ہوگا۔

عمل پہلے' نتیجہ بعد میں

عزیزانِ من! قرآن کی یہ کیا Term (اصطلاح) ہے۔ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے نتیجہ ہمیشہ اس کے بعد نکلتا ہے۔ کہا ہے کہ مَا قَدَّمَتۡ (78:40) جو کسی کے اپنے ہاتھ نے پہلے بھیجا ہوگا۔ کسی نے چار دن رہنے کے لیے آنا ہے۔ یہاں کچھ چیزیں وہ پہلے بھیج دیتا ہے کہ میں جہاں جاؤں تو وہ چیزیں وہاں موجود ہوں۔ اس کے مطابق مجھے وہاں جا کر انتظام کرنا ہے۔ پہلے بھیجا ہوا تمہارا ہی بھیجا ہوا ہے' کسی اور کا نہیں ہے' یہ بھی نہیں ہے کہ ہم نے کچھ بخشش کے طور پر دیا ہوا ہے۔ یہ تمہارا ہی بھیجا ہوا ہے۔ کیا بھیجا ہوا ہے؟ اگر زہر بھیجا ہوا ہے تو تباہی آ جائے گی' تریاق بھیجا ہوا ہے تو زندگی ملے گی۔ یہ ہے قَدَّمَتۡ یَدٰہُ (78:40)۔ جنہوں نے قانون کی خلاف ورزی کی تھی' ان کا جو انجام بتایا ہے' اس کے بارے میں کہا کہ وَیَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا (78:40)۔ اس وقت جو شخص اُس کے واقع ہونے سے انکار کرتا ہے' وہ حق کے سامنے اس عذاب کو دیکھ کر کہے گا کہ اے کاش! میں صاحبِ اختیار ہونے کی بجائے مٹی کا تودہ ہوتا تو اب مجھ سے باز پرس تو نہ ہوتی۔ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے!

عزیزانِ من! جن کو حساب کا پتہ تھا' ڈر تھا' وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-645AD) کے شہادت (24AH) کے آخری الفاظ یاد رکھیں۔ انہوں نے خشک تنکا اٹھایا' کہا کہ عمر! تو عمر ہونے کی بجائے یہ تنکا ہوتا تو آج تجھے حساب کا ڈر نہ ہوتا۔ یہ مطلب ہے کُنۡتُ تُرٰبًا کا۔ کہ وہ کہے گا کہ اے کاش! میں صاحبِ اختیار انسان نہ ہوتا' مٹی کا تودہ ہوتا۔

---

❶ یہ دَور ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کے واقع ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ہم تمہیں آگاہ کیے دیتے ہیں کہ (اگر تم نے یہ راہ اختیار نہ کی تو) تم پر بہت جلد تباہی آ جائے گی۔ (ایضاً)

عزیزانِ من! یہ سورۃ النباء، 78 ویں سورۃ کی آخری آیت تھی۔ اگلے درس میں، انشاء اللہ، ہم سورۃ النّٰزعٰت لیں گے۔ یہ عجیب وغریب سورۃ ہے۔ وہاں قرآن بتائے گا کہ یہ جو جماعتیں اس طرح تیار کی جا رہی ہیں، وہ کیا ہیں؟ ملائکہ اور روح کا فنکشن (عمل) کیا ہے؟ دین کا مطلب کیا ہے؟ اسلام کے معنی کیا ہیں؟ جماعتِ اسلامی کا ہے کے لیے وجود میں لائی جاتی ہے؟ یہ پانچ آیات ہیں، دو دو الفاظ کی آیات ہیں۔ اس طرح ان دس الفاظ میں پورا نظام آ جاتا ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀ ...... ❀ ...... ❀

چوتھا باب: سورۃ النازعات (آیات 1 تا 5)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1984ء کی 8 تاریخ ہےاوردرسِ قرآنِ کریم کا آغازسورۃ النّٰزعٰت سے ہورہاہے: (79:1)۔ جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں کہا تھا کہ اس سورۃ کی پہلی پانچ آیات دودو الفاظ پرایک ایک آیت مشتمل ہے۔ جہاں تک میری بصیرت کام دیتی ہے دین کا پورا ملخص' اسلام کا منتہٰی' ملتِ اسلامیہ کا فریضہ حیات' کائنات میں ایک نظامِ نو کی تجویز' یہ تمام چیزیں' ان دس لفظوں کے اندر اعجاز اور جامعیت سے سموئی گئی ہیں۔ آپ میری تو کیفیت سمجھ سکتے ہیں کہ میں جب بھی ان کے اس اسلوب بیان اور جامعیت پر غور کرتا ہوں' وجد میں آجاتا ہوں۔ اور جہاں تک اس کی عظمت اور جبروت کا تعلق ہے وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ **لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ** (59:21) اگر ہم اس قرآن کو قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساس عطا کر دیتے) تو' تو دیکھتا کہ وہ اس کی جبروت وعظمت کے احساس سے وہ لرز اٹھتا۔ قلبِ کوہ میں اتر تا تو وہ لرز اٹھتا انسان تو بہرحال سنگ وخشت نہیں ہے۔ میری کیفیت یہی ہوتی ہے۔ جب بھی میں ایسے مقامات پہ آتا ہوں تو اس کے اس جبروت و عظمت سے لرز اٹھتا ہوں اور پھر انہیں' اپنے الفاظ میں بیان کرنا' ان کی تشریح کرنا' بڑا ہی جرأت طلب معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کر میں' ان چیزوں پر آتا ہوں ورنہ ہمت نہیں پاتا۔ وہ ❶ ٹھیک کہہ گیا تھا کہ

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اس کے لیے نفسِ جبرئیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کہاں اور یہ مقام کہاں! کوشش کرونگا کہ اپنی بساط کے مطابق میں کچھ عرض کرسکوں لیکن پہلے اس کے لیے کچھ تمہیدی تعارف کی ضرورت ہوگی۔

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

فرد کی انفرادیت سے لے کر ایک ایک قوم کی انفرادی سوچ کا ماحصل

عزیزانِ من! دنیا میں پہلے افراد کو لیجیے۔ ہر فرد کا مقصداً اگر وہ مذہب پرست ہے' تو اس کی اپنی نجات ہے۔ وہ اپنی اسی نجات کی فکر میں غلطان و پیچاں رہتا ہے۔ اپنی نجات کے لیے کوشش کرتا ہے' سعی و کاوش کرتا ہے' مشقتیں کرتا ہے' ریاضتیں اٹھاتا ہے۔ اسے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ہمسائے کی نجات بھی ہوتی ہے یا نہیں' اپنی نجات کی فکر ہے۔ دنیا دار ہے تو اس کے لیے اپنی زندگی' خوشحالی کی زندگی' فارغ البالی کی زندگی' کامیابی کی زندگی' کی فکر ہے۔ اگر آپ افراد سے لے کر اقوام تک جاتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ہر قوم اپنے استحکام' اپنی توانائی' اور اپنے غلبہ' کی فکر میں رہتی ہے خواہ اس کے لیے اسے دوسری دس اقوام کا خون بھی کیوں نہ نچوڑنا پڑے۔ قوم کا ہیرو وہ ہوتا ہے جسے Patriotic (محبّ وطن) کہتے ہیں۔ یہ محبّ وطن کیا ہوتا ہے؟ وہ جو اپنی قوم کے مفاد کے لیے ہر قوم کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ یہ اقوام کے اندر جو بڑے بڑے مجسمے کھڑے ہوتے ہیں' اور تاریخ میں جن کے نام سنہری حروف سے لکھتے ہیں' وہ کون ہوتے ہیں؟ جو اپنی قوم کے لیے ہر قسم کی مفاد پرستیوں کی تلاش کے حصول میں مصروفِ تگ و تاز ہوتے ہیں' جن کے نزدیک صرف My Nation' My Country ہوتا ہے بلکہ Wrong (باطل) or (یا) Right (حق) بھی اسی پہ ہوتا ہے' یعنی میرا وطن' میرا ملک' میری قوم' خواہ وہ غلط ہے' خواہ صحیح ہے مجھے اس کے لیے کچھ کرنا ہے۔

عزیزانِ من! ایک مفکر [1] کے الفاظ ہیں ''جو کچھ ہم اپنے وطن یا قوم کے لیے' ملک کے لیے' کرتے ہیں اگر وہی کچھ نجی طور پر اپنی ذات کے لیے کریں تو کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔'' شیطان تو وہ پھر بھی کہلاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی وہ قوم اُن کو ہیرو بناتی ہے' ان کی پرستش کرتی ہے' ان کے مجسمے کھڑے کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کے غلبہ اور استیلاء' قوت و استحکام کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ پتہ نہیں انہوں نے کتنی قوموں اور کتنے انسانوں کا خون کیا۔ اس کی انہیں پرواہ نہیں ہے۔ دنیا میں اس وقت جو کشت و خوں اور فساد انگیزیاں ہو رہی ہیں وہ اس لیے ہیں کہ ہر قوم اپنے غلبہ اور تسلط اور استحکام کی فکر کرتی ہے' دوسری قوم کی اس کو فکر نہیں ہوتی۔ ہر قوم اپنے لیے جی رہی ہے۔ پوری تاریخ اس کی چلی آ رہی ہے اور آج یہ واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ہر فرد اپنی فکر میں ہے۔ مذہب پرست اپنی نجات کے لیے ہے' دنیا دار اپنی کامیاب زندگی کے لیے ہے۔ یہاں اپنی سے مراد زیادہ سے زیادہ اپنے بال بچوں کی اور اپنے خاندان کی زندگی کی فکر ہے۔ ذرا اور آگے بڑھے تو پھر قوم آئی اور ہر قوم اپنے فروغ اور اپنی کامیابی کے لیے غلطاں و پیچاں ہے' اسے دوسرے کی فکر

---

[1] اس مفکر کا نام ہے کیور (Cavour)۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

" If we did for ourselves what we do for our country, what rascals we should be ". (Cavour, Foreign Affars, July 1952) .

نہیں ہے۔ تاریخ کے انہی ادوار میں ہمیں ایک اور قوم نظر آتی ہے: بالکل نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا۔ یہ نرالی قوم، ایک انوکھی قوم، نادر قوم، تاریخ میں استثنیٰ رکھنے والی قوم ہے۔ ابھی ابھی ہم نے کہا ہے کہ یہ جتنی قومیں تھیں ان میں سے ہر قوم اپنے لیے ہے۔ ان کا ہر ہیرو (Hero) اپنی قوم کے لیے ہے اور اس کے برعکس قرآن نے ایک قوم پیدا کی جس کے لیے کہا کہ **کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ** (3:109) تم وہ بہترین قوم ہو جسے ہم نے انسانیت کی بھلائی کے لیے پیدا کیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہ مقامات ہیں جہاں قرآن بے مثل و بے نظیر نظر آتا ہے۔ پہلے دن، جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی اور تاریخ مرقوم ہوئی ہے، آج تک تاریخ میں کسی مقام پہ یہ نظر نہیں آئے گا کہ کسی قوم سے کہا گیا ہو کہ تمہیں ہم نے پیدا کیا تا کہ تم نوعِ انسانی کی بھلائی کرو۔ اس قوم کی بعثت کی وجہ جواز یہ ہے بلکہ اس کی تخلیق کا سبب اور موجب یہ ہے، اس کا فریضہ حیات یہ ہے۔ قرآن نے **اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ** کہا ہے۔ عربی زبان میں یہ جو للناس کا "ل" ہے، یہ ہوتا ہے فائدے کے لیے یعنی الناس کے فائدے کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے۔ تو اب یہ دیکھ لیجیے کہ قرآنِ حکیم کیا کہہ گیا۔ خدا نے یہاں دنیا میں ایک نئی قوم پیدا کی اور اس کا فریضہ حیات یہ بتایا۔ اسے (لِلنَّاس) یعنی نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کے رسول ﷺ کے متعلق کہا گیا کہ اس کا فریضہ، اس کی بعثت کا مقصد یہ ہے: **وَ یَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ** [1] (7:157)۔

نبی آخرالزمان ﷺ اور اس کی امت کا فریضۂ حیات نوعِ انسانی کو ہر نوعِ غلامی سے نجات دلانا ہے

عزیزانِ من! آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسانی جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے یہ ان زنجیروں کو توڑے، اپنی نہیں، اپنی قوم کی نہیں، اپنے وطن کی نہیں، پوری انسانیت کی، ان زنجیروں کو توڑے، ان کے سروں کے اوپر جتنی بڑی بڑی بوجھل سلیں رکھی ہوئی ہیں، ان سلوں کو اتار پھینکے۔ نوعِ انسانی کی زنجیروں کو توڑنے والا، جن بوجھوں کے تلے انسانیت دب رہی ہے انہیں اتارنے والا۔ یہ ہے بعثت کا مقصود۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا ہی نہیں، رسالت کا مقصود بھی یہ ہے اور یہی مقصدِ رسالت، رسول اللہ ﷺ کے بعد وراثت کتاب اللہ کے ذریعہ امت کو آجاتا ہے۔ اس طرح یہ اس امت کا فریضہ قرار پا جاتا ہے۔ یہ وہ امت ہے، اور یہ اس کا دین ہے۔ (90:10)۔ عزیزانِ من! اسی سورۃ کی 10 آیات سے آگے تین چار آیات ہیں۔ پہلے کہا کہ **وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ** (90:10) یہاں انسان کو ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے۔ اس چوراہے پر سے دونوں راستے جہاں جاتے ہیں، ان میں سے ایک راستہ ایسا ہے جسے یہ عام

---

[1] وہ (مذہبی پیشواؤں کے جن خود ساختہ آئین و شرائع اور مستبد حکام کے جور و ستم کے) جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی، اُس بوجھ کو اُس کے سر سے اتارتا ہے اور (تقلید و اوہام کی جن زنجیروں میں انسانی قلب و دماغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے (76:4)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

طور پہ اختیار نہیں کرتا: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ❶ (90:11)۔عقبۃ کے معنی ہوتے ہیں: پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا۔راستہ ہے اور وہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔یہ بڑا دشوار گزار ہوتا ہے' قدم قدم چڑھا جاتا ہے' ہر قدم پہ سانس پھول جاتی ہے' انسان تھک جاتا ہے' کھڑا ہو جاتا ہے۔کہتا ہے کہ یہ گھاٹی پہ چڑھنے کا راستہ ہے: وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ (90:12) تم پوچھو گے کہ یہ کونسا راستہ ہے جسے گھاٹی پہ چڑھنے کا اتنا دشوار گزار راستہ بتایا ہے۔کہا کہ یہ دین کا راستہ ہے' اسلام کا راستہ ہے' اس قوم کا فریضہ زندگی ہے۔اب یہاں بھی کہا کہ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ (90:12) تمہیں خدا کے سوا کون بتائے گا کہ یہ عقبۃ کیا چیز ہے؟ جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ یہ بڑا دشوار گزار راستہ ہے' یہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! غور سے سنیے گا دو لفظ ہیں۔کہا کہ فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) دنیا میں ہر غلام کو غلامی سے آزادی دلانا۔یہ دین کا مقصد ہے۔کہا کہ یہ ہے وہ دین کا صحیح راستہ جو ہم نے ان کو بتا دیا لہٰذا یہ ہے پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا۔لفظ کے اعتبار سے تو دنیا میں اگر کسی کی گردن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے' جس کو محکومی اور غلامی کہتے ہیں' اس سے آزادی دلانا ہے۔ قرآن تفصیل میں نہیں جاتا کہ تفصیل میں جانے کے لیے تو ایک جداگانہ کتاب لکھنی پڑے گی کہ غلامی اور محکومی ہوتی کیا ہے۔اس کا تو سوال ہی نہیں ہے' وہ تو ایک لفظ میں ساری بات کہہ جاتا ہے۔کہا کہ فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) غلامی اور محکومی میں جو گردنیں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں ان کو آزاد کرانا۔

رزق کی محتاجی ہر قسم کی محکومیت کو جنم دیتی ہے

عزیزانِ من! میں اگلی دو تین آیتوں میں اور بھی عرض کر دوں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے' کس کس قسم کی غلامی ہوتی ہے۔یاد رکھیے! سب سے بڑی غلامی محتاجی کی ہوتی ہے' مثلاً رزق کی محتاجی' ضروریاتِ زندگی کی محتاجی۔محکومیت تو اس کے پیچھے خود بخود چلی آتی ہے۔یہ جتنے مستبد حاکم ہوتے ہیں وہ رزق کے سرچشموں پر اپنا کنٹرول رکھتے ہیں' ان کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس کے بعد پھر جب وہ روٹی کے ہاتھوں محتاج ہو جاتے ہیں تو پھر ہر قسم کی غلامی ان کے نصیب میں آ جاتی ہے۔غلام ہوتا ہی محتاج ہے۔جو کسی کا محتاج نہیں وہ غلام ہوتا ہی نہیں۔یعنی وہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں' پنجابی کے اندر کبھی کبھی وہی ذہن میں آ جاتی ہیں: ''اُوئے اسی کسے دا دتا

---

❶ ان دو راستوں میں سے ایک راستہ ذاتی مفاد پرستی کا ہے۔یعنی جس طریق سے بھی ہو سکے' دوسروں کی محنت کا ماحصل غصب کر لینا اور یوں تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کرنا۔انسان کی عقل حیلہ جو اس سے کہتی ہے کہ یہ راستہ بڑا آسان ہے۔اُسے اِسی کو اختیار کرنا چاہیے۔اس کے مقابلے میں دوسرا راستہ بڑا محنت طلب اور صبر آزما ہے۔یوں سمجھو گویا یہ پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ہے' جس میں قدم قدم پر انسان کی سانس پھول جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں ہر قدم انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

کھانے آں۔'' ❶ یہ بڑی چیز ہے کہ ہم اس کے طفیل کیوں ہوں۔ یہ چیز ہے جہاں سے محکومی اور غلامی کی ابتدا ہوتی ہے۔ گردنوں میں زنجیریں ڈالی جاتی ہیں۔ یہاں کہا کہ ابتدا اس پروگرام کی ہوگی اور اس وقت ہوگی اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (90:14) جب ضروریات زندگی کی کمی واقع ہوجائے' قحط واقع ہوجائے' تو اس میں پھر ایسی صورت پیدا کرنا کہ کوئی ان ضروریات سے محتاج نہ رہے۔ یہ دین کی گھاٹی ہے' یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔ یہ ہے دین کا وہ راستہ۔ یعنی دنیا میں ہر شخص کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا۔ اس میں پہلا قدم یہ ہے کہ یہ جو رزق کی روٹی کی احتیاج ہے' یہاں سے اس کی ابتدا کی جائے۔ کہا کہ اس قسم کے حالات میں ہر فرد کی ضروریات زندگی پورا کرنا' یہاں تک کہ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ❷ (90:15)۔ عزیزانِ من! کیا باتیں ہیں دو دو لفظوں کی! یہاں کہا کہ وہ جو اپنے آپ کو بھری سوسائٹی میں' انسانیت میں' بھرے شہروں میں' پوری آبادی کے اندر بھی' اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے اس کو تنہا محسوس نہ ہونے دینا۔ غور فرما رہے ہیں کہ یہ دین کیا چیز ہے' پھر کہا کہ ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15) یہ نہیں ہے کہ وہ کسی صحرا میں ہے' کسی جنگل میں ہے' کسی سنسان وادی میں ہے۔ جہاں کوئی انسان نہیں' وہاں تو بہر حال اسے تنہا ہونا ہی ہے۔ یہ تنہائی وہ نہیں ہے جو غلامی کی تنہائی ہے۔ تنہائی تو یہ ہے کہ بھری محفل میں' پوری آبادی کے اندر' جہاں یہاں سے لے کر وہاں تک تمام انسان قریب ہوں اور وہ پھر بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں۔

پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لیے پہلے قدم کی تفصیل

عزیزانِ من! دُور نہ جائیے۔ اپنے حالات پہ غور کیجیے اور کہیے کہ کیا ہم اس معاشرے کے اندر' یتیم ہیں یا نہیں؟ ہم میں سے ہر فرد یتیم ہے۔ جس پہ آ کر پڑتی ہے' اسی کو بھگتنی پڑتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ o اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ❸ (90:15-16)۔ اسے چھوڑیئے کہ جو کچھ کام ہی نہیں کر سکتا' اسے لیجیے جس کے کام کی کیفیت یہ ہے کہ وہ بیچارہ صبح سے شام تک خاک آلود مٹی میں لتھڑا رہتا ہے' اس کے باوجود اس کے لیے حرکت کا سامان پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک مقام کے اوپر کھڑا ہے' آگے نہیں چل سکتا۔ ان حالات میں ہر مزدور جس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ پہلے دن سے جو اس نے گارا اور مٹی ڈھونا شروع کیا' عام الفاظ میں بھی اینٹیں اٹھانی شروع کی ہیں تو وہ ساری عمر یہی کرتا چلا آتا ہے یعنی زندگی میں اس کا ایک قدم آگے نہیں بڑھتا' وہیں چکر کاٹ رہا ہے' صبح سے شام تک

---

❶ ارے! کیا ہم کیا کسی کا دیا ہوا کھاتے ہیں! یعنی ہم کسی کے غلام نہیں۔

❷ ان لوگوں کے رزق کی فکر کرنا جو معاشرے میں' ہزار ہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی' اپنے آپ کو تنہا پائیں۔

❸ جو معاشرے میں ہزار ہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائیں۔ یا ان لوگوں کے رزق کی فکر کرنا جنہیں اس حالت تک پہنچا دیا گیا کہ وہ محض روٹی کی خاطر مٹی میں رلتے ہیں۔ (یعنی سرمایہ داروں کے محتاج رہ کر ان کے لیے محنت و مشقت کے کام کرتے رہیں۔)
(مفہوم القرآن۔ پرویز)

یہی کیفیت ہے۔ مسکین ہے یعنی یہ ساکن ہوگیا ہے اور زندگی تو حرکت کا نام ہے: حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں' حرکت ہے تو زندگی ہے۔ عام طبعی طور پہ بھی کہا جائے گا کہ زندگی حرکت سے ماپی جاتی ہے۔ کوئی کیڑا مکوڑا' کسی بھی قسم کا' کہیں بھی ہو' یونہی چپ کر کے بیٹھا ہوا ہو' یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ زندہ ہے یا مردہ ہے' ذرا سا اس کو چھیڑا جاتا ہے' اگر اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ زندہ ہے۔ اگر وہ ساکن رہتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ زندہ نہیں ہے۔

یہ عرب تو قوم ہی عجیب تھی۔ سانپ اس طرح سے کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا ہو اور پتہ نہ چلے کہ یہ زندہ ہے یا مردہ ہے تو اس کے لیے یہ ہوتا ہے کہ ذرا دُور سے تھوڑا سا چھیڑ کر دیکھیے' اگر وہ یوں حرکت کرتا ہے تو زندہ ہے۔ اِسے یہ حرکت کہتے ہیں۔ حیات کا لفظ ہی یہاں سے نکلا ہے۔ حیات اور حرکت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں فرد کی' یا قوم کی زندگی جامد ہو جائے' آگے نہ بڑھے' حرکت نہ کرے تو یہ ہے وہ غلامی کی زنجیر جس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وہ **مِسۡکِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ** ہیں۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے **ذا متربةٍ** کی! اس کی کیفیت یہ ہے کہ صبح سے شام تک مٹی میں ملا ہوا ہے' اتنی محنت کرنے کے باوجود وہیں کا وہیں کھڑا ہے بلکہ پیچھے کو لوٹ جائے گا آگے بڑھنے کی بات نہیں ہوگی۔ اب یہ آ گیا **فَكُّ رَقَبَةٍ** (90:13) [1] کا پہلا قدم! تو آپ نے غور فرمایا کہ دین کا منتہیٰ' مقصود' ملخص کیا ہے؟ بس یہی **فَكُّ رَقَبَةٍ**۔ اب قرآن اس کی تفصیل میں نہیں جا رہا۔ اس نے اس کا صرف ایک گوشہ بتایا ہے کہ اس رقبۃ کی' اس گردن میں زنجیریں ڈالنے کی' اس محکومی اور غلامی کی' ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب رزق کو دوسرے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ کہا کہ یہاں سے اس نظام کی ابتدا کی جائے گی اور پھر یہ پہلے قدم ہونگے جو پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کے لیے ہونگے۔

یہ بتایا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ دین کیا ہے؟ پھر کہا کہ یہ ہے دین۔ اور دین کی ابتدا ہے یہاں سے: فک رقبةٍ۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے' وہ قوم' جس کو یہ حکم تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی محکوم اور غلام نظر آئے' تو تمہارا فریضہ یہ ہے کہ اس کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اسے آزاد کر دو۔ کیا وہ قوم آزاد لوگوں کو غلام بنائے گی؟ اور اب آپ کی تاریخ' جس کو پھر آپ ''اسلام کی تاریخ'' کہہ رہے ہیں' اس کے عہدِ ملوکیت کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ آپ کے سلطان کے ایک ایک گھر میں تین تین ہزار غلام لونڈیاں موجود ہیں اور اس پہ اب تک بحث چلی آ رہی ہے۔

مملکت پاکستان کی پارلیمان میں کم از کم ایک لونڈی کا مطالبہ

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ اس دَور میں غلام اور لونڈیوں پر بحث چلی تھی پھر وہ درمیان میں' میں' آ جاتی ہے۔ کیا کیا جائے:

---

[1] یہ راستہ ہے کہ انسان صرف اپنی فکر ہی نہ کرے' بلکہ جہاں دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے' اُسے اس سے آزاد کرائے یعنی سب سے پہلے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم' مطیع اور زیردست نہ رہے۔ ہر ایک گردن اٹھا کر چلے' ہر ایک کو جسمانی' ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو (اُس پر قانونِ خداوندی کے سوا' کسی کی پابندی نہ ہو۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر۔ اُس دور میں غلامی' لونڈیوں اور غلاموں کے خلاف آواز اٹھائی۔ بھڑوں کا چھتہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگے کہ یہ ❶ اسے خلافِ اسلام کہہ رہا ہے۔ آپ اندازہ لگایئے' ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1978-1903) کی' غلام اور لونڈیوں کے متعلق کتاب موجود ہے۔ اس میں یہ کہے چلے جارہے ہیں کہ غلام اور لونڈیاں اسلام کا جزو ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کون ہے وہ جو اس کو ناجائز قرار دے رہا ہے۔ انہوں نے گالیاں تک دیدیں۔ جرم کیا ہے؟ اس میں لکھا ہے کہ اصل میں ان لوگوں کا' دماغ چل گیا ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ یہ صرف قرآن سے قانون لانا چاہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ دماغ چلا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے جی' غلامی کے جواز میں نہیں' وجوب میں لازم ہوجاتا ہے۔ آپ کی پارلیمان میں ایک مولوی صاحب نے ❷ یہ کہا تھا کہ زیادہ نہیں تو ایک ایک لونڈی رکھنے کی تو اجازت دی جائے۔ آج اس دور کے اندر' UNO (اقوام متحدہ) نے تو اپنے چارٹر کے اندر اس غلامی کو منسوخ کیا ہوا ہے۔ یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ غلام اور لونڈیاں رکھنا اسلام کا فریضہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب ہمارا اقتدار آئے گا یعنی ان کے تصور کا اسلامی نظام آئے گا تو پھر تو کوئی بھی گردن آزاد نظر نہیں آئے گی۔ اب بھی جنہیں ہم خود ہی آزاد کہتے ہیں' وہاں ان کو کونسی آزادی میسر ہے۔ ہزار سال پیشتر کے جو احکام ہیں ان کا ہی اتباع ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ناممکن العمل ہیں' یہ جانتے ہوئے کہ یہ عقل وفکر کے خلاف ہیں' یہ جانتے ہوئے کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں' انہیں ماننے پر مجبور ہیں۔ غلامی صرف گلے میں رسے ڈالنے کا تو نام نہیں ہوتا' یہ ساری غلامی کی انواع ہیں۔ اسی لیے اس نے کہا تھا کہ قرآن کیا ہے؟ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے۔ غلامی کی یہ مختلف انواع ہیں۔ بظاہر نظر نہیں آتا کہ یہ غلام ہیں۔ غلامی یہ ہے کہ آپ کو اس میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ قرآن کو بھی آپ کوٹ (Quote: حوالہ) نہیں کر سکتے۔ اجازت ہی نہیں ہے آپ کو۔ جتنے آپ کے ہاں کے یہ فقہ کے قانون ہیں' وہ Laws (قوانین) بن جاتے ہیں۔ ان قوانین کا اتباع مملکت کے قانون کی حیثیت سے لازم ہوجاتا ہے' اسی لیے فَكُّ رَقَبَةٍ کہا ہے۔

عزیزانِ من! میں کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم میں لونڈی اور غلام بنانے کا تو تصور ہی نہیں آسکتا۔ جو دین کی بنیاد ہی فَكُّ رَقَبَةٍ قرار دیتا ہے اس میں غلام اور لونڈیوں کا تصور کہاں سے آیا۔ کیا وہ یہ کہے گا کہ جاؤ اور دوسری قوموں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر گھر میں رکھو۔ قطعاً نہیں۔ اصل یوں ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے معاشرے کے اندر غلام اور لونڈیوں کا رواج تھا بلکہ اس زمانے میں ساری دنیا میں ہی یہ تھا۔ اس طرح آئندہ کے لیے تو غلامی کا یہ دروازہ بند کیا۔ آپ قرآن میں دیکھیے کہ ذرا ذرا سی کوتاہی پر' ذرا ذرا سے سقم پر' تھوڑی سی خطا پر' جسے ذرا سا گناہ یا جرم کہتے ہیں' کی پاداش میں کیا کیا؟ فَكُّ رَقَبَةٍ: آزاد کرو غلام کو' اپنا کوئی غلام ہے وہ تو اسی طرح سے آزاد کرو' ورنہ معاشرے میں جہاں بھی کہیں غلام نظر آتا ہے اس کو خرید کر آزاد کرو' جس قیمت پہ بھی اس کا مالک

---

❶ یہ اشارہ غلام احمد پرویزؒ (1985-1903) کا اپنی طرف ہے۔

❷ اس کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ المومنون' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006۔

چاہیے وہ ادا کر کے اسے آزاد کراؤ۔ قرآن ان کو آزادی دینا چاہتا ہے اس لیے کہا کہ اس کو آزاد کراؤ۔ سارے قرآن میں آزاد کرو کی بات ہے۔ یہاں آپ کے ہاں ان لوگوں کا اسلام یہ ہے کہ ان کو غلام بناؤ۔

عزیزانِ من! آزادی کی ابتدا اس فَكُّ رَقَبَةٍ سے ہوگئی کہ یہ اسلام کا پہلا قدم ہے۔ یہ ہے ملخص: نوعِ انسانی کو ہر قسم کی غلامی سے آزادی دلانا۔ یہ دین کا ملخص ہے اور یہ اِس امت کا فریضہ۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ کس طرح ساری تاریخ میں یہ ایک بالکل انوکھا واقع ہوا ہے۔ اقوام کی تاریخ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہر قوم اپنے آپ کو دوسروں کی غلامی سے آزاد کرالے۔ منتہیٰ ہی یہ تھا' تحریک پاکستان کا منتہیٰ ومقصود بھی یہی تھا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارے ہاں کے نیشنلسٹ علماء حضرات نے مخالفت کی تھی' اس میں دارالعلومِ دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1957-1879) پیش پیش تھے۔ اقبالؒ (1938-1877) کے ساتھ ان کی جو بحث ❶ ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ وہ عجیب چیز ہے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ جب یہاں ہمارا مقصد بھی انگریزوں کو نکال کر' ان کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا ہے' اور آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا ہے' تو پھر آپ یہ تگ وتاز الگ کیوں کر رہے ہیں' ان کے ساتھ کیوں نہیں ملتے' کانگریس والوں کے ساتھ جیسے ہم ملے ہوئے ہیں' تو اس کا جواب اس بالغ نظر انسان نے' مومن نے' دیا تھا کہ یہ ٹھیک ہے انگریزوں کی غلامی یا کسی دوسرے کی غلامی سے آزادی تمہارے نزدیک مقصود بالذات ہے' ہمارے نزدیک ایک بلند مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدمِ اول یہ ہے کہ انگریز کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد کسی انسان کی بھی غلامی برداشت نہیں ہوگی۔ جس مقصود کو ہم چاہتے ہیں' وہ تو یہ ہے۔

اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد امت کا فریضہ

عزیزانِ من! مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) نے واضح کر دیا کہ یہ ہے تمہارا اور ہمارا فرق۔ تو یہ غلامی سے خود ہی آزادی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد اگلی بات فَكُّ رَقَبَةٍ کی ہے یعنی دوسروں کو آزاد کرانا۔ ان سورتوں میں' ان آیات کے اندر' یہ جتنی کشمکش ہے' وہ پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ وہ جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کی' قومِ اول' امتِ اول تھی جنہوں نے غلامی اور محکومی سے آزادی حاصل کر لی تھی' تو یہ کشمکش اس لیے تھی کہ وہ جو شیطان راستے میں Hindrences (رکاوٹیں) پیدا

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) ارمغانِ حجاز میں حسین احمد کے عنوان سے یوں لکھا ہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں' ورنہ — زدیو بند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر زمقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی' تمام بولہبی است

(ارمغانِ حجاز اردو' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' 1996' ص۔74)

کرتا تھا' رکاوٹیں ڈالتا تھا' ان رکاوٹوں کو ہی Remove (ہٹا) کرلے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اقوامِ عالم کی ہر نہج کے اعتبار سے تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی انہوں نے اپنی آزادی حاصل کرنے کا مقصد حاصل کر لیا اور یہ آزاد ہو گئے۔ ان کا منتہائے مقصود تو یہی ہو سکتا تھا اور یہ ہو گیا۔ اس کے بعد اب آیئے کہ اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کے اوپر کیا فریضہ عائد ہو رہا ہے؟ وہ فریضہ ہے نوعِ انسانی کو ہر قسم کی غلامی سے آزادی دلانا۔

الفاظ کے انتخاب کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان بھی ایک معجزہ ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے گا۔ میں پھر عرض کرونگا کہ آپ اسے کہیں نوٹ کر لیجیے گا' یہ مواقع دوبارہ نہیں حاصل ہونگے۔ بہر حال' عرض کیے جاؤں گا' بڑی گہرائیوں میں جانے کے بعد یہ مطالب سامنے آئیں گے اور پھر ان الفاظ کی جامعیت' جو قرآن کا اعجاز ہے' پہ بھی غور کیجیے گا۔ اس کا اسلوبِ بیان بھی معجزہ ہے۔ یہ عربوں کی بڑی وسیع زبان ہے' جسے مرادفات کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں' ایک ایک چیز کے لیے ہزاروں کی تعداد میں الفاظ ہیں' ان میں سے ایک لفظ کو چننا ہے' اور پھر یہ دیکھیے کہ ان الفاظ کے انتخاب کے سلسلہ میں' عربوں کے ہاں ان کے مفہوم اور معنی میں کتنی وسعتیں' کتنی گہرائیاں ہیں۔ بات یہ کہنی ہے کہ اب ان کا فریضہ یہ ہے کہ یہ جو محکوم اور غلام قومیں ہیں ان کو اس غلامی اور محکومی سے نکال کر آزادی کی سطح پہ لے آئیں۔ خود آزاد ہونے کے بعد مقصدِ حیات مکمل نہیں ہو گیا' بلکہ بات تو اب یہاں سے شروع ہوئی ہے۔

محکومی اور غلامی کے لیے ''غرق'' کے لفظ کا استعمال

عزیزانِ من! اب اس سورۃ النازعات کی پہلی آیت وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا (79:1) میں دو الفاظ ہیں۔ یہ قوم جو اب پیدا ہوئی ہے' کیا ہے؟ کہا کہ یہ قوم ہے۔ کسی قوم کو محکومی اور غلامی کی پستی کے گڑھے میں پھینک دینا مستبد قوتوں کا کام ہوتا ہے' اسے پستی کا گڑھا بھی کہا جا سکتا تھا' خود پستی بھی ایک لفظ تھی جو یہاں کہا جا سکتا تھا اور عربی میں تو پوچھیے نہیں کہ کتنے الفاظ تھے۔ پستی اور کس انداز کی پستی!! یہ پانی کی تہہ میں کسی کو غرق کر دینا ہے۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ پانی میں ڈوب جائے' اس کی تہہ تک پہنچا دیا جائے' تو نہ وہ کچھ دیکھ سکتا ہے' نہ کچھ سن سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی سن سکتا ہے۔ اللہ اکبر! ایک لفظ میں قرآن کریم نے غلامی کی انتہائی تصویر کھینچ دی۔ سطحِ ارض پر جہاں جی چاہے' کسی غلام کو' محکوم کو' قیدی بنا کر رکھ دیجیے' اس میں یہ بات نہیں پیدا ہوگی۔ وہاں وہ چیخے چلائے گا سہی' اور کچھ نہیں کر سکے گا' کسی کی سنے گا سہی' کچھ دیکھے گا سہی' لیکن یہ مستبد حاکم احساسِ محکومیت کے ہر دروازے پر مہر لگا دیتا ہے۔ اب وہ اپنی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا' اپنے کانوں سے سن نہیں سکتا' اپنی زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ زبان اپنی ہے' مگر بات ان کی ہے۔ چراغ میرا ہے' رات ان کی ہے۔ اللہ اکبر! یہاں قرآن غرقًا کا لفظ لایا ہے۔ معلوم نہیں آپ احباب کے دل میں بھی وہ کیف پیدا ہوتا ہے یا نہیں' میری تو کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے:

کیا جانیے کیا کہتا' کیا دیکھتا' کیا کرتا
زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

کیا جانیے' مگر وہ دیکھتا تو سہی لیکن جہاں ایک غرق کے لفظ سے یہ کیفیت ہے: صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ [1] (2:18)۔ محکوم کے ساتھ حکمران کی ساحری یہ کرتی ہے۔ اب جسے اس طرح سے پانی کی تہہ میں ڈبو دیا ہو کہ وہاں وہ نہ کسی کی سن سکے' نہ کسی کو کچھ سنا سکے' نہ کچھ دیکھ سکے۔ اس پستی سے' اس گڑھے سے' اس کو نکالنا ہے۔ اب دیکھیے کہ اس نکالنے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو خود یہ جو حکمران اور حاکم ہیں جن کے یہ محکوم اور غلام اور قیدی ہیں' ان کا استبداد ہوگا کہ ان کو یہی نہیں نکالنے دیں گے' سب سے بڑی مزاحمت تو ان کی ہوگی' نکالنے نہیں دیں گے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہوگی کہ جب یہ غلام اور محکوم' خوئے غلامی میں پختہ ہو جاتا ہے تو وہ خود بھی نہیں نکلنا چاہتا:

نے تیر کماں میں ہے' نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(غالب)

محکوم قوموں کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ

عزیزانِ من! قفس کے اِس پرندے کو آپ آزاد کر ہی نہیں سکتے۔ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں' تقسیم سے پہلے یہاں ہندو ہوتے تھے۔ تو ان کے ہاں عام طور پہ چکور ہوتا تھا۔ وہ اسے یا اس قسم کے تیتر کو پنجرے میں ڈالتے تھے۔ صبح سیر کے لیے نکلتے تھے' پنجرہ ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ چکور یا تیتر' جو اس میں بند ہوتا تھا' اس کو باہر آزاد کر دیتے تھے' وہ پیچھے پیچھے ہوتا تھا' جنگل میں جاتے تھے' جنگل کے آزاد پرندے' انہی جیسے' ان کو آوازیں دے رہے ہوتے تھے کہ آ وتمہیں کیا ہو رہا ہے' کہاں جا رہے ہو' یہ ہے تمہارا مقام' دیکھو تو سہی ہم کہاں ہیں۔ یہ سنتے تھے اور اس پنجرے کے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے' کھڑا ہوتا تھا تو پنجرے کے اوپر چڑھ جاتے تھے' چونچوں سے مار مار کر اس کے دروازے کو کھولتے تھے۔ آزاد پر بھی موجود ہیں۔ آزاد بھی ہیں۔ دوسرے آزاد پرندوں کی آوازیں بھی سن رہے ہیں' مگر کیفیت یہ ہے کہ اس پنجرے کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ جب غلام کی' محکوم کی ایسی حالت ہو جاتی ہے تو کیا ہی خوب کہا اقبالؒ نے کہ

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام!

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

---

[1] بہرا' گونگا' اندھا۔

پھر تو خود پرندہ کھڑا ہو کر شکار کو کہتا ہے کہ آ مجھے پکڑ لے: پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام۔

عزیزانِ من! اگلے لفظ پر آنے سے پیشتر یہ ساری تمہید' یہ سارا مفہوم' سمجھ میں آئے گا جب ذہن میں یہ آ جائے گا کہ وہ محکوم جو پانی کے اندر غرق ہوا ہے اس کی کیفیت کیا ہے: حواس (Senses) باقی نہیں ہیں' سوچنے سمجھنے کے سب دروازے بند ہو چکے ہوئے ہیں۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ جن کے یہ غلام و محکوم ہیں ان کا استبداد' دباؤ اور ہر قسم کی تدابیر کہ یہ آزاد نہ ہونے پائیں' کوئی ان کو آزاد نہ کرنے پائے' اگر ان کا مقابلہ کر بھی لیا جائے تو یہ خود اپنی خوئے غلامی کی وجہ سے وہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ اب کہیے کہ اس قسم کا جو ڈوبا ہوا ہے اس کو نکالنا ہے' اس کے لیے قرآنِ کریم میں کیا لفظ ہے؟

عزیزانِ من! اس قسم کے ڈوبے ہوئے کو نکالنے کے لیے قرآن کریم **النّٰزِعٰت** کا لفظ استعمال کیا ہے: **اَلنّٰزِعٰتِ** (79:1) کے معنی ہوتے ہیں: کسی کو بالوں سے پکڑ کر' گھسیٹ کر' اوپر لے کر چلے جانا' یہ ہے۔ **اَلنّٰزِعٰتِ** قرآن کے کیا الفاظ ہیں! اس قسم کے ڈوبنے والے کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو اس کو تیرانے کے لیے' بچانے کے لیے' جاتا ہے وہ اسے بھی لے ڈوبتا ہے۔ اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔ اسے کیسے نکالا جائے گا؟ یہ سمجھنے سمجھانے کی بات نہیں ہے' یونہی آسانی سے تیرانے والی بات بھی نہیں ہے' اس کو تو بالوں سے پکڑ کر' اوپر گھسیٹا جائے گا۔ یہ محکوم قومیں' جنہیں مستبد حاکموں کے استبداد نے اس مقام پہ پہنچا دیا ہے تو اس امت کا یہ فریضہ ہے کہ ان قوموں کو کھینچ کر' گھسیٹ کر' اوپر لائے۔

قدم بقدم منزل کی طرف رواں دواں مصروفِ کار رہنے کا مقصد

عزیزانِ من! پہلے تو انہیں سطحِ آب پہ لے آنا ہے' انہیں اپنے برابر کرنا ہے' جہاں زندگی نے سانس لینا ہو' انہیں وہاں پہنچانا ہے' تاکہ یہ زندہ' سانس تو لے سکیں۔ انہیں یہ کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا** (79:1) یہ قوم جس نے عمر بھر کی کشمکش' تصادمات' تزاحمات سے اپنی آزادی حاصل کی تھی' یہ تیر کر پانی سے باہر آ گئے تھے' ابھی ساحل پہ کھڑے ہی ہوئے تھے کہ یہ حکم دیا کہ وہ جو بہت نیچے ڈوبے ہوئے ہیں تمہیں ان کو بھی بچانا ہے' وہاں سے نکالنا ہے۔ اب یہ ان کے نکالنے کی فکر کر رہے ہیں۔ اس آزادی کے بعد اب ان پہ یہ فریضہ عائد ہو رہا ہے۔ صدرِ اول میں مسلمانوں کی یہ جتنی بھی جنگیں' جنہیں اسلام کی جنگیں کہتے ہیں' اور پھر ہمارے ہاں والے کہتے ہیں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلا ہے' یہ جنگیں اسلام پھیلانے والی بات نہیں تھی' خود ساحل پہ آنے کے بعد یہ جو سطحِ سمندر کے نیچے ڈوبی ہوئی محکوم قومیں تھیں' ان کو وہاں سے نکالنا تھا۔ اس نکالنے کے لیے یہ جو مستبد قومیں' سلطنتیں اور ملوکیتیں تھیں' اس دور کے قیصر و کسریٰ تھے پھر ان کے ساتھ ان محکوم قوموں کو آزاد کرانے کے لیے یہ جنگیں لڑنا پڑیں۔ اس کا تخمِ طیب تو نبی اکرم ﷺ نے اپنی مدینے کی

زندگی میں ہی بو دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی شاید پہلی جنگ بدر [1] بھی لگ رہی تھی یا اس کے بعد کی بات ہے' جو آپ ﷺ نے قیصر و کسریٰ کو خطوط لکھے تھے۔ آپ اندازہ لگایئے کہ قیصر و کسریٰ کو خطوط لکھے تھے۔ ذرہٗ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر۔ انہیں خط لکھا جا رہا ہے' یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارے ہاں کے مزدوروں' مزارعوں اور کاشتکاروں پہ جو ظلم ہو رہے ہیں تم انہیں روک دو تو اچھا ہے' ورنہ تمہارے ہاتھ روک دینے پڑیں گے۔ غور کیجیے عرب کا ایک یتیم ہے' ابھی اپنی مملکت بھی قائم نہیں ہوئی' وہ انہیں یہ لکھ رہا ہے۔ اس کو پتہ تھا کہ اپنی آزادی تو اب بہت قریب ہے' قریباً حاصل ہو ہی چکی ہے' اس سے ہمارا مقصد تکمیل تک نہیں پہنچ رہا' حالانکہ مقصد تو آگے شروع ہونا ہے۔ دائیں بائیں یہی دو سلطنتیں' یہی دو تہذیبیں' بلکہ دنیا میں سب سے بڑی تہذیبیں اور مملکتیں' یہی تھیں۔ انہیں یہ چٹھی لکھی جا رہی ہے۔ پھر وہاں کی غلام و محکوم قومیں ہیں وہ غلامی سے نکلنا ہی نہیں چاہتیں۔ ایک ان کا مقابلہ' دوسرا ان ڈوبے ہوؤں کو بالوں سے پکڑ کر' کھینچ کر' باہر لانا۔ کیا نقشہ ہے جو قرآنِ کریم نے کھینچا ہے! وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا [2] (79:1) وہ انہیں وہاں سے نکال کر اوپر لے آئے۔ کیا اب یہ مقصد پورا ہو گیا؟ کہا کہ جی نہیں! صدیوں' نسلوں کی غرقابی کے بعد' محکومیت کے بعد' اب یہ آزادی کی فضا میں صرف سانس لینے کے قابل ہوئے ہیں' اب انہیں آزادی سے لذت آشنا کرنا ہے۔

مردِ مومن کے لیے آزادی کا تصور

عزیزانِ من! اگلے دو الفاظ ہیں ان دو الفاظ میں آزادی کی ایک ایسی Definition (حد بندی) ہو گئی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایک تو آزادی وہ ہوتی ہے جسے وہ مادر پدر آزادی کہتے ہیں۔ یہ دنیا میں جتنی قومیں ہیں' جنہوں نے اپنے اوپر کوئی اور پابندیاں عائد نہیں کر رکھی ہیں' وہ آزاد ہیں۔ جو جی چاہے فیصلے کریں' جس کا جی چاہے گلا کاٹ دیں' جس کو جی چاہے لوٹ لیں۔ یہ اپنی قوم کے مفاد کی خاطر یہ کچھ کرتے رہیں' ان پہ کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں' ان کے ہاں آزادی اسی کا نام ہے' لیکن آزادی اور بھی ہے' آزادی کسی اصول کی حدود کے اندر رہتے ہوئے' ناقابلِ تغیر اقدار کی پابندیاں کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ ہے اصل آزادی۔ اب دیکھیے! سمجھایا کیسے جا رہا ہے۔ یہ آسمان کے جنہیں ہم ستارے کہتے ہیں' ان میں کچھ تو ستارے ہوتے ہیں' یہ جسے زمین جنبد نہ جنبد

---

[1] 17 رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624ء۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 288-287 (فٹ نوٹ نمبر 1)

[2] مستبد قوتیں، زبردست طبقہ کو اس قدر کچلتی ہیں کہ ان کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ بالکل بنجر زمین کی طرح نظر آتے ہیں جس میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہے لیکن قوانین خداوندی کی اطاعت سے ایسی انقلابی جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو اس مظلوم و مقہور طبقہ کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو پورے زور سے کھینچ کر اوپر لے آتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

گل محمد کہتے ہیں وہ قطب تارا ہوتا ہے' وہ اپنی جگہ سے ہلتے نہیں ہیں' اپنے مقام کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں' وہیں وہ گھومتے ہیں لیکن ان میں آگے جانے کی حرکت نہیں ہوتی' انہیں ہمارے ہاں ستارے کہتے ہیں اور ایک سیارے ہوتے ہیں' وہ حرکت کر کے چلتے بھی ہیں' تو یہ جو حرکت کے ساتھ چلنا ہے یہ آزادی ہے۔ یہ ستارہ جو حرکت کرتا ہے' جو اُن تمام قوانین کی پابندی کرتا ہے جو فضا میں اس کے اوپر عائد کی گئی ہیں' ان پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے یہ حرکت کرتا ہے۔ یہ آزادی ہے جس کو صحیح معنی میں قرآن کی رو سے آزادی کہا جاتا ہے کہ انسان کو پورا اختیار اور ارادہ حاصل ہو بشرطیکہ وہ قرآن کی عائد کردہ' خدا کی عائد کردہ' پابندیوں یا اقدار کی حدود کے اندر رہے۔ اب اس ستارے سے جو نقل وحرکت میں آزاد ہوتا ہے اس کے لیے سمجھایا گیا ہے لیکن پابند ہوتا ہے ان قوانین کا جو خدا کی طرف سے اس پہ عائد کیے گئے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں نشاط' اس کو کہتے ہیں خوشی۔ خوشی! کیا خوشی ہے! پوری آزادی' اقدار کی پابندیوں کے ساتھ۔ اس کا نام ہے نشاط۔

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

معاف رکھیے گا اگر آزادی کے اس تصور میں تھوڑی سی ''کرک'' [1] آ جائے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اب آپ کے ہاں اربابِ نشاط کسے کہا جاتا ہے؟ او بدبختو! تم نے تو اپنے ساتھ اپنی زبان کو بھی تباہ کیا۔ اس تصور میں ''طاؤس ورباب آخر تھا۔'' نشاط یہ ہے۔ عزیزانِ من! آزادی کی ایسی Definition (تعریف) کہیں نہیں مل سکتی۔ بہرحال آپ کے اس گناہگار [2] نے بھی ان میدانوں کا کچھ مطالعہ تو کیا ہی ہوا ہے۔ اس کے اندر عمر گزر گئی' آزادی کی یہ تعریف کہیں نہیں ملتی' یہ نشاط یا سرور یا یہ جو اس کی صحیح خوشی ومسرت ہے اس کی یہ Definition کہیں نہیں ملتی کہ ''آزادی ہو کسی پابندی کے ساتھ'' اور ان اقدار کی پابندی خود اپنے اوپر عائد کی ہو' کسی اور نے عائد نہ کی ہو' اقدار تو وہ ہوں پابندی یہ خود عائد کرے' ان کے اندر رہتے ہوئے کامل آزادی حاصل ہو۔'' اسے آزادی کہا ہے اور اس قسم کی آزادی حاصل ہو جانے کا نام نشاط یا مسرت یا خوشی یا سرور یا کیف ہے۔ دیکھا آپ نے' پابندی اور آزادی کا یہ غزل کا شعر بڑا حسین شعر ہے:

مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!

مؤمن کو یہ آزادی ملتی ہے: مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا' کیا اسیری ہے' بڑا خوبصورت ہے' اور کیا رہائی ہے! اس کے لیے کہا کہ **وَالنّٰشِطٰتِ**

---

[1] کسیلا پن

[2] یہ اشارہ غلام احمد پرویزؒ (1903-1985) کا خود اپنی طرف ہے۔

نَشْطًا ❶ (79:2) ان کو محکومیت کی غرقابی کی تہوں سے کھینچ کر‘ نکال کر‘ اوپر لے آنا اور پھر انہیں اس قابل بنا دینا کہ انہیں آزادی حاصل ہو لیکن اقدارِ خداوندی کی پابندیوں کے ساتھ۔

عزیزانِ من! یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ جو غَرْقًا (79:1) کا لفظ آیا تھا۔ وہ غور طلب ہے۔ اسے پھر دیکھیے۔ پانی میں غرقا کی جہت سے آگے ہے کہ پھر ان کی توانائیاں اتنی نشو ونما یافتہ ہوں کہ وہ زندگی کے ہر میدان کے اندر اس طرح تیرتے ہوئے جائیں جیسے وہ تیراک‘ جو پورے بازو مار کے تیرتا جاتا ہے‘ جیسے گھوڑا جس طرح پورا سرپٹ چلتا ہے یعنی پوری توانائی اور وسعت کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنا۔ اس کے لیے یہاں لفظ سَبَّحَ آیا ہے۔ آ تسبیحاں‘ جیہڑیاں پھیریاں جاندیاں نیں ہن۔ ❷ یہ تو یہاں کے الفاظ ہیں‘ مگر قرآن میں ہے کہ وہ جو غرق ہیں‘ ان کو تیرنے کے قابل بنا دینا۔ کیا بات ہے اس ادب کی! غَرْقًا پانی کی تلمیح ❸ سے یہاں (79:3) اَلسّٰبِحٰتِ لائے کہ اب اسی دریا میں‘ جہاں یہ تہہ میں غرق ہوئے تھے‘ اور یوں نکلے تھے اب اس کی سطح کے اوپر سب یوں تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں کہ جس کا کچھ ایسا نظارہ ہے کہ کوئی چیز گویا کبھی ان کے راستے میں حائل ہی نہیں رہی‘ سوال ہی نہیں ہے کہ تیرتے ہوئے کوئی موج‘ کوئی طوفان حائل ہو۔ کہا کہ اَلسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ❹ (79:3) پوری گرمجوشی کے ساتھ‘ پورا ہاتھ مار کر چلے جا رہے ہیں کہ راستے میں کوئی رکاوٹ (Hindrance) نہیں ہے‘ کوئی شیطان نہیں ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک مقامِ مومن کے سامنے اعلون ہی اس کی منزل ہے

عزیزانِ من! وہ تو اس طرح چلے جا رہے ہیں کہ ان کا باقیوں سے پیچھے رہنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ مومن تو پیچھے رہ ہی نہیں سکتا‘ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اس سے آگے چلا جائے۔ مومن تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی غیرت اس کو بھی برداشت نہیں کر پائی کہ کوئی

---

❶ اور مستبد طبقہ نے‘ اِن کی راہ میں جس قدر رکاوٹیں ڈال رکھی ہوتی ہیں‘ وہ جماعت ان سب کو راستے سے ہٹا کر‘ کمزور طبقہ کی غلامی کی گرہیں کھول دیتی ہے کہ وہ آزادانہ سرگرمِ عمل ہوں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اب یہ تسبیحیں ہیں جو پھیری جاتی ہیں۔

❸ تلمیح کے لفظی معنی ہیں ’’دُور سے اشارہ کرنا‘‘ ‘جس کنایئے میں صفت سے موصوف تک (یا لازم سے ملزوم تک) پہنچنے میں بہت سے واسطے ہوں اور وہ مخفی ہوں تو اسے ’’کنایۂ تلویح‘‘ کہتے ہیں۔ مثلاً ’’ٹھنڈے چولہے والا‘‘ کنایہ ہے بخیل آدمی سے اور اس میں بہت سے واسطے ہیں جو مخفی ہیں اور غور کے بعد ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ مثلاً چولہا ٹھنڈا ہونے کا مطلب ہے کہ اس میں آگ نہیں جلتی۔ جب آگ نہیں جلتی تو کھانا بھی نہیں پکتا۔ کھانا نہ پکنے کے معنی یہ ہیں کہ نہ وہ خود کھاتا ہے اور نہ اپنے بال بچوں کو کھلاتا ہے اور جس شخص کا یہ حال ہے اس کے مہمان نواز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ وہ انتہائی بخیل ہے۔

❹ اس طرح‘ وہ (کمزور طبقہ) حرکت وعمل کے سمندر میں تیزی سے تیرتا ہے۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اس کے ساتھ ساتھ چلے؛ اس لیے کہا کہ پھر یہ یوں ان میدانوں کے اندر چلے جائیں جیسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ **فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا** ❶ (79:4) آگے بڑھنے والے اور آگے بڑھنے والے، آگے بڑھنے والے! آپ دو دو لفظوں پر غور فرما رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کا مقصود کیا ہے، اس قوم کا فریضہ حیات کیا ہے، نظامِ زندگی کیا ہے، آزادی ہے اور غلامی سے رہائی کس طرح ہے۔ دو دو لفظوں میں اس کی تشریح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کہا ہے: **فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا** (79:4) یعنی آگے بڑھنے والے، قرآن نے مومن کو اعلون کہا ہے **اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ** (47:45 ;3:139) کہا ہے اور وہ تو صیغہ ہی ایسا ہے کہ جس سے آگے کوئی اور **اعلیٰ** ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ان بلندیوں کے اوپر ہوتا ہے۔ اس لیے آپ قدم بقدم دیکھیے: غرق ہوئے ہیں، ایسی صورت ہے کہ پانی کی تہ سے وہ خود نکل ہی نہیں سکتے، وہاں سے نکلنا چاہتے بھی نہیں ہیں۔ ان کو ان پستیوں سے نکالا جاتا ہے، ان محکوم قوموں کو نکال کر اوپر لانا ہے۔ یہ فریضہ ہے۔

صدرِ اوّل کا دورِ زرّیں

عزیزانِ من! یہ صدرِ اول کی تاریخ ہے۔ اے کاش! کہیں یہ تاریخ اس طرح مرتب ہو جائے کہ یہ خود ہی تیر کر باہر نہیں آئے تھے، بلکہ انہوں نے ان ڈوبے ہوؤں کو بھی تیرایا تھا اور ان قوموں کو کھینچ کر باہر لائے تھے۔ ہمارے ہاں کی جو صدرِ اول کے عساکر کی فوجوں کی، اور اس جماعت کی بھی تگ و تاز ہے، وہ اس مقصد کے لیے ہی تھی۔ وہ نکال کر لائے تھے۔ تاریخ بتائے گی کہ کس کس قوم کو، کس کس غرقابی کی تہہ سے، کھینچ کر، لایا گیا تھا۔ پھر ان کو کس طرح وہ آزادی دی تھی جسے قرآن صحیح معنی میں نشاط آور آزادی کہتا ہے: پابندی کے ساتھ آزادی۔ پھر کتنی توانائیاں ان کے اندر بھر گئی تھیں کہ وہ اسی بحرِ ذخار کے اندر تیرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ اس تیراکی میں کوئی ان کے برابر نہیں آ سکتا تھا۔ آگے بڑھنا تو ایک طرف رہا وہ تو وہاں تک چلے جا رہے تھے جہاں ان کا کوئی مقابلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مالک یوم الدین کا مفہوم

عزیزانِ من! اس کے بعد یہ کہا کہ اس تمام کام کا ملخص کیا ہے جو یہ سب کچھ ہم نے اشاروں میں سمجھایا؟ بات کیا ہوئی؟ اس کے لیے کہا کہ **فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا** ❷ (79:5) اپنے معاملات کی تدبیر آپ کرتے تھے۔ واہ واہ واہ! اب وہ صحیح فرمانروائی، صحیح آزادی، صحیح

---

❶ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

❷ اختیارات تمام کے تمام قوانینِ خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف ان قوانین کی ہوگی (یعنی وہ دور جس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا، نہ محتاج اور نہ ہی کوئی کسی مجرم کو اس کے جرم کی پاداش میں چھڑا سکے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

حاکمیت آ گئی۔ مقصد یہ ہے۔ وہ جو اپنے معاملات کا حل آپ دریافت کرتے تھے' انہیں خود طے کرتے تھے' اس میں بھی وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ❶ (82:19) کی وہ شرط موجود ہے۔ یہ ہوگا یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3)۔

عزیزانِ من! ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اس میں یہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ آتا ہے: الدین کے دور کا مالک۔ کہا کہ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ❷ (82:17) صبح سے شام تک کہتے تو رہتے ہو۔ اگر ان رکعتوں کو گن لیا جائے تو میرا خیال ہے یہ قریباً 44 مرتبہ آ جاتا ہے۔ ان میں مالک یوم الدین کہتے تو رہتے ہو۔ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ❷ (82:17) کوئی پتہ بھی ہے یہ یوم الدین ہوتا کیا ہے؟ کیا انداز سمجھانے کا! ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ (82:17) ایک بار اور ہم پوچھتے ہیں تم سے بھئی کہ کچھ معلوم بھی ہے کہ یوم الدین کیا ہے' تمہیں نہیں معلوم' ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ یہ دور' یہ زمانہ' یہ معاشرہ' یہ نظام' وہ ہوگا یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ❸ (82:19) جس میں کوئی فرد کسی دوسرے کا طفیل نہیں ہوگا۔ یہ ہوگا یوم الدین۔ تو کیا وہاں انارکی (Anarchy: تشتت وانتشار) ہوگی' جو کسی کا جی چاہے کرے؟ مشہور ہے کہ آزادی کا اعلان ہونے کے بعد ایک بڑھیا ایک جگہ سے سڑک پار کر رہی تھی۔ ٹریفک والوں نے کہا کہ یہاں سے سڑک نہ پار کرنا۔ اس نے کہا کہ آج آزادی کا اعلان ہوا ہے' آزادی ہے۔ اتنے میں ایک سائیکل والا آیا۔ اس نے دے ٹکر ماری۔ وہ چلائی کہ یہ کیا ہے۔ اس نے کہا: آزادی ہے۔ عزیزانِ من! یہ آزادی نہیں ہے۔ آزادی وہ ہے جس میں کوئی کسی کا طفیل نہ ہوگا۔ اور آگے شرط ہے۔ کہا کہ اس دور میں وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ❹ (82:19) تمام امور کے فیصلے خدا کی اقدار کے مطابق ہونگے۔ یہ یوم الدین ہے۔ وہاں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم محتاج نہیں ہوگا۔ تمام امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے تابع ہونگے اور یہاں کہا کہ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (79:5) وہ اپنے معاملات کی تدبیریں خود کریں گے۔ یہ چیز مشروط ہوگی کہ ہر معاملے کا فیصلہ خدا کے فیصلے کے مطابق ہوگا' یہ اس مقام پر پہنچا دیں گی۔ یہ قوم جس نے خود آزادی حاصل کی تھی'

---

❶ وہ اس وقت تک یہ کچھ کرتے تھے جب تک زمامِ اقتدار' مستبد قوتوں سے چھن کر' ان کمزوروں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے' اور وہ اپنے تمام معاملات کی تدبیر' قوانین خداوندی کی روشنی میں' خود آپ کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یَوْمِ الدِّیْنِ (ظہور نتائج کا دور) کیسا ہوگا؟ (ایضاً)

❸ یہ وہ دَور ہوگا جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا' نہ ہی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار ہوگا۔ (ایضاً)

❹ اختیارات تمام کے تمام قوانین خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف اُن قوانین کی ہوگی' کسی اور کی نہیں ہوگی۔ (یعنی وہ دور جس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔ اور نہ ہی کوئی کسی مجرم کو اس جرم کی پاداش سے چھڑا سکے گا (88:19)۔ (ایضاً)

اتنی اضطرابات اور اتنے تزاحمات کے بعد، یہ محکوم قوموں کو اس مقام پر لے آئی۔ یہ تھا امتِ مسلمہ کا فریضہ۔ یہ تھا دین۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔ یہ تھا قرآن کا پہلا پیغام کہ اس قوم نے یہ کچھ کرنا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ النّٰزعٰت کی پہلی پانچ آیات آ گئیں لیکن یہ جو کچھ ہے، یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے کہ یونہی بیٹھے بٹھائے ایسا ہو جائے گا۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا ہے کہ مستبد قومیں اپنے کسی ایک نوکر کو یا غلام کو بھی آزاد نہیں ہونے دیتیں چہ جائیکہ قوموں کی قومیں ان کی حکومت، فرمانروائی اور استبداد کے شکنجے سے چھڑا لی جائیں، اور آگے ہے کہ وہ اسے آسانی سے کبھی چھوڑنے نہیں دیں گے۔ پھر آگے بتایا کہ اس میں کیا کچھ ہوگا۔

عزیزانِ من! سورۃ النّٰزعٰت کی پہلی پانچ آیات تک ہم آ گئے، چھٹی آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

پانچواں باب: **سورۃ النازعات** (آیات 6 تا 26)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1984 کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النازعات کی آیت 6 سے ہو رہا ہے: (79:6)۔ سابقہ درس میں بتایا گیا تھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہی نہیں ہے کہ یہ اپنی آزادی اور مرفعہ الحالی کی فکر کرے بلکہ اس کا فریضہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی قوم محکوم اور دوسروں کی غلام ہو' یہ انہیں اس غلامی کی زنجیروں سے چھڑائے' انہیں آزادی دے' پھر ان کی توانائیوں میں اتنی نشو ونما پیدا کرے کہ وہ اس زندگی کے بحرِ مواّج سے تیرتی ہوئی آگے چلی جائیں۔ یہی نہیں کہ باقی اقوام کے صف بہ صف چلیں بلکہ ان سے آگے چلیں اور ملخص یہ ہے کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنے معاملات کو خود طے کر لیں۔ یہ فریضہ بتایا اس امت کا جسے **اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** (3:109) کہا گیا۔ یہ للناس ہے' یعنی وہ امت جو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یہ اس کا فریضہ تھا۔ اب اس نے دوسری محکوم قوموں کو آزادی دلانی تھی۔ پہلی چیز تو یہ تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ پھولوں کی سیج ہے' وہیں سے ایک حکم نامہ بھیج دیں اور وہ قوم آزاد ہو جائے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ محکوم قوموں کی خوئے غلامی بھی ایسی ہوتی ہے کہ غلامی کی زندگی انہیں بڑی راس آتی ہے۔

محکوموں کے بغیر حاکم چہ معنی دارد؟

آزادی دلانے میں اصل دشواری وہ مستبد صاحبِ اقتدار قوتیں ہوتی ہیں جنھوں نے انہیں محکوم بنا رکھا ہوتا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے جیسا کہ حضرتِ موسیٰ ❶ علیہ السلام نے فرعون ❷ سے کہا تھا کہ میں تمہارا کچھ نہیں چھیننا چاہتا' میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ بنی اسرائیل' جسے تم نے اس طرح اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے' کو یہاں سے لے کر چلا جاؤں' تو اس میں تمہارا تو کچھ نقصان نہیں۔ اس نے کہا کہ تم یہ کہتے ہو کہ نقصان نہیں' بات بڑی صاف ہے' حاکم وہی ہوتا ہے جس کا کوئی محکوم ہو۔ اگر کوئی محکوم ہی نہ ہو تو وہ حاکم ہی نہیں ہوسکتا۔ حکومت تو محکوم کے وجود کو چاہتی ہے۔ کوئی کتنا بڑا صاحبِ اقتدار ہو۔ پہاڑ اس کے ہوں' سمندر اس کے ہوں' جنگلات' نہریں' دریا' چاندی اور سونے کے ڈھیر' جواہرات کے ذخائر' یہ سب اُس کے پاس ہوں اور وہاں کوئی انسان نہ ہو جس پہ وہ حکومت کرے تو وہ حاکم ہی نہیں ہوتا۔ اسے تو حاکم ہونے کے لیے محکوموں کی ضرورت ہے' تو اگر یہ چیز کہی جائے کہ جو تمہارے محکوم ہیں' انہیں ہم یہاں سے نکال کر لے جائیں گے تو پھر وہ حکومت کس پہ کرے گا۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کا خون نمکین ہوتا ہے' جو شیر ایک دفعہ انسان کا خون پی لے' اسے کسی اور شکار میں لذت ہی نہیں ملتی۔ شیروں کا تو پتہ نہیں' ہم نے نسانوں کو دیکھا ہے۔ یہ شیر نہیں' یہ تو بھیڑیئے ہوتے ہیں۔ ان کے قابو میں جب کوئی انسان آ جاتے ہیں تو یہ آسانی سے انہیں نہیں چھوڑتے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے بڑی عمدہ تشبیہ' نہیں بلکہ' استعارہ سے اس بات کو بیان کیا۔ انگریز کے زمانے میں ہندوستان میں اس کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اہلِ ہند کوشاں تھے لیکن شروع شروع میں تدابیر یہ تھیں کہ Resolution (قرار دادیں) پاس کیے جاتے تھے' درخواستیں دی جاتی تھیں' Representation کے ذرائع اختیار کیے جاتے تھے' وفود بھیجے جاتے تھے' اس طرح ان سے کہا جاتا تھا کہ ہمیں آزادی دیجیے' اقبالؒ نے بڑی خوبصورت انداز سے بات کی تھی:

ترا' ناداں! امیدِ غم گساریہا زِ افرنگ است

اے نادان! افرنگ سے متعلق تیری امید کیوں ہے' تیرے ذہن میں یہ بات ہے کہ یہ تمہارا ہمدرد ہوگا' تمہارا غمگسار ہوگا' تم جو یہ درخواستیں اس طرح کر رہے ہو' اس پر ہمدردانہ غور و خوض کرے گا اور وہ تمہیں آزاد کر دے گا؟

عزیزانِ من! اگلا مصرع ہے جس میں بات کہی ہے کہ

دلِ شاہیں نہ سوزد بہرِ آں مرغے کہ در چنگ است

---

❶ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ قریب 1700/1600 ق م کا ہے۔ (پرویزؒ: برقِ طور' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1993' ص۔4)

❷ اس کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔119۔

کسی باز کے پنجے میں جب کوئی چڑیا آ جاتی ہے' وہ لاکھ چیں چیں کرے' اس کا دل پسیجتا ہی نہیں ہے۔ یہ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ تو تم یہ چیں چیں کر کے سمجھتے ہوں کہ یہ باز تمہیں رہا کر دے گا۔ کس قدر خام خیالی ہے! کس قدر خوش فہمی ہے! اس طرح سے آزادیاں حاصل نہیں ہوا کرتیں۔ کوئی باز بھی قابو آئی ہوئی چڑیا کو اس طرح نہیں چھوڑتا' وہ لاکھ چیں چیں کرے۔ یہ چیز ہوتی ہے حاکم' مستبد' قوم کی۔ وہ نہیں چھوڑتی۔ اب سوچیے کہ یہ قوم جسے اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا خود تو وہ آزاد ہوگئی۔ اگر اسے نظر بظاہر باقی اقوام کے مقابلے میں دیکھا جائے تو اس کے بعد اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اپنے معاملات میں آزاد ہوگئی تھی۔ یہی منتہیٰ ہوتا ہے قوموں کا' لیکن یہاں تو ان کا فریضہ دوسرا تھا۔

دوسروں کو آزادی دلانے کا فریضہ

عزیزانِ من! ان کا فریضہ تو دوسری قوموں کو غلامی کے پنجے سے چھڑانا تھا۔ اب اس چھڑانے کے لیے مقابل میں جو قوتیں تھیں اب ان کے ساتھ ٹکراؤ ہونا تھا۔ آپ غور کیجیے کہ اسلام کہتے کسے ہیں' دین ہے کیا' اس کے تقاضے کیا ہیں۔ یہ صرف نماز روزے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اس ٹکراؤ کا' تصادم کا' تزاحم کا نام ہے۔ اور کاہے کے لیے ہے؟ ان کی سلطنت حاصل کرنے کے لیے نہیں' جوع الارضی نہیں' اپنی مملکت کو وسیع کرنے کے لیے نہیں' دوسری قوموں کو محکوم بنانے کے لیے نہیں۔ طاقتور قوموں کے یہی مقاصد ہوتے ہیں' ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ محکوم قوموں کو آزادی دلانے کی خاطر ان مستبد قوتوں سے ٹکراؤ ہوگا جنہوں نے انہیں محکوم بنا رکھا ہے۔ انہیں آزاد کرانے کی خاطر خود شمشیر بکف' کفن بدوش' میدانِ جنگ میں آیا جائے گا۔ ان کے ساتھ لڑائی کی جائے گی تاکہ ان کی محکوم قوموں کو آزادی حاصل ہو۔ اللہ اکبر! وہ جو میں عرض کیا کرتا ہوں' اور جو قرآن نے کہا ہے کہ اس کی مثل نہیں ملے گا۔ تو یہ یہی نہیں ہے کہ قرآن کی یوں مثل نہیں ملے گی کہ وہ الفاظ کی بات ہے۔ یہ چیزیں تاریخ میں کہیں اور نہیں ملیں گی کہ کوئی قوم ہے جسے کوئی اپنی مصیبت نہیں' کوئی مشکل نہیں' کوئی دشواری نہیں' وہ آزاد ہوگئی ہے' اسے سب کچھ مل گیا ہے۔ اس کے بعد وہ ٹکراؤ لے رہی ہے' اسے میدانِ جنگ میں جانا پڑ رہا ہے' اتنی اتنی بڑی قوتوں کے ساتھ تصادم ہو رہا ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ دوسری قوموں کو آزادی دلانے کے لیے۔ یہ تھا فریضہ اس قوم کا۔ پھر انہوں نے ان قوموں کو آزادی دلائی' ان قوموں کو دوسری اقوامِ عالم کے ہمدوش ہی نہیں کیا بلکہ ان سے آگے بڑھا دیا۔ ان کی توانائیاں' ان کی قوتیں اتنی پروان چڑھائیں کہ وہ دنیا کی بلند ترین قوموں کے اندر شمار ہونے لگیں' اپنے اپنے معاملات کو خود طے کرنے کے قابل ہوگئیں۔ انہیں ایسا ہی کرنے کے لیے کہا گیا۔

حق و باطل کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ کا نقشہ

عزیزانِ من! اب اگلی آیت آ گئی جواب زیرِ درس ہے اور جہاں سے آج ہم ابتدا کر رہے ہیں۔ **یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝**

تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ (79:6-7) ❶ ۔کہا کہ اب وہ دَور آئے گا۔اس کے بعد اس قوم سے کہا گیا کہ تمہیں میدانِ جنگ میں جانا ہوگا' ٹکراؤ ہوگا' لشکر کشی ہوگی اور وہاں ایسا ٹکراؤ ہوگا جسے کہتے ہیں کہ بنیادیں تک ہل جائیں گی۔ یہ ہیں الفاظ جو کہے ہیں: کانپ اٹھیں گی' تھرتھری مچ جائے گی' لرزش آجائے گی۔ آگے آگے وہ قوم ہوگی۔

عزیزانِ من! اب وہ قومِ مقابل کی بات کر رہا ہے۔اس کے پیچھے کیا ہوگی؟ کیا الفاظ ہیں' قرآن کے! **الرادفة**۔اسی سے ردیف ہے۔اسے یوں سمجھ کہ ایک گھوڑے پہ یا ایک اونٹ کے اوپر دو سواریاں ہوں' وہ جو پیچھے بیٹھی ہوئی سواری ہوتی ہے' وہ ردیف ہے' یہ جو شاعری میں ردیف ہے' آپ نے اس کا سن رکھا ہے۔ یہ وہ ہوتی ہے۔ یہ ردیف کہلاتی ہے: پیچھے بیٹھی ہوئی' لیکن یہ اتنی حسین تشبیہ ہے کہ وہ آگے والی سواری جہاں جہاں جائے گی' یہ پچھلی والی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوگی' پیچھا ہی نہیں چھوڑے گی۔ یہ پیچھے بیٹھی ہوئی سواری ہے۔کہا کہ ان کے یہ جو اعمال تھے' انہوں نے اپنی قوموں کے ساتھ جو کچھ ظلم کیے تھے' ان کے جو نتائج ہیں' وہ ان کے پیچھے یوں چمٹے ہوئے ہیں جیسے پچھلی سواری اگلی سواری کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ چل بچو! کہاں جاتا ہے۔**الرادفة** ان کے پیچھے وہ چلے آرہے ہیں' یعنی یہ چیز بھی ہے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم کوئی ان کے اوپر زیادتی نہیں کر رہے' کوئی ان کے اوپر ظلم نہیں کر رہے' یہ جو ان کا مقابلہ بظاہر نظر آتا ہے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں' یہ نہیں ہے' ان کے اپنے غلط نظام کے جو تخریبی نتائج ہیں وہ ان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں' ساتھ چپکے ہوئے ہیں' وہ ان کو چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ یہ ہے الرادفة۔اور اس کے بعد کہا کہ **قُلُوۡبٌ يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝ اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ** (79:8-9) دل وقفِ اضطراب ہیں' پریشانی میں دھڑک رہے ہیں اور نگاہیں شکست کے احساس سے' ندامت کی وجہ سے' زمین میں گڑی ہوئی ہیں۔دو دو الفاظ میں قرآن کیا نقشہ دیئے جاتا ہے۔خوب منظر کشی ہے۔کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے: آج بڑی شوکت' حشمت' قوت' دولت' ثروت یہ سب کچھ حاصل ہے' یہ بڑی بلندیوں کے اوپر اڑ رہے ہیں' **يَقُوۡلُوۡنَ** (79:10) یہ نہایت طنز آمیز انداز سے آپس میں کہتے ہیں کہ دیکھیے یہ جماعت' یہ لوگ' یہ رسول' ہم سے یہ کہتا ہے کہ **ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِى الۡحَافِرَةِ** (79:10) ❷ ۔کیا الفاظ ہیں صاحب!

تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر کی ترجمانی

عزیزانِ من! یوں اس آیت کے معنی یا مفہوم یہ سمجھیے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ' جو کچھ تمہیں حاصل ہے' یہ سب چھن جائے گا اور تم اس حالت میں لوٹ جاؤ گے جو اس سے پہلے تمہاری تھی' تم اسی پستی کے گڑھے میں گر جاؤ گے' یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ طنزاً کہتے ہیں کہ

---

❶ یہ انقلاب آفریں جماعت مومنین' جو زیردستوں کو ابھار کر اوپر لا رہی ہے' اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ آنے والا انقلاب آ کر رہے گا۔اس انقلاب میں جھٹکے پر جھٹکا آئے گا' اور ہر جھٹکے سے' نیچے کا طبقہ ابھر کر اوپر آ جائے گا' اور اوپر والا طبقہ نیچے چلا جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ تمام قوت و دولت اور جاہ و حشمت' جسے تم نے کمزوروں سے چھین رکھا ہے' سلب کر لی جائے گی اور تم پھر اُسی حالت میں پہنچ جاؤ گے جہاں تم اس جاہ و حشمت سے پہلے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یہ کہتا ہے کہ ہماری یہ حالت ہوجائے گی۔ ذرا دیکھیے تو سہی' بھلا ہماری یہ حالت ہوجائے گی؟ اگلی آیت بھی ساتھ ہی لے لوں تو پھر میں عرض کرونگا کہ اس میں تشبیہ کی کیا کیفیت ہے' کس قدر حسین تشبیہہ ہے۔ اگلی آیت ہے: ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (79:11) اچھے بھلے توانا انسان ہو مگر وہ کہتا ہے کہ کھوکھلی ہڈیاں رہ جاؤ گے' صرف ڈھانچہ رہ جاؤ گے' یہ کہہ رہا ہے کہ ہماری یہ حالت ہوجائے گی۔ سوچیے کہ ہماری یہ حالت ہوجائے گی؟

عزیزانِ من! اس آیت میں دو الفاظ ہیں! فِی الْحَافِرَةِ میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں تو مرادفات کی کمی نہیں ہوتی' وہاں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں مرادفات ہیں' وہاں سے ایک لفظ کا انتخاب ہوتا ہے۔ یہ جو آرکیالوجی (محکمہ آثارِ قدیمہ) والے کھدائی کرتے ہیں' تو پہلی چیز تو وہ ہوتی ہے کہ وہ کوئی ماضی کی قومیں' بالکل برباد ہوگئی ہوئی' ویران ہوچکی ہوئی' ختم ہوچکی ہوئی' ہوتی ہیں' وہ مٹی کے تلے دبی ہوئی ہوتی ہیں' یہ جو کھدائی کے بعد نیچے سے شہروں کو نکالتے ہیں' اسی میں سے مٹی کے ڈھانچے بھی نکلتے ہیں۔ یعنی پستی میں گرنا' پچھلی حالت میں لوٹنا ایسے جیسے کسی کا آثارِ قدیمہ بن جانا' یا اثارت آثارِ قدیمہ کو کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ساری حشمت اور دولت اور زندگی اور لہلہاتی حرکت ختم ہوجائے گی' تم آثارِ قدیمہ بن جاؤ گے۔ کیا خوبصورت الفاظ ہیں قوموں کی تباہی کے متعلق! آثارِ قدیمہ میں جب وہ کھودتے ہیں تو انسان تو کوئی وہاں سے نہیں نکلتا' انسانوں کی ہڈیاں نکلتی ہیں' جسے پنجر کہتے ہیں' ڈھانچے کہتے ہیں۔ یہ اگلے الفاظ وہ ہیں: ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (79:11) کھوکھلی ہڈیاں رہ جائیں گی' ڈھانچے رہ جائیں گے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تم یہ ہوجاؤ گے' زندہ قوم نہیں رہو گے' زندہ انسان نہیں رہو گے' آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہوجاؤ گے' تمہاری ہڈیاں' تمہارے ڈھانچے رہ جائیں گے۔ یہ ایک دوسرے سے طنزاً کہتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق یہ کہتا ہے: قَالُوْا تِلْکَ اِذًا کَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (79:12) وہ طنز آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا' اگر یہ گردش ہوئی تو یہ گردش تو بڑی نقصان دہ گردش ہے' تباہ ہوجانے والی بات ہے' یہ ہمیں اس سے ڈراتا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ یہ چیز اتنی ہی نہیں کہ یہ ہوکر رہے گی' اب پکے ہوئے پھل کی طرح تم کسی کی جھولی میں گرنے والے ہو' وقت آ پہنچا ہے' ایک جھٹکے میں یہ کچھ ہوجائے گا: فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ [1] (79:13) ایک جھٹکا' ایک آواز' ایک بگل' وہ جو جنگ کے متعلق اعلان ہوتا ہے وہ ایک یہ چیز ہوگی: فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ [2] (79:14) تم میدانِ جنگ میں نکل آؤ گے اور پھر اس میں وہ یہ سب کچھ ہوگا جو تم سے کہا جا رہا ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے اس مقصد کے حصول کے لیے ابتدائی تعارف جو ان قوموں کے ساتھ جو ہو رہا ہے۔ یہ قوم کاہے کے لیے آ رہی ہے' باہر نکل رہی ہے' کیوں بگل بج رہے ہیں' کیوں میدانِ جنگ میں آ رہی ہے؟ اس لیے کہ یہ انہی کی محکوم قوموں کو ان کے پنجہ استبداد

---

[1] وہ ایک سخت آواز ہوگی۔

[2] اس کے بعد سب میدان میں ہوں گے۔ (اُسی میدان میں یہ سب فیصلے ہوں گے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سے چھڑائے' ان کی اپنی کوئی قوم وہاں محکوم ہے' ان کے کوئی قیدی ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں جن کو چھڑانے کے لیے یہ جا رہے ہیں۔ یہ انہی کی محکوم قوم' یا جن قوموں کو انہوں نے محکوم بنا رکھا ہے' انہیں چھڑانے کے لیے ہے۔ ان کا ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں' کوئی تعلق نہیں' کوئی سیاسی اشتراک نہیں' اپنی مملکت کا حصہ نہیں' اپنی قوم کے افراد نہیں' انسان ہیں اور فریضہ یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی انسان کسی دوسرے کی غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے ان کا فریضہ یہ ہے کہ یہ ان زنجیروں کو توڑیں' اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا تو فریضہ یہ بھی ہے کہ یہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں۔ اور قرآن میں بھی یہ ہے کہ اگر ہم یہ انتظام نہ کرتے تو دنیا میں کسی اہلِ مذہب کی عبادت گاہیں محفوظ نہ رہ سکتیں۔ یعنی یہ اہلِ مذاہب وہ ہیں جن کے مذاہب کو قرآن باطل کہتا ہے' ان کی عبادت کو وہ شرک کہتا ہے' ان کے معبودوں کو باطل قرار دیتا ہے' ان کے مذہب کے خلاف اعلان کرتا ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ اس قوم کا فریضہ' اس امت کا فریضہ' یہ بھی ہوگا کہ اگر کہیں کسی عیسائی کے گرجے کو کسی سے خطرہ ہو تو ان کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ اپنی جانیں دے کر اس گرجے کو محفوظ رکھیں۔ اللہ اکبر!

اسلام بزورِ شمشیر پھیلا: مودودیؒ مرحوم کا ارشاد

عزیزانِ من! ملاحظہ فرمائیے یہ ❶ کہتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ غیروں اور دشمنوں نے تو یہ کہنا ہی تھا' یہ اپنے بھی بڑے فخر سے دنیا میں یہی کہتے ہیں (معاذ اللہ)۔ یہ مودودی ❶ مرحوم ہی تھے جو ان چیزوں میں آگے آگے جا رہے تھے۔ ان کی پہلی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' ہے جس میں بڑے فخر سے یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے اندر معاذ اللہ یہاں تک بھی کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ساری زندگی وعظ' تلقین' تبلیغ' یہ سب کچھ' کرتے رہے' چار آدمی بھی نہ ملے' اور اس کے بعد جونہی تلوار ہاتھ میں لی' ملکوں کے ملک فتح کر کے رکھ دیئے۔ کہا کہ بتاؤ اسلام کس سے پھیلا؟ وعظ و تلقین سے پھیلا یا تلوار سے پھیلا۔ کیا کیا جائے؟ قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ دوسروں کی محکوم قوموں کو چھڑانا تمہارا فریضہ ہے' ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا تمہارا فریضہ ہے' اس کے لیے تو یہ بھی کہا گیا کہ تمہیں میدانِ جنگ میں آنا پڑے گا۔

عزیزانِ من! اب آیت 14 تک ہم آ گئے ہیں۔ پہلی پانچ آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ قوم جو ہم تیار کر رہے ہیں' یہ امت جو ہم متشکل کر رہے ہیں' اس کا فریضہ یہ ہوگا کہ دنیا کی محکوم قوموں کو محکومی کی حالت سے نکال کر آزاد کرائے' طاقتور بنائے' اس قابل صاحبِ اختیار بنائے کہ اپنے معاملات آپ طے کرنے کے قابل ہو۔ اس کے بعد یہ کہا کہ اس مقصد کے لیے ٹکراؤ ہوگا' بڑا سخت ٹکراؤ ہوگا' اس کے بعد یہ مقصد حاصل ہوگا۔ قرآن کا انداز آپ کو معلوم ہے کہ جب وہ کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اس کے بعد اس کے لیے دلائل بہم پہنچاتا ہے۔ دلائل کے لیے ایک طریق تو یہ ہے کہ وہ خارجی فطرت میں جو نظام کارفرما ہے' جس طرح سے وہاں قانون کی عمل داری ہو رہی ہے'

---

❶ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1979-1903)

وہ اس کو بطور شہادت پیش کرتا ہے کہ ہمارا قانون یہ ہے اور پھر کہتا ہے کہ جس طرح وہاں نافذ العمل ہے' انسانوں کی دنیا میں بھی یہی قانون نافذ العمل ہوگا۔ ایک تو اسکا انداز یہ ہے۔ جب وہ قوموں کے متعلق کوئی بات کرتا ہے تو دوسرا انداز یہ ہے کہ وہ سابقہ قوموں کے احوال وسرگزشتیں بطور شواہد پیش کرتا ہے' تاریخی شواہد دیتا ہے کہ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھو کہ کیا ایسا نہیں ہوا۔

داستانِ بنی اسرائیل بطورِ شہادت

اب بات یہ آرہی ہے کہ ایک بہت بڑی محکوم قوم' ایک بہت بڑے جابر کے پنجہ استبداد میں گرفتار ہے' اسے وہاں سے چھڑانا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے اقوامِ عالم میں اس کی کئی مثالیں دی جاسکتی تھیں۔ سب سے زیادہ جامع مثال بنی اسرائیل اور صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے ٹکراؤ کی ہے۔ ان داستانوں میں سب سے زیادہ حصہ جو بیشتر ان سرگزشتوں کا ہے وہ بنی اسرائیل کا ہے' بڑی جامع طور پر وہ داستان تاریخی شہادتیں پیش کرتی ہے۔ اب یہاں یہ چیز ہے کہ ایک پوری قوم اس کی غلامی کے پنجے میں گرفتار ہے۔ صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا ہے کہ وہ وہاں جا کر اس قوم کو آزادی دلائے' وہاں جو حکمران ہے وہ فرعون جیسا مستبد ہے کہ جس کا نام دنیا کے اندر فرعونیت کے لیے مشہور ہوگیا ہے۔ یہ کتنا بڑا جابر ہے۔ یہ اس کی طرف جا رہے ہیں' اس کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے۔

اب یہاں تک آنے کے فوراً ہی بعد قرآن کہتا ہے کہ ایک بگل بجے گا' تو تم میدانِ جنگ میں نکل آؤ گے اور آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ کہا کہ یہ سمجھنا چاہتے ہو کہ یہ واقعہ کی طرح تاریخ میں ہوتا ہے تو سنو' یہ انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں ہے۔ یہ سلسلہ تو شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مستبد قوتیں کمزوروں کو دباتی رہی ہیں' اور انبیائے کرام اور ان کے رفقاء کی جماعتیں' ان کمزوروں اور ناتوانوں کو ابھار کر اوپر لاتی رہی ہیں۔ مثلاً هَلْ اَتٰـكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ❶ (79:15)۔ کیا بات ہے! کتنا خوبصورت انداز ہے! عزیزانِ من! پتہ نہیں زندگی میں دوبارہ یہ کچھ کہنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے' آپ تھوڑی سی عربی سیکھ چھوڑیئے گا۔ قرآن مشکل عربی زبان کی کتاب نہیں ہے وہ تو بڑی آسان عربی زبان ہے۔ یہ عربی زبان کے اعتبار سے اتنا آسان ہے اور ادبِ عربی کے اعتبار سے اتنا حسین' خوبصورت اور جاذبِ نگاہ ہے دلکش حقائق تو ایک طرف رہے' جو اس کا انداز ہے' وہ آپ دیکھیے گا کہ اس سے آپ کو کیا لذت ملتی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ یہ کہتے ہوئے کہ یہ یوں آئے گا' یہ ٹکراؤ یوں ہوگا' کہا کہ هَلْ اَتٰـكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ❶ (79:15)۔ بات کہاں سے شروع کی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پہلی زندگی تو خود فرعون کے ہاں گزری تھی۔ کہا کہ بات شروع کرتے ہیں جہاں موسیٰ صاحبِ وحی بنا تھا۔ اب دیکھیے کہ وہ قرآن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی ابتدا' اس مقصد کے لیۓ کہاں سے کرتا ہے؟ اس مقام سے جہاں اسے طور کی چوٹیوں پر وحی دی گئی اور اس کے

---

❶ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کو لو۔

ذمہ یہ فریضہ عائد کیا گیا۔ بات شروع کرتا ہے کہ اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ❶ (79:16)۔ اس حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں یہ چیز پہلے ❷ بھی آ چکی ہے کہ وہ وادالمقدس طویٰ میں پہنچا۔ عام ترجمہ اور تفسیریں یہ ہونگی کہ وہ طوی کی مقدس وادی میں پہنچا۔ ایک تو یہی ہے کہ یہ اس وادی کو کہتے ہیں جس کا نام طوی ہے اور پھر وہ وادی بھی مقدس۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو خاص طور پہ قرآن نے الفاظ دیئے ہیں' بڑے ہی عمیق اور وسیع معنی پر مشتمل ہیں۔ مقامِ نبوت اس کے اندر آتا ہے' وحی کی خصوصیت اس کے اندر آتی ہے۔ جسے نبوت ملنے والی ہوتی ہے' اسے خود ایک دن پہلے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اُسے کس مقام پہ سرفراز کیا جائے گا۔ وہ جانتا ہی نہیں' لیکن اپنے طور پر اس کے دل میں ایک تڑپ ہوتی ہے' ایک خلش ہوتی ہے' ایک تلاش ہوتی ہے۔ جو کچھ اس کی قوم میں حاضر و موجود ہوتا ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا اور حقیقت اس کے سامنے ہوتی نہیں۔ وحی ملنے سے پہلے یہ اضطرابی کیفیت اس کے اندر ہوتی ہے۔ یہ وحی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کی جو خلش ہے وہ بڑی چیز ہے ورنہ وہ اسی قوم سے ہوتا ہے' اسی معاشرے سے ہوتا ہے' وہی اعتقادات' مسالک' مشارب جو اس قوم میں ہوتے ہیں' انہی کے اندر یہ پلتا ہے' بڑھتا ہے' پھولتا ہے' پھلتا ہے۔ اسے تو انہی میں سے ایک ہونا چاہیے لیکن اس میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کسی حقیقت کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ❸ (93:7)۔ معاذ اللہ ضآلاً کے معنی گمراہ نہیں ہیں۔ نبی نبوت ملنے سے پہلے کی زندگی میں گمراہ نہیں ہوتا۔ جو ہو رہا ہوتا ہے وہ اس پہ مطمئن نہیں ہوتا' وہ تلاشِ حقیقت میں اِدھر اُدھر جاتا ہے۔

ضال کے معنی ہوتا ہے: تلاشِ حقیقت میں اِدھر اُدھر پھرنے والا' سرگرداں پھرنے والا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ہے اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو قرآن نے تفصیل سے بتا دیا کہ وہ جہاں کہیں سنتے تھے کہ وہاں کہیں کوئی حقیقت ہے' وہاں کوئی صاحب ایسے ہیں جو باقی انسانوں سے الگ کوئی راستہ بتاتے ہیں' یہ وہاں پہنچتے تھے۔ وہ جسے آپ حضرتِ خضر ❹ کے ساتھ ملاقات کہتے ہیں' وہ خضر کا لفظ تو قرآن میں نہیں آیا لیکن ایک بزرگ کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے۔ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ نبوت ملنے کے بعد یہ کیفیت

---

❶ اس داستان کا آغاز وہاں سے کرو جب موسیٰ اس مقام میں پہنچ چکا تھا جہاں عقل کے تجرباتی طریق کی لمبی مسافتوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا، اور اس پر وحی کے ذریعے براہِ راست انکشافِ حقائق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا (20:12) یعنی جب موسیٰ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اُس وقت اس کے نشوونما دینے والے نے اسے پکارا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ملاحظہ کیجیے: منظور الحق' پروفیسر ڈاکٹر (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 2005۔

❸ پھر کیا یہ بھی واقعہ نہیں کہ تو تلاشِ حقیقت میں حیران و سرگرداں پھر رہا تھا' تو اس نے بذریعہ وحی' زندگی کے صحیح راستے کی طرف تیری رہنمائی کر دی؟ (ایضاً)

❹ ان نکات کی وضاحت کے لیے ملاحظہ کیجیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف و سورۃ مریم' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص ص 140-116۔

نہیں ہوتی کہ نبی پھر بھی جا کر پیر و مرشد تلاش کرتا پھرے۔ نبوت ملنے کے بعد تو پھر دنیا بھر کے پیر و مرشد اس کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ یہ اس سے پہلے کا واقعہ ہے: وہی تلاشِ حقیقت میں پھرنے والا' لمبے لمبے سفر کرنے والا۔ اس کے بعد جب اِسے وحی ملتی ہے تو کیا کرتی ہے؟ وہ اس کے لمبے لمبے سفر کی صفوں کو لپیٹ دیتی ہے۔ مقدس کے معنی ہوتا ہے: ''دور دور تک جانے والا'' اور طوی کے معنی ہوتا ہے: لپیٹ دینے والا۔ موسیٰ علیہ السلام! تیری لمبی لمبی مسافتیں' جن میں تُو سرگرداں پھر رہا تھا' آ وَ آج وہ لپیٹ دی جاتی ہیں۔ وحی کے بعد پھر ان مسافتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ وحی کی رو سے ان صفوں کو لپیٹ دینا ہے۔ پہلے وہ اپنے دل کے اضطراب سے' اپنے ہی علم اور شعور اور عقل و فہم کی رو سے' کچھ راستے تلاش کرتا ہے' وہ گمراہ نہیں ہوتا۔

وحی اور عقل میں فرق

وحی ملنے سے پہلے وہ حقیقت تلاش کر رہا ہوتا ہے لیکن وہ بڑے لمبے راستے ہوتے ہیں۔ وحی انہی لمبی راہوں کو لپیٹ کر مختصر کر دیتی ہے۔ یہ ہے دونوں میں فرق۔ اقبالؒ (1877-1938) نے اس کے متعلق کہا ہے' وہ ایک جگہ نہیں وہ تو بہت جگہ یہ چیز کہتا ہے:

ہر دو امیرِ کارواں ہر دو بمنزلے رواں

عقل بھی راہیں تلاش کرتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ دوسری طرف وحی ہوتی ہے' وہ بھی صحیح راہ دیتی ہے۔ یہ دونوں کی کیفیت ہوتی ہے۔ فرق کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ

عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

جو عقل ہے وہ مختلف ذرائع اسباب پہ تجربات کرتی رہتی ہے۔ پھر یہ ثابت کیا۔ تجربہ غلط ثابت ہوا' پھر دوسرا تجربہ کیا اس کو ثابت کیا۔ اس کے برعکس عشق کھینچ کر لے جاتا ہے کہ لے یہ ہے حقیقت۔ لمبی مسافتیں نہیں ہوتیں، اور عزیزانِ من! دنیا میں قرآن کی وارث قوم کو دیگر اقوامِ عالم پر یہی Advantageous Position (افادی حیثیت) حاصل ہوتی ہے کہ جو جن حقائق تک وہ شاید صدیوں کے بعد بھی کہیں نہ پہنچیں اور پھر اتنی ہی ناکام تجارت کے بعد ہڈیاں تڑاتے ہوئے خون کی خندقیں عبور کرتے ہوئے' وحی کا ایک لفظ' اس کی ایک آیت' اس کی ایک سورت' اس کو اس مقام پہ پہنچا دیتی ہے۔ یہ ہے فرق دونوں میں۔ یہ ہے وہ **بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى**: وہ لمبی لمبی مسافتیں یہ تھیں۔ **اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ** جب اس کے رب نے اس کو پکار کر کہا کہ موسیٰ! بڑی لمبی مسافتیں تم نے گزاری ہیں' تلاشِ حقیقت میں بڑے سرگرداں پھرے ہو' آ وَ آج تمہاری مسافتوں کی صفیں لپیٹ دی جاتی ہیں' سنو جو ہم کہتے ہیں۔ یہ ہے عزیزانِ من! وحی کے اور عقل کے طریقِ کار کا فرق۔ یہ ہیں جو لمبی لمبی وادیاں ہیں۔ قدس کے معنی ہی ''دور دراز چلے جانا'' ہوتا ہے۔ وہ جو لمبی وادیاں مسافتیں ہیں' وہ طے ہو جاتی ہیں' مختصر ہو جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہی: جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے۔ یوں تو وحی سے سرفراز ہونا کوئی چھوٹی نعمت نہیں ہے ہر انسان کو تو یہ ملتی نہیں ہے' بہت بڑی چیز ہے' لیکن پہلی ہی وحی کے اندر جو فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ ہے **اِذْهَبْ اِلٰى**

فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ❶ (79:17)۔ایک لفظ میں بتا دیا کہ یہ ہے کیا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فرعون بڑا سرکش ہو گیا ہے' حد سے بڑھ گیا ہے' اس کی طرف جاؤ۔عزیزانِ من! فریضہ عائد ہو رہا ہے کہ اس کی طرف جاؤ۔ اگلی آیت میں ایک بات آ رہی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اسے کس طرح Explain (واضح) کروں۔ یہ اتنی بڑی جامع چیز ہے۔ اس امت کا فریضہ یہ بتایا کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی محکوم اور غلام قومیں ہیں' انہیں محکومی اور غلامی سے چھڑانا ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس جا رہے ہیں جس کے متعلق کہا گیا کہ بڑا ہی سرکش ہے اور حدود فراموش ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ٹکراؤ کے لیے جا رہے ہیں۔ اب دنیا میں جہاں بھی کوئی دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ کے لیے جائے گا' یوں کہیے کہ وہاں ان کی جنگ ہو گی' اس کو اقتدار سے ہٹانا ہوگا۔ جب دوسروں کے ساتھ یعنی صاحبِ اقتدار حکمرانوں کے خلاف' جنگ ہوتی ہے تو ان کو اقتدار سے ہٹانا ہوتا ہے' ان کی مملکت کو چھیننا ہوتا ہے' پھر اگر وہ مفتوح ہو گیا ہے' آپ کو فتح حاصل ہوئی ہے تو پھر تو پوچھو نہیں کہ اس کے ساتھ کیا کچھ کیا جاتا ہے: زنجیریں پہنانا' قید و بند میں ڈالنا' پھانسی کے تختے پہ چڑھا دینا اور بھی بہت کچھ یعنی یہ اس کے خلاف ایک انتقامی چیز ہوتی ہے جس کے لیے یہ حملہ کیا جاتا ہے' اس کے ساتھ تصادم کیا جاتا ہے' لیکن خدا کی مامور یہ جماعت' یہ نبی' یہ رسول' جب فرعون کی طرف جاتا ہے' تو پہلی وحی میں جو حکم دیا جاتا ہے اس کا اندازہ لگائیے' بڑے غور سے سنیے کہ عزیزانِ من! یہ کاہے کے لیے ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ **فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى** ❷ (79:18)۔

عزیزانِ من! اس آیت میں بڑی توجہ طلب چیز ہے' قرآن کے ایک لفظ نے سیاست کی دنیا بدل دی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اس سے جا کر کہو کہ ''تجھے سلطنت حاصل ہے' حکومت حاصل ہے' دولت حاصل ہے' قوت حاصل ہے' تمہیں یہ سب کچھ حاصل ہے لیکن تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما نہیں ہوئی' تم سطحِ انسانیت پہ نہیں آ سکے۔ اس لیے یہ سب کچھ ہونے کے باوجود تم ایک جابر و ظالم حیوان تو بن سکے ہو' انسان نہیں بن سکے۔ میں آیا ہوں کہ تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے' تمہیں سطحِ انسانیت پہ لے آؤں۔'' اللہ اکبر! مقصد یہ بتایا جا رہا ہے۔ قوم اٹھی ہے تو اس لیے کہ جہاں کہیں کوئی محکوم قوم ہے' اس کو محکومیت کی زنجیروں سے نکال کر انسانیت کی صف میں آگے لے جائے۔ یہاں ٹکراؤ کے لیے' فرعون کے مقابلے کے لیے' اس کو بھیجا جاتا ہے کہ جاؤ' وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ جانے کا مقصد

---

❶ تم فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے دھاندلی مچا رکھی ہے۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ اس نے کمزوروں کو بری طرح دبا رکھا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ (اس کی طرف جاؤ اور) اس سے کہو کہ (تم نے دولت اور قوت تو بہت جمع کر رکھی ہے لیکن اپنے مقامِ انسانیت کے متعلق تم نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں) کیا تُو چاہتا ہے کہ تیرے شرفِ انسانیت کی بھی نشوونما ہو جائے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کیا ہے؟ اس سے کہنا یہ ہے' کہ تمہیں سب کچھ حاصل ہے لیکن تم انسان نہیں بن سکے اور پھر یہ نہیں کہ اس کو بید مار مار کر انسان بنایا جاتا ہے' جنوں چمڑی ادھیڑ دیندے نیں' کہتے ہیں۔ ❶ جلاد تو ہے ہی جلدۃ سے: یہ بید مارنا' کھال ادھیڑ دینا۔ یہاں کہا کہ یہ اس طرح سے نہیں ہے۔ یہاں اَنۡ تَزَکّٰی ہے۔ میری بات سنو' تمہاری سمجھ میں بات آ جائے گی۔ تمہاری انسانیت کی صلاحیتیں Undeveloped (غیر نشوونما) رہ گئی ہیں۔ کیا بات کہہ رہا ہے! یہ شخص جنگ کرنے کے لیے' میدانِ جنگ میں آنے کے لیے' تصادم کے لیے' اتنے بڑے سرکش کے سامنے جا رہا ہے۔ مقصداً سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم انسان نہیں بن سکے' میری بات سنو گے تو انسان بن جاؤ گے۔ فَقُلۡ هَلۡ لَّکَ اِلٰٓی اَنۡ تَزَکّٰی ❷ (79:18)

قرآنِ حکیم کا سیاسی نظام

عزیزانِ من! وہ اربابِ فکر جو میرے درس میں ہیں' اللہ کا شکر ہے' وہ اسے غور سے سنیں۔ میں عرض کرونگا کہ اس نقطے پر سیاست کی ایک عمارت استوار ہو جائے گی کہ جب یہ قوم دوسروں سے ٹکراؤ کرتی ہے' تصادم ہوتا ہے' بظاہر جسے جنگ بھی کہا جا سکتا ہے' Conflict (تصادم) بھی ہوتی ہے تو ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ مقابلے میں آتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ سطحِ انسانیت پہ نہیں ہوتے' سطحِ انسانیت پہ ہوں تو جس مقصد کے لیے تم اٹھے ہو' وہ اس کا مقابلہ کریں ہی نہیں' وہ تو اُسے Appreciate (پسند) کریں' اس کا ساتھ دیں' تعاون کریں کہ چلو' ہم بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ وہ مقابلہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ حیوانی سطح پہ ہوتے ہیں۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ انہیں بتاؤ کہ میں جو پروگرام دے رہا ہوں' اس پہ چلو گے تو تمہاری انسانی صلاحیتیں نشوونما پا جائیں گی' اللہ اکبر! کیا مقاصد ہیں! یہ ہے' عزیزانِ من! قرآن کا سیاسی نظام۔ جب وہ فریقِ مقابل کے لیے بھی یہ کچھ چاہتا ہے تو خود جو اپنی قوم کے افراد ہونگے ان کے لیے یہ جو لوگ صاحبِ اقتدار ہیں ان کا فریضہ یہ بھی ہوگا کہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے صفحہ انسانیت پر لے آئیں' نہ کہ یہ انہیں مزید کچل کر ان کو پست سے پست تر کرتے چلے جائیں۔ دنیا کے اربابِ اقتدار اور اربابِ حکومت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ دیکھیں کہ ذرا سی بھی صلاحیت ابھر رہی ہے تو یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ ❸ (28:4)۔ یہ تھا فرعون۔ جو ابنائے قوم ہیں' اُن میں سے جن کے متعلق اس کے ذہن میں یہ ہو کہ یہ ذرا ابھر رہے ہیں وہ جھٹ سے انہیں وہیں ختم کر دیتا ہے۔ یہ وہی ہے جو میں مالی کی مثال دیا کرتا ہوں کہ وہ مالی ہاتھ میں قینچی سی لے کر چلا پھرتا ہے' جہاں کہیں اس نے دیکھا کہ ایک پتی بھی اس کے نقشے سے ذرا ہٹ کر ابھر

---

❶ جسے چمڑی ادھیڑ دینا کہتے ہیں۔
❷ (اس کی طرف جاؤ اور) اس سے کہو کہ (تم نے دولت اور قوت تو بہت جمع کر رکھی ہے لیکن اپنے مقامِ انسانیت کے متعلق تم نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں) کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے شرفِ انسانیت کی بھی نشوونما ہو جائے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
❸ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے' ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا۔ (ایضاً)

رہی ہے اس کو کڑچ کر دیتا ہے، وہیں ختم کر دیتا ہے۔ دنیا کی حکومتیں اس قینچ کے سر پہ چلتی ہیں کہ کوئی ابھرنے نہ پائے۔

قرآن کی سیاست یہ ہے کہ یہ جتنے لوگ دبے ہوئے ہیں، ان کی نشو ونما کر کے انہیں ابھار کر یہ اوپر لے آتی ہے، یہ ان کی اقوام کو بھی اوپر لے آتی ہے اور یہ جو ارباب اقتدار ہیں، ان سے وہ کچھ چھینتی بھی نہیں ہے بلکہ ان کو سطح انسانیت پہ لاتی ہے: قُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (79:18)۔ کیا الفاظ ہیں! کیا یہ نہیں چاہے گا، کیا تم یہ نہیں چاہو گے کہ ایسے ہو جاؤ؟ حیوان سے انسان بن جاؤ، اور اس کے بعد ہے کہ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ❶ (79:19)۔ اور وہ کس طرح سے انسان بنے گا؟ اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ میں وہ طریق تمہیں بتاؤں گا، وہ راستہ تمہیں بتاؤں گا، جس راستے پہ چلتے ہوئے ربوبیتِ خداوندی تمہاری نشو ونما کرے گی اور فَتَخْشٰى (79:19)۔ تمہیں سوائے قانونِ خداوندی کے عواقب سے، کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ ہوا وہ انسان جس کی انسانی صلاحیتیں نشو ونما پا جائیں۔ یہاں الفاظ ہیں: اِلٰى رَبِّكَ (79:19)۔ یہ جو لفظ ہیں انہیں ذرا ذہن میں رکھیے گا۔ دو آیتیں آگے چل کر پھر اس بات کی سمجھ آئے گی کہ ''الیٰ ربک'' کیوں کہا ہے۔ یعنی خدا کے، اللہ کے تو اسمائے حسنہ اتنے ہیں، خصوصیت سے یہاں اس نے الیٰ ربک کیوں کہا۔ ابھی دو آیتوں کے بعد بات سامنے آ جائے گی۔ آگے کہا کہ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى (79:20) حسنِ قوانینِ خداوندی کا جو عظیم ضابطہ تھا اس کی علامات اس کے سامنے رکھیں کہ یہ ہے وہ ضابطہ جس میں ہر انسان کو آزادی ملتی ہے، کوئی کسی کا محکوم نہیں رہتا اور تمہارے جیسا انسان، جو بپھرا ہوا ایک بھیڑیا یا شیر ہے، وہ اسے سطح انسانیت پہ لے آتا ہے، تجھ میں بڑی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں لیکن وہ غلط راہوں پہ پڑی ہوئی ہیں، ان کو صحیح قالب میں ڈھال دیا جائے گا۔ مگر ہمارے ہاں کے مترجمین اور مفسرین کہتے ہیں کہ آیت الکبریٰ وہ عصا تھا جو سانپ بن گیا اور ایسا یدِ بیضا ہو گیا۔ یہ آیات آ چکی ❷ ہوئی ہیں، وہ آگے بھی آئیں گی تو ان کا مفہوم ساتھ کے ساتھ آتا جائے گا۔ قرآن بات تو یہ کرتا ہے۔ اس کو سطح انسانیت پہ لا رہا ہے، اور اس کے سامنے تو ایک ایسا پروگرام، ایسا ضابطہ ہدایت لانا ہوگا جو تمہاری غلط روش کے نتائج بتائے کہ کیا ہیں، اور پھر یہ بتایا جائے گا کہ تم اپنی صلاحیتوں کو کس طرح تباہ کر رہے ہو۔ وہاں یہ چیزیں ہونگی، یہ ان کے سامنے رکھیں لیکن وہ تو نشہ اقتدار میں مست تھا۔ فَكَذَّبَ وَ عَصٰى ❸ (79:21) اس نے کہا کہ وہ سب غلط ہے جو مجھے کہہ رہے ہو کہ میرے اس نظام کا نتیجہ میری تباہی اور ہلاکت ہوگا۔ بالکل غلط ہے، اس نے ان کو ماننے کی بجائے سرکشی اختیار

---

❶ اور میں تجھے وہ راستہ بتاؤں جو تمہیں خدا کی ربوبیت عامہ کی طرف لے جائے...... اُس سے یہ کچھ کہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے اس کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ اپنی موجودہ روش سے، جو اُسے تباہیوں کے جہنم کی طرف لے جا رہی ہے، رُک جائے۔ (اس سے کم از کم اتمام حجت ہی ہو جائے گا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء

❸ لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور بدستور اپنی سرکشی پر اڑا رہا۔ (ایضاً)

کی۔ اب عزیزانِ من! اگلی آیت میں دو الفاظ ہیں: ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی ❶ (79:22)۔ یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستانِ کشمکش ہے، یہ قرآن کے بیشتر مقامات میں آ گئی ہوئی ہے، بڑی تفصیل سے ہر جگہ آئی ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! قرآن اپنے اس آخری پارے میں کرتا یہ ہے کہ ان تفاصیل کو دہراتا نہیں ہے، ان کی طرف اشارہ کرتا ہوا آگے چلا جاتا ہے کیونکہ اسے پتہ ہے کہ یہ تو سب کچھ پہلے آ چکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے تصریفِ آیات کا طریقہ بتایا ہے کہ ایک جگہ جو بات آئے، اسے قرآن میں دیکھو کہ اس کے متعلق کہاں کہاں کیا کچھ آیا ہوا ہے۔ اس طریقہ سے، ہر اشارے سے، اس بات کی پوری تفصیل سمجھ میں آ جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش کی یہ داستان اس سے پیشتر ایک سے زیادہ جگہوں پر، پوری تفصیل کے ساتھ آ چکی ہے۔ یہاں قرآن تفصیل نہیں دے رہا، اشارہ کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ کہا کہ ثُمَّ اَدْبَرَ (79:22)۔ یہ دو الفاظ ہیں اور آگے ہے: یَسْعٰی (79:22)۔ کیا بات ہے قرآن کی! ''ادبر'' تو یہ ہے کہ اس سے اس نے پیٹھ موڑ لی، منہ موڑ لیا۔ یہ ایک منفی سی چیز ہوتی ہے۔ اعراض برتا، بات نہ سنی، دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ یہ اس کے بعد کوئی Possitive Action (مثبت عمل) نہیں ہے۔ اس سے یہی ہے کہ منہ موڑ لیا ہے، ٹھیک ہے یہ (ادبر) ہے اور اس کے بعد ہے: یَسْعٰی یعنی منہ موڑ کر چپکے سے نہیں بیٹھ گیا بلکہ اپنے پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوششوں میں لگ گیا۔ غور فرمایا دو لفظوں کے معنی کیا ہو گئے۔ ادبر سے یہی بات تھی کہ صاحب! اس نے منہ موڑ لیا۔ ٹھیک ہے، منہ موڑ کر چلا گیا۔ پھر اتنا ہی نہیں کیا۔ آگے ہے: یَسْعٰی اس کا ایک Plan (منصوبہ) تھا، اس پر عملدرآمد کے لیے جو مختلف کڑیاں تھیں، اس نے وہ شروع کر دیں، یعنی فَحَشَرَ فَنَادٰی (79:23) مملکت کے لوگوں کو جمع کیا۔ اس نے اپنی مملکت کے عمائدین و اراکین کو آواز دی۔ ممکن ہے آپ کو اب یاد ہو۔ آپ بھی تو بہرحال اتنے عرصے سے درسوں کو اور قرآن کی آیات کو Follow (سمجھ) کر رہے ہیں۔ فرعون نے یہ دیکھ لیا تھا کہ سیاست میں وہ حضرتِ موسیٰ کو مات نہیں کر سکتا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس قوم میں یہ شخص اتنا صاحبِ اثر ہے کہ اس پہ اگر ہاتھ ڈالا تو بغاوت ہو جائے گی۔ وہ بہت دُور کا سیاست جاننے والا تھا۔

مذہبی پیشوائیت کا ہتھیار

عزیزانِ من! قرآن میں ہے کہ اس کے مشیروں نے کہا تھا کہ کب تک تُو ان دو بھائیوں کو ڈھیل دیتا چلا جائے گا: اس وقت تک کہ تمہیں تخت سے اتار کر الگ کر دیں اور خود بادشاہ بن کر بیٹھ جائیں۔ کیا تُو اس وقت تک یہی کرتا رہے گا؟ اس نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیسے ڈیل (Deal) کرنا چاہیے، اس طرح سے نہیں جیسے تم کہتے ہو۔ یہ غلط ہے۔ کیا کیا جائے؟ مذہبی پیشوائیت

---

❶ موسیٰ کی طرف سے منہ پھیر کر الٹا اس کوشش میں لگ گیا کہ اسے کسی طرح شکست دے دی جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ایہد ے پچھے پادتی جائے۔ جیہڑا کم ڈنڈے نال نہیں نکلدا انا' او اینان کول نکل اونداا ے۔ ❶ کتنی دُور کی بات ہے! تاریخ تو اپنے آپ کو دہرائے چلے جارہی ہے: کسی صاحب اقتدار کی قوت اور طاقت نے وہ کچھ نہیں کیا جو ان لوگوں کے ایک کفر کے فتوے نے کر دیا۔ عباسیوں کی سلطنت (132-656AH بمطابق 750-1258AD) ایسے نہیں الٹ سکتی تھی۔ وہ جو وہاں مسائل چھیڑے گئے تھے' ان مسائل کی رو سے آپس میں کشت و خون ہوا تھا' بغداد کی نالیوں میں دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون بہا تھا: کفر کے فتوے' خلق و تقدیر قرآن ایسے مسائل' اس دور کے اشاعرہ کے مسائل' یہ بکھیڑے شروع کیے تھے۔ آپ دیکھیے جسے علم الکلام کہا جاتا ہے یہ ایسے مسائل تھے جن کا زندگی سے واسطہ ہی کچھ نہیں ہے' یہ مسائل چھیڑے تھے۔ یوں سمجھو کہ ان ویلدی پئی سی ولی جٹی ❷ لیکن اس آپس میں ہی قتل و غارت گری سے قوم تباہ ہوگئی' سلاطین کو خود کچھ کرنا ہی نہیں پڑا۔ یہ ہوتا ہے' مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں جو کرایا جاتا ہے۔ فرعون نے یہ تدبیر سوچی تھی۔ اس نے لوگوں کو جمع کیا اور اس کے بعد وہ پہلی بات ان کو بتا رہا ہے کہ میں کون ہوں' تم کس طرح سے میرے محکوم ہو' کیا کچھ میرے ہاتھ میں ہے؟ یہ وہ چیز ہے عزیزانِ من! جو میں نے ابھی عرض کیا تھا' کہ وہاں **اِلٰی رَبِّکَ** کیوں کہا ہے' رب کیوں کہا ہے؟ اس نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا **فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** (79:24) بتاؤ تمہارا ان داتا کون ہے' تمہیں کون روٹی دیتا ہے' کس پر تمہارے رزق کا اختیار ہے؟ انسان کی سب سے دکھتی ہوئی رگ' بھوک ہے' روٹی کا حصول ہے۔ یہاں یہ جو **رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** کہا ہے' اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ ان کا سب سے بڑا معبود تھا۔ وہ اس کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ یہ تو خود سورج دیوتا کی پرستش کرتا تھا' یہاں رب ربوبیت ہے اور دوسرے مقام پر قرآن نے یہ واضح بھی کر دیا ہے۔ احتیاطاً میں Reference (حوالہ) بھی دے دوں۔ یہ حوالہ ہے: (43:51)۔ وہاں اس کی تفصیل ہے کہ **وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ** (43:51) فرعون نے اپنی اس قوم کے اندر اعلان کیا۔ کہا کہ **قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ** (43:51) ❸۔ عزیزانِ من! اس آیت (43:51) میں کہا کہ بتاؤ ملکِ مصر کی یہ زمینیں' یہ آب پاشی کے

---

❶ مذہبی پیشوائیت ان کے پیچھے لگا دی جائے (کیونکہ) جو کام بزورِ طاقت نہیں ہوتا' وہ ان سے ہو جاتا ہے۔

❷ ویلی جٹی اُن ویلے۔ اب تو شاید ایسا نہ ہو۔ کچھ عرصہ پہلے تک دیہات میں ہر گھر میں چھوٹا سا بیلنا ہوتا ہے۔ گھر کی خواتین فرصت کے وقت میں کپاس بیلا کرتی تھیں یعنی کپاس سے بنولے الگ کر کے روئی تیار کرتی تھیں۔ یہ تعمیری کام تھا۔ محاورہ میں کہا گیا ہے کہ اس بیکار عورت کو دیکھیے۔ وہ کپاس نہیں اُون بیل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں وقت بھی صرف ہوگا اور توانائی بھی لیکن نتیجہ کچھ نہیں برآمد ہوگا۔ ہماری قوم صدیوں سے اون بیل رہی ہے۔ یہ اس لیے کہ ملوکیت ساری ''کپاس'' اپنی فیکٹریوں میں بھیج دیتی ہے۔ یہ بیچاری بیکار بیٹھی اُون نہ بیلے تو کیا کرے؟ (حوالہ: لمعات: نظریہ ضرورت' طلوعِ اسلام' فروری 1983' ص۔2)

❸ اس نے کہا کہ اے میری قوم! کیا میں مملکت مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں' جو میرے انتظام کے تحت جاری ہیں' اور جن پر تمہاری معیشت کا دارومدار ہے' میری نہیں ہیں؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ذرائع، یہ نہریں، یہ دریا، کس کی ملکیت ہیں؟ کہو کہ کیا یہ ہماری نہیں ہیں؟ ہم ان کے مالک ہیں۔ ایک دن تمہارے اوپر رزق کے سرچشمے بند کر دیں، تو پھر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ کہو، ہے یہ بات؟

روٹی کی محتاجی

دیکھا آپ نے، اصل چیز ہی یہ ہے۔ عزیزانِ من! انسان مرتا ہی یہاں ہے، Indirectly یا Directly (بالواسطہ یا بلاواسطہ) رزق کے چشموں پر یہ قابض ہو جاتے ہیں، اور پھر اس کے بعد جو سرکس کا رنگ ماسٹر ہوتا ہے وہ شیر سے اپنے اشاروں پہ جو کچھ کراتا ہے وہ آپ کو پتہ ہے۔ شیر اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہوتا ہے، کیوں؟ شیر کو روٹی یا گوشت اس وقت ملتا ہے جب وہ سرکس کا یہ کھیل کر چکتا ہے، اس سے پہلے اس کو کچھ نہیں دیتے۔ صبح سے وہ بھوکا ہوتا ہے اور اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ کرنے کے بعد مجھے روٹی ملنی ہے۔ وہ بھوک کے بعد اس روٹی کے لیے اس ہنٹر کے زور پر، رنگ کے اندر یہ سارا کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ **فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** [1] (79:24)۔ عزیزانِ من! یہاں پھر یہ ربکم الاعلیٰ بھی دیکھیے۔ چھوٹے چھوٹے پیمانے پر تو ہو سکتا ہے کہ یہ ایک وقت کی روٹی دیدیں مگر یہ جو وہاں تک اعلیٰ، بلند ترین اقتدار ہیں، ان کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ہے وہ جس کے ہاتھ میں تمہارا رزق ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ کیا وہ میں ہی نہیں ہوں؟ یہاں **انا** آیا ہے۔ انا بھی دیکھیے۔ یہ جو ایسے وقت میں قرآن کا انداز ہے یہ وہی ہے جیسے انگریزی میں بھی I (میں) کی جگہ We (ہم) لکھ دیتے ہیں۔ یہاں ''انّ'' نہیں ہے۔ یہاں **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** ہے اور اس کے بعد ہے: **فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى** [2] (79:25)۔ قرآن یہ کہہ رہا تھا کہ یہ تم نے دیکھا کہ فرعون جیسا اس قدر جابر جس نے رزق کے سرچشموں کو اپنے قابو رکھا ہوا تھا، اس کو بھی کیا ہوا؟ دو الفاظ ہیں کہ وہ بیڑیاں جو اس نے اس قوم کو پہنا رکھی تھیں، وہ بیڑیاں اس کو پہنا دی گئیں۔ جو اس نے پہلے خرابیاں کی تھیں ان کی بیڑیاں بھی اور جو خرابیاں اس کے بعد اس نے کرنی تھیں وہ بیڑیاں بھی اسے پہنا دی گئیں۔ اس تمام نظام کے نتیجے میں یہ چیز ہوئی۔ کہا کہ یہ **نکال** ہے۔ عزیزانِ من! یہ جو ''نکال'' کا لفظ اس کے اندر ہے اس میں کوئی اذیت یا عقوبت نہیں ہوتی۔ ''نکال'' کسی کو پابند کر دینا ہے، کسی کی حرکت کو روک دینا ہے۔ قرآن یہ لفظ انہی معنوں میں لاتا ہے۔ بات آگے چل کر آئے گی کہ کہانی کیا ہے۔

---

[1] اور ان سے کہا کہ تمہاری پرورش میں کرتا ہوں (کھانے پینے کو دیتا ہوں۔ میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں) اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ (یہ جو موسیٰ کہتا ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا خدا ہے، یہ غلط ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] خدا کے قانونِ مکافات نے اسے اس طرح پکڑا کہ اس کا حال بھی تباہ ہو گیا اور مستقبل بھی برباد...... یہ نتیجہ تھا اس کے ان جرائم کا جو اُس نے موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے کیے تھے، اور جن کا مرتکب وہ اس کی آمد کے بعد بھی ہوتا رہا۔ (ایضاً)

کسی غلط عمل کے نتیجہ کا دوسرا نام سزا ہے

عزیزانِ من! یہاں (79:25) میں بھی یہ کہا ہے کہ یہ نہیں کیا کہ وہ محکوم ہوگیا' مفتوح ہوگیا' اس کی قوت چھن گئی' تو پھر اس کو یہ عذاب دیا گیا اور پھر یہ اذیت دی گئی اور یہ کچھ کیا۔ یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ وہ **عَصٰی** (79:21) تھا' یہ اس کا طغٰی تھا' وہ سرکش تھا' حدود فراموش تھا۔ قرآن اس کے لیے **نکال** کا لفظ لایا کہ اس کو پابند کر دیا گیا' پابندیاں اس کے اوپر عائد کر دی گئیں۔ بس اتنا ہی کیا کہ اس کے جتنے بھی غلط اعمال تھے' اس کے جتنے بھی جرائم تھے' اس کا غلط نظام جو وہ پہلے نافذ کر چکا تھا' جواب کر رہا تھا' اس کے تمام نتائج جو اس کے پیچھے ردیف کی طرح' اس سواری کی طرح اس کے پیچھے لگے بیٹھے ہوئے تھے' چمٹے ہوئے تھے' جہاں جاتا تھا اس کے پیچھے تھے' وہ زنجیریں' بیڑیاں' ہتھکڑیاں بن کر فرعون کو لگ گئیں۔ عزیزانِ من! اسے نکال کہتے ہیں۔ یہی لفظ آیا ہے' جہاں چور کی سزا (5:38) قرآن نے کہی ہے' جو کہتے ہیں ہاتھ ہی کاٹ دینا ہے۔ بہر حال وہاں آؤنگا تو بتاؤں گا کہ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ وہ یہ نہ کر سکے۔ میں تو اس پہ آ چکا ہوں۔ آپ اسے میری تفسیر [1] میں دیکھ لیجیے گا' وہاں ''نکال'' کا لفظ یوں ہے کہ ایسی صورت پیدا کی جائے' ایسی پابندی اس کے اوپر عائد ہو جائے کہ وہ یہ کچھ نہ کر سکے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد کہا کہ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی** [2] (79:26)۔ یہ جو ہم نے فرعون اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ٹکراؤ کی داستان دہرائی ہے اس کے بعد قومِ بنی اسرائیل کو محکومی سے چھڑا کر آزادی دلانے کی جو بات ہم نے بیان کی ہے یہ کوئی تاریخی واقعہ ہی نہیں جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ یہ جو ہم نے بیان کیا ہے' یہ تاریخ کی کتاب نہیں۔ عبرت کا لفظ تو آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں کس معنی میں عام استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی بڑے عجیب ہیں۔ یہ جو ''عبرۃ'' ہوتا ہے یہ پل ہوتا ہے۔ اِدھر آپ کھڑے ہیں' یہ آپ کے لیے منزلِ مقصود نہیں ہے جہاں آپ کھڑے ہیں۔ مقصود وہ ہے' جو وہاں ان کے باہر راستہ ہے۔ آپ نے اس سے آگے چلنا ہے' وہاں تک پہنچانے کا جو ذریعہ ہوتا ہے' وہ ہوتا ہے جسے پل کہا جاتا ہے۔ اُسے ''عبرۃ'' کہا جاتا ہے۔ کسی واقعہ' کسی کہانی' کسی استعارہ' کسی تشبیہ کو' بیان کرنے کے بعد کہنا کہ یہ مقصود بالذات نہیں' یہ ایک پل ہے جس سے گزر کر تم اصلِ حقیقت تک پہنچ سکو گے۔ قرآن کے ایک ایک لفظ کو' کسی کو تاریخی واقعہ کے طور پر' کہانی سمجھ کے' داستان سمجھ کے' لذت لینے نہ بیٹھ جانا کہ بڑی اچھی کہانی بیان کی ہے' نہیں' نہیں یہ تو ایک پل ہے' اس سے تم نے حقائق تک پہنچنا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **لِمَنْ یَّخْشٰی** (79:26)

---

[1] پرویزؒ: مطالب الفرقان فی دروس القرآن (جلد چہارم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1981' ص ص۔ 511-503۔

[2] موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کے اس تاریخی نوشتے میں ہر اس شخص اور قوم کے لیے سامانِ عبرت ہے جو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے ڈرے۔
(مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیکن وہی پہنچ سکے گا جس کو خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کا کچھ ڈر ہو۔ وہ ان قوانین کے آگے جھکے گا۔ یہ **خشی** ہے کہ وہ خدا کے قوانین کے سامنے جھک جائے کیونکہ اس کی سرکشی کا نتیجہ وہی ہوگا جو فرعون کا ہوا تھا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ النازعات کی آیت 26 تک آ گئے۔ یہ بات یہیں تک ہی ہے۔ آگے دوسری بات آ گئی ہے۔ وہ آ گئی ہے ان شہادتوں کی جو خارجی کائنات کی ہیں۔ یہاں تک ہم آئے باقی آئندہ سہی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

❶ اس سورۃ کے بعد سورۃ الناس تک کے دروس محترم پرویزؒ کے فوت ہو جانے کے باعث بعد محصوف کے پہلے دور کے دیے گئے دروسوں سے لیے گئے ہیں۔

چھٹا باب: سورة النازعات (آیات 27 تا 30)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1984ء کی 22 تاریخ ہے اور درس قرآن حکیم کا آغاز سورۃ النازعات کی آیت 27 سے ہو رہا ہے: (79:27)۔

سابقہ درس کا خلاصہ

قرآنِ حکیم اپنے بتائے ہوئے قانون کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے ہمیشہ دو چیزیں پیش کرتا ہے، جس میں ایک تو تاریخی شواہد اور دوسرا خارجی کائنات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بہرحال، پچھلے درس میں تاریخی شواہد کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہمارے سامنے آ گیا اور اب اس کے بعد خارجی کائنات کا ذکر آ رہا ہے۔ اس میں خصوصیت سے فرعون کے اس دعویٰ کا ذکر ہے کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** (79:24) میں تمہارا ''ان داتا'' ہوں، تمہاری روٹی میرے ہاتھ میں ہے اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ کہا تھا کہ مصر کی یعنی اس ملک کی، یہ زمینیں، اس میں یہ جو نہریں بہتی ہیں، بتاؤ کہ یہ کس کی ملکیت ہیں؟ اور پھر خود ہی کہا تھا کہ ہماری ہیں، اور جب یہ ذرائع رزق ہماری ملکیت میں ہیں تو تمہارا جو رزق ہے وہ ہماری ملکیت ہے، ہم تمہارے رزق کے دینے والے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ دعویٰ تھا ربوبیتِ اعلیٰ کا۔

اب اگلی آیات میں بات اگرچہ خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی کی ہے لیکن اسی ربوبیت کے سلسلے میں ذکر آ رہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ یہ زمینیں، یہ نہریں، جو بھی زبردستی، ڈنڈے کے زور سے، ان پہ قابض ہو جائے، وہ کہتا ہے کہ یہ میری ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کس طرح سے تمہاری ہیں؟ زمین کس طرح سے تمہاری ہو سکتی ہے، یہ تو تمہارے باپ دادا کے پیدا ہونے سے بھی بہت پہلے یہاں موجود تھی۔ ان کو کس نے پیدا کیا؟ تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ نہریں تمہاری ہیں، بتاؤ کہ ان نہروں کے اندر جو پانی ہے کیا وہ تمہارا بنایا ہوا پانی ہے؟ بتاؤ کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے یہ پانی پیدا کیا ہے؟ سنو! جس نے زمین پیدا کی، جس نے پانی پیدا کیا، جس نے یہ پہاڑ پیدا کیے، یہ سلسلہ آب رسانی پیدا کیا، یہ اس کی ملکیت ہو سکتا ہے۔ یاد رکھیے! جو کسی چیز کی تخلیق کرتا ہے، وہ اس کا مالک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تم یہ دعویٰ

کیسے کر سکتے ہو؟ یہاں یہ دونوں باتیں ضمناً آ گئیں: قانون کی کارفرمائی بھی اور اس کے اس دعوے کی تردید بھی کہ زمینوں کا اور نہروں کا اور پانیوں کا مالک میں ہوں اس لیے میں تمہارا ان داتا ہوں۔ کہا: ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ط بَنٰـهَا o رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا o وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ❶ (79:27-29)۔ کہا کہ تخلیق میں سوچو یہ زمین حتیٰ کہ تم جو بسنے والے بھی ہو‘ اس پہ سوچو اور اس کے مقابل میں یہ فضائی کرّے جسے سماء کہا جاتا ہے‘ ان پہ سوچو۔ یہ خارجی کائنات ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ اس پہ غور کرو اور بتاؤ کہ کیا ان کی تخلیق مشکل تھی یا تمہاری تخلیق مشکل تھی۔ سماء اور جس اعتبار سے اس کو بنایا گیا ہے‘ استوار کیا گیا ہے‘ وہ اپنے اپنے مقام میں نہایت استحکام کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے اور پھر اسی فضا میں رات کو تاریک بنایا اور دن کے وقت اس کی روشنی کو نمودار کیا۔

کائنات کے کرّوں کی کیفیت

عزیزانِ من! ذرا غور تو کیجیے کہ فضا کے اندر کس قدر عظیم الجثہ کُرّے ہیں اور ان میں ہمارا یہ کرّہ ارض کچھ کم چھوٹا نہیں ہے‘ بلکہ یہ جو ہمارا سورج کا ایک نظام ہے جس میں چھ کرّے اور ہیں‘ کائنات میں اور کرّے بھی ہیں ان میں سب سے چھوٹا نظام یہ ہے‘ اور کائنات میں یہ جو کرّوں کے نظام ہیں ان کی تعداد بھی گنتی شمار میں نہیں آ سکتی۔ وہ تو عظیم الجثہ واقع ہوئے ہیں۔ اس آیت میں کہا کہ سوچو تو سہی کہ کیا یہ تمام تمہارے پیدا کردہ ہیں؟ یہ کرّے ہیں‘ ان کو اس فضا کی پہنائیوں میں اس طرح سے معلق کیا ہے اور فَسَوّٰهَا (79:28) پھر ان میں اعتدال اور توازن رکھ دیا کہ وہ اپنے اپنے مقام میں نہایت استحکام کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔

عزیزانِ من! آپ زمین کو ہی دیکھیے کہ گول ہونے کے باوجود رہائش کے لیے ایسی ہے کہ ہمیں کبھی احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گول ہے‘ یعنی یہ عجیب چیز ہے‘ اس گول چیز کے اوپر چلتے چلتے کہیں تو کوئی ایسی جگہ آئے گی‘ جہاں اس کی گولائی شروع ہو جائے گی‘ تو آپ دھڑام سے نیچے گر جائیں گے مگر اس کی گولائی کہیں شروع ہی نہیں ہوتی۔ گول ہے اور گولائی کا پتہ ہی نہیں کہ کہاں سے شروع ہوئی‘ اسی لیے آج تک ذہن میں یہی تھا کہ یہ چپٹی ہے‘ جب تک سائنس کی رو سے‘ مشاہدات کی رو سے‘ نہیں دیکھا گیا کہ اس قسم کا کُرّہ گول ہے‘ سمجھا یہ جاتا تھا کہ یہ چپٹی ہے اور اگر ہمیں سائنس کا یہ انکشاف معلوم نہ ہو تو ہم بھی اسے چپٹی ہی سمجھیں گے‘ حتیٰ کہ گلوب کے مطابق سارے کرّہ ارض کی سیاحت کرنے والے ایک مقام سے چلتے ہیں‘ پھر گھوم کے وہیں آ جاتے ہیں‘ انہیں بھی اس ساری سیاحت میں‘ کہیں

---

❶ (اے رسولؐ! تم اپنی قوم کے سامنے یہ تاریخی شہادتیں پیش کرنے کے بعد‘ ایک دفعہ ان سے پھر کہو کہ تم اس سلسلہ کائنات اور خود اپنی پیدائش پر غور کرو اور بتاؤ کہ) پیدائش کے اعتبار سے تم زیادہ سخت اور مستحکم ہو یا یہ فضائی کرّے جنہیں ہم نے بنایا ہے۔ خدا نے ان عظیم کرّوں کو فضا کی بلندیوں میں پیدا کیا۔ اور پھر ان میں ایسا اعتدال اور توازن رکھ دیا کہ وہ اپنے اپنے مقام میں نہایت استحکام کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ پھر اسی فضا میں رات کو تاریک بنایا اور دن کے وقت اُس کی روشنی کو نمودار کیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

زمین کی گولائی نظر ہی نہیں آتی۔ چلتے جارہے ہیں انہیں یہی لگتا ہے کہ یہ چپٹی ہے' یعنی عجیب طرح کی یہ چیز ہے' اور عجیب طرح کی یہ خلقت ہے۔ کرّے کے اعتبار سے تو اس کا گول ہونا ضروری ہے' رہنے کے اعتبار سے اس کا چپٹا ہونا' ہموار ہونا' نہایت ضروری تھا۔ اسی لیے کہا کہ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ❶ (79:28)۔

عزیزانِ من! سوّٰھا کے معنی ہیں کہ ان کا بیلنس (توازن ۔Balance) پورا رکھا' ان کو ہموار کیا' ان کا توازن برقرار رکھا اور ہموار کرنے کے معنوں کے اندر یہ آتا ہے کہ جس سے اس کے اندر یہ آبادی ہو سکتی ہے' پھر اس کی گردش کی یہ کیفیت ہے کہ اس کے اندر ایک تنوع اور ایک اختلاف ہے کہ رات کی تاریکی آتی ہے' جس کے بارے میں قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے تاکہ اس میں تم دن بھر کی کدوکاوش سے' کام کاج کرنے سے تمہاری جو توانائیاں صرف ہو جاتی ہیں' رات کی نیند میں وہ دوبارہ لوٹ آتی ہیں' صبح اٹھتے ہو تو پھر وہ توانائیاں تمہارے اندر ہوتی ہیں' تم ریفریش ہوتے ہو' تروتازہ ہوتے ہو' دوسرے دن کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہو۔ اسی گردشِ لیل ونہار سے ہی یہ سب کچھ ہے۔ نہ وہ تاریکی باہر سے آتی ہے' نہ اس کے بعد وہ صبح کی روشنی کہیں باہر سے آتی ہے۔ یہ سب چیزیں اسی نظام کے اندر موجود ہیں۔ یہ زمین گول ہے اور پھر چپٹی ہے کہ تم اس کے اوپر رہ سکتے ہو۔ ہموار ہے اس میں توازن ہے' باقی کرّوں کے ساتھ معلق ہونے کے باوجود کہیں لڑھک نہیں جاتی اور اس کے بعد اسی میں سے تاریکی پیدا ہوتی ہے' اسی میں سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک تو قرآن کی یہ چیزیں آئیں جو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کی ایک آیت (79:30) میں ایک لفظ دَحٰهَا آیا ہے جو بڑا ہی غور طلب ہے۔ یہ لفظ قرآن اور سائنس کے باہمی تعلق کی نوعیت پہ روشنی ڈالتا ہے۔

قرآن اور سائنس کے باہمی رشتے کی نوعیت

عزیزانِ من! یوں تو قرآنِ کریم کا ہر گوشہ' ہر ذرہ' اعجاز ہے' معجزہ ہے' وحی ہے' خدا کی تخلیق ہے۔ شہد کا ہر قطرہ شہد ہوتا ہے' اس میں تو کوئی فرق ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن قرآن میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ وہاں قرآن نے جو حقیقت بیان کی ہے وہ ابھر کر کہہ دیتی ہے کہ یہ ہے اعجاز۔ قرآن کا وہ اعجاز ہم لوگ کیسے جانیں' وہ تو یورپ کے Scientists (سائنسدان) جب اس مقام پہ پہنچتے ہیں تو بلا تامل پکار اٹھتے ہیں کہ ہم نے جب حقیقت پہ غور کیا تو ہم اس نتیجہ پہ پہنچے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کے برعکس ہم اور آپ ہیں کہ جو سائنس کی دنیا میں جاتے ہی نہیں' پھر قرآن کے سمجھنے کا جو طریق ہے' اس کی رو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہمیں اس میں کوئی اعجاز نظر آئے' ہمیں تو اس میں الجھنیں نظر آتی ہیں' وہ لوگ ہیں جو مسلمان نہیں ہیں جنہیں قرآن کے ساتھ وہ عقیدت نہیں' دلبستگی نہیں جو ہونی

---

❶ خدا نے ان عظیم کرّوں کو فضا کی بلندیوں میں پیدا کیا۔ اور پھر ان میں ایسا اعتدال اور توازن رکھ دیا کہ وہ اپنے اپنے مقام میں نہایت استحکام کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چاہیے یا ہے' وہ خارجی طور پہ آزادانہ طور پہ (Independantly) کچھ تحقیق کرتے ہیں' تحقیق کرنے کے بعد نتیجہ پہ پہنچتے ہیں' اعتراف کرتے ہیں' اس بات کا اعلان کرتے ہیں' اپنے ہاں کے جو دوسرے Scientists (سائنسدان) ہیں' ان کو پکارتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: او بابا! خدا کے لیے اس پہ غور کرو' چودہ سو سال پیشتر کسی انسان کا ذہن یہ کہہ سکتا تھا؟ تو اگر کسی انسان کا ذہن یہ نہیں کہتا تھا' تو پھر آگے بات یہی ہے کہ اس علم کا سرچشمہ کوئی ماورائے انسانیت ہی ہے اور یہ انسان کی تخلیق نہیں ہوسکتا۔ میرے سامنے وہ نکتہ آ گیا ہے۔ میں اس کے بعد یہ عرض کرونگا کہ وہ کیسے کہتے ہیں۔ وہ آیت ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا [1] (79:30)۔

یہ ارض' یہ کرے کس طرح وجود میں آئے؟ کیسے بنے؟ کس طرح یہ اتنی تیزی سے گردش کر رہے ہیں؟ یہ ہمارے تو ذہن میں بھی نہیں آتا۔ میں یہ بات محاورے کے طور پہ عرض کر رہا ہوں۔ یہاں سے لے کر چودہ سو سال تک آپ کے ہاں جتنے مفسر ہیں وہ اس کو کیا سمجھتے تھے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ قرآن کا ایک لفظ " دَحٰهَا " ہے جس سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ پہلے تو یہ چیز ہے کہ یہ جو ارض وسما کی تخلیق یا یہ کرّے ہیں' وہ کس طرح وجود میں آ گئے۔ انہیں سمجھنے کے لیے دو مقام ہیں' نہیں' بلکہ تین ہیں' ان میں ایک تو سورۃ دخان میں ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا' عزیزانِ من! یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے اور سائنس کی دنیا سے متعلق ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کا اعجاز میں ابھی آپ کے سامنے پیش کرونگا۔ بات یہ ہے کہ مغرب کا' یورپ کا' ایک سائنسدان [2] جو مسلمان نہیں' وہ ان دو آیات پر غور کرنے کے بعد کس نتیجہ پہ پہنچا ہے؟

یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟

عزیزانِ من! یہ ذہن میں رکھیے کہ جن آیات میں ہمیں' ہمارے مفسرین کو' ہمارے مترجمین کو' کوئی بات نظر ہی نہیں آتی' اس لیے نہ اس کا ترجمہ صحیح ہوا' نہ اس کی تفسیر۔ یہ تخلیق ارض وسما کیسے ہوا؟ قرآن کے اندر یہ ہے کہ یہ سارا کچھ' جتنا بھی ہے' یہ کائنات کے افلاک ہیں' یہ سماء ہیں' یہ کرّے ہیں۔ یہ سارے کسی وقت گیسز (Gaseous) حالت میں تھا۔ اسے آپ دخان کہتے ہیں۔ قرآن اسے دخان کہتا

---

[1] پھر اس زمین کو دیکھو۔ یہ اور دیگر اجرام' پہلے ایک ہی ہیولیٰ (Nebula) تھے۔ اس نے اس ہیولیٰ سے ارض (زمین) کو الگ کر کے یوں دور پھینک دیا جس طرح گوپیئے سے پتھر پھینکا جاتا ہے (21:31)۔ یہ یاد رہے کہ آیت (2:29) میں ثم ترتیب کے لیے نہیں ہے۔ اجرام فلکی کی تخلیقی ترتیب یہی ہے جو آیت (79:30) میں بیان ہوئی ہے۔ عصر حاضر کا علمی انکشاف یہ ہے کہ اولین ہیولیٰ (Nebula) کی تیز گردش سے جو چھینٹے اڑے وہ ان کروں کی شکل میں گردش کر رہے ہیں۔ اس قرآنی مثال کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یعنی اس ہیولیٰ سے کرہ ارض یوں اڑ کر الگ ہوا جس طرح تیزی سے گھومنے والے گوپیئے سے نکل کر پتھر دور چلا جاتا اور گھومتا رہتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' ص۔ 411' فٹ نوٹ نمبر 1۔) (مفہوم)

[2] یہ فرانس کا سائنسدان ہے۔ اس کا نام مورس بکائے (Maurice Bucaille) ہے۔

ہے۔ یہ سارا گیسز (Gaseous) مجموعہ تھا۔ بہرحال' میں ان الفاظ سے ہی آگے گزر جاؤں گا۔ پھر اس کے بعد قرآن یہ کہتا ہے کہ **اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰـھُمَا** ❶ (21:30)۔

عزیزانِ من! یہ ہیں قرآن کے دو الفاظ: **کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰـھُمَا** (21:30) اور اسی کے ساتھ تیسرا لفظ **دَحٰھَا** (79:30) ہے۔ آپ نے کبھی گوپیا ❷ دیکھا ہے۔ یہ وہی ہے جس سے بچے کھیل کھیلتے ہیں۔ یہ باغبان کے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں گوپیا لڑائی کا بہت بڑا اسلحہ بھی ہوتا تھا۔ وہ اسے چلاتے ہیں۔ اس کے اندر پتھر رکھا ہوا ہوتا ہے اور اس کو گھماتے ہیں' تیزی سے گھمانے کے بعد اسے ایک طرف سے ایک لخت چھوڑتے ہیں تو اس میں سے پتھر تیزی سے نکل کر جاتا ہے۔ وہ تیز سیدھا بھی جا رہا ہوتا ہے اور گردش بھی کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن نے پہلے یہاں سے یہ بات کی کہ تیزی سے گوپیئے کے اندر سے یہ نکلا' یوں بھی گردش کی' اور سیدھا بھی گیا۔ یہ ایک بات ہے' اور پھر **رَتْقًا فَفَتَقْنٰـھُمَا** (21:30) میں ''رتق'' اور ''فتق'' دو الفاظ آئے ہیں۔ ''رتق'' کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کا اکٹھا ہونا'' اور ''فتق'' ہوتا ہے ''جس طرح کوئی چیز گھمائی یا یہ کہ کوئی Liquid (مائع) ہو' اس میں سے جو چھینٹے اِدھر اُدھر اڑتے ہیں' ان چھینٹے اڑنے کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔'' کہا کہ یہ ہیولیٰ (Nebula) ارض وسما Gases (گیسوں) کا مجموعہ تھا۔

معاف رکھیے گا' یہ کچھ خشک سا موضوع ہے لیکن عجیب چیز ہے جو میں پیش کر رہا ہوں کہ Scientists (سائنسدان) کس نتیجہ پہ پہنچے۔ ان دو آیات سے یہ سمجھ میں آیا کہ یہ Gases (گیسوں) سے' اکٹھا سا' سارا ایک ہیولیٰ سا تھا' وہ تیزی سے گھوم رہا تھا کہ اس میں سے چھینٹے اڑے۔ یہ جو اس خلا کے اندر مختلف کرّے آتے ہیں' یا نظر نہیں آتے مگر علم میں ہیں' یہ سارے چھینٹے اڑے۔ ان میں سے ایک چھینٹا وہ ہے جسے یہ زمین کہا جاتا ہے' ایک چھینٹا وہ ہے جسے سورج کہا جاتا ہے۔ یہ چھینٹے اڑے تھے اور اڑے تھے ایسے جیسے گوپیئے سے پتھر نکلتا ہے۔ اس کے اندر دونوں ❸ گردشیں ہوتی ہیں۔ الفاظ عربی زبان کے ہیں اور ان کا انتخاب قرآنِ کریم کا ہے۔ اور آگے میں عرض کروں گا کہ سائنس کی تحقیق نے کس حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا۔ اس حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹنے کی ایک مثال ''رتق'' اور ''فتق'' سے یہ بتایا کہ پہلے یہ سارا ہیولیٰ (Nebula) اکٹھا تھا' تیزی سے' گردش کی وجہ سے' چھینٹے اڑے۔ یہ چھینٹے ہیں جو مختلف کرّے ہیں۔ جیسے گوپیئے میں سے پتھر نکلتا ہے کہ وہ اپنے محور کے گرد بھی گردش کر رہا ہوتا ہے اور تیزی سے کہیں جا بھی رہا ہوتا ہے۔ **وَالشَّمْسُ**

---

❶ حقائق کا انکار کرنے والوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ تخلیق کے ابتدائی ادوار میں' یہ سب ایک ہی ہیولیٰ (Nebula) تھے۔ پھر ہم نے انہیں الگ الگ کر دیا۔ (مثلاً کُرّہ ارض' اُس اولیں ہیولیٰ (Nebula) سے یوں الگ ہوا جس طرح گوپیئے سے پتھر پھینکا جاتا ہے (79:30) اور اس طرح تمام کرّے اپنے اپنے مدار میں تیرنے لگ گئے (36:40; 21:33)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ گوپیا' گوپن' گوپھن' فلاخن: رسی کا بنا ہوا آلہ' جس میں پتھر یا مٹی کی گولی رکھ کر مارتے ہیں۔

❸ Axial (محوری) اور Orbital (مداری) گردشیں۔

تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا (36:38) سورج اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! ایک طرف تو یہ ہے اور دوسری طرف یہ کہ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (21:33;36:40) یہ سب اپنے اپنے مدار کے اندر تیرتے چلے جا رہے ہیں یہ اسے فلکی گردش کہتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا (36:38) اِن کا ایک اور مستقر ہے جس کی طرف انہوں نے جانا ہے۔ اب یہ سارے کے سارے اس طرف بھی چلے جاتے ہیں۔ نظامِ شمسی کے علاوہ سارے کرے اپنے نظام کو لیے ہوئے' اپنے محور کے گرد بھی گردش کر رہے ہیں' اور کسی منزل کی طرف بھی جا رہے ہیں۔ قرآن نے ایک لفظ گو پیئے کی تشبیہ سے کیا چیز کہہ دی ہے کہ یہ اپنے محور (Axis) کے گرد بھی گردش کر رہے ہیں اور تیزی سے سیدھے اپنے اپنے مدار میں بھی جا رہے ہیں۔ یہ ہے کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ❶ (36:40)۔ اور یہ بھی کہ وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ❷ (36:38)۔

یہاں (36:38) میں تقدیر کا لفظ آیا ہے۔ کیا لفظ ہے تقدیر! یہ اس کا مقرر کیا ہوا پیمانہ ہے' ایک قانون ہے جو اسے تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا اس کے مستقر کی طرف لیے چلا جا رہا ہے۔ پھر آگے چاند کے متعلق یہ ہے کہ وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ (36:39) اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یعنی سورج کی طرح سے قمر کا حساب ہے اور آگے ہے کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (36:40) ہر کرّہ اپنے اپنے محور میں گردش کر رہا ہے اور تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا سارا نظام جتنا بھی ہے اپنے کسی مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اب ارض کے متعلق جب یہی بات آئی کہ پہلے یہ ایک Nebula تھا' ہیولیٰ تھا گیسز کی طرح' پھر وہ تھوڑا سا Liquid (مائع) ہوا' ٹھنڈا ہوا' اس میں سے چھینٹے اڑے اور یہ جو بڑے بڑے کرّے ہیں' یہ اس کے چھینٹے ہیں۔ گو پیئے میں سے نکلے ہوئے پتھر کی طرح' اپنے محور کے گرد بھی چکر لگا رہے ہیں اور کسی مستقر کی طرف بھی چلے جا رہے ہیں۔ یہ تھیں قرآن کی یہ آیات۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں تو بہر حال ان کا یہ تصور (Concept) بھی نہیں تھا کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کائنات کے حقائق اور قوانین کے اوپر جو پردے پڑے ہوئے ہیں' جوں جوں یہ پردے اٹھتے چلے جائیں گے' ہر حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آتی جائے گی تو علمِ انسانی جوں جوں اوپر اٹھتا چلا جائے گا' وہ ان پردوں میں سے کسی پردے کو اٹھائے گا اور پردہ اٹھے گا تو اس کے پیچھے سے قرآن کے دعوے کے ثبوت میں ایک اور تائید مل جائے گی۔

ہماری ناکامی کی وجہ

عزیزانِ من! یہ ذہن میں رکھیے کہ ہمارے ہاں کے اسلاف گزرے ہیں ان کے دَور میں ابھی یہ پردے اٹھے نہیں تھے' انسانی علم

---

❶ ہر کرّہ' اپنے اپنے دائرے میں' اپنی اپنی رفتار سے' ٹھیک' اپنے اپنے راستے پر' تیرتا چلا جاتا ہے۔ (21:23) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اور اس پر بھی غور کرو کہ سورج' کس طرح اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے ٹھہرائے ہوئے اندازوں (Measures) کے مطابق ہو رہا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور جس کا ہر قانون علم پر مبنی ہے۔ (ایضاً)

کی سطح ابھی بڑی پست تھی، بلند نہیں ہوئی تھی۔ تو ٹھیک ہے اپنے دَور سے متاثر ہو کر یا جہاں تک علمِ انسانی اس زمانے میں تھا، انہوں نے اتنی سی بات ہی سمجھی اور وہ انہوں نے لکھ دی۔ تو یہ ایسی بات نہیں جس پہ ہم یہ کہیں کہ صاحب! وہ تو بالکل ہی بے وقوف تھے (معاذ اللہ) جاہل تھے، ان کو پتہ ہی نہیں تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ آج ہماری کیا کاریگری ہے کہ ہمارے دَور میں علمِ انسانی اتنا اونچا ہو گیا ہے اور ہمارے بعد آنے والے ہمیں وہی کچھ سمجھیں گے جو آج ہم اپنے اسلاف کو سمجھ رہے ہیں۔ پتہ نہیں علمِ انسانی نے اور کیا کیا چیزیں بے نقاب کرنی ہیں۔ یہاں آ کر ہم مار کھا گئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اگر یہ حضرات یہ کہتے کہ ہم ایسا سمجھے ہیں تو بعد میں آنے والے کے سامنے جب کوئی نئی حقیقت آتی تو وہ یہ کہتا کہ نہیں، صاحب! آپ نے صحیح نہیں سمجھا، بات یہ تھی جواب ظاہر ہوئی ہے، تو وہاں کچھ مشکل نہیں تھی۔

ہمارے ساتھ یہ سازش ہوئی ہے کہ ہر ایسی بات جو خود لکھی، اس کے بارے میں یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے، روایت میں یہ ہے، حدیث میں یہ ہے، حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ اب جب یہ کہا جائے کہ حضور ﷺ نے یہ فرما دیا تو قیامت تک یہ کہنے کی کون جرأت کرے گا کہ نہیں صاحب! یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ اب اس میں ایک ہی چیز ہے کہ جب کوئی حقیقت بے نقاب ہو تو وہاں یہ جرأت سے کہا جائے کہ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کا فرمودہ نہیں ہے، یہ وضعی حدیث ہے، یہ بنائی ہوئی چیز ہے۔ پھر تو مزید تدبر کی، تفکر کی، غور و فکر کی، ان سے اختلاف کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہ تو ہے ہی رسول اللہ ﷺ کا فرمودہ۔ اب اگر یہ کہتے ہو کہ یہ نہیں ہے، تو منکرِ حدیث ٹھہرے، خارج از اسلام ہوئے، کفر کے فتوے لگے، مرتد ہوئے۔ یعنی آپ نے صرف یہ کہا کہ وہ چیز حقیقت کے خلاف ہے، واقعہ کے خلاف ہے، مشاہدہ کے خلاف ہے تو خارج از اسلام ہوئے۔

اب یہ چیز کہ ''زمین ساکن ہے''، علم، حقیقت، مشاہدہ، تجربہ، الغرض ہر چیز کے خلاف ہے لیکن نہیں صاحب! یہاں فرمان یہ ہے کہ یہ رسول اللہؐ نے فرما دیا ہے۔ اب (معاذ اللہ) آپ سوچیے کہ دنیا کے سامنے ہم کس قسم کا رسول پیش کر رہے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ آج بھی مدینہ یونیورسٹی کا چانسلر یہ بات کہہ رہا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے، وہ خارج از اسلام ہے، اس پر ارتداد کا فتویٰ لگے گا، وہ شخص ایسا کہنے والے کو مرتد قرار دے رہا ہے۔ کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے اور یہ شخص اسے جھٹلا رہا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس طرح غور و فکر کے راستے بند ہوئے، تحقیقات کی کوئی گنجائش نہ رہی، علمِ انسانی منجمد ہو کر رہ گیا، لیکن میں نے عرض کیا کہ ہم تو بہر حال کسی عقیدے کی بنا پہ چلیے یہ مانتے بھی ہیں کہ یہ حضور ﷺ نے فرمایا، ہم دنیا کو کیا کہیں گے، اور پھر جو کچھ، ان کے نزدیک، رسول اللہؐ نے فرمایا، ان کی رو سے، ان قرآنی آیات کی، تفسیر کی گئی۔ یہ جو تفاسیر ہیں، یہ اسی دَور کا جو علمِ انسانی تھا، وہاں تک مقید ہیں یا جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث پیش کر دیں، یہ تفاسیر ان سے محدود ہو کر رہ گئیں۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر مورس بکائے کی قرآنِ حکیم پر سائنٹیفک تحقیق

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ میں یورپ کے سائنسدان کی ایک چیز پیش کرونگا۔ آپ کو یاد ہوگا' میں نے کئی ایک درسوں میں بھی فرانس کے ایک Scientist (سائنسدان) کا نام لیا تھا۔ اس کی کتاب' ایک ڈاکٹر سائنسٹ کی' ایک تحقیق ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایک سے زیادہ بار اس کا ذکر کیا ہے' اور میرا ایک خطاب جو طلوعِ اسلام میں شائع ہوا ہے' اس میں خاصی مفصل تنقید بھی آئی ہے۔ اس کی کتاب کا نام ہے: The Bible, The Quran and Science۔ یہ ڈاکٹر ہے۔ یہ مورس بکائے French Name (فرانسیسی نام) ہے۔ شاید اس کا تلفظ ایسا صحیح نہ ہو۔ اس کو مورس بکائے کہتے ہیں اسے یوں پڑھنا چاہیئے' اگرچہ وہ لفظ Maurice ہے اور وہ اگلا ہے Bucaille۔ اس کا تذکرہ پہلے بھی آ چکا ہے لیکن اب چونکہ ان آیات کے حوالے سے یہ بات آئے گی تو میں پھر یہ عرض کردوں۔ یہ عیسائی ہے۔

اس شخص نے بائبل کا مطالعہ کیا۔ کائنات کے متعلق بائبل میں جو کچھ آیا ہے اس نے صرف اس حصہ کا مطالعہ کیا اور بائبل سے منحرف ہوگیا کہ صاحب! یہ تو بچوں کی بنائی ہوئی باتیں نظر آ رہی ہیں' ان میں تو کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ دیکھنے کے بعد میں مذہب کی طرف سے ہی متنفر ہو رہا تھا' عجیب اتفاق کہہ لیجیے یا بہرحال ان لوگوں کا تحقیقاتی ذہن ہے' اس نے کہا کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ عیسائیت یا یہودیت میں بائبل تو ان دونوں مذاہب کی کتاب ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کا بھی ایک مذہب ہے اور ان کے بعد سب سے بڑا مذہب ہے' مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت ہے' ذرا دیکھیں اس میں کیا لکھا ہے۔ اس بنا پہ وہ قرآن کی طرف آ گیا۔ اس کی بھی خوش بختی' ہماری خوش قسمتی تھی' کہ وہ بعد میں روایات پہ آیا۔ پہلے قرآن پہ آ گیا۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ جو محقق ہے اس کی تحقیق کا انداز کیا ہے۔ بات صاف تھی۔ قرآن پہ آ گیا' ترجمے موجود تھے' وہ تو اس زمانے میں ابھی عربی جانتا نہیں تھا' کوئی ترجمہ لیتا اس میں ان آیات کے ترجمے دیکھ کر کہہ دیتا کہ صاحب! جو کچھ بائبل کہہ رہی ہے' وہی کچھ قرآن کہہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر کے اندر بڑا حصہ تو خود وہی اسرائیلیات سے ہے' وہیں سے لی ہوئی باتیں ہیں' اور ان کے ترجمے ان کی تفسیریں دیکھیں تو وہی ہیں۔ لیکن ایک ریسرچ اسکالر کا اندازہ لگائیے۔ وہ اس انداز سے کہیں مختلف ہے۔

آپ کو یاد ہے میں بار بار جو کہا کرتا ہوں کہ میں نے قرآن کو کیسے سمجھا ہے اور وہ قرآن ہی نے بات سمجھائی کہ ایک تو یہ کہ زمانہ نزول قرآن میں ان الفاظِ قرآنی کا جو مفہوم عرب سمجھتے تھے پہلے تو وہ مفہوم متعین کرو۔ اس چودہ سو سال میں عربی زبان میں بڑا فرق آ گیا ہے اور یہ Modern Arabic (جدید عربی) جو ہے وہ تو بولتے ہیں' سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن بہرحال زبان میں اتنا زیادہ فرق آ جاتا ہے' وہ جو قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ اُس زبان میں ہے جو اُس زمانے کا عرب بولتا تھا تو یہ تو معلوم کرنا ضروری ہوگیا کہ

ان مفرداتِ قرآنی کے معنی اس زمانے کے عرب کیا لیتے تھے۔ میں نے قرآن فہمی کی ابتدا پھر یہاں سے کی ہے کہ یہ Departure (انحلا) ہے اس طریقے سے' جو چلا آ رہا ہے' یہ اس سے ایک الگ راستہ تھا' جس کی وجہ سے کفر کے فتوے لگے' ارتداد بھی ہو گیا اور پتہ نہیں کیا کیا چیزیں ہوئیں۔ دیکھنے والی پہلی چیز یہ ہے کہ اس زمانے میں عرب قرآن کی اس زبان کا کیا مفہوم لیتے تھے' کیونکہ انہوں نے وہاں کسی لفظ کے متعلق بھی نہیں پوچھا تھا کہ صاحب! اس کے کیا معنی ہیں' اس کی سند لائیے۔ یہ ان کی زبان تھی' وہ سمجھتے تھے۔ پہلی چیز یہ تھی۔ اس کے لیے میں نے عرض کیا تھا کہ میں نے' پتہ نہیں' سالہا سال' بلکہ یوں کہیے کہ میری تو ساری عمر' عزیزانِ من! اسی کے اندر گزری۔ میں نے لغات القرآن مرتب کیا جس میں قرآن کے الفاظ کے وہ معنی دیئے جو اس زمانے میں عرب سمجھتا تھا اور دوسری چیز قرآن نے خود دی کہ قرآن کا کوئی ایک موضوع کسی ایک مقام پہ نہیں بیان کیا گیا' مختلف مقامات میں وہ بیان کیے گئے ہیں' ان تمام مقامات کو اکٹھا کرو گے تو پھر بات بالکل صاف ہو جائے گی اور پھر تمہیں کسی خارجی روشنی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی یعنی یہ قرآن کا اعجاز ہے۔ یہ دو چیزیں تھیں۔ تو پھر میں نے اس کے لیے' جسے Classification کہتے ہیں' جسے تبویب کہتے ہیں' اس انداز سے یہ کچھ کیا' بہر حال گزشتہ پچاس سال سے میں قرآن کا مفہوم پیش کر رہا ہوں۔ میرا تو یہ فریضہ تھا' ایمان تھا' ذمہ داری تھی۔ اس شخص یعنی موریس بکائے کی تو کوئی چیز نہیں تھی۔ موریس بکائے نے کہا کہ یہ جو تراجم ہیں ان سے یہ کہنا کہ میں یہ قرآن سمجھ رہا ہوں' غلط ہے۔ یہ تو میں وہ کچھ سمجھ رہا ہوں' جو اس شخص نے سمجھا ہے جس نے ترجمہ کیا ہے' یہ تو ریسرچ نہیں' قرآن کا سمجھنا نہیں' پھر اس نے کہا کہ قرآن کو سمجھنے والی بات تو وہ موجودہ عربی زبان میں نہیں آتی۔ اسے سمجھنے کے لیے اُس دور کی زبان کا آنا ازبس ضروری ہے۔

موجودہ عربی زبان سے قرآن کو سمجھنے میں مشکلات

عزیزانِ من! موریس بکائے نے کہا کہ جس دَور کے اندر کتاب لکھی جاتی ہے اس دَور کی زبان آنی چاہیے۔ تحقیق اسے کہتے ہیں' ریسرچ یہ ہوتی ہے۔ یہ شخص عرب میں بدوؤں کے ہاں جا کر اتنا عرصہ رہا اور ان کی زبان سیکھی۔ کہا کہ اب پتہ چلا قرآن کیا کہتا ہے۔ پھر آیا اور جو اس کے کائنات کے متعلق اپنے موضوع تھے' قرآن سے Classification کی' تصریفِ آیات سے وہ سارا کچھ اکٹھا کیا اور یہ جو قرآنی الفاظ کا یہ مفہوم جو اس نے بدوؤں کی زبان سے متعین کیا' پھر اس مفہوم کو قرآن کی آیت میں جب وہ رکھتا ہے تو آپ دیکھیے گا کہ وہ جھوم اٹھتا ہے' اور اپنے زمانے کے سارے دانشوروں' سائنٹسٹوں' مفکروں کو پکار کر کہتا ہے کہ آو! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ چودہ سو سال پہلے کوئی انسان یہ بات کہہ سکتا تھا۔ یہی آیت ہے جس ضمن میں اس کے جو نتائج ہیں وہ میں پیش کرونگا۔

ڈاکٹر موریس بکائے کے نزدیک قرآنی حقائق کی اہمیت

عزیزانِ من! موریس بکائے کی یہ کتاب میرے سامنے رکھی ہے۔ اس نے یہ کتاب French (فرانسیسی زبان) میں لکھی تھی۔

الاسٹر ڈی پینل (Alastair D Pannell) کے ساتھ خود بیٹھ کر عربی کا اور اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا' پھر عربی میں بھی اس کا ترجمہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس نے جو آیت لی ہے وہ ہے رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30)۔ وہ یہ آیت لے کر اور متعلقہ آیات ساتھ لے کر بحث کرتا چلا آ رہا ہے۔ بائبل کے متعلق پہلے بات کی ہے۔ معاف فرمائیے' میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ چیز محفوظ ہو رہی ہے' ریکارڈ ہو رہی ہے' اس کے الفاظ بھی ریکارڈ ہو جائیں' تو یہ بات زیادہ مستند ہو گی' وہ بھی میں پیش کر دونگا' پھر اس کا ترجمہ بھی پیش کر دونگا کہ جو احباب انگریزی نہیں جانتے انہیں بھی معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ بات تو اس کے اپنے الفاظ میں ہو گی جو انگریزی میں ہے۔ وہ کہتا ہے:

Whereas monumental errors are to be found in the Bible, I could not find a single error in the Quran. I had to stop and ask myself: If a man was the author of the Quran, how could he have written facts in the 7th century A.D that today are shown to be in keeping with modern scientific knowledge? There was absolutely no doubt about it: the text of the Quran we have today is most definitely a text of the period, if I may be allowed to put it in these terms. What human explanation can thire be to this observation? In my opinion there is no explanation; there is no special reason why an inhabitant of the Arabian Peninsula should, at a time when King Degobert was reining in French (629-639 A.D), have had scientific knowledge on certain subjects that was ten centuries ahead of our own.

میں اس کا ترجمہ بھی عرض کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ ''ان موضوعات کے متعلق' جہاں بائبل میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں' قرآن میں مجھے اس قسم کی کوئی ایک غلطی بھی نہیں ملی۔ ایسے مقامات پر مجھے کھڑے ہو کر سوچنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنف کوئی انسان تھا تو اس کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ سائنس کے ان حقائق کو ساتویں صدی عیسوی میں پیش کر سکتا' جن کا انکشاف اس دور میں آ کر ہوا ہے۔ جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلا شک و شبہ وہی ہے جسے پیغمبر اسلام ﷺ نے دنیا کو دیا تھا۔ لہٰذا اس میں بعد کے کسی ردو بدل' اضافہ یا آمیزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا عقلِ انسانی اس کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتی ہے کہ اس زمانے میں ایک انسان نے یہ کچھ کیسے معلوم کر لیا۔ میں تو اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکا''۔ اور اس سے ذرا آگے چل کر وہ کہتا ہے:

How could a man, from being illiterate become the most important author in terms of literary merit, in the whole of Arabic literature? How could he then pronounce truths

of a scientific nature that no other human being could possible have developed at the time and all these without once making the slightest error in his pronouncements on the subject? The ideas in this study are developed from a purely scientific point of view. They lead to the conclusion that it is inconceivable for a human being living in the 7th century A.D to have expressed assertions in the Quran on highly varied subjects that do not belong to his period and for them to be in keeping with what was to be revealed only centuries later. For me there can be no human explanation to the Quran.

وہ کہتا ہے کہ ’’جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے وہ لامحالہ انسان کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک انسان متنوع حقائقِ کائنات کے متعلق جو اس زمانے میں انسانوں کے سامنے آئے ہی نہیں تھے‘ ایسی باتیں کہہ دے جو چودہ سو سال کے بعد جا کر بے نقاب ہوئی ہیں۔ بنابریں میں تو قرآن کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہو سکتا ہے‘‘۔

عزیزانِ من! ایک غیر مسلم خالص تحقیق کے بعد اس نتیجے پہ پہنچ رہا ہے اور اگلی بات جو اس نے کہی ہے وہ ہمارے لیے غور طلب ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ان کے ہاں (مسلمانوں کے ہاں) بڑے بڑے دانشور لوگ ہیں‘ لکھے پڑھے لوگ ہیں انہوں نے اس صدی میں بھی‘ ہمارے دَور میں بھی‘ قرآن کے ترجمے کیے ہیں۔ کہا کہ میرے لیے یہ بڑی باعث حیرت بات ہوئی کہ ان کے ہاں کے جو اسلاف تھے وہ تو اپنے زمانے میں وہ کچھ ترجمے کرسکتے تھے یا وہ تفسیریں بیان کر سکتے تھے کہ ان کے سامنے یہ حقائق نہیں تھے‘ حیرت یہ ہے کہ اس دَور کے‘ یہ ان کے ہاں کے دانشور بھی‘ وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو کچھ وہ کہتے تھے‘ حالانکہ سائنس کے انکشافات ان کے سامنے آ چکے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے مجھے اس پہ اس سے بھی زیادہ تعجب آ رہا ہے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ وہی تعجب ہے جو ہمارے ہاں ہر درس میں سامنے آتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

Why do such errors in translation exist? They may be explained by the facts that modern translators often resume, rather uncritically, the interpretation given by older commentators. In their day, the latter had an excuse for having given in inappropriate definition to an Arabic word containing several possible meanings; they could not possibly have understood the real sense of the world or phrase which has only become clear in the present day, thanks to scientific knowledge. In other words, the problem is raised of the necessary revision of translation and commentaries. It was not possible to do this at a certain period in the past, but now-a-days we have knowledge that enables us to render their true sense. These problems of

translation are not present for the texts of the Judeo Christian Revolution: the case described here is absolutely unique to the Quran.

عزیزانِ من! ان الفاظ میں وہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کے الفاظ وہی ہیں' اس زمانے کی زبان موجود ہے' اس کی تحقیق کی جاسکتی ہے۔ سائنس کے انکشافات سامنے آگئے ہیں' تو پھر ان لوگوں کو کیا ہوا کہ اس کی روشنی میں جو تراجم یا تفاسیر پہلے سے چلے آرہے ہیں ان کا کیوں نہ Critically Examine (تنقیدی جائزہ) کریں' کیوں نہ تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور جو حقائق اور زبان کے مطابق ترجمے ہوسکتے ہیں وہ ترجمے کیوں نہ کریں۔ وہ کہتا ہے کہ میں یہ بات بالکل نہیں سمجھ سکا کہ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔

آزادانہ علمی تحقیق کے بغیر قرآن فہمی ناممکن ہے

عزیزانِ من! یہ غیر مسلم محقق آزادنہ تحقیق کے بعد ہی قرآنی حقائق کے متعلق ان نتائج پہ پہنچا ہے۔ قرآن کے منجانب اللہ یا وحی ہونے کی اتنی بڑی شہادت ہے کہ جو تحقیق کی کسوٹی کے اوپر پوری اتر رہی ہے اور اس قوم کی کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے باوجود وہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہے۔ معاف رکھیے گا پھر کبھی کبھی ''میں'' درمیان میں آجاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کے سمجھنے کا اور سمجھانے کا میں نے پچاس سال پیشتر جو انداز اختیار کیا تھا اُس وقت میرے سامنے یہ مورس بکائے (Maurice Bucaille) یا اس قسم کا کوئی اور مغربی محقق نہیں تھا۔ کسی نے اس انداز سے بات ہی نہیں کی۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے یوں بات کی ہے' ورنہ ان کے ہاں کے جو بھی Authors (مصنفین) ہیں' محقق ہیں' دانشور ہیں' ہمارے ہاں کے ترجموں کو لے کر ہی انہوں نے کام کیا ہے اور قرآن کو اٹھا کے پھینک دیا ہے (معاذ اللہ)۔ یہ کچھ میں نے اس زمانے میں کیا۔ اس کی تائید آج اس دَور کے Scientists (سائنسدان) کررہے ہیں کہ قرآن سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے' اور اس طریقے سے قرآن سمجھنے کے بعد اس شخص نے ان آیات کو لیا ہے جو تخلیقِ کائنات سے متعلق ہیں۔

وضعی روایات اور بائبل کا تقابل

عزیزانِ من! اگلی بات اور بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ مسلمان اتنی بڑی روشنی اور نعمت کے باوجود ان تاریکیوں کے اندر کیوں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اس کی اس کتاب کا آخری باب [1] (The Qur`an, Hadiths and

---

[1] جو احباب خود اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں' ان کے لیے اس کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Bucaille, Maurice, and Pannel, Alastair D. (1998) The Bible, the Quran and Science. Lahore: Islamic Book Service.

Modern Scince، قرآن، حدیث اور جدید سائنس) ہے۔ اس میں اس شخص نے ہماری حدیثیں دی ہیں کہ انہوں نے ان کا بیڑہ غرق کیا ہے' یعنی یہ وضعی روایات ہیں۔ معاذ اللہ یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث ایسی ہے۔ اسکا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے وضعی روایات دی ہیں۔ اور وہ کرتا یہ ہے کہ وضعی روایات دیتا ہے اور ان کے مدمقابل بائبل کے بیانات دیتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے کہ دیکھ لیجیے' دونوں ایک ہی ہیں۔ جہاں سے بائبل والوں نے لی ہیں' وہیں سے انہوں نے بھی لی ہیں۔ انہوں نے یہ روایات خود بھی وضع کی ہیں اور بائبل کا حصہ بنا دیا' ادھر انہوں نے بھی خود وضع کیں' وہ قرآن میں تو انہیں داخل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لے رکھی ہے۔ مگر قرآن کے ساتھ ایک اور قرآن بنا دیا۔ اور یہ ہیں وہ وضعی روایات جو دونوں کے ہاں موجود ہیں۔

مورس بکائے نے بائبل اور قرآنِ کریم کا پہلے دو حصوں کے اندر تقابل کیا[1] اور پھر یہ کہا کہ نظر آ رہا ہے کہ بائبل کے زمانے کے ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے' اس میں قدم قدم پہ غلطیاں' اور فحش غلطیاں ہیں' یہ سائنس کے خلاف ہیں اور تحقیق کے بھی خلاف ہیں۔ اس کے مقابلے میں اس دور کا جو قرآن ہے عین علم اور حکمت اور تحقیق کی کسوٹی پہ پورا اترنے والا ہے۔ یہ بکائے کے دو Chapters (ابواب) تقابل کے ہیں اور آخر میں وہ بتاتا ہے کہ آؤ' میں تمہیں بتاتا ہوں۔ انہیں جو ہوا تھا وہ تو تھا ہی۔ وہ تو اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ان کی بائبل بین وہی' لفظاً لفظاً' وہی ہے جو ان کے انبیاء کو ملی تھی۔ ان مسلمانوں کو کیا ہوا؟ بکائے کہنے لگا: ان کو یہ ہوا' یہ دیکھیے اور پھر وہ روایات لاتا ہے' بائبل کے بیان لاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ دونوں ایک سطح پہ کھڑے ہیں اور یہ مذہب کی سطح ہے دین کی نہیں ہے۔ ایک غیر مسلم محقق اس نتیجے پہ پہنچ رہا ہے۔

بغداد کی گلیوں میں خونِ مسلم کی شہادت

عزیزانِ من! آج تو شاید جو کچھ میں یہ کہتا چلا آ رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں' شاید آج تو کچھ مفید مطلب نظر نہ آتا ہوگا اس لیے کہ راستے میں جو پہلے چھوٹی چھوٹی کنکریاں اور چھوٹے چھوٹے پتھر تھے' وہ اس دَور میں قرآن کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ ہماری تاریخ میں ایک دفعہ پہلے بھی یہ کوشش ہوئی تھی کہ قرآن کو قرآن اور عقل کی رو سے سمجھا جائے۔ اس کے خلاف ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت نے جو کیا' بغداد کی گلیوں کی نالیوں کا خون' اس کی شہادت دیتا ہے۔ ان کی کتابوں کا' جو انہوں نے تحقیق کے بعد قرآنی حقائق پر لکھی تھیں' کہیں بھی کوئی ورق نہیں ملتا۔ کہیں کہیں ان مذہبی پیشواؤں کی کتابوں میں کچھ گالیاں دے کر ان کا نام تو نظر آتا ہے مگر ان کی کسی کتاب کا کوئی ورق کہیں نہیں ملتا۔ اس کے بعد انہیں اتنا پیچھے دھکیلا کہ ہزار برس میں پھر اس قسم کی کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی' اگر ہوئی ہوگی تو

---

[1] اس کا عنوان ہے: Qur`anic and Biblical Narrations

وہ انفرادی طور پر ہوگی' ان کی وجہ سے آگے نہیں آئی ہوگی' چھپی چھپائی رہی ہوگی' تاریخ کے صفحات سے ہمیں کچھ نہیں مل رہا۔ قرآن کے راستے کے اندر ان کی اتنی بڑی روک ہے' آج بھی یہی چیز ہے۔

فکرِ قرآنی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! مجھے جرأت کے ساتھ کہنے دیجیے اسے تحدیثِ نعمت کہتے ہیں۔ خدا کے فضل وکرم کا ذکر کرتا ہوں۔ قرآن پہ یہ جو کچھ بھی میں نے محنت کی ہے مجھے کوئی وحی نہیں آئی' کوئی الہام نہیں ہوا' قرآن کے بتائے ہوئے طریقے سے قرآن کو سمجھا۔ اگر اس کے راستے میں یہ رکاوٹ نہ بنتے تو آج کم از کم پاکستان کے اندر قرآن کی حکومت قائم ہوگئی ہوتی' اور پھر اسے ایک دنیا دیکھتی۔ یہ ایک شخص 'مورس بکائے' اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے۔ دانشوروں کا ایک گروہ ہے جس کو یہ شخص متاثر کر رہا ہے' اس کی کتابیں پوچھو نہیں کہ کس طرح سے چل رہی ہیں۔ اگر یہ چیز کہیں پاکستان کے اندر عملاً ہوتی اور یہ مملکت قرآنی ہوتی تو پھر پوچھیے کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے' لیکن خاص طور پہ یہاں یہ اہتمام کیا گیا کہ کہیں قرآن کی آواز آگے نہ جانے پائے۔ ایک Slogan (نعرہ) ہے' ایک الزام ہے: یہ منکرِ حدیث' منکرِ شانِ رسالت' وہ اس قدر کافر' مرتد۔ اور وہ ان کے ہاں کا پورا جلوس اس پراپیگنڈے کے لیے ہے۔ پرویز کا اس میں کچھ نہیں گیا' عزیزانِ من! معاف رکھیے گا' میری تو کوئی دوکانداری نہیں تھی۔ اس زندگی کے آخری دور میں صدمہ یہ ہے کہ اتنی محنت سے' میں محسوس کر رہا ہوں' کہ جتنا کچھ میں اپنی محدود سی بصیرت اور وسعت کے مطابق بھی کر پایا ہوں' اگر اتنا بھی یہ قرآن عام ہو جاتا تو آج اس معاشرے کی حالت کچھ اور ہوتی' اور دنیا بھی دیکھتی کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ بدنصیبی ہے' میری بھی' قوم کی بھی' اس دور کی بھی' اور یہ اس لیے کہ یہ اگر قرآنِ خالص کو لے لیں تو ان کی دوکان میں کچھ باقی نہیں رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ نو دس سال ان اٹھارہ علوم میں صرف کرتے ہیں۔ ان کے نصاب میں قرآن ہے نہیں۔ اٹھارہ علوم میں قرآن نہیں ہے' اور وہ جتنے بھی علوم ہیں ان کے بعد ایک شخص اپنے آپ کو فاضل اور عالم تو کہہ سکتا ہے' عملی طور پہ کسی کام ہی نہیں آتا۔ قرآن ہے نہیں۔ اگر یہ کہیں کہ قرآنِ خالص کی بنا پر ہی دین سمجھ میں آتا ہے اور نظام متعین ہوتا ہے تو قرآن تو ان کے پاس ہے نہیں۔ جو ہے اس میں قرآن نہیں ہے' تو قرآن کو اگر یہ لے لیں تو وہ سارا بے کار ہو جاتا ہے۔ ان کی کروڑوں کی تعداد ہے' کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں ہے' اور اب تو ان کے ہاں ذریعہ معاش کے ساتھ اقتدار کی جھلک بھی ہے۔

مذہبی پیشوائیت کے فتوے قانون بن گئے

عزیزانِ من! پہلے ان کے فیصلے فتوے کہلاتے تھے۔ کسی کا جی چاہے مانے۔ کسی کا جی چاہے نہ مانے' اب وہ فتوے ملک کا قانون بن گئے ہیں۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ نہ مانیں۔ یہ تو بہرحال الگ بات ہے۔ میں اس بات کی طرف نہیں جا رہا' فرقہ بازی آجائے گی۔ وہی چیزیں جو اس سے پیشتر پرسنل شخصی (Personal) ہوتی تھیں' ذاتی ہوتی تھیں' اب وہ ملک کا قانون بن گئی ہیں۔ یہی چیز ملوکیت

کے دَور میں ہوئی تھی۔ اس زمانے کے بنے ہوئے قانون چلے آ رہے تھے۔ انگریز نے اپنے ہاں ان قوانین کو شرع محمدیؐ کہہ کر رائج کیا تھا۔ ان کی وجہ سے امت مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ ان کے جتنے پرسنل لاز (شخصی قوانین) ہیں وہ قانون بن گئے ہیں۔ مثلاً غصے میں آ کر کہہ دیا: طلاق طلاق طلاق تو چل' وہ طلاق ہوئی اور اس کے بعد معاذ اللہ میری بیٹیاں بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں وہ حلالے کی چیز آ گئی ہے جس کا لفظ بولنے سے شرم آتی ہے۔ وہ Law ہے' قانون بن گیا ہے۔ یا مثلاً یتیم پوتے کو دادا کے ہاں وراثت نہیں مل سکتی کیونکہ یتیم جو ہو گیا بیچارہ۔ یہ فتویٰ نہیں ہے' Law ہے۔ یا مثلاً اپنے مال میں وصیت نہیں کر سکتا' دیکھ رہا ہے کہ ساری عمر انہوں نے' میرے ان شریکوں نے' جو کچھ کیا ہے' اس کے بعد یہ میری بیوہ اور میرے بچوں کے ساتھ کیا کریں گے۔ وہ ان کے حق میں پوری وصیت نہیں کرتا۔ وہ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ یہ Law (قانون) ہے' پھر یہ فتوے قانون بن جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ اگر یہ چیز جس طرح سے کہ یہ غیر مسلم محقق اس نتیجے پہ پہنچے ہیں' اس طریقے سے قرآن کو سمجھ کے' قرآنِ کریم کی روشنی کو پھیلایا جاتا ہے' تو اس دور میں بھی آپ دیکھیے کہ یہ ملک بقعۂ نور بن جاتا۔ کم از کم ایک خطۂ زمین تو ایسا ہوتا پھر اس کی روشنی کی کرنیں دور دور تک پہنچتیں۔ میں نے آپ کے ساتھ ایک آیت کے متعلق یہ کہا ہے۔ اس شخص ❶ نے تخلیقِ کائنات کے متعلق بہت سی آیات لی ہیں جن کے متعلق ایسی تحقیق کی ہے۔ عزیزانِ من! ہم تو وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا ❷ (79:30) تک ہی آئے ہیں۔ یہ بڑی ضروری چیز تھی۔ آپ سمجھ لیجیے۔ دَحٰھَا (79:30) کا ایک لفظ ہے جس سے یونہی آگے گزر جاتے ہیں اور دوسرے الفاظ ہیں: رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا (21:30)۔ ان دونوں الفاظ کا ترجمہ یوں ''منہ بند'' ہے اور ''منہ کھول'' دیا۔ یہ ترجمے ہو جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہیں وہ آیاتِ قرآنی اور یہ ہیں وہ لوگ جو آزادنہ علمی تحقیق کی رو سے ان کے مفہوم کو یوں سمجھے ہیں اور یوں سمجھ کر ادھر پہنچے ہیں۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا ہم آیت 30 تک آئے' 31 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ مورس بکائے (Maurice Bucaille) نے

❷ پھر اس زمین کو دیکھو۔ یہ اور دیگر اجرام' پہلے ایک ہی ہیولیٰ (Nebula) تھے۔ اُس نے اس ہیولیٰ سے ارض (زمین) کو الگ کر کے یوں دور پھینک دیا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے (21:30)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ساتواں باب: سورة النازعات (آیات 31 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1984ء کی 29 تاریخ ہے۔ رمضان المبارک کا آخری جمعہ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النازعات کی آیت 31 سے ہو رہا ہے: (79:31)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس تو پچھلی آیت کے ایک لفظ تک ہی محصور رہا۔ وہ آیت ہے: **وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا** [1] (79:30) اور میں نے فرانسیسی محقق، ڈاکٹر مورس بکائے (Maurice Bucaille) کی تشریحات کے مطابق یہ عرض کیا تھا کہ اس نے کس طرح اس ایک لفظ کی تشریح، جو قرآن نے دوسرے مقام پر، رتق اور فتق کہہ کر دی ہے، کی اور اربابِ سائنس کو پکار کر کہا تھا کہ مجھے بتاؤ کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر کوئی انسانی فکر یہ باتیں کہہ سکتی تھی، جو آج سائنس کے انکشافات کی وجہ سے ہمارے سامنے آئی ہیں، تو اس سے تم کس نتیجہ پہ پہنچتے ہو۔ میں تو کم از کم اسی نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ ایک لفظ کی تشریح سے پھر وہ اگلی آیت پہ کھڑا ہو گیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ کتاب **لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ** (10:5) ہے، **لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ** (2:164) ہے، **لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ** (13:3) ہے۔ یہ اربابِ علم و دانش کے لیے ہے، عقل و فکر کی رو سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے، یہ ہے ہی اس قوم کے لیے جو علم و عقل سے کام لے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عقیدت کی رو سے ادھر نہیں آتے۔

ڈاکٹر مورس بکائے نے کہا یہ تھا کہ جب میں بائبل کی طرف سے مایوس ہو گیا تو میں نے کہا: دنیا میں اتنا بڑا ایک اور مذہب بھی ہے، اس کی بھی ایک کتاب ہے، ذرا اسے بھی دیکھ تو لوں کہ وہ کیا کہتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ قرآن کی طرف آیا ہے۔ Scientific (سائنسی) طریق پر اس شخص نے تحقیق کی ہے۔ اس کا جو میدان ہے، وہ سائنس کا ہے۔ اسی میدان سے متعلق، جو قرآن کی آیات تخلیقِ ارض و سماء اور نظم و نسقِ کائنات سے متعلق ہیں، اس نے اپنے آپ کو وہیں تک محدود رکھا ہے اور پھر جن نتائج پہ وہ پہنچا ہے، ایک ایک حقیقت کے بعد اس کا اعلان کرتا ہے اور سائنسدان سے کہتا ہے کہ بتاؤ مجھے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کوئی انسان، یہ بات عقل و علم کی بنا پر کہہ سکتا تھا؟

---

[1] پھر اس زمین کو دیکھو۔ یہ اور دیگر اجرام، پہلے ایک ہیولیٰ (Nebula) تھے۔ اُس نے اس ہیولیٰ سے ارض (زمین) کو الگ کر کے یوں دُور پھینک دیا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے (21:30)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہمارے ہاں ہر چیز تقلیدی ہے

ہمارے ہاں جو کچھ چلا آ رہا ہے اس میں علم اور عقل کا دخل ہی نہیں ہے۔ وہ ساری چیز تقلیداً ہو رہی ہے۔ اب تقلیداً کی بھی بات آ گئی یہ بھی عرض کر دوں۔ آپ روزانہ مقلد اور غیر مقلد کے مباحثے اور مناظرے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ دو فرقے [1] ہیں۔ غیر مقلد وہ ہیں جنہیں اہلحدیث کہا جاتا ہے۔ دوسرے مقلد ہیں۔ وہ کسی نہ کسی امام کی تقلید کرتے ہیں۔ درحقیقت دونوں ہی مقلد ہیں اور شخصیتوں کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ کسی فقہ کے امام کی تقلید میں کہتے ہیں۔ یہ جو حدیثوں کے جمع کرنے والے ہیں جنہیں جامعین حدیث کہتے ہیں' مثلاً امام بخاریؒ وغیرہ' یہ ان کی تقلید کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث کے متعلق کہہ دیا کہ یہ ہمارے قیاس میں' ہمارے خیال میں' رسول اللہؐ کی حدیث ہو سکتی ہے اور انہوں نے تیرہ سو سال تک یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے۔ یہ ان کی تقلید ہے۔ بات تو کسی نہ کسی شخص پہ جا کر کھڑی ہو جاتی ہے' اور جب وہاں' آخری سند' وہ شخص ہو جائے' خواہ وہ فقہ کا امام ہو' خواہ وہ احادیث کے کسی مجموعے کا جامع ہو' بات ایک شخصیت پہ کھڑی ہو جاتی ہے' پھر وہاں تحقیق نہیں ہو سکتی' وہاں علم کا کوئی کام نہیں' عقل اور فکر اور دانش کا وہاں کوئی کام نہیں۔ وہ تو یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات کہہ دی۔ مقلدین نے کہہ دیا کہ فلاں امام کی' فلاں فقہ کی کتاب میں' درمختار میں' عالمگیری میں' یہ آیا ہے۔ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ بخاری میں' مسلم میں' یہ آیا ہے' وہیں کھڑے ہیں: جامد' پتھروں کی طرح ایک مقام کے اوپر جامد۔ جہیم کی زندگی ہے' رُکے ہوئے ہیں اور انسانی علم تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ لمحہ بہ لمحہ' لحظہ بہ لحظہ' پھیلتا جا رہا ہے' اس کی سطح بلند ہوتی چلی جا رہی ہے۔ قرآن تو ان اربابِ علم و عقل کے لیے تھا جو سمجھیں۔ جن لوگوں نے آج سے ہزار برس پہلے' پانچ سو سال پہلے تفسیریں لکھیں' انہوں نے اگر یہ کچھ لکھ دیا ہے تو ان پہ ان کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے کی علمی سطح ہی اتنی تھی۔ نظر آتا ہے کہ خود ان کی علمی سطح بھی کچھ اتنی ہی تھی۔ ٹھیک ہے' اصل چیز جو وجہ تاسف یا باعثِ اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ لوگ اسی کو حرفِ آخر سمجھے چلے آ رہے ہیں۔ اس طرح نہ علم آگے بڑھ سکتا ہے' نہ فکر کی سطح بلند ہو سکتی ہے' نہ قرآن کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ موریس بکائے (Maurice Bucaille) کی اس کتاب میں دَحٰھَا (79:30) کا ایک Chapter (باب) ہے۔ وہ آگے بڑھا ہے اور کہا ہے کہ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا [2] (79:31)۔ عام معنی اور تفسیر یہ ہے کہ پھر اس میں زمین سے پانی نکالا۔ اور ''مرع'' کے معنی: ''چارہ یا نباتات'' یا یہ چیزیں نکالیں۔ یہ سیدھی اور صاف سی بات ہے۔ اس میں تو کوئی ایسی بات

---

[1] مقلد اور غیر مقلد کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالق القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص۔ 374' فٹ نوٹ نمبر 3

[2] اس کے بعد اس میں سے پانی کشید کر کے سمندروں کو الگ کیا (اور خشکی کے قطعات کو الگ)۔ پھر ان قطعات میں نباتات کی نمود ہوئی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نظر نہیں آتی کہ جس پہ کھڑے ہو کر فکر کی رو سے کچھ سوچا جائے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟ لیکن وہ لوگ تو اس میں ایسے نہیں آگے بڑھتے۔ اس میں ہے کہ **اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا** (79:31) زمین سے پانی نکالا۔ وہ مورس بکائے کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ٹھیک تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اس میں پانی نکالا۔ یہاں ہے: مآء ھا (79:31) اس کا پانی نکالا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے یہ مآء ھا کیوں کہا؟ کیا بات ہے! سوچنے والے تو یوں سوچتے ہیں کہ صرف مــآء تو کہا جاتا ہے' اس سے تو بات بن جاتی۔ ہم سب یہی کہتے ہیں کہ یہ زمین کا پانی ہے۔ اب وہ کھڑا ہوا ہے کہ یہ جو اس وقت ہمارے ہاں پانی ہے یہ تو ایک Cyclic Order (دوری ترتیب) کی بات ہے' یہ گردش کی بات ہے' یہ سمندر' دریا' جہاں بھی پانی ہے' وہاں سے سورج کی حرارت اس کو عمل تبخیر (Evaporation) کے ذریعے اوپر پہنچاتی ہے۔ وہاں' جہاں کہیں' Atmosphere (فضا) میں ٹھنڈک زیادہ ہوتی ہے' وہاں جا کر یہ بھاری ہو جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جسے بادل کہا جاتا ہے۔ یہ بادل جب بھاری ہو جائیں یعنی ہوا سے زیادہ بوجھل ہو جائیں تو زمین پہ گرتے ہیں۔ اسے بارش کہا جاتا ہے۔ پھر وہی پانی جو اوپر گیا تھا نیچے آ جاتا ہے' پھر اسی پانی کو اسی طرح سے سورج کی کرنیں اپنے اپنے ڈول بھر کر اوپر لے جاتی ہیں' پھر نیچے آ جاتا ہے۔ یہ پانی تو یہ ہے۔ اس نے کہا کہ قرآن نے یہاں ''مآء ھا'' کیوں کہا ہے؟ وہ شخص کھڑا ہے کہ ''مآء ھا'' کیوں آیا ہے؟

عزیزانِ من! اب اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ تو ایک بہت بڑا آتشیں گولا' آگ کا پگھلا ہوا مادہ تھا' اس تیزی سے چکر لگا رہا تھا۔ یہ پانی کہاں سے آ گیا؟ ایسی آگ اور اس میں سے پانی!! یہ کہاں سے آ گیا؟ اب اس کی Scientific (سائنسی) تحقیق ہو رہی ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ پھر یہ زمین مختلف ''ایام'' سے گزری ہے۔ قرآن نے تو ''یوم'' ہی کہا ہے۔ یعنی یہ کرہ ارض مراحل سے گزرا۔ وہ اس کی تحقیق کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ اس کے اندر' کہیں باہر سے' پانی نہیں آیا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کے اندر جو تغیرات ہوئے ہیں' اُن کی رو سے یہ پانی کس طرح بن گیا۔ وہ مــآء ھــا (79:31) میں ''ھــا'' کی تفسیر دے رہا ہے۔ وہ مورس بکائے یہاں ایک لفظ پر کھڑا ہو گیا ہے کہ قرآن نے ''مــآء'' کے ساتھ ''ھا'' کیوں کہا ہے۔ ہم میں سے تو کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ اس ''ھا'' پر بھی غور کریں۔ یہی ہے جی' زمین میں سے پانی نکالا ہے اور پھر وہ برستا ہے۔ وہ لوگ یوں نہیں آگے بڑھ جاتے۔ وہ مقلد نہیں ہیں' وہ محقق ہیں۔ اس نے پانی پر بھی ایک Chapter (باب) لکھا ہے جس میں یہ بات آئی ہے۔

میرے درس میں اتنا وقت نہیں ہے۔ یہ قرآنِ کریم تو مختلف گوشوں اور دائروں کے اربابِ علم و تحقیق کے لیے نصابی کتاب ہے۔ جتنا کچھ اور جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ بتا رہا ہوں یا جو سائنسدان ہیں اور سمجھ میں آگے بڑھے ہوئے ہیں وہ ان چیزوں کو سمجھا سکیں گے۔ مورس بکائے نے' بہرحال' اس کے بعد' اگر ''دحٰھا'' والی بات پر ایک Chapter (باب) لکھا تھا تو اگلا حصہ اس ''مــآء ھا'' میں ''ھا'' کی تفسیر پر ہے جو وہ کر رہا ہے۔ اس آیت میں اگلا لفظ ہے: **وَ مَرۡعٰـهَا** (79:31) انسانوں کے لیے بھی اور مویشیوں کے لیے

بھی۔ یہ بات آگے آتی ہے۔ اب اگلی آیت میں کہا کہ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا [1] (79:32)۔

قرآنِ حکیم میں الفاظ کا چناؤ

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یوں تو قرآنِ کریم کا ہر لفظ ایک اعجاز ہے اور اسے پھر دہرادوں کہ عربی زبان میں ایک ایک لفظ کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ انہیں عام طور پہ مرادفات کہا جاتا ہے اور مرادف کے معنی لیے جاتے ہیں کہ ''وہی معنی دینے والا دوسرا لفظ۔'' عرب اس چیز کو زبان کا نقص بیان کرتے ہیں کہ کسی ایک بات کے لیے دو الفاظ ہوں۔ اس [2] نے کہا تھا کہ وہ زبان کیا ہوئی' جس میں کسی ایک بات کے لیے دو الفاظ ہوں۔ عربی زبان میں ایک چیز کے لیے پانچ پانچ سوُاور ہزار ہزار الفاظ ہوتے ہیں۔ [3] ہر لفظ کے معنی' دوسرے لفظ کے معنی سے' ذرا سے شیڈ کے اعتبار سے' مختلف ہوتے ہیں۔ وہ جو قرآن نے ان میں سے لفظ کا انتخاب کیا ہے' پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنے الفاظ' جو مرادف تھے' ان میں سے اس ایک لفظ کا انتخاب اس نے کیوں کیا؟ شاعری میں تو یہ اس لیے ہوتا ہے کہ کہیں وزن نہ ٹوٹ جائے۔ مثلاً شہد اور انگبیں بالکل ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ ان دونوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا! شہد ہی کو کہتے ہیں۔ وہ الفاظ اس لیے رکھے ہوئے ہیں کہ اگر شعر کے وزن میں کہیں انگبیں سے وزن قائم ہوتا ہے تو انگبیں لکھ دیا' اگر شہد سے وزن قائم ہوتا ہے شہد لکھ دیا' معنی دونوں کے ایک ہیں لیکن عربی میں یہ بات نہیں ہے۔ عرب اس کو نہیں مانتا' وہ اس طرح سے الفاظ نہیں لاتا۔

کوئی لفظ دوسرے لفظ کی جگہ نہیں لے سکتا

عزیزانِ من! اس [2] نے کہا ہے کہ قرآن نہ نثر ہے نہ نظم ہے۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کہیں کیا کہ یہ اسلوبِ بیان کے اعتبار سے ہے کیا؟ یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم میں جو لفظ انتخاب کر کے رکھ دیا ہے' ان پانچ سو الفاظ' ہزار الفاظ میں سے کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں آ سکتا' اور وہ تو یہاں تک ہے کہ اگر اس کی جگہ ہم خود کوئی دوسرا لفظ چن کر وہاں رکھ دیں تو یہ قرآن میں تحریف ہے' شرک ہے۔ خدا کے منتخب کردہ لفظ کی جگہ اگر ہم اپنا انتخاب کردہ لفظ رکھ دیں' خواہ وہ ان مرادفات میں سے ہی کیوں نہ ہو' تو یہ لفظ بھی جو قرآن نے یا اللہ تعالیٰ

---

[1] اور انہی میں بڑے بڑے محکم پہاڑوں کو ابھارا۔

[2] یہ اشارہ رچرڈ مورس بک (Richard Maurice Bucke) کی طرف ہے۔ اس نے اس بات کا اظہار اپنی معروف کتاب Cosmic Consciousness (کائناتی شعور) میں کیا ہے۔

[3] بقول رچرڈ مورس بک عربوں کے ہاں شہد کے لیے اسی (80) الفاظ' سانپ کے لیے دوسو (200)' شیر کے لیے پانچ سو (500)' تلوار کے لیے ایک ہزار (1000) اور اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس الفاظ موجود تھے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: Bucke, Richard Maurice: Cosmic Consciousniss, pp. 30-31)

نے منتخب کیا ہے اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ قرآن کی انفرادیت ہے اسی لفظ سے قرآن قرآن ہے۔ اگر کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ لگا دیا جائے تو وہ خدا کا کلام نہیں رہے گا۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ **وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا**[1] (79:32)۔ اس آیت میں **اَرْسٰهَا** کی کیا بات ہے! یہ 'رسیٰ یا مرسا'' اس وقت کہتے ہیں جب کشتی لنگر انداز ہو جاتی ہے۔ اب اس میں کیا بات ہوتی ہے؟ یہاں یہی لفظ کیوں آیا ہے۔ اس کے آگے بھی یہ لفظ آتا ہے کہ **يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا**[2] (79:42)۔ پانی کے اوپر کشتی چل رہی ہوتی ہے کسی ایک مقام پہ آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ کرّہ ارض اور جتنے فلک کے دوسرے کرّے ہیں ان سب کے متعلق یہ تحقیق ہے کہ وہ اپنے اپنے مدار میں تیزی سے گردش کر رہے ہیں کشتی کی طرح تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں لیکن اس میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑ جہاں کھڑا ہے وہ وہیں کھڑا ہے یہ چلتا ہوا نظر نہیں آتا پوری زمین تو چل رہی ہے یہ نہیں چل رہے اس کے لیے قرآن نے ایک لفظ لنگر انداز ہونا تجویز کیا کہ زمین کی یہ کشتیاں لنگر انداز ہو کر ایک مقام پہ رک گئی ہیں۔ لفظ ہے 'ارسٰھا''۔ ان سب کی وجہ سے کیا ہوا؟ پہاڑوں کا پانی کے معاملے میں نشوونما کے معاملے میں بڑا اہم رول ہے۔ یہ جتنی بارش ہوتی ہے یا پہاڑوں کی بلندیوں پر برف گرتی ہے تو پانی بہہ جاتا ہے۔ بہتے پانی کو تم جتنا استعمال کر سکتے ہو کر لو باقی یہ سارے کا سارا سمندر میں چلا جاتا ہے تمہارے پاس کچھ نہیں رہتا۔ جب یہ بارش نہ ہو اور پانی نہ ہو تو اس وقت پھر آپ دیکھیے کہ کیا صورت ہو جاتی ہے۔ برف کا یہ پانی آپ کے ان ڈیمز (Dams) کے اندر نہیں آ رہا تھا جہاں سے بجلی پیدا ہو رہی تھی اور پچھلے دنوں جو لوڈ شیڈنگ ہوئی ہے سارے ملک میں عذاب آ گیا کہ بارشیں نہیں ہوئیں تو پانی نہیں ہے۔ فطرت کا انتظام یہ ہے کہ یہ جو بہنے والا پانی ہے اس کے علاوہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ پانی تو جمع ہو ہی نہیں سکتا لیکن فطرت کا نظام دیکھیے اس کو برف کی شکل میں اس زمانے کے لیے جمع کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے جب سورج کی حرارت تیز ہو یہاں بارش نہ ہو رہی ہو تو وہی برف پگھل کر پانی کی شکل میں پھر دریاؤں کی صورت میں آتی ہے علاوہ اور کاموں کے پہاڑ یہ کام دیتے ہیں دوسرے کاموں کے لیے تو ارضیات کا شعبہ ہی دوسرا آ جائے گا۔ اس میں وہ بتائیں گے کہ پہاڑ کیا کیا کام دیتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا** (79:32) ایک لنگر انداز ہو گئے یہ سب۔ یہ سارا نظام کس کے لیے ہے؟ کہا کہ یہ **مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ** (79:33)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامانِ زیست پیدا کرے۔ وہاں پچھلی آیت میں کہا تھا **مَرْعٰهَا** (79:31) تمہارے لیے تمہارے مویشیوں کے لیے بھی یہ چارہ یعنی نباتات پیدا کرے۔

---

1. اور انہی میں بڑے بڑے محکم پہاڑوں کو ابھارا۔
2. (اس انقلاب کے متعلق یہ کچھ سننے کے بعد) یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ انقلاب بالآخر آئے گا کب؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لفظ متاع میں قرآنِ حکیم کا پورا معاشی نظام مضمر ہے

عزیزانِ من! اس آیت میں متاع کا لفظ آ گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا اور میں نے اس کی تشریح کی تھی لیکن اب تو جوں جوں لفظ آتے جائیں گے میں ان کی تشریح دہراتا چلا جاؤں گا کہ آخری بار ہے' یہ آخری پارہ ہے' اور درسوں میں یہ بھی آخری مقام ہے' متاع کا لفظ ہے۔ اس ایک لفظ میں قرآنِ کریم کا سارا معاشی نظام آ گیا' اسے سامانِ زیست کہا جا سکتا تھا' رزق بھی کہا جا سکتا تھا' لیکن بیشتر مقامات میں جہاں اصولاً یہ چیز کہی ہے وہاں اس کو متاع کہا ہے۔ متاع کے لفظ میں تو قرآن کا سارے کا سارا معاشی نظام آ گیا ہے۔ قرآن کا معاشی نظام یہ ہے کہ انسانوں کی پرورش ہو' نشوونما ہو' یہ کچھ جمع نہ کریں' جتنی بھوک ہے اتنی روٹی ملے۔ رزق کے معنی عربی زبان میں ہوتا ہے: ''سامانِ زیست جو وقت پر مل جائے۔'' یہ اس کے اندر شرط ہے' تو یہ اتنا ہی ہے کہ وقت کے اوپر اتنی روٹی مل جائے جس سے پیٹ بھر جائے' اور اس کے بعد جو باقی جتنا غلہ ہے اگر پھر وہ سمیٹ کے رکھ لیتا ہے تو یہ باطل کا نظام ہے۔ جو غلہ' جو روٹی' جو آٹا' کسی دوسرے بھوکے کے کام آنا تھا اس سے وہ چھین کر رکھ لیتا ہے' جمع کر لیتا ہے۔ بس جونہی کسی نے ضرورت سے زیادہ جمع کیا وہ نظام باطل کا ہو گیا۔ وہ جمع اس لیے کرتا ہے کہ کل کلاں کو اگر کوئی مصیبت آ گئی تو میں اس وقت کہاں سے کھاؤں گا۔ اس کے جواب میں کہا کہ بس یہ ہے وہ نظام جس میں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:152) تمہاری اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ پھر جمع کیوں کرنا ہے؟ اس کے لیے کیا لفظ ہے متاع کا۔

اس زمانے کا مسافر سفر میں جا رہا ہے' سفر کے دوران جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ عام طور پہ ان کے ہاں ہوتی تھیں: پانی نکالنے کے لیے ڈول اور ڈوری۔ وہ بڑی ضروری چیز ہوتی تھی۔ ایک لٹھ حفاظت کے لیے ضروری' ستو توشہ دان میں' توشہ دان بھی کس قسم کا؟ یہ وہی بھیڑ وغیرہ کی کھال کا جو بنا ہوا ہوتا تھا' بوری چھوٹی سی' اس میں وہ ستو وغیرہ' یہ چیزیں' سر پہ لپیٹنے کا کپڑا۔ اب اس میں یہ دیکھیے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں جو اشد ضرورت کے وقت کام آئیں گی' اور اس میں ایک چیز بھی زائد از ضرورت ساتھ نہیں رکھے گا۔ وہ دو ڈول نہیں رکھے گا' کوئی دو پگڑیاں نہیں رکھتا' دو لٹھ نہیں اس کے پاس ہوتے' مسافر تو کم از کم بوجھ اپنے ساتھ رکھتا ہے لیکن رکھتا وہ ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے' ضرورت رکی نہ رہے اور زائد از ضرورت کچھ نہ ہو' وہ سامان وقت کے اوپر پوری ضرورت کو پورا کرے اور زائد از ضرورت نہ ہو۔ اسے عربی زبان میں متاع کہتے ہیں۔ اِس ایک لفظ کے اندر سارا معاشی نظام آ گیا کہ یہ سارا جتنا کچھ زمین پیدا کرتی ہے' یہ پانی' یہ زمین' یہ رزق' یہ اجناس' جو کچھ پیدا ہوتا ہے یہ صرف متاع ہیں' اور زندگی کو ایک سفر قرار دے دیا۔

عزیزانِ من! یہاں ایک دوسری چیز متاع کے اندر اور آ گئی۔ یہ چیز ہے: فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ [1] (2:36)۔

---

[1] دنیا میں انسانی زندگی کوئی ایک آدھ دن کی بات نہیں کہ یوں بھی گزر جائے۔ اس نے یہاں ایک مدت تک رہنا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دنیا میں زندگی ایک وقت تک کے لیے ہے۔ زندگی ایک سفر ہے۔ اس کے اندر یہ چیز نہیں ہے کہ یہ ابدی طور پر رہنے کا ٹھکانہ ہے۔ اسے آگے چلنے کے لیے سفر بتایا ہے' اور یہ سارا سامانِ زیست وہ ہے جس کی مسافر کو سفر کے دوران ضرورت پڑتی ہے' اور پھر جب سفر ختم ہو جاتا ہے تو جو چیز بھی ہوتی ہے' یہ اسے اتار کر رکھ دیتا ہے۔ معاملہ ختم ہوا' سفر ختم ہو گیا۔ اب قرآن نے ساری زندگی کے سامانِ زیست کے لیے متاع کا لفظ استعمال کیا ہے۔ عربی زبان میں اس کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں مگر قرآن میں ان میں سے یہ لفظ چنا گیا ہے۔ چننے والا خدا ہے جو علیم و خبیر ہے۔ اسے پتہ ہے کہ معاشی نظام جو ہم تجویز کر رہے ہیں اس نظام کو سمجھانے کے لیے یہی لفظ ہو سکتا ہے' اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ آ ہی نہیں سکتا۔ اب بتا دیا کہ انسان کی یہ زندگی ہے' اس دنیا کے اندر اس کا یہ رول اور یہ سفر ہے' اس سفر کے اندر یہ دنیا اس کی منزل نہیں ہے۔ منزل آگے ہے کیونکہ زندگی تو موت سے ختم نہیں ہوتی' آگے چلتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ''آگے چلیں گے دم لے کر'' اس میں وہ جو موت ہے' وہ تھوڑے سے ''دم لینے'' کی بات ہے' ستانے کی بات ہے' پھر آگے چلنے کی بات ہے۔ [1] یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ بڑی خوبصورتی سے یہ بات کہی ہے:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ ہے زندگی اور اس کے سامان کے لیے لفظ ہے: **مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ** [2] (79:33)۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے خطاب ہے۔ یہاں '**كُمْ**' کے لفظ میں دیکھیے قرآن کیا کہہ گیا: یہ سب کے لیے ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کی بھوک کا سامان ہے اور باقی وہ ہیں جو بھوکے رہیں گے۔ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے: نوعِ انسانی کے اپنے لیے بھی اور یہ جتنے Domestic Animal (پالتو جانور) جن کو مویشی اور حیوانات کہتے ہیں' جو تم نے اپنے ہاں پال رکھے ہیں' ان کے لیے بھی ہے۔ یہاں **اَنْعَامِكُمْ** کہا ہے۔ یہاں' یہ پورے انعام' جتنے بھی باہر جنگلوں میں' کھیتوں میں' پہاڑوں پہ' آپ کے حیطہ تحویل میں نہیں ہیں' جو آپ کی ذمہ داریوں کے اندر نہیں ہیں' ان کی ذمہ داری نہیں عائد ہو رہی۔ یہ **اَنْعَامِكُمْ** ہے۔ **مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ** اور ''**كُمْ**'' میں پوری نوعِ انسانی آتی ہے۔ اب دوسرا ''**كُمْ**'' بھی آ گیا یعنی متاع کے معنی بھی آ گئے اور ''**كُمْ**'' کے معنی بھی آ گئے یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے سامانِ زیست جو پوری زندگی ملتا رہے: ان کو بھی اور ان کی اولاد کو بھی۔

عزیزانِ من! اس (79:33) آیت کے یہ چار الفاظ ہیں اور آپ دیکھ لیجیے کہ اس میں پورے کا پورا معاشی نظام آ گیا۔ اب یہ بات

---

[1] موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

[2] (اس تمام سلسلہ کو اس انداز سے استوار کیا کہ) یہ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامانِ زیست پیدا کرے۔ (مفہوم القرآن - پرویز)

بھی آ گئی کہ ارض کا، زمین کا، پہاڑوں کا، اور پانی کا ذکر کیوں ہو رہا تھا۔ یعنی ایک تو یہ ہے کہ محض علمی معلومات کے لیے کوئی چیز ہو، جیسے ہمارے ہاں سائنس کے اسٹوڈنٹس (طالب علم) کو کالجوں میں ان چیزوں کو پڑھاتے ہیں، وہ صرف معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ قرآن صرف وہ معلومات بہم پہنچانے کی کتاب نہیں ہے، وہ یہ ساری معلومات اپنے کسی اصول کی طرف لانے کے لیے بہم پہنچاتا ہے۔ اس نے کہنا یہ تھا کہ یہ ارض تمہارے لیے، تمہارے مویشیوں کے لیے، پوری انسانیت کے لیے ذریعہ رزق ہے۔ سامانِ زیست صرف نشوونما کے لیے ہے، جمع کر کے رکھنے کا نہیں ہے۔ اُسے تو یہ کہنا تھا۔ اس کے لیے پہلے ارض کی کیفیت بیان کرتا چلا آیا۔ اب جو بات کہنی تھی اس کے لیے کہا کہ **مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ** (79:33) یہ تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامانِ زیست پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ سامانِ زیست تو تمام کے لیے ہوگا۔ اب اگر یہ "کُمْ" کے لیے ہے تو خدائی منشا کے مطابق ہے اور اگر کیفیت یہ ہے کہ بعض کو مل رہا ہے، بعض بھوکے رہ رہے ہیں تو یہ نظام کفر ہے، نظامِ اسلام نہیں ہے۔ "کُمْ" کے اندر پوری انسانیت آتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ باطل کے نظام میں تو یہ جن کو طبقاتی تقسیم کہتے ہیں پستیاں اور بلندیاں، ناہمواریاں، یہی چیز ہوتی ہے جس کو آپ طبقاتی تقسیم کہتے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں کہ جن کے کتوں کے لیے بھی وہ کچھ ملتا ہے جو دوسروں کے بیٹوں کے لیے نہیں ملتا۔ سنگ مرمر کے محلوں میں رہتے ہیں، یہ جھونپڑی میں رہتے ہیں، ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ اٹھانے والے اب آئے کہ اب آئے، یعنی یہ جو انسان اور انسان میں تفریق ہے، قرآن نے جو "کُمْ" کہا ہے اس میں تو تفریق نہیں ہے۔ جہاں یہ طبقاتی تفریق آئے گی وہاں باطل کا نظام آ جائے گا۔

اب قرآنِ مجید ایک انقلاب لا رہا ہے۔ اس انقلاب کے لیے پھر ایک تشبیہہ آ رہی ہے۔ بات النّٰزِعٰتِ سے شروع ہوئی تھی۔ وہ محکوم قومیں جن کو پانی میں ڈبو کر رکھا ہوا ہوتا ہے، وہاں سے پانی کی تشریح کی بات آئی تھی، یہ وہ طبقاتی تفریق کی پستیاں اور بلندیاں ہیں جنہیں یہ انقلاب ہموار کر رہا ہے۔ کیا لفظ ہے اس کے لیے جو آگے آ رہا ہے! **فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى** [1] (79:34)۔ یہ لفظ ہے "طامۃ"۔ عزیزانِ من! طآمۃ سیلاب کو کہتے ہیں اور سیلاب بھی ہے کبریٰ، اتنا بڑا سیلاب۔ سیلاب ہی بلندیوں اور پستیوں کو ہموار کر سکتا ہے۔ پانی ہموار کرتا ہے، پانی کہیں سے بھی چھوڑ دیجیے جہاں کہیں گڑھا آئے گا پہلے وہ گڑھے کو بھرے گا، پھر آگے چلے گا۔

قرآنِ حکیم کا معاشی انقلاب طبقاتی تفریق کے لیے پیغامِ موت ہے

تقسیمِ رزق یہ ہے کہ جہاں اس کی ضرورت ہے پہلے اس کو پورا کرے گا پھر آگے چلے گا۔ یہ "ماعون" ہے، بہنے والا پانی ہے، کھڑا نہیں، اور بہنے والے پانی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پستیوں کو اور بلندیوں کو ہموار کر دیتا ہے۔ کہا کہ وہ انقلاب آئے گا، ایک سیلاب ہوگا۔

---

[1] (اگر ایسا غلط معاشرہ قائم ہو جائے کہ اس میں زمین کی پیداوار انسانوں کے لیے زیست کا سامان بننے کے بجائے کمزوروں اور ناتوانوں کو بالادستوں کے پنجہ استبداد میں جکڑنے کا ذریعہ بن جائے، تو) پھر وہ انقلابِ عظیم آئے گا۔ (جس کا ذکر شروع کی آیات میں کیا گیا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ایک تو یہ جتنے بھی گڑھے غلامی کے طوق وغیرہ اوپر آئے ہوئے ہوتے ہیں وہ ان کو تو اتار کر پھینک دے گا' پھر پستیوں اور بلندیوں کو ہموار کردے گا' اور یہ طآمہ بھی کبریٰ ہے' بہت بڑا ہے' اتنا بڑا کہ یہ انقلاب جو قرآنی انقلاب ہوگا' اس کا مقصد پستیوں اور بلندیوں میں ہمواری پیدا کردینا' سطح کا برابر کردینا ہوگا۔ اس سے طبقات کی تقسیم نہیں رہتی' انسان اور انسان کے اندر کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ یہ ہوتا ہے انقلاب جسے قرآنی انقلاب کہتے ہیں اور وہاں صورت یہ ہوگی: **يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ** ❶ (79:35)۔Construction (ترکیب) کے اعتبار سے' اس آیت کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس میں انسان کے سامنے صرف وہ چیز ہوگی جس کے لیے اس نے محنت کی ہوئی ہے۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد ہے: **لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ** ❷ (53:39) اس میں جو معاوضہ ہے وہ محنت کا ہے' سرمائے کا نہیں۔ یہ بنیاد ہے قرآن کے معاشی نظام کی۔ جو معذور اور سائل و محروم ہے اس کی ذمہ داری نظام پہ آتی ہے لیکن جو محنت کرنے کے قابل ہے' مگر خود محنت کر کے' کما کے' نہیں کھاتا اس کا خدا کے رزق میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

محنت کے معاوضہ کی کیا صورت ہوگی

عزیزانِ من! معاوضہ محنت کا ہے۔ یہ جسے آپ Capital System (نظام سرمایہ داری) کہتے ہیں' اس کی بنیاد اس پہ ہے کہ معاوضہ سرمائے کا ہوتا ہے' محنت کا نہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان کے سامنے صرف وہ چیز ہوگی جس کے لیے ماسعیٰ ہے یعنی جس کے لیے اس نے محنت کی ہے' اس آیت (79:35) کے دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ اس میں پھر انسان کے سامنے وہ چیزیں آجائیں گی جس کے لیے اس نے کوشش کی تھی۔ اگر اس آیت کو ماضی کے معنی میں لینا ہو تو' یہ آسکتا ہے کہ جس کے لیے اس نے کوشش کی تھی۔ دراصل بات وہی ہے یعنی محنت کا ماحصل اس کا معاوضہ ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محنت کا معاوضہ بھی نہیں کہنا چاہیے۔ معاوضہ تو کوئی دوسرا Determine (متعین) کرتا ہے جیسے مزدور کو کتنی مزدوری دینی چاہیے' یہ کارخانے کا جو مالک ہے وہ متعین کرتا ہے' یہ مزدور اپنے لیے متعین نہیں کرتا کہ میرا گزارہ اتنے میں ہوگا اور مجھے اتنا دیجیے۔ وہ تو بحث ہی نہیں ہوتی' اسی لیے میں نے عرض کیا ہے کہ معاوضہ Wages (اجرت) ہوتے ہیں جو یہ لوگ Determine (متعین) کرتے ہیں۔ جو اس کی محنت کا ماحصل ہے' جو اس محنت کی پیداوار ہے اس کا حقدار یہ مزدور ہے' یہ محنت کرنے والا ہے۔ بہرحال' اس انقلاب کے متعلق ایک ہی حوالہ اور لے لیجیے کافی ہوجائے گا۔ حضرتِ

---

❶ اس انقلاب سے ایسا معاشرہ قائم ہوجائے گا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کی محنت کو غصب نہیں کرسکے گا۔ ہر شخص اپنی سعی و عمل کا ماحصل اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ اس میں کسی کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ (73-56:63; 53:39)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسی جدوجہد' اسی قسم کے نتائج...... خدائی پیمانے (Measure) کے مطابق' معاوضہ (Reward) صرف محنت کا ہوگا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

موسیٰ علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ' وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے (20:24)۔ وہ کہہ رہا ہے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ❶ (79:24)۔ حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ وہ انسانوں کے رزق پر قابض ہو کر بیٹھ گیا ہے' جاؤ وہاں (20:24)۔ کاہے کے لیے؟ عجیب بات ہے! وہ تو سورۃ طٰہٰ میں آپ دیکھیے گا' بڑے دلکش انداز میں یہ داستان چلی آ رہی ہے۔ ❷ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جاؤ' تمہیں ایک پروگرام کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے (20:13) اور وہ پروگرام یہ ہے اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا (20:15) وہ جو انقلاب آ رہا تھا' وہ اس وقت تک' جسے کہتے ہیں Under ground (زیر زمین) تھا' غیر محسوس طور پر آ رہا تھا۔ دیکھیے کیا اندازِ قرآن ہے! کہ جو انقلابات آتے ہیں' جن کی تیاریاں ہوتی ہیں وہ تو یہ کہتا ہے کہ جب تک ذہنیت نہیں بدلے گی باہر کی دنیا میں تبدیلی نہیں آئے گی' تو ذہنیت بدلنے میں بھی وہ انقلاب اپنے مراحل طے کر رہا ہوتا ہے' وہ غیر محسوس ہوتے ہیں۔ کہا کہ ''وہ انقلاب جو غیر محسوس طور پر آ رہا تھا' ہم یہ چاہتے ہیں کہ اب وہ نمودار ہو جائے' اب وہ محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔'' سوال یہ ہے کہ یہ کاہے کے لیے ہو؟ یہ ہے وہ بات جو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ انقلاب کاہے کے لیے ہو؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے ٹکراؤ کا مقصد

عزیزانِ من! اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سلطنت چھین کر اس کی جگہ خود وہاں جابر بن کر بیٹھ جائے تو اُس انقلاب کا قطعی طور پر یہ مقصد ہی نہیں۔ وہ انقلاب تو اس مقصد کے لیے ہے کہ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (20:15) تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا ماحصل مل جائے۔ یہ ہے اس کا مطلب۔ اتنے بڑے جلیل القدر نبی' صاحبِ ضربِ کلیم اور اتنا عظیم انقلاب! یہ جو واقعہ ہوا تھا وہ تاریخ میں منفرد انقلاب ہے' اتنا بڑا وہ طاغی اور اتنا بڑا سرکش تھا اور اپنے آپ کو اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) کہنے والا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔ کس کے لیے تھا یہ سب کچھ؟ تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا ماحصل مل جائے۔ یہ ہے انقلابِ قرآنی کا مقصد۔ یہی ہے يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (79:35) تاکہ اس انقلاب کے بعد محنت کا ماحصل اُسی کے لیے ہو جس نے محنت کی ہے' کوئی دوسرا اُسے غصب نہ کر سکے۔ یہ نہ ہو کہ دانہ ایں می کارد آں حاصل برد۔ کاشت یہ کرتا ہے فصل وہ اٹھا کر لے جاتا ہے۔ امتے برامتے دیگر چرد' ایک قوم دوسرے کی کھیتی سے چرتی ہے' یہ کاشت کرتا ہے وہ فصل اٹھا کر لے جاتا ہے' یہ نہ ہو۔ یہ ہے يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ❸ (79:35)

---

❶ تمہاری پرورش میں کرتا ہوں (کھانے پینے کو دیتا ہوں۔ میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں) اس لیے سب سے بڑا رب میں ہی ہوں (یہ جو موسیٰ کہتا ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا خدا ہے' یہ غلط ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ملاحظہ کیجیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق' (مدیر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005۔

❸ اس انقلاب سے ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کی محنت کو غصب نہیں کر سکے گا۔ ہر شخص اپنی سعی و عمل کا ماحصل اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ اس میں کسی کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ (53:39;56:63-73) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جب تقسیمِ رزق اس طرح ہوگی تو پھر اس کا کیا ہوگا جو محنت نہ کرنے والا سرمایہ دار ہے' اس کی کیا صورت ہوگی؟

قوموں کی جہنمی زندگی کی نشان دہی

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ❶ (79:36)۔ یہ آیت کئی دفعہ سامنے آئی ہے' اور آج یہ اپنے مقام پہ سامنے آئی ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہوا ہے کہ جہنم آج بھی تم سے دُور نہیں ہے۔ وہ تو لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ❷ (29:54) ہے۔ وہ اس وقت بھی گھیرے ہوئے ہے' وہ تمہیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہے' صرف تم اس کو نہیں دیکھ رہے (79:36)۔ قرآن کی رو سے جنت اور جہنم کا تصور ہی کچھ اور ہے۔ اس وقت کے متعلق قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ اب بھی دیکھ رہی ہے' صرف تم اس کو نہیں دیکھ رہے۔ کہا کہ جب اس قسم کا انقلاب آئے گا' اس کے لیے لفظ ہے: ''وَبُرِّزَتْ''۔ یہ بارز اور مضمر ہے۔ گرامر جاننے والے شاید جانتے ہیں کہ ضمیر بارز ہوتی ہے اور مضمر ہوتی ہے۔ بارز کے معنی ہوتے ہیں کہ ''جو شے پہلے چھپی ہوئی ہو' وہ نمودار ہو جاتی ہے۔'' یہاں کہا ہے: بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ (79:36) یعنی جحیم تو موجود تھی' مگر وہ مضمر تھی' چھپی ہوئی تھی' نگاہوں کے سامنے نہیں تھی۔ وہ نمودار ہو جاتی ہے لیکن نمودار بھی ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ہوتی ہے جو لِمَنْ يَّرٰى (79:36) دیدہ بینا ہے۔ صرف دیکھنے والے کے لیے ایسا ہوتا ہے:

آنکھ والا تیرے جلوے کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے' نظر کیا دیکھے

قوموں کی جہنمی زندگی کی نشان دہی

یہ لِمَنْ يَّرٰى ہے یہ اس کے لیے ہے جو دیکھنے والی آنکھ رکھتا ہے۔ جحیم کا لفظ آپ کو معلوم ہے: جہاں کسی کی رفتار رک جائے' جہاں وہ کھڑا ہو جائے' یہ ہے جہنم اور یہ ہے جحیم۔ زندگی ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہ تو مسلسل چلتے رہنے کا نام ہے' حرکت کا نام زندگی ہے۔ حرکت رکی ہے تو مردہ ہے۔ قرآن کی رو سے وہ مقام جہاں کسی فرد یا کسی قوم کی حرکت رک جائے' وہ چلنے کے قابل نہ ہو' روک پیدا ہو جائے' اسے جحیم کہا جاتا ہے۔ تو اب قوموں کے لیے جہنم یہ ہوئی کہ جہاں کوئی قوم رکی ہوئی ہو۔

عزیزانِ من! جہاں کسی قوم کے بلند ہونے کا معیار ہی یہ ہو کہ وہ صرف وہی کرے جو ان کے باپ دادا نے کیا تھا' وہ صرف اسی

---

❶ اس وقت جہنم ابھر کر سامنے آ جائے گا لیکن صرف دیدۂ بینا کے لیے۔ یعنی اس کے لیے جس میں حقائق کے مشاہدہ کی صلاحیت ہو۔ (جہنم تو آج بھی موجود ہے لیکن غیر مرئی (Unseen) ہے۔ اُس وقت وہ ابھر کر سامنے آ جائے گا۔) (29:54; 39:48; 82:16)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ کافروں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

مسلک پر رہے جو سلفِ صالحین کا ہے' تو انجام ظاہر ہے۔ یہ رکے ہوئے ہیں' اسی پہ کھڑے ہیں۔ قومیں آگے بڑھ رہی ہیں' وہ آسمان پہ پہنچ رہے ہیں' یہ ٹی وی کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے رویتِ ہلال ہے' چاند دیکھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہلال کا دیکھنا ہے اور دیکھنا کیا ہے؟ ٹیلیفون سے سنتے ہیں کہ بنوں ❶ سے اطلاع آئی ہے۔ نام تو میں نہیں لے رہا۔ یہ رویتِ ہلال کمیٹی ہے' جس کے ممبران نے کبھی ہلال دیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر بحثیں چلتی ہیں۔ ایکطرف یہ ہے کہ اپنا اپنا مسئلہ ہے کہ جہاں کے لوگ ہیں وہاں نظر آئے تو پھر ان کے ہاں کی عید ہے۔ دوسری طرف یہ ہے کہ اُن کے ہاں شکا گو سے بھی اگر ٹیلیفون آ جاتا ہے تو اطلاع ہو جاتی ہے کہ جی عید ہو گئی۔ مسئلہ اپنا اپنا بھی ہے۔

عزیزانِ من! جب قومیں سوچنا چھوڑ دیں تو پھر وہ یہاں پہنچ جاتی ہیں' ورنہ یہ کوئی ایسے فلسفیانہ مضامین نہیں ہیں کہ اِن کے لیے ارسطو(322-384ق م) کے دماغ کی ضرورت ہے کہ جب تم کہتے ہو کہ مسئلہ اپنا اپنا ہے تو پھر سیدھی بات ہے: لاہور میں بیٹھے ہو' یہاں چاند نظر آیا ہے۔ مگر مسئلہ اپنا اپنا بھی ہے۔ یہ حدیث شریف بھی اپنے مسلک کے مطابق کوٹ (Quote) کر دیں گے' ان کو اطلاع خواہ شکا گو سے ملے یا بنوں سے' کہیں سے ان کو ٹیلیفون سے اطلاع مل جائے۔ رویتِ ہلال ہے اور ٹیلیفون کے اوپر فیصلہ ہو رہا ہے۔ مجھے ان پہ تنقید کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا یہ میدان (Field of Specialization) نہیں ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جب انسان کسی مقام پہ عقل وفکر اور سوچ چھوڑ دے اور کھڑا ہو جائے تو پھر اس کی یہ صورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے سند کیا ہے جو تم کر رہے ہو؟ کہ جی فلاں تفسیر میں یہ آیا ہے' فلاں حدیث میں یہ آیا ہے' فلاں امام نے یہ کہا ہے۔ یہ ان کا تھا جو کچھ کہا ہوا ہے۔ یہ رکے ہوئے ہیں' کھڑے ہیں' پھر کچھ نہیں سوچا جا سکتا۔ جحیم یہ ہے اور اس کے اندر ایک اور بڑی عجیب بات ہے **بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى** (79:36) یہ دیکھنے والے کے لیے ہے۔ قرآن تو ان کے بھی سامنے ہے' الفاظ بھی ہیں' عربی زبان بھی جانتے ہیں' اور عربی تو پھر ان کی مادری زبان بھی ہے۔ یہ تو سارا کچھ ہے پھر کیا بات ہے جو انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ یہ "لمن یرٰی" ہے' یہ دیدہ بینا کے لیے ہے۔ یہ آنکھ کا نور ہے' دل کا نور نہیں ہے۔ جس کو یہ Eye sight (بینائی) کہتے ہیں' یہ اس سے نہیں ہے۔ بصیرت اور چیز ہوتی ہے اور بصارت اور۔ برادرانِ عزیز! میں پھر وہی کہوں گا کہ وقت تھوڑا ہے' زندگی کا کچھ پتہ نہیں ورنہ قرآن کا تو ایک ایک لفظ' انسان کا دامن پکڑ لیتا ہے۔

الجحیم کہاں واقع ہے

یہاں الجحیم (79:36) کہا ہے۔ اس سے کیا چیز نمودار ہو کر سامنے آئے گی؟ ان کے ذہن میں تو یہ ہے کہ یہ بہت بڑا بھڑکنے والا تنور ہے' اس میں لکڑیاں ہیں' اس میں شعلے اٹھ رہے ہیں' وہ سامنے آئے گا۔ یہاں جحیم سامنے آئے گی۔ (39:48) نکالیے۔ یہ بڑی اہم آیت

---

❶ یہ پاکستان کے صوبہ سرحد (NWFP) کے ایک ضلع کا نام ہے۔

ہے۔اس آیت کا جو بیشتر حصہ ہے وہ چھپا کر رکھا جاتا ہے۔اس کے نتائج بھی غیر محسوس طور پر ان کے ہاں مرتب ہوتے جاتے ہیں۔اس کی ذات پر ان کا اثر ہوتا ہے' وہ ان کو دیکھ نہیں سکتے۔اس دن' جس دن یہ چیز' یہ نتائج سامنے آتے ہیں' یہ وہاں ''برزت الجحیم'' ہے۔یہاں ہے کہ وَبَدَالَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ❶ (39:48) جو کچھ انہوں نے کیا تھا' اس کی ناہمواریاں ہی نمودار ہو کر سامنے آ جائیں گی۔ یہی جحیم ہے یعنی اپنے اعمال نے جو ناہمواریاں پیدا کی تھیں' جو غلط نقش اس کے اوپر مرتسم ہوئے تھے' جو ان کی ذات پہ ان کے اثرات مرتب ہوئے تھے' جو یہ نہیں دیکھ رہے تھے۔یہ جحیم کا نمودار ہونا ہے اس لیے کہا کہ وَبَدَالَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُ وْنَ (39:48) اور جن نتائج کے متعلق یہ مذاق اڑاتے تھے کہ کہاں کا عذاب' کہاں کی یہ جزا اور سزا' وہ ان کو چاروں طرف سے گھیر لے گا' تو یہی تو جحیم ہے۔ وَبَدَالَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا (39:48) ان کے اپنے اعمال کی پیدا کردہ ناہمواریاں ابھر کر سامنے آ جائیں گی۔یہی ہے وہ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ❷ (79:35)۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى o وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا o فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِىَ الْمَاْوٰى ❸ (79:37-39)۔یہاں پہلی آیت میں طغٰی کا لفظ آیا ہے۔کچھ حدود ہیں جو قرآن مقرر کرتا ہے کہ ان سے آگے نہ بڑھنا' مگر وہ آئندہ زندگی کے مفاد پر' یہاں کی طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ❹ (2:187)۔ان حدود اللہ سے سرکشی نہ اختیار کرنا۔قوانینِ خداوندی سے یہ سرکشی کیا ہے؟ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ❺ (79:38)۔اس آیت کی کیا بات ہے صاحب! وہ آئندہ زندگی کے مفاد پر' یہاں کی طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔لیکن قرآن کی رو سے اس دنیا کی زندگی ایسی نہیں کہ اس کو ترک کر دینا چاہیے کہ یہ قابلِ نفرت ہے۔''اثر'' Priority (ترجیح) کی بات ہے' دو چیزوں میں ٹکراؤ ہو۔ایک طرف اتنا کچھ' اتنا روپیہ' مل رہا ہو اور دوسری طرف یہ ہو کہ یہ قانونِ خداوندی کی رو سے ناجائز ہے' اب اس میں وہ کس بات کو ترجیح دیتا ہے۔ خدا کے اس قانون اور حکم کو ترجیح دیتا ہے یا اس ہزار روپے کو ترجیح دیتا ہے' دونوں میں کس کو وہ ترجیح دیتا ہے؟ زندگی کے اندر سارا ٹکراؤ ہی یہ ہے۔غلط اور صحیح' حق اور باطل کا ٹکراؤ ہی یہ ہے کہ اس ٹکراؤ میں تم کس چیز کو ترجیح دیتے ہو۔ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا میں جامع طور پہ کہہ دیا کہ

---

❶ ان کے اپنے اعمال کی پیدا کردہ ناہمواریاں اُبھر کر ان کے سامنے آ جائیں گی۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ اس وقت جہنم ابھر کر سامنے آ جائے گا لیکن صرف دیدہ بینا کے لیے۔یعنی اس کے لیے جس میں حقائق سے مشاہدہ کی صلاحیت ہو۔(جہنم تو آج بھی موجود ہے لیکن غیر مرئی (Unseen) ہے۔اس وقت یہ ابھر کر سامنے آ جائے گا۔) (29:54;39:48;83:16) (ایضاً)

❸ یاد رکھو! جو شخص ہمارے قوانین ربوبیت سے سرکشی برتتا ہے اور طبعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد (Immediate Gain) کو مستقبل کی خوش گواریوں پر ترجیح دیتا ہے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ (ایضاً)

❹ یہ ہیں وہ حدود جو قانونِ خداوندی نے مقرر کر دی ہیں۔ان کی نگہداشت کرو۔ (ایضاً)

❺ وہ طبعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد کو مستقبل کی خوشگواریوں پر ترجیح دیتا ہے۔ (ایضاً)

جہاں طبعی مفاد اور اقدارِ خداوندی میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے اس میں یہ شخص اقدارِ خداوندی پر مفادِ طبعی کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ ہے وہ سیات، یہ ہے وہ جس کی وجہ سے جحیم کے اندر ہے۔ اسی لیے کہا کہ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (79:39) اس کا ٹھکانہ جحیم ہے، وہ مقام جس میں انسانیت کی نشو ونما رُک جاتی ہے۔ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى لا o فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (79:40-41) [1]۔ اس سے پہلی آیت یعنی (79:37) میں بھی 'طَغٰى' تھا، قوانینِ ربوبیت سے سرکشی تھی۔ اب اس کے مقابل میں دوسرے لوگ آ گئے، وہ آگے بڑھ گئے، یہاں لفظ ہے 'نَهٰى' کا۔ اور کہا ہے کہ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ (79:40) [2] کیا بات ہے! یہ جو عام طور پہ کہتے ہیں کہ وہ چیز جو جرم سے باز رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ میں پکڑا جاؤنگا اور عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو جاؤنگا، پھر وہاں سے وہ سزا کا حکم ملے گا۔ وہ جو عدالت میں کھڑے ہونا ہے، وہ یہ ہے خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ۔

ھویٰ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! جسے یہ خیال رہے کہ میں نے عدالت خداوندی میں کھڑے ہونا ہے، یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ کیا کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (79:40) وہ ہر اُس چیز سے اپنے آپ کو باز رکھتا ہے جو قوانین خداوندی کے خلاف جائے۔ یہ ھویٰ عجیب لفظ ہے۔ قرآن میں ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ o ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:4-5) ہم نے تو انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا تھا، بلندیوں کے لیے پیدا کیا تھا، یہ کم بخت اپنے آپ کو پست سے پست تر مقام کی طرف لے جاتا ہے، بلندیوں کی بجائے نیچے کی طرف لے جاتا ہے۔ عربی زبان میں ''ھویٰ'' اس چیز کو کہتے ہیں جو نیچے کی طرف لے جائے۔ پہاڑ کی چوٹی سے اگر کسی پتھر کو چھوڑا جائے تو وہ اپنے Momentum [3] (معیارِ حرکت) سے ہی، تیز تر، نیچے چلا آتا ہے۔ یہ ہوتا ہے جس کو ھویٰ کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اس پستی سے وہی بچا جس نے اپنے آپ کو ان چیزوں سے روکے رکھا، جو اس کو پستیوں کی طرف لے جانے والی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ احکام و اقدارِ خداوندی کے اتباع سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ کہا کہ ارتقا حاصل ہوتا ہے، انسانیت بلندیوں کی طرف جاتی ہے۔ اب اگلا سوال یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دینے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ کہا کہ انسانیت پستیوں کی طرف آ جاتی ہے، ایک فرد کی ذات

---

[1] جو شخص اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ اس نے ایک دن عدالت خداوندی میں کھڑے ہونا ہے۔ یعنی اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آنے ہیں اور اس احساس کے ماتحت، وہ اپنے ان جذبات اور خواہشات کو بے باک ہونے سے روکتا ہے، جو قوانین خداوندی کے خلاف جائیں۔ تو یہ وہ ہے جس کا مقام جنت ہے...... اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] جو شخص اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ اس نے ایک دن عدالت خداوندی میں کھڑے ہونا ہے یعنی اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آتے ہیں۔ (ایضاً)

[3] Force of motion or force gained through movement or progression

بھی پستیوں کی طرف آتی ہے۔ معاشرہ بھی' اقوام بھی' اور انسانیت بھی پستیوں کی طرف آتی ہے۔ یہ **نھی النفس** کیا بات ہے!

عربی زبان کی رفعتِ پرواز اور اس کی عظمت

عزیزانِ من! اے کاش! میرے پاس اور وقت ہوتا۔ اس ''نَھْـــی'' لفظ کے معنی تو ہوتا ہے: جو شخص روک دیتا ہے۔ ہم یہی معنی کرتے ہیں' لیکن یہ عرب قوم جب یہ زبان بنا رہی تھی تو میں کہتا ہوں کہ ہم تو وجد میں آ جاتے ہیں: ان پڑھ قوم ہے' دنیا کا تاریک ترین خطہ ہے اور زبان بنانے میں اس کی یہ کیفیت ہے۔ ان کے ہاں وحی تو تھی نہیں۔ وحی کی عدم موجودگی میں کیا چیز تھی جو غلط چیزوں سے روکتی تھی۔ وہ ایک چیز جو انسان کو اندر سے (From Within) روکنے والی ہے اس کا نام انہوں نے ''عقل'' رکھا تھا۔ عقل کے معنی ہی ہیں: ''روکنے والی چیز' جس سے کسی چیز کو باندھ دیں۔'' آپ کو معلوم ہے کہ اونٹ کو باندھنے کے لیے ہر جگہ کھونٹے تو ہوتے نہیں تھے کہ وہ کسی رسی سے اُسے باندھ دیتے لہٰذا وہ اسے کھڑا کرتے تھے اور پھر اس کا پاؤں اٹھا کر اس کی ران کے ساتھ دہرا کر دیتے تھے اور ایک رسی سے اس کو باندھ دیتے تھے۔ یہ رسی ''عقال'' کہلاتی تھی۔ یہ لفظ عقل سے ہے۔ یہ عجیب قوم تھی' اور کیا بات ہے عقل کی! یہ جو عربوں کے ہاں آپ نے سر کے اوپر لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ایک رسہ سا لپیٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس کو ''عقال'' کہتے ہیں۔ وہ اس کپڑے کو باندھ دیتا ہے کہ گر نہ جائے۔ تو وہ چیز جو انسان کو غلط راستے سے روکتی تھی' اس کا نام ''عقل'' بھی تھا اور ''نھی'' بھی اس کا نام تھا۔ یہ جس کو **نھی** کہتے ہیں' اس کے معنی باندھ دینا ہوتا تھا' اس کے معنی روکنا تھا' دونوں کے معنی عقل تھی۔ یہ قوم اس زمانے میں کہ جب کسی کے ہاں وحی نہ ہو تو پھر عقل سے کام لے وہ بھی کچھ کام دے جائے' جہاں وحی کو طاقِ نسیا بنا دیا جائے اور عقل کو مردود کہہ دیا جائے تو پھر **ثُــمَّ رَدَدْنٰــــهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ** ❶ (95:5)۔ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! اب اس آیت کو دیکھیے: **وَ نَهَـى الـنَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى** (79:40) وہ اپنے ان جذبات اور خواہشات کو بیباک ہونے سے روکتا ہے جو قوانین خداوندی کے خلاف جائیں۔ اس میں دیکھیے کہ نھی کا یہ لفظ کہاں ہے۔ اس لیے **فَـاِنَّ الْـجَـنَّةَ هِـیَ الْـمَـاْوٰى** (79:41) اس کا مقام وہ جنت ہے۔ یہ الجحیم یعنی جہنم کے بالمقابل الجنۃ کا لفظ آیا ہے۔ اس انقلاب کے متعلق' یہ کچھ سننے کے بعد' قرآن کہتا ہے کہ **يَسْـئَـلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا** (79:42) وہ پوچھتے ہیں کہ اس انقلاب کی وہ کشتی کب لنگر انداز ہوگی؟ یہ نہیں کہا کہ وہ انقلاب کب آئے گا۔ کیا بات ہے اس میں' یعنی وہ انقلاب چلا تو آ رہا ہے' وہ پوچھتے یہ ہیں کہ یہ کشتی کہاں لنگر انداز

---

❶ پھر اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اُسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ (آسمانی انقلاب' اسے اُس پستی سے اٹھا کر' انسانیت کی بلند سطح پر لانا چاہتا ہے لیکن یہ بات مفاد پرستوں کی مصلحتوں کے خلاف جاتی ہے اس لیے ان دونوں میں تصادم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس انقلاب کی رو سے' انسانوں کی ایک جماعت شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہے' لیکن اس کے بعد ان کی نسلیں' آہستہ آہستہ' دین میں آمیزش کرنے لگ جاتی ہیں اور اس طرح پھر سے حیوانیت کی اُسی پست ترین سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوگی' یہ کشتی کب لنگر انداز ہوگی؟ انقلاب' یک لخت نمودار نہیں ہو جاتا' وہ آہستہ آہستہ مرتب ہو رہا ہوتا ہے' وہ پاؤں پاؤں چل رہا ہوتا ہے' وہ کشتی تیرتی ہوئی آ رہی ہوتی ہے' جہاں آ کے وہ رک جاتی ہے' لنگر انداز ہو جاتی ہے' اس کا نام ہم انقلاب رکھتے ہیں کہ وہ محسوس طور پر ہمارے سامنے آ تا ہے' ورنہ وہ بہت پہلے سے چلا ہوا ہوتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ یہ پوچھتے یہی ہیں کہ اس انقلاب کی کشتی کب لنگر انداز ہوگی؟ کہا کہ فِيمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (79:43) ❶ تمہیں اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ کب آئے گی؟

آپ کو یاد ہے کئی ایک مقامات میں قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ نے یہ عرض کیا تھا کہ بارِالٰہی! میری ساری زندگی اسی تگ و تاز اور مصائب اور مشکلات کو برداشت کرتے گزر جائے گی یا میری آنکھوں کے سامنے وہ انقلاب آ بھی جائے گا جس کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں؟ تو یہ کہا تھا کہ یہ تیرا کام نہیں ہے' بہرحال' اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) تیرے ذمہ اس پیغام کو پہنچاتے چلے جانا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ انقلاب کب آئے گا' یہ ہم اپنے حساب و قانون کی رو سے جانتے ہیں۔ تیرا یہ فرض نہیں ہے۔ عزیزانِ من! حضور ﷺ کو بھی نہیں بتایا۔ کہا یہ کہ فِيمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (79:43)۔ تیرا فریضہ اور منصب یہ نہیں ہے۔ تو اس پروگرام میں تگ و تاز کرتا چلا جا اور اس کے بعد کہا کہ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (79:44) ❷۔ یہاں یہی منتہیٰ کا لفظ آیا ہے جو "نھی" سے ہے' جہاں آ کے رُکنا ہے۔ جہاں اس نے رُکنا ہے اس کا علم تیرے خدا کے پاس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کہاں اس کشتی نے لنگر انداز ہونا ہے۔ اس کا نام انقلابِ محسوس ہوگا جس کو دنیا دیکھے گی کہ اب انقلاب آیا ہے۔ اس سے پہلے تمہیں بھی اس کے متعلق متعین طور پر معلوم نہیں ہوتا۔

قربِ قیامت کے پوسٹر

عزیزانِ من! یہاں قربِ قیامت کی نشانیاں بڑے بڑے پوسٹروں میں لگائی جاتی ہیں۔ وہ پوسٹر لگ جاتا ہے اور پھر پھٹ جاتا ہے۔ اب تو وہ سلسلہ بند ہو گیا' یہ کچھ کرتے کرتے تھک گئے ہیں ورنہ اس سے پہلے ہمارے بچپن میں ہر سال ایک پوسٹر لگا کرتا تھا۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (79:44) اس کے وقت کا تعین صرف خدا سے متعلق ہے۔ اسی کو اس کا علم ہے۔ اور رسول ﷺ سے کہا کہ کہو کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (79:45) تم تو صرف اِس بات کے آگاہ کرنے والے ہو کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ تمہارا کام یہی ہے۔ یہ وہی ہے جو کہا تھا کہ اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) تمہارے ذمہ اس کا پہنچاتے چلے جانا ہے اور ہمارے ذمہ یہ بات ہے کہ یہ کب نمودار ہوگا۔ اس لیے ہم بھی جو یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! یہ کچھ کب آئے گا؟ ہمیں

---

❷ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ یہ میرے حیطہ علم کی بات نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کب واقع ہوگا۔ (7:187; 33:63) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ اس کے وقت کا تعین' صرف خدا سے متعلق ہے۔ اُسی کو اس کا علم ہے۔ یہ تمام باتیں' انجام کار' اُسی کے قانونِ مشیت کے مطابق طے ہوں گی (53:42)۔ (ایضاً)

بھی یہی جواب ملے گا جو رسول اللہ ﷺ کو ملا ہے کہ تم اس کے لیے کوشش کرتے چلے جاؤ۔ کب آئے گا؟ یہ تمہارا ذمہ نہیں ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کب آئے گا' اس وقت تم اس انقلاب کے لیے جلدی کیوں مچا رہے ہو۔ اس لیے کہ **كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا** (79:46) جب وہ آئے گا تو یہ آہ و پکار کریں گے کہ ہمیں مہلت کا وقفہ بہت کم ملا...... یونہی ایک صبح یا ایک شام جتنا۔ اب یہ ہیں کہ جو اس وقت اتنی اتنی لمبی چیزیں اپنے ذہن میں رکھے بیٹھے ہیں۔ اُس وقت ان کو ایسے معلوم ہوگا کہ یہ زندگی جو ہم نے گزاری ہے' یونہی صبح و شام کی زندگی تھی' اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ ان کے ہوش حواس اڑ جائیں گے' یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ زندگی کتنی تھی؟ کیا کیا؟ کچھ اس میں ہوا تھا؟ کیا کچھ چھوڑا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ انقلاب تو اتنا پریشاں کن ہوگا' اس میں حواس باختہ ہو جائیں گے۔ ان سے کہو کہ کیوں بار بار اس کے آنے کے لیے تم اس طرح سے' منتیں مانگ رہے ہو' کوششیں کر رہے ہو' جیسا انتیس کا عید کا چاند دیکھنا ہوتا ہے۔ وہ عید کا چاند نہیں ہے۔ وہ تو تمہارے لیے ایک تباہی کی آواز ہوگی تو اس کے لیے اس قدر متمنی کیوں ہو رہے ہو؟ اُس وقت تو تم کہو گے کہ اگر زیادہ وقت ملتا تو ہم اپنی روش بدل لیتے! لیکن اس وقت اس شکایت یا تاسف سے کیا حاصل ہوگا؟ کچھ نہیں۔

عزیزانِ من! یہ سورۃ النازعات کی آخری آیت تھی' یہ سورۃ ختم ہوئی۔ اگلے درس میں ہم تیسویں پارے کی سورۃ عبس لیں گے جس کی پہلی ہی آیت عبس وتولیٰ (80:1) ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

آٹھواں باب: سورۃ عبس (آیات 1 قصہ شانِ نزول)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1984ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ عبس سے ہو رہا ہے: (80:1)۔

قرآنِ حکیم کے سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ شانِ نزول کا عقیدہ

عَبَسَ وَتَوَلّٰی o اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (80:1-2) اس نے تیوری چڑھائی، منہ بسورا، اس پر بڑا ناگوار گزرا کہ اس کے پاس ایک غریب اندھا کیوں آ گیا۔ یہ بات اتنی سی ہے۔ اس کی تشریح میں بعد میں کرونگا، ضمناً ایک اہم نکتہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے لیکن اس سلسلے میں خاص طور پر میں اسے دہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآنِ کریم کے راستے میں سازشوں سے جو رکاوٹیں پیدا کی گئیں، ان میں ایک عقیدہ شانِ نزول کا بھی ہے۔ آپ کوئی سا ترجمہ یا کم از کم تفسیری ترجمہ دیکھ لیں تو وہاں لکھا ہوا ملے گا کہ اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے اور اس حکم کی شانِ نزول یہ ہے۔

یہ شانِ نزول کیا چیز ہے؟ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے راستے میں جو بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑی رکاوٹ شانِ نزول کا عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق وحی کا سلسلہ قرآن پہ ختم ہوا، نبوت نبی اکرم ﷺ کی ذات پر ختم ہوئی، خدا نے قرآن میں دین کو مکمل کر دیا، تمام نوعِ انسانی کے لیے ابدی طور پر یعنی قیامت تک کے لیے دین میں راہنمائی دے دی، تکمیل دین بھی ایسی کی کہ کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ناقص، ناتمام یا تشنہ رہ گیا ہو یا یہ کسی خاص زمانے تک محدود رہ گیا ہو، بلکہ اس کے برعکس قیامت تک کے لیے نوعِ انسانی کے سامنے جو Problems (مسائل) آنی تھیں، ان کے متعلق قرآن میں راہنمائی دے دی گئی، اور مشیت نے جب یہ دیکھا کہ اب اس کے بعد کسی مزید حکم، قانون، اصول، قدر، یا راہنمائی کی ضرورت نہیں ہے تو اس سلسلے کو ختم کر دیا۔ تو گویا مشیت کے ایک پروگرام کے مطابق یہ ضابطہ ہدایت نازل ہوا، خدا کی طرف سے مکمل کیا گیا۔ اسی مشیت کے مطابق جو کچھ خدا نے دینا تھا وہ اس میں دیدیا۔ اسے پھر سمجھ لیجیے کہ خدا نے جو کچھ نوعِ انسانی کو قیامت تک کے لیے دینا تھا، وہ اسکے اندر دیدیا لیکن ہمارے ہاں شانِ نزول کے معنیٰ، یا جو عقیدہ پیدا کیا گیا، وہ یہ ہے کہ فلاں واقعہ اس طرح سے ہوا تھا اور فلاں نے فلاں کے ساتھ یہ کیا تھا تو اس پہ یہ آیت

نازل ہوئی۔ مثلاً یہ کہ بیبیاں بلا حجاب باہر نکلا کرتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45A.D) نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ اس طرح فتنہ پرور لوگوں کو فتنہ برپا کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے' ان کو باپردہ نکلنا چاہیے۔ رسول اللہ نے ان کی شکایت سنی تو اس پر خدا کی طرف سے پردے کے احکام نازل ہوئے۔ میں نے یہ ایک مثال دی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کی ان چیزوں میں اکثر یہ ہوگا کہ اِس آیت کی شانِ نزول یہ ہے اور اس کی شانِ نزول وہ ہے۔

وحی واقعات کی رہین منت نہیں ہوتی

عزیزانِ من! ذرا غور سے سمجھ لیجیے۔ یہ باتیں آخری بار' آخری پارے میں' آ رہی ہیں' آپ کے کام آئیں گی۔ بات یوں ہوئی کہ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو یہ آیت نہ اترتی۔ یعنی پھر قرآن میں اللہ تعالیٰ کے کسی خاص پروگرام کے تحت راہنمائی نہیں دی بلکہ دنیا میں انسانوں نے آپس میں واقعات کیے تو ان واقعات کی وجہ سے خدا کی طرف سے ایک حکم آ گیا۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو یہ حکم بھی نہ آتا۔ پھر سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم کا ضابطۂ مشیت کے کسی پروگرام کے مطابق' اس طرح سے مرتب ہو کر وحی نہیں ہوا بلکہ لوگوں نے مجبور کر دیا کہ اس واقعہ کی وجہ سے ایک وحی اس کے مطابق اترا کرے' وہ واقعہ نہ ہوتا تو وہ وحی بھی نہ آتی۔ قرآن نے اس واقعہ کے مطابق انسانوں کو جو راہنمائی دینی تھی وہ دے دی۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے جتنے بھی امم سابقہ کے' انبیائے گزشتہ کے خود واقعات بیان کیے ہیں ان کا مقصد وقائع نگاری نہیں ہے بلکہ ان کے ضمن میں' ان پر مبنی' وہ ابدی احکام دیئے ہیں' ہدایات دی ہیں' اقدار دی ہیں' جو دین کا مقصد تھا اور یہ سارا قرآن نے خود کر دیا ہے' وہ واقعات بھی بیان کر دیئے' ان امتوں کے احوال وکوائف بھی بیان کر دیئے' انبیاء کی سرگزشتیں بھی دیدیں' اس لیے کہ ان کے ساتھ یہ سارے احکام واقدار وابستہ تھیں۔ وہ مکمل کر دیا۔ اب جہاں قرآن نے خود کسی چیز کے متعلق کچھ نہیں کہا وہ ان لوگوں نے پورا کیا کہ یہ واقعہ ہوا تھا اس لیے یہ حکم نازل ہوا۔

عزیزانِ من! اسے پھر دہرادوں کہ بقول ان کے اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو یہ حکم ہی نہ آتا۔ تو قرآن کی راہنمائی یا قرآن کے ان واقعات کے اوپر جو احکام ہیں ان میں جو چیزیں دی گئیں' اگر یہ واقعات نہ ہوتے' تو قرآن آدھا رہ جاتا۔ پھر یہ واقعات نبی اکرم ﷺ کی زندگی تک ہی ہوئے۔ واقعات تو قیامت تک ہوتے رہیں گے' اگر حضور ﷺ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے اور کوئی واقعات ہوتے تو اور بھی احکام آ جاتے' قرآن میں اور اضافہ ہو جاتا' اور یہ بھی کہ حضور ﷺ کے بعد قیامت تک واقعات تو ہوتے رہیں گے۔ نبوت ختم ہو گئی اور جو چیزیں خدا کی طرف سے وحی کے نزول کا موجب بنا کرتی تھیں وہ واقعات تو ہوتے رہیں گے مگر اب ان کے مطابق وحی کی راہنمائی نہیں آئے گی کیونکہ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تو اب کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔

شانِ نزول کے واقعات ڈھائی سو سال کے بعد اکٹھے کیے گئے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدے نے قرآن، وحی، وحی کا مقصد، دین کی اکملیت، ختمِ نبوت، ان تمام کے اوپر کیا اثر مرتب کیا۔ واقعات تو اب بھی ہوتے رہیں گے مگر اب وحی نہیں آ سکتی کیونکہ خدا نے نبوت کو ختم کر دیا اور جو چیزیں اس راہنمائی کے نازل ہونے کی موجب ہوتی تھیں وہ واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ تو جو راہنمائی آئی وہ اس خاص واقعہ سے محدود ہو کر رہ گئی۔ اس واقعہ کو سامنے لائیے تو پھر سمجھ میں آئے کہ اس خاص حکم کے معنی کیا ہیں۔ وہ اُس واقعہ کی نسبت سے معنی متعین ہونگے کہ یہ بات انہوں نے کی تھی یا اس کے متعلق یہ وحی آئی ہے۔ قرآن تو ان واقعات پر محصور اور محدود ہو کر رہ گیا، فہمِ قرآن ان واقعات کے اوپر مبنی ہوا اور یہ واقعات قرآن کے اندر درج نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ واقعات کہاں ہیں؟ ڈھائی سو سال بعد کی روایات میں، تین سو سال بعد کی تاریخ میں، وہ بزرگوار بخارا[1] سے تشریف لائے، انہوں نے آ کر یہ روایات جمع کیں، کوئی نیشاپور[2] سے آئے، کوئی ترمذ[3] سے آئے۔ یہ سارے عجم سے آئے۔ اپنے ہاں شانِ نزول کے یہ واقعات انہوں نے دیئے۔ اب جو واقعہ انہوں نے دیدیا، اس آیت کے معنی اس سے متعلق ہو گئے، وہی اس کا مفہوم ہو گیا، قرآن کی ان راہنمائیوں کو ان واقعات کے ساتھ پابند کر دیا جو انہوں نے اپنے ہاں روایات میں درج کیے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کے ساتھ اس ایک عقیدے نے کیا کیا۔ اب اگلی بات یہ رہی کہ یہ عقیدہ کیوں وضع ہوا اور یہ چیزیں کیوں کی گئیں، اس عقیدے کے تحت بڑی بڑی سازشوں کی گنجائش نکل آئی اور پھر اس سے بڑی بڑی سازشیں ہوئیں[4]۔ یوں بات سمجھ میں نہیں آئے گی اس کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

تہمت تراشی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی واضح ہدایات

سورۃ نور میں یعنی (24:11) سے بات شروع ہوتی ہے اور یہ واقعہ عام طور پہ واقعہ افک حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام سے مشہور ہے۔

---

1. یہ اشارہ حضرت امام محمد اسماعیل بخاریؒ (194-256/260ھ) کی طرف ہے۔ ان کا وطن بخارا تھا۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے مکررات حذف کرنے کے بعد 2762 احادیث اپنے مجموعہ صحیح بخاری میں درج ہیں۔
2. یہ شارہ حضرت امام مسلم بن حجاجؒ (204-261ھ) کی طرف ہے۔ ان کا وطن نیشاپور تھا۔ انہوں نے تین لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے 4348 احادیث اپنے مجموعہ صحیح مسلم میں درج کیں۔
3. یہ اشارہ حضرت امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ (209-279ھ) کی طرف ہے۔ ان کا وطن ترمذ تھا۔ انہوں نے بھی تین لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے صرف 3115 احادیث اپنے مجموعہ جامع ترمذی میں درج کیں۔
4. تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص ص 221-242

افک کا معنی ہوتا ہے ''کسی کے خلاف تہمت لگانا'' یہ لفظ آپ نے سنا ہوگا' عام مشہور ہے' اس کو بڑی شہرت دی جاتی ہے۔قرآنِ کریم میں جو آیات ہیں ان میں یوں ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡکِ عُصۡبَۃٌ مِّنۡکُمۡ (24:11) یہ لوگ جنہوں نے یہ تہمت تراشی کی تھی' یہ ایک گروہ تھا' اور وہ جوان کا سرغنہ تھا اُس کے متعلق اسی آیت میں یہ ہے کہ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ (24:11) وہ اوروں سے بھی زیادہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔اب اگلی ہی آیت میں وہ راہنمائی جو قرآن نے دینی تھی' وہ آئی کہ جب کسی کے خلاف کوئی تہمت لے کر آئے' دیگر مقامات میں بھی ہے کہ جب کوئی خبر تم تک لے کر آئے تو اسی وقت اس پہ اعتماد نہ کرلیا کرو' اور نہ ہی اسے آگے پھیلایا کرو' اس کی تحقیق کیا کرو' اور حکومت کے متعلق یہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ جو متعلقہ آفیسر حکومت نے مقرر کیا ہوا ہو' اُسے اس کی طرف ریفر (Refer) کیا کرو کہ وہ اس کی تحقیق کرے' خود بخود اس کو نہیں لے دوڑو' یہ نہ کیا کرو' اس سے معاشرے میں فتنہ پھیلتا ہے۔ یہ احکام قرآن میں موجود ہیں۔اسی سلسلے میں یہاں بھی یہ کہا کہ لَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا (24:12) جب تم نے اس بات کو سنا تھا تو تم نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کا سا طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا اور اپنے لوگوں کے متعلق' جن کے خلاف یہ بات کہی جا رہی تھی' حسنِ ظن سے کام کیوں نہ لیا۔تمہاری طرف سے پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ قَالُوۡا ہٰذَاۤ اِفۡکٌ مُّبِیۡنٌ (24:12) ان لوگوں سے کہہ دیتے کہ یہ تو صریح تہمت نظر آتی ہے۔ یہ تو جیسے[1] On the face of it کہتے ہیں یعنی یہ تو نظر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تہمت تراشی کی گئی ہے' یہ بہتان ہے' یہ صحیح نہیں ہے۔تمہارا ردِ عمل یہ ہونا چاہیے تھا۔اس کے آگے ہے کہ وَ لَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ قُلۡتُمۡ مَّا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَکَلَّمَ بِہٰذَا (24:16) جب تم نے اسے سنا تھا تو تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ ہمارے لیے قطعاً زیبا نہیں ہے کہ ہم یونہی اس چیز کو پھیلا دیں کہ سنی اور لے کر چلے گئے بلکہ سُبۡحٰنَکَ ہٰذَا بُہۡتَانٌ عَظِیۡمٌ (24:16) یوں تو معصوم خدا کی ذات ہے لیکن یہ ایک بہتان نظر آتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ آیات ہیں۔ان میں قرآن نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ وہ خاتون کون تھی جس کے خلاف یہ بہتان تراشی ہوئی۔ یہ کہیں نہیں آیا۔قرآن نے اس میں جو راہنمائی دی ہے اس کے لیے اس بات کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ نام دیئے جاتے اور واقعات کی تفصیل بیان کی جاتی۔اس کا سوال ہی نہیں تھا۔

قرآنِ حکیم میں تہمت تراشی کے سلسلے میں کسی کا نام نہیں آیا

عزیزانِ من! صد ہزار بار افسوس کہ یہاں پھر وہ داستان شروع ہوتی ہے۔آیات میں نے پیش کیں۔آپ کے سامنے اس کا صحیح آسان ترجمہ بھی آ گیا۔ان کی رو سے ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کسی قسم کا کوئی الجھاؤ پیدا ہوتا ہے' نہ کوئی پیچیدگی' نہ کوئی کسی قسم کا ابہام۔

---

[1] نظر بظاہر

قرآن میں تو یہ نام کہیں ہے بھی نہیں، لیکن میں اس لیے بالخصوص یہ عرض کر رہا ہوں کہ بات آگے چلے گی کہ بقول ان کے حضرت عائشہ اتنی بیمار ہو گئیں کہ بالکل قریب المرگ۔ اس کے بعد ایک دن آپ ﷺ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ وحی بھیجی اور اس وحی نے میری عصمت کی گواہی دی۔ اس پہ رسول اللہ ﷺ مطمئن ہوئے اور پھر مجھے گھر لے گئے۔ یہ بڑی تفصیل کیساتھ ہے۔ اس قسم کی سازشیں تو پھر تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔ جب افسانہ ہی مطلوب ہو تو افسانہ کی ہر شق پوری کی جاتی ہے۔

نشتر کی زد میں آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی

آپ سوچیے کہ مقصد تو حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ایک بہتان تراشنا تھا لیکن افسانہ نگار نے یہ نہیں سوچا' یہ لوگ سوچا ہی نہیں کرتے تھے' کہ ؎ ترے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیسا تصور قائم ہوتا ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ پہلا Reaction (ردِّ عمل) یہ ہونا چاہیے تھا کہ نہیں' یہ بہتان ہے' یہ افکِ عظیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں کہا۔ قرآن میں یہ کہا ہے کہ جب اس قسم کی کوئی خبر آئے تو اس کی تحقیق کیا کرو۔ اب یہاں تحقیق نہیں کی جا رہی۔ قرآن نے' تہمت لگانے کے سلسلے میں' اسی سورۃ النور میں' جس کو قذف کہتے ہیں' یہ خود کہا ہے کہ قذف کی صورت ہو' کوئی بہتان تراشی کرے' تو اس سے کہو کہ اس کے لیے چار گواہ لاؤ' اور وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کو سزا دو' یعنی بہتان کے سلسلے میں یہ سارے احکام خود قرآن میں موجود ہیں' مگر یہاں بہتان کا چرچا ہوتا ہے' رسول اللہ ﷺ ان میں سے کسی حکم کی بھی تعمیل نہیں کرتے۔ معاذ اللہ آپ سوچ لیجیے کہ اس کے بعد یہ افسانہ نگار' یہ سازشی' کس نتیجہ پہ پہنچانا چاہتا ہے کہ بیوی کے متعلق ایسا ہی تھا' ذہن میں کسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی' یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ یہ بہتان ہے۔ اف' بقول ان کے بلا تحقیق میکے بھیج دیا۔ چرچا ہوتا رہا۔ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میرے پاس ایک ایک عورت آتی رہی میں سارا مہینہ روتی رہی' رسول اللہ ﷺ نے مہینہ بھر بھی تحقیق نہیں کرائی۔ اس کے بعد بھی میں اس نتیجے پہ نہیں پہنچی کہ میں بری الذمہ ہوں' میں بے گناہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیج کر ان کی بریت کی۔ اب حضور ﷺ کا اسوہ حسنہ ہمارے لیے تو قیامت تک کے لیے ایک ماڈل (نمونہ) ہے۔ اس روایت کی رو سے' ہمارے سامنے کیا اسوہ آتا ہے کہ جب اس قسم کی کوئی بات' اس قسم کی تہمت تراشی کی بات' آئے تو قرآن یہ کچھ کہتا ہے تو کہتا رہے۔ ہمارے لیے سنتِ رسول اللہ ﷺ اسوہ حسنہ وہ ہے جو بخاریؒ [1] نے بیان کیا ہے: کوئی تحقیق نہ کرو' کچھ نہ پوچھو' اٹھاؤ اور بیوی کو میکے بھیج دو۔ اب آگے جا کے مشکل پیش آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی تحقیق کے بعد یہ نہیں کہا کہ نہیں' یہ غلط ہے' یہ بہتان ہے۔ ان کو تو وحی آ گئی ہم پہ تو وحی نہیں آئے گی۔ ہم نے جس کو میکے بھیج دیا وہ تو گئی۔ یہ ہے' عزیزانِ من! ان

---

[1] یہ اشارہ حضرت امام محمد اسماعیل بخاری (194-256/260ھ) کے مجموعہ احادیث صحیح بخاری کی طرف ہے۔ آپ کا وطن بخارا تھا۔ آپ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے مکررات کو حذف کر کے صرف 2762 احادیث کو اپنے مجموعہ ''صحیح بخاری'' میں درج کیں۔

آیات کی شانِ نزول اور اِس شانِ نزول سے یہ ہے مطلب!

اے محمدؐ گر قیامت را براری سرزِ خاک

سر برار و ایں قیامت درمیانے خلق بیں

ان کو کچھ احساس نہیں ہوا کہ ناموسِ رسالت کسے کہتے ہیں۔ حضرتِ عائشہؓ یا ام المؤمنین ہیں، یہ مائیں ہیں۔ اپنی ماؤں کے متعلق خیال نہیں آیا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، قرآن نے کیا کہا ہوا ہے؟ کہ تمہارا ردِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ یہ بہتان ہے۔ قرآن نے حکم دیا ہے کہ اس طرح سے تحقیق کرنی چاہیے، قرآن نے حکم دیا ہے کہ اتنے گواہ مانگنے چاہئیں اور اس وقت تک اس ملزمہ کو بالکل بری الذمہ سمجھنا چاہیے جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا، یہ رسول اللہؐ کا اسوہ حسنہ ہے۔ یہ سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے، خدا اس کے لیے وحی بھیج کر بریت کرتا ہے، اپنی طرف سے انہوں نے حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظمت برقرار رکھی کہ خدا نے بریت بھیج دی۔ جی، رسول اللہؐ کے متعلق آپ کا کیا خیال گزرا؟

یہ ہے، عزیزانِ من! شانِ نزول کا عقیدہ وضع کرنے کے جذباتِ محرکہ۔ میں اگر اور واقعات بیان کروں تو ان میں بھی نبی اکرمؐ ہی کسی نہ کسی شکل میں ملوث ہوتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ یہ کتنی گہری سازش تھی جو قرآن کے خلاف ہو رہی تھی، نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے خلاف ہو رہی تھی۔ حضرتِ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح، حضرت زیدؓ کے ساتھ ہوا۔ بات بالکل صاف سی تھی۔ حضرتِ زینب رضی اللہ عنہا آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اتنی قریبی رشتے والی بہن، بچپن سے اکٹھے رہے۔ ان کی شادی آپؐ نے خود اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ کے ساتھ اس لیے کی کہ آپؐ قریش بنی ہاشم کی عظیم ترین ایک خاتون کی شادی ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ کر کے مساوات کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے خود انؓ کی شادی کی اور اس کے بعد وہ نبھ نہ سکی۔ یوں ہوتا ہے۔ نہیں نبھی، حتیٰ کہ حضرتِ زیدؓ انہیں طلاق دینے پہ آمادہ ہو گئے۔ قرآن میں یہ واقعہ درج ہے۔ وہ سورۃ احزاب کی (33:37) آیت ہے۔ اس میں یہ واقعہ موجود ہے کہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ حضرتِ زیدؓ ان کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ قرآن میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت زیدؓ سے کہا کہ طلاق نہ دو۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کی شادی جو اس مقصد کے لیے کی گئی ہے وہ ناکام ثابت ہو جائے، اور پھر آپ کی اپنی پھوپھی زاد بہن پر کیا گزرے گی۔ ایک تو شادی اس طرح سے کی، پھر اسؓ نے طلاق دیدی۔ کچھ بھی تھا، قرآن میں یہ ہے کہ آپؐ انہیں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو کہہ رہے تھے کہ طلاق نہ دو۔ اس کے باوجود انہوں نے طلاق دیدی۔ تو اس خاتون حضرتِ زینبؓ پر یہ اتنا صدمہ گزرا تھا کہ اس کی تلافی کے لیے، اس کے بعد، نبی اکرمؐ نے خود ان سے نکاح کر لیا۔ بات یہ واضح ہے۔

معاذ اللہ معاذ اللہ

عزیزانِ من! شانِ نزول (معاذ اللہ) دیکھیے کہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت زیدؓ سے شادی کے بعد ایک دن نبی اکرم ﷺ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے گھر گئے۔ زید رضی اللہ عنہ گھر پہ نہیں تھے۔ ان کی بیوی' یہی حضرتِ زینب رضی اللہ عنہا نے دروازہ کھولا۔ وہ سامنے آئیں (معاذ اللہ معاذ اللہ) حضور ﷺ ان کے حسن کو دیکھ کر' فریفتہ ہو گئے۔ پھوپھی زاد بہن ہیں' ساری عمر ساتھ رہے ہوئے ہیں' خود شادی کی ہے' مگر یہ کہتے ہیں کہ جیسے کسی غیر کے گھر میں گئے ہیں' دروازہ کھلا ہے' سامنے سے وہ نظر آ گئی ہے' فریفتہ ہو گئے' اور چاہا کہ خود شادی کر لیں' اور زیدؓ سے کہا کہ ان کو طلاق دیدو۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ ﷺ انہیں روک رہے تھے کہ یہ نہ کرنا۔ بخاری شریف کی شانِ نزول یہ کہہ رہی ہے۔ کیا کردار نبی اکرم ﷺ کا پیش کیا جا رہا ہے؟ جب غیر مسلم ان روایات کا حوالہ دیتے ہیں تو مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی روایات ہیں جو انہوں نے بخاری ❶ اور مسلم ❷ میں درج کر دیں' ہزار برس سے ہمارے ہاں کے سارے علمائے کرام' فقہائے کرام انہیں سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔ یہ نصاب میں داخل ہیں۔ یہ درس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کا ختم ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو قرآنِ کریم کا ختم ہے' یہ تو کبھی کبھار ہوتا ہے۔ اب تو خیر عام ہونے لگ گیا ہے ❸۔ پہلے تو رمضان میں ہوتا تھا۔ اب بخاری شریف کا ختم ہوتا ہے۔ یہ جتنے بھی علمائے کرام بن کر نکلتے ہیں' ان کو سند ملتی ہے۔ یہ ساری جتنی بھی اس قسم کی شانِ نزول کی روایات ہیں' یہ جو حدیث کے مجموعے ہیں' ان میں یہ ہے۔ یہ غیر مسلم جب اس قسم کی روایات کو اکٹھا کر کے یا ویسے ہی پیش کرتے ہیں تو مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب Ban (ممنوع) کی جائے' یہ بند کی جائے۔ میں کراچی میں تھا۔ ایک دفعہ وہاں' مغرب سے ایک کتاب آئی۔ انگریزی کی یہ کتاب سیرت پہ لکھی ہوئی تھی۔ اس میں اس قسم کی روایات تھیں۔ اس کتاب کو میری طرف بھیج دیا گیا کہ ذرا اس کو دیکھو' کہتے ہیں اس کو Ban (ممنوع) کر دیا جائے تو کیا اس میں ایسا مواد ہے کہ اسے Ban (ممنوع) کر دیا جائے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا۔ اس میں جو روایات تھیں وہ بالکل صحیح صحیح اس نے نقل کی ہوئی تھیں' اس میں کسی قسم کی کوئی غلطی' کوئی اضافہ نہیں تھا۔ میں نے اس کتاب کی ان روایات کے اوپر حوالے دیئے کہ یہ فلاں کتاب میں ہے' یہ فلاں حدیث ہے' یہ فلاں روایت ہے' یہ طبری میں ہے۔ یہ سارے حوالے لکھ کر دیئے۔ میں نے کہا کہ یہ کتاب ہے ہی اس قابل کہ اسے واقعی Ban (ممنوع) کر دیا جائے کہ یہ اتنی بڑی تہمت نبی اکرمؐ پر لگا رہی ہے لیکن اس کو Ban (ممنوع) کرنے سے پہلے' ان کتابوں کو

---

❶ یہ اشارہ حضرت امام محمد اسماعیل بخاریؒ (194-256/260ھ) کے مجموعہ احادیث ''صحیح بخاری'' کی طرف ہے۔

❷ یہ اشارہ حضرت امام مسلم بن حجاجؒ (204-261ھ) کے مجموعہ احادیث ''صحیح مسلم'' کی طرف ہے۔

❸ یاد رہے کہ یہ بات 6 جولائی 1984ء کو کہی جا رہی ہے۔

(Banممنوع) کیا جائے جہاں سے اس شخص نے یہ کچھ لیا ہے۔ وہاں ان کتابوں کے اندر جو یہ چیزیں موجود ہیں ان کو تو تم سر آنکھوں پہ لگاتے ہو' ان کے تو منبر و محراب پہ ختم کرتے ہو' اس کو دہراتے ہو اور جو اس میں سے نقل کر کے اپنے ہاں درج کرتا ہے تم اس کتاب کو Ban (ممنوع) کرتے ہو۔ ارے چور کو مارتے ہو' چور کی ماں کو مارو۔ عزیزانِ من! ماں کو کیسے مارتے وہ تو امام ہیں' انہوں نے تو وہ کتابیں جمع کی ہوئی ہیں' ان میں تو وہ کچھ بدستور موجود ہے اور یہ اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔

ناموسِ پیغمبر ﷺ پر تہمت تراشیاں

عزیزانِ من! بات شانِ نزول کے عقیدے کی ہو رہی تھی۔ آپ نے اب یہ خیال فرما لیا کہ اِس عقیدے کے وضع کرنے کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ اس قسم کی تہمت تراشیوں کی' اس قسم کی افسانہ نگاریوں کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر قرآن تک رہا جائے تو قرآن نے اپنے ہاں ان واقعات کے متعلق' اس قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا' کچھ نہیں کہا۔ یہ ساری چیزیں روایات کے اندر ہیں۔ ان روایات نے شانِ نزول بیان کر دیا کہ صاحب! یہ تھی وہ بات' اس پہ خدا نے وہ احکام نازل کیے یا یہ آیت اتری۔ اب ان آیاتِ قرآن کو انہی روایات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ ان آیات کا مفہوم ہی ان روایات سے متعین کیا جاتا ہے۔ یہ ہے شانِ نزول کی بات جو میں عرض کر رہا ہوں۔

قرآنِ کریم اپنی ذات میں خود مکتفی ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ ان لوگوں سے پوچھو کہ کیا خدا کی یہ کتاب تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟ اس نے بڑی تحدی سے یہ کہا ہے مگر یہ ہیں کہ سینے پہ ہاتھ مار کر کہتے ہیں کہ یہ بالکل کافی نہیں ہے: یہ مجمل ہے' ناقص ہے' تشنہ ہے' اس میں کمی ہے اور یہ روایات جو خاص مقاصد کے تابع وضع کی گئیں وہ ساری چیزیں پوری کر رہی ہیں۔

جہاں تک نام لینے کا تعلق ہے قرآنِ کریم میں ایک تو حضرتِ زیدؓ کا نام آیا ہے۔ اور دوسرا ابی لہب کا نام [1]۔ حضرت زیدؓ کا ذکر وہی اس واقعہ کے اندر ہے جہاں حضورؐ نے ان سے یہ فرمایا کہ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ (33:37) طلاق نہ دو' بیوی کو بیوی بنا رکھو۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔ اور وہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' وہ شانِ نزول کی روایت ہے کہ حضورؐ معاذ اللہ ان کی بیوی کا حسن دیکھ کر معاذ اللہ معاذ اللہ فریفتہ ہو گئے اور ان کو آمادہ کیا کہ طلاق دیدو۔ اب یہ جو بات ہو گی کہ قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ طلاق نہ دو' بیوی کو بیوی بنا کر رکھو۔ یہ پوچھو نہیں' عزیزانِ من! پھر میں کہوں گا' کہ بڑا سینے پہ پتھر رکھ کر سنو کہ کہتے ہیں کہ جی' یہ بات وہ ایسے ہی اوپر اوپر سے کہتے تھے' اندر سے یہی چیز کہہ رہے تھے کہ طلاق دیدو تاکہ میں نکاح کر لوں۔ رسول اللہ ﷺ کے کردار' حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ' جو نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک اسوہ حسنہ ہے' کے لیے یہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور پھر یہ کہ وہ قیامت تک کے لیے ہے۔ اب جو یہ کہہ دے کہ میری غیرت اس کو گوارہ نہیں کرتی کہ میں حضورؐ کی طرف ان روایات کو منسوب کروں تو اس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نے امام بخاری کی کسی روایت کو غلط کہہ دیا ہے۔ قرآن کے خلاف جاتا ہے جائے' ناموسِ پیغمبر ﷺ داغدار ہوتی ہے ہوتی رہے' بخاریؒ کی کسی روایت کو غلط نہ کہہ دیا جائے۔ ان سے بھی بلند مرتبہ ہے ان بخاریؒ اور مسلمؒ کا۔

عزیزانِ من! قرآن کے سمجھنے میں یہ یادرکھیے کہ یہاں قرآن نے جو نام لیا ہے تو وہ صرف حضرتِ زید کا نام ہے جو سارے قرآن میں ایک دفعہ اس واقعہ میں ہے، یا وہ ابی لھب ❶ کا نام ہے: تَبَّتْ يَدَا اَبِىْ لَهَبٍ ❷ (111:1)۔ یہ شانِ نزول کے لیے ایک ایک آیت چن کرلاتے ہیں کہ یہ اس کے متعلق ہے۔ یہ ساری چیزیں اسی قسم کی سازش ہیں۔ قرآن سمجھنے کے لیے ان چیزوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، وہ خود مکتفی ہے، اپنے مطلب اور مقصود کو وہ خود واضح کرتا ہے۔ سورج دیکھنے کے لیے کسی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ علم، عقل، شعور، فہم، فراست، اور عقلِ انسانی، قرآن سمجھنے کے لیے کافی ہے، باقی سارے وضع کردہ اضافے ہیں جو قرآن کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ قرآن مکمل دین ہے، نور ہے، روشنی ہے، خود مکتفی ہے۔

شانِ نزول کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کا کردار

عزیزانِ من! اس تمہیدی تعارف کے بعد بلکہ وضاحت کے بعد کہ اِن کے نزدیک شانِ نزول کیا ہے، اب ہم اس آیت کی طرف آتے ہیں جو آج کے درس کا موضوع ہے۔ یہ سورۃ عبس، 80 ویں سورۃ ہے۔ شروع ہوتی ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰى o اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (80:1-2) پیشانی شکن آلود ہوگئی، تیوری چڑھائی، منہ بسورا، بڑا ناگوار گزرا۔ کیا ناگوار گزرا؟ یہ کہ یہ ایک غریب اندھا کیوں آ گیا؟ قرآن نے یہاں نام نہیں لیا کہ کس نے یہ کیا اور کس پہ یہ واردات گزری لیکن اب شانِ نزول آ گیا: نبی اکرم ﷺ روسائے قریش کی ایک محفل میں بیٹھے ہوئے انہیں وعظ و تلقین کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک مسلمان صحابی نام بھی دیدیا گیا ہے، آ گئے اور آ کر بیٹھ گئے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کو بڑا ناگوار گزرا۔ آپ نے تیوری چڑھائی، منہ بسورا کہ یہ کیوں آ گیا؟ عزیزانِ من! یہ شانِ نزول ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن نے کیا کہا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایک طرف یہ روسائے قریش ہیں، امیر لوگ ہیں، سردار ہیں، بڑے بڑے لوگ ہیں۔ دوسری طرف ایک غریب اندھا ہے تو گویا رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ یہ بتا رہے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ تو خاتم النبین ہیں، جہاں پر وحی کے سلسلہ رشد و ہدایت کی بات حضرت نوحؑ سے شروع ہو کر ختم ہوئی۔ قرآن نے اس پورے قصے میں کیا بات کہی ہے؟ بات یہ کہی ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہنے والے، جنہیں یہ لوگ نچلے درجے کے کہتے تھے، کمین کہتے تھے، کمی

---

❶ آپؐ کا ایک چچا ابو طالب ہے، جس کا انتقال 10 نبوی میں ہوا۔ اگرچہ مسلمان نہیں ہوا، اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم رہا لیکن اپنے بھتیجے کا اس طرح ساتھ دیتا ہے کہ تین برس تک، چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت، پہاڑ کے ایک درہ شعب ابو طالب کے تنگ و تار میں مصیبتوں کے دن نہایت خندہ پیشانی سے گزار لیتا ہے۔ یہ 7 نبوی کا واقعہ ہے اور دوسرا حقیقی چچا عبدالعزی بن عبدالمطلب ہے جس کی کنیت ابی لہب ہے۔ اس نے سب کام کاج چھوڑ کر، زندگی کا مقصد ہی یہ بنا لیا ہے کہ اس حق و صداقت کے مجسمہ بھتیجا کی مخالفت کی جائے اور اس جوشِ مخالفت میں اور تو اور صلۂ رحمی تک کو بالائے طاق رکھ دیا جائے حالانکہ یہ وہ خصوصیت تھی جو عربوں کا قومی جوہر بن گئی تھی اور وہ اس پر نہایت فخر کیا کرتے تھے۔ (حوالہ: پرویزؒ: معراج انسانیت، ص۔246)۔

❷ وہ دیکھو! جماعت مخالفین کا سب سے بڑا نمائندہ...... قریش کی معاشرتی اور اقتصادی خرابیوں کا سب سے بڑا ذمہ دار...... کعبہ کا متولی...... اِن کے غلط نظام کا سب سے بڑا حامی...... ابولہب...... اِس نظامِ خداوندی کے مقابلہ سے عاجز آ گیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہتے تھے ادھر آئے اور دوسری طرف یہ جو بڑے بڑے سردار تھے یہ آئے اور آکر انہوں نے حضرتِ نوحؑ سے یہ کہا کہ اگر تم ان لوگوں کو نکال دو تو ہم آئیں گے اس لیے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ یہ یہاں ہمارے برابر بیٹھے ہوئے ہوں۔ ہم ان سے معروف ہوں، ہم یہ نہیں برداشت کرسکتے۔ ہم آتے ہیں اور تمہاری دعوت کو قبول کرتے ہیں، پہلے ان کو نکال دو۔ پھر اس کے جواب میں، وہی پہلی دعوت کے جواب میں، یہ کہا ہے کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ان ایک ایک کا صدق و خلوص تمہارے جیسے ہزاروں امیروں اور سرداروں پر نچھاور کیا جاسکتا ہے۔ کیا کہتے ہو تم؟

معیار کا ترازو

عزیزانِ من! یہاں دولت اور حشمت اور عزت اور وقار معیار نہیں ہے۔ یہاں معیار ایمان اور خلوص ہے۔ جو اس کے ساتھ آئے گا وہ معزز اور مکرم ہے۔ وہ میرا مقرب ہے، میرے قریب بیٹھے گا۔ تمہاری خاطر اگر میں انہیں نکال دونگا، خدا مجھے اپنی بارگاہ سے دھکا دے کر نکال دے گا۔ پہلی دعوت اور ہر نبی کی سرگزشت میں یہ چیز چلتی آتی ہے۔ **قال** وہ جو سردار تھے، انہوں نے آکر یہ کچھ کہا۔ نبی نے کہا کہ مجھے تمہاری کچھ پرواہ نہیں ہے۔ صدقِ دل سے آتے ہو تو آؤ، نہیں آتے ہو تو جاؤ۔ یہاں یہ بات نہیں ہے کہ مجھے یہ بڑے بڑے لوگ اپنی پارٹی میں شامل کرتے ہیں کہ کسی طرح سے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس کا سوال نہیں ہے۔ یہاں تو یہ ہے کہ صدقِ دل سے اور خلوص سے کون اس کو قبول کرتا ہے۔ یہ انبیائے کرام کا پورا شیوہ اور ان کے ہاں کی یہ روش چلی آرہی ہے۔ قرآن کی تعلیم چلی آرہی ہے، اور یہ بنیاد قرآن کی تعلیم کی ہے۔ یہ انسانیت کی مساوات ہے جس کی تلقین کرنے کے لیے قرآن آیا ہے، نبی اکرم ﷺ انہی انبیائے کرام کی آخری کڑی ہیں۔ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ سرٹیفکیٹ

نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو خود قرآن نے یہ کہا ہے کہ **اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ** (68:4) آپ ﷺ تو انسانیت کے خلقِ عظیم کے حامل ہیں، انبیائے کرام علیہم السلام کے زمرے کے اولی العزم نبی خلقِ عظیم کے حامل ہیں۔ آپ ﷺ کو قرآن یہ سرٹیفکیٹ دے رہا ہے۔ کیا ان کی یہ کیفیت ہوگی کہ اگر ایک غریب یا ایک اندھا آکر محفل میں بیٹھ گیا تو اُن ﷺ پہ ناگوار گزرے، تیوری چڑھالے، منہ بسور لے اور اس سے کہے کہ کیوں آگئے ہو۔ تم یہاں سے (معاذ اللہ معاذ اللہ) نکل جاؤ۔ نہیں، آپ ﷺ یہ کبھی نہیں کہیں گے۔ مگر یہاں تو اس آیت کی شانِ نزول یوں بیان کی جارہی ہے۔

عزیزانِ من! آیت کا اصل مطلب کیا ہے، اسے آئندہ درس میں بیان کیا جائے گا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

نواں باب: **سورۃ عبس** (آیات 1 تا 16)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1984ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز پھر سورۃ عبس سے ہو رہا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 80 ویں سورۃ ہے۔ سابقہ درس میں بھی میں نے اس کی تمہید پیش کی تھی اور آج کے درس کا آغاز بھی اسی تمہید کی تکمیل کے لیے ہو رہا ہے۔ اصل میں یہ نکتہ سامنے آ گیا تھا کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کا طریقہ کیا ہے۔ آیتیں آتی رہیں گی اور بھی آگے آئیں گی' اگر آپ نے یہ اصول ذہن نشین کر لیے تو آپ خود قرآن سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

آخر یہ سب کچھ کیوں کر ہوا؟

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے راستے میں جہاں اور روڑے اٹکائے گئے' رکاوٹیں پیدا کی گئیں' سازشیں ہوئیں' ان میں ایک چیز شانِ نزول کی بھی تھی۔ [1] قرآنِ کریم نے جن واقعات کا کوئی تصریحی ذکر نہیں کیا ہے' متعین طور پہ نہیں کہا ہے' کسی کا نام نہیں لیا ہے' بعد میں شانِ نزول کے تحت ان واقعات کو متعین طور پر بتایا گیا' ان کا نام لیا گیا' یہ کہا گیا کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی' یہ فلاں شخص کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ جو کیا گیا' روایات کے ذریعے کیا گیا۔

جب ہم نزول کی روایات کو دیکھتے ہیں تو ان میں بیشتر وضعی افسانے نظر آتے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ روایات وضع کرنے کا عام چلن چل گیا تھا۔ یہود و نصاریٰ بھی یہ کچھ کرتے تھے اور خود منافقین بھی یہ کچھ کرتے تھے۔ انہی میں شانِ نزول کے متعلق واقعات اور افراد کا حصہ ہے اور یہ چیز بڑی کثرت سے آئی ہے اور پھر اسی کی رو سے قرآن کی تفسیر کی گئی' انہی وضعی قصوں کی رو سے پھر ترجمے کیے گئے۔ یہ یاد رکھیے قرآن سمجھنے کے لیے جو آیت بھی آپ کے سامنے آئے' جو مقام بھی آپ کے سامنے آئے' سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ مروجہ ترجمہ یا تفسیر کیا ہے' اس پر پہلے غور کیجیے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی مروج چلا آ رہا ہے آپ اس پہ غور و فکر نہیں کر سکتے' اسے

---

[1] مزید سازشوں کی تشریح و تبیین کے متعلق ملاحظہ کیجیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 218-197 اور 242-221۔

آپ کو اسی طرح صحیح ماننا پڑے گا۔ عزیزانِ من! یہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن نے تدبر کو، غور کو، فکر کو، عقل کو، شعور کو فرض قرار دیا ہے۔ قرآن کسی زمانے یا خاص اشخاص کے لیے نہیں ہے۔ یہ ہماری آپ کی راہنمائی کے لیے بھی ہے اور ابدی طور پہ بھی ہے۔ یہ قیامت تک کے لیے ہے، تمام کے لیے ہے۔ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ تدبر کرے۔ اس لیے پہلی چیز یہ ہے کہ جو کچھ آ رہا ہے، اس پہ غور و فکر کیجیے، تدبر کیجیے۔ اگر وہ صحیح ہے تو پھر ٹھیک ہے، اسے Accept (قبول) کر لیجیے، اس لیے نہیں کہ کسی نے پہلے ایسے کہا ہے بلکہ اس لیے کہ قرآن نے اور آپ کے غور و فکر نے بھی یہی کہا ہے اور اگر اس میں وہ چیز قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے مسترد کر دیجیے خواہ اس کی نسبت کسی بڑے سے بڑے کی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔

احادیث کے سلسلے میں مسلک یہ ہے کہ ہر وہ حدیث نبی اکرم ﷺ کی نہیں ہو سکتی جو قرآن کے خلاف ہے، رسول اللہ ﷺ کی ذات کی عظمت کے خلاف ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف ہے۔ جہاں یہ چیزیں آئیں آپ انہیں مسترد کر دیجیے۔ اب آپ اس کی مثال دیکھیے۔ یہی جو سورۃ عبس ہے اسے آپ کسی ترجمے میں دیکھیے، کسی تفسیر میں دیکھیے، ہزار برس سے، جب سے یہ مدون چیزیں آپ کے پاس آ رہی ہیں، اس زمانے سے آج تک، یہی کچھ اس میں ملے گا کہ **عَبَسَ وَتَوَلّٰی** (80:1) [1] رسول اللہ ﷺ نے تیوری چڑھائی، ماتھے پر شکن پڑ گئے، منہ بسورا، آپ بہت برافروختہ ہو گئے۔ کس بات سے؟ کہ **اَنْ جَآءَ هُ الْاَعْمٰی** (80:2) ایک اندھا آ گیا۔ میں یہاں مروجہ تراجم بیان کر رہا ہوں۔ بہت گراں گزرا، شکن پڑ گئے، منہ بسورا: **عَبَسَ**۔ کس بات سے یہ کچھ ہوا؟ کہ یہ بندہ کیوں آ گیا۔ پھر یہ کہا کہ قریش کے کچھ بڑے بڑے سردار بیٹھے تھے۔ آپ انہیں وعظ و نصیحت کر رہے تھے، تبلیغ کر رہے تھے اور وہ ماحول بڑا عمدہ آ رہا تھا کہ اتنے میں ایک صحابی کا نام لیا کہ جی، وہ آ گئے اور آ کر بیٹھے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ ایسا سخت گراں گزرا کہ وہاں الفاظ ہیں: **عَبَسَ وَتَوَلّٰی** (80:1)۔ سخت قسم کے الفاظ ہیں کہ خدا کو یہ کہنا پڑا کہ تمہارے چہرے پہ شکن پڑ گئے، تم نے منہ بسور لیا۔ یاد رہے مروجہ تراجم کی رو سے خدا رسول سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم یہ کہہ رہے ہو یہ اندھا درمیان میں کیوں آ گیا۔ اب یہی جو مروجہ ترجمہ ہے میں اسی کے مطابق پہلے عرض کیے جا رہا ہوں۔ **وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی o اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی** (80:3-4) رسول سے خدا کہہ رہا ہے کہ تجھے کیا پتہ ہے کہ یہ جو آیا ہے یہ اس سے کتنا فائدہ اٹھا جائے، اس کے اخلاق سنور جائیں، اس کی ذات میں نشو و نما ہو جائے، ویسے ہی اگر یہ سمجھ سوچ کر بھی اس کے اوپر عمل کرے تو اس کو بہت فائدہ ہو جائے، تمہیں اس چیز کا کیا پتہ ہے اور تم نے اس کے آنے پر منہ بسور لیا اور تمہارے ماتھے پہ شکن پڑ گئے۔ پھر سوچ لیجیے میں یہ کچھ مروجہ تراجم اور تفسیر کی رو سے عرض کر رہا ہوں۔ **اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی o فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی** (80:5-6) تو یہ جو مستغنی ہیں، جو پرواہ نہیں کرتے لیکن مال و دولت والے ہیں تو ان کے پیچھے لگا ہوا ہے کہ صاحب! یہ کسی طرح

---

[1] ان تمام آیات کا صحیح مفہوم اگلے صفحات میں دیا گیا ہے۔

مسلمان ہوجائیں اور جو غریب اس طرح سے آیا ہے آپ نے اس کی پرواہ نہیں کی، تمہارے ماتھے پر شکن پڑ گئے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کس کے متعلق کہا جا رہا ہے؟ قرآنِ کریم میں یہ نہیں ہے کہ یہ کس کے متعلق ہے۔

ان روایات کی رو سے یہ ہوا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے: **اَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی o وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی o** (80:6-7) تیرے ذمے یہ نہیں ہے کہ تُو ان تمام کو مسلمان کردے جن کے پیچھے تُو یہ کر رہا ہے۔ **وَاَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی o وَ ھُوَ یَخۡشٰی o فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَھّٰی** (80:7-10) یہ جو اپنے آپ کو مستغنی سمجھتے ہیں اور جو مال و دولت والے ہیں، یہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے: نہ اس پیغام کی، نہ اس قرآن کی، نہ اس تلقین کی مگر تیری کیفیت یہ ہے کہ تُو ان کے پیچھے لگا ہوا ہے کہ کسی طرح یہ مسلمان ہوجائیں اور وہ جو آیا ہے، وہ ''یَخۡشٰی'' ہے، وہ دل میں خدا کا خوف لیے ہوئے ہے، قلب کو جھکائے ہوئے ہے، نہایت اخلاق کے ساتھ تمہارے پاس آیا ہے۔ **فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَھّٰی** (80:10) تُو اُس کی طرف سے بے رخی برت رہا ہے، بے رخی ہی نہیں ہے بلکہ کیفیت یہ ہے کہ تمہارے ماتھے پہ شکن پڑ گئے ہیں کہ وہ آیا کیوں ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! مروجہ تفاسیر اور ان کی رو سے آپ کے ہاں کے مروجہ تراجم۔

حقائق کی اصل نوعیت

عزیزانِ من! قرآن نے اس کا نام نہیں لیا کہ وہ کون ہے اور کس کے ماتھے پہ تیوریاں پڑیں مگر اگلی ساری باتیں اس کے متعلق ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جو مروجہ چلا آ رہا ہے اس پہ کھڑے ہو کر غور کرو۔ اِس کے لیے کسی بڑے ارسطو کے سے دماغ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ کا مقام اس سے بہت بلند ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ سلسلہ رشد و ہدایت حضرتِ نوح علیہ السلام سے شروع ہوا ہے اور رسول اللہ ﷺ تک پہنچا۔ سارے قرآن میں دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر نبی کے پیغام کی، اس کی تلقین کی مخالفت، اُنہوں نے کی جو مترفین تھے، مال و دولت والے تھے، سردار تھے، بڑے بڑے لوگ تھے اور یہ جنہیں عام طور پر چھوٹے لوگ کہا جاتا ہے، پست درجے کے غریب کہا جاتا ہے، انہوں نے اس پر سب سے پہلے لبیک کہا۔

اگلی چیز یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے مال و دولت والے تھے، جو سرغنے اور سردار تھے، ان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ یہ جو پست درجے کے لوگ ہیں، جنہیں ہم کمین لوگ کہتے ہیں، جو تمہارے پاس آ بیٹھتے ہیں، ان کو یہاں سے نکال دے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ ہمارے برابر بیٹھ جائیں۔ سارے قرآن میں یہ ہے، اور ہر جگہ قرآن میں یہ ہے کہ پھر خدا نے انبیاء سے کہا یا انبیاء نے خود ان سے یہ کہا کہ میرے ہاں اس تلقین میں تو مساواتِ انسانیہ ہے، یہاں مال و دولت سے کوئی غرض نہیں ہے، نہ مجھے اس سے واسطہ ہے کہ یہ کیا کام کاج کرتے ہیں، مجھے تو اس سے غرض ہے کہ خلوصِ دل سے، سلیم قلب سے، میری طرف کون آتا ہے، کون اس پہ غور و فکر کرتا ہے۔ کون اس کو قبول کرتا ہے، وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، میرے نزدیک تو سب یکساں ہیں اور وہ جو جماعت متشکل کرتے تھے اس میں بیشتر یہ چھوٹے درجے کے لوگ ہوتے تھے۔ سارے قرآن میں یہ چلا آ رہا ہے۔

اب یہ جو انبیائے کرام کا سلسلہ رشد و ہدایت ہے اس کا مسلک و روش یہ ہے۔ قرآن اس کی تائید کر رہا ہے' واقعات بتا رہے ہیں' ابتدا ایک نبی کے ذکر سے کر رہا ہے' کیا نبی اکرم ﷺ کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے پھر رہے ہوں؟ اور **جَآئَکَ یَسْعٰی o وَھُوَ یَخْشٰی** (80-8-9) اگر ایک خلوصِ قلب سے لپک کر تیری طرف آ رہا ہے' سلیم قلب سے' خلوصِ دل سے' آ رہا ہے تو آپ اس کو دھتکار رہے ہیں' ماتھے پہ تیوری ڈال رہے ہیں' شکن پڑ گئے ہیں کہ یہ ان کے پیچھے کیوں آ گیا۔ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

سوچنے کا مقام

پہلی چیز یہ ہے کہ سارا سلسلہ جو قرآن نے رشد و ہدایت اور انبیاء کرام کی تلقین و تعلیم کا بتایا' یہ کچھ اس کے خلاف ہے۔ نبی اکرم ﷺ خاتم النبین ہیں۔ ان کا اتنا بلند مرتبہ ہے' ان کے متعلق یہ چیز کہنا کہ آپ ﷺ نے یہ کیا ہوگا' یکسر خلافِ قرآن ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ قرآن میں تدبر پہلی چیز ہے۔ اس تدبر کی رو سے یہ چیز سمجھ آ جائے گی کہ یہ قرآن کے خلاف ہے' حضور ﷺ کی سیرت کے خلاف ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ** (68:4) آپ خلقِ عظیم پہ تھے۔ حضورؐ کے متعلق تو خاص طور پہ کہا ہے۔ خلقِ عظیم کا حامل ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو کہ ایک شخص اس طرح سے خلوصِ قلب سے لپک کر آنے والا ہو اور اس کے آنے پر آپ اس قدر چیں بہ جبیں ہو جائیں' آپ منہ بسور لیں' بے اعتنائی برت لیں (معاذ اللہ) یہ ممکن نہیں ہے یہ تو جب ہم نے پہلے ہی قدم میں' تدبر کیا' قرآن کی روشنی میں اس پہ غور کیا' تو نظر آیا کہ نبی اکرمؐ معاذ اللہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے تدبر کی پہلی چیز یہ آ گئی۔

عزیزانِ من! ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ پھر یہ واقعہ ہے کیا؟ اگر یہ حضور ﷺ نہیں ہیں تو پھر یہ کون ہے؟ اس آیت کا مفہوم کیا ہے؟ قرآن نے تو یہاں سے بات شروع کی ہے: **عَبَسَ وَتَوَلّٰی** (80:1)۔ اس آیت میں عبس وتولّی کا فاعل نہیں بتایا۔ یہ کس نے کیا ہے' یہ نہیں بتایا۔ پہلی چیز تو تدبر سے یہ ہوئی کہ کم از کم حضور ﷺ نہیں ہیں۔ یہ سیدھی سی بات ہے۔ پھر وہ کون ہے؟ اب وہی تصریفِ آیات کا قرآن سمجھنے کا دوسرا طریقہ ہے کہ دوسرے مقامات میں دیکھیے کہ وہاں قرآن میں کیا آیا ہے؟ کیا اس سے اس پہ کچھ روشنی پڑتی ہے؟ یہ یقیناً قرآن کا دعویٰ ہے کہ تصریفِ آیت سے میں اپنا ہر مقام سمجھا دیتا ہوں۔ اب آیئے تصریفِ آیات سے دیکھیں۔ عزیزانِ من! میں پھر بڑے تاسف کے ساتھ وہی کہتا ہوں جو بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ اگر قرآن کے نسخے آپ کے ہاتھ میں ہوتے' آپ کے سامنے آیات ہوتیں' تو یہ بات آپ کی سمجھ میں آتی' پھر یہ طریقہ بھی آپ کی سمجھ میں آتا کہ تصریفِ آیات سے ہوتا کیا ہے' کیسے بات سمجھ میں آتی ہے؟ بہر حال یہ تو آپ کا کام تھا' میرا فریضہ تو پیش کرنا تھا اور میں خاص طور پہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شاید ان باتوں کے دہرانے کا پھر وقت نہ آئے' آپ کو افسوس رہ جائے گا۔ آپ کم از کم کہیں نوٹ تو کرتے چلے جایئے' کہیں حوالے تو لکھتے چلے جایئے' بعد میں آپ کے کام آئیں گے۔

قرآن کیا بتاتا ہے؟ سورۃ مدثر 74 ویں سورۃ' کے درس کو ہوئے کوئی دور کی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو ایک مہینے [1] ہی ہوئے ہیں کہ سورۃ المدثر ہمارے سامنے تھی۔ اس میں خاص طور پہ قرآن نے پہلے تو متعدد مقامات میں یہ بتایا ہے کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار' بڑے بڑے نمائندے' آپ کے پاس آتے تھے' بحث و تمحیص بھی ہوتی تھی۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ مفاہمت کے لیے بھی تیار ہوتے تھے بلکہ حضور ﷺ کو مفاہمت کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ قرآن میں یہ چیزیں موجود ہیں کہ وہ Compromise (مفاہمت) کے لیے حضور ﷺ کو آمادہ کرتے تھے۔ اور قرآن میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرمؐ ان کو دوٹوک جواب دیدیتے تھے کہ میں کسی کے ساتھ Compromise (مفاہمت) نہیں کرسکتا' باطل مفاہمت کرسکتا ہے' حق مفاہمت نہیں کرسکتا۔ میں تمہاری اس قسم کی کوئی شرط ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اب ہم دیکھیں گے کہ قرآن میں یہ ہے کہ یہ بڑے بڑے سردار اور نمائندے آپؐ کے پاس آتے تھے۔ سورۃ المدثر' جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی تھی' اس میں تو خاص طور پہ کہا ہے کہ **ذَرْنِی وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا o وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا o وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا o وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا o ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ** (74:11-15) آج یہ جو سردار آیا ہے' وہ جو قریش کا نمائندہ آیا ہے' یہ جو انہوں نے پھر کوئی نمائندہ بھیجا ہے' اس کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے پاس بڑا مال و دولت ہے' بہت بڑا جتھہ ہے اور بڑا قبیلہ ہے' قریش کا نمائندہ ہے۔ یہ لوگ نسبی اور نسلی تفاخر میں بھی انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں۔ قرآن نے اس کی یہی باتیں بتائی ہیں کہ یہ سارا کچھ اس کے ذہن میں ہے۔

میں پھر یہ عرض کردوں کہ یہ جو نبی اکرم ﷺ اور قریش کی کشمکش تھی' اس میں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ قریش کچھ ایسے مذہب پرست لوگ نہیں تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ مسئلہ کیا تھا کہ تیرہ سال مکے کی زندگی کے بعد مدینے کی چھ سات سال زندگی میں مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کیا آپ ﷺ اور یہ مسلمان ان کو بت پرستی سے منع کیا کرتے تھے؟ یہ جنگیں اس لیے تھیں۔ خود ان کے ہاں بتوں کی کیا کیفیت تھی وہ تو خیر میں کسی دوسرے وقت سناؤں گا' کئی دفعہ سنا بھی چکا ہوں۔ ان کا ایک شخص ضرار تھا۔ کسی نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا تو وہ ان باتوں کے پوچھنے کے لیے بتوں کے پاس آیا کرتے تھے اور طریقہ یہ تھا کہ وہ پجاری تین تیر چلاتے تھے۔ اِن میں سے ایک کے اوپر ''نہ'' لکھا ہوتا تھا' ایک کے اوپر ''ہاں'' لکھا ہوتا تھا۔ تو اگر ''ہاں والے'' دو تیر آجائیں تو پھر ہوتا تھا کہ ٹھیک ہے جو تم چاہتے ہو وہ کرو' اور اگر وہ ''نہ والے'' ہو جائیں تو روک دیا جاتا تھا۔ اب وہ شخص ضرار وہاں آیا اور وہاں اس بت سے پوچھ کے تیر چلائے۔ ''نہ'' نکلی' دوسرے پہ بھی ''نہ'' نکلی' تیسرے پہ بھی ''نہ'' نکلی تو تیروں کا ترکش لے کر مٹھا اس کے منہ پہ دے مارا: تیری ایسی کی تیسی' تیرے باپ کو کوئی قتل کر دیتا تو پھر میں دیکھتا تُو کس طرح ''نہ'' کہتا ہے' تم ''نہ'' کرتے رہو میں تو بدلہ لونگا۔ یہ تھی ان کی حالت: وہ تو اپنے معبودوں کو

---

[1] اس کے لیے دیکھیے پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' انتیسواں پارہ سورۃ المدثر' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2006ء

بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ مذہب پرست نہیں تھے۔

عربوں کے اندر نسلی تفاخر کی نوعیت

قریش کے اندر سب سے بڑی چیز نسلی تفاخر تھا۔ پہلے تو پورے عربوں کے اندر یہ تھا کہ وہ غیرِ عرب کو کہتے ہی عجم تھے' کہ یہ گونگے ہیں۔ آپؐ کی دعوت سے یہی پہلی چیز تو کٹ گئی۔ ان کے ہاں دوسری نسلی تفاخر کی چیز رنگ کا مسئلہ تھا۔ ذرا سی سیاہ رنگت ہوئی تو انہوں نے اسے اپنے ہاں پٹخ کر پھینک دیا۔ عربوں کے ہاں جو دوسرے قبیلے تھے وہ انہیں بھی اپنے سے پست جانتے تھے۔ ان میں ایک لڑائی ایسی ہوتی تھی جس میں دونوں طرف سے ایک ایک آدمی آتا تھا اور وہ دونوں لڑتے تھے۔ ان کے نسلی تفاخر کی کیفیت یہ تھی کہ جب وہ بدر [1] کے میدان میں لڑنے کے لیے آئے ہیں تو یوں ہوا کہ اُدھر قریش کی طرف سے ایک آیا' اِدھر سے مدینے کے انصار میں سے ایک آیا۔ یہ انصار قریش نہیں تھے۔ یہ عام طور پہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ قریش انہیں بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ پہلے تو آ کر' پکار کر' اپنا نام اور اپنا تعارف کراتے تھے۔ ان انصار میں سے آنے والے نے جو اپنا تعارف کرایا تو قریش کے اس شخص نے کہا کہ کسی قریشی کو بھیجو' ہم اِس کے ساتھ لڑنا اپنے لیے باعثِ ہتک سمجھتے ہیں۔ وہ واپس چلا گیا۔ وہ قریش تو ان سے جنگ کرنا' بھی اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھتے تھے۔ یہ تھی ان قریش اور ان عربوں کے ہاں نسلی تفاخر کی نوعیت۔

تصویر کا دوسرا رخ

عزیزانِ من! کیفیت یہ تھی کہ حضور ﷺ نے آواز دی۔ جس نے بھی لپک کر اس پہ لبیک کہا' آپ نے اسے گلے لگا لیا۔ حبش کا بلال رضی اللہ عنہ' روم کا مزدور صہیب رضی اللہ عنہ' فارس کا سلمان رضی اللہ عنہ' عمار رضی اللہ عنہ۔ کیا مقام تھے ان لوگوں کے! حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45ء) سے پوچھا گیا کہ آپ کے جنازے کی نماز کون پڑھائے تو انہوں نے کہا: وہ مزدور صہیب رضی اللہ عنہ' میرے جنازے کی نماز پڑھائے گا۔ بیشتر تو یہ غلام ہی تھے جو آزاد ہوئے ہوئے تھے اور پھر مختلف ملکوں کے تھے۔ وہاں حبش کے جتنے لوگ تھے' یہ سارے کے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں شمار تھے جن میں کوئی تفاوت نہیں تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ کے اندر یہ تمام شامل ہیں' یکساں شامل ہیں' اخوت ہے' مساوات ہے۔ اِدھر یہ جماعت ہے اور اُدھر وہ قریش والی صورت ہے کہ وہ غیرِ قریش سے جنگ کرنا بھی باعثِ ہتک سمجھتے تھے۔ یہ چیزیں بڑی اہم ہیں اور سمجھنے کے لیے بڑی ضروری ہیں۔ پھر یہ آیات سمجھ میں آئیں گی کہ ہوا کیا تھا۔

---

[1] جنگ بدر (17 رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624ء)

حضور کی خدمت میں متکبرانہ انداز میں ایک نمائندے کی آمد

عزیزانِ من! بات یہ ہو رہی تھی کہ حضور کی خدمت اقدس میں متکبرانہ انداز میں ان کا ایک نمائندہ آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن معاملات پر Discussion (گفتگو) ہو رہی ہوگی' ان میں کچھ Conditions یعنی شرائط پیش کی جا رہی ہونگی۔ قرآنِ کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ اس کا جتھہ بھی بڑا تھا' مال و دولت میں بھی بڑا تھا۔ وہ اس گھمنڈ' تکبر اور غرور میں آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ **اِنَّـهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيۡدًا** (74:16) اس کے دل میں قوانینِ خداوندی کے خلاف بڑی دشمنی تھی۔

جب یہ سورۃ ❶ سامنے آئی تھی تو میں نے آپ کو بتایا تھا کہ قرآن نے کیسا محاکاتی نقشہ کھینچا ہے۔ حضور ﷺ نے جو کچھ اس سے کہا' **اِنَّـهٗ فَكَّـرَ وَ قَدَّرَ** (74:18) اس پہ اس نے کچھ سوچا' پھر اندازہ لگایا کہ اس سے ہماری حالت کیا ہوگی۔ **فَقُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ** (74:19) تباہ ہو' برباد ہو' اس کا ستیاناس ہو' کس قدر غلط اندازہ لگایا۔ کیا بات ہے قرآن کی! **ثُـمَّ قُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ** (74:20) کتنا غلط اندازہ لگایا' ایسا غلط اندازہ جس سے تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ وہی ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات پہ کہا ہے کہ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ یہ جنہیں ہم پست سمجھتے ہیں' کمینے سمجھتے ہیں' نیچ سمجھتے ہیں' انہیں نکال دیجیے۔ کیسا غلط اندازہ لگایا ہے! **ثُـمَّ نَظَرَ** ❷ (74:21)۔ اس سے پہلے یہ ہے کہ **فَكَّرَ وَ قَدَّرَ** ❸ (74:18)۔ اب یہاں (74:21) میں کہا ہے کہ پھر دوبارہ اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور سنیے عزیزانِ من! اِس آیت کی یہ ابتدا ہوئی ہے: عبس (80:1) اس نے تیوری ڈالی: عبس۔ قرآنِ کریم نے یہ نہیں بتایا کہ کس نے تیوری ڈالی؟ **ثُمَّ نَظَرَ** پھر اس نے تنقیدی نگاہ ڈالی اور پھر اس سورۃ میں آ گیا کہ **ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ** ❹ (74:22)۔

عبس وتولیٰ کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت

عزیزانِ من! عبس وتولیٰ کے سلسلے میں قرآن تو یہاں (74:22) میں وہی لفظ عبس لے آیا ہے کہ پھر اس نے ماتھے پہ تیوری ڈالی' اور اس کے ساتھ ہی کہا: بسر (74:22) وہ بہت افسردہ ہوا' بہت تنگ نظر ہوا' منہ بسورا' اور پھر **ثُـمَّ اَدۡبَـرَ وَاسۡتَـكۡبَرَ** (74:23) نہایت تکبر کے ساتھ منہ پھیر کر چل دیا۔ چند ہی سورتیں پہلے سورۃ المدثر میں یہ سارا کچھ ہمارے سامنے آیا تھا۔ اب یہ بات ہے کہ یہ لوگ کہتے

---

❶ سورۃ المدثر

❷ اس نے' بار دگر' اس دعوت پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ (جب یہ تمہارے پاس آیا تو تم نے اُسے اسی کا نفع نقصان اچھی طرح سمجھا دیا۔ اُسے بتا دیا کہ اس کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا اور قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کس قدر خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔ چنانچہ) اُس نے' اس پہ غور کیا۔ دونوں راستوں کا باہمی مقابلہ کیا اور پھر اس کا اندازہ لگایا کہ کون سی راہ اس کے لیے فائدہ مند ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❹ (اس کے سینے کی کشمکش کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہو گئے۔) اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔ (ایضاً)

کیا تھے۔ میں پھر عرض کر دوں' عزیزانِ من! قرآن فہمی کا اصول سمجھتے جائیے۔ آپ نے غور فرمایا کہ پہلی چیز تدبر کی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس پہ کھڑے ہو کر سوچیں۔ اگلی چیز تھی کہ اگر وہ چیز قرآن کے خلاف آئے تو پھر آپ کا فریضہ ہو جائے گا کہ آپ قرآن سے پوچھیے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ آپ نے دیکھا کہ میں نے آپ کے سامنے ایک ہی مثال پیش کی ہے۔ اس سے کس طرح نکھر کر بات سامنے آ گئی۔ اب اگلی بات ہے کہ یہ آ کر کیا کہتے ہیں؟ میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ قریش کی یہ حالت تھی اور وہ یہ کچھ کہتے تھے۔ برادرانِ عزیز! مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں یہ اپنی طرف سے کہوں۔ قرآن یہ سب کچھ کہہ رہا ہے' میں نے بہر حال اللہ تعالیٰ کے فضل سے' اس کی توفیق سے' ایک عمر اسی میں گزاری ہے' غور کیا ہے' قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق قرآن کو سمجھا ہے۔

سنیے! وہ کہتے کیا تھے؟ وہ بڑے لوگ' ان چھوٹے لوگوں کو جو' ان کی نظروں میں پست درجہ کے کمینے اور غلام تھے' حقارت کی نظر سے دیکھتے اور کہتے کہ لو! هٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا ❶ (6:53) اچھا! یہ ہیں وہ لوگ جن پر خدا نے اپنا اتنا بڑا فضل کیا ہے' نوازش کی ہے' ذرا انہیں دیکھو تو سہی۔ عزیزانِ من! یہاں نظر آ گیا کہ وہ کیسے لوگ تھے۔ کسی اصولی بات پہ بحث نہیں ہو رہی ہے۔ وہ کہہ یہ رہے تھے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن پر خدا نے اتنا بڑا فضل کیا ہے؟ اب اگلا سوال یہ ہے کہ ان کا مطالبہ کیا تھا؟ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کو جو کہا ہے' اس سے نظر آتا ہے کہ ان کا مطالبہ کیا تھا۔ سورۃ یونس اور سورۃ ھود میں یہ کہا ہے کہ ان اکابرین کے ساتھ اس معاملے میں مفاہمت نہ کرنا۔ یہ کیا بات تھی؟ اسی سورۃ الانعام میں ایک ہی آیت پہلے کہا کہ وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ (6:52) یہ جو خلوصِ دل سے خالصۃً لوجہ اللہ اس دعوت پہ لبیک کہتے ہوئے' اے رسول! تمہارے پاس آ گئے ہیں' اور صبح و شام اس دعوت کو عام کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں' ان لوگوں کے کہنے سے ان کو دھتکار نہ دینا۔ نظر آیا کہ وہ کیا مطالبہ کرتے تھے' ان کی کیا شرط تھی' کس بات پہ مفاہمت چاہتے تھے۔

مساواتِ انسانیہ کا ہی دوسرا نام دین کا فروغ ہے

عزیزانِ من! قرآن نے واضح کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا کہ تمہاری یہ خواہش کہ اس جماعت میں بڑے بڑے لوگوں کو شامل ہونا چاہیے تاکہ وہ دین کی تقویت کا موجب بنیں' کسی طرح بھی ان غریبوں کے خلاف نہیں جانی چاہیے' بالکل نہیں' یہ بات ہی نہیں ہونی چاہیے' خواہ تمہیں اس سے اتنی بڑی منفعت کیوں نہ نظر آتی ہو کہ صاحب! اس میں اسلام کی شوکت ہے' دین کا فروغ ہے۔ اس قسم کے Justificatory Reasons (وجہ جواز) دے کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا۔ بنیادی تو دین اسلام کی یہ ہے کہ مساواتِ انسانیہ

---

❶ یہ ہیں وہ جنہیں ہم میں سے انعاماتِ خداوندی کے لیے چن لیا گیا ہے۔ ذرا ان کی حالت تو دیکھو؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہو۔ اگر مساواتِ انسانیہ کی قیمت دے کر آپ نے دین کا فروغ چاہا تو دین تو پہلے ہی ختم ہوگیا۔ جب انسانی مساوات ختم ہوگئی تو دین تو ختم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا کہ صاحب! پھر اس سے دین کا بھلا ہوگا' فروغ ہوگا' اسلام ترقی کرے گا' غلط ہے۔ اسلام تو پہلے ہی ختم ہو چکا۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا کہ بالکل نہیں' قطعاً نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بالکل نہیں آتا' نہ آئے' کوئی بات نہیں اسلام نے Votes (ووٹ) نہیں لینے ہیں کہ اسے گنتی چاہیے کہ کتنے آدمی ساتھ ہیں۔ وہ تو کوالٹی (Quality) دیکھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ خلوصِ قلب کتنا ہے۔ یہ لوگ اس قدر دل کی چاہت سے' جھک کر' اسلام کی طرف آتے ہیں: **مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ** (6:52) یہ بیچارے کیا کام کاج کرتے ہیں؟ حضرت نوحؑ کے زمانے میں انہوں نے کہا تھا: یہ کنجڑے ہیں' سبزیاں بیچتے ہیں' کوئی موچی ہے' ان میں سے کوئی ترکھان ہے' کوئی لوہار ہے۔ یہاں حضور ﷺ کو یہ کہا کہ یہ لوگ تم سے یہ کہتے ہیں کہ بتاؤ تو سہی کہ یہ کیا کام کرتے ہیں' یعنی وہ تو قریش کا چودہ سو سال کا زمانہ تھا' اب تو وہ چیز بکھر گئی ہماری تقسیم سے پیشتر ہمارے جو گاؤں تھے ان کے اندر جو زمیندار راجپوت یا جاٹ وغیرہ ہوتے تھے' وہ گاؤں کے کمہار اور لوہار کو اپنی چارپائی پہ بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ آج کے زمانے میں یہ جو قرآن نے ''حسابہم'' کہا ہے کہ یہ تم سے کہتے ہیں کہ صاحب! ان میں سے کوئی مٹی کے برتن بناتا ہے' کوئی لوہار کا کام کرتا ہے' کوئی کنجڑے کا کام کرتا ہے۔ کہا کہ اسلام کو اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ کیا کام کرتے ہیں' سوال تو یہ ہے کہ دین میں ان کا مقام کیا ہے۔ کہا کہ ان کی ان باتوں میں نہ آجانا۔ **فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ** (6:52) اف' اس قیمتی متاع کو دھتکار دیا' تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ یہ رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے۔

عزیزانِ من! قدم قدم پہ سوچتے چلے جائیے۔ وہ جو **عَبَسَ وَتَوَلّٰى** کا عام مفہوم دیا جاتا ہے کہ رسول نے یہ کیا تھا' آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح اس کی تردید کرتا چلا جا رہا ہے۔ خدا کے اتنے واضح احکام کے بعد بھی آپ سوچتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کیا ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ کہا کہ جی! ان کو دھتکارنا نہیں' یہ بڑی گراں بہا متاع ہے۔ ایک اور ریفرنس لے لیجیے' یہ بڑے اہم مقام ہیں۔ ادھر تو یہ کہا تھا کہ کہیں ان کو دھتکار نہ دینا' ادھر مثبت ہے۔ اب یہ کہا ہے کہ **وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا** [1] (18:28)۔ یہاں کہا ہے کہ انہی کے ساتھ استقامت

---

[1] اے رسول! تُو بھی' اپنے ان رفقاء کے ساتھ' جو صبح شام (ہر وقت) نظامِ خداوندی کی دعوت کو عام کرنے میں لگے رہتے ہیں' اور اپنی تمام توجہات کو اسی مقصد پر مرکوز رکھتے ہیں' اس پروگرام پر استقامت کے ساتھ جما رہ (6:52; 8:62-64; 89:29-30) ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ تو دنیاوی مفادِ عاجلہ کی کشش و جاذبیت کے پیچھے لگ کر ان لوگوں سے اپنی نگاہیں پھیر لے۔ (یہ مخالفین تمہیں ان رفقاء سے برگشتہ کرنے کی بڑی کوشش کریں گے) سو تم کسی ایسے شخص کی بات پر کان نہ دھرنا جس کے دل پر ہمارے قوانین کی طرف سے' پردے پڑ چکے ہوں اور وہ اپنے جذبات کے پیچھے لگ رہا ہو۔ ایسے شخص کا معاملہ حد سے گزر چکا ہوتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سے رہو جو ان کی نگاہوں میں ایک بڑی قیمتی متاع ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ یہ اپنے رب کو صبح و شام' قلب سلیم کے ساتھ' دل کے خلوص سے پکارتے ہیں۔ یہ ہے تمہاری جماعت۔ ان کے ساتھ مستقل مزاجی سے' استقامت سے رہو' ان کے ذہن میں سوائے اس کے کوئی اور مفاد یا مطلب نہیں ہے کہ دین کا فروغ ہو' خدا کا نظام قائم ہو۔ اپنے آپ کو ان کے ساتھ رکھو' ایسا نہ ہو کہ یہ جو اتنے اتنے بڑے مال اور دولت اور نعما اور سامانِ آسائش اور زیبائش لے کر تمہارے پاس آجاتے ہیں کہ یہ تمہارے لیے وجہ کشش بن جائیں' اور تم انہیں دھتکار دو۔ یاد رکھو یہ وجہ کشش نہیں ہو سکتے۔ کہو کہ بتاؤ' تم کس قسم کا قلب لے کر ہمارے ہاں آئے ہو' اس بازار میں تو اس کی قیمت ہے' تمہارے اس مال و دولت کی قیمت نہیں ہے۔ قرآن یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے اور پھر یہ تو خاص طور پر ان کے متعلق کہا ہے۔

بات تو واضح ہی تصریفِ آیات سے ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس سلسلے میں ایک اور ریفرنس لے لیجیے: **لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ** (15:88) [1] یہ ٹھیک ہے کہ ان کے پاس بہت مال و دولت ہے۔ یہ بہت کچھ دینے کی پیشکش بھی کرتے ہونگے۔ یہ بھی کہتے ہونگے کہ اس سے تمہاری اس تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہوگا۔ تمہارے پاس تو چار پیسے بھی نہیں ہیں' جہاد میں جانے کے لیے سواریاں بھی نہیں ہیں' ہم یہ سب کچھ دیتے ہیں' بس ہماری ایک شرط مان لو۔ کہا گیا کہ یہ قطعاً نہ ماننا' یہ جو اس قسم کے لوگ ہیں جن کو یہ غریب کہتے ہیں' ان کو سنبھالو' اس طرح ان کی حفاظت کرو جیسے مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ چیزیں قرآن کے بیشتر مقامات میں کہی ہیں۔ میں نے اس سے صرف چند ایک کے حوالے آپ کو دیئے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تصریفِ آیات سے بات کیسے صاف ہو جاتی ہے۔ اس آیت (74:22) میں تو **عبس** کا لفظ ہی آ گیا کہ یہ قریش کے یا تو کچھ بڑے بڑے سردار تھے یا شاید ایک ہی سردار تھا۔ جو کچھ قرآن نے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ آیا کرتے تھے' پھر رسول اللہؐ کے ساتھ اس معاملے میں گفتگو کیا کرتے تھے' بحث کیا کرتے تھے' آپ ﷺ بھی کوشش کرتے تھے کہ وہ لوگ کسی طرح سے سمجھ جائیں' صحیح راستے پہ آجائیں۔ ٹھیک ہے یہ ہوا کرتا تھا اور یہ چیز بھی قرآن نے بتائی کہ بات یہ ہوتی تھی کہ ان کی نگاہوں میں جو لوگ پست درجے میں تھے' جن کو وہ کمین لوگ کہتے تھے' اپنے سے پست خیال کرتے تھے' اس میں پہلی چیز یہ ہوتی تھی کہ وہ انہیں بہت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اب یہ چیزیں ہمارے سامنے تصریفِ آیات سے آ گئیں۔ اب قرآن کی طرف آیئے اور اس عبس کو دیکھیے کہ وہ قریش کا ایک

---

[1] تم طبعی زندگی کے اس ساز و سامان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف طبقات کو دے رکھا ہے' نہ ہی تم اپنے آپ کو اس غم میں گھلاتے رہو کہ یہ لوگ صحیح راستے کی طرف آ کر' زندگی کی تباہیوں سے کیوں نہیں بچ جاتے! تم اب (ان مخالفین کا خیال چھوڑ کر) ان لوگوں' جو اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں' اپنے بازوؤں کے نیچے سمیٹتے جاؤ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نمائندہ مال و دولت میں مستغنیٔ آیا ہوا ہے بیٹھا ہوا ہے اور اتنے میں اَنْ جَآءَ هُ الْاَعْمٰى (80:2) [1] عزیزانِ من! یہ تو محفلِ نبوی ﷺ ہے بارگاہِ نبوی ہے کسی شہنشاہ کا دربار تو نہیں ہے کسی بڑے سردار کا دربار نہیں ہے کہ وہاں کسی غریب کی کسی چھوٹے آدمی کی باریابی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کھلا ہوا دربار تھا کہ اَنْ جَآءَ هُ الْاَعْمٰى (80:2) وہاں آپؐ سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے ایک غریب اندھا معذور آ گیا۔

ماتھے پہ تیوری کس نے چڑھائی؟

عزیزانِ من! عربی زبان میں اعمٰی نابینا کو بھی کہتے ہیں اندھے کو بھی کہتے ہیں اور جو مال و دولت سے محروم ہو اُسے بھی کہتے ہیں۔ یہ جامع لفظ قرآن یہاں لے آیا ہے کہ وہ اندھا بھی ہے اور غریب بھی ہے۔ یہاں پہلی چیز تو یہ ہوئی۔ معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہوا کہ عام طور پہ ہمارے ہاں بھی اندھے کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ وہ تو بڑی ہمدردی کے قابل ہوتا ہے۔ پہلے تو اندھا ہونا ہی کچھ کم نہیں پھر غریب ہونا اس پر بھی مستزاد ہے۔ اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ کون تھا ان کے لیے وہ بات کہ جس سے اس نے ماتھے پہ تیوری ڈالی یہ تھی کہ وہ آنے والا ان میں کا کوئی سردار نہیں تھا بلکہ ایک غریب تھا اور اتفاق سے اندھا بھی تھا جنہیں یہ لوگ بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ''یہ کیوں آیا'' اس بنا پر اس قریش کے نمائندہ نے ماتھے پہ تیوری چڑھائی منہ بسورا اور نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ قرآن کے دیگر مقامات کے مطابق یہ بات صاف ہو گئی۔ قریش کے نمائندے کا نام کیا تھا اس اندھے کا تعارف کیا تھا جو آیا اس سے غرض ہی نہیں۔ اس کے بغیر قرآن کی بات جو قرآن کہہ رہا ہے صاف ہو گئی۔ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور جب قرآن نے نام نہیں دیا تو ہمیں اس تجسس کی کیا ضرورت ہے اور پھر تجسس کا ذریعہ کیا ہے۔ ذریعہ تو آپ کی یہ روایات ہیں۔ آپ ادھر جائیں تو یہ سارا کچھ بتایا گیا ہے جس میں عبس کا فاعل رسول اللہ ﷺ کو بتایا جا رہا ہے اور پھر میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن عبرت و موعظت کی تلقین و تعلیم کی کتاب ہے قیامت تک کے لیے ہے۔

قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ یہ بتائے کہ یہ جو واقعات ہیں ان میں سن (سال) اور Dates یعنی تاریخیں اور نام اور مقام سارے اس طرح سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو تاریخ کی کتاب میں ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو زندگی کا ایک اصول دینا ہے دین کی زندگی کا جو اساس ہے وہ پیش کرنا ہے اور وہ یہ چیز تھی کہ یہ بڑے بڑے مال دار لوگ سردار لوگ نفرت کے پروردہ لوگ برداشت ہی نہیں کرتے تھے کہ یہ جو چھوٹے درجے کے لوگ ہیں وہ اس جماعت کے اندر آ جائیں۔ اسی لیے کہا کہ اَنْ جَآئَهُ الْاَعْمٰى [2] (80:2)۔

---

[1] آپؐ کے پاس ایک غریب اور معذور اندھا ہدایت حاصل کرنے کے لیے آ گیا۔ (مفہوم القرآن)

[2] آپؐ کے پاس ایک غریب اور معذور اندھا ہدایت حاصل کرنے کے لیے آ گیا۔ (مفہوم القرآن)

میں پھر یہ عرض کرونگا کہ اے کاش! آپ کے سامنے قرآن کے نسخے ہوتے تو آپ دیکھتے کہ یہ آیات کیسے آ رہی ہیں۔ اس آیت کے فوراً بعد اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى ❶ (80:3)۔ اب یہاں پھر وہ کہتے ہیں کہ خدا یہ رسول اللہ سے کہہ رہا ہے: پھر تمہیں کیا پتہ ہے کہ یہ اس سے ایک نصیحت حاصل کرلے اور پاکیزہ بن جائے۔ یہ رسول اللہؐ سے نہیں کہا تھا' یہ خدا کی طرف سے وحی آ رہی ہے۔

رسول اللہؐ سے کہا جا رہا ہے کہ جس نے منہ بسورا ہے اور تیوری چڑھائی ہے کہ یہ اندھا کیوں آ گیا' اسے کہو کہ تمہیں کیا پتہ ہے کہ اندھا تم سے بھی زیادہ قرآن کی تعلیم' خدا کے احکام کی پیروی کرنے والا اور اپنی اصلاح کرنے والا ہو۔ بات صاف ہے۔ وحی نے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے' یہ کہلوایا ہے کہ اس سے کہو' جس پہ اس شخص کا آنا' بڑا گراں گزرا ہے' کہ تمہیں کیا پتہ ہے کہ یہی شخص ہے کہ اس تعلیم سے' اس کے اخلاق اتنے سنور جائیں' اس کی زندگی اتنی سنور جائے۔ یہ پہلا لفظ ہے: يَزَّكّٰى جو سوچ کی دعوت دے رہا ہے۔ قرآن کے تو ایک ایک لفظ میں بات آ جاتی ہے۔ یا کم ازکم اگلی ہی آیت میں ایک دوسرا لفظ ہے: اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (80:4) ❷۔ یہ لفظ ہے' ''تنفعه''۔

قرآن کی تعلیم سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ اگر اسے ذہنی طور پر سمجھا جائے تو اس کے جو حقائق اور معارف آتے ہیں' وہ بھی بڑی منفعت بخش چیز ہوتی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو انسان کی زندگی' اس کی سیرت سنورتی ہے۔ یہ پہلی چیز سے بھی بڑی چیز ہے۔ یہاں قرآن یہ دو چیزیں لایا ہے کہ تمہیں کیا پتہ ہے کہ فرض کرو اگر یہ صرف ذہنی طور پر ہی سمجھ لے تو پھر اس کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہوگا۔ یہ سمجھنے کے لیے آیا ہے اور اس کے بعد اگر یہ اس پر عمل کرے گا تو اس کی زندگی سنورے گی۔ وحی' نبی اکرم ﷺ کی زبان سے' اس قریش کے نمائندے سے یہ کہہ رہی ہے کہ یہ جو اس کا آنا تمہیں اتنا ناگوار گزرا ہے' تمہیں کیا پتہ ہے کہ یہ جو اس طرح اپنے دل کی کشش سے آیا ہے' ذہنی طور پہ کتنا' فائدہ اٹھا سکے' قلبی طور پہ اس کا قلب کتنا سنور جائے' تجھے اس چیز کا کیا پتہ اور اگلی دو آیات میں کہا کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ❸ (80:5-6)۔ اور یہ وہی ہے جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کیفیت تو یہ ہے۔ اس کے مقابلے میں تُو چاہتا یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے سردار ہیں' بڑے بڑے مالدار ہیں' جو اپنے آپ کو' خدا کے قوانین سے' مستغنی سمجھتے ہیں' ان کی پرواہ ہی نہیں کرتے' اس سے کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے' تو تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ

---

❶ تجھے کیا خبر کہ یہی اندھا' تمہاری تعلیم سے' کس قدر پاکیزہ اخلاق کا حامل بن جائے اور اس طرح اس کی ذات کی اعلیٰ نشو ونما ہو جائے۔

❷ یا وہ اس تعلیم کو سمجھ لے تو کم ازکم اس سے بتدریج فائدہ حاصل کرتا چلا جائے۔

❸ (اس کے برعکس) ایسا شخص جو اپنے آپ کو رشد و ہدایت سے مستغنی سمجھتا ہے' جو کہتا ہے کہ اسے اس قسم کی تعلیم کی نہ ضرورت ہے نہ پرواہ' تو تجھے کیا پڑی ہے کہ اس شخص کے پیچھے اپنی جان کھپاتا پھرے۔

میں ان کے پیچھے پیچھے پھروں، اِن کی پرواہ کروں اور اُن سے بے اعتنائی برتوں۔ یہ کچھ رسول اللہ ﷺ اس سے کہہ رہے ہیں۔ بات کتنی صاف ہوتی چلی جارہی ہے۔ وہ تصریفِ آیات سے مفہوم متعین کرلیتے تھے۔ **فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی** ❶ (80:6-7)۔ یہ جو بات ہے کہ یہ جو اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے، جو اس طرف نہیں آتا، وہ خود اس کا ذمہ دار ہے، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ آپ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اس لیے وہ ایسا ہوگیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ توجہ لینا ہی نہیں چاہتا تھا، وہ ادھر خیال ہی نہیں کرنا چاہتا، وہ اپنے آپ کو اس سے مستغنی سمجھتا تھا، وہ اس کی احتیاج ہی نہیں سمجھتا تھا۔ جو احتیاج ہی نہیں سمجھتا، سمجھنا ہی نہیں چاہتا، اگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ کہو کہ میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں، وہ خود ذمہ دار ہے کہ وہ اس سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔ **وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ○ وَهُوَ يَخْشٰی ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی** ❷ (80:8-10)۔ تم یہ چاہتے ہو کہ جو شخص اس طرح دل کی کشش سے، خدا کا احساس لیے ہوئے، لپک کر، دوڑ کر، میرے پاس آئے، میں اس سے بے اعتنائی برتوں، اس سے بے توجہی برتوں۔ **كَلَّا** (80:11) میں ہرگز یہ نہیں کرسکتا۔

عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ **كلا** کہاں آتا ہے: قطعاً یہ نہیں ہوسکتا، ناممکن ہے جو تم مجھ سے چاہتے ہو، ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ **اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ** (80:11) قرآن تو تمام نوعِ انسانی کے لیے کھلا ہوا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں یہ تفریق نہیں ہوسکتی کہ یہ مالدار ہے، یہ سردار ہے، یہ سرغنہ ہے، یہ غریب ہے، یہ اندھا ہے۔ اس میں اس تفریق کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو سورج ہے، جو بھی آنکھیں کھولے گا یہ اس کو روشنی دیدیگا۔ اس میں غریب اور مالدار کی تفریق ہی نہیں ہے۔ **اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ○ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ** (80:11-12) یہ ایک واضح صحیفہ اور کھلی ہوئی کتاب ہدایت ہے، جس پر عمل کرنے سے انسان کو شرف و مجد حاصل ہوسکتا ہے۔ جو بھی اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ نصیحت حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں معیار یہ ہے کہ نصیحت کون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو کرنا چاہتا ہے اس پر دروازے بند نہیں کیے جاسکتے، جو نہیں چاہتا، زبردستی اس کو اس طرف نہیں لایا جاسکتا۔ یہاں تو **فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ** (80:12) والی بات ہے یعنی اس سے وہی فائدہ اٹھاسکتا ہے جو اپنے دل کی مرضی سے اس کی طرف آئے۔ ان آیات سے آپ سوچ لیجیے کہ قرآن کا کتنا بنیادی اصول ہمارے سامنے آیا کہ **اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ** یہ کھلا ہوا ضابطہ حیات پوری انسانیت کے لیے ہے۔ انسان اور انسان میں فرق نہیں ہے پھر یہ تفریق جو تم چاہتے ہو کہ جو مالدار ہیں، سرغنے ہیں، سردار ہیں، بڑے بڑے لوگ ہیں، انہیں میں اپنے قریب رکھوں، ان کی طرف توجہ دوں، انہی کا میں خیال کروں، خواہ وہ اپنے آپ کو مستغنی ہی کیوں نہ سمجھیں، خواہ ایسا ہی کیوں نہ ہو کہ میں بلاؤں، وہ دوڑے چلے جائیں،

---

❶ تجھے کیا پڑی ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے اپنی جان کھپاتا پھرے۔ اگر ایسے شخص کی اصلاح نہ ہوسکے تو تجھ پر اس سے کچھ الزام نہیں آسکتا۔

❷ الزام اس سے آتا ہے کہ ایک شخص، قرآن سمجھنے کے لیے، بھاگتا ہوا تیرے پاس آئے، اور غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج کا خوف بھی ہو۔ وہ ان سے بچنا چاہے اور تُو اس سے بے رخی برتے۔ (2:2)۔

میں ان کے پیچھے رہوں، اور یہ جو غریب لوگ ہیں، جنہیں تم غریب کہتے ہو، بلکہ غریب سمجھ کر تم ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، ان کی غربت اور افلاس تمہارے لیے وجہ نفرت ہے، میں انہیں دُور کر دوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى** ❶ (80:3)۔ تُو کیا جانے کہ یہ خاک میں ملے ہوئے موتی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ، یعنی رفقائے جماعت، والذین معہٗ کے متعلق جس قدر شاندار الفاظ میں ستائش، تہنیت اور تبریک کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اُن سے نظر آتا ہے کہ ان کا مقام کتنا بڑا ہے۔ اس نمائندے سے کہا جا رہا ہے کہ ان کے متعلق تُو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ قابلِ نفرت ہیں۔ اس پہ کیا بات یاد آ گئی کہ

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

یہ خاکسار گرد آلود ہیں۔ ان کو حقارت سے دیکھ رہے ہو۔ تمہیں کیا پتہ کہ اس غبار کے اندر کتنے بڑے شاہسوار لپٹے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ انکا مقام کیا تھا؟ اقبالؒ (1877-1938ء) نے ان کے متعلق کیا ہی خوب کہا ہے۔ اس کا انداز ہی اپنا ہے صاحب! اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تشریح تو ایک طرف، مجھے تو وجد آ جاتا ہے جب میں سنتا ہوں:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

معاف فرمایئے گا حقائق کے اعتبار سے یہ بہت اونچا شعر ہے: زندگی ایک عمر تک، ایک زمانے تک، ایک عرصے تک، کعبے اور بت خانے میں روتی پھرتی ہے

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اس کے بعد کہیں جا کر بزمِ عشق سے ایک دانائے راز آتا ہے۔ انسان آسانی سے نہیں بن جاتا، یہ متاعِ گراں بہا مفت نہیں مل جاتی۔ کہا تو میر ❷ نے بھی اسے اپنے الفاظ میں ہے لیکن وہ بات نہیں بنی۔ وہ کہتا ہے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

عزیزانِ من! کیا عرض کروں کہ یہ جو انسان نکلے تھے، اُن کی صحیح تاریخ سامنے نہیں آئی۔ اس کائنات میں اتنا انقلابِ عظیم کسی اور قوم، کسی

---

❶ تجھے کیا خبر کہ یہی اندھا، تمہاری تعلیم سے، کس قدر پاکیزہ اخلاق کا حامل بن جائے اور اس طرح اس کی ذات کی اعلیٰ نشوونما ہو جائے۔

❷ میر تقی میر (1721-1810) اردو کے ان چند خوش نصیب شاعروں میں ہیں، جنہیں ان کی زندگی میں ہی غیر معمولی شاعر تسلیم کیا گیا۔
اتنی بھی بدمزاجی، ہر لحظہ، میر، تم کو — الجھاؤ ہے زمیں سے، جھگڑا ہے آسماں سے

اور زمانے میں' نہیں آیا جو' ان خاکساروں نے برپا کیا تھا' جنہیں یہ لوگ اس نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی غریب' مزدور' غلام' یہی کوئی حبش کا' کوئی فارس کا' کوئی روم کا مزدور' ❶ یہی جو تھے' تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں۔ یہ تو اتنے دانائے راز آئے۔ قرآن نے اس مقام پہ جو یہ کہا ہے کہ تجھے کیا خبر! یہ بات بڑی بات ہے۔ بڑا انداز ہے۔ رسول اللہؐ سے کہا کہ اسے کہو کہ تم مال و دولت اور اپنے نسبی اور نسلی تفاخر کے اوپر گھمنڈ میں' نشے میں بدمست ہو' تمہیں کیا پتہ انسان کیا ہوتا ہے' تُو ان کی قدر کیا جانے' تو یہ کہہ رہا ہے کہ میں ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر تم لوگوں کی طرف توجہ دوں محض اس لیے کہ تم مال و دولت رکھتے ہو۔ تفاخر کیا ہے؟ یہ بات آگے آتی ہے' یہاں نسلی اور نسبی تفاخر کو' کاٹ کر رکھ دیا۔ جو قرآن کہتا ہے' وہ بات آگے آتی ہے۔ قرآن کے متعلق یہاں بات آئی کہ یہ تو قیامت تک کے لیے تذکرہ ہے' ہر انسان کے لیے تذکرہ ہے' جس کا جی چاہے' فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ جو چاہے یہ اس کے لیے ہے' اور یہ لوگ ہیں' مَنِ اسْتَغْنٰى' جو یہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ تُو مجھے کہہ رہا ہے کہ میں ان کے پیچھے پھروں۔

کیا اب بھی کسی شک کی گنجائش ہے

عزیزانِ من! اتنی ہی آیات پر غور کر کے دیکھیے' بات سمجھ میں آ جائے گی۔ یہ کچھ قرآن کی کلی تعلیم کے مطابق ہے' مشیت خداوندی کے مطابق ہے' عظمتِ رسالت مآب ﷺ کے مطابق ہے' صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے منصب کے مطابق ہے۔ کوئی شک' کوئی شبہ' کوئی اعتراض' کوئی ابہام' کوئی الجھن' رہ ہی نہیں سکتی اور پھر کسی روایت کی ضرورت نہیں' نام معلوم کرنے کی حاجت نہیں۔ قرآن کا جو مقصد ہے وہ کھلے الفاظ میں بیان کر رہا ہے کہ یہ مقصد ہے: فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ یہ ہے بات۔ اب قرآن کا ذکر آ گیا۔ قرآن کا انداز عجیب ہے۔ ضمناً بھی ایک بات آتی ہے تو جو چیزیں کسی طرح سے کسی زمانے میں' شکوک پیدا کرنے والی بھی ہوں' ساتھ کے ساتھ ان کو بھی صاف کرتا چلا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے متعلق گہری سازش

قرآنِ کریم کے متعلق سازشوں سے جو جہاں شکوک پیدا کیے گئے' ان میں ایک یہ بھی سازش تھی کہ یہ رسول اللہؐ کے زمانے میں جمع نہیں ہوا تھا۔ رسالت مآب کا فریضہ حیات قرآن دینا تھا' خدا نے یہ کہا ہے کہ اس کا جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ اس کا محفوظ کرنا' ہمارے ذمے ہے۔ نبی اکرمؐ کا' رسالت کا فریضہ قرآن کو محفوظ کرنا تھا۔ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ کاتب تھے جو اس کو لکھتے تھے' پھر قرآن کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں' مسجدِ نبوی کے اندر' وہ جسے امام کہا جاتا تھا' وہ صحیفہ جسے ماسٹر کاپی (Master Copy) کہتے ہیں' وہ

---

❶ حبش کا حضرت بلالؓ' فارس کا سلمانؓ' روم کا مزدور صہیبؓ

موجود تھی۔قرآن میں یہ ہے کہ یہ عام پتوں اور کاغذ پہ نہیں لکھا جاتا تھا کہ وہ کمزور سے ہوتے ہیں۔ یہ ہرن کی کھالوں پہ لکھا جاتا۔اس زمانے میں لکھنے کا یہ ذریعہ سب سے مضبوط ہوتا تھا۔اسے کاغذ کہنے کی بجائے قرطاس کہیں گے اور وہ ہرن کی کھال ہوتی تھی۔قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ اس پہ لکھا جاتا تھا' لکھنے والے اتنے کاتب تھے۔نبی اکرم ﷺ اس لکھے ہوئے کو صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلا کر پڑھواتے تھے' خود پڑھ کر اس کی تائید کرتے' تصدیق کرتے' پھر اس امام میں رکھتے تھے' جو ماسٹر پیس(Master Piece) تھا۔ وہاں سے نقل کرتے تھے۔سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں یہ کاپیاں نقل ہوتی تھیں۔ ہمارے ہاں تاریخ میں یہ چیزیں بھی موجود ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ دوسرے ملکوں میں جایا کرو تو قرآن کا نسخہ اپنے ساتھ نہ لے جایا کرو' ممکن ہے دشمن اس کی بے حرمتی کرے یا ضائع کردے۔تو گویا قرآن کے نسخے موجود تھے' حضورؐ کی زندگی کے اندر' یہ سارا کچھ تھا۔خود یہ چیز قرآن کریم میں موجود ہے کہ خدا نے اس کے جمع کرنیکا اور اس کو محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا تھا۔

قرآنِ کریم تحریر میں آئی ہوئی ایک مدون شدہ کتاب' مرتب شدہ کتاب ہے۔عربی زبان میں کتاب تو کہتے ہی اُسے تھے جس کے اوراق کو جمع کر کے اس میں لوہے کا چھلا ڈال دیا گیا ہو۔آج کی اِس قسم کی جلد سازی غالباً اُس زمانے میں نہیں ہوتی تھی۔اب بھی یہ ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں بڑے بڑے فریموں کے اندر لوہے کا چھلا ہوتا ہے۔وہ لوہے کا چھلا ڈال دیتے ہیں۔یہ اوراقِ پریشاں اکٹھے کر کے جب وہ چھلا ڈالتے تھے تو وہ اس کو کتاب کہتے تھے۔قرآن کی دوسری سورۃ البقرہ کے الٓمٓ کے بعد پہلے دو الفاظ ہیں: **ذٰلِکَ الْکِتٰبُ** (2:2)اس کتاب کے خلاف شکوک پیدا کرنے کی سازشیں ہوئیں کہ یہ برس ہا برس جمع ہی نہیں ہوا تھا۔حضورؐ کے زمانے میں یہ ہڈیوں پہ تھا' کھجور کے پتوں پہ تھا' اور پھر معاذ اللہ وہ جو رجم کی دو آیات کہہ رہے ہیں' کھجور کے پتوں پہ لکھی ہوئی تھیں اور حضرتِ عائشہؓ نے کہا کہ وہ میری بکری کھا گئی اور پھر کہیں نہیں ملیں۔یعنی وہیں ایک ہی جگہ تھی' وہاں کھجور کے پتوں پہ یہ کتاب لکھی ہوئی تھی اور ان میں کا کھجور کا پتہ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ بکری آئے اور کھا جائے اور جب وہ کھا گئی تو بکری کو قصاب لے گیا تو معاملہ ختم ہو گیا۔یعنی وہ دو چار آیات پھر اس کے بعد ملی ہی نہیں ہیں۔قرآن کے خلاف یہ اتنی بڑی سازش ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! یہ سب آپ کے ہاں کی روایات کی کتابوں اور تفسیروں کے اندر موجود ہے۔قرآن کی یہ کیفیت ہے۔ یہود و نصاریٰ اور منافقین نے یہ شکوک ڈالدیئے کہ صاحب! یہ آیات تو ہیں ہی نہیں۔اور پھر جناب! جو آگے اس کی تاریخ تدوین یعنی اسے جمع کرنے کی تاریخ ہے' اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرتِ ابوبکرؓ صدیق (573-634ء) کے زمانے (632-634AD) میں جمع ہوا تھا' اور کوئی حضرتِ عمرؓ (581-645AD) کے زمانے میں (634-645AD) اور حضرتِ عثمانؓ (573-656AD) کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ جامع القرآن ہیں۔یعنی عثمان کا قافیہ ملانے کے لیے جامع القرآن نام رکھ دیا کہ جی پہلے قرآن جمع ہی نہیں ہوا تھا' انہوں نے جمع کیا اور پھر یہ بھی کہ آپ کے ہاں کتاب المصاحف ہے۔میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتا ہوں۔ یہ بھی روایات میں ہے کہ جو قرآن خود

حضرت عثمانؓ نے جمع کیا تھا' اس میں بھی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ ان سے کہا کہ غلطیاں رہ گئیں تو انہوں نے کہا کہ انہیں پڑھنے والے خود درست کرلیں گے۔ ❶ یہ کچھ خدا کی کتاب کے ساتھ ہورہا ہے جب کہ قرآن کہتا ہے: **فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ o فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ o مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ** ❷ (80:12-14) اللہ اکبر! یہ قرآن صحیفے کے اندر ہے' خود صحف ہے یعنی لکھا ہوا ہے۔ صحیفہ تو کہتے ہی مدون کتاب کو ہیں۔ یہ صحیفے کے اندر ہے' مکرم ہے' مرفوع ہے' مطہر ہے۔ اللہ اکبر! قرآن کی عظمت! وہ بہت رفعتوں والا ہے' بہت کرامت والا ہے' بابرکت باعزت ہے۔ یہ ہے اس کی کیفیت اور اس کے بعد ہے کہ **بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ o كِرَامٍ بَرَرَةٍ** (80:15-16) یہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے لکھا گیا ہے' جو بڑے معزز ہیں۔ **سَفَرَةٍ** جن کے کردار و سیرتیں بے داغ ہیں۔ **سَفَرَةٍ** سفیدی کو کہتے ہیں۔ عربی زبان میں جو ''کرام'' کا لفظ ہے' وہ ہر قسم کی عزت اور توقیر اور بلندی اور رفعت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ جو ہر قسم کے اثرات سے آزاد ہیں۔ یہ تھے' وہ نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور صداقت و شرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اترنے والے' کریم النفس اور کشادہ ظرف جن کے ہاتھوں سے' خدا کہتا ہے کہ قرآن لکھا جاتا رہا' رسول اللہ ﷺ کی زیرِ نگرانی یہ مدون ہوتا تھا اور لکھا جاتا تھا۔ لکھنے والوں کی خدا نے یہ صفات بتائی ہیں' ایسے لکھنے والے موجود تھے۔ خدا خود کہتا ہے کہ اس کو جمع کرانا' لکھانا اور پھر اس کو محفوظ رکھنا' میرا ذمہ تھا۔ یہ قرآن کے متعلق آیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ عبس کی آیت 16 تک ہم آ گئے' سترہ سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ قرآن کے خلاف کی جانے والی ان سازشوں کے متعلق تفصیل اور حوالہ جات کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 242-221۔

❷ اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو اپنے دل کی مرضی سے اس کی طرف آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے چھپا کر نہیں رکھا' بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا (کہ جس کا جی چاہے پڑھ لے اور اس سے فائدہ حاصل کرلے) اس میں بلندیٔ فکر اور پاکیزگیٔ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔

(مفہوم القرآن۔ پرویز)

دسواں باب: سورۃ عبس (آیات 17 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1984ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ عبس کی آیت 17 سے ہو رہا ہے: (80:17)۔

قرآنِ حکیم کے متعلق شکوک وشبہات

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ میں ایک کشمکش کا ذکر چلا آ رہا ہے اور یہ وہی بنیادی کشمکش ہے جو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ ایک طرف نسلی تفاخر کا حامل امیر طبقہ ہے اور دوسری طرف نچلے درجے کے غریب لوگوں کا طبقہ۔ اس نسلی تفاخر کے حامل طبقہ کا مطالبہ یہی تھا کہ یہ جو نچلے درجے کے کمینے غریب لوگ ہیں ان کو ہمارے برابر لا کر بٹھایا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ ہم اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں اور یہ داعیِ انقلاب ﷺ ہے یا ہر نبی ہے جس نے خدا کی طرف سے جواب دیا کہ یہ تو دین ہی مساواتِ انسانیہ کا ہے' اس میں نہ نسلی برتری کو کوئی دخل حاصل ہے' نہ امارت کو کوئی دخل ہے۔ **كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ** (80:11) یہ تو نوعِ انسانی کے لیے راہنمائی کا ایک ضابطہ ہے۔ **فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ** (80:12) جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کر لے۔ اس میں تم یہ جتنی اضافی چیزیں پیش کر رہے ہو' ان کا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ جب یہ کہا کہ یہ ایک تذکرہ اور ضابطہ حیات ہے تو ضمناً اس کے متعلق وہ جیسے یہ کہتے ہیں کہ بے ساختہ پن سے یہ بات سامنے لے آیا کہ یہ ضابطہ کیا ہے؟ کہا کہ **فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ٥ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ٥ بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ ٥ كِرَامٍ بَرَرَةٍ** [1] (80:11)۔ کیا بات ہے! یہ وہی ہے جیسے وجد میں آ کر کوئی چیز کہی جاتی ہے۔ عربی زبان کے کچھ الفاظ بھی آپ کو یاد ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ کس قدر والہانہ انداز سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کیا ہے' اور بات تو والہانہ انداز سے ہے لیکن ہمارے ساتھ یا قرآن کے ساتھ یا اسلام کے ساتھ یا دین کے ساتھ جو بہت بڑی سازش ہوئی ہے' یہاں اس کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

---

[1] ہم نے اسے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا ہے (کہ جس کا جی چاہے' پڑھ لے اور اس سے فائدہ حاصل کر لے)۔ اس میں بلندیٔ فکر اور پاکیزگیٔ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے لکھنے والے' اور آگے پھیلانے والے' بھی نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور صداقت وشرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اترنے والے ہیں..... کریم النفس اور کشادہ ظرف۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سازش یہ تھی کہ قرآن کے متعلق اس امت کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں' پھر اسے نا تمام کہا جائے' پھر اسے مجمل کہا جائے' پھر یہ کہا جائے کہ اس میں ابہام ہے' یہ خارجی راہنمائیوں کا محتاج ہے۔یعنی قرآن کے متعلق یہ چیز اگر دلوں میں ڈال دی جائے تو پھر دین باقی رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ تھی سازش۔اور اس سازش میں سب سے بڑی سازش یہ تھی کہ یہ کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ قرآنِ کریم کو مکمل شکل میں' ضابطے کی شکل میں' کتاب کی شکل میں' دے کر ہی نہیں گئے۔ یہ منتشر طور پر' کچھ کھجور کے پتوں' پہ لپٹا ہوا تھا' کوئی اونٹ کی ہڈیوں پہ لپٹا ہوا تھا' وہ کوئی مٹی کی چھوٹی چھوٹی تختیاں تھیں' یہ ان پہ لکھا ہوا تھا' تو گویا اس طرح سے بکھرا ہوا تھا' کہیں ایک جگہ مکمل کتاب کی شکل میں تھا ہی نہیں۔ پھر اس پر عمارت استوار ہوئی' روایات آئیں۔ میں کئی بار دروس میں اسے دہراتا ہوں اور زندگی کے آخری دم تک دہراتا چلا جاؤنگا کہ جب تک ان روایات کو دین کا درجہ دیا جاتا رہا کہ یہ یقینی دین ہیں' تاریخ نہیں ہیں اور پھر جب تک فقہ کے قوانین کو قیامت تک غیر متبدل قرار دے کر مسلمانوں کے لیئے' امت کے لیئے' شریعت کا درجہ دیا جاتا رہا' نہ اسلام قائم ہو سکے گا' نہ دنیا میں کہیں اسلامی مملکت قائم ہو سکے گی۔اسے ذہن میں رکھیے اور چونکہ یہ دروس آنے والے مورخ کے لیے بھی ریکارڈ ہو رہے ہیں' میں عرض کرونگا کہ اسے ذہن میں رکھیں اور اس حقیقت کو پھیلائیں۔اس کے بغیر جتنی کوششیں جی چاہے کر دیکھیے کوئی کامیابی نہیں ہوں گی۔آپ جب تک ان دو چیزوں کو دین مانتے چلے جائیں گے' نظام دین ثبت نہیں ہو سکے گا۔اب اس کے لیے آگے روایات آئیں کہ یہ تو کتاب کی شکل کے اندر تھا ہی نہیں' محفوظ نہیں تھا' صحف کی شکل میں نہیں تھا' پھر اسے جمع کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ان روایات میں آپ یہ سب کچھ دیکھیں گے۔ میں نے اس کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ان روایات میں کہیں تو یہ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق [1] رضی اللہ عنہ کے زمانے (13-11 ھ بمطابق 634-632ء) میں کوشش شروع ہوئی اور پھر اس قسم کی روایات بھی ہیں کہ نہیں' یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے (24-13 ھ بمطابق 634-645AD) میں شروع ہوئیں' پھر آگے یہ روایات آئیں کہ نہیں' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے (35-24 ھ بمطابق 656-645ء) میں شروع ہوئیں' یعنی پہلے اسی میں اختلاف شروع کیا' ایک کمیٹی بنائی گئی' اب انہوں نے ان کھجور کے پتوں کو' ان ہڈیوں کو' ان تختیوں کو' اکٹھا کرنا شروع کیا اور وہاں سے قرآن مرتب کرنا شروع کیا اور پھر بعض آیات ملی بھی نہیں [2]۔

رجم اور رضاعت کی آیات کی تلاش

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا کہ یہ روایات ہیں جو بتا رہی ہیں کہ مدینے میں بیٹھے ہوئے ہیں' صحابہ رضی اللہ عنہم سارے موجود ہیں' کہا یہ جا رہا ہے کہ قرآن کے جمع کرنے کے لیے جو کمیٹی بٹھائی' اس نے کوششیں شروع کیں' انہیں رجم اور رضاعت کے متعلق یہ آیات کہیں مل

---

[1] آپ ؓ کا اصل نام عبداللہ ہے۔

[2] ان سازشوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص۔218-197 اور 242-221۔

نہیں رہیں۔ دوسری طرف روایت آ رہی ہے کہ جمع کرنے کی یہ کوشش اس لیے شروع ہوئی کہ ایک جنگ میں اتنے سو قرآن کے حافظ شہید ہو گئے۔ ان روایات کے باہمی تضاد کا اندازہ لگائیے۔ یعنی مختلف تعداد ہے۔ بہرحال سینکڑوں سے زیادہ روایات ہیں کہ ایک جنگ میں قرآن کے حفاظ شہید ہو گئے تو اس پہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45ء) نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634ء) سے کہا کہ یہ سلسلہ جاری رہا تو قرآن کی حفاظت مخدوش ہو جائے گی' اسے کہیں لکھ لینا چاہیے۔ چلیے یونہی مان لیجیے تو مدینے کے اندر اتنے حافظ موجود تھے کہ ایک جنگ میں اٹھارہ سو کے قریب بھی یہ تعداد پہنچتی ہے' سینکڑوں کی تعداد میں ہیں کہ وہ ایک جنگ میں شہید ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے حافظوں کی ان روایات کی رو سے اتنی تعداد تھی' تو اس کے جمع کر کے لکھنے میں دقت کیا پیش آ سکتی تھی۔ وہ تو ایک حافظ Dictate (املاء) کرا سکتا تھا۔ اب آپ کے ہاں زیادہ سے زیادہ دو حافظ ہوتے ہیں۔ تراویح میں یا شبینوں میں ایک قاری ہوتا ہے' ایک سامع ہوتا ہے' اگر کہیں کسی جگہ بھی وہ قاری غلطی کرتا ہے' سامع ٹوک دیتا ہے تو بات صاف ہو گئی۔ یہ دو حافظ اکٹھے ہو کر اس کو ڈکٹیٹ Dictate (املاء) کرا سکتے تھے۔ یہ لوگ یہ چیز بھول گئے' اور دانستہ روایات کے اندر اس قسم کے تضادات رکھے کہ یہ امت الجھاؤ میں پڑی رہے۔ کمیٹی بیٹھی' ڈھونڈ رہے ہیں' آیات مل نہیں رہیں' اتنے حافظ موجود ہیں۔ کمیٹی تو ان حافظوں کی ہونی چاہیے تھی' مگر ان کے ہاں کمیٹی بیٹھی ہے اور ڈھونڈ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! مدینہ منورہ میں جہاں اس طرح بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45AD) اس شہر کے اندر شہد کی مکھیوں کی طرح قرآن کی تلاوت گونجتی ہے' وہاں آیات مل نہیں رہیں۔ تلاش کرتے کرتے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ بیٹے! یہ ٹھیک ہے' قرآن میں یہ آیات تھیں' پھر سوالیہ انداز میں کہا کہ کیا وہ تھیں؟ آپ شواہد کی رو سے ایسے بات کر رہی ہیں جیسے پتہ نہیں کہ سو سال کے بعد یہ بات شروع ہو گئی ہو۔ وہیں بیٹھے ہوئے وہ کہہ رہی ہیں کہ یہ ''تھیں۔'' پھر کیا ہوا؟ کہ جی! یہ کھجور کے پتے پہ لکھی ہوئی تھیں اور ہمارے گھر کے اندر وہاں' آپ اُسے ایک چارپائی سمجھ لیجیے' بکری کی رسی باندھ رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت ہم گھر والے تو پریشانی میں الجھ گئے۔ بکری باہر صحن سے رسی تڑا کر اندر چلی گئی اور اس نے جا کر یہ پتہ کھا لیا۔ ختم ہوا قصہ۔ وہ کھا گئی۔ اب اس روئے زمین پر وہ آیات موجود ہی نہیں' باقی ہی نہیں رہیں کہ وہ تو بکری کھا گئی۔

آیات بکری کھا گئی

عزیزانِ من! آپ کے ہاں قرآن کے متعلق یہ روایات ان صحاح ستہ کے اندر موجود ہیں جنہیں حدیثوں کی صحیح ترین کتابیں کہتے ہیں۔ بکری ان آیات کو کھا گئی۔ کیا کریں کہ صاحب! وہ تو اب موجود نہیں وہ قرآن میں تو نہیں لکھی جا سکتیں۔ حضرت عمرؓ (581-644/45ء) سے پوچھا گیا' کیونکہ وہ خلیفہ تھے۔ یعنی یہ بات غالباً ان کے زمانے میں ہوئی کہ کیا کریں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے

میں ہم ان آیات کی تلاوت کرتے تھے۔ تو بھئی ٹھیک ہے، جب تلاوت کرتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے اور آپ رضی اللہ عنہ تو ہیڈ آف دی اسٹیٹ (سربراہِ مملکت) موجود ہیں، آپ کو تو یہ اقتدار بھی حاصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے جلیل القدر صحابی ہیں، آپ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی تلاوت کرتے تھے تو قرآن میں داخل کیجیے۔ کہنے لگے: نہیں بابا! اعتراض ہو جائے گا کہ عمرؓ نے اپنی طرف سے قرآن میں کچھ داخل کر دیا۔ ''اپنی طرف سے''! کے لفظ قابلِ غور ہیں۔ پھر کیا کیا جائے؟ کہ جی! قرآن میں تو انہیں داخل نہ کیا جائے لیکن ان کا حکم برقرار رکھا جائے۔ آپ کے ہاں قرآنِ مجید کی یہ تاریخ ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کی بیسیوں آیات ہیں جو قرآن میں موجود ہیں اور ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ کس لیے موجود ہیں؟ تلاوت کے لیے کیونکہ ایک ایک حرف سے دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ وہ ثواب کی خاطر رکھی ہوئی ہیں، حکم ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔ ایک تو اس قسم کی آیات ہیں کہ قرآن میں موجود ہیں، حکم منسوخ ہے اور دوسری وہ آیات ہیں کہ جن کا حکم چلتا ہے مگر وہ قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ کتنی گہری سازش تھی۔ قرآن کی حفاظت خدا نے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہ مکمل، آخری، محفوظ، غیر متبدل، ضابطہ حیات ہے اور آپ کے ہاں ان روایات کی رو سے اس کی تعریف یہ ہے۔ یہ روایتیں حدیث کی شکل میں، صحاح ستہ کے اندر موجود ہیں، جو حدیث کے چھ صحیح ترین مجموعے ہیں، یہ ان میں موجود ہیں۔ اب کسی کی جرأت نہیں کہ وہ انہیں ان سے نکال دے۔ یہ ہے آپ کے ہاں قرآن کی کیفیت۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے یعنی اس کو تو یہ پتہ تھا کہ ان لوگوں نے کیا کرنا ہے۔ یہاں بات شروع ہوئی کہ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (80:11) قرآن تذکرہ ہے۔ ایک واضح صحیفہ اور کھلی ہوئی کتاب ہدایت ہے جس پر عمل کرنے سے انسان کو شرف و مجد حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن کی اپنی شہادت

عزیزانِ من! آپ اندازہ لگائیے کہ خدا قرآن میں خود کہتا ہے کہ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ❶ (80:11)۔ یہاں یہ صحفٍ ہے۔ صحیفوں کے اندر ہے۔ عرب تو لکھی ہوئی چیز کو صحف کہتے ہیں اور اس کے ساتھ اس صحف کی صفت یہ ہے کہ یہ قرآن مکرمۃٍ ❷ ہے۔ اب قرآن تو خود خدا کی طرف سے ہے جو اس کتاب کو نازل کرنے والا ہے۔ وہ اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ o مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ❸ (80:13-14)۔

---

❶ ہم نے اسے (قرآن کو) چھپا کر نہیں رکھا، بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا ہے (کہ جس کا جی چاہے پڑھ لے اور اس سے فائدہ حاصل کر لے۔)

❷ واجب التکریم، نہایت باعزت (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ ہم نے اسے (قرآن کو) چھپا کر نہیں رکھا، بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا ہے (کہ جس کا جی چاہے پڑھ لے اور اس سے فائدہ حاصل کر لے۔) اس میں بلندیٔ فکر اور پاکیزگی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ (ایضاً)

اللہ اکبر! واجب التکریم ہے' شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ مرفوعۃٍ ہے' ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے' مطھر ۃٍ ہے اور پھر یہ یونہی ایسا نہیں ہوگیا بلکہ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ ❶ (80:15)۔ قرآن ان لکھنے والوں کے لیے یہاں ''سفرۃ'' کا لفظ لایا ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ ایک بنیادی معنی تو اس کے ہوتے ہیں: کسی چیز کو تحریر سے چمکدار بنا دینا۔ چونکہ انسان کا مافی الضمیر چمک کر سامنے آتا ہے اس لیے اس کو بھی سفرۃ کے لفظ سے منسوب کیا ہے۔ یہ جو سفیر ہوتا ہے' وہ سفرۃ سے ہے۔ اسی سے سفر کا لفظ ہے۔ جسے آپ سفر کہتے ہیں' جسے Journey کہا جاتا ہے' اس کے معنی کسی بات کو دُور دُور تک لے جانا بھی ہوتا ہے' یعنی واضح کرنا' چمکدار بنانا' دُور دُور لے جانا۔ اسی سے آپ کے ہاں سفیر کا لفظ آتا ہے۔ وہ آپ کی مملکت کے پیغام کو دُور دُور تک پہنچانے والا ہے' یعنی یہ ہیں وہ جو قرآن کے لکھنے والے ہیں' وحی کے کاتب ہیں' یہ ان کی صفت بتائی گئی ہے: سفرۃٍ یعنی نہایت چمکدار بنانے والے' تعریف کی رو سے دُور تک پہنچانے والے بھی: کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ❷ (80:16)۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں یہ جو ایک لفظ ''کرم'' ہے یا ''کرام'' ہے' یہ بڑا جامع لفظ ہے۔ آپ کسی کی جتنی صفاتِ حسنہ بیان کرتے جائیں گے' اگر آپ انہیں ایک لفظ کے اندر کہیں تو وہ کرام کا لفظ ہوتا ہے۔ کرام بھی ہیں اور اس کے ساتھ بررۃٍ بھی ہیں کہ ان پر کسی قسم کا کوئی اثر Influence نہیں تھا۔ بررۃ کے معنی ہوتا ہے: کسی چیز سے آزاد ہو جانا' وہ ان چیزوں سے بالکل بلند تھے' ان پر کوئی کسی قسم کا اثر نہیں تھا۔ یہ تھے لکھنے والے۔ صحف کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ لکھا گیا۔

قرآنِ حکیم کے متعلق شکوک وشبہات کی ایک دوسری وجہ

عزیزانِ من! خدا اس قرآن کی حفاظت کا ذمہ لے رہا ہے۔ یہ وہ قرآنِ مجید ہے جو نبی اکرم ﷺ امت کو دے کر گئے لیکن شکوک اور شبہات یہ پیدا کیے گئے ہیں کہ یہ رسول اللہ کی طرف سے اس شکل میں دیا ہی نہیں گیا تھا۔ قرآن کے متعلق شکوک پیدا کرنے کے لیے' اس کی دوسری وجہ اور بھی ہے اور وہ آجکل ہمارے سامنے آرہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس عاجز' گناہگار کا تو قصور ہی یہ ہے کہ یہ قرآن کو خدا کا مکمل آخری غیر متبدل ضابطہ حیات مانتا ہے۔ یہ جرم ہے۔

جب کہا گیا کہ صاحب! اگر یہ احادیث دین تھیں تو رسول اللہ ﷺ کو چاہیے تھا کہ انہیں خود مرتب ومحفوظ کرکے امت کو دے کر جاتے تاکہ امت میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہ رہتا' اختلاف نہ ہوتا۔ یہ جتنے اختلافات' ہزار برس میں' آپ کے سامنے آرہے ہیں کہ یہ طے بھی نہیں ہو پاتا کہ تراویح کی رکعتیں بیس ہیں یا آٹھ ہیں۔ یہ سارا ان روایات کی رو سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو چاہیے تھا کہ اپنی روایات کا ضابطہ' جو آپ دین کہتے ہیں' قیامت تک کا مکمل شکل میں' منضبط شکل میں' دے کر جاتے۔ اس زمانے میں یہ اعتراض ہوتا ہوگا۔

---

❶ اس کے لکھنے والے اور آگے پھیلانے والے بھی نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ صداقت اور شرافت کے بلندترین معیار پر پورے اترنے والے ہیں...... کریم النفس اور کشادہ ظرف۔ (ایضاً)

آج یہ اعتراض ہمارے خلاف ہوا کہ تم ثابت کرو کہ قرآنِ شریف کو حضورؐ مرتب شکل میں دے کر گئے تھے۔ حضور ﷺ تو اس کو بھی مرتب شکل میں دے کر نہیں گئے تھے۔ چل بھئی، نہ قرآن کو حضورؐ نے مرتب شکل میں دیا، نہ حدیث کو مرتب شکل میں دیا۔ نبوت ختم ہو گئی، ٹکریں مارتے رہو۔ یہ ایسی سازش ہے جو آپ کو قیامت تک کے لیے کسی ایک نکتے پہ جمع ہی نہیں ہونے دیتی۔ آج تک یہی جواب دیا جاتا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو قرآن کو بھی نہیں دے کر گئے تھے۔ اب جو میں نے کہا کہ صاحب! یہ تو پھر آپ کی ان روایات کی رو سے پتہ چلتا ہے کہ نہیں دے کر گئے تھے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ یہی جو عبس والی روایت ہی ہے وہ مثلاً حضرتِ عائشہؓ سے مروی ہے یعنی وہ روایت کرتی ہیں، آگے وہ قصہ بیان ہو جاتا ہے۔ پڑھنے والا یوں سمجھتا ہے کہ جیسے حضرتِ عائشہؓ نے امام بخاریؒ سے یہ بات کہی اور آپ نے یہ لکھ لی۔ وہاں اسی طرح سے حضرت عمرؓ سے مروی ہے، فلاں صحابہؓ سے مروی روایت ہے۔ دو سو سال کے بعد یہ لکھنے والا لکھ رہا ہے، لکھ بھی نہیں رہا، جمع کر رہا ہے اور کہہ یہ رہا ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ [1] اور یہ حضرت عمرؓ (581-644/45ء) سے مروی ہے۔ یہ مروی، آپ کو پتہ ہے، کیسے ہوئے۔ یعنی عوام کو ان چیزوں کے متعلق معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

دو سو سال تک کی پھیلی ہوئی کڑیاں

عزیزانِ من! یہ روایات آپ ﷺ سے قریباً دو سو سال بعد جمع کی گئیں۔ ان دو سو سال کے عرصے میں آپ سوچ لیجیے کہ کتنے راوی آئے ہوں گے۔ امام بخاری [2] نے روایات جمع کرنا شروع کیں۔ یہ جتنے آئمہ حدیث تھے، انہوں نے انہیں کیسے جمع کرنا شروع کیا؟ یہ پھر پھر کے پوچھتے تھے کہ بھئی! رسول اللہ ﷺ کی کوئی بات تمہیں معلوم ہو تو بتاؤ۔ اس نے بتائی تو انہوں نے کہا کہ بھئی! تمہیں یہ کیسے معلوم ہے؟ کہ جی، میں نے اپنے باپ سے سنا تھا۔ ٹھیک ہے، اور باپ قبر میں چلے گئے۔ پھر ان سے پوچھا کہ انہوں نے کہاں سے سنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جی، فلاں سے سنا تھا۔ اب یہ بیان کرنے والا دو سو سال تک کی کڑیاں بیان کر رہا ہے: اس نے ان سے سنا تھا، اس نے ان سے سنا تھا، اس نے ان سے سنا تھا، اور آخر میں جا کر اس نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634ء) سے سنا تھا۔ اب انہوں نے لکھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634ء) سے مروی ہیں اور یہ حدیث آ گئی۔ اب اِس سننے پڑھنے والے کے ذہن میں تو یہ آیا کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ (573-634ء) نے یہ فرمایا تو وہ تو ساری عمر رسول اللہؐ کے ساتھ رہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ یہ بتاتے نہیں ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ یہ دو سو سال کا درمیان کا عرصہ ہے۔ پھر درمیان میں بات آ گئی۔ ہمارے ہاں عدالتیں بھی بنتی ہیں اور اب تو

---

[1] حضرت عائشہؓ 65 برس کی عمر تک آپؐ کی شریک زندگی رہیں (حوالہ: پرویزؒ: معراج انسانیت، باب درونِ خانہ، ص 741۔)

[2] امام بخاریؒ: آپ کا نام امام محمد اسمٰعیل بخاری ہے۔ آپ کا سن ولادت 194ھ ہے۔ آپ بخارا میں پیدا ہوئے آپ 256ھ (یا بعض کے نزدیک 260ھ) میں سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ آپ نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے مکررات حذف کرنے کے بعد 2762 احادیث اپنے مجموعہ میں درج کیں۔

شرعی عدالتیں بھی ہیں۔ کسی عدالت میں، کسی شہادت دینے والے یعنی گواہ کو بلایئے اور وہ آ کر یہ کہے کہ جی! مجھے اس واقعہ کا خود کوئی علم نہیں، میں نے خود نہیں دیکھا، میں نے کسی دوسرے سے سنا تھا اور میں گواہی دینے آیا ہوں۔ اسے کمرہ عدالت سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ یہ شہادت ہی نہیں ہے کہ میں نے کسی دوسرے سے سنا تھا۔ یہاں روایات کی تدوین ❶ کے سلسلے میں کیفیت یہ ہے کہ دین متعین کر رہے ہیں اور شہادت کی یہ کیفیت ہے کہ جو بیان کرنے والا ہے، وہ بتا رہا ہے فلاں سے سنا اور دو سو سال تک کے لیے پانچ چھ کڑیاں آ جاتی ہیں اور اس شہادت کو غیر متغیر دین بنایا جاتا ہے۔

اختلافات رفع کرنے کا واحد طریق

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب تک دین میں آپ فائنل اتھارٹی، سندِ آخر، سندِ واحد، خدا کی کتاب کو نہیں مانیں گے نہ آپ کے اختلافات رفع ہوں گے، نہ دین قائم ہوگا، نہ کوئی مملکت اسلامی بن سکے گی۔ قرآن کے متعلق جہاں بھی آتا ہے وہ یہ ہے کہ **اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ** (75:17) اس کا جمع کرنا ہمارے ذمہ تھا۔ خدا قرآن میں کہتا ہے کہ اس کا جمع کرنا ہمارے ذمہ تھا۔ اس کے برعکس تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ قرآن کوئی جمع ہی نہیں ہوا تھا، یہ ویسے ہی بکھرا ہوا چھوڑ گئے تھے۔ یہ اور یہ لوگ تھے جنہوں نے آ کر قرآن کو جمع کرنا شروع کیا۔ اب جو جمع کرتے ہیں تو چلو کوئی تو آخری سہی۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (634-573ء) کو جامع القرآن کہتے ہیں مگر وہ بھی عثمان کا کافیہ ملتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ جامع القرآن بنا دیا۔ وہیں سے یہ ہوا کہ یہ قرآن پہلے جمع نہیں ہوا تھا، تو چلو حضرت عثمان جامع القرآن ہو گیا۔ چلو یہی سہی، کیا اس سے امت متفق ہو گئی؟ نہیں جی۔ اس کے بعد روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (656-573ء) کے جمع کیے ہوئے قرآن میں بھی غلطیاں تھیں، وہ انہیں پوائنٹ آوٹ (Point out) کی گئیں کہ یہ غلطیاں رہ گئیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں، امت بہت بڑی ہے، وہ تلاوت سے خود ٹھیک کر لے گی۔ یعنی بقول ان کے جنہوں نے جمع کیا وہ آپ نہیں ٹھیک کریں گے، امت خود ٹھیک کر لے گی۔ یہ شہادات کیا ہیں؟ یہ وضع کی ہوئی روایتیں ہیں۔ یہ باتیں ہیں جو آپ کے ہاں کی کتابوں میں داخل کی گئی ہیں جسے آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری صحیفہ کہتے ہیں اس پہ سنی تو کم از کم متفق ہیں کہ یہ ان کا جمع کردہ قرآن ہے۔ اس کے متعلق بھی روایات ہیں کہ اس میں غلطیاں رہ گئی تھیں۔ ❷ تو خدا کی کتاب پر سے آپ کا یقین اٹھا، دین کی عمارت متزلزل ہو گئی، یقین باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ تھی کہ جہاں بھی قرآن کا یہ ذکر آتا ہے، کبھی یہ کہا ہوا ہوتا ہے کہ ہمارے ذمہ اس کا واضح

---

❶ مزید تفصیل اور حقیقت جاننے کے لیے ملاحظہ کیجیے: مقام حدیث، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 2001ء۔

❷ اس گہری سازش کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ حج، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء ص ص: 218-197 اور 242-221۔

کرنا ہے' ہمارے ذمہ اس کا جمع کرنا ہے' ہمارے ذمہ اس کو محفوظ رکھنا ہے اور پھر کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ o مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ o بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ o کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ❶ (80:13-16) اور اس کے بعد ہے کہ قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَکۡفَرَہٗ (80:17)۔ اِس قسم کے سازشی انسانوں کا ستیاناس ہو جائے' کہ یہ کس چیز کو چھپاتے ہیں۔ یہ اس قسم کے صحیفے کو اس قسم کے حقائق کو' چھپاتے ہیں۔ اب دو باتیں ہیں جہاں عبس سے اس کشمکش کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ اس زمانے کے قریش کے بڑے بڑے نمائندے تھے' سردار تھے۔ انہیں دولت کا نشہ تھا اور نسلی تفاخر تھا۔ پہلی چیز تو یہ نسلی تفاخر تھا جو ان کو اِدھر آنے ہی نہیں دیتا تھا اور دوسری جماعت کے ساتھ مل بیٹھنے ہی نہیں دیتا تھا۔

نسلی تفاخر کوئی چیز نہیں' کوئی شے نہیں

عزیزانِ من! یہ کشمکش حق و باطل آگے بڑھتی رہی۔ اب ان کی توجہ اس طرف ہوئی' یہ فرمایا۔ ذرا قرآن کے اس اعتراض پہ غور کیجیے گا۔ یہ بات پھر سمجھ میں آئے گی۔ ایک بچہ کسی گھر میں پیدا ہوا' اس میں اس کی کیا کاریگری ہے! لیکن کاریگری کی یہ کیفیت ہے کہ کسی خاص گھر میں پیدا ہو کر وہ ساری عمر کے لیے وجہ تفاخر ہو جاتا ہے۔ آپ اس زمانے کی قبائلی زندگی کو چھوڑ دیجیے۔ آج آپ کے ہاں سیدوں کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ' پیدائشی سید ہے۔ اب یہاں شہری زندگیوں میں تو یہ چیز کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی' صرف نام کے ساتھ سید لکھا جاتا ہے۔ کل تک ہمارے ہاں اور اب بھی گاؤں کی زندگی کے اندر تو یہ پوچھو نہیں کہ صاحب: سید کے سر کو سلام' غیر سید سید زادی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اب بھی یہ کیفیت ہے اور اس کے لیے بھی عجیب چیز ہے۔ (مثلاً) ایک سید کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا ہوا ہے۔ وہاں یہ مدعی اس مدعا علیہ کو جھوٹا ثابت کر رہا ہے' بے ایمان ثابت کر رہا ہے اور اس دوران باہر نماز کا وقت ہوتا ہے تو آلِ محمدؐ پہ درود بھیج رہا ہے یعنی وہاں آلِ محمدؐ کے ساتھ یہ درود و سلام بھیج رہا ہے' پھر عدالت میں جا کر اسے کہتا ہے تو بڑا بے ایمان ہے۔ آپ دیکھیے کہ حالانکہ وہ قبائلی زندگی کے دور چلے گئے لیکن اب تک کیفیت یہ ہے: گیا ہے سانپ نکل' اب لکیر پیٹا کر۔ وہ لکیر سانپ سے زیادہ معتبر ثابت ہو رہی ہے۔ آپ کو یاد ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ طلوعِ اسلام ❷ میں بھی لکھا ہوا ہے کہ عدالت میں ایک مجسٹریٹ نے' یہ غالباً زنا کا مقدمہ تھا' یہ کہا تھا کہ ٹھیک ہے' جرم تھا' سزا ملنی چاہیے لیکن اس سزا میں یہ لکھا تھا کہ اس نیچ ذات کے کمہار نے یا تیلی نے' ایک سید زادی سے یہ کچھ کیا اس لیے اسے دوگنی سزا ملنی چاہیے۔ ملاحظہ فرماؤ' ابھی تک نسلی تفاخر کی یہ کیفیت ہے اور سید ہی کی بات نہیں ہے' ہم جو

---

❶ ہم نے اسے (قرآنِ کریم کو) چھپا کر نہیں رکھا' بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا ہے (کہ جس کا جی چاہے پڑھ لے اور اس سے فائدہ حاصل کر لے۔) اس میں بلندیٔ فکر اور پاکیزگی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے لکھنے والے' اور آگے پھیلانے والے بھی' نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور صداقت و شرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اترنے والے ہیں......کریم النفس اور کشادہ ظرف۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ مجلّہ طلوعِ اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

بٹے ہوئے ہیں: یہ راجپوت ہیں' یہ جاٹ ہیں' یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں' پھر وہ بیچارے کمی اور کمینے آ جاتے ہیں۔ تو نسبی تفاخر کی یہ چیز تھی جو ان کے راستے میں حائل تھی اور عربوں کے ہاں تو اس میں بڑی ہی شدت تھی۔ پہلے تو عرب' من حیث العرب' باقی جتنے Non - Arab (غیر عرب) ہوتے تھے' یہ ان کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ پہلے سے ان کے تفاخر کی یہ کیفیت تھی۔ پھر عربوں کے ہاں بھی قبائل میں سے یہ قبیلہ قریش کا تھا' قریش میں بھی بنی ہاشم کا قبیلہ تھا۔ (اللہ اکبر) یہ معاذ اللہ خدا ہو جانے والی بات تھی۔ تو یہ تھے جن کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا ٹکراؤ ہوا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو حضور ﷺ کا انتخاب کیا ہے اسی عرب میں سے' اسی قریش میں سے' اسی بنو ہاشم میں سے' اور بنو ہاشم میں بھی وہ خاندان جو عبدالمطلب کا تھا' بہت بلند خاندان مانا جاتا تھا۔ اس کے ایک فرد کو چنا جو یہ کہتا ہے کہ نسلی تفاخر بالکل باطل ہے' ہر انسان دوسرے انسان کے برابر ہے۔ اگر معاذ اللہ یہ وہاں کے کسی پست قبیلے کے یا پست گوت یا ذات کے فرد ہوتے اور یہ کہتے تو ہر ایک کہتا کہ یہ اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے یہ کچھ کہہ رہا ہے' مگر یہ ان کے نقطہ نگاہ سے اتنا بڑا ہے جس سے اونچا نسلی تفاخر والا کوئی شخص ہو ہی نہیں سکتا۔

عزیزانِ من! اب انہیں یہ شخص اعلان کر کے کہہ رہا ہے' کہ نسلی تفاخر کوئی چیز نہیں۔ یہ انہیں کہہ رہا ہے جو نسلی تفاخر کی بنا پہ کہہ رہے تھے کہ اس غریب' اندھے پست قبیلے کے فرد کو یہاں کیوں بیٹھنے دیا ہے' یہ تو کمینہ ہے۔ کبھی آپ نے یہ سوچا بھی ہے؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی زندگی پر ہی غور کرنا چاہیے کہ کن کن مراحل سے گزری ہے۔ خدا کہتا ہے کہ غور کرو ہم اس کے لیے کس کس قسم کا سامانِ زیست مہیا کرتے ہیں تا کہ وہ دیکھیں کہ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (80:18) پھر تمہاری پیدائش اور تمہاری تفریق کس چیز سے ہوئی ہے۔ تو پیدائش کے اعتبار سے ہی اپنے آپ کو بڑا کہہ رہا تھا' تیری تخلیق کس چیز سے ہوئی ہے؟ مِنْ نُّطْفَةٍ (80:19) ایک قطرۂ آب (مادہ تولید) سے ہے۔ ہر انسانی بچے کی پیدائش اسی مادہ تولید سے ہوتی ہے۔ کہنے لگا: یہاں ابتدا ہوتی ہے۔ اس انداز کے آغاز کے بعد کہا کہ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (80:19) پھر اس کو خاص انداز اور پیمانے کے مطابق متشکل کیا' شکل دی' ایک خاص انداز سے اور پیمانے کے مطابق اس کا تناسب درست کیا' بچہ بنا' انسان بنا۔ کہا کہ تمہاری ابتدا تو اس جرثومے سے ہوئی۔ وہ جرثومہ تو سید نہیں تھا' قریش نہیں تھا' بنو ہاشم نہیں تھا' ابو مطلب نہیں تھا۔ اس جرثومے سے یہ پیدائش ہوئی' اور ہر انسانی بچے کی پیدائش اسی سے ہوئی۔ تو یہ بات کیا وجہ تفاخر ہوئی۔ بات تو آگے ہے کہ پھر اسے ذرائع علم' بصارت وسماعت وغیرہ' عطا کیے۔ نیز اس کے لیے سامانِ زیست مہیا کیا تا کہ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ❶ (80:20)۔ پیدائش سے بعد کے لیے قرآن میں یہ آیا ہوا ہے کہ اِنَّ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (90:10) ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے' امتیاز اور تفریق کرنے کے ذرائع: بصارت' سمع' قلب عطا کر دیئے ہیں' اب اس کے بعد خود فیصلہ کر لے کہ اس نے کونسا راستہ اختیار کرنا ہے۔

---

❶ اُس پر زندگی کی راہیں آسان ہو جائیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اس میں اس بات کو کیا دخل ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے یہ سید ہے' یہ کمہار ہے' یہ جاٹ ہے' یہ قریش ہے' یہ بنو ہاشم ہے۔ پیدائش کی یہ ساری چیزیں سب کے اندر برابر ہیں۔ ہر انسان کی پیدائش اسی طرح سے ہوتی ہے۔ یہی سمع و بصارت ہر ایک کو ملی ہوئی ہوتی ہے۔ دو راستے ہر ایک کے سامنے ہوتے ہیں جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرلے۔ اس لیے کہا کہ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ❶ (80:20) زندگی گزارنے کی راہیں آسان ہوجائیں۔ یہ طبعی زندگی ہے ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ❷ (80:21) طبعی زندگی گزارنے کے بعد' ہر انسان' خواہ بڑا سید ہے' یا وہ کمی ہے' وہ اسی طرح سے مرجاتا ہے اور دونوں کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے۔ وجہ افتخار جو تم لیے پھرتے ہو اس کے لیے قریش کے اس نمائندے سے یہ کہا جا رہا ہے' کہ وہ ہے کیا' ذرا بتاؤ تو سہی' کس مقام پر دونوں میں فرق آتا ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے دونوں کی زندگی ایک جیسی' موت ایک جیسی' قبر میں چلے گئے۔ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ❸ (80:22)۔

میں یہ عرض کروں کہ جیسا کہ میں کہتا چلا آرہا ہوں کہ ان کا تعلق انسان کی' ایک فرد کی' زندگی سے بھی ہے اور قوم کی زندگی سے بھی' کیوں کہ قوموں کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ ابھرتی ہیں' پھر زوال پذیر ہوجاتی ہیں' پھر قومیں مرجاتی ہیں' مردہ قومیں حتیٰ کہ ایسی قومیں جن میں پھر زندہ ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور ایسی بھی جن میں زندہ ہوجانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر انہیں ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ❸ (80:22) اس کے قانونِ مشیت کے مطابق حیاتِ تازہ عطا ہوجاتی ہے' افراد کو بھی ہوتی ہے۔ ہم تو موت کے بعد کی زندگی کہتے ہیں' مگر ایک انگریز کا قول ہے کہ Life after life (حیات بعد الحیات) یہ زیادہ اچھا ہے' وہ موت کو درمیان میں لاتا ہی نہیں۔ وہ اس زندگی کے بعد زندگی کہتا ہے۔ تو یہ بھی مل جاتی ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ساری چیزیں یکساں طور پر ہر انسانی بچے اور ہر انسان کے ساتھ وابستہ ہیں' اس میں نسلی امتیاز اور تفاخر کا کوئی مقام ہی نہیں ہے' پھر کس بات پہ تم جھگڑتے ہو' لیکن انسان کی کیفیت یہ ہے کہ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ❹ (80:23) جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ اسے پورا نہیں کرتے۔ خدا کیا کہتا ہے؟ میں نے کہا ہے کہ اسے تصریفِ آیات سے لیجیے۔ اب قرآن میں ''امرہ'' کے متعلق آیات لائیے' واضح ہوجائے گا کہ قرآن کیا کہتا ہے کہ ''ہم کیا کہتے ہیں جس کو یہ پورا نہیں کرتا۔''

---

❶ اُس پر زندگی کی راہیں آسان ہوجائیں۔

❷ ان میں اکثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بصارت و سماعت وغیرہ سے کام ہی نہیں لیتے اور مُردوں کی طرح قبرستانوں میں پڑے رہتے ہیں۔

❸ بعض ایسے بھی ہیں جو قانونِ خداوندی کی راہ اختیار کرکے' زندگی کی توانائیاں حاصل کرلیتے ہیں اور ان قبرستانوں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ (اسی طرح ان کی طبعی موت اور موت کے بعد حیاتِ آخرت ہے۔)

❹ (مُردوں کی سی زندگی بسر کرنے والوں) کی حالت یہ ہے کہ انہیں جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے' وہ اُسے کبھی پورا نہیں کرتے۔ (وہ اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں' اور عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کے متعلق کبھی سوچتے تک نہیں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عالم گیر تصور کی بجائے قومیت کے تصور کا نتیجہ

عزیزانِ من! قرآن نے یہ دو باتیں تو پہلے کہی ہوئی ہیں کہ ہم نے یہ کہا تھا کہ انسانوں میں تفریق نہ کریں، ہم نے یہ کہا ہے کہ يَقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ [1] (2:27; 13:21; 13:25) پوری عالمگیر انسانیت ایک امت ہے، ایک قوم ہے، انہیں ٹکڑے ٹکڑے نہ کرو۔ تو انسانیت تو ایک طرف رہی یہ تو ایک برادری میں، ایک گھر میں، ایک شہر میں، ہی انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، خاندانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، برادریوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، قوموں میں تقسیم ہو جاتے تھے، قبائل میں تقسیم کر دیا گیا اور اس دور میں جسے ہم تہذیب وتمدن کا دور کہتے ہیں، یہ جو انہوں نے تقسیم کی حدود مقرر کی ہوئی ہے: Nations کی، قوموں کی، یعنی دنیا میں سب سے زیادہ فساد اور قتال پھیلانے والی چیز یہ قومیت کی لکیریں ہیں۔ انہی پہ قومیں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتی ہیں۔ اور پھر لڑتی بھی کس طرح سے ہیں؟ یہ دو قومیں ہیں جو دونوں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں: ایران بھی اور عراق بھی، پڑوسی ایسے ہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرے کی سرحد مل رہی ہے۔ دونوں میں کیا تفریق ہے: عراق ایک قوم، اور ایران دوسری قوم، حالانکہ مذہبی اعتبار سے بھی دونوں میں شیعہ سنی یعنی مشترک ہیں، اور نسلی اعتبار سے بھی دونوں میں آبادیاں مشترک ہیں مگر سیاسی اعتبار سے جو لکیر کھینچ دی ہے اس سے یہ دو Common قومیں بن گئیں۔

سب سے بڑا ابلیسی نظام

انسان کو وطن کی بنیادوں پر لکیر کھینچ کر قوموں میں تقسیم کر دینا، یہ سب سے بڑا ابلیسی نظام ہے۔ قرآن ان لکیروں کو مٹانے کے لیے آیا تھا اور اس نے مٹا کر دکھا دیا تھا۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو ہم نے انہیں کرنے کے لیے کہا ہے وہ یہ نہیں کرتے۔ پھر رزق کی تقسیم کے معاملے میں قرآن نے یہ کہا کہ جو کچھ ہم نے بطور رزق دیا ہے وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے، اس میں الگ الگ گروہ اور ٹکڑے نہیں ہو سکتے کہ ان کے ہاں اتنا فالتو فراواں ہو کہ سمجھ میں نہ آئے کہ اس کے ساتھ کیا کریں۔ ان کے ہاں یہ کیفیت ہو کہ ڈھونڈے سے بچے کے لیے روٹی نہ ملے۔ او انسان اور انسان کے اندر یہ تفریق! کہا کہ اس کو مٹانے کے لیے تو ہم نے یہ ساری راہنمائیاں بھیجیں۔ یہ فرق کس طرح؟ یہ طبقاتی فرق کیوں ہے؟ یہ دوسری چیز ہے کہ جس پہ وہ نازاں تھے۔ یہ فرق ہے۔ کہا کہ فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ [2] (80:24)۔ یہ ذرا، رزق اور روٹی پر، غور کرے۔ بات تو روٹی کی کی جاتی ہے۔ روٹی کے معنی تو آپ سمجھتے ہیں کہ جی! اس میں دھن دولت

---

[1] انسانیت کے جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا تھا، انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔

[2] انسان ذرا اپنی خوراک پر ہی غور کرے (تو اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ یہ سامانِ زیست تمام انسانوں کے لیے خدا کی طرف سے بے مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ اس لیے اس میں حسب ضرورت سب کا حصہ ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یہ ساری چیزیں آ جاتی ہیں۔ کہا کہ کبھی اس پہ بھی غور کیا ہے کہ اس میں تمہاری اپنی کاریگری کتنی ہے؟ ذرا سوچیں کہ **اَنَّـا صَبَبۡـنَا الۡمَآءَ صَبًّا** ❶ (80:25)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ خدا جہاں قرآن میں اپنے جمال کی' اپنی رحمت کی بات کرتا ہے تو وہاں اپنے لیے ''اَنَـا'' (میں) ❷ کہتا ہے۔ عربی زبان والے یہ جانتے ہیں کہ اس میں فرق کیا ہوا۔ ہمارے ہاں تو ترجمہ ''میں'' ہی ہوتا ہے لیکن ترجمے میں ایک ''ہم'' ❸ ہوتی ہے۔ میں اور ہم میں فرق ہوتا ہے۔ یہ ''ہم'' عدالت کے ایک فارم میں ہے جو کہ اگرچہ 1860ء میں چھپا ہے' اس میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ ہمارے دستخطوں اور مہرِ عدالت سے شائع ہوا۔ ہمارے دستخطوں سے' آیت حاکمہ ہوتی ہے۔ وہ ہم کہتے ہیں۔ جس مقام پہ خدا نے انسان کے مقابلے میں اپنی ان چیزوں کو بیان کرنا ہوتا ہے کہ اس میں تمہارا یعنی انسان کا دخل نہیں ہے' ہمارا ہے' وہ وہاں ''انا'' اور ''نا'' لاتا ہے۔ ان آیات میں دیکھیں: **اَنَّـا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ۝ ثُـمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا** ❹ (80:25-26) یہاں وہی ''اَنَّا'' یا ''نا'' آ رہا ہے۔ ان کے بعد اگلی آیات ہیں کہ **فَـاَنۡبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا ۝ وَّعِـنَـبًا وَّ قَضۡبًا ۝ وَّ زَيۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلۡبًا ۝ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا** ❺ (80:27-31) ان آیات میں کہا یہ ہے کہ یہ کھانے کی چیز ہے جسے آپ روٹی کہتے ہیں۔

ذرائع رزق کا پیدا کرنا

جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے' جس پہ انسانیت کی پرورش کا انحصار ہے' کہا کہ ذرا اس کی بنیادیں دیکھو تو سہی۔ دیکھو کہ اس کا اولیں دارومدار پانی پہ ہے' زمینیں بنجر ہو جاتی ہیں اگر وہاں بارش نہ ہو یا پانی کا انتظام نہ ہو' تو کہا کہ یہ جو تم بڑے بڑے دولت مند بنے پھرتے ہو زمیندار بنے پھرتے ہو کیا تم پانی برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ عزیزانِ من! یہاں دیکھا کہ ''ہم'' کہاں آیا ہے۔ یہ پانی کون برساتا ہے' پھر اس پانی کے بعد زمین میں' ٹھیک ہے' ہمارے قانون کے مطابق جب تم بیج ڈالتے ہو' زمین کو شق کر کے اس بیج میں سے

---

❶ بارش' جس پر پیداوار کا بنیادی انحصار ہے' انسان کی اپنی ہنرمندی سے نہیں برستی' ہمارے قانون کے مطابق برستی ہے۔ (56:63-73; 67:30)

❷ First Person Singular Pronoun یعنی ضمیر واحد متکلم

❸ First Person Plural Pronoun یعنی ضمیر جمع متکلم

❹ بارش' جس پر پیداوار کا بنیادی انحصار ہے' انسان کی اپنی ہنرمندی سے نہیں برستی' ہمارے قانون کے مطابق برستی ہے۔ (56:63-73; 67:30) (انسان زمین میں بیج ضرور ڈالتا ہے' لیکن زمین کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل ہمارے ہی قانون کے مطابق پھوٹتی ہے۔ (یہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ دانے کو کونپل میں تبدیل کر دے۔) (ایضاً)

❺ پھر یہ بھی ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے کہ اناج والی فصل سے اناج پیدا ہو' اور دوسری فصلوں سے دوسری چیزیں۔ (مثلاً) انگور اور ترکاریاں...... زیتون اور کھجوریں' گھنے باغات...... اور دیگر قسم قسم کے پھل اور مویشیوں کے لیے چارہ۔ (ایضاً)

کونپل کون نکالتا ہے' پھر کونپل کو پروان چڑھا کر کون پودا بناتا ہے' پھر اس میں جسے سٹے کہتے ہیں' خوشے کہتے ہیں' ان خوشوں میں کون دانے ڈالتا ہے' دانوں کو کون پکاتا ہے' پھر اسی ایک پانی اور اسی ایک زمین میں سے اجناس بھی نکلتے ہیں' سبزیاں ترکاریاں بھی نکلتی ہیں' پھل بھی نکلتے ہیں' پھلوں کی یہ مختلف قسمیں بھی ہوتی ہیں' یہ سارا کچھ گنا کر کہتا ہے' ذرا ہم سے سامنے آ کر بات کرو' اس میں تمہاری کاریگری کیا ہوتی ہے۔ تم تو گندم کے بیج سے جو نہیں اگا سکتے' جو کے بیج سے گندم نہیں پیدا کر سکتے' پانی نہ ہو تو تمہارا بیج بھی ناس ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ریفرنس (حوالہ) لکھ لیجیے' وہاں بڑی اہم آیات ہیں۔ سورۃ الواقعۃ میں کہا ہے کہ **اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ** [1] (56:63-64)۔

اب یہاں سے جو بات شروع ہوتی ہے یہ دیکھیے: تحرثون' تزرعون اور زٰرعون کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عربی زبان ہے۔ اس میں تحرثون بھی کھیتی باڑی کو کہتے ہیں لیکن یہ وہاں ہوتا ہے جہاں صرف بیج ڈالنے کا تعلق ہوتا ہے اور اس بیج سے جب وہ آگے بات چلتی ہے تو وہاں زراعت ہوتی ہے۔ پھر قرآن نے زرعون کہا ہے کہ تم تو اتنا ہی کرتے ہو کہ زمین میں بیج ڈالتے ہو۔ پھر اسے اگاتا کون ہے' اور آگے سارا کچھ دیا ہوا ہے کہ بتاؤ تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟ اور آخر میں یہ کہا ہے کہ **نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً** (56:73) جو کچھ ہم نے یہ کہا ہے' یہ ایک بہت بڑی وارننگ کی چیز ہے جو تمہیں بتائی گئی ہے' یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ ٹھیک ہے خدا کے قانون کے ساتھ انسان کی محنت چاہیے۔ کہا کہ ذرا سوچو کہ تمہاری اس میں کیا چیز ہے؟ تمہاری صرف محنت ہے' باقی سارا سامان' جتنے اسباب ہیں' جتنے ذرائع ہیں' وہ سب ہم نے پیدا کیے ہوئے ہیں تو یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار ہوا۔ پھر کہا کہ ہم تو ایک نہایت دیانتدار مشترکہ کاروبار کرنے والے کی طرح بات کر رہے ہیں۔ تم ایمان سے بتاؤ' دیانت سے بتاؤ کہ تمہارا حصہ کتنا ہے۔ تمہاری صرف محنت ہے اور جتنا کچھ باقی ہے وہ سارا ہمارا ہے۔ اب جو فصل ہے' اس کے ڈھیر لگ گئے' پیداوار جمع ہو گئی' تو کاروبار کا تقاضا ہے کہ اس میں جس کا جتنا حصہ پڑتا ہے یہ اس کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے۔ تمہی کہو کہ تمہارا کتنا حصہ بنتا ہے' ہمارا کتنا حصہ بنتا ہے۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دس فیصد بھی نہیں بنتا۔ بتاؤ' تم فیصلہ کر لو تو اپنا تم خود لے جاؤ' ہمارا ہمیں دو۔ یہ کتنا صحیح دیانتدار کاروباری ہے! ہمیں دیدیں۔ کہا گیا کہ جی! وہ ٹھیک ہے یہ اپنا تو ہم لے جائیں گے' آپ کو کہاں دیں' آپ نہ تو کہیں نظر آتے ہیں' نہ سامنے آتے ہیں' نہ مانگتے ہیں۔ آپ کو کیسے دیں؟ اس

---

[1] (اس مقصد کے لیے ذرا تم اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو' تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر' اس میں بیج ڈالتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اُگاتا ہے؟ کیا یہ تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے۔ (67:30; 80:25-30) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے لیے کہا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (56:73) بھوکوں کو دیدو' ہم تک پہنچ جائے گا۔

عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے۔ قرآن کا یہ معاشی نظام ہے اور اس سے اگلی آیت میں کہا ہے کہ **فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ** (56:74) یہ چھوٹے پیمانے پر ربوبیت اور نشو و نما کا سامان ہر ایک کرتا ہے' اپنی ذات تک' زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان تک۔ یہاں کہا کہ جو خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ ہے اس کے لیے کوشش کرو اور جدوجہد کرو۔ یہ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ عزیزانِ من! اب آپ کے ہاں یہ **فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ** کا ہے کے لیے رہ گئی؟ رکوع اچ جا کے تسبیحاں پھیرنا۔ [1] یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کہاں یہ آیت آئی ہے اور یہ وہاں کیوں آئی ہے۔ اپنے گھر بار والوں کے بھوکوں کو تو تم کھلاتے ہو۔ ربوبیت یہ بھی ہے۔ یہ ربوبیتِ صغریٰ ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پہ ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ **فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ** (56:74) یہ عظیم ربوبیت ہے کہ اس میں پوری انسانیت کو شامل کر لو اور آگے یہی بات واضح کر دی کہ **مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ** [2] (80:32)۔ یہ ''کُمْ'' پوری انسانیت کے لیے آیا ہے' یہ تمہارے لیے بھی ہے۔ میں نے ''متاع'' کے معنی پچھلے درس میں یا اس سے پہلے درس میں بتائے تھے کہ مسافر کے لیے زادِ سفر کو ''متاع'' کہتے ہیں جس میں کوئی چیز کم بھی نہیں ہوتی کہ سفر میں ضرورت پڑے اور اس کے پاس نہ ہو' اور کوئی ضرورت سے زیادہ بھی نہیں۔ کیا لفظ ہیں قرآن کے' عربی زبان کے! اور مسافر ضرورت سے زیادہ اٹھاتا بھی نہیں ہے' وہ بوجھ بن جاتا ہے' وہ تو غالبًا ذوق [3] نے پرانے زمانے میں کہا تھا کہ

کیوں اتنا گراں بار ہے کہ زادِ سفر بھی
اے راہروِ ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کا بنیادی اصول متاع کے ایک لفظ میں مضمر ہے

عزیزانِ من! مسافر گراں بار نہیں ہوتا' اس کے پاس ضرورت سے کم بھی نہیں ہوتا اور ضرورت سے زیادہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کا بنیادی اصول ہے اور یہاں کہا ہے کہ **مَتَاعًا لَّكُمْ** (80:32)۔ اِس ''کم'' میں پوری انسانیت ہے اور آگے کہا ہے کہ **وَلِاَنْعَامِكُمْ** اور یہ تمہارے مویشیوں کے لیے بھی ہے۔ اس Context (سیاق وسباق) میں کہا یہ تھا کہ تم آج ان غریبوں کی محنت کو غصب کر کے' سمیٹ کر' سانپ کی طرح اس پہ بیٹھے ہوئے ہو اور اسی چیز کو اپنے لیے' وجہ تفاخر کہہ رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم ڈاکو ہو' تم کذاب ہو' اسی غریب کا' جس کے لیے تم کہتے ہو کہ کیوں آ بیٹھا ہے' اس کی اور ان جیسوں کی محنت کے ماحصل سے تم یہ کچھ بنے تھے' ورنہ

---

1. رکوع میں جا کر تسبیحاں پھیرنے کے لیے صرف۔
2. یہ سب تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامانِ زیست کا کام دیتا ہے۔ (اسے اسی مصرف کے لیے رہنا چاہیے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)
3. شیخ ابراہیم ذوق (1204-1271ھ بمطابق 1789-1854ء)

تمھیں تو ''تم'' کے سوا' کوئی کچھ نہ کہتا تھا
جناب ہم نے بنایا حضور ہم نے کیا

تم ان کے بنائے ہوئے ہو۔کیا بات ہے جو عبس سے شروع ہورہی ہے اور کہاں جا کر ختم ہورہی ہے۔کہا ہے کہ تم یوں نہیں ماننے والے' ہمیں پتہ ہے۔تم میں بڑی نخوت ہے' بڑا تکبر ہے۔وہ (نمائندہ قریش) اٹھ کر چلا جاتا ہے۔وہاں سورۃ مدثر میں دیکھا تھا کہ جواب بن نہ پڑا تو پھر اس نے ماتھے پہ تیوری چڑھائی' نہایت تکبر سے منہ پھیر کر چلا گیا اور کہہ گیا کہ وہی پرانے لوگوں کی باتیں ہیں جو سنائی جارہی ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ ہمیں پتہ ہے کہ یہ یوں تسلیم نہیں کرتے۔

قرآنی لفظ صآخۃ کا مفہوم

عزیزانِ من! اس کے بعد پھر اس انقلاب کا اگلا مرحلہ آئے گا۔یہ تو ہے نہیں کہ ہم وعظ و نصیحت کر کے چپکے سے بیٹھ جائیں گے۔ کہا کہ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ❶ (80:33)۔ہمارے ہاں تو اب ترجمہ اور تفسیروں میں یہ چیزیں قیامت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں کہ وہاں یہ چیزیں آئیں گی۔یہاں آیا ہے: صـــآخۃ ۔یہ پوچھو نہیں کہ قرآن نے یہ عربی زبان کا لفظ کیوں چنا۔اس زمانے میں لڑائیاں تلواروں کی ہوتی تھیں۔یہ جو تلوار کی جھنکار ہوتی ہے اسے صآخۃ کہتے ہیں۔یہاں کہا ہے کہ پھر اس کے بعد وہ مرحلہ آئے گا جہاں تلوار پہ تلوار اور لوہے پہ لوہا پڑے گا اور اس کی جھنکار پیدا ہوگی' وہاں آ کر پھر تم صحیح راستہ اختیار کرو گے۔میں نے بہت کوشش کر دیکھی' تم نہیں مان رہے۔اب سوال یہ ہے کہ صآخۃ کب آئے گا؟ اس میں کیا ہوگا؟ اب کس طرح جنگ کا نقشہ کھینچا گیا ہے؟ کہا کہ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ○ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ ○ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ (80:34-36) اس دن اتنی افراتفری' نفسانفسی' آپو دھاپی ❷ پڑ جائے گی کہ بھائی بھائی کو چھوڑ دے گا' اولاد ماں باپ کو چھوڑ دے گی' خاوند بیوی کو چھوڑ دے گا' ماں بچوں کو چھوڑ دے گی۔

عزیزانِ من! خدا محفوظ رکھے' اس قسم کی جنگ کی صورت یہاں تو پیدا نہ ہو۔ہم نے ابھی تک یہ صورت دیکھی نہیں ہے۔اب یہ جو وہاں جنگیں ہورہی ہیں ان کے اندر جتنا کچھ ٹی وی وغیرہ پہ آرہا ہے' اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح قرآن یہ بھیانک نقشہ کھینچ رہا ہے' ہر ایک کی افراتفری' نفسانفسی کا عالم ہے۔قرآن نے اس تفصیل کے بعد کہا کہ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (80:37) ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہوگا' کوئی کسی دوسرے کو پوچھے گا نہیں' کسی کی مدد نہیں کر سکے گا۔کہا کہ تمہاری یہ کیفیت ہو جائے گی۔تم وہاں تک کیوں پہنچتے ہو۔وہاں تک پہنچانے کے لیے ہمیں کیوں مجبور کرتے ہو' اس سے پہلے بات کیوں نہیں مان لیتے۔اس کے بعد جو

---

❶ جب وہ تصادم کا وقت آئے گا تو اسلحہ کی جھنکار سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے گی۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ اسے اردو میں آپا دھاپی کہتے ہیں۔یعنی اپنی اپنی فکر' اپنی اپنی بپتا۔اپنی اپنی مصیبت۔

اس کا نتیجہ نکلے گا اس کا بھی سن رکھو کہ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ o ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (80:38-39) جب اس تصادم کا فیصلہ ہو گا تو ایک گروہ (جس نے قوانین خداوندی کے مطابق روش اختیار کی تھی) کامیابی و کامرانی کی وجہ سے نہایت خوش و خرم ہوگا۔ ان کے چہروں کے لیے وہی لفظ "مسفرۃ"❶ آ گیا: وہ چہرے "سفر" والے یعنی چمکدار ہونگے' ہشاش و بشاش ہونگے، خوشگوار ہونگے۔ ان کامیاب ہونے والوں کے چہرے شگفتگی و شادابی سے چمک رہے ہوں گے۔

کالے دھن کا دوزخ

عزیزانِ من! اب قرآن دوسرے گروہ کے بارے میں کہتا ہے کہ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ o تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ o (80:40-41) کچھ چہرے ایسے ہونگے جن پر گرد وغبار پڑی ہوئی ہوگی' گرد وغبار ایسی جو سیاہی ہوگی' جو ان کے خد و خال تک کو ڈھانپ لے گی' وہ روسیاہ ہونگے' ناکام ہونگے' محکوم ہونگے' ذلیل ہونگے۔ کون ہیں یہ لوگ جن کی یہ کیفیت ہوگی؟ جن کے چہرے گرد وغبار سے ہی نہیں' سیاہی سے اٹے ہوئے' روسیاہ' نادم' شرمسار' ذلیل' محکوم ہوں گے۔ ان کے لیے کہا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ❷ (80:42)۔ کیا بات ہے کہ دو لفظوں میں قرآن نے باطل کے نظام اور اس نظام کے جو علمبردار ہیں' ان دونوں کی خصوصیات بتا دیں! کہا: كَفَرَةٌ (80:42) جو متاع انہیں ملا ہے وہ اسے چھپا کر رکھنے والے ہیں' وہ ربوبیت عظمیٰ والے نہیں ہیں' جو ہر چیز کو پھیلا کر رکھیں' سامنے رکھیں۔ نہیں یہ وہ گروہ نہیں ہے۔ یہ وہ گروہ ہے کہ جو ملا ہے اسے چھپا کر رکھا ہے۔

چھپا کر رکھنے کی تو ہمارے دور میں نئی نئی اصطلاحات آئی ہیں۔ یہ وہی ہے جسے کالا دھن (Black money) کہتے ہیں یعنی وہ چھپائی ہوئی اپنی دولت۔ وہ چھپائی ہوئی دولت مصیبت بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اب وہ کوشش کر رہے ہیں کہ قسم قسم کے تکنیک اور طریقے وضع کیے جائیں کہ کسی طرح سے وہ کالا دھن سفید ہو جائے۔❸ قرآن نے یہاں کالا اور سفید دو قسم کے چہرے بتائے ہیں۔ ہمارے دور میں دھن کی دو قسمیں ہوگئی ہیں۔ دھن کی کیا ہوں گی' دھن والوں کی دو قسمیں ہوگئیں۔ یہ کالے چہرے والے عذاب میں مبتلا ہیں۔ انہیں قرآن کہتا ہے کہ یہ کفرۃ ہیں۔ انہوں نے اوپن منی (Open Money: سفید دھن) نہیں رکھا تھا' کھلی ہوئی دولت نہیں رکھی تھی' اسے

---

❶ مسفرۃ۔ واضح' چمکدار۔ اس کے مادہ سے بننے والے الفاظ و معانی کے لیے دیکھیے اس کتاب کا ص 155۔

❷ یہ ہوگا ان لوگوں کا انجام جو اس وقت خدا کے دیئے ہوئے سامانِ رزق پر (اپنی مفاد پرستیوں کے) پردے ڈالتے ہیں' اور یوں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے انسان طبقات میں بٹ جاتے ہیں اور نوع انسانی میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے' جو عدالتِ خداوندی میں بہت بڑا جرم ہے۔ (ہم چاہتے یہ ہیں کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہیں۔ ان میں پھوٹ نہ پڑے)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ یاد رہے یہ بات 20 جولائی 1984ء کو کہی گئی تھی۔

چھپالیا تھا' جو ملا دبا کر بیٹھ گئے تھے۔

قرآنی لفظ فجرہ کا مفہوم

عزیزانِ من! اگلی بات **فَجَرَةُ** کی ہے۔ فجرہ کے معنی ہوتے ہیں: Disintegrate کر دینا' ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' الگ الگ کر دینا۔ کوشش ہی یہ کی جاتی ہے کہ ان کا اجتماع نہ ہو سکے' کسی ایک مقام کے اوپر جمع نہ ہو سکیں' انسانیت انسانیت کے مرکز پہ نہ آ سکے' ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے' جو ملا دبا کے رکھ لیا۔ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ ہمارے ہاں متحدہ محاذ نہ بنا لیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی آج یہ کیفیت ہوئی لیکن ہوئی اس جنگ کے بعد۔ اس سے پیشتر اتنا عرصہ ہم کوشش کرتے رہے کہ یہ صحیح راستے پہ آ جائیں' یہ نہ آئے۔ یہاں آنے کے بعد پھر وہ مساواتِ انسانیہ قائم ہوئی جو قرآن کا دعویٰ تھا اور پروگرام تھا۔

عزیزانِ من! سورۃ عبس آج اختتام پہ پہنچ گئی۔ آئندہ اتوار کو ہم درس میں سورۃ التکویر لیں گے: **اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ o وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ o وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ o وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ** (81:1-4)۔ کیا بات ہے! اس طرح دھمدھاتی ہوئی طوفان آمیز آیات کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ ان آیات میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

گیارھواں باب: سورة التکویر (آیات 1 تا 7)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1984ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التکویر سے ہو رہا ہے۔ یہ تیسواں پارہ اور 81ویں سورۃ ہے: (81:1)۔

قرآنی الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت

تمہیداً پھر دہرا دوں کہ میں نے انتیسویں اور تیسویں پارے کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ ان پاروں میں خاص طور پر کچھ واقعات کا تذکرہ آتا ہے۔ ان کی صورت یہ ہے (مثلاً) چاند پھٹ جائے گا' سورج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے یا گہنا جائے گا' تاریکی چھا جائے گی' ستارے جھڑ جائیں گے' آسمان کے ٹکڑے ہو جائیں گے' پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ آخری دو پاروں میں یا ان سورتوں کے اندر اس قسم کے یہ الفاظ آئیں گے۔ میں نے شروع میں یہ عرض کیا تھا کہ اگر ان الفاظ کے حقیقی معنی لیے جائیں جیسے پھٹ جانے کے معنی ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا تو اس کے بعد مطلب یہ ہوگا کہ یہ جیسا کہا جاتا ہے یا جیسا قرآن میں بھی ہے کہ اس طبعی کائنات یعنی Physical Universe نے ایک دن ختم ہونا ہے' یہ نہ ازلی ہے نہ ابدی ہو سکتی ہے' تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانے کے واقعات کا تذکرہ ہو کہ یوں اس طرح سے ہوگا اور یہ کائنات یوں ختم ہو جائے گی۔ لیکن میں اسے ترجیح نہیں دیا کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کائنات نے ایک دن ختم ہونا ہے' یہ ابدی نہیں ہے لیکن قرآنِ کریم کا بنیادی منصب انسانیت کی ہدایت ہے' راہنمائی ہے' اس کی مشکلات کا حل پیش کرنا ہے' یہ بتانا ہے کہ اس قسم کا نظام قائم ہوگا جس میں انسان سطحِ انسانیت پر پہنچ سکے گا۔ قرآنِ کریم کا منصب وفریضہ یہ ہے۔

اگر ان واقعات کے متعلق یہ ہو کہ آخر میں جا کر یہ طبعی کائنات اس طرح ختم ہو گی تو اس میں راہنمائی کی بات نہیں ہے اور پھر قرآن تو قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ضابطہ ہدایت ہے۔ یہ بات آخر میں جا کر ہونی ہے اور یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ کب ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے لیے اب بھی کروڑوں سال کا عرصہ ہو جب جا کر یہ چیز پیدا ہو۔ یورپ کے Scientists (سائنسدان) ان چیزوں پر بھی لگے ہوئے ہیں کہ کس رفتار سے سورج کی حرارت کم ہو رہی ہے' زمین کی حرکت میں فرق آ رہا ہے' کتنے کروڑ سال بعد ان کا آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ اگر کروڑوں سال بعد جا کر وہ واقعات رونما ہوں تو اس دوران میں جتنے انسان ہیں ان کے لیے اس میں راہنمائی کی بات نہیں

ہے۔اس وجہ سے میں نے ان مقامات پر خصوصاً حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی لینے کا ترجیحاً یہ مسلک اختیار کیا ہے۔عربی زبان میں بھی' اور قرآنِ کریم میں بھی' ان الفاظ کے مجازی معنی لیے جاتے ہیں جیسے کہ ہر زبان میں الفاظ کے معنی ہوتے ہیں۔اگر ان کے مجازی معنی لیے جائیں تو اس میں دو چیزیں سامنے آئیں گی۔ان میں ایک تو وہ انقلابِ عظیم ہے جو نبی اکرم ﷺ اور حضورؐ کے رفقاء کے ہاتھوں حضور ﷺ کی زندگی میں رونما ہوا اور دوسرا وہ جو تدریجاً (Gradually) آئے گا۔

جہانِ نو کا دَور اور فہم قرآن

عزیزانِ من! اس دور میں' جسے ہم صدرِ اول کہتے ہیں یعنی عہدِ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ کے عہد میں جو انقلاب عرب میں آیا' ایک تو یہ الفاظ اس انقلاب کے متعلق آسکتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کی رو سے ایسا نظر آتا ہے کہ اس دورِ ہمایوں کے بعد پھر کچھ عہدِ جاہلیت کا تاریک زمانہ آتا ہے۔اس تاریک زمانہ کے بعد یہ انقلاب تدریجاً آئے گا' زمانے کے تقاضے آہستہ آہستہ انسانیت کو اس طرف لے آئیں گے اور پھر کوئی جماعت ہوگی جس کے ہاتھوں وہی دَور دوبارہ آئے گا۔یعنی قرآن کا وہ دور جسے میں اجتماعیت کا دور' مساواتِ انسانیہ کا دور' تعظیم وتکریم آدمی کا دور کہہ رہا ہوں۔وہ دور پھر آئے گا۔

یہ جو قرآن کے الفاظ آئے ہیں ان کے مجازی معنی لینے سے ایک تو وہ انقلاب ہے جو اس دور میں آیا تھا۔یہ معنی اس پر منطبق ہوتے ہیں۔اور اس میں پھر ایسے انداز سے کچھ کہا گیا ہے کہ جب یہ انقلاب دوبارہ آئے گا تو اس کی بھی کچھ علامات اور کچھ نشانیاں قرآن نے دی ہیں کہ کس طرح تدریجاً' آہستہ آہستہ' اس دَور میں پھر انسانیت پہنچ جائے گی۔ چونکہ پہلے جو معنی ہیں یعنی آخر میں مادی کائنات نے کس طرح ختم ہونا ہے' اس میں چونکہ یہ راہنمائی کی بات نہیں تو میں وہ معنی نہیں لیتا۔اِن الفاظ کے دوسرے مجازی معنی لینے سے دو انقلابات سامنے آئیں گے۔ایک تو وہ جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں' اس دور میں' انقلابِ عظیم آیا' اس کا ذکر ہے' اور دوسرا یہ کہ پھر جب انسانیت میں دوبارہ وہی دور اور وہی نظام آئے گا' اس کے متعلق کہیے کہ جسے پیش گوئی کہتے ہیں' یہ چیزیں آئیں گی۔اگر ان تمہیدی تعارف کی چیزوں کو سامنے رکھ لیا جائے تو قرآنِ کریم کے آخری دو پاروں کی بالخصوص تیسویں پارے کی جو سورتیں اور آیات ہیں' ان کے سمجھنے میں دقت نہیں رہتی۔اسی اصول کے مطابق میں نے قرآن کو سمجھا ہے اور اسی کے مطابق اپنے درس میں سمجھایا کرتا ہوں۔

شق القمر کی حقیقت

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ جب سورۃ القمر شروع ہوئی تھی تو اس میں کہا تھا کہ **اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ** (54:1)۔اس میں **الساعۃ** اور انشق القمر کے الفاظ آئے تھے۔ہمارے ہاں کے عام مترجمین یا مفسرین' الساعۃ کو قیامت کے ہی متعلق سمجھتے ہیں۔ ان کا تو یہ ہے کہ قیامت آئی اور پھر شق القمر کا معجزہ ہے جو ہمارے ہاں بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے انگلی سے اشارہ کیا

اور چاند دوٹکڑے ہوگیا۔اس کے یہ معنی لیے جاتے ہیں۔آپ کو یاد ہوگا اور خاص طور پر جو احباب مسلسل درس میں آ رہے ہیں انہیں یاد ہو گا کہ یہ سورتیں' یہ آیتیں پہلے گزر چکی ہیں۔ان میں عرض کیا تھا کہ یہ درحقیقت اسی انقلاب کا ذکر ہے جو حضورؐ کے ہاتھوں برپا ہوا۔عربِ جاہلیت' جس کی نمائندگی قریش کر رہے تھے' کا اقتدار' دبدبہ اور جلال مٹ گیا۔وہ عرب کسی کو سانس نہیں لینے دیتے تھے۔ان کے مقابلے میں داعی انقلاب' واقعہ کے اعتبار سے بھی ایک یتیم' ایک غریب آیا۔جب اُس نے آواز اٹھائی تو جسے کہتے ہیں' کوئی Second (تائید) کرنے والا بھی نہیں تھا یا اگر کوئی تھا بھی تو کوئی ایک آدھ رفیق تھا۔ابتدا میں کوئی جماعت بھی پیدا ہوئی تو غریبوں کی' ان کی جو غلام تھے' جو قریش کے نزدیک بہت ہیچ اور نیچ درجے کے قبائل سے متعلق تھے اور وہ چند نفوس تھے۔تیرہ سال کا عرصہ لگا اور اس میں بدر [1] کے میدان میں' جو کل کائنات جمع ہوئی ہے' وہ تاریخ یہی بتا رہی ہے کہ تین سو تیرہ تھے۔کتنی رفتار سست تھی' کتنی جماعت کمزور تھی اور مقابلے میں اس دور کے قریش' عرب کے اندر تو ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔پہلی ہی جنگِ بدر میں جب اِدھر سے وہی کل تین سو تیرہ کائنات تھی جنہیں لے کر حضور ﷺ تشریف لے گئے۔ان کے مقابلے میں وہاں ایک ہزار کے قریب قریش مکے سے چلے ہوئے مدینے کے قریب' آ پہنچے۔ یہ تھے مقابلے میں اور پھر اس کے بعد یہ جو جنگیں مثلاً جنگ احزاب [2] وغیرہ ہوئی ہیں وہ تو مقابلے کے لیے تمام قبائل اکٹھے ہو گئے تھے۔تو مخالفت میں اتنے بڑے ہجوم' اس قسم کے عساکر' اور اس قسم کے لشکر' ان کے پاس ساز و یراق' اتنی بڑی قوتوں کے وہ مالک اور دوسری طرف مقابلے میں اس قسم کی یہ جماعت۔کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ کامیاب ہوگی اور وہ مغلوب اور مفتوح ہو جائیں گے۔اس دور میں یہ کہنا کہ وہ انقلاب قریب آ رہا ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (54:1) وہ انقلابِ عظیم قریب آ رہا ہے جس میں یہ کیفیت ہوگی۔

عزیزانِ من! قمر عربوں کا' جاہلیتِ عرب کے جھنڈے کا' نشان تھا۔اگر کسی قوم یا فوج کے متعلق یہ کہنا ہو کہ اسے شکست ہو جائے گی تو آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ جھنڈا سرنگوں ہو جائے گا' پھٹ جائے گا۔یہ "قمر" عربوں کا جھنڈا ہے۔یہ جو کہا ہے کہ انقلابِ عظیم قریب آ رہا ہے' تم دیکھو گے کہ کس طرح عربوں کی قوت کا جو نشان ہے' وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر' پھٹ کر' گر جاتا ہے اور یہ واقعہ ہوا۔یہ ہے ایک مثال۔شق کے معنی پھٹ جانا ہے' گر جانا نہیں ہے۔قمر کو یوں حقیقی معنوں میں لیجیے تو چاند بھی اس کے معنی ہونگے لیکن اگر اِسے مجازی معنوں میں لیں گے تو قمر عربِ جاہلیت کی مملکت یا قوت کا نشان یا ان کا جھنڈا ہے۔یہ اس کا شق ہو جانا ہے' یہ جھنڈے کا پھٹ جانا ہے' سرنگوں ہو جانا ہے' ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے' ان کی طاقت کا مٹ جانا ہے' ان کا مفتوح اور مغلوب ہو جانا ہے۔کہا کہ یہ انقلاب قریب آ رہا ہے جس میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی اور پھر' عزیزانِ من! چند ہی دنوں کے اندر یہ کیفیت پیدا ہوئی۔اسی طرح بات سمجھ میں آ گئی۔

---

1. جنگ بدر (سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء) اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔287 (فٹ نوٹ نمبر 1)
2. جنگ احزاب (ذیقعد 5ھ)

دوسرے مقام پہ سورۃ القیٰمۃ میں بھی آیا ہے کہ **جُمِعَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ** [1] (75:9)۔ اگر یہاں اس کے یہی حقیقی معنی لیے جائیں کہ چاند اور سورج دونوں اکٹھے ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی بات سے تو کوئی چیز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

اپنی طرف سے مجازی معنی لینے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے

عزیزانِ من! یہاں پھر وہی بات ہے کہ پھر یہی قربِ قیامت میں جب یہ طبعی کائنات تباہ ہو گی تو یہ اس وقت کی کچھ بات ہے کہ ایسے ہو گا' لیکن اگر اس کے مجازی معنی لیے جائیں تو بات کچھ اور بنتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں یہ مجازی معنے اپنی طرف سے لوں۔ مجھے کیا حق حاصل ہے۔ یہ تو عربی مبین کی کتاب ہے۔ عربی مبین میں ہی یہ معنی لکھے ہوئے ہیں' ان کے لغات میں یہ معنی لکھے ہیں' ان کی کتابوں میں یہ معنی لکھے ہوئے ہیں' ان کے ہاں یہ مفہوم لکھا ہوا ہے: شمس یعنی سورج ایران کے جھنڈے کا نشان تھا' اور قمر عربوں کا نشان تھا۔ عرب اور ایران والوں میں اتنی دشمنی تھی کہ جیسا میں نے کئی دفعہ درس میں کہا ہے ایرانی ان عربوں کے ساتھ دوستی تو ایک طرف' جنگ کرنا بھی اپنے لیے باعثِ ہتک سمجھتے تھے' انہیں اپنے اوپر بڑا کبر و ناز تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ یہ ایسی سلطنت و مملکت صدیوں سے تھی جس کی تہذیب ساری دنیا پہ چھائی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ساری دنیا میں دو ہی تو سپر پاورز تھیں' یا روم کی یا ایران کی اور دونوں کے ساتھ حضور ﷺ کی اس جماعت کا ٹکراؤ تھا۔ [2]

چاند اور سورج کا اکٹھے ہونا

عزیزانِ من! شمس ایرانیوں کا نشان تھا اور عربِ جاہلیت کا قمر۔ ایران اور عرب میں آپس میں اس قدر بعد تھا' تفاوت تھا اور اس قدر دشمنی اور عداوت تھی [2] اور اس میں کہا جا رہا ہے کہ وقت آنے والا ہے جب **وَخَسَفَ الۡقَمَرُ** [3] (75:8)۔ پہلے تو یہ دیکھیے جسے کہتے ہیں کہ وہ گہن میں آ گیا۔ اب یہاں ہے کہ قمر گہن میں آ گیا۔ چاند گہن میں نہیں آ گیا' عربوں کی جو طاقت تھی وہ گہنا گئی' ماند پڑ گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اس کے لیے کہا کہ **وَجُمِعَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ** (75:9) ایران اور عرب دونوں اکٹھے ہو گئے۔

---

[1] ''چاند اور سورج'' اکٹھے ہو جائیں گے۔ (عرب اور ایران کی قوتیں مل کر ایک ہو جائیں گی۔ جاہلیت عرب کے جھنڈے کا نشان ''قمر'' تھا اور ایرانی سلطنت کے جھنڈے کا نشان ''شمس'' تھا۔ ان آیات میں' اگر اِس دنیا کی قیامت صغریٰ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو ظہورِ اسلام سے عرب جاہلیت اور ایران کی سیاسی زندگی میں آنے والا تھا۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ' لاہور' فٹ نوٹ نمبر 1' ص 1388۔

[2] ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 89 (فٹ نوٹ نمبر 1)' 91 (فٹ نوٹ نمبر 6)' 92 (فٹ نوٹ نمبر 1) اور 323 (فٹ نوٹ نمبر 1)۔

[3] ''چاند'' تاریک ہو جائے گا۔ (یعنی جاہلیت عرب کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔)

اب اس کے بعد کی جو تاریخ ہے وہ کوئی لمبے عرصے کی تاریخ نہیں ہے۔ چند ہی سالوں کے بعد کی بات ہے کہ ایران فتح کیا' ایران اور عرب ملکر ایک مملکت بنی۔ یہی نہیں بلکہ روم کے جتنے اور علاقے بھی تھے' مصر وغیرہ کے علاقے بھی تھے' ان کو بھی اکٹھا کیا۔ عرب اور ایران کی دونوں مملکتیں اس طرح ملی ہیں کہ وہ ایک ہی سلطنت' ایک ہی مملکت' ایک ہی نظام' ایک ہی جسے ہم خلافت کہیں گے' ہو گیا تھا۔ عرب وایران یعنی شمس اور قمر کے جمع ہونے کا یہ تاریخ کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ ان حالات میں جب عرب اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایران اور عرب کی یہ صورت ہوگی اور ایران والے تو جیسا میں نے کہا ہے ان کے کبرو ناز کے خلاف تھا کہ وہ یہ سمجھیں کہ ہم عرب کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں گے۔ قرآن اس زمانے میں یہ کہہ رہا ہے کہ انقلاب آنے والا ہے۔ اس میں تم دیکھو گے کہ کس طرح یہ عرب اور ایران دونوں ایک ہو کر ایک مملکت بن جاتے ہیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ معنی لینے سے کس طرح یہ چیزیں واضح بھی ہوئیں' تاریخ نے اس کی تائید بھی کی اور اس میں کوئی الجھاؤ نہ رہا' کسی قسم کا ابہام نہ رہا' کتابِ مبین نے اپنے معنی آپ واضح کر دیئے' اس لیے کہ اس نے کہا یہ تھا کہ یہ عربی مبین کے اندر کتاب نازل ہوئی ہے تو عربی مبین سے جب پوچھا تو اس نے یہ بھی بتایا کہ قمر کے یہ معنی بھی ہیں اور شمس کے یہ معنی بھی ہیں اور پھر تاریخ نے بتایا کہ اس طرح یہ شمس اور قمر یکجا ہو کر ایک مملکت بن گئے تھے۔ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ اس دَور کے انقلاب کا ذکر ہے۔

اب آج کے درس میں ہمارے سامنے سورۃ التکویر آ رہی ہے۔ اس کی پہلی ہی آیت میں جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ عجیب و غریب Sum up (اختصار واکتناز) کیا ہوا ہے یعنی تت کڈیا ہویا جنوں کیندے نیں۔ ❶ اِس آخری پارے میں تو خاص طور پر' دو دو الفاظ کی' تین تین الفاظ کی آیتیں ہیں' ان کی جامعیت کی کیفیت یہ ہے کہ اس کو کھولتے چلے جایئے' کھولتے چلے جایئے' اس کے اندر لاانتہا معنی چھپے ہوئے ہیں۔ پہلی ہی آیت ہے: اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ (81:1) کسی آنے والے دور میں جب انسانوں کے خود ساختہ نظامِ تمدن ومعاشرت کی جگہ قرآنی نظام لے لے گا تو اُس وقت کی انقلابی کیفیات کے متعلق یوں سمجھو کہ ملوکیت کا نظام لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ ❷

---

❶ جسے تلخیص کیا ہوا کہتے ہیں۔

❷ نزولِ قرآن کے وقت ملوکیت کی سب سے بڑی نمائندہ' اور عربوں کے قریب تر' مملکت ایران کی تھی جس کے جھنڈے کا نشان ''شمس'' تھا جس طرح قبل از اسلام' عربوں کے جھنڈے کا نشان ''قمر'' تھا۔ اس آیت میں نام تو ''شمس'' کا لیا گیا ہے لیکن اس سے مراد ملوکیت کا نظام ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا۔ اس نظام کو نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاءؓ نے مٹایا۔ لیکن وہ پھر قائم ہو گیا۔ سورۃ التکویر کی ان آیات میں کسی آنے والے دور کا ذکر ہے جب ملوکیت کا نظام پھر مٹے گا۔ اس دور کی جو دوسری نشانیاں بتائی گئی ہیں اس سے ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے یہ ہمارے ہی زمانے کا ذکر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عصر حاضر کی بے پناہ تبدیلیاں' قرآنی نظام کے قیام کا پیش خیمہ ہوں۔ (اس کے حوالے کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' ص۔1418' فٹ نوٹ 1)

عزیزانِ من! اس آیت میں کورت کا لفظ آیا ہے۔ یہیں سے اس سورۃ کا نام تکویر ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو لپیٹنا۔ اب یہ شمس کا جو لپیٹنا ہے اگر وہ ''شمس'' سورج ہے تو یہ اس کی گردش ہے کیونکہ تکویر گردش کو کہا جاتا ہے۔ میں یہ معنی ابھی عرض کروں گا۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ ''شمس'' ایران کی علامت ہے۔ گردش کے معنوں میں عربی زبان میں جو الفاظ آتے ہیں' میں نے کہا تھا کہ ان میں معنی کے اعتبار سے ایسا شیڈ کا فرق ہوتا ہے' یہ جو لپیٹنا ہے' اس میں خاص طور پہ وہ جو لپیٹ ہے' جو اس قسم کی گردش ہے جس طرح پگڑی کو لپیٹا جاتا ہے' کہ سر (Head) اپنے مقام پہ تو کھڑا ہوتا ہے' وہ ساتھ نہیں گھومتا لیکن پگڑی کے جو بل ہیں وہ لپیٹے جاتے ہیں' اس قسم کے لپیٹ کہ جس پہ لپیٹا جائے وہ تو اپنے مقام پر' اپنے محور پر اسی طرح قائم ہو' اور لیل ونہار کی یوں گردش ہو تو اسے کو تکویر کہیں گے جیسے یہ سورج اپنی پگڑی باندھ رہا ہے۔

سورج کا رات کو عرش کے نیچے چھپ جانا

عزیزانِ من! کیا بات تھی ان عربوں کی' پتہ نہیں یہ قوم کیا بلا تھی! کہاں سے یہ تصور لے کر آتے تھے کہ اس دور میں تو ذہن میں یہ بھی نہیں آسکتا تھا کہ چاند کی یا سورج کی گردش بھی ہو رہی ہے' وہاں تو وہ جو روایت والے تھے جب ان سے پوچھا گیا: سورج رات کو کہاں جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ خدا کے عرش کے نیچے جا کر چھپ جاتا ہے اور دوسری صبح پھر فرشتے کچوکے دے کر اسے وہاں سے نکالتے ہیں۔ معاذ اللہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تو حدیث نہیں ہو سکتی۔ ان کی عام ذہنی سطح یہ تھی کہ اس سے زیادہ ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی تھی کہ سورج اس کے بعد جاتا کہاں ہے۔ انہوں نے یہ چیز وضع کی اور پھر جو ذہنی سطح ہے ان کی جنہوں نے انتخاب کیا انہوں نے بھی اس کو منتخب کر کے اپنے مجموعے میں داخل کر دیا' یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ صحیح ترین حدیث ہوگی۔ اور پھر اس کے بعد ان سب نے بھی اس کو Accept (تسلیم) کر لیا' تو گویا یہ عام لوگوں کی ذہنی سطح تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ جو قرآن کی چیز آ رہی ہے۔ یہ وحی کی چیز ہے' ان دونوں میں کتنا تفاوت نظر آ رہا ہے لیکن زبان کے اعتبار سے آپ دیکھیے کہ عرب کتنے آگے تھے۔ سورج کی گردش کو پگڑی کے لپیٹ سے تشبیہ دینا بڑی چیز ہے۔ یہ جو گردش لیل ونہار ہے' میں سمجھتا ہوں کہ بڑے سے بڑے شاعر بھی اس تشبیہ سے آگے نہیں جا سکے۔ ہمارے ہاں اقبالؒ (1877-1938) نے بھی یہ چیزیں لکھی ہیں لیکن میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ معنی تو یہاں وہ مجازی لیے جائیں گے تو پھر شمس کے تو معنی ہی ایران ہوگا۔ ایران کا جھنڈا لپیٹا جائے گا۔ بڑا اعلانِ عظیم ہے صاحب!

ذرہ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر

یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ اگر یہ مکی آیت ہے تو عرب میں اس اتنی سی کمزور اور مختصر جماعت کی شاید ابھی اپنی مملکت بھی قائم نہ ہوئی ہوگی یا اگر زیادہ سے زیادہ ہوئی ہے تو مدینے کی شہری مملکت میں ہوئی ہے۔ اِس اتنی مختصر اور کمزور سی جماعت کے ایک سربراہ کی طرف سے یہ اعلانِ عظیم ہے کہ عرب کا جھنڈا تو گہنایا جائے گا' یہ تو ماند پڑے گا ہی' یہاں تو یہ ہے کہ ایران کا جھنڈا بھی لپیٹ دیا جائے گا۔ اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ

(81:1)۔ گویا یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ ہونے والے واقعہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب یہ ہوگا تو پھر آگے یہ بات آئے گی کہ پھر کیا ہوگا۔

قرآن کے اسلوبِ بیان کے متعلق ایک اہم خبر

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ جو اسلوبِ بیان ہے اسے عرب آج تک طے نہیں کر پائے کہ یہ کیا ہے۔ ان کے ہاں اتنے بڑے بڑے عرب ادیب تھے' شاعروں کا تو پوچھو ہی نہیں کہ ان کے ہاں کیا کمال تھا۔ نہ اس زمانے کے ادیب' نہ اس کے بعد کے بڑے بڑے عربی زبان کے ادیب' جو ان کے ہاں موجود ہیں' نہ اس کے بعد باقی دنیا کے ادیب جنہوں نے عربی زبان پر اتنی دسترس حاصل کی آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ قرآن کا اسلوبِ بیان کیا ہے۔ نہ یہ نثر ہے' نہ یہ نظم ہے اور دو ہی تو اسالیب ہوتے ہیں۔ اگلے دنوں اخبار میں ایک خبر آئی تھی۔ میں تو ان چیزوں کو دیکھتا ہوں۔ کوئی امریکہ کا موسیقار تھا۔ اس نے کہیں کسی قاری کو' قرآن کی تلاوت اپنی قرأت کے ساتھ سنا تو وہ شخص وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کسی سے پوچھا کہ یہ کس شاعر کی نظم ہے جو یہ پڑھ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ نظم Poetry (شاعری) نہیں ہے' یہ تو نثر ہے۔ وہ حیرت سے کہنے لگا کہ کیا یہ نثر ہے اور اس میں اس طرح موسیقی ہے؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی نثر میں ایسی موسیقی نہیں آ سکتی۔ موسیقی کے لیے تو شاعری لازم ہے۔ آپ نثر کا فقرہ گا کے کسی طرح سے ادا ہی نہیں کر سکتے۔ اس نے کہا کہ نہیں' یہ نثر نہیں ہے۔ اب اس کو اس کی دھن لگ گئی اور اُسے پھر ان کے پتے (Addresses) دیئے گئے۔ اس نے مختلف قاریوں سے قرآن کے مختلف مقامات سنے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب وہ سورۃ الرحمٰن پہ آ گیا تو وہاں تو پھر اس کی نگاہ نے جھک جھک کر سجدے کر دیئے ہونگے اور اسی پر وہ اسلام لے آیا۔

عزیزانِ من! قرآن کے اسلوب کے متعلق یہ بات طے نہیں ہے کہ یہ نثر ہے یا یہ نظم ہے لیکن اس میں آہنگ اس قسم کا ہے کہ وہ جو موسیقار ہے وہ فریفتہ ہو جاتا ہے اور یہ جو ہمارے ہاں قاری آ کر پڑھتے ہیں آپ دیکھیے' اگر آپ کو کچھ کلاسیکل موسیقی سے تھوڑا سا لگاؤ ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں یہ راگ کتنا پرفیکٹ (Perfact: مکمل) نکلتا ہے جو یہ اس میں قرأت کرتے ہیں۔ یہ عجیب چیز ہے کہ یہ کوئی نثر کی کتاب ہے' اس میں موسیقی سے تعلق نہیں' قرأت سے پڑھا جا رہا ہے' مگر موسیقی کے پورے فن پہ پورا اتر رہا ہے۔

اما تو چیزے دیگری

مجھے موسیقی سے بھی کچھ لگاؤ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جسے ''حجازی قرأت'' کہتے ہیں اور جسے ''مصری قرأت'' کہتے ہیں' اس میں فرق کیا ہوتا ہے۔ یہ کلاسیکل راگ کا ہی فرق ہے۔ حجازی قرأت ''بھیروں راگ'' میں ہوتی ہے اور مصری قرأت ''بھیرویں راگ'' میں ہوتی ہے' جہاں سننے والے یوں جھوم اٹھتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اس راگ کا وہ مقام آتا ہے جس میں واقعی جھوما جاتا ہے اور پھر یہ شاعری نہیں۔ میں قرآنِ کریم کے اسلوبِ بیان کی بات کر رہا ہوں' معارف اور حقائق تو بات ہی کچھ اور ہوئی۔ میں نے یہ بات اس لیے چھیڑی تھی کہ

یہی جو چار پانچ دس آیات ہیں، آپ دیکھیے کہ جسے آپ کا فیہ کہتے ہیں وہ کس طرح کس انداز سے آتا ہے: اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ o وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ o وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ o وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ o وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ o وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ o وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ o وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ o بِاَىِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ (81:1-9)۔ کیا بات ہے! کچھ سمجھ میں نہ آئے صرف سننے سے ہی انسان کو وجد آجاتا ہے کہ یہ ہے کیا۔ اور شاعری نہیں۔ خود صاحبِ کتاب کو یعنی خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ یہ شاعری نہیں۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ شاعری اس کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے اور اگر وہ اب سامنے ہوں تو پھر پوچھیں کہ حضور ﷺ پھر یہ ہے کیا۔ اما تو چیزے دیگری۔ بڑا عجیب لفظ ہے یہ جو کہہ گیا تھا:

بسیار خوباں دیدہ ام

اما تو چیزے دیگری

یہ کسی کے متعلق کہنے کی انتہا ہے: جو کچھ بھی وہ کہتا، وہ اس سے کم ہوتا، جو یہ کہا ہے کہ میں نے ساری دنیا کے یہ ''خوباں دیدہ ام'' لیکن تو کچھ اور ہی ہے۔ یہ جو چیز ہے، یہ کچھ اور ہی ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے، یہ نثر نہیں، یہ نظم نہیں۔ یہ کیا ہے؟ ہر ایک نے یہ کہا ہے کہ یہ کچھ اور ہے۔ آج تک تیرہ سو سال میں، ادبی اعتبار سے بھی، جس نے بھی قرآنِ کریم پہ غور کیا، ان لوگوں نے یہ کہا کہ یہ کچھ اور ہے۔ نیٹشے (Friedrich Nietzsche:1844-1900) نے اس کو Appreciate (نظرِ تحسین) کیا۔ وہ بہت بڑا جرمن فلاسفر تھا۔ اس نے بھی یہ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ جو الہام کی زبان ہے وہ نہ شاعری ہوتی ہے، نہ نثر ہوتی ہے۔ اس نے جو اپنی آخری کتاب لکھی ہے، وہ عجیب کتاب ہے۔ اس میں اس نے اپنے لیے ایک زبان خود Coin (وضع) کی ہے لیکن اس زبان کے اندر نہ شعر رہا ہے، نہ نثر رہی ہے۔ دونوں کو چھوڑا ہے تو وہ کچھ نہیں رہا ہے۔ اس نے دونوں کو چھوڑا ہے تو وہ بھی پکار اٹھا کہ اما تو چیزے دیگری۔ تو کچھ اور ہی ہے۔ یعنی انسانی ذہن تخلیقی طور پہ بھی وہ اسلوب نہیں وضع کر سکا جو قرآن کا ہے۔

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ (81:1) ایران کا جھنڈا لپیٹ دیا جائے گا اور پھر یہ جسے Passive vorb کہتے ہیں، انگریزی میں جسے مجہول فعل کہتے ہیں، جس میں فاعل، جو کرنے والا ہے، کو نمایاں طور پہ نہیں بتایا جاتا: مثلاً جائے گا، کھایا جائے گا، لپیٹا جائے گا۔ یہ کون لپیٹے گا؟ اس میں یہ واضح نہیں ہوتا۔ ایسے مقامات پر قرآن نے افعال مجہول استعمال کیے ہیں: مثلاً یہ لپیٹا جائے گا، یہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔ جو اب کرنے والے ہیں، ہوسکتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت یہ اور ہوں، لپیٹنے کے وقت وہ اور ہوں۔ جماعت وہی ہو لوگ دوسرے ہوں۔ وہ نام دے کر کیوں ایسا کریں، کیوں انہیں متعین کریں۔ اس لیے ایسے مقام پر اس نے Passive Voice (مجہول کے صیغے) استعمال کیے ہیں: یہ کر دیا جائے گا، یہ ہو جائے گا۔ اس میں بڑا فرق ہے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ہم ایسا کر دیں گے۔ کہا کہ یہ ہو جائے گا۔

بڑے یقین کے ساتھ کہا کہ **الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ** (81:1) ''شمس'' لپیٹ دیا جائے گا اور **اِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ** [1] (81:2)۔

اس زمانے میں' ایران اور روما کی یہ دو تو بڑی بڑی سپر پاورز تھیں۔ انہوں نے عرب کی سرحدوں پر اپنے چھوٹے چھوٹے رئیس (متمکن) Establish کر رکھے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ یہ جو عربوں کے' نبی اکرم ﷺ کے یا مسلمانوں کے' پہلے ٹکراؤ ہوئے ہیں' وہ ان کے ساتھ ہوئے ہیں۔ وہ سرحد پر واقع تھیں۔ یہ بڑی بڑی پاورز نہیں تھیں' نہ یہ قمر تھے' نہ یہ شمس تھے۔ انہیں ستارے کہا کرتے تھے۔ یہ ''نجوم'' تھے۔ عجیب قوم تھی صاحب! قرآنِ کریم نے اسی انداز کی بات کی ہے' شمس و قمر کی بات کی ہے۔ لیکن یہ نہ شمس ہیں' نہ قمر ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیا ہیں؟ یہ چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں۔ دراصل یہ ریاستیں ہیں جو ان سرحدوں کے اوپر تھیں۔ کہا کہ شمس لپیٹا جائے گا' قمر شق ہو جائے گا' اور **نُجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ** (81:2)۔ یہ جو ''انکدرت'' ہے اس کے معنی ہیں: بکھر جانا' افسردہ ہو جانا' ماند پڑ جانا' پھیکا پڑ جانا۔ طلوعِ سحر سے پہلے ستاروں کا ذرا رنگ دیکھیے کہ اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے: اڑا اڑا رنگ ہوتا ہے' افسردہ ہوتا ہے' ماند پڑ رہے ہوتے ہیں' بجھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ لفظ اس کے لیے آیا ہے۔ اب نجوم کا لفظ قمر اور شمس کی رعایت سے ہے۔ وہ نجوم اور وہاں شق القمر' شمس کو کورت' نجوم کے لیے انکدرت ہے یعنی ماند پڑ جائیں گے' پھیکے پڑ جائیں گے' افسردہ ہو جائیں گے۔ وہ تو سورج کی آمد سے پہلے ان کی کیفیت انکدرت ہے۔ یہ ہو گئے چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور وہ بڑی ریاست' بڑی مملکت۔ چھوٹی ریاستوں کے بعد' پھر خود ان ریاستوں کے اندر' خود قبائل کے اندر' یہ بڑے بڑے سردار ہیں ان کے لیے کہا کہ **وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ** [2] (81:3)۔ یہ تیسرا درجہ آیا۔

قوت کا تیسرا درجہ' ملوکیت کے تمام نشان ماند پڑ گئے

عزیزانِ من! قوت کے جتنے مظاہر تھے قرآن نے ان ایک ایک کو لیا ہے: سپر پاورز کو لیا ہے۔ وہ جو ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں استعمار کے مطابق تھیں' ان کو لیا ہے' پھر ان کے اندر جو بڑے بڑے سردار تھے' وہ سردار جو پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے تھے کہ ہمیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہلا سکتا ہے' انہیں لیا ہے۔ انہیں جبال کہتے ہیں جس کا ترجمہ ان کی زبان کے اندر پہاڑ ہے۔ عرب انہیں جبال کہتے تھے جو اپنی طاقت میں اتنے مست تھے' جو کہا کرتے تھے کہ ہمیں کوئی نہیں ہلا سکتا ہے۔ آج بھی یہ جو بڑے بڑے سردار ہیں اس قسم کی آوازیں ہمارے ہاں کے گاؤں کے معاشرے میں اب بھی سنائی دیتی ہیں۔ پہلے تو یہ بڑے بڑے شہروں میں بھی ہوتے تھے۔ یہ جو جبال ہیں' یہ جو بڑے بڑے سردار ہیں جو اپنی جگہ پہ جم کر یوں Establish (ثبت، متمکن) ہوئے ہیں' جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی نہیں ہلا سکے گا' جب

---

[1] ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کر نیچے گر جائیں گے۔ ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی۔ (مفہوم القرآن)

[2] اور پہاڑوں جیسے محکم امراء اور رؤسا اپنی اپنی جگہ ہل جائیں گے۔ (20 :78 ;56:5 ;20:105) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

انہیں اپنی جگہ سے اس طرح ہلا دیں گے کہ وہ سردارانِ قوم ریت کے تودے بن کر رہ جائیں گے' یہ تو ہے جی اس انقلاب کے آنے کی علامات جو نبی اکرمؐ اور عہدِ صحابہؓ کے اندر' ان عربوں کے ہاتھوں یعنی امتِ مسلمہ کے ہاتھوں آیا' جس میں یہ کیفیتیں محسوس شکل میں سامنے آ گئیں کہ عربوں کا جاہلیت کا قمر بھی پھٹ گیا' ایران کے شمس کا جھنڈا لپیٹا گیا' ان رومیوں اور ایرانیوں نے جتنی بھی سرحد کے اوپر بڑی بڑی ریاستیں قائم کی ہوئی تھیں' وہ ماند پڑ گئیں' افسردہ ہو گئیں' اپنے مقام میں جھڑ گئیں' ختم ہی ہو گئیں کیونکہ سورج نکل آیا۔ بڑے بڑے قبیلوں کے' بڑے بڑے سردار' جو اپنے مقام پہ' اپنے آپ کو بڑے محکم سمجھتے تھے' وہ اپنے مقامات سے ہلا دیئے گئے' ریت کے ڈھیر بنا دیئے گئے۔

تجرباتی طور پر زمانے کی سست رفتاری کے بعد بتدریج اگلا قدم

عزیزانِ من! اب میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے بعد قرآن نے یہ چیزیں بھی کہیں کہ اس دور کے ختم ہونے کے بعد پھر مجوسیت آ جائے گی' پھر سرمایہ داری آ جائے گی' پھر دورِ استبداد آ جائے گا' تو پھر جو اسی انسانیت کے دور کا زمانہ آنا ہے' اس کے آنے میں پھر لمبا عرصہ لگ جائے گا کیونکہ یہ بات زمانے کی رفتار سے آگے چلے گی۔ ایک چیز By Revolution (بذریعہ انقلاب) ہوتی ہے۔ یہ کوئی چیز انقلابی طور پہ پیدا کر دینا ہے۔ وہ تو الٹ کے رکھ دینے والی بات ہے' وہ شبا شب ہو جاتی ہے' راتوں رات بھی ہو جاتی ہے یا چند دنوں کے اندر' چند سالوں کے اندر' تھوڑے سے عرصے کے اندر انقلاب بڑی تیزی سے آتا ہے لیکن دوسرا طریقہ ارتقا کا ہوتا ہے جسے By Evolution (بذریعہ ارتقا) کہتے ہیں۔ یہ بڑا آہستہ آہستہ آتا ہے۔ زمانہ' تاریخ' معاشرہ اور انسانوں کے رہن سہن میں تبدیلی آہستہ آہستہ آتی ہیں۔ ذہنوں میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ عقلِ انسانی اپنے لیے ایک طریقہ تجویز کرتی ہے' تو اس کے متعلق غلغلہ مچ جاتا ہے کہ ہاں ہم نے اب نجات کی راہ پا لی ہے۔ اب دیکھیے کتنا بڑا انقلاب آئے گا۔ تھوڑے عرصے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو بالکل غلط بات ہے۔ یہ طریقہ تو بڑا ہی ناکام تھا' اس نے تو بڑی تباہیاں مچائی ہیں۔ پھر وہ اس طریقے کو چھوڑتے ہیں۔ چھوڑنے کے بعد ایک نیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ پچھلے طریقے کی جو خامیاں سامنے آتی ہیں' ان کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن اگلا طریق بھی تو عقلی قیاس کی رو سے ہی تجویز کرتے ہیں۔ پھر وہ اس نئے طریقے کو آزماتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ایک اور طریقہ تجویز کرتے ہیں۔ یہ انسانوں کی ذہنی تاریخ ہے۔

ذہنِ انسانی کی رو سے انسانوں نے جو مختلف قسم کے نظامِ زندگی تجویز کیے اُن کی یہی تاریخ ہے کہ ایک نظام تجویز کیا' تھوڑے عرصے تک اس پہ عمل کیا۔ اس کی خرابیاں تباہیاں سامنے آئیں' اسے چھوڑا' پھر ایک نیا طریق تجویز کیا' جس میں پہلے طریق کی خوبیاں تو لے آئے اور اس کی خرابیوں کو چھوڑ آئے۔ یہ بتدریج آگے بڑھنے والا طریق ہے۔ اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے کیونکہ اس کا یہ

طریقہ تدریجی (Gradual) ہوتا ہے۔ جب عقلِ انسانی آگے بڑھتی ہے تو پچھلے تجربے کی خوبیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کا ہر قدم وحی کے تجویز کردہ نظام کی طرف اٹھتا ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ تاریخ کو قرآن نے بڑی اہمیت دی ہے لیکن تاریخ کا مطالعہ اس نگاہ سے کرنا چاہیے کہ انسانوں نے عقل کی رو سے اپنے لیے کون کون سے نظام تجویز کیے۔ ان نظاموں نے کیا نتیجہ پیدا کیا' پھر انسانوں نے اس کے بعد کونسا نظام تجویز کیا۔ اس میں پہلے نظام کی خوبیاں کس طرح لائے پھر اس نظام میں کس طرح خرابیاں پیدا ہوئیں اور یوں بتدریج تاریخِ انسانی آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

ناکام تجارب کے بعد انسانیت کا ہر قدم قرآنی نظام کی طرف اٹھتا ہے

عزیزانِ من! اس نقطہ نگاہ سے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہونگے کہ ہر نیا نظام جو انسانوں نے تجویز کیا وہ ایک قدم قرآن کی طرف جا رہا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے تاریخ کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ جو اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے' بڑی چیزیں کہہ گیا ہے کہ

ہر دو امیرِ کارواں ہر دو بمنزلے رواں

عقل اور وحی دونوں ہی امیرِ کارواں ہیں' دونوں کا قدم منزل کی طرف اٹھ رہا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ

عقل بحیلہ می برد ' عشق برد کشاں کشاں

عقل کی رو سے اسباب و ذرائع کے ماتحت' بہ حیلہ' بتدریج' رفتہ رفتہ' ٹھوکریں کھاتے' خون اور آگ کی خندقیں پیرتے' انسانیت کی ہڈیاں تڑواتے' کس قدر خون ریزیاں کرتے' انسانیت خون کے دریاؤں میں سے نہا کر نکلتی ہے۔ عقل اس طرح منزل کی طرف جاتی ہے اور عشق یوں لے جاتا ہے' اس لیے کہ وہ عقل کی رو سے بتدریج چیزیں نہیں تیار کرتا' حقائق پہلے دن سے' وحی کی رو سے' قرآن کے اندر منکشف کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ حقائق عقل کے تدریجی طریق کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کے اوپر سے وحی نے پردہ اٹھا کر قرآن کے اندر انہیں محفوظ کر دیا ہے اس لیے عشق برد کشاں کشاں' وہ کھینچ کر لے جاتا ہے' بتدریج نہیں لے جاتا۔ بس یہ فرق ہے۔

قرآنِ حکیم کا دَورِ حکومت اب دُور نہیں رہا

عزیزانِ من! اب اس کے بعد قرآن کی رو سے وہ دَور آ رہا ہے اور میں اس پہ بہت پُراُمید ہوں کہ قرآن کی جو علامات' جو نشانیاں' میں نے سمجھی ہیں' میری بصیرتِ قرآنی نے سمجھائی ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ دَور کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ ابھی آپ اگلی آیات میں دیکھیں گے کہ قرآن کس انداز سے بات کر گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کونسا دَور دُور نہیں ہے' کس طرح سے قریب ہے؟ اس کے لیے پہلے یہ دیکھیے کہ اس کی کیا نشانیاں بتائیں۔ عربوں کے نزدیک اونٹ سب سے زیادہ مفید' قیمتی' کارآمد اور لائیفک ذریعہ تھا۔ ان کی زندگی اونٹ

پر تھی۔ اس وقت کے انسانوں سے کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! ایک زمانہ آئے گا جب وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ❶ (81:4) جب اونٹ بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔

عزیزانِ من! ذرا غور کیجیے چودہ سو سال پہلے عربوں سے یہ کہنا کہ اس کے بعد ایک دَور ایسا بھی آئے گا' جب یہ اونٹ بے کار ہو کر رہ جائیں گے' اونٹ ہی نہیں کہا بلکہ عشار کہا ہے۔ جو سب سے زیادہ کار آمد اور قیمتی اونٹنیاں ہوتی تھیں ان کے لیے یہ لفظ آتا تھا۔ اونٹ کے لیے تو عربوں کے ہاں چھ سو سے بھی زیادہ الفاظ ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ یہ جو قیمتی' بہترین قسم کی اونٹنیاں یا اونٹ ہیں' وہ بے کار ہو کر رہ جائیں گے اور پھر عُطِّلَتۡ (81:4) کہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ جی' مر مرا جائیں گے' یہ اونٹ کہیں ملے گا ہی نہیں' اونٹ تو ہو گا لیکن وہ بے کار ہو گا' جس کو معطل کہتے ہیں۔ اسے معطل کر دیا۔ یہ ہوتا ہے کہ وہ کام پہ نہیں جاتا۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے! عربوں سے یہ کہنا کہ یہ اونٹ بے کار ہو جائیں گے' وہ زمانہ آئے گا' یہ بہت بڑی بات ہے۔

اونٹ کیسے بے کار ہو جائیں گے؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اونٹ بے کار ہو رہے ہیں اور ملکوں میں تو ایک طرف خود اونٹوں کا جو ملک ہے وہاں بھی اب موٹریں اور گاڑیاں اور جہاز چل رہے ہیں۔ اب تو ہوائی جہاز ہیں۔ چھوٹا سا سفر بھی ہیلی کاپٹر میں طے ہوتا ہے' بڑا تو پوچھو نہیں۔ اب بڑے فخر سے' سب سے بڑے سعودی عربیہ کے ہوائی جہاز کی کمپنی ہے' وہاں موٹریں چلتی ہیں۔ وہاں اونٹ بے کار ہوتے ہیں۔ اونٹ کی سواری اب وہاں نظر ہی نہیں آتی: وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ❶ (81:4)۔ دیکھیے کس طرح سے ہمارے زمانے کی ایک ایک علامت سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ❷ (81:5) یہ نامانوس آبادیوں کو وحوش کہتے ہیں جیسے آسٹریلیا کے پرانے زمانے کی قومیں' افریقہ کے لوگ۔ یہ اس طرح سے صحراؤں میں' جنگلوں میں' بستیوں میں بسنے والے' الگ الگ بسنے والے لوگ ہیں۔ قومی حیثیت سے رہنے والے انسان' تاریخ میں بھی بہت تھوڑے سے علاقے تھے جس کے اندر یہ کیفیت تھی' جس میں یہ لوگ ایک قوم کی حیثیت سے بستے تھے۔ اس زمانے میں بھی یہ رومن یا ایرانی وغیرہ قوم کی حیثیت سے بستے تھے۔ عربوں کے ہاں صرف قبائل تھے' باقی ان کے ہاں بھی قومی حیثیت کوئی نہیں تھی۔ قوموں کی سطح پر اکٹھے ہو کر رہنا' ایک کمیونٹی کی طرح' بڑے پیمانے پر' ایک نیشن کی طرح' اکٹھے ہو کر رہنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ قومیں کہ جو نامانوس تھیں اس طرزِ زندگی سے ان کے ذہن میں بھی یہ کچھ نہیں آ سکتا تھا۔ ابھی کل تک ہمارے ہاں یہ صورت تھی۔

---

❶ اور جن ذرائع رسل و رسائل (مثلاً اونٹوں) کو اس وقت اتنی اہمیت دی جا رہی ہے' وہ سب بیکار ہو جائیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی۔ (ایضاً)

افریقہ کی آبادی میں مملکت کا تصور

آسٹریلیا کے باشندوں، افریقہ کے قبائلیوں، کو وحشی کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی خانہ بدوش وغیرہ قسم کی جو آبادیاں تھیں وہ الگ الگ رہنے والی تھیں۔ ان آبادیوں میں بالخصوص افریقہ کی آبادی تو ہمارے سامنے یوں آئی ہے کہ بالکل بکھرے ہوئے منتشر صحراؤں کے اندر بسنے والے۔ ان میں بھی قومی حیثیت سے بسنے کا اب انداز پیدا ہو رہا ہے، وہ قومیں بن گئی ہیں، اور مملکتوں کے زمرے میں شمار ہونے لگ گئی ہیں، یو این او (U.N.O) کے اندر اپنی سیٹ لے رہے ہیں۔ کل تک جن کا ابھی نام بھی نہیں تھا، ان میں بعض مملکتیں ایسی وجود میں آئی ہیں جن کا وہ نام تلاش کرتے ہیں، وہ باقی دنیا سے کہتے ہیں کہ سانوں دسیو کا کجھیا ہیگا، ناں کی رکھیے۔ ❶ نام پوچھتے ہیں یعنی اجتماعی زندگی سے اتنے نامانوس تھے کہ ان کے تصور میں نہیں آتا تھا۔ اس دور کے اندر تو اب مشکل سے ایسے لوگ ملیں گے جو اسی طرح سے اجتماعی زندگی سے نامانوس ہوں، ورنہ وہ بھی سارے اجتماعی زندگی سے مانوس ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں کہاں ہے کہ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ❷ (81:5) اور اس طرح یہ اجتماعی زندگی کے تصور سے نامانوس افراد اکٹھے ہو کر قومیں بننی شروع ہو جائیں گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اور کس دور کی یہ علامات بتا رہا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ❸ (81:6)۔ اس زمانے کے عربوں کے ہاں سمندروں میں کشتیاں چلتی تھیں، اتنا بڑا سمندر، اس کے اندر وہ اتنی سی بادبان والی کشتی کوئی یہاں کوئی وہاں۔ بڑی بڑی مملکتوں کی بھی کشتیاں ہی تھیں۔ اتنے سمندر میں اگر دس بیس کشتیاں بھی ہوں تو وہ بات کیا بنتی۔ یہ کہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔

کشتیوں کی جگہ جہازوں سے سمندر بھر جائیں گے

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ اس کے بعد وہ وقت آئے گا جب سمندر جہازوں سے بھرے ہوئے ہونگے۔ بِحَارُ (81:6) سمندروں کو بھی کہتے ہیں اور ان کے ہاں سمندروں کے کنارے پہ جو بستیاں بسی ہوئی ہوتی ہیں وہ ان کو بھی کہتے تھے۔ اس زمانے میں جب سمندر میں بادبان کشتیاں کہیں ایک ایک دو دو جاتی تھیں تو کنارے پہ بستیوں نے بس کے کیا کرنا تھا، اب موجودہ دور میں آپ دیکھیے کہ سب سے بڑی اہمیت سمندر کو حاصل ہوگئی ہے۔ ساری دنیا کا کاروبار سمندر پہ چل رہا ہے۔ سمندر کے کنارے ممتاز ترین بستیاں

---

❶ بچہ پیدا ہوا ہے ہمیں بتانا کہ اس کا کیا نام رکھیں۔

❷ اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ اور سمندروں میں آمد و رفت کا سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے بھرے سے دکھائی دیں گے اور ان کے کناروں کی آبادیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

بنتی چلی جارہی ہیں۔ جب کشتیوں سے، جہازوں سے، سمندر بھرے ہوئے ہوجائیں گے اوران کے کنارے کی بستیاں بہت زیادہ آباد ہوجائیں گی، یہ ان کی کیفیت ہوگی۔ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ❶ (81:7)۔

عزیزانِ من! کیابات ہے! قوم بھی بنے۔ جسے آپ Means of Communication (مواصلات کے ذرائع) کہتے ہیں، یہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ تعلق رابطہ قائم کرنے کے ذرائع ہیں۔ ہماری زندگی میں اس سے پہلے ذرائع کیا تھے؟ بس یہی پوسٹ آفس کا کوئی ایک کارڈ۔ اورآپ کو معلوم ہے کہ پوسٹ آفس (ڈاک خانے) کہاں ہوتے تھے۔ آپ احباب تو لاہور والے ہیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ ہم سے پوچھیے۔ ہم جو گاؤں والے تھے، ہمیں دس دس میل سے جاکر تو پوسٹ کارڈ لینا ہوتا تھا، ہفتہ میں ایک بار کہیں وہ چٹھی رساں (Post man) آیا کرتا تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں گاؤں بہرحال دس دس بیس بیس میل کے فاصلے پہ ہوتے تھے۔ جہاں یہ صورت نہیں ہوتی تھی وہاں ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہوتا تھا، مواصلات کے ذرائع ہی نہیں تھے۔

مواصلاتی نظام

عزیزانِ من! آج کیفیت یہ ہے کہ اپنے گھر میں، اپنی میز پہ بیٹھے ہوئے، آپ لندن میں بات کررہے ہیں جیسے دوسرے کمرے میں بات ہورہی ہے۔ میں یہ اپنے ہاں کے ٹیلیفون کا ذکر نہیں کررہا۔ آپ یہ کہہ دیں گے کہ ذرا کرکے تو بتاؤ۔ یہ ٹیلیفون کا خراب ہونا تو ایک طرف رہا، ایسے بھی گھر ہیں کہ جہاں گھر کے آدمی بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔ قرآن ان کی بات نہیں کررہا۔ آج Means of Communication (ذرائع مواصلات) اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ جو چاند پہ گیا ہوا ہے، وہ جو زمین پہ بیٹھا ہوا ہے، اس کے ساتھ باتیں کررہا ہے، اسے کچھ بتا بھی رہا ہے۔ عزیزانِ من! وہ جو پہلے گئے تھے، ان کے زمانے کا واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں نے لکھ کر رکھا ہوا ہے۔ اس زمین پہ بیٹھنے والے نے کہا کہ تو فلاں سے فلاں وقت کے لیے سورہا تھا۔ عزیزانِ من! یہ زمین والا اس کو کہہ رہا ہے جو چاند کے جہاز میں تھا، ابھی چاند کے اوپر نہیں اترا ہوگا۔ جو چاند کے جہاز کے اندر تھا، اس نے کہا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ یہ کس طرح سے معلوم ہوا کہ وہ سورہا ہے، تم نے یہ بات کیسے کی۔ اس نے کہا کہ یہ جو ہمارے نبض کی Beating (دھڑکن) ہے، یہ ریکارڈ ہوتی ہے۔ جاگنے والے اور سونے والے کی Beating (دھڑکن) میں فرق ہوتا ہے۔ اتنا عرصہ اس کی جو نبض تھی، وہ اس رفتار سے چلی تھی، جس رفتار سے سونے والے کی چلتی ہے، اس لیے میں نے اسے کہا تھا کہ تو سورہا تھا اور وہ سچی بات تھی۔ یعنی Communication (مواصلات) کی کیفیت یہ ہے کہ چاند میں بیٹھا ہوا، یا جو خلا کے اندر، جہاز کے اندر، بیٹھا ہوا ہے، وہ اگر سو بھی رہا ہے تو اس کا بھی نیچے والے کو پتہ چل رہا ہے۔ یہاں کہا کہ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (81:7) جب یہ جو الگ الگ افراد ہیں، وہ

---

❶ اور اطراف واکنافِ عالم کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائیں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جڑ کر ایک ہو جائیں گے۔ اللہ اکبر! اس دور کے اندر خدا ہی یہ کہہ سکتا تھا۔ پھر عربوں کے دَور کے اندر کو تو میں نے کہا ہے کہ ان مواصلات کا کہیں دُور دُور تک نام ونشان نہ تھا۔ یہ چٹھی رسانی تو ہمارے ہاں انگریز کے زمانے کی بات ہے۔ اس سے پہلے تو ہمارے ہاں بھی نہیں تھی اور عربوں کے ہاں تو ابھی کل تک یہ بات نہیں تھی کہ کہیں وہ چٹھی لے کر چلا جائے۔ وہاں ان سے یہ **وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ** (81:7) کہنا بہت بڑی بات ہے۔ آگے وہ بات آتی ہے کہ بڑی اہم بھی ہے بڑی نازک بھی ہے، عقلی اعتبار سے بھی بڑی عظیم ہے اور جذباتی اعتبار سے بھی بڑی شدید ہے۔

بیٹی کی پیدائش پر کیا ہوتا؟

عزیزانِ من! ہمارے دَور کی جو سب سے اہم بات آگے آ رہی ہے، اس کی تفسیر اور تشریح میں بعد میں عرض کرونگا۔ عربوں کے ہاں بیٹی کے پیدا ہونے سے اندازہ لگایئے کہ ان کے ہاں عورت کا مقام کیا تھا۔ بیٹی کو پیدا ہونے کے فوراً بعد زندہ گاڑ دیا جاتا تھا، زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ یہ تھا عربوں کے ہاں، مقامِ عورت۔ اس مقام پہ قرآن صرف اس لڑکی کو نہیں لیتا، جس کو گاڑ دیا جاتا ہے، بات عورت کی کرتا ہے کہ جس کے مقام کے لیے اس سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی کہ اس لڑکی کا ذکر کیا جائے جس کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا، اس لیے کہ مَردوں نے ہمیشہ عورت کو زندہ گاڑا ہے۔ وہ عرب کا عہدِ جاہلیت ہو یا آج کا دورِ تمدن، کوشش یہی کی ہے کہ اس کو زندہ گاڑ دیا جائے اور پوچھیے نہیں کہ قرآن اس بات کو کس انداز سے بیان کرتا ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں نے کہا کہ بات چھیڑ کر چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اسے پھر آئندہ ہی بیان کیا جائے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ التکویر کی آیت 7 تک ہی ہم آئے ہیں، آٹھویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

بارھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 8 تا 12)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1984ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ التکویر کی آیت آٹھ سے ہو رہا ہے: 81/8۔

قرآن کا اسلوبِ بیان

درس کے آغاز سے پہلے سابقہ درس کے سلسلہ میں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ غالباً درس کے آخری مرحلے میں میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کا اسلوبِ بیان بھی ایک معجزہ ہے۔ عرب، جو اپنی زبان پہ اتنے نازاں تھے کہ وہ ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے، وہ بھی انگشت بدنداں تھے کہ اس انداز اور اسلوب کے متعلق کیا کہیے: یہ نہ نظم ہے نہ نثر ہے۔ اما تو چیزے دیگری، اس انداز میں بھی یہ کوئی اور شے ہے اور وہ شے ایسی ہے کہ جس کی کوئی مثل نہیں لاسکتا، جس کی نقل نہیں کی جاسکتی۔ وہ اس کے اسلوبِ بیان سے بھی عاجز آ گئے تھے اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے بعد بھی عربی زبان کے بڑے بڑے محقق غیر مسلم بھی اور مسلمان بھی یہ تحقیق کرتے رہے کہ اس اسلوبِ بیان کے متعلق کیا کہا جائے۔ وہ شعر کے خصوصیات پہ بھی پورا اترتا ہے اور شعر نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے، ہم نے اپنے رسول کو شعر نہیں سکھایا اور شاعری کی ہر خصوصیت پہ پورا اترتا ہے حتیٰ کہ میں نے عرض کیا تھا کہ موسیقی کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ اس کے زیر و بم پہ بھی پورا اترتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی حجازی اور مصری قرأت کے محرکات

عزیزانِ من! یہ جو ہمارے ہاں حجازی اور مصری قرآتیں ہیں یا یہ جو بڑے بڑے قاری ہمارے ہاں آتے ہیں، ان کے طائفے آتے ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، یہ موسیقی کے اندر لَے ہے جس میں یہ قرآن پڑھا جا رہا ہے تو گویا اس کی کیفیت تو یہ ہے۔ وضاحت طلب نکتہ یہ تھا کہ اس پہ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں اس سے متفق ہوں کہ قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہیے۔ بالکل نہیں۔ یہ تو امت کے خلاف ایک سازش تھی۔ امت کو قرآنِ کریم سے دور لے جانے کے لیے، بیگانہ رکھنے کے لیے، اور ایک جھوٹا اطمینان اور فریبِ نفس دلانے کے لیے یہ کیفیت پیدا کی گئی کہ اس کے ظواہر پہ ہی سارا زور دیا تا گیا کہ اس کے مطالب اور مقاصد ذہنوں سے دور رہیں۔ اور یہ کہ قرآن کو ناظرہ پڑھنا چاہیے یعنی ناظرہ پڑھنے سے بہت ثواب ہوتا ہے۔ ناظرہ کے معنی ہیں اس کے الفاظ پڑھتے

چلے جایئے اور الفاظ کے معنی سمجھ میں نہ آئیں۔

ہمارے ہاں صدیوں سے بغیر سمجھے اور بغیر سوچے قرآن کی تلاوت کا عمل چلا آ رہا ہے

قرآن نے تو اپنا تعارف پہلے ہی لفظ میں یہ کرایا ہے کہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ (2:2) یہ ایک کتاب ہے۔ کیا دنیا کی کوئی کتاب ایسی بھی ہے کہ جس کے الفاظ پڑھیں اور کتاب کے معنی سمجھ میں نہ آئیں؟ بالکل معنی سمجھ میں نہ آنا تو ایک طرف اگر اس کتاب کا اسلوب مشکل ہے تو آپ اس زبان کی کتاب ایک دفعہ پڑھ کر رکھ دیں گے کہ نہیں بھائی' یہ میرے بس کی بات نہیں ہے' یہ مشکل ہے' میں یہ نہیں سمجھ سکتا لیکن دنیا میں یہی ایک کتاب ہے کہ جس کو پڑھا جا رہا ہے' ہزاروں بار' لاکھوں بار' کروڑوں بار اور ایک لفظ نہیں سمجھتا: نہ پڑھنے والا' نہ سننے والا۔ ایک ایک رات میں اس کو ختم کیا جاتا ہے' ایک ایک قاری کے پیچھے ہزاروں سننے والے موجود ہوتے ہیں' سارا قرآن پڑھنے کے باوجود نہ قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایک لفظ کے بھی معنی کیا ہیں' نہ ان لاکھوں ہزاروں سننے والوں کی سمجھ میں ایک بھی لفظ آتا ہے:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

اور وہ پڑھے چلے جا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک ایک حرف بغیر سمجھے ہوئے پڑھنے سے ہی دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ یہ ناظرہ ہے' پھر اس کے بعد حفظِ قرآن ہے۔ انہی الفاظ کو حفظ یعنی ازبر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جو حفاظ ہیں یعنی جو قرآن کے حافظ ہیں' وہ بھی اس کے الفاظ ہی کو دہراتے ہیں' انہیں بھی ان لفظوں میں سے کسی ایک لفظ کے معنی پتہ نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد فنِ قرآت آ گیا صاحب! قاری ہیں' اسے تجوید بھی کہتے ہیں' اس کے لیے آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے مدرسے کھلے ہوئے ہیں۔ کتنے کتنے سال اس فن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بڑے بڑے ماہرین ہوتے ہیں۔ ان لفظوں کے معنی وہ بھی نہیں جانتے۔ یعنی آپ نے غور فرمایا کہ امت اس بات سے مطمئن ہو گئی ہے۔ وہ کتاب ہے کہ جس کے الفاظ کو دہرا لیا جائے تو مقصد پورا ہو جاتا ہے' ضرورت نہیں ہے کہ اس کے معنی بھی سمجھ میں آئیں مفہوم بھی سمجھ میں آئے۔

عزیزانِ من! وہ کتاب جس کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہ آئے' پڑھتے چلے جایئے تو بتایئے کہ اس کتاب کے وجود سے کیا مقصد ہوا؟ اس کے ظواہر کی طرف توجہ دینے سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ بھی نہیں ہمارے اس دور میں' خاص طور پہ اس کے ظواہر' پہ توجہ دی جا رہی ہے۔ قرآنِ کریم کا ایک ماڈل ہے۔ پتہ نہیں من بھر کا ہے یا کتنا ہے' اسے کسی ایک جگہ رکھا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم سونے کے تاروں سے لکھا گیا ہے' اسے لکھنے میں کتنے ہی سال لگے اور کتنے ہی لاکھ روپے اس پہ صرف ہوئے پھر وہ تبرکاً پھرایا گیا' اس کے جلوس نکالے گئے' پھر پچھلے دو

تین سال سے وہ قرآنِ کریم ہے جس کا ایک پارہ من بھر کا ہے۔ وہ یہاں ہی نہیں بلکہ اگلے دنوں یہ تھا کہ وہاں انگلینڈ میں بھی اس کی زیارت کرائی گئی۔ اس کو پھرایا جارہا ہے اور وہ تیس پارے پھر آپ سوچ لیجیے کہ تیس من کے وہ ہوئے۔ وہ اس کے اوپر لگے ہوئے ہیں' اتنا روپیہ خرچ آرہا ہے' اسراف ہورہا ہے' مگر وہ سب اس کی کتابت میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے قرآنِ کریم صحیح لکھا ہوا ہونا چاہیے' خوشخط لکھا ہوا ہونا چاہیے' نگاہوں کو اچھا لگے' اچھی طرح سے پڑھا جائے۔ اتنی سی بات ہے لیکن اس کتابت کے اندر بھی اب فنِ کتابت والے' عجیب عجیب قسم کی کاریگریاں دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ وہ جو کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے اور تو اور مجھے ان فنون سے بھی دلچسپی ہے بعض اوقات سمجھنے کے لیے مجھے دقت پیش آتی ہے کہ یہ کونسی آیت ہے جو لکھی ہوئی ہے۔ فن ہے' لگے ہوئے ہیں اس کے اندر۔ چلی ہوئی ہے قوم' اس شغف کے اندر ساری قوم کی قوم ڈوبی ہوئی ہے۔ قرآن کے مطالب اور معنی اور مقاصد کے متعلق کہیں کچھ نہیں کہا جارہا۔ یہ جو گا گا کر پڑھنے والی بات ہے' یہ بڑی دلچسپ چیز ہے' اس کے لیے ایک حدیث بیان کی جاتی ہے مگر یہ حدیث مطلب کے اعتبار سے واقعی بڑی عظیم ہے: **لیس منا من لم یتغنیٰ بالقرآن** غور کیجیے کتنی بلند چیز ہے: قرآن جس شخص کو کسی اور چیز سے مستغنی نہیں کردیتا' بے نیاز نہیں کردیتا' غیرِ خداوندی راہنمائی سے' دنیا کی ہر چیز سے' مستغنی نہیں کردیتا' حضورؐ نے کہا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ آپ ان الفاظ پہ غور کیجیے کہ قرآن مستغنی نہیں کردیتا' مگر اس روایت کے غلط مفہوم نے قرآن کریم کو گا گا کر پڑھنے کا جواز پیدا کردیا۔

ایک روایت کا غلط مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کی ایک آیت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے قرآن نازل کردیا ہے۔ گویا انسانی راہنمائی کے لیے' ایک ضابطہ حیات ہونے کے لیے' قرآن مکتفی ہونا چاہیے۔ کتنی عظیم ہے یہ روایت جو اوپر آچکی ہے! نظر آتا ہے کہ یہ واقعی نبی اکرم ﷺ کی روایت ہے کہ جس شخص کو قرآن غیر قرآنی چیزوں سے مستغنی نہیں کردیتا' وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اب یہاں یتغنیٰ ایک لفظ آیا ہے۔ اس میں غ کے زیر کے ساتھ غِنا پڑھیں' تو اس کے معنی گانا ہوتا ہے' اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جو قرآن کو گا کر نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اندازہ لگائیے کہ یہ سارا کچھ کیا ہے: قوم کو ظواہر میں الجھا دینا ہے تاکہ قرآن کے مفہوم' معنی' اور مقاصد و مطالب نگاہوں سے اوجھل رہیں' ان کی ضرورت ہی نہ سمجھی جائے' ساری عمر اسی طرح سے الفاظ کو دہراتے ہوئے چلے جائیں مطمئن ہوجائیں کہ ہاں! قرآن کی تلاوت ہورہی ہے' ثواب ہورہا ہے۔ یاد رکھیے عزیزانِ من! قرآن عربی مبین کی ایک کتاب ہے' یہ خود قرآن نے کہا ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو واضح کتاب بنایا ہے۔ یہ مبین ہے۔ خود بھی واضح ہے اور ہر چیز کو واضح کردینے والی ہے۔ نور ہے' روشنی ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ اس کی وضاحت ہمارے ذمہ تھی' ہم نے اس کی وضاحت بھی کردی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب

ہے جو پوری انسانیت کے لیے ضابطہ حیات ہے' راہنمائی کا کوڈ ہے' واضح ہے' روشن ہے۔ اس کتاب کو بہرحال اس انداز سے پڑھا جانا چاہیے کہ اس کے مطالب اور مقاصد واضح ہوں۔ اسی لیے خود قرآن نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ (54-17,54-22, 54-32, 54-40) بڑا آسان ہے قرآن۔ اور واقعی آسان ہے۔ میں کئی دفعہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان میں بھی اگر کسی کو زبان کے اعتبار سے بھی گرامر کے آداب سکھانے کے بعد کوئی آسان سی کتاب شروع کرانی ہو' تو وہ قرآن ہے' ورنہ عربی ادب تو اتنی مشکل چیز ہے کہ پوچھیے نہیں۔ اس میں قرآن سہل ترین کتاب ہے۔ اس کو اس طرح پڑھنا چاہیے' نہ کہ اس طرح کہ اس کے اندر وہ قراءتیں ہوں' ناظرہ ہو' گانے ہوں اور وہ تجویدیں ہوں اور پھر اس کے بعد یہ کہ سوسو من کا قرآن ہو' اور اس کے بعد پھر یہ رنگا رنگ قسم کی اس کی کتابتیں ہوں۔ یہ سارا کچھ قوم کو الجھانے کے لیے ہے کہ قوم قرآن کے مفہوم کے قریب نہ آنے پائے اور اپنے آپ کو مطمئن رکھے کہ ہاں' ہم مقصد پورا کر رہے ہیں' لہٰذا پہلی چیز تو یاد رکھنے والی ہے کہ یہ تمام حربے قرآن سے امت کو دور لے جانے کے لیے ہیں۔ قرآن سمجھ کر پڑھنے کی کتاب ہے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کا ضابطہ حیات ہے۔ اب اس وضاحت کے بعد ہم درس کی طرف آتے ہیں۔

عہدِ جہالت میں عورت کا مقام

قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ایک دَور آئے گا' جس میں ہر شخص کا عمل اس کے سامنے نمایاں طور پر آ جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ درمیان میں ایک ایسا دَور بھی ہوگا کہ امت اس دین سے الگ ہو جائے گی۔ یہاں قرآن نے کچھ نشانیاں بھی بتائی ہیں کہ اس کے بعد ایک دور ایسا آئے گا جس میں یہ تغیرات ہونگے۔ ان تغیرات کے بعد یہ بتایا ہے کہ پھر ایک ایسا نظام قائم ہوگا کہ جس میں ہر شخص کا عمل اس کے سامنے نمایاں طور پہ آ جائے گا۔ غلط کام کے غلط نتیجے اور صحیح کام کے صحیح نتائج واضح طور پر اس دَور میں سامنے آ جائیں گے۔ قرآن کریم نے پہلے اس دَور کی مختلف نشانیاں بتائی ہیں کہ اس اس قسم کے تغیرات ہونگے۔ وہ تغیرات پہلی سات آیات تک ہیں جو ہم پہلے درس میں دیکھ چکے تھے۔ جب پچھلی دفعہ آٹھویں آیت آئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز ہے' اسے ہم آگے چل کر Define (متعین) کریں گے' وہ آیات ہیں: وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (81:8-9)۔ یہاں الْمَوْءٗدَةُ کا لفظ آیا ہے۔ عرب اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ بچیاں خاصی عمر کی ہو جاتی تھیں تو پھر انہیں دفن کرتے تھے۔ بہرحال' وہ دفن کر دی جاتی تھیں۔ عرب اس بچی کو مَوٗدة کہتے ہیں۔ میں اس آیت پہ تو بعد میں آؤنگا۔ خود اس آیت کا جو انداز ہے وہ تو پوچھو نہیں' وہ انسان کو وجد میں لے آنے والا ہے۔ عربوں کے ہاں عورت کی کیفیت کیا تھی؟ یہاں تو صرف مَوْءٗدَةٌ کہہ کر بات چھوڑ دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیوں ایسا کرتے تھے؟ عورت کی ان کے ہاں پوزیشن کیا تھی؟ سورۃ النحل (16:58-59) کی دو آیات ہیں۔ ان میں کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ (16:58) جب کوئی آکر ان کو خبر

دیتا ہے کہ تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو رنج کے مارے ان کا چہرا سیاہ پڑ جاتا ہے' اس صدمے کو سن کر' وہ غلطاں و پیچاں ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے اور اگلی آیت ہے کہ یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ (16:59) اس منحوس خبر کے سننے کے بعد وہ اپنے لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔ ایک آیت میں قرآن نے بتا دیا کہ ان کے ہاں عورت کی حیثیت کیا تھی: وہ اپنی قوم کے اپنے قبیلے کے لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے کہ ہو کیا گیا' اور اس کے بعد وہ سوچتا ہے کہ اَیُمْسِکُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ (16:59) کیا میں اپنی قوم میں یہ کلنک کا ٹیکہ لیے ہوئے ساری عمر پھرتا رہوں یا اس کو ابھی سے دفن کر دوں؟ عزیزانِ من! ان الفاظ پہ غور کیجیے: اَلَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ [1] (16:59) یہ خیالات جو اس کے دل میں ہیں کس قدر برے ہیں! ایک آیت میں یہ بات صاف ہو گئی کہ اس ماحول میں' اس معاشرے میں' عربوں کے ہاں عورت کا مقام کیا تھا۔ قرآن بتا رہا ہے کہ ان لوگوں کی بیٹی کی پیدائش پر یہ کیفیت ہو جاتی تھی۔ اگر زندہ رکھتا ہے تو اس کے یہ الفاظ سن لیجیے کہ کیا میں یہ کلنک کا ٹیکہ' شرمندگی کا سامان' ساری عمر اپنے ساتھ لیے پھروں' یا ابھی دفن کر دوں؟ اگر وہ زندہ رہتی ہے تو وہ باپ ماں کے لیے ندامت کا' شرمندگی کا باعث بن جاتی ہے' اور اس سے بچنے کے لیے ان کے ہاں طریقہ یہ ہے کہ اس کو زندہ گاڑ دیا جائے' زندہ دفن کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی جو قرآن کہہ گیا ہے کہ ان کے ہاں عورت کا مقام کیا تھا۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ اَلَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ (16:59) خود کہہ دیا کہ کس قدر غلط اور برا فیصلہ ہے جو یہ اپنے ذہن میں کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن نے بتا دیا ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے۔ نہ یہ ایسی ہے کہ بیٹی کے پیدا ہونے پر کوئی شرم محسوس کرے' نہ ایسی کہ اگر ساری عمر اسے زندہ رکھا ہوا ہے تو ندامت کے مارے منہ چھپاتا پھرے' نہ ایسی کہ اس کو زندہ درگور کر دیا جائے۔ عورت اور مرد انسان ہیں۔ یہ باتیں درس میں بھی آ چکی ہیں اور میں نے عورت کے مقام پر بہت کچھ لکھا ہے' خاص طور پہ میرا ایک مضمون میرے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے: ''عورت قرآن کے آئینے میں''۔ عورت اور مرد میں قرآن نے کوئی فرق ہی نہیں کیا۔ جہاں وہ الناس کہتا ہے۔ اس کا ترجمہ انسان ہے۔ انسان میں صرف مرد ہی داخل نہیں ہوتے۔ مرد اور عورتیں دونوں انسان ہوتے ہیں۔

قرآن نے عورت کو مرد کا ہم دوش بنا دیا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں ایسی آیات ہیں کہ جن میں مومنین اور مومنات یعنی ہر وہ بات' ہر وہ خصوصیت' ہر وہ کام' جو مومنین کے متعلق ہے قرآن انہی کو مومنات کے متعلق بھی کہتا ہے۔ اور اس طرح دونوں کو ہمدوش چلاتا ہے۔ اس صنف روزگار کے اندر کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے ہر مقام' ہر خصوصیت حاصل ہے' انسانیت کی بھی اور پھر مومن ہونے کی بھی' اس دنیا میں بھی اور

---

[1] اُف! کس قدر برا ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ اپنی معصوم بچیوں کے متعلق کرتے ہیں!! (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آخرت کے اندر بھی۔ قرآن کی آیات میں دونوں کے متعلق برابر برابر یہ چیز آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جس میں مرد کے مقابلے میں عورت کو کم تر درجے پہ دکھایا گیا ہو۔ قرآنِ کریم نے عورت کو اس مقام سے اٹھا کر' جو عرب معاشرے میں عورت کا تھا' مرد کے ہمدوش بنا دیا۔

صدرِ اوّل کے اسلام کے بعد عورت کی حالت زار

عزیزانِ من! صدرِ اول کے اسلام کا زمانہ چلا گیا۔ اس دَور کے بعد مسلمانوں نے اپنے ہاں ہر اُس چیز کو رائج کیا' جسے مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا' جسے عرب والا وجہ ندامت سمجھ رہا تھا۔ پھر جب وہ ہاتھ دھو کر عورت کے پیچھے پڑے تو پوچھو نہیں کہ وہ اسے کس مقامِ پست پہ لے آئے۔ چونکہ زندہ دفن کرنا معاشرے کا ایک قانونی جرم تھا' میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہیں ہوا تھا کہ خدا سے ڈر کر انہوں نے اس جرم کو چھوڑ دیا ہو کہ اس کو زندہ درگور نہ کیا جائے بلکہ یہ قانوناً جرم قرار دیدیا گیا تھا اور اس کی سزا قتل کی سزا تھی اس لیے صدرِ اوّل کے اسلام کے بعد انہوں نے عورت کو یوں زندہ درگور تو نہ کیا۔ اس کے برعکس اسے زندہ رکھا کہ نہ وہ زندہ رہے' نہ وہ مُردوں میں ہو۔ یہ جہنم کی زندگی ہے' جو قرآن نے کہی ہے کہ اس میں نہ موت ہوگی نہ زندگی ہوگی۔ انہوں نے ساری عمر عورت کو اس مقام پہ رکھا کہ آج بھی نہ وہ زندوں میں شمار ہوتی ہے نہ مُردوں میں شمار ہوتی ہے۔ اُسے اس حالت میں رکھنا جرم نہیں ہے اس لیے مرد کو سزا نہیں مل رہی کیونکہ اس نے عورت کا قتل تو نہیں کیا اور جو کیا ہے وہ ایسا قتل ہے کہ پھانسی پر لٹکائے رکھا ہے لیکن وہ جسے نیچے سے تختہ کھینچ لینا کہتے ہیں کہ ایک منٹ میں معاملہ ختم ہو' یکسو تو ہو' تختہ نہیں کھینچا جاتا' اسے پھانسی کے تختے پہ لٹکائے رکھا جاتا ہے۔ یہ اس عذاب سے زیادہ سخت عذاب ہے جو وہ عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر کے دیتے تھے۔ وہ تو ایک منٹ کی بات تھی' ختم ہوا قصہ' مگر یہاں:

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ ہجر میں بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا ❶

عورت کے متعلق وضعی روایات

عزیزانِ من! وہ تو لڑکی کو ایک بار مار دیتے تھے مگر یہاں ساری عمر اس کو مارا جاتا ہے۔ وہ دور ختم ہوا۔ اب کیا کیا جائے؟ جیسا کہ زندگی کے دیگر شعبوں اور گوشوں میں کیا' یہاں بھی یہ کیا: روایات وضع کیں۔ یہ بڑی عجیب سازش تھی کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہا جائے' کہا یہ

---

❶ دیوانِ غالب میں یہ شعر یوں ہے:
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شبِ غم بری بلا ہے　　مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
(دیوانِ غالب، جہانگیر بک ڈپو، لاہور' 2002ء، ص۔37)

جائے کہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد کس کی جرأت ہے کہ یہ کہے صاحب! میں اسے نہیں مانتا اور سند کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے۔ دوڑھائی سو سال کے بعد بخارا ❶ سے' نیشاپور ❷ سے' آذربائیجان ❸ سے' سیستان ❹ سے' آنے والے' لوگوں سے ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ صاحب! رسول اللہؐ کی کوئی بات آپ کے پاس ہے؟ کسی نے کہا کہ ہاں صاحب! میرے ابا جان نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ بات اس طرح تھی۔ دوڑھائی سو سال بعد' انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے یہ بات کس سے سنی؟ جی! انہوں نے کہا تھا کہ انہوں نے اپنے والد سے سنی یا اپنے استاد سے سنی' پھر انہوں نے اپنے والد سے سنی۔ آپ سوچتے ہیں کہ دواڑھائی سو سال کے عرصے میں درمیان میں کتنے نام لینے پڑیں گے اور آخر میں بات کسی صحابی پر آئی یا پھر یہ کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا۔ کئی دفعہ یہ چیزیں آ چکی ہیں۔ اس قسم کی چھ لاکھ روایات تو امام بخاریؒ ❺ خود کہتے ہیں کہ مجھے لوگوں سے ملیں اور پھر میں نے انہیں خود اپنے قیاس سے چھانٹا۔ ان میں سے چھانٹ کر کوئی تین ہزار کے قریب رکھیں اور اپنی کتاب میں درج کیں۔ ویسے تو یہ قریباً چھ ہزار کے قریب بنتی ہیں مگر مکررات کو نکال دیا جائے تو وہ اتنی بن جاتی ہیں' اب ان روایات کے متعلق' جو انہوں نے اس طرح جمع کیں' اس طرح اِن کا انتخاب کیا کہ ایک انسان نے اپنے قیاس اور رائے کے مطابق ان کو اکٹھا کر کے دیا' اُسے کہا کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا تھا۔ جی! عورت کے متعلق اس قسم کی حدیثیں ہیں۔ واضح رہے کہ خود جسے موضوعات کہتے ہیں' ہمارے ہاں وہ وضعی حدیثیں ہیں۔ ان پر بڑی بڑی کتابیں ہیں کہ یہ کس طرح سے بنائی جاتی تھیں' کیوں بنائی جاتی تھیں' ان کے کیا مقاصد تھے۔ یہ سارا کچھ ہمارے ہاں کتابوں میں موجود ہے۔ اس کے باوجود اگر ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ کہہ دیجیے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ یا اس پہ رسول اللہؐ یا صحابہؓ میں سے کسی کی شان میں طعن پڑتا ہے تو اس کا نام ہی منکرِ حدیث رکھ دیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں ایک کافر کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو منکرِ حدیث کا ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان کے پاس مذہب کی جس قدر بھی متاع ہے' وہ تو ساری کی ساری یہ چیزیں ہیں۔ ان پر کسی قسم کی تنقید نہیں ہے' یہ چیز ہونی چاہیے کہ ان کو بھی ایک بار' جس طرح امام بخاریؒ نے کیا تھا' بیٹھ کر' سوچ کر' دیکھ لو' ان میں سے جو قرآن کے خلاف جاتی ہیں تو کہہ دو کہ امام بخاریؒ کی چھان پھٹک صحیح نہیں رہی کیونکہ یہ روایات حضورؐ کی شان کے خلاف جاتی ہیں' کم از کم انہی روایات کے متعلق کہہ دو کہ یہ صحیح نہیں ہو سکتیں مگر افسوس کہ آپ انہیں چھُ نہیں کر سکتے۔ عورت کے متعلق بھی اس قسم کی بے شمار وضعی روایات ہیں۔ ان کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

---

❶ حضرت امام محمد اسماعیل بخاریؒ (256-194ھ) اپنے وطن بخارا سے آئے۔

❷ حضرت امام مسلم بن حجاجؒ (261-204ھ) اپنے وطن نیشاپور سے آئے۔

❸ حضرت امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ (279-209ھ) اپنے وطن ترمذ' جس کا آج نام آزربائی جان ہے سے آئے۔

❹ حضرت امام ابوداؤد (275-203ھ) اپنے وطن سیستان سے تشریف لائے۔

❺ ملاحظہ فرمائیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔ 201 فٹ نوٹ نمبر 1۔

روایات کی روشنی میں عورت کا مقام

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ پہلی چیز ''صحیح حدیث'' میں یہ ہے کہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اِس سے ذہن میں یہ آیا کہ ہاں، رسول اللہؐ نے یہ ایسا ہی صحیح فرمایا ہے۔ صحاح ستہ یعنی چھ صحیح حدیث کی کتابیں ہیں جو ہمارے ہاں چلی آ رہی ہیں، انہوں نے صحیح بخاری کو بھی انہی میں رکھا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس نام کے ساتھ ہی صحیح کا لفظ لکھ دیا جاتا ہے، اس کے اندر کی جو بھی حدیث آ جاتی ہے، اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحیح حدیث میں ہے، جناب! یہ صحیح حدیث میں ہے کہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے پس تو اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو تُو اسے توڑ دے گا۔ ٹوٹ تو جائے گی، سیدھی نہیں ہوگی۔ تو اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ اگر تو اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے اِس سے فائدہ اٹھانا چاہے، تو بیشک تو فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اسے کچھ تھوڑی سی ٹیڑھی رہنے دو کیونکہ یہ پوری کی پوری سیدھی نہیں ہو سکے گی، ٹوٹ جائے گی۔ اس کو کچھ تھوڑی سی ٹیڑھی رہنے دو اور پھر اس سے فائدہ اٹھالو۔ یعنی یہ ایسی چیز ہے جس سے مرد فائدہ اٹھائے گا، یہ ہے عورت کا مقام! ٹیڑھی رہنے دو۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت نے نبیؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے پس آپؐ نے اس سے بدلا لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت اتری: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) [1] اور اس کا ترجمہ یہ لوگ کرتے ہیں کہ خدا نے مردوں کو عورتوں پر داروغہ یا حاکم بنا کر بھیجا ہے۔ تو جس کو جیل کا داروغہ بنایا جائے گا وہ قیدیوں کا جو حشر کرے گا، وہ تو ظاہر ہے۔ لکھا یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس عورت سے کہا کہ اگر تمہیں خاوند نے مارا ہے تو تم اس کا بدلہ لے سکتی ہو تو اس پہ یہ آیت اتری۔ آپ کو یاد ہے میں نے قرآن کی آیات کے شانِ نزول [2] کے متعلق ایک درس میں بیان کیا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ اس کا بدلہ لینے پر یہ آیت اتری کہ خدا نے مردوں کو عورتوں پر داروغہ بنایا ہوا ہے۔ آیت اتری اور بدلا نہ دلوایا گیا۔ یہ ہیں حدیثیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لیے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے ایسا کرنے کا حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ آگے سنیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا کیا جائے، میں نے کچھ اور چاہا تھا خدا نے کچھ اور چاہا۔ یعنی رسول اور اس کے خدا کے اندر

---

1. تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں۔ بقول صاحب تاج العروس قَوَّامٌ کے معنی ہیں سامانِ رزق مہیا کرنے والا، کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے۔
2. اسی کتاب کا نواں باب (ص ص 134 تا 150) نیز دسواں باب (ص ص 151 تا 161) ان تمام کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، ......ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص 218-197 اور 242-221۔

معاذ اللہ کشمکش ہو رہی ہے اور رسول اللہؐ کی مجبوری ہے۔ عورت سے کہا کہ میں نے کہا تھا کہ بدلہ لو اور اُدھر سے خدا کی طرف سے یہ حکم آ گیا۔ خدا کے لیے بھی تو بہرحال مجھے معاف فرمایئے گا مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کا لفظ ''میاں'' خاوند کے لیے یا اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ میاں یا مالک ہمارے ہاں عورتوں کی زبانوں پہ ہے۔ یہ انہی روایات کی بنا پہ ہے۔ اللہ میاں بھی یہ چیز تھی۔ وہ میاں جو ہوا۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضورؐ جو کچھ فرماتے تھے وہ وحی کی بنا پر ہوتا تھا ان سے پوچھیے کہ اس حدیث کی روشنی میں آپ کیا فرما رہے ہیں؟ یہی کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا خدا نے کچھ اور چاہا ہے: **اردنا عملہ و اراد اللہ غیرہ** اس لحاظ سے یہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ ہم نے ایک چیز چاہی تھی خدا نے اس کے برعکس فیصلہ دیدیا اب میں کیا کروں۔ پھر اس عورت سے کہا ہوگا کہ اچھا جاؤ بی بی! روؤ جا کے۔ کیا کیا جائے تم بھی مجبور ہو میں بھی مجبور۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ یہیں سے وہ حکم ہوتا ہے کہ مردوں کو حق حاصل ہے کہ عورتوں کو ماریں بھی اور پھر اس کے بعد تو کئی روایتیں ہیں کہ فلاں صحابی نے یوں مارا حضرتِ عمرؓ نے یوں مارا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ سجدہ کرے اپنے خاوند کو!!! یاللعجب! حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ مضرت کا باعث نہیں ہے۔ فتنہ مضرت کا باعث۔ ان کو یاد نہیں رہتا۔ ایک طرف یہ کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے اور دوسری طرف یہ کہ عورتوں سے زیادہ فتنہ دنیا میں کوئی نہیں۔ گویا وہ جو ماں ہے وہ عورت نہیں ہوتی یعنی وہ سب سے بڑا فتنہ بھی ہے اور اس فتنہ گر کے پاؤں کے نیچے جنت بھی ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے حدیثیں وضع کیں جب یہ عورت کہتے تھے تو اس سے ان کے ذہن میں بیوی ہوتی تھی کیونکہ یہ دو چیزیں بظاہر یوں آمنے سامنے رکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر عورت فتنہ ہے حضورؐ کے فرمان کے مطابق مضرت رساں ہے تو پھر ایک ماں بھی تو بہرحال عورت ہے بجز اس کے کہ اگر کسی کے ہاں اولاد نہ ہو۔ ہر عورت ماں ہو جاتی ہے تو ہر ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ پاؤں کے نیچے جنت ہے پھر پاؤں کے اوپر فتنہ ہے۔ اور کیا کہا جائے!!

جنت میں اکثریت فقیروں کی اور دوزخ میں اکثریت عورتوں کی

عزیزانِ من! بڑا دکھ ہوتا ہے کہ عورت فتنہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے: عورت گھر اور گھوڑا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی بھیک منگوں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔ جن عورتوں کے پاؤں کے نیچے جنت تھی ان کی اکثریت دوزخ میں ہے۔ اس انداز سے عزیزانِ من! پھر عورت کو اس مقام پر لایا اور پھر اس کے بعد آہستہ آہستہ ملوکیت کے زمانے کے اندر عورتوں کو محلوں کے اندر بند کیا ہے تو پھر تو وہ باہر نہیں نکل سکتیں۔ کوئی کام جو مرد کر سکتا ہے عورت کو اس پہ مقرر نہیں کیا جا سکتا انہیں کوئی ذمہ داری کا کام نہیں دیا جا سکتا۔ چلتے گئے ہیں چلتے

آ رہے ہیں۔ اپنے اس دور میں آپ دیکھیے کہ روز کس کس قسم کے فتوے جاری ہو رہے ہیں' قانون بن رہے ہیں۔ کس قسم کے قانون بن رہے ہیں؟ یہی کہ اگر عورت کے سامنے کوئی اس کے خاوند کو قتل کر دے تو اس کی شہادت نہیں لی جا سکتی۔ آج کل یہ جو فوجداری کے کیس کے قانون آپ کے ہاں بنے ہوئے ہیں' میں ان کی بات کر رہا ہوں' اس زمانے کی نہیں کر رہا جب یہ روایات وضع ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں ان روایات کی بنیادوں پر پھر فقہ کے قانون بنے۔ یہی وہ فقہ کے قانون ہیں جو قیامت تک کے لیے اب آپ کے ہاں شریعتِ حقہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب جو ہمارے ہاں اسلام کا نفاذ کہا جا رہا ہے' اس میں جو اسلامی قوانین بنائے گئے ہیں اور بنائے جا رہے ہیں' ان میں یہ چیز بھی ہے۔

فوجداری کیس میں عورت کی شہادت قبول نہیں

قتل کے کیس (مقدمہ) میں' فوجداری کے کیس (مقدمہ) میں' عورت کی شہادت ہی نہیں لی جا سکتی' یہ شہادت قابلِ قبول ہی نہیں ہے' یعنی اس کے سامنے اس کے خاوند کو کوئی قتل کر دیتا ہے اور ایسا مقام ہے جہاں کوئی دوسرا ہے نہیں' اس کی شہادت نہیں لی جائے گی۔ دوسرا کوئی شہادت والا ہے نہیں' ملزم بری ہو گیا۔ عورت کی شہادت نہیں لی جا سکتی۔ دیوانی کے قصے میں' دستاویزات کے اندر' جہاں کہیں شہادت لینی پڑ جائے تو وہاں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے۔ یہ جو آجکل قصاص اور دیت کا قصہ چل رہا ہے وہ تو اور بات ہے کہ وہ کیا کیا چیزیں قرآن کے خلاف ہیں۔ ان میں یہ جو نفاذِ اسلام کے قوانین بن رہے ہیں' وہ قرآن کے خلاف ہیں۔ ان میں ایک یہ چیز بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بیچ میں بات آ گئی۔ قرآنِ کریم میں بہ نصِ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جو قتلِ خطا ہے' غلطی سے کسی سے کسی کا کوئی قتل ہو جائے' تو اس میں اس کا خوں بہا یا دلایا جائے گا' اس کی سزا موت نہیں ہو گی بلکہ خوں بہا دیا جائے گا۔ اس کو دیت کہتے ہیں' اسے عربی زبان میں خون بہا کہا جائے گا' اور جو قتلِ عمد ہو گا' دانستہ کسی نے کسی کو قتل کیا ہو گا تو اس کی سزا موت ہو گی' اس میں دیت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جو قانون بنایا جا رہا ہے' اس میں قتلِ عمد میں دیت بھی ہے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا بھی حق ہے کہ وہ قاتل سے صلح کر لیں' اسے معاف کر دیں' کچھ لے کر صلح کر لیں۔ سوچ لیجیے قرآن قتلِ عمد میں موت کی سزا دیتا ہے۔ بہر حال دیت قتلِ عمد میں ہو یا یہ کسی میں بھی اسے رکھیں' اگر مرد قتل ہو تو اس کی دیت (فرض کیجیے) کہ دس ہزار روپیہ ہے' اس کی جگہ عورت قتل ہو تو اس کا خوں بہا مرد سے آدھا ہے۔

قرآن کے ماننے والوں کی حالتِ زار

عزیزانِ من! آپ اندازہ لگائیے' یہ ہے جو عورت کا مقام ہے۔ اب روز یہ فتوے جاری ہو رہے ہیں کہ آنے والے دستور (Constitution) میں' عورتوں کا مقام کیا رکھا جائے گا' کیا کیا اس کے حقوق ہونگے؟ یہ سارا کچھ اس قرآن کے ماننے والی قوم کہہ

رہی ہے جس نے یہ چیز کہی کہ یہ لوگ عورت کو باعث ہتک باعث ندامت سمجھتے ہیں ان کی یہ کیفیت ہے۔ کتنا برا خیال ہے جو یہ دلوں میں لیے ہیں' کتنے بڑے غلط فیصلے ہیں جو یہ کچھ کر رہے ہیں اور اس طرح ہم چلے آئے ہیں۔

فتوؤں کو قانون بنا دیا گیا

اس ہزار سال کے اندر' ان روایات کی رو سے' انہی روایات کی بنیادوں پر' جو فقہہ کے قوانین بنے' ان قوانین کو شریعت کے قوانین قرار دیا' وہی آپ کے ہاں کا اسلام رائج رہا۔ اس سے پہلے وہ Personal یا ذاتی یا نجی چیز تھی' فتوؤں تک تھی' مولوی صاحب فتویٰ دیتے تھے۔ اب وہ چیز قانون کی حیثیت سے آپ کے ہاں نافذ ہوگی۔

اس انقلاب میں مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ ایسا کیوں ہوا

عزیزانِ من! اس کے ساتھ ہی قرآن اس دور کی بات کر رہا ہے جس میں عجیب عجیب قسم کے انقلابات آئیں گے جو میں نے پچھلے درس میں عرض کر دیئے تھے بلکہ پچھلے دو درسوں میں عرض کیے تھے کہ ایک انقلاب آئے گا۔ اس انقلاب کے اندر جہاں قرآن نے اور چیزیں کہی ہیں' وہاں ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ o بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ [1] (81:8-9)۔ معاف رکھیے! یہ انقلاب جو قرآن نے اس آیت میں کہا ہے' ہمارے سامنے عجیب اعجاز پیش کرتا ہے۔ عام طور پر مقدموں میں' عدالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ جرم کیوں کیا تھا۔ انداز یہی ہے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ وہ دور آئے گا جس میں مظلوم عورت سے پوچھا جائے گا کہ تم پہ یہ ظلم کیوں ہوئے ہیں۔ کیا انداز ہے اس چیز کا! مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ ظالم نے وہ ظلم کیوں کیے ہیں؟ یہ تو اتنے مبرا واضح ہیں' بین ہیں کہ کیوں پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں' مگر یہاں کہا ہے کہ مظلوم سے پوچھا جائے گا۔ یہ انداز ہے: وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (81:8) اس مظلوم سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ: بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (81:9) کس جرم کی پاداش میں تمہیں ذبح کیا گیا ہے۔ عورت سے یہ پوچھا جائے گا۔ یہ دور آئے گا اور میں دیکھ رہا ہوں عزیزانِ من! کہ وہ دور اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں تو وجد میں آ جاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ عورتوں کا کمیشن بٹھایا جا رہا ہے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم خود تحقیق کر کے بتاؤ کہ تم پہ یہ کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی عورتوں کے یہ کمیشن بیٹھے ہوئے ہیں' ان سے کہا ہوا ہے کہ تم خود تحقیق کرو کہ عورتوں کے حقوق کی تلفی کیوں کی گئی ہے' ایسا کیوں ہوا ہے' عورت کا یہ مقام کیوں ہوا ہے؟ یہاں حکومتوں کی طرف سے کمیشن مقرر ہو رہے ہیں۔ وہ جو باقی کفار کی حکومتیں ہیں' انہوں نے تو اپنے ہاں یہ مسائل بہت پہلے طے کر لیے تھے۔ وہاں بھی یہی ہوا تھا' انہوں نے بھی یہ حقوق' ایسے ہی نہیں دیدیئے

---

[1] جب ان لڑکیوں کے متعلق' جنہیں معاشرہ زندہ درگور کر دیتا ہے اور ان بیچاریوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا' پوچھا جائے گا کہ انہیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جا رہا ہے؟ (یعنی جب عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے)۔

تھے۔ عورتوں نے اس کے خلاف اٹھ کر بغاوتیں کی تھیں۔ اس کے بعد یہ کچھ ہوا تھا لیکن اب جو یہ چیز ہے کہ خود ہمارے ہاں دیکھا جائے گا کہ اسلام کی رو سے کیا بنتا ہے۔ عورتوں کا کمیشن ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم خود تحقیق کرو کہ تمہارے ساتھ یہ کچھ کیوں ہوا۔ کیا ہوا' کیا کیا' کس کس انداز سے تمہاری حق تلفی کی گئی؟ وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ❶ (81:8-9) یہ قرآن ہے' عزیزانِ من! اس کا انداز ہی اپنا ہے۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ ایک طرف یہ کچھ بھی ہے مگر یہ نہیں ہے کہ انہوں نے واقعی قرآن کی رو سے یہ سمجھ لیا ہے کہ عورت اور مرد کا ایک ہی مقام ہے اور عورت کو پست نہیں رکھنا چاہیے' اس لیے کہ اس کے ساتھ ہی جو سیاست کے' معیشت کے' آئین کے' انتخابات کے' دوسرے قوانین بن رہے ہیں ان میں ہر کوشش یہی کی جارہی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں نہ آسکے۔ ان میں ایسی شرائط رکھی جارہی ہیں۔ اِدھر یہ بھی ہے۔ اُدھر جسے میں زمانے کے تقاضے کہا کرتا ہوں' وہ بھی تقاضا کررہے ہیں کہ عورت اور مرد کا ایک ہی مقام ہے۔

تقاضوں کی رو سے اسلام کا نفاذ

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے جسے فطرت کے قوانین کہا ہے' جسے تاریخ نے زمانے کے' تقاضے کہہ کر پکارا ہے' انسان زمانے کے ان تقاضوں کی رو سے ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ اسلام کی رو سے وہ ایسا کرنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور نہیں پارہے۔ اسلام کی رو سے تو وہ اب بھی عورت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کو ووٹ دینے کا حق نہیں۔ یہ کیا چیز ہے جس کی بنا پہ ایسا ہے؟ یو این او کے چارٹر کے اندر یہ حق موجود ہے۔ انہوں نے بنیادی حقوقِ انسانیت (Fundamental Human Rights) دیئے ہیں' تو انہوں نے ہیومن (Human) میں عورت اور مرد دونوں کو شمار کرلیا ہے۔ مسلمانوں کی مملکتوں نے بھی' اس چارٹر پہ دستخط کیے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو مجبور پارہے ہیں کہ اگر وہاں سوال اٹھایا گیا کہ یو این کے چارٹر میں عورتوں کو مردوں کے برابر جو حقوق دیئے گئے ہیں' کیا تمہارے ہاں ان پہ عمل ہورہا ہے یا نہیں ہورہا؟ ہاں کہنا مجبوری ہے' اس بنا پر یہ تحقیق کرنے کے لیے کمیشن ہورہے ہیں کہ عورتوں کے کون کونسے حقوق ہیں' جو تلف کیے گئے ہیں اور کس طرح کیا کیا حقوق ان کو دیئے جاسکتے ہیں: بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ❷ (81:9) اور پھر یہ چیز اس دور کی ہے کہ جب یہ بات یونہی نہیں کہ کسی گاؤں میں بات ہوئی' گاؤں تک رہ گئی' شہر کے کسی محلے میں واقعہ ہوا تو محلے تک رہ گیا' اس

---

❶ جب ان لڑکیوں کے متعلق' جنہیں معاشرہ زندہ درگور کردیتا ہے اور ان بیچاریوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا' پوچھا جائے گا کہ انہیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جارہا ہے؟ (یعنی جب عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے)۔

❷ اور انہیں کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جارہا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دَور میں کیا ہوگا: وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ❶ (81:10) جو ذرائع ابلاغ ہیں، وہ جگہ جگہ پھیل جائیں گے۔ صحف لکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ یہ چیزیں اخبارات، رسائل، مجلّات، کتابیں، نشر کی ہیں۔ اس زمانے میں اگر کہیں کوئی کتاب لکھی بھی جاتی تھی تو اس قدر عام کاغذ ہی نہیں ہوتا تھا، وہ کتاب ہرن کی کھالوں پہ، اور ایک خاص قسم کا قرطاس ہوتا تھا اس پہ بڑی محدود تعداد میں لکھی جاتی تھی، مگر آج ایسا نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں قرآن کے ایک لاکھ نسخے موجود تھے

اگرچہ قرآن کا اعجاز اس زمانے میں بھی ایسا تھا کہ کتابت کے، اشاعت کے ذرائع اتنے محدود تھے لیکن تاریخ بتارہی ہے کہ حضرتِ عمرؓ کے زمانے (24-13ھ بمطابق 645-634ء) میں قرآن کے قریب ایک لاکھ نسخے عالمِ اسلام میں موجود تھے، مسلمانوں کو قرآن کے ساتھ اتنا شغف تھا۔ بہرحال یہ کہا کہ یہ دور آئے گا کہ جس میں پھر یہ باتیں یونہی محدود طبقے میں نہیں رہیں گی بلکہ یہ ذرائع ابلاغ، صحیفے، اخبارات، مجلّات، کتابیں، نشرت، عام پھیل جائیں گی۔ اس لیے اس زمانے میں پھر جو مظلوموں کو دبانے والے ہیں، ان کے لیے یہ بھی مشکل ہوجائے گی کہ بات بڑی عام ہوجائے گی، پھیل جائے گی۔ یورپ میں کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ مسلمانوں کے ممالک میں عورتوں کی کیا کیفیت ہے، اور کچھ نہیں تو بہرحال ان ممالک کو اس کی ہی تو کچھ شرم آئے گی۔ وہ عرب تو اس زمانے میں شرم کے مارے کہتا تھا کہ زندہ رکھوں یا ماردوں۔ اب یہ تو ہے کہ یہ ممالک لکھ رہے ہیں کہ تمہارے ہاں عورتوں کا کیا حال ہے: وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (81:10) اب محدود زمین ہی کی بات نہیں ہے بلکہ اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل رہے ہیں۔

پچاس سال قبل انسانی ذہن کی پستی

عزیزانِ من! اب تو کیفیت یہ ہوگی کہ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ❷ (81:11) اس آیت میں ''کشطت'' کا لفظ آیا ہے۔ اَلْکَشْطُ ہوتا ہے نقاب کشائی کرنا، کسی پر پڑے ہوئے پردے اٹھادینا۔ آسمانی کروں پر پڑے ہوئے پردوں کو بھی اٹھایا جائے گا۔ قرآن چودہ سو سال پہلے کہہ رہا ہے۔ عزیزانِ من! سو پچاس سال پہلے بھی کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ یہ فضائی کروں پر پڑے ہوئے پردے بھی اٹھائے جاسکتے ہیں۔ کرّے ہی سمجھ میں نہیں آتے تھے کہ یہ کیا ہیں۔ ہمارے ہاں تو اب تک یہ بحث چل رہی ہے: مدینہ منورہ کے یونیورسٹی کے چانسلر کہہ رہے ہیں کہ جو یہ کہے کہ زمین گھومتی ہے، وہ مرتد ہے، اس کی سزا موت ہے۔ فضائی کروں کے متعلق یہ چیز، اس دَور کی یہ بات ہے اور کیا انداز ہے کہ ان میں کیا کیا جائے گا۔ عدمِ تحقیق کی رو سے جو ان کے اوپر پردے پڑے ہوئے

---

❶ اور اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل جائیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اور اجرام فلکی پر پڑے ہوئے پردے، ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں۔ (ان کے حالات دریافت کیے جائیں گے)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہیں' انہیں اٹھادیا جائے گا۔اس کے لیے لفظ ہے: کُشِطَتۡ۔ یہ وہی ہے جیسے ہمارے ہاں نقاب کشائی کرتے ہیں۔ کہا کہ ان پر پڑے ہوئے پردے اٹھائے جائیں گے' تو یہ بات زمین تک ہی نہیں رہے گی۔ سعدی (1291-1184ء) نے تو یہ چیز ذرا طنز میں ہی کہی تھی کہ

تو کارے زمیں را نکو ساختی
کہ بر آسماں نیز پرداختی

کیا تُو زمین کے سارے معاملے سنوار چکا ہے جو تمہیں اب آسمانوں کی سوجھ رہی ہے۔ بات ٹھیک ہے۔ ان قوموں نے بہرحال اپنے اپنے قومی دائرے کے اندر تو زمین کے معاملے سنوار ہی لیے ہوئے ہیں۔ جہاں دوسری قوموں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے وہ اسی طرح کے وحشی ہیں جس طرح کے وحشی آج سے ہزار سال پہلے کا انسان ہوتا تھا لیکن بہرحال اس کے باوجود انہوں نے آسمانی کروں پر پڑے ہوئے پردوں کو بھی اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ دَور وہ آ گیا ہے جس میں قرآن کی یہ چیز بھی سامنے آ جائے گی اور اس دور میں یہ جو چیزیں ہیں' وہ تو خارجی کائنات کی ہیں کہ عورتوں کے متعلق یہ ہوگا۔

ذرائع مواصلات کا دَور

عزیزانِ من! Communication (مواصلات) کے ذرائع اتنے عام ہو جائیں گے کہ وحشی بستیاں بھی تہذیب وتمدن کی دعویدار ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ ساری چیزیں ہونگی لیکن قرآن تو تاریخ کی کتاب یا طبیعات کی کتاب نہیں ہے کہ یہ فزکس کے متعلق یا بیالوجی وغیرہ کے متعلق یہ باتیں بتا رہا ہے' وہ تو ایک خاص مقصد کیطرف لانے کے لیے کہہ رہا ہے کہ یہ کچھ ہونے کے بعد پھر ایک نظام قائم ہوگا۔ میں اگلی دو آیتیں چھوڑ کر تیسری آیت پہ آتا ہوں۔ اس میں کہا کہ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّآ اَحۡضَرَتۡ (81:14) جس میں ہر شخص کا عمل' اس کے سامنے آ جائے گا' جو کچھ اس نے کام کیا ہے' وہ اس کام کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھ لے گا' عزیزانِ من! اب تو یہ چیز ہے کہ اگر کسی کے پاس ان کو چھپانے کی اتنی وسعت ہے تو جرائم پہ پردہ ڈال دیا جاتا ہے' سینکڑوں جرائم چھپے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اچھے کاموں کا صلہ کسی کو ملتا ہی نہیں ہے۔ ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میاں! تم نے دیانتدار بن کر کیا کمایا' ایمانداری سے تو روز تجارت میں گھاٹا ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ وہ دور آئے گا کہ جس میں ہر شخص کے کام کا نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا' کام کے نتیجے کو کوئی چھپا نہیں سکے گا' نہ ہی کوئی چیز Unrewarded (بلانتیجہ) رہ جائے گی کہ اچھے کام کا صلہ نہ ملے اور برا کام چھپا ہوا رہے۔ یہ نہیں ہوگا۔ ایسا نظام آئے گا اور اس کے لیے پھر قرآن نے ان پہلی دو آیات میں دو الفاظ کہے ہیں کہ وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ o وَ اِذَا الۡجَنَّةُ

اُزۡلِفَتۡ ❶ (81:12-13)۔ یوں سمجھیے کہ پھر یہ جحیم اور دوزخ مجرموں کے لیے بھڑ کایا جائے گا اور جو اگلی آیت ہے' اس کے لیے آ جو وقت پھر ختم ہو گیا۔ اسے ہم آئندہ درس کے لیے اٹھا رکھتے ہیں کہ اس میں بات بھی بڑی اہم کہی گئی ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ التکویر کی آیت 12 تک آ گئے۔ اس کے بعد آئندہ درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

---

❶ (اس وقت خدا کے قانونِ مکافات کا عمل بھی تیز تر ہو جائے گا کیونکہ اس وقت آخرالامر وہ نظام متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پائے گا۔ لہٰذا اس کی رو سے) مجرمین کے لیے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے۔
اور اس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لیے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا۔ (مفہوم)

تیرھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 13 تا 24)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1984ء کی 10 تاریخ ہے۔ سورۃ التکویر' 81 ویں سورۃ' ہمارے زیرِدرس ہے اور آغاز 13 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (81:13)۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ

اس سورۃ میں بالخصوص اور آخری پارے کی ان سورتوں میں بالعموم' قرآنِ حکیم کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ' اگر میں دو لفظوں میں بیان کروں تو وہ یوں ہوگا کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ** (9:33) نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے جو نظام دیا تھا' آخر کار اسے انسانوں کے تمام وضع کردہ نظاموں کے اوپر غالب آ کر رہنا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے جو قرآن نے کیا ہے۔ یہ بہت بڑا چیلنج ہے جو اس نے کیا ہے۔ یہ غالب آ کر رہنا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک' جسے ہم صدرِ اول کہتے ہیں' میں انسانوں کے جو نظام تھے' یہ ان پر غالب آیا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ اس کے بعد' جسے Cut back کہتے ہیں' اس میں پھر ملوکیت آ گئی۔ میں عرض کروں کہ اس کی تفصیل میں جانے سے تو بہت سی' سینکڑوں ہی چیزیں آئیں گی مثلاً یہ کہ اس دین کی خصوصیات کیا تھیں اور اس کے برعکس جو انسانوں کے وضع کردہ ادیان یعنی نظامہائے زندگی ہیں' انکی خصوصیات کیا ہیں اِن میں تین باتیں ایسی ہیں جن کے تابع یہ سب کچھ آ جاتا ہے: انسانوں کی حکومت خواہ وہ کسی شکل میں ہو' تھیا کریسی یعنی مذہبی پیشوائیت کا جال' اور نظامِ سرمایہ داری۔ بہر حال ملوکیت کے اس دَور میں یہ چیزیں ختم ہوئیں اور اس کی جگہ قرآن کا نظام غالب آیا۔ اس کے بعد پھر یہ دور آیا جس میں ملوکیت آئی اور اس کے ساتھ ہی یہ چیزیں بھی آ گئیں۔ وہ قرآنی انقلاب پیچھے چلا گیا۔

انقلابِ قرآنی کے دَور کا عکس

عزیزانِ من! اب اس دَور کے بعد جسے یہ ارتقائی طور پر' By Evolution کہتے ہیں' زمانے کے تقاضے کی رو سے انسان خود اپنے مختلف نظاموں کو آزماتا جائے گا' ان کی تجرباتی غلطیاں آتی جائیں گی' وہ ان اغلاط کو چھوڑتا جائے گا پھر دوسرا نظام وضع کرے گا۔ اس طریق سے پھر یہی نظام جو قرآن نے بتایا ہے' غالب آ کر رہے گا۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ اب یہ جو آخری پارے کی سورتیں ہیں اِن

میں کچھ اشارات دیئے ہیں' کچھ علامات دی ہیں کہ آخری دَور میں کیا کیا شکلیں پیدا ہونگی اوراس کے بعد نظر آتا ہے کہ قرآن کا وہ نظام جو ارتقائی طور پہ آنا تھا وہ نظام پھر Establish (قائم) ہوگا۔ یہ ہے جو' ان آخری پارے کی سورتوں میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا ان سورتوں کے اندر جو نقطہ ماسکہ ہے وہ یہ ہے۔ علامات جو اسی سورۃ التکویر میں بتائی گئیں ان میں تو یہ کہا گیا۔ وہ تو اسی زمانے کی بات تھی کہ ایران کی سلطنت ختم ہوجائے گی' عرب جاہلیت کا اقتدار ختم ہوجائے گا' سرحدوں کے اوپر جو چھوٹی چھوٹی سی ریاستیں تھیں وہ مٹ جائیں گی۔ اس کے بعد کہا کہ پھر وہ دور جسے قرآن حکیم آخری دور کہہ رہا ہے اس میں یہ چیزیں بتائی گئیں کہ یہ جو دنیا کی غیر مہذب آبادیاں ہیں' وہ بھی آپس میں ملکر اپنا ایک نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گی' مواصلات کے ذرائع زیادہ سے زیادہ عام ہوجائیں گے' اخبارات وغیرہ عالمگیر حیثیت اختیار کرلیں گے' فضائی کُرّوں پہ پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے۔ قرآن یہ ساری چیزیں بتاتا چلا گیا ہے۔

قرآن حکیم کے دور میں ظہور پذیر ہونے والے دو اہم معاشرتی پہلو

عزیزانِ من! اس کے بعد وہ بات آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ان سب کے بعد وہ نظامِ عدل آئے گا جس میں ہر فرد کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوگا اور وہ سامنے آجائے گا۔ یہ ہے نظامِ عدل جو قرآن بتارہا ہے۔ اس میں جو دو چیزیں کہی گئی ہیں وہ میں پھر عرض کرونگا۔ نظامِ عدل میں یہ چیز ہے کہ کوئی مجرم اپنے جرم کی سزا سے نہ بچے اور اچھے کام کرنے کے نتائج سامنے آجائیں۔ اس کے لیے بھی اس نے یہ کہا کہ وہ نظام قائم ہوگا۔ میں نے جس مقصد کے لیے یہ کچھ دہرایا ہے اس میں ایک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ یہ جو قرآن نے اس آخری دور کی علامات بتائی ہیں' اس میں یہ سب کچھ ہوگا اور جتنی علامات میں نے ابھی عرض کی ہیں وہ تو ہمارے سامنے قدم بقدم آرہی ہیں' آچکی ہیں اور آتی جارہی ہیں' لیکن علاوہ ازیں ان میں ایک چیز تو بڑی اہم ہے اور وہ یہی ہے کہ **وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ o بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ o** (81:8-9) اس دَور میں عورت کہ جسے مردوں نے زندہ درگور کررکھا ہے اس کو حیاتِ نو عطا ہوگی اور پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ تم ان کے خلاف فردِ جرم عائد کرو جنہوں نے تمہارے ساتھ یہ کچھ کیا تھا۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے۔ اس نظام کے دوبارہ قائم ہونے کے لیے جو شکلیں واضح کی ہیں' ان میں قرآن کے نزدیک یہ چیز بڑی اہم ہے اور تاریخ انسانیت میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ہمسفر کے پاؤں میں زنجیریں پہنانے کا نتیجہ

عزیزانِ من! جو راہ رو' جو سفر کرنے والا' اپنے ہمسفر کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دے گا' وہ خود بھی اپنی پوری رفتار سے نہیں چل سکتا' اس کی اپنی رفتار بھی بغیر زنجیروں کے آدھی رہ جاتی ہے۔ جو کچھ انسان نے بہ ہئیت مجموعی عورت کے ساتھ کیا اور پھر ہم مسلمانوں نے جو کچھ عورت کے ساتھ کیا' اس کے پاؤں میں زنجیریں ہم نے پہنائیں لیکن اس سے ہماری رفتار بھی تو وہ نہ رہی جو ہمیں چاہیے تھی۔ ہم دنیا میں' اقوامِ عالم کی صفوں سے بھی پیچھے رہ گئے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ دَور آئے گا کہ جب یہ جنہیں زندہ دفن کردیا گیا' ایک مقدمہ جیسے

ہوتا ہے' وہ کھڑا ہوگا' ایک انکوائری ہوگی' ایک کمیشن بیٹھے گا' یہ چیز ہوگی اور پھر عورت سے یہ پوچھا جائے گا کہ بتاؤ' اس مرد نے تمہارے ساتھ کیا کیا کیا تھا۔ یہ اسی لیے ہوگا کہ پھر انصاف کیا جائے اور عورت کو صحیح مقامِ انسانیت دلایا جائے۔ قرآنِ حکیم نے اپنے دَور کی یہ شرط قرار دی ہے اور اس لیے قرار دی ہے کہ قرآن کریم کو ذکر للعالمین کہا ہے' یہ تو نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ حیات ہے۔ انسانوں کے اندر تو عورتوں کی یہ آدھی آبادی موجود ہے۔ انسانوں کی اس آدھی آبادی کو اگر آپ معذور اور مفلوج رکھیں گے تو پھر یہ نظامِ عالم قائم نہیں ہو سکے گا۔

عورت کے ہاتھوں آنے والا ایک انقلابِ عظیم

قرآنِ حکیم تو عالمگیر نظام قائم کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کتنی عظیم چیز کہہ گیا ہے کہ اس نظام کے عالمگیر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہوں۔ اس لیے جتنی بھی علامات بتائی ہیں' ان میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ یہ زندہ درگور کی ہوئی عورت اُٹھ کھڑی ہوگی جب کہ اس سے پہلے تو اسے یہ مجال ہی نہیں تھی کہ وہ زبان سے ایک لفظ بھی ادا کر سکتی لیکن وہ دَور آئے گا کہ جب خود اس سے کہا جائے گا کہ تم مرد کے خلاف فردِ جرم مرتب کرو کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا اور پھر وہ نظامِ عدل کا دَور آئے گا' جو للعالمین کی سطح کا ہے' پوری انسانیت کے لیے ہے۔ یہ ہے نقطۂ ماسکہ جو میں نے عرض کیا ہے۔ یہ جو آخری دو پاروں کی سورتیں ہیں ان کی آیات میں بتایا ہی یہ ہے۔ قرآنِ کریم انسانوں کے وضع کردہ نظام کے تابع معاشرے کی جو شکل ہوتی ہے اسے جہنم سے تعبیر کرتا ہے' اور وہ جو صحیح نظام کے تابع' انسانیت جس خوشگوار ماحول میں رہتی ہے' اسے جنت کہہ کر پکارتا ہے۔ اسے پھر دہرادوں اور اسے میں اکثر دہرایا کرتا ہوں کہ آخرت کا جنت اور جہنم اپنے مقام پہ ہے' اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن نے اسے وہیں تک محدود نہیں رکھا' اس دنیا کا جہنم بھی تو اس نے بتا رکھا ہے' وہ تو ہمیں پتہ ہی ہے لیکن اس نے اس دنیا میں جنتی زندگی کا بھی تو نظارہ پیش کیا ہے اور یہ ہے کہ وہ جس کے لیے اس نے کہا ہے کہ جب یہ نظامِ عدل قائم ہوگا تو پھر وہ جنت کی زندگی حاصل ہوگی۔

قرآنی نظام کے قیام کا ماحصل جنتی زندگی کا حصول ہے

عزیزانِ من! اس جنتی زندگی کے متعلق ہی تو کہا ہے کہ وَ اِذَا الۡجَنَّةُ اُزۡلِفَتۡ ❶ (81:13)۔ یہ وہ خاص نکتہ ہے جسے میں نے اس دوسرے درس میں دہرایا ہے۔ جہنم کے متعلق تو کئی درسوں میں آ چکا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہ جہنم تو آج بھی تمہیں محیط ہے' تمہیں گھیرے ہوئے ہے' وہ تمہیں دیکھ رہی ہے' تم اسے نہیں دیکھ رہے۔ جب تمہاری بصیرت کی آنکھیں کھلیں گی تو جہنم نمودار ہو کر تمہارے

---

❶ اور اس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لیے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سامنے آ جائے گا اور تم اسے دیکھ لو گے کہ یہ ہے وہ جہنم۔ جہنم کے متعلق یہ کچھ کہا گیا تھا۔ یہاں جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ جنت کو تمہارے قریب لایا جائے گا۔ کیا بات ہے! اگر وہ آخرت کی جہنم ہے جو مرنے کے بعد ہی آنی ہے تو وہ وہاں کا معاملہ ہے۔ یہاں تو اس کو قریب لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ اسے قریب لایا جائے گا۔ تو یہ معنی ہیں کہ وہ جنت یہاں کہیں ہے' پھر یہ بڑی عظیم چیز ہے کہ ہم وہاں نہیں جائیں گے' ہم جہاں بھی ہونگے' اگر ہم نے یہ نظام قرآن قائم کرلیا تو جنت ہمارے پاس خود آ جائے گی۔ دو ایک اور مقامات پر بھی جنت کے قریب لانے کے متعلق یہی الفاظ آئے ہیں۔ جنت کی وسعت کے متعلق تو قرآن نے کہا ہے کہ وہ ارض و سما میں پھیلی ہوئی ہوگی' یعنی کوئی خاص مقام نہیں ہے' جس کا نام جنت ہے' وہ تو معاشرے کی ایک کیفیت ہے جس کا نام جنت ہے اور وہ پھیلی ہوئی ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی یہ قرآنی معاشرہ قائم ہوا وہیں وہ جنت کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اس کے لیے یہ کہنا کہ وہ جنت تمہارے قریب لائی جائے گی' بات کہنے کا کتنا حسین انداز ہے! اور ایک جگہ تو قرآن کریم میں ایسی چیز آئی ہے جو بڑی غور طلب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ درس اس کا مقام بھی نہیں ہے' وہ تو نصاب کی چیز ہے' بڑی اہم آیت ہے۔ یہ جو قرآن حکیم کا نظام ہے جب وہ یہاں قائم ہوگا تو اس میں یہ ہے کہ وَ جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا [1] (89:22) خود رب اور اس کے فرشتے تمہارے پاس آئیں گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میں صرف آیت ہی پیش کر رہا ہوں' اس کی باریکیوں میں جانے کے لیے تو درس کا مقام مشکل ہوتا ہے کیونکہ

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات کے دوران قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک گفتگو

عزیزانِ من! علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) سے جب میری آخری ملاقات ہوئی تھی تو اس میں جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا پر ایک گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے ان سے یہ عرض کیا تھا کہ آپ نے ''جاوید نامہ'' میں جو آسمانوں کی باتیں بتائی ہیں' میں ایسا دیکھ رہا ہوں کہ قرآن تو اِسی زمین پر یہ ایک ڈرامہ بتا رہا ہے۔ یہ جَآءَ رَبُّكَ (89:22) ہے تو آپ تڑپ اٹھے تھے۔ پھر ان کا تو انداز ہی یہ ہوتا تھا۔ جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا [1] (89:22) تو یہ وہ نظام ربوبیت ہے' جس میں آسمانی اقدار یعنی وحی کی اقدار اور فطرت کی قوتوں (Natural Forces) ' جنہیں قرآن ملائکہ کہتا ہے' کا امتزاج ہوگا۔ یہ الگ الگ رہتی ہیں تو جہنم ہی پیدا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کہا ہے کہ تیرے خدا کا نظام ربوبیت' کائناتی قوتوں کو' صف درصف اپنے جلو میں لیے زمین پر متمکن ہو جائے گا۔

---

[1] اور تیرے خدا کا نظامِ ربوبیت' کائناتی قوتوں کو' صف درصف' اپنے جلو میں لیے زمین پر متمکن ہو جائے گا۔ (یعنی اس نظام میں فطرت کی قوتوں کا ماحصل' کسی خاص گروہ یا خاص قوم کی قوت اور دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے' عالمگیر انسانیت کی نشو و نما کے لیے وقف ہوگا)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

وحی کے دیئے گئے کائناتی تصور کو اپنائے بغیر مشرق و مغرب کی حالتِ زار

عزیزانِ من! اگر فطرت کی قوتوں کو محفوظ اور مسخر نہ کیا جائے اور انہیں اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو پھر ایک ایسا جہنم پیدا ہوتا ہے جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے۔ اگر فطرت کی یہ قوتیں ساتھ نہ ہوں اور بزعمِ خویش سمجھا جائے کہ ہم خدا کی راہنمائی پر عمل کررہے ہیں تو یہ وہ تصوف یا مذہب ہوگا جو انسان کو بالکل ناکارہ کردیتا ہے۔ وہ نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا رہتا ہے۔ یہ وہی ہے جس میں اِدھر ہم گرفتار ہیں اور اُدھر وہ گرفتار ہیں جنہوں نے فطرت کی قوتوں کو بیباک چھوڑ رکھا ہے۔ ہم عذاب میں گرفتار ہیں کہ ہم نے فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کیا۔ ہم ان کے تابع ہوگئے ہیں' ان کے پرستار ہوگئے ہیں۔ ہم بت پرست ہیں۔ وہ جنہیں ہم بت پرست کہتے ہیں وہ بھی تو یہی کہتے ہیں: بادل کو ''اندر'' دیوتا کہا اور جھک گئے' آگ کو ''اگنی'' دیوی کہا اور جھک گئے۔ ہم بھی تو فطرت کی قوتوں کے سامنے جھکے ہوئے ہیں' ہم نے انہیں تو مسخر نہیں کیا۔

اقدارِ خداوندی اور فطرت کی قوتوں کو یکجا کرنے کا نام ہی مملکتِ اسلامیہ ہے

عزیزانِ من! جب اقدارِ خداوندی اور فطرت کی قوتیں' اکٹھی ہونگی تو یہ وہ نظام ہوگا' جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (81:13) ایسی صورت جب پیدا ہوگی کہ رب اور ملائکہ صفاً صفاً آئیں گے تو پھر وہ نظامِ عدل قائم ہوگا جس میں جنت کو کھینچ کر تمہارے پاس لایا جائے گا' کتنا بڑا مقام ہے مومن کا کہ یہ جنت کیطرف نہیں جارہا' جنت اس کی طرف خود آرہی ہے۔ ایک غزل کا شعر ہے' یہ غالباً اصغر [1] کا ہے' بہرحال اس میں ایک لفظ کا مغالطہ ہے

مجھ کو وہی کافی ہے ساقی تری مینا سے
جو کھنچ کے چلی آئے خود جذبِ تمنا سے

یہ ہے وہ انداز: جو کھنچ کے چلی آئے خود جذبِ تمنا سے۔ یہ جنت کا کچھ ایسا انداز ہے' ''ازلفت'' جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ تو تمہارے جذبِ تمنا سے خود تمہاری طرف کھنچ کے چلی آئے گی۔ یہ کیفیت پیدا ہوگی اور اس میں پھر قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ اس میں عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ [2] (81:14) ہر فرد نے جو کیا ہوگا وہ اسے اپنے سامنے حاضر پائے گا۔ یہ ہے نظامِ عدل۔ اس میں جو کچھ کیا ہوگا' اس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اور تو اور دل میں گزرنے والے جو خیالات ہیں' وہ بھی محسوس شکل میں نتیجہ خیز ہونگے'

---

[1] اصغر حسین (1884-1936) تخلص اصغر' گونڈہ میں طویل قیام کی وجہ سے گونڈوی مشہور ہوئے۔
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

[2] اُس وقت ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بےنقاب دیکھ لے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ان کا ارتکاب تو ایک طرف رہا' دل میں گزرنے والے جو خیالات ہیں وہ بھی نتیجہ خیز ہوں گے کیونکہ حقیقت میں انسانی عمل کی بنیاد تو وہی ہوتی ہے۔ یہ ہوگا وہ نظام جس میں جنت خود مومن کی طرف کھچ کے چلی آئے گی۔

قرآن حکیم کا اپنے دعاوی کی صداقت کے لیے منفرد انداز بیاں

عزیزانِ من! اب قرآن کی اگلی بات آئی۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ کچھ دعاوی پیش کرتا ہے اور پھر اپنے ان دعاوی کے سچا ہونے کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے کہ تاریخ میں دیکھیے کہ فلاں قوم نے ان کے مطابق زندگی بسر کی تو اس کا نتیجہ کتنا خوشگوار اور جنتی نکلا' ان کی خلاف ورزی کی تو وہ قوم کس قسم کی تباہیوں کے جہنم میں مبتلا ہوگئی۔ اس کا یہ انداز آپ تیس پاروں میں دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ یہ سارا انداز یہی ہے: تاریخی شواہد اور اس کے ساتھ یہ کہ جب ہمارا قانون نافذ ہوگا تو یہ ایسے نتائج پیدا کرے گا' جیسے خارجی کائنات میں ہمارا قانون پیدا کر رہا ہے اور اس حسن و خوبی سے خارجی کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ یہ نظامِ کائنات قوانین کے ذریعے چل رہا ہے' وہاں الل ٹپ نہیں ہے۔ ہر بات' یہاں تک کہ چھوٹی سے چھوٹی بات کے لیے بھی' ایک قانون ہے۔ جسے آپ تسخیرِ فطرت کہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ اگر اس قانون کا علم حاصل کر لیا جائے تو اس کی قوت مسخر ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کا دوسرا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں فطرت کے قوانین کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ وہ قوانین کیا ہیں۔ [1]

اب یہاں اس نے بات جو کہی ہے' یا کہنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو صدرِ اول کے نورانی نظام کے بعد' یہ دنیا پھر ظلمت کدہ بن گئی' تاریکیوں میں گر گئی' اور باطل نظام چھا گیا' تو آپ یہ دیکھیں گے کہ پھر آہستہ آہستہ' رفتہ رفتہ' یہ تاریکی چھٹتی چلی جائے گی اور آخرالامر پھر یہاں نمودِ سحر ہوگی جس میں تابانیاں ہونگی' روشنی ہوگی' نورانیت ہوگی۔ قرآنِ کریم دونوں نظاموں کی تشبیہ دیتا ہے۔ باطل کے نظام کو وہ ظلمات کہہ کر پکارتا ہے' اسے تاریکیاں کہتا ہے اور جو حق کا نظام ہے' اسے وہ نور یا روشنی کہہ کر پکارتا ہے۔ تو اب قرآن کہتا یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ دن کی تابانیاں ہوتی ہیں اور پھر غروبِ شمس کے بعد تاریکی چھا جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تاریکی ابدی نہیں ہوتی۔ پہلے آہستہ آہستہ وہ تاریکی بڑھتی ہے' پھر اس کے بعد گھٹتی چلی جاتی ہے اور جب سحر قریب آتی ہے تو پھر روشنی کی نمود ہو جاتی ہے۔ یہ کہا کہ ہمارے ہاں فطرت کے یہ قانون ہیں۔ اب یہاں تک پہنچنے کے بعد جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' قرآن نے کہا یہ ہے کہ یہ کچھ ہوگا۔ یعنی پہلے اس دَور کے اندر یہ نظام قائم ہوا' تو اسے نورانیت کہا گیا' پھر باطل کے نظام آئے تو کائنات کے اوپر تاریکی آگئی۔ آہستہ آہستہ پھر وہ تاریکیاں چھٹ جائیں گی تو نورانیت آجائے گی۔ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے کہی ہے۔

---

[1] قوانینِ فطرت کی مزید تشریح و تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005ء ص 315 (فٹ نوٹ نمبر 1)۔

قرآنِ حکیم میں شاعری جیسی لطافت اور فلسفے جیسے حقائق یکجا نظر آتے ہیں

عزیزانِ من! یہاں تک پہنچنے کے بعد اب قرآنِ کریم کا انداز وہی ہے۔ اس کا یہ انداز بڑا وجد آور ہے۔ عربوں کے ادیب تو ایک طرف رہے، یہ جو اربابِ ادب، اربابِ شعر اور ذوق لطیف والے ہیں، وہ جب قرآن کی ان آیات پہ پہنچتے ہیں تو انہیں واقعی وجد آجاتا ہے کہ اس کا اسلوبِ بیان کیا ہے اور اس کے اندر کتنے حقائق ہیں۔ یادرکھیے جو شاعری ہوتی ہے، اس میں صرف لطائف ہوتے ہیں حقائق نہیں ہوتے اور جب عام طور پہ حقائق بیان کیے جاتے ہیں تو وہ فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ بڑا خشک ہوتا ہے۔ یہ جو قرآن کی بات ہے کہ وہ شاعری جیسی لطافت پیدا کرتی ہے، فلسفے جیسے حقائق بیان کر رہی ہے تو محترم! یہ ہے اس کا وہ بے مثل ہونا، جس کی آج تک کوئی شخص نقل نہیں کر سکا۔ یا وہ فلسفہ ہوگا یا وہ شاعری ہوگی۔ قرآن دونوں چیزیں اکٹھی کر رہا ہے۔ بات یہ کہہ رہا ہے کہ اس دَور کے بعد پھر تاریکی آئی اور وہ تاریکی یہ ہے۔ وہ چھٹتی جائے گی، پھر نورِ سحر ہوگا۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ یہ جو ہم نے فَــلَا (81:15) کہا ہے (اگر آپ کے پاس نسخے ہیں تو دیکھیے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے) کہ بات یوں نہیں جو تم اپنے ذہن میں دبائے بیٹھے ہو۔ یہ بات نہیں ہے: قرآن کہتا ہے کہ **فَلَا اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ o الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ o وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ o وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ** [1] (81:15-18) کیا بات ہے! بغیر سمجھے صوتی اعتبار سے بھی آپ دیکھیے کہ کس قسم کی ''شاعری'' آرہی ہے۔

صاحب علم کے لیے ستاروں کی گزرگاہیں بطور شہادت ہیں

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ پہلے یہ چیز سورۃ والنجم میں آچکی ہے۔ وہاں کہا تھا کہ **وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰی** [2] (53:1) پھر نجوم

---

[1] (ہم یہ باتیں یونہی نہیں کر رہے۔ اس حقیقت پر سارا نظامِ کائنات شاہد ہے) اس پر شاہد ہیں وہ ستارے جو طلوع ہونے کے بعد، دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔ اور تیز خرام ستارے جو اپنی منزل طے کر کے چھپ جاتے ہیں۔ (53:10:50-75) اور رات، جو خاموشی سے آتی اور خاموشی سے چلی جاتی ہے اور صبح، جب وہ نئی زندگی کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔

[2] (اِن لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وحی کی کی جس راہ نمائی کی طرف انہیں دعوت دی جا رہی ہے، وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؟ وہ سفر زندگی میں کہیں دھوکا تو نہیں دے جائی گی؟ وہ غلط راستے پر تو نہیں ڈال دے گی؟ وہ کسی مقام پر جا کر ساتھ تو نہیں چھوڑ دے گی؟ ان سے کہو کہ تم جب راتوں کو صحرا میں سفر کرتے ہو، جہاں کوئی پختہ راستے یا نشاناتِ راہ نہیں ہوتے، تو تم اپنی راہ نمائی کہاں سے حاصل کرتے ہو؟ تم ستاروں کو دیکھ کر اپنا رخ متعین کرتے ہو۔ تم بتاؤ کہ اِن کی راہ نمائی کے متعلق تمہارا تجربہ کیا ہے؟ کیا ان کی راہ نمائی قابلِ اعتماد ہے یا یہ اپنی روش بدل کر دھوکا بھی دیتے ہیں؟ کیا یہ مستقلاً تمہاری راہبری کرتے ہیں یا کبھی ساتھ بھی چھوڑ دیتے ہیں؟ تمہارا جو جواب ستاروں کے متعلق ہے وہی جواب وحی کی راہ نمائی کے متعلق سمجھ لو، اس لیے کہ رسول کو وحی بھی وہیں سے ملتی ہیں جہاں سے ستاروں کو اپنی محکم روش پر چلے جانے کی وحی ملتی ہے۔ (6:98; 56:57) لہٰذا) ستارہ جو ایک خاص مقام سے طلوع ہو کر، اور خاص راستہ طے کر کے، ایک خاص مقام پر غروب ہو جاتا ہے (اور ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے متعلق قرآن میں یہ کچھ بتایا گیا ہے' وہ سورۃ واقعہ 56 ویں سورۃ کی آیات 76-75 میں ہے۔ میں ان آیات کو بھی پڑھونگا: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ o وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ❶ (56:75-76) کیا بات ہے! کہا کہ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ستاروں کی گزرگاہوں کو۔ اگر تم غور کروگے تو دیکھوگے کہ یہ شہادت کتنی عظیم ہے۔ کس بات کے لیے بطور شہادت اسے پیش کرتا ہوں؟ اس کے لیے کہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ o فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (56:77-78) یہ قرآن بہت باعزت اور کتابِ مکنون ❷ ہے۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ o تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ❸ (56:79-80) یعنی اس کے لیے مواقع النجوم ❹ (56:75) کو شہادت میں پیش کیا جارہا ہے۔ جب یہ آیات درس میں آئی تھیں تو میں نے تشبیہاً بڑی تفصیل سے عرض کیا تھا۔ وہ مواقع النجوم کو شہادت میں پیش کررہا ہے۔ اس کے لیے تو میں نے کہا تھا کہ کسی ماہر فلکیات سے پوچھیے' جو علم الافلاک کے ماہر ہیں' ان سے پوچھیے کہ قرآن حکیم کیا کہہ گیا ہے۔ میں نے گزارش کیا تھا کہ وہ لوگ جب قرآن کی ان آیات کو دیکھتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ چودہ سو سال پیشتر ایک شخص' عرب کی سرزمین میں' جہاں علم پہنچا ہی نہیں تھا' وہ وہاں جو کچھ کہہ رہا ہے اُسے آج بھی ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکی۔ ہم یہ چیزیں صرف دوربین سے ہی کچھ دیکھ سکے ہیں اور وہ شخص ہے کہ جس کے پاس عینک تک نہیں ہے وہ چودہ سو سال پیشتر یہ حقائق بیان کررہا ہے۔ یہ وہ لوگ بیان کرتے ہیں ہم کیا جانیں۔

ستاروں کی دو مختلف اقسام

عزیزانِ من! قرآن کیا کہتا تھا؟ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ❺ (81:15)۔ اب قرآن دو قسم کے ستاروں کی بات کرتا ہے کہ وہ اس پر شاہد ہیں۔ ایک تو وہ ستارے ہیں جو نمودار ہوتے ہیں' ذرا آگے بڑھتے ہیں اور اس کے بعد پیچھے ہٹ کر پھر اپنے مقام پہ

---

❶ (قرآن اُس نظامِ ربوبیت کا ضابطہ ہے جس میں زندگی کے محکم اور غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں۔) اس دعوے کے ثبوت میں' ہم ستاروں کے طلوع وغروب کے مقامات کو' بطور شہادت پیش کرتے ہیں: (20-81:15 ;5-53:1)......اور اگر تمہیں رموز و اسرار کائنات کا علم ہو' تو تمہیں معلوم ہوجائے کہ یہ شہادت کس قدر عظیم ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ قرآن بطور ضابطہ حیات' زندگی کی خوش حالیوں اور فراوانیوں کا کس قدر عمدہ محکم کفیل ہے۔ (ایضاً)

❸ قرآنِ کریم کے حقائق سے وہی لوگ صحیح معنوں میں مطلع ہوسکتے ہیں جنہیں قلب و دماغ کی پاکیزگی نصیب ہو۔ (اس سے بہرہ یاب ہونے کے لیے تطہیر فکرونظر ضروری ہے۔ یعنی اگر انسان پہلے سے کچھ خیالات ذہن میں رکھ کر یا جذبات سے مغلوب ہوکر قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ اس سے مستفیض نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالی الذہن ہوکر اور جذبات سے الگ ہٹ کر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے)۔ یہ اس خدا کی طرف سے' بتدریج نازل ہوا ہے جو تمام نوعِ انسان کا نشوونما دینے والا ہے۔ (اس لیے اس کا مقصود بھی نوعِ انسان کی نشوونما ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❹ ستاروں کے طلوع وغروب کے مقامات (ایضاً)

❺ اس پر شاہد ہیں وہ ستارے جو طلوع ہونے کے بعد' دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔ (ایضاً)

غروب ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے سے وقت کی روشنی دی' پھر پیچھے ہٹ گئے' اس کے اندر رجعت آ گئی اور پھر وہ چھپ گئے۔ **اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ** (81:16) وہ ستارے بھی جو نمودار ہوتے ہیں' لپکتے ہیں' ہرنوں کی طرح چوکارتے ہیں اور اس کے بعد' وہ ہرن کی طرح جا کر جھاڑیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ اس کو کنس کہتے ہیں کہ پھر وہ ہرنوں کی طرح چکارتے ہوئے' جھاڑیوں میں' چھپنے کی جگہ' جا چھپتے ہیں۔ یہ پہلی قسم کے وہ ستارے ہیں جو پیچھے لوٹنے والے ہیں یہ دوسری قسم کے وہ ستارے ہیں جو آگے بڑھ کر چھپنے والے ہیں۔ یہ ستارے اس حقیقت پہ شاہد ہیں' میں پیش کرتا ہوں شہادت میں ان ستاروں کو۔ کس بات کی شہادت؟ وہ بات آگے آتی ہے۔ اور اگلی بات ہے کہ شہادت میں پیش کرتا ہوں **وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ** (81:17) رات کو کہ جس کی تاریکیاں دبے پاؤں آہستہ آہستہ آتی ہیں۔

الفاظ کے انتخاب میں قرآنِ حکیم کا اعجاز

عزیزانِ من! الفاظ کے انتخاب میں قرآنِ کریم کا اعجاز دیکھیے۔ وہ یہاں **عَسْعَسَ** کا لفظ لاتا ہے۔ اس لفظ کے خود صوتی اعتبار سے بھی نظر آتا ہے کہ یہ سہکتا ہوا چلا آ رہا ہے' بات زور سے نہیں ہو رہی۔ یہ دبے پاؤں چلا آ رہا ہے۔ عربوں کی زبان میں بھی یہ بات تھی کہ وہ لفظ کی صوتی اعتبار سے بھی معنوی خوبی بیان کر جاتے تھے کہ جب وہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ آتی ہے' بڑھتی نہیں' چلی جاتی ہے۔ عربی زبان میں ایک لفظ ہے **عَسْعَسَ** جس میں دونوں باتیں ہوتی ہیں' خاموشی سے' دبے پاؤں بڑھتی ہے اور اس کے بعد ایک وقت پہ پہنچ کر اسی طرح خاموشی سے دبے پاؤں پیچھے ہٹ جاتی ہے' بڑھتی چلی جاتی ہے' تو ہٹتی چلی جاتی ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ **وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ** (81:18) اور پھر صبح ایک حیاتِ تازہ کا پیام لے کر آ جاتی ہے۔ یہاں اس کے لیے قرآنِ کریم نے **تَنَفَّسَ** کا لفظ منتخب کیا ہے۔ عزیزانِ من! میں ابھی وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو قرآن کی اس لطافت کو اور اس کی اس عظمت کو بیان کر سکیں: ستاروں کا پہلے نمودار ہونا' چھپ جانا' رات کا تاریکیوں کی چادر کو لے کر دبے پاؤں آنا' آتے ہی نہیں چلے جانا' پھر اس کے بعد پیچھے لوٹنا' پیچھے لوٹنے کے بعد ایک نقطہ وہ آ جانا کہ جہاں کہا کہ **وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ** [1] (81:18) کیا بات ہے تنفس کی! حیاتِ تازہ کا نیا پیام لے کر پھر صبح آ جاتی ہے۔

فکرِ قرآنی' انسان کو مایوس ہی نہیں ہونے دیتی

عزیزانِ من! یہ تشبیہات اتنی خوبصورت اور استعارات اتنے لطیف تھے کہ ہمارے ہاں کے شاعروں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ جو رات کی تاریکیاں اور اس کے بعد صبح کی تابانیاں ہیں' ہمارے ہاں اس کے متعلق بہت کچھ ہے' یعنی یہ بات کہ قرآن کسی حالت میں بھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔ قرآن کی تو ساری بات ہی یہ ہے کہ انتہائی مایوسیوں میں بھی وہ امید کی ایک کرن کو روشن کرتا ہے کہ یہ دَور آنا ہے یہ آ کر رہنا ہے۔ عاصی کا ایک مصرعہ ہے:

---

[1] اور صبح' جب وہ نئی زندگی کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

غروبِ شمس نویدِ طلوعِ صبح دگر

یہ بڑا اچھا مصرعہ ہے کہ سورج کے غروب ہونے

پر مایوس نہ ہو، یہ تو ایک نئی صبح کے طلوع کا پیام دیتا ہے۔ یہ خوبصورت چیزیں ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ

مری شبِ غم گزر رہی ہے یقینِ محکم کے ساتھ قابل

وہیں طلوعِ سحر بھی ہوگی جہاں ستاروں نے ساتھ چھوڑا

یہ بات وہی ہے جو قرآن نے یہاں کی ہے۔ قرآن جس انداز سے کہتا ہے وہاں ہم کیا سوچیں، البتہ علامہ اقبالؒ (1877-1938) کو فطرت نے یہ چیز عطا کی تھی کہ وہ اقتباسِ نورِ قرآنی سے اپنے ہاں یہ لطافتیں پیدا کرتا تھا۔ ان کی وہ مشہور نظم ہے۔ اس نظم کے آخر میں انہوں نے یہ کہا ہے:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

آپ دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن کی آیت کے ساتھ ساتھ کیسے چل رہا ہے: اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی۔ اس کے بعد ہے کہ

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار

نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہوجائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے

یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

اقبالؒ: بانگ درا (شمع اور شاعر)

یہی ہے جو قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ ہوگا۔ شب کی ظلمات اور تاریکیاں، جیسے آئی ہیں، اسی طرح واپس جائیں گی اور اس کے بعد **وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ** (81:18) پھر ایک تازہ صبح، حیاتِ نو کا پیام لے کر نمود ہوگی۔ تنفس تو سانس لینے کو کہتے ہیں۔ صبح کے لیے سانس لینے کی بات کی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ چیزیں صرف محسوس ہی کی جاسکتی ہیں۔ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی۔ یہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتیں، خدا قرآن میں کہہ رہا ہے، فطرت کے ان مظاہر کو، ان قوانین کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ کہ **اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ** [1] (81:19-21)

---

[1] یہ سب مظاہر فطرت اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جو شخص یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے، اور نہایت معزز پیغامبر۔ اسے اُس خدا کی طرف وحی کی تائید و قوت حاصل ہے جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ (یعنی جس طرح وہ قوانین جو خارجی کائنات میں کار فرما ہیں، اشیائے کائنات کے خود ساختہ نہیں، خدا کے وضع کردہ ہیں، اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق جو قوانین یہ رسول پیش کر رہا ہے، [باقی اگلے صفحے پر]

نبی اکرم ﷺ کے لیے رسول کے الفاظ کی حقیقت

عزیزانِ من! یہاں یہ کہا گیا ہے کہ ہمارا رسول فطرت کے مظاہر اور قوانین کے متعلق جو کچھ کہہ رہا ہے وہ خود رسول اللہ ﷺ کے اپنے الفاظ نہیں ہوتے۔ اسے جو پیغام دیا گیا وہ اسے من وعن دہرا دیتا ہے۔ یہ بڑے ہی عالی انداز میں بات کہی ہے۔ وحی کے الفاظ تو نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ہی باہر آتے تھے، وہیں سے سنائی دیتے تھے، وہیں سے لکھے جاتے تھے، انہی کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اب یہ چیز ہے کہ وہ الفاظ خود رسول اللہ ﷺ کے اپنے نہیں ہوتے تھے۔ وہ خدا کا پیغام ہوتا تھا، ایک لفظ ''رسول'' نے اس بات کی ساری حقیقت واضح کر دی کہ یہ رسول ﷺ صرف پیغامبر ہے اور جب پیغامبر کو امین کہا ہے تو امین پیغامبر یا قاصد تو وہی Massenger (قاصد) ہوتا ہے جو اپنی طرف سے ایک لفظ نہ کہے، جو پیغام دیا گیا ہے اسی طرح من وعن دہرا دے، اسی کو پہنچا دے۔ دہرا کر بھی کیا دینا ہے وہ تو چٹھی لے کر آتا ہے، یعنی لفظِ رسول نے یہاں یہ واضح کر دیا کہ یہ قولِ رسول اگرچہ حلقِ ابن عبداللہ سے برآمد ہوا ہے لیکن نبی اکرم ﷺ کی فکر کا تخلیق کردہ نہیں ہے۔ ان کا پیغام ان کے اقوال نہیں ہیں، ان کی تخلیق نہیں ہے، وہ تو صرف پیغامبر ہیں۔ اب ایک لفظ نے دونوں چیزوں کو واضح کر دیا کہ یہ وحی، خدا کے اقوال ہیں، اور ارشادِ خداوندی ہیں جو یہ پیش کرتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک رسول یا قاصد یا پیغامبر کی ہے۔ یہ امین ہے۔ اپنی طرف سے اس میں کچھ نہیں ملا سکتا۔ یہاں یہ دونوں چیزیں واضح کر کے رکھ دیں کہ جو رسول ہے، وہ کریم ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں لفظِ رسول نے واضح کر دیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے اپنے افکار یا اپنی تخلیق یا اپنے اقوال نہیں تھے، وہ صرف پیغامبر تھے، وہ پیغام پہنچانے والے تھے۔ لیکن اب پیغامبر کی کیفیت یہ ہے: **ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ** (81:20) یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وحی کے معنی روح بھی ہوتے ہیں، اس کے معنی قوت یا توانائی کے بھی ہیں۔ قرآن میں وحی کو روح کہا گیا ہے: **یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ** (17:85) یہ روح کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔ **قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا** ❷ (17:85) تم کہہ دو کہ ہمیں اس کا بہت تھوڑا سا علم حاصل ہے۔ اس کے معنی وحی کے ہیں۔ وحی میں قوت ہوتی ہے۔

[گزشتہ سے پیوستہ]--------------------------------

یہ بھی اس کے اپنے وضع کردہ نہیں۔ خدا کے متعین فرمودہ ہیں)۔ یہ رسول بڑا قابلِ اعتماد ہے۔ وہ اس پیغام کے پہنچانے میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ پھر، وہ صرف پیغام کو پہنچاتا ہی نہیں، اس کی تشکیل کے لیے ایک نظام قائم کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر یقین رکھیں، وہ اس کی بات مانیں اور اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ (اس کے بغیر کوئی نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ان سے کہہ دو کہ وحی کا تعلق خدا کے ''امر'' سے ہے، محسوس کائنات سے نہیں۔ اور چونکہ تمہارا علم صرف محسوس کائنات تک محدود ہے، اس لیے تم، عالمِ امر سے متعلق حقائق کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ (اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی کے علاوہ کوئی اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ وحی کیسے نازل ہوتی ہے اور اس کی کنہ وحقیقت کیا ہے۔ لیکن وحی کی رو سے دی ہوئی تعلیم ......قرآن...... کو ہر ایک سمجھ سکتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

قوانین کے علم میں بڑی قوت ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ جو قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پہ حضرات انبیائے کرام کے متعلق اور خاص طور پہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا گیا ہے کہ ہم نے رسول کو تقویت دی' تو یہ قانون کی تقویت ہوتی ہے۔ وہ جو' حرفوں والا تالا ہوتا ہے' اس کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ جسے ان کی قوت کا پتہ ہوتا ہے اور وہ جسے ان کا پتہ نہیں ہوتا' آپ اِن دونوں کی قوت کا فرق تو سمجھ سکتے ہیں۔ اب یہ جو آسمانی کرے ہیں' جنہیں ان کے قوانین کا علم حاصل ہو گیا ہوا ہے' آپ غور فرمائیے کہ ان میں اور ہم میں قوت کا کتنا فرق ہے۔ قانون کا علم ہو جانا ایک قوت عطا کرتا ہے۔ اس علم کی رو سے وہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے جو کچھ وہ قانون کرنا چاہتا ہے۔ یہ جتنی تخلیق انسان کر رہا ہے وہ اس پر ہے کہ کہ اسے اس قانون کا علم حاصل ہے وہ ایجاد تو کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تخلیق وہاں کرتا ہے' جہاں اُسے قانون کا علم حاصل ہوتا ہے۔ جتنا جتنا قانون کا علم حاصل ہوتا جائے گا' اتنی ہی انسان کی قوت بڑھتی جائے گی۔ اسی لیے قرآن نے تسخیرِ فطرت پر اتنا زور دیا ہے۔

نبی کو وحی کے ذریعے ہی قوانینِ فطرت کی قوت کا علم حاصل ہوتا تھا

عزیزانِ من! نبی کو وحی کی رو سے تقویت حاصل ہوتی ہے' رسول کو وحی کی رو سے یقین حاصل ہوتا ہے کہ یہ قوانینِ فطرت ہیں' وہ اسی کو پھر Convey (پہنچانا) کر دیتا ہے' آگے پہنچا دیتا ہے' پھر انسانوں میں جو بھی ان قوانین سے واقف ہوئے انہیں وہ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے **ذِیْ قُوَّۃٍ** ❶ (81:20)۔ اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اسے کس کی طرف سے یہ قوت ملی ہے؟ اس کے جواب میں کہا کہ **عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ** ❷ (81:20)۔ یہ قوت ذاتی نہیں ہے۔ ذاتی اعتبار سے تو صرف **اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ** تھا' یہ قوت جو وحی کی رو سے ملی ہے یہ اس خدا کی طرف سے ملی ہے اور خدا کے متعلق ہے کہ وہ **ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ** ❷ (81:20) یہاں عرش کا لفظ آیا ہے۔ کائنات میں خدا کے قوانین کارفرما ہیں اور ان کے اوپر جو مرکزی کنٹرول ہے وہ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جس کے ہاتھ میں کائنات کا پورا مرکزی کنٹرول ہے' اس کی طرف سے اس رسول کو یہ تقویت حاصل ہوئی ہے۔ تو اتنی بڑی بنیادی' اساسی' قوتوں کا مالک۔ مرکزی قوتوں کے مالک کی طرف سے اس رسول کو یہ تقویت حاصل ہوئی ہے اور تقویت وہ ہے جو وحی نے ان کو دی ہے' قوانینِ خداوندی نے اِن کو دی ہے۔ یہ ہے وہ قوت جو اس رسول کو حاصل ہے۔

---

❶ اسے خدا کی طرف سے وحی کی تائید و قوت حاصل ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اسے (یہ تائید و قوت اس خدا کی طرف سے ملی) جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ (ایضاً)

❸ کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لینے والا۔ (ایضاً)

اہلِ قرآن کی نظر میں مقامِ نبوت

عزیزانِ من! اب اس کی بنا پہ اگلی دو باتیں آئیں۔ قرآن کریم نے کہا کہ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ (81:21)[1]۔ وہاں (81:19) میں یہ بات تھی کہ یہ رسول ہے پیغامبر ہے۔ پہلے بھی یہ خیال آیا تھا اور ہمارے دور میں خاص طور پہ اس کو نمودار کیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ رسول تو صرف معاذ اللہ ایک ڈاکیا (Postman) ہوتا ہے بس وہ خدا کی طرف سے چٹھی رساں کی طرح چٹھی لاتا ہے چٹھی Deliver (حوالے کرنا) کر دیتا ہے بس اس کے بعد وہ کچھ اور نہیں ہوتا (معاذ اللہ)۔ مجھے بڑا افسوس ہوا آپ کو بھی ہوگا کہ یہ بات ان کی طرف سے کہی گئی جنہوں نے اپنے فرقہ کا نام اہل الذکر والقرآن رکھا۔ انہیں اہلِ قرآن کہا گیا ہے۔ قرآن کی طرف نسبت اور رسول کے متعلق یہ بات کہ وہ صرف ایک ڈاکیا معاذ اللہ ہوتا تھا۔ میں عرصہ پچاس سال سے چیزیں بیان کرتا چلا آ رہا ہوں کہ نبوت وحی کا ملنا ہے اور اس میں نبی کا اپنا کوئی ہاتھ ہوتا ہی نہیں اپنی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ یہ جس کو خدا دیتا ہے اسے ہی وحی ملتی ہے۔

رسالت کا فریضہ وحی کے مطابق ایک نظام قائم کرنا ہوتا تھا

عزیزانِ من! وحی ملنے کے بعد اس وحی کے مطابق ایک نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے فریضہ اس نبی کا۔ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے اس کو رسول کہا جاتا ہے۔ رسالت کے معنی نبوت یا وحی کا پہنچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ عملاً اسے ایک نظام کی شکل میں قائم کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ ہے فریضہ رسالت کہ جب وہ اس نظام کو قائم کرے گا تو پھر اسکی اطاعت لازم آ جائے گی۔ یہ اطاعت درحقیقت نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ نبی اکرمؐ سے بھی جب کہا گیا ہے کہ لوگوں کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلے کرو تو وہ یہی نظام ہے جو قرآن کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے مرکز تھے۔ حضور ﷺ قرآن کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اب یہ بات نہیں تھی کہ مذہب کی طرح اپنے اپنے طور پر جس کا جی چاہے خود اس کی اطاعت کرلے یہ بات نہیں تھی۔ یہ ایک اجتماعی نظام ہے جس میں اس نظام کی اطاعت کی جائے گی اور ہر فرد ایک ہی طرح سے اطاعت کرے گا۔ جماعت بنے گی اجتماعی نظام ہوگا مملکت ہوگی مملکت کے قوانین ہونگے جن کی اطاعت کی جائے گی۔ یہ ہے نظامِ خداوندی۔ اس نظام کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے بعد بھی آگے چلے گا۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک چمکتی ہوئی حدیث ہے کہ تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے۔ اس میں اپنا ہی نہیں کہا کہ میری ہی اطاعت کرو بلکہ یہ بھی کہا کہ میرے بعد یہ جو خلفائے راشدین

---

[1] یہ رسول بڑا قابل اعتماد ہے۔ وہ اس پیغام کے پہنچانے میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا پھر وہ صرف پیغام کو پہنچاتا ہی نہیں اس کی عملی تشکیل کے لیے ایک نظام قائم کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر یقین رکھیں وہ اس کی بات مانیں اور اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ (اس کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میرے راستے پہ چلنے والے ہونگے' ان کی اطاعت بھی تمہارے اوپر لازم ہوگی۔ تو یہ اطاعت درحقیقت اس نظام کی ہے جو قرآن کی رو سے قائم کیا جاتا ہے۔ یہی رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا۔ پھر یہ نظام آگے چلا۔ یہ الگ بات ہے کہ تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ ہماری وہ بات ایک مقام پہ جا کر رک گئی لیکن یہ بات نہیں ہے کہ رکنے کے بعد ختم ہوگئی۔ جب جی چاہے اس خلافت کی از سرِ نو تجدید ہوجائے گی اور جب بھی یہ نظام دوبارہ قائم ہوگا اس کا نام کچھ بھی رکھ لیجیے گا' یہ وہی چیز ہوگی جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد بھی جو اس نظام کو قائم کریں گے' ان کی اطاعت بھی تم پر لازم آئے گی۔ ایک نظام یا حکومت جو Continuously (مسلسل ومتواتر) چلتی ہے' اس حکومت کی اطاعت ہر ایک پہ لازم ہوتی ہے۔ صدیوں تک ایک حکومت قائم رہتی ہے۔ اس کے قوانین بھی بدلتے ہیں' انداز بھی بدلتے ہیں' اسالیب بھی بدلتے ہیں' اربابِ اقتدار بھی بدلتے ہیں لیکن اس گورنمنٹ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ تھا وہ نظامِ خداوندی جسے اب دین کی اطاعت کہا گیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ رسول صرف پیغام پہنچانے والا ہی نہیں ہوتا بلکہ پیغام کے مطابق نظام قائم کرتا ہے اور اس اعتبار سے اس کی اطاعت لازم آجاتی ہے۔ یہ اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ وہ رسول احکامِ خداوندی ہی کی اطاعت کراتا ہے۔ اس لیے رسول یا یہ نظام امین ہوتا ہے۔

قرآنی نظام کی دو خصوصیات: امن اور امانت

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ امین میں یہ امن اور امانت دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ امن سے جو مادہ نکلتا ہے اس کے معنی ہیں امن قائم کرنے والا۔ امانت بھی اس کے اندر آتی ہے۔ آپ جب کسی امین کے ہاتھ میں اپنا راز یا کوئی متاع دے دیتے ہیں تو اس کے بعد آپ کو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے تو یہ چیز اس امن کے اندر ہے۔ یہ جو نظام قائم ہوگا اس نظام میں امن بھی ہوگا اور اس کے اندر امانات بھی ہونگی' اسی لیے آپ ﷺ کو **رسول امین** کہا گیا ہے۔

رسول ﷺ خدا کی طرف سے صرف ایک لفظ ''سوچا کرو'' کی تلقین

آگے یہ بات کہی کہ **وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ** [1] (81:22)۔ مجنون کا یہ لفظ دوسرے مقام پہ بھی ہے' جہاں کہا ہے کہ اے رسول! ان لوگوں سے کہو کہ میں اتنا عرصہ' بہت لمبی چوڑی باتیں' آپ سے کہتا رہا ہوں' تلقین کی' تبلیغ کی ہے۔ میں آج تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں: ایک بات' وہ سن لو۔ فطری طور پر ایک انسان واقعی اس پہ آجائے گا کہ ایک ہی تو بات ہے جو یہ کہنا چاہتا ہے تو سن لو۔ آگے کہا کہ وہ بات ایسی نہیں ہے کہ تم چلتے چلتے سن لو' وہ بڑی اہم بات ہے۔ خدا کے لیے کھڑے ہوجاؤ' سارے نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہوجاؤ۔ ٹھیک ہے کھڑے ہوگئے۔ دیکھا آپ نے نفسیاتی طور پہ ان کو کیسا تیار کیا جا رہا ہے' اس بات پہ غور کرنے کے

---

[1] یاد رکھو! تمہارا یہ رفیق پاگل پن کی باتیں نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' وہ ہو کر رہے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیے جو آگے کہی جائے گی۔ بڑا عجیب انداز ہے۔ کھڑے ہو جاؤ۔ کہو بھئی! کہا کہ ایک بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ **تَتَفَكَّرُوْا** (34:46) سوچا کرو بس! یہ ایک بات بھی نہیں' ایک لفظ کہا ہے اور سارا راز ہی اس میں ہے۔ کہا کہ اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا جو میں کہہ رہا ہوں تو تم اس نتیجے پہ پہنچو گے کہ **مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ** (81:22) ایسا کہنے والا پاگل نہیں تھا۔ کیا بات ہے صاحب! جب تم نے سوچنا شروع کر دیا تو تم خود اس نتیجے پہ پہنچ جاؤ گے کہ یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' ایسا کہنے والا پاگل نہیں ہے۔ اور یہی بات یہاں آئی ہے کہ یہ تمام جتنے بھی ستارے اور سیارے اور چاند اور سورج اور نمودِ سحر' صبح کا تنفس' یہ تمام چیزیں ہیں' یہ اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ تمہارا یہ کہنے والا' یہ رسول' پاگل نہیں ہے۔ اللہ اکبر!

مقامِ نبوت اور آپ ﷺ کا فریضۂ حیات

عزیزانِ من! نبوت کا مقام سمجھنا چاہتے ہو' وہاں سورۃ النجم میں بھی یہ مقامات آئے ہوئے ہیں اور میں نے یہ بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ''مقامِ محمدی'' میرا ایک مقالہ بھی ہے۔ اس میں سورۃ النجم کی تفسیر بھی ہے۔ اس میں یہ مقامات بھی آئے ہیں۔ یہاں (81:23) میں ان کو دہرایا ہے کہ اس کا مقام کیا ہے؟ کہا کہ **وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ** ❶ (81:23)۔ اس نے وحی پانے کے بعد اپنے آپ کو کہاں پایا ہے! یعنی انداز ہے کہنے کا کہ اس نے اپنے آپ کو کہاں پایا ہے! اصل بات یہ ہے کہ اس کا مقام کہاں ہے' ذرا سوچو۔ جواب میں افق کہا' افق تو کہتے ہیں جہاں یہ زمین اور آسمان ملتے ہیں۔ یہ لفظ ہی ہے جو وہ مقام بتاتا ہے جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے اُفق کہتے ہیں۔ اصطلاح میں یہ بلندترین اور وسیع ترین مقام ہے۔ جب کسی چیز کے متعلق اس مقام کا کہنا ہو تو اس کے لیے افق کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس میں یہ دونوں ہی چیزیں ہیں: اس کی بلندی بھی اور وسعت بھی۔ جتنا اونچا ہوتے چلے جائیں گے یہ اتنی ہی زیادہ وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ درحقیقت کوئی ایسا خطِ امتیاز کھینچا ہوا نہیں ہوتا' وہ تو ہماری حدِ نگاہ ہوتی ہے لیکن اس میں ہوتا یہ ہے کہ جتنے اونچے ہوتے چلے جایئے اتنی وہ وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔ افق کے معنی یہی ہیں۔ وحی کا علم علمِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں پہ ہے۔ اس لیے یہ افق کے اوپر اپنے آپ کو پا رہا ہے لیکن افق کی تو یہ بھی صورت ہوتی ہے کہ بعض اوقات چاند دیکھنے والی رات کو' آپ انتیس کو دیکھتے ہیں کہ صاحب! چاند نظر نہیں آیا' دھندلا سا تھا' بادل سے تھے' گہرسی تھی' یہ چیزیں بھی تو افق کے اوپر ہو جاتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز افق کے اوپر ہے۔ وہ افق مبین ہے۔ کیا بات ہے! سورۃ النجم میں بھی ہے کہ اس کی آنکھ نے دھوکا نہیں کھایا' دوسری طرف پھری نہیں ہے۔ تو افق کے متعلق کہا کہ اس کا جو علم ہے اس میں دھندلاہٹ نہیں ہے' گدلا پن نہیں ہے۔ یہ صاف مبین ہے۔ مبین کے لفظ میں یہ ہے کہ وہ چیز خود بھی واضح ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کرتی ہے تو وہاں کہتے ہیں کہ وہ مبین

---

❶ اور اس نے اپنے آپ کو علم کے اس بلندترین اور وسیع ترین مقام پر فائز پایا ہے جہاں انسان کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ [اس طرح یہ رسول جو کچھ کہتا ہے' گویا آنکھوں دیکھا حال کہتا ہے (53:1-7)] (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوتی ہے۔ افق مبین بھی ہے۔ اور اگلی چیز نے پھر واضح کیا کہ وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ❶ (81:24)۔

عزیزانِ من! بڑی عظیم چیزیں آتی جارہی ہیں۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی پانے کا نام ہے۔ وحی نہایت واضح شکل کے اندر آتی ہے اور وحی پانے کے بعد اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ اس کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ وہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ❷ (5:67) پہنچاؤ اور اگر تم نے یہ بفرضِ محال نہ کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس مقصد کے لیے تمہیں یہ نبوت دی گئی تھی تم نے وہ مقصد پورا نہیں کیا' گویا مقصدِ نبوت یہ ہے کہ اس وحی خداوندی کو' اس تعلیم کو' اپنی ذات تک نہ رکھا جائے بلکہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہ بنیادی چیز ہے' اِسے ذہن میں رکھنا چاہیے: اس وحی خداوندی کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔

تصوف کی حقیقت اور علم لدنی کا دعویٰ

عزیزانِ من! جو نبوت تھی اس پہ تو ایمان ہوا۔ اب یہ مشکل ہوگئی کہ بات آگے کیسے چلائیں۔ سو ہمارے ہاں تصوف آیا۔ تصوف کے اندر بھی ان کا دعویٰ کشف والہام کا ہوا یعنی خدا کی طرف سے علم ملنے کا دعویٰ۔ یہ وہی بات ہوگئی جو نبوت کی ہے۔ تو پھر ختمِ نبوت کے اوپر ایمان کیسے رہا۔ بات لمبی چلی جائے گی اور میں نے کئی دفعہ کہا بھی ہے۔ ''تصوف کی حقیقت'' میری کتاب بھی ہے۔ بہرحال' ان کا دعویٰ یہ ہے اور ان کے سرخیل شیخِ اکبر ❷ کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم بھی اسی مقام سے لیتے ہیں جس مقام سے نبی لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا

---

❶ پھر جو کچھ اسے وحی کے ذریعے ملتا ہے' اسے اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ اسے' نہایت کشادہ ظرفی سے' دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ سب کو اس میں شریک کرتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ تم اس ضابطہ ہدایت کو' جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (560-638ھ مطابق 1165-1240ء) چھٹی صدی ہجری میں اُندلس میں پیدا ہوئے اور 638ھ میں دمشق میں وفات پائی جہاں اس کے مزار پر بہت بڑا گنبد ہے۔ وہ اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں: ''جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل صاحب الزماں' غوث' قطب لیتے ہیں۔'' ص۔ 519۔ ان کا مشاہدہ یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی جو کچھ نظر آتا ہے' سب خدا ہی ہے یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ساتویں خطبے: ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' میں ابن عربی کے اس مشاہدہ کو ان الفاظ میں درج کیا ہے: God is a percept; the world is a concept. (p.141) اور سید نذیر نیازی نے ان کے خطبات کے اردو ترجمہ: ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''وجود مدرک ہے تو خدا ہے' کائنات معنی۔'' پھر اس پر نوٹ یہ لکھا ہے ''لہٰذا اس کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے' خارج سے نہیں۔ خارج سے ہم جس حقیقت کا ادراک بذریعہ حواس کر رہے ہیں وہ صرف ذات الٰہیہ ہے۔ ص۔ 281۔ سید نذیر نیازی: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' بزم اقبال' لاہور' 1958۔

محققین کا خیال ہے کہ ابن عربیؒ اخوان الصفا کے نظریات ومعتقدات سے متاثر تھے۔ اخوان الصفا' باطنی مسلک اسماعیلیہ کے پیرو مصنفین کا ایک گروہ تھا جس نے (اپنے ناموں کا انکشاف کیے بغیر) کچھ رسائل تصنیف کیے تھے۔ ان کی تعلیمات محمد ابوالقاسم الاندلسی (متوفی 395ھ) [باقی اگلے صفحے پر]

دعویٰ ہے اور ختمِ نبوت بھی قائم ہے۔ برادران عزیز! کیا بتاؤں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا ہوا ہے! آگے بات چلتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وہ جو صوفی یا یہ صاحبِ کشف اور صاحبِ الہام ہیں' ان کو جو الہام ہوتا ہے' ان کو جو خدا کی طرف سے علم ملتا ہے' وہ ان کی اپنی ذات تک ہوتا ہے' وہ سینہ بہ سینہ علم ہے۔ اسے وہ علمِ لدنی کہتے ہیں یعنی خدا کی طرف سے براہِ راست ملا ہوا لیکن رہتا یہ ان کی ذات تک ہے۔ ان کے متعلق جو یہ پوچھا جائے کہ صاحب! یہ کیا ہے جو آپ کو یہ کشف والہام ملتا ہے' تو وہ اس ایک ہی مصرع میں جواب دیتے ہیں کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

نشے کا علم تو اسے ہی ہوسکتا ہے جو خود نشہ کرے' سمجھایا نہیں جاسکتا کہ نشہ ہوتا کیا ہے۔ یہ کمبخت شاعری بڑی فریب انگیز چیز ہے۔ ایک تشبیہ اور ایک استعارے سے باطل کو حق اور حق کو باطل کر دیتی ہے۔ صاحب! یہ تو نشہ ہے اور واقعی ہے۔ وہ کتنا ہی بڑا صاحبِ علم کیوں نہ ہو کسی دوسرے کو سمجھا یا ہی نہیں سکتا کہ نشہ ہوتا کیا ہے۔ وہ تو کہے گا: آپ نشہ کرو تو پتہ چلے' تو گویا تصوف کا نشہ وہ ہے۔ یہ وہ علم ہے کہ جو کرے گا اس کو ہی پتہ چلے گا' دوسرے تک Communicate (پہنچایا) نہیں کرسکتا اور نبوت وہ ہے کہ جب وہ حقائق ملیں گے تو اس کا فریضہ ہے کہ ان کو دوسروں تک Communicate (پہنچائے) کرے' اسے دوسروں تک پہنچائے۔

تصوف سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے: اقبالؒ

عزیزانِ من! اب یہاں یہ چیز واضح ہے کہ تصوف مسلمانوں میں ہی نہیں آیا' اس سے پہلے یہودیوں میں' عیسائیوں میں' ہندوؤں میں' ہر مذہب کے اندر' یہ تھا اور اس میں ایک چیز قدرِ مشترک تھی کہ یہ جو علم ہوتا ہے یہ اس کی اپنی ذات تک ہوتا ہے جسے آپ صوفی کہیے' ولی کہیے' Saint کہیے' کچھ بھی کہہ لیجیے۔ یہ اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ یہاں (81:24) میں اس کی تردید کی کہ اس رسول کو یہ جو علم خدا کی طرف سے حاصل ہوا ہے' اس علم میں یہ بخیل نہیں ہے کہ اپنی ذات تک رکھے گا اور دوسروں کو نہیں دے گا۔ اس نے تصوف کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جو علم خدا کی طرف سے ملے گا اس کے لیے اس صاحبِ علم کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ یہ دوسروں تک بھی پہنچائے اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کرنے والے متبعین جن کو قرآن کا یہ علم ملے گا اس کا دوسروں تک پہنچانا' ان کا فریضہ ہو جائے گا۔ اگر وہ یہ کہیں کہ نہیں صاحب! یہ تو میری ذات تک ہی ہے' آگے نہیں پہنچتا' تو پھر وہ صاحبِ نبوت نہیں ہے۔ یہ تصوف والوں کی بات ہے جو کچھ وہ کر رہا ہے۔ پھر ہمارے ہاں ہوا یہ کہ قرآن نے تو یہ کہا تھا کہ یہ اس باب میں بخیل واقع نہیں ہوا ہے' یہ اس چیز کو عام کرے گا مگر

[گزشتہ سے پیوستہ]

کی تصانیف کے توسط سے افریقہ اور اندلس (ہسپانیہ) تک رائج ہوگئی تھی۔ اس لیے ان محققین کا قوی گمان ہے کہ ابن عربی انہی کے فلسفہ سے متاثر تھے۔ تصوف کی جو تصویر ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ ایک حد تک اخوان الصفا کی تعلیمات کا عکس ہے۔ (حوالہ مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید مرحوم۔ ماخوذ از پرویزؒ: شاہکار رسالت' ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987' ص ص۔ 520-519۔

انہوں نے مہر نبوت توڑ کر رکھ دی۔

ہمارے ہاں کی خودساختہ روایات

عزیزانِ من! جب تصوف آیا تو پھر وضعی روایات آئیں: لوگوں کی بنائی ہوئی روایات۔ اب یہ تمام روایات ہمارے ہاں موجود ہیں۔ اُن میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی موجود ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر سے لپیٹے ہوئے علم کے دو بند برتن دیئے تھے ایک برتن کو تو میں نے کھول کے عام کر دیا ہے اور اگر میں دوسرے برتن کو کھولوں تو گلے کے اوپر یوں ہاتھ پھرے کہ میرا گلا کاٹ جائے گا۔ میں وہ نہیں کھولوں گا۔ تو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو آدھا علم ملا تھا وہ علم مخفی رکھا۔ پنجابی اچ اونوں کجا ای کیندے ہیگے نیں جیہڑا بند کیتا ہویا ہونداا ے۔ [1] وہ جو اس برتن میں بند کیا ہوا تھا۔ وہ بند کا بند ہی رکھا گیا۔ آدھا ہی علم ہے جو عام کیا گیا۔ سب سے زیادہ حدیثیں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں۔ انہیں بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ہی کجا تھا جو میں نے کھول کے بیان کیا ہے' دوسرا بند کا بند رکھا ہوا ہے۔ وہ کہاں گیا؟ وہ صوفیا کے پاس آ گیا۔ کیا بات ہے ان کی؟ جس رسولؐ کے متعلق قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ تمہیں جو کچھ بھی دیا جاتا ہے' فرض ہے کہ **بلغ ما انزل الیک** (5:67) تم اسے ساری انسانیت تک پہنچاؤ۔ یہ **ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ** [2] (27 81 ;38:87 ;12:104) ہے۔ یہ کسی ایک قبیلے' گوشے' ذات' برادری' ملک' تک نہیں۔ اِسے نوعِ انسانی تک پہنچاؤ۔ اس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمیں اس کا جو علم ملا تھا اس میں سے آدھا تو میں تم لوگوں کو دے رہا ہوں' یہ ظواہر کا علم کہلاتا ہے اور تصوف میں جو میں رکھ رہا ہوں وہ باطن کا علم ہوتا ہے' جسے وہ علمِ حقیقی عام کہتے ہیں' وہ باطن ہی کا ہوتا ہے۔ تو یہ جو کچھ بھی چپا چبایا ہوا' یونہی خشک سا علم تھا وہ تو انہوں نے امت کو دے دیا اور جو باقی تھا وہ رکھ لیا۔ وہ ان کے ہاں سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے!!! جب کہ قرآن کہتا ہے کہ **وَ مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ** (81:24) یہ علمِ خداوندی جو اس کو وحی کے ذریعے سے ملا ہے' یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بخیل نہیں ہے' یہ ایک ایک حرف' ایک ایک نقطہ' نہایت کشادہ ظرفی سے پورے عالم تک پہنچانے والا ہے۔

عزیزانِ من! درس کا وقت ختم ہو گیا۔ ابھی تین چار آیات رہتی ہیں' وہ بھی بہرحال اہم ہیں۔ ہم آیت 24 تک پہنچ گئے۔ سورۃ التکویر کی آیت 25 سے ہم آئندہ لیں گے۔

عزیزانِ من! ابھی ایک بڑا اہم اعلان کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا درس تو ایک مسلسل جوئے رواں کی طرح چلتا ہے' راستے میں کہیں کہیں بعض تقاریب ایسی آ جاتی ہیں تو ان پر خصوصی درس ہوتا ہے۔ اب اگلی خصوصی تقریب یومِ آزادی ہے۔ زندہ قوموں کے

---

[1] اسے پنجابی زبان میں کجا ہی کہتے ہیں جسے بند کیا گیا ہوتا ہے۔

[2] یہ تمام نوعِ انسان کے لیے ضابطہ حیات ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہاں یہ بڑا اہم دور ہے۔ اس پہ بھی میرا ایک خصوصی درس ہوا کرتا ہے۔ چودہ اگست تو درمیان میں آئے گا' اگلا جمعہ 17 اگست کو آئے گا۔ تو 14 کی بجائے' 17 اگست کا جو اگلا جمعہ ہے اس میں مسلسل درس کی بجائے آزادی سے متعلق جو موضوع ہے' اس پہ میرا درس ہوگا۔ وہ موضوع یہ ہے جسے آپ کچھ تعجب سے سنیں گے: ''جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا۔'' مجھے یہ بھی سعادت حاصل ہے کہ میں نے اس تحریک کے ساتھ دس سال تک کام کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم نے مانگا کیا تھا اور جو ملا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ تو موضوع ہی یہ ہے: جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا۔

عزیزانِ من! ایک تبدیلی اور ہے آج درس ساڑھے آٹھ بجے ہو رہا ہے وہ آئندہ نو بجے ہوگا کیونکہ دُور دُور سے لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں تو اگلے جمعے کا درس نو بجے صبح اسی مقام پہ ہوگا' یومِ آزادی کی تقریب ہوگی' عنوان یہ ہوگا جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' اس کے لیے ان احباب نے یہ اطلاعی کارڈ چھپوا لیے ہیں۔ آپ کو تو علم ہو گیا ہے' جاتے وقت وہاں اسٹال سے یہ کارڈ لیتے جایئے گا۔ اپنے حلقے میں جو احباب اس سے متفق ہوں یا اس کا ذوق رکھتے ہوں' ان تک اسے پہنچا دیجیے گا۔ آئندہ درس میں ہم یہ موضوع لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

چودھواں باب: سورۃ التکویر (آیات 25 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1984ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم سورۃ التکویر کی آیت 25 سے شروع ہو رہا ہے۔ سابقہ درس میں کہا یہ گیا تھا کہ قرآنِ کریم نے فطرت کے شواہد کی شہادات پیش کرنے کے بعد کہا کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ❶ (81:29) یہ ہمارا پیغام ہمارے پیغامبر کی زبان سے تم تک پہنچ رہا ہے۔ یہ خدا کا پیغام اس کے رسول کی وساطت سے پہنچ رہا ہے۔ قرآن کا عام طور پہ انداز یہ ہے کہ وہ تضادات کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر اپنے مفاہیم و معانی کو واضح کرتا ہے۔ یہ انداز بڑا موثر بھی ہوتا ہے اور واضح بھی ہوتا ہے، تضاد سے ایک چیز تو یہ ہے کہ دونوں چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔ مثلاً تاریکی کے بعد روشنی کہنے سے دونوں چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔ قرآن کا یہ انداز ہے۔ وہاں یہ کہا کہ یہ قول رسولِ کریمؑ کی زبان سے آیا ہے۔ یہاں کہا کہ وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ❷ (81:26)۔ یہاں شیطان کا مفہوم واضح کرنے کی ضرورت نہیں' آپ احباب کے سامنے ہے۔ پچیس سال سے تو قرآن کی یہی اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم میں بیان کرتا چلا آ رہا ہوں۔ خدا کے پیغام کو' قرآن کو' وحی کے پیغام کو چھوڑ کر' جو چیز بھی خلافِ قرآن آئے گی وہ شیطانِ رجیم کا پیغام ہوگا۔ یہ سارا کچھ بیان کرنے کے بعد آپ کو اپنے ذہن میں متحضر کرنا چاہیے جو پہلی آیات میں آ چکا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ❸ (81:26)۔ کیا انداز ہے کہ اتنی واضح باتیں ہم نے کیں' اتنی واضح شہادات بہم پہنچائیں' اس قدر دلائل اور براہین سے بات پیش کی جس کا جواب ان کے پاس نہیں ہے تو ان سے پوچھو کہ پھر اور کس دروازے پہ دستک دے رہے ہو صاحب! اسے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔ یہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مخاطب قوم سے تو کہا ہی تھا یہ تو ہم سے بھی کہا جا رہا ہے کہ اسے چھوڑ کر پھر تم کہاں جا رہے ہو۔ ہم نے سینکڑوں در تجویز کر رکھے ہیں جہاں ہم جاتے ہیں اور یہاں کہا ہے کہ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (81:26) اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ اگر تم کسی اور دروازے پہ چلے جاؤ' کسی اور آستاں پر سجدہ ریز ہو جاؤ' اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا اس قرآن کا کچھ نہیں

---

❶ یہ سب مظاہر فطرت اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جو شخص یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے' اور نہایت معزز پیغامبر۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ کسی کے سرکش جذبات کی باتیں نہیں جو قیاسات پر مبنی اور حقیقت سے بہت دور ہوتی ہیں۔ (ایضاً)

❸ جب حقیقت یہ ہے تو پھر بتاؤ کہ تم اس قسم کے ضابطہ قوانین کو چھوڑ کر کدھر چلے جا رہے ہو؟ (ایضاً)

جا تا کیونکہ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (81:27) یہ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ ہدایت بھی ہے اور شرف و مجد بھی۔ ذکر کے معنی آپ کو پتہ ہے کہ شرف اور عزت اور تکریم کا موجب بھی ہیں۔ یعنی یہ ایسا ضابطہ ہدایت ہے کہ جس کے اتباع سے شرفِ انسانیت حاصل ہو جاتا ہے۔ تم اس سے روگردانی کرو گے تو کوئی بات نہیں، دنیا کی کوئی اور قوم اس کو لے لے گی۔ یہ قیامت تک کے لیے آخری پیغام ہے۔ جب بھی کوئی قوم اسے لے گی وہی شرف حاصل کر لے گی: لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (81:28) جو بھی تم میں سے چاہے وہ سیدھا اور متوازن راستہ جس کی طرف قرآن نے راہنمائی کی ہے، اختیار کر لے۔ اب یہاں بھی آگے ایک چیز آتی ہے اور اس سے پیشتر بھی دو ایک مقامات پہ اور بھی آ گئی ہیں۔ اگرچہ وہاں میں نے بڑی وضاحت سے ان کی تشریح کر دی تھی لیکن جب بھی کوئی آیت بارِ دگر یعنی دوبارہ آتی ہے تو کچھ نہ کچھ تشریح ضرور کرنا پڑتی ہے جو میں اب بھی کر رہا ہوں۔

جس قسم کا راستہ، اس قسم کی منزل

قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار بنایا ہے، ہم نے راستے دکھا دئے ہیں: اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوۡرًا (76:3) [1] راستہ ہم نے دکھا دیا ہے، چوراہے پہ یہ کھڑا ہے۔ اس کے بعد اس کا جی چاہے تو صحیح راستہ اختیار کر لے، جی چاہے غلط اختیار کر لے، یہ اس کے اختیار کی بات ہے۔ آگے یہ ہے کہ وہ جو راستہ اختیار کرے گا، وہ کس منزل پہ پہنچائے گا؟ یہ منزل نہیں بدل سکتا۔ جس قسم کا راستہ اختیار کرے گا اس قسم کی منزل پہ پہنچ جائے گا۔ جو عمل کرے گا اس کا نتیجہ نکل آئے گا۔ گندم از گندم بروید جوز جو۔ اس کا جی چاہے تو گندم بودے، جی چاہے جو بولے۔ اسے یہ اختیار تو ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ بوئے یہ جو اور اس میں سے یہ فصل کاٹے گندم کی۔ یہ ہے قرآن کی ساری تعلیم کا ملخص یعنی بنیادی اساسی چیز یہ ہے۔ اس پہ آگے قرآن کی تعلیم چلتی ہے، انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ (18:29) جس کا جی چاہے ایمان لے آئے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے لیکن جب ہمارے دورِ ملوکیت میں اربابِ اقتدار کا استبداد، ظلم، جبر اور جور آیا تو اس کے لیے تو ان کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں تھی، کوئی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی عقیدۂ تقدیر درآیا۔

اسلام کے خلاف پہلا غلط عقیدہ

صدرِ اول کو کوئی سو برس کی بات سمجھ لیجیے، اس دورِ ملوکیت میں ان کے دل و دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جور و جبر اور اس قسم

---

[1] خدا نے اسے، وحی کے ذریعے، صحیح راستہ بتا دیا، اور پھر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اس صحیح راستے کو اختیار کر لے، اور چاہے اس سے انکار کر کے، اپنے لیے دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے، اور مستوجب جزا و سزا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کا استبداد کیوں؟ اب ڈھال بننے کے لیے ان کا مذہب آیا۔ سب سے پہلا غلط عقیدہ' جو خلافِ اسلام عقیدہ تھا' اور جسے اسلام کے اندر داخل کیا گیا' وہ ملوکیت کے اس تقاضے کی وجہ سے تھا کہ انسان تو اپنے اختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتا' یہ تو سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے: وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اَنَّ اللّٰـهَ عَـلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (65:12) اور اس قسم کی آیات کا مفہوم یہ لیا گیا کہ سب کچھ وہ کرتا ہے' اس کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا' لہٰذا یہ جو جور و جبر تم سمجھتے ہو کہ یہ سلاطین کی طرف سے ہوتا ہے تو یہ بیچارے یہ کچھ کرنے والے کون ہیں۔ یہ تو خدا کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ خدا ان سے یہ کہتا ہے کہ اس کو گولی مار دو' یہ گولی مار دیتے ہیں' وہ اسے کہتا ہے کہ ان کو آغوشِ مرحمت میں لے لو یہ اس کو لے لیتے ہیں' یہ بیچارے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے ذریعے ہیں' ان کو کیوں مطعون کرتے ہو' ان کے کسی قسم کے کسی فیصلے' کسی حکم' کسی جبر' کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی اگر تمہارے ہاں کوئی شبہ پیدا ہو گیا' شکایت پیدا ہو گئی تو یہ درحقیقت خدا کے خلاف شکایت ہو گی' کیونکہ یہ اس کا حکم ہے جس کی بجا آوری یہ کر رہے ہیں۔ یہ عقیدہ وضع کیا گیا' جسے تقدیر کا عقیدہ کہتے ہیں۔

عقیدۂ تقدیر کی کیفیت

عزیزانِ من! جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قرآن نے ایمان کے تو پانچ ارکان بتائے تھے: اللہ پر ایمان' اس کے ملائکہ پر ایمان' رسولوں پر ایمان' کتابوں پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ سارے قرآن میں یہی ہے۔ پھر اس دورِ ملوکیت میں قرآن پہ اضافہ ہوا: وَ الۡـقَـدۡرِ خَیۡـرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی [1] یہ ایمان کا چھٹا جزو بن گیا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ جبر کا عقیدہ ہے' تقدیر کا عقیدہ ہے۔ یہ آپ کے ہاں جزوِ ایمان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد' اب آپ دیکھیں گے یہ آپ کے ہاں چھ اجزائے ایمان ہیں: پانچ اللہ کے مقرر کیے ہوئے' چھٹا یہ ملوکیت کا مقرر کردہ اور یہ آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے' لکھا بھی یہی جاتا ہے پڑھایا بھی یہی جاتا ہے' آپ سے دہرایا بھی یہی جاتا ہے۔ پختہ تر کر دو' اس عقیدے کو اتنا دہراؤ کہ جبر ان کی نس نس میں چلا جائے' کیونکہ اس کے بعد جو ملوکیت چلی ہے تو آج تک مسلمانوں کے ہاں وہی چلی آ رہی ہے' اس کے لیے جواز ہی یہ ہے کہ یہ تو سب خدا کے حکم سے ہو رہا ہے' اور جب صورت یہ ہو جائے تو قرآن کی ساری تعلیم کا محل مسمار ہو جاتا ہے۔ وہ تو مکافاتِ عمل ہے کہ جیسا کرو گے اسی کے مطابق تمہیں نتیجہ بھگتنا پڑے گا: اچھے کام' خدا کی طرف سے اس کا بدلہ حسنات خوشگواریاں' برے کام کا بدلہ تباہیاں۔ یہ ہے قرآن کی ساری تعلیم کا ملخص۔ یہ ہے بنیاد' یہ ہے کہ عمل کے مطابق نتیجہ اور اگر انسان سے کہا جائے کہ یہ اپنے عمل میں صاحبِ اختیار ہے ہی نہیں یہ اپنی مرضی اپنے ارادے سے کچھ کر ہی نہیں سکتا' تو یہ وہ گھوڑا ہے جس کی لگام سوار کے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے وہ دائیں کو موڑے تو وہ دائیں کو مڑ جاتا ہے' وہ بائیں

---

[1] اور خیر و شر کی قدر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔

کو چاہے تو یہ بائیں کو مڑ جاتا ہے' اس کے اندر گھوڑے کا کوئی اختیار نہیں ہے کہ بائیں کو کیوں مڑا تھا۔ وہ کہے گا لگام کھینچنے والے سے پوچھو۔ مسلمانوں کو یہاں لاکر رکھ دیا۔

قرآن کے مفہوم کو ہی بدل دیا گیا

اسی لیے آج تک مسلسل وہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کیونکہ آپ کے ہاں مسلسل ملوکیت چلی آ رہی ہے' استبداد چلا آ رہا ہے' جور و جبر چلا آ رہا ہے۔ اب قرآنِ کریم میں جہاں یہ چیزیں آئی تھیں وہاں کیا کیا جائے۔ اب وہاں اس کے مفہوم کو بدلا گیا۔ جہاں اس نے انسانوں کے لیے من یشآء کہا تھا وہاں کہا کہ نہیں' یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ من یشآء' خدا جس کو چاہے وہ یہ کر سکتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اگر تم یہ کچھ کرو گے تو یاد رکھو جہنم میں ڈالے جاؤ گے اور اس کے بعد یہ من یشآء ہے یعنی خدا جس کو چاہے گا جہنم میں ڈال دے گا۔ یہ کچھ کرو گے جنت میں چلے جاؤ گے' مگر انہوں نے کہا کہ من یشآء کا مطلب ہے کہ جس کو چاہے وہ جنت میں بھیج دے گا' یعنی وہ جس کو چاہے گا یہ تمہارے اعمال کے اوپر کوئی بات نہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اہم آیت تھی۔ اس سے ذرا پہلے بھی آ چکی ہے کیونکہ قریب تر آئی تھی اس لیے میں اسی کو دہراتا ہوں۔ (76:29) بڑی اہم ہے۔ یہ حوالے ہیں' یہ لکھ لیجیے پھر یہ چیزیں سامنے نہیں آئیں گی اور یوں آسانی سے آپ کو حوالے بھی نہیں ملیں گے اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ (76:29) یہ پورا قرآن تمہارے لیے ایک یاددہانی ہے' ایک عبرت کا تذکرہ ہے' موعظت ہے فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29) جس کا جی چاہے اس کے بعد اپنے خدا کی طرف جانے والے راستے کو اختیار کر لے۔ یہ راہنمائی ہے جو ہم نے تمہیں دیدی ہے۔ یہ سائن پوسٹ ہے جو چوراہے پہ لگا دیا ہے کہ یہ راستہ گلبرگ کو جاتا ہے' یہ شہر کو جاتا ہے۔ اب تم میں سے جو مسافر جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔ یہی ہے قرآن کی تعلیم! یہی ہے مکافاتِ عمل! فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29) جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کر کے وہ راستہ اختیار کر لے جو اسے خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف لے جائے۔ آگے ہے وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ [1] (76:30)۔ اس آیت کے ترجمہ اور تفسیر سے پہلے یہ سن لیجیے کہ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ (76:29) جس کا جی چاہے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ میں پھر یہ عرض کرونگا کہ آپ قرآن کی تعلیم سے محروم ہو رہے ہیں اگر قرآن کے نسخے آپ کے سامنے ہوتے تو آپ ان الفاظ کو دیکھتے: جس کا جی چاہے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرے۔ یہ مَنْ شَآءَ اتَّخَذَ واضح ہے اور آگے جناب! وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30) کا ترجمہ یہ کیا: لیکن تم تو اس کے خلاف چاہ ہی نہیں سکو گے جو خدا چاہتا ہے۔ کیا بات ہے اس خدا کی! ہم نے تمہیں آنکھیں دیدی ہیں جو جی میں آئے دیکھو لیکن تم تو وہی دیکھ سکو گے جو ہم دکھانا چاہیں گے۔ تو یہ آنکھیں کاہے کو دیدیں' یہ کاہے کو کہہ دیا کہ تمہارا جو

---

[1] ان سے کہہ دو کہ یہ اسی صورت میں ہو سکے گا کہ تم اپنے اختیار و ارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لو۔ (تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشاء ہے۔)

جی چاہے ان آنکھوں سے دیکھو جب اس کے بعد کہا کہ نہیں صاحب! تم اپنی آنکھوں سے اپنی مرضی کے مطابق، کچھ نہیں دیکھ سکو گے، وہی دیکھ سکو گے جو ہم دکھانا چاہیں گے۔ تو کہاں گیا انسان کا اختیار وارادہ، کہاں گئی قرآنِ کریم کی یہ ساری تعلیم؟ اور پھر اس کے خلاف شکایت بھی نہیں کر سکتے کہ یہ تو ہم سے آپ نے ہی کرایا تھا۔ توبہ توبہ کہتے ہیں، معاذ اللہ کہیں خدا کے حضور ایسا نہ کہنا، یہ کہو گے تو تمہیں دوہری سزا ملے گی، کہو بھی یہ نہیں اور پٹو بھی اپنے ناکردہ گناہوں پر کرایا تم نے، پٹ ہم رہے ہیں۔ تم اس سے کہہ بھی نہیں سکتے، کیا سوچتے ہو؟

قرآن میں بالکل تضاد نہیں ہے

عزیزانِ من! اس قرآن کیساتھ کیا ہوا ہے؟ ''جس کا جی چاہے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرے لیکن تم تو خود کچھ چاہ ہی نہیں سکتے۔ جو خدا چاہے تم وہی چاہ سکتے ہو'' گویا انسان کے چاہنے پر بھی خدا کا جبر ہے۔ جو انسان کے اعمال ہیں اُن کے سرزد ہونے سے پہلے انسان کے دل میں خیال، ارادہ، تمنا اور آرزو پیدا ہوتے ہیں، وہاں سے بات اٹھتی ہے۔ پھر اعمال کے لیے مظاہر ہوتے ہیں اس خیال، ارادہ، تمنا اور آرزو کے مطابق انسان کام کرتا ہے، وہ جو اسی کے اوپر کنٹرول ہو کہ تم چاہ ہی نہیں سکو گے بجز اس کے جو ہم چاہیں۔ ہم چاہیں کہ غلط راستہ اختیار کرو تو تم بھی چاہو گے غلط راستہ اختیار کرنا تو چل پڑے۔ اس کے بعد کہا کہ ہم تمہیں جہنم میں بھیجیں گے۔ کیا بات ہے ایسے خدا کی!! یاللعجب! یہ تو بالکل ملوکیت کا خدا ہے۔ ان کا تصور یہ ہے کہ **السلطٰن ظل اللہ علی الارض** سلطان زمین کے اوپر خدا کا سایہ ہے۔ یہ اصل میں الٹی بات ہے۔ ان کے ہاں خدا سایہ ہے ان سلاطین کا۔ جو ہر استبداد کے مالک تھے، جن کے خلاف آپ لب کشائی نہیں کر سکتے تھے انہوں نے خدا اسی قسم کا بنا دیا جیسا یہ سلطان ان کے سامنے تھا۔ یعنی بادشاہوں جیسا ایک بادشاہ۔

اوتھے کی پرواہ اے راقب! اوتھے بے پرواہیاں
چھڈ دے عملاں والیاں نوں، پھڑ لے اوگنہارنوں

یہ خدا کس قسم کا ہے؟ ملوکیت کا خدا، شہنشاہیت کا خدا، جس کو جی چاہے پکڑ لے، جو جی میں آئے کردے۔ جو خدا کا تصور تھا، وہ اپنے ہاں کے سلاطین کے مقابل پیدا کیا، تو اس کے لیے تو یہ چیز تھی کہ ان کی مرضی کے خلاف چاہ ہی نہیں سکتے۔ تمہیں اختیار دیا گیا ہے لیکن تم دیکھو ان کے اشارہ ابرو کی طرف کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ جو وہ چاہیں تم وہ چاہو، اب یہ جتنی انسان کے چاہنے والی آیات تھیں کہ تم جو چاہو کرو، اس کے ساتھ یہ لگا دیا کہ یہ ٹھیک ہے، ہم کہتے ہیں جو چاہو تم کرو، تمہارا اختیار ہے لیکن تم تو خود چاہ ہی نہیں سکتے، کر نہیں سکتے والی بات نہیں، چاہ نہیں سکتے اس کے خلاف جو ہم چاہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے آپ کے ہاں! قرآن کی اختیار وارادے والی جتنی آیات ہیں، ان کے متعلق یہ شرط لگائی ہوئی ہے۔ یہ میں نہیں عرض کر رہا۔ یہ ہے وہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں۔

مشیت ❶ خداوندی سے کیا مراد ہے

عربی زبان کے قاعدے کی ❷ رو سے سنیئے تو بات کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے۔قرآن کے انداز پہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29) یہ ایک واضح حقیقت ہے جسے ان

---

❶ عربی زبان میں ایک مادہ(Root) ہے ش ی أ۔اس سے شَـآءَ' یَشَآءُ' شَیْئًا' مَشِیَّئَۃٌ جیسے الفاظ بنے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ''چاہنا'' کیا جاتا ہے۔یہی ترجمہ یا یوں کہیے کہ''مشیت'' کا غیر واضح مفہوم ہے جو مسئلہ تقدیر کے ضمن میں بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن گیا ہے۔''مشیت'' کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔بعض متکلمین نے ارادہ اور مشیت میں کوئی فرق نہیں کیا لیکن لغت کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔''ارادہ'' تو فقط کسی بات کے چاہنے کو کہتے ہیں' اور جب اس ارادے کے مطابق وہ بات وجود میں آ جائے تو اسے مشیت کہتے ہیں۔اس لیے''شی'' کے ارادہ کی وجود پذیر شکل کا نام ہے۔جب ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے تو ارادہ اور مشیت کے اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔خدا کے تخلیقی پروگرام کے دو حصے ہیں۔ ایک عالم امر اور دوسرا عالم خلق۔یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت و معلول(Cause & Effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ایسا ضرور آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور وہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک معلول (Effect) بغیر کسی سابقہ علت (Cause) کے ظہور میں آ گیا ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں سے کائنات کا سلسلۂ خدا کی مرضی' منشاء' ارادہ اور اس کی پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلۂ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا۔اس مقام پر مشیت خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی۔یہ خدا کا عالم امر ہے جہاں ہر شۓ اس کی اسکیم کے مطابق' وجود میں آتی ہے۔یعنی اس کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔پانی نشیب کی طرف کیوں بہتا ہے' آگ حرارت کیوں پہنچاتی ہے' سنکھیا مہلک کیوں ہے؟ تو اس کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکے گا کہ''خدا کی مشیت'' ہی ایسی تھی یعنی یہ سب کچھ جو مشیت خداوندی کی رو سے' عالم امر میں' مقرر ہوئے تھے۔طبعی کائنات میں جو قوانین فطرت کارفرما ہیں' قرآنی نکتہ نگاہ سے وہ بھی قوانین مشیت ہیں اور انسانی زندگی سے متعلق جو قوانین بذریعہ وحی عطا ہوئے ہیں' انہیں بھی قوانین مشیت کہا جائے گا۔یعنی یہ حقیقت کہ انسانی جسم کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ کھاتا پیتا ہے' قانونِ مشیت ہے' اور یہ بات کہ انسانی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ دوسرے ضرورت مندوں کے لیے دیتا ہے' یہ قانونِ مشیت ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں خدا کے متعلق شَـآءَ' یَشَـآءُ جیسے الفاظ آئیں ان کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ''خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' ان کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے:''سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔''

آپ دیکھیں گے کہ ترجمے کے اتنے فرق سے' قرآن کریم کے وہ مقامات کس طرح واضح ہو جاتے ہیں جو پہلے ترجمہ کی رو سے' وجہ ہزار پریشانی بنے رہتے ہیں اور جنہیں سلجھانے کے لیے ہزار قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں سے کام لیا جاتا ہے' لیکن ان کے باوجود' یہ مقامات سلجھنے کے بجائے اور الجھتے چلے جاتے ہیں۔طبعی کائنات میں یہ قوانین علوم سائنس کی رو سے سمجھ میں آئیں گے اور انسانی دنیا میں' قرآنِ کریم میں غور و تدبر سے۔(ماخوذ از پرویزؒ: کتاب التقدیر' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 1986' ص ص۔197-195)

❷ اِن آیات میں مَا تَشَآءُوْنَ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے: تم نہیں چاہتے۔اس میں مَا نفی (نہیں) ...... [باقی اگلے صفحے پر]

کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کر لے؛ وہ راستہ اختیار کر لے جو اسے خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف لے جائے۔ اس طرح تم میں سے جو چاہے' وہ اپنے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے اور اس کے بعد ہے **وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ** (76:30) بھئی! تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ تم صحیح راستہ اختیار کرو۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ تمہارا چاہنا ہمارے چاہنے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اب یہ اختیار دیا کہ تم وہ بھی چاہ سکتے ہو جو ہم چاہتے ہیں اور تم اس کے خلاف بھی چاہ سکتے ہو اور بہتر تو یہ ہے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہیں۔ جب یہ بات ہو جائے گی تو تمہارا جو چاہنا ہو گا وہ تمہیں خیر کی طرف لے جائے گا کیونکہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ تم صراطِ مستقیم کی طرف جاؤ۔ پھر الفاظ کو دیکھو' میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کا جو انداز اور اسلوب ہے وہ وجد آفریں ہے۔

[گزشتہ سے پیوستہ] ------------------------------------

اِن آیات میں مَا تَشَآءُوْنَ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے: تم نہیں چاہتے۔ اس میں مانفی (نہیں) کے لیے ہے اور تَشَآءُوْنَ مضارع ہے۔ اس طرح مَا تَشَآءُوْنَ نفی مضارع ہے۔ عربی گرامر کی رو سے اس کے معنی نہی (مت کرو) کے بھی ہوتے ہیں گرامر کی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں: خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا۔ یہ ایک فنی بحث ہے مختصر المعانی میں ہے ثُمَّ الْخَبَرُ قَدْ يَقَعُ مَوْقِعَ الْاِنْشَاءِ. اِمَّا لِلتَّفَاؤُلِ اَوْ لِاِظْهَارِ الْحِرْصِ فِيْ وُقُوْعِهٖ كَمَا مَرَّ. اَوْ لِلْاِحْتِرَازِ عَنْ صُوْرَةِ الْاَمْرِ اَوْ لِحَمْلِ الْمُخَاطَبِ عَلَى الْمَطْلُوْبِ بِاَنْ يَكُوْنَ الْمُخَاطَبُ مِمَّنْ لَا يُحِبُّ اَنْ يُكَذِّبَ الطَّالِبَ (صفحہ 232) یعنی کبھی کبھی خبر انشاء کی جگہ بھی مستعمل ہو جاتی ہے۔ ایسا بطور تفاول کے ہوتا ہے۔ یا متکلم چاہتا ہے کہ ایسا واقع ہو جائے۔ یا متکلم (صاف صاف) امر (حکم) کی صورت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر مخاطب کو اس بات کے لیے برانگیختہ کرنے کے لیے ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو متکلم کو جھٹلانا نہیں چاہتے۔ زمخشری نے (اپنی تفسیر کشاف میں) اس نکتہ کی وضاحت سورۃ بقرہ کی 83 ویں آیت میں کی ہے۔ کہا ہے کہ اس آیت میں لَا تَعْبُدُوْنَ (2:83) نفی مضارع ہے لیکن اس کے معنی نہی کے ہیں۔ اس کے بعد قُوْلُوْا (2:83) امر کا صیغہ ہے۔ یعنی لوگوں کو اچھی بات کہو۔ زمخشری نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہاں اخبار فی معنی النہی ہے یعنی خبر' نہی کے معنوں میں ہے جیسے کہتے ہیں: "تَذْهَبُ اِلٰى فُلَانٍ' تَقُوْلُ لَهٗ كَذَا ۔ اس میں "تَذْهَبُ". "تَقُوْلُ" اگرچہ مضارع کے صیغے ہیں لیکن ان سے مراد امر ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ "وَهُوَ اَبْلَغ مِن صَرِيْحِ الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ ۔ یعنی یہ انداز امر و نہی کے صیغوں کے ذریعہ صاف حکم دینے یا منع کرنے کے مقابلے میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ ان تصریحات سے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہم نے تمہیں اس کا اختیار دے رکھا ہے کہ تم جیسا جی چاہے کرو لیکن تمہیں چاہیے یہ کہ اپنے اختیار و ارادہ کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص ص۔ 994-993)۔ اقبالؒ (1938-1877) کس خوبصورتی سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مری دعا ہے' تری آرزو بدل جائے

اور آرزو بدل جانے سے' انسان کی ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ "تم اپنی آرزو کو اس طرح بدلو کہ وہ ہمارے قانونِ مشیت سے ہم آہنگ ہو جائے۔"

تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ هٰـذِهٖ تَـذْكِرَةٌ (76:29) یہ ایک واضح حقیقت ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے' یہ تذکرہ ہے۔ فَمَنْ شَآءَ (76:29) جس کا جی چاہے۔ اتَّـخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْـلًا (76:29) وہ خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ یہاں من شآء کہا ہے۔ جو تمہارا جی چاہے' جو تم چاہو۔ کہا کہ پھر تم وہی کیوں نہ چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ اب یہی معلوم کرنا رہ گیا کہ خدا کیا چاہتا ہے کہ ہم کریں۔ یہ متعدد مقامات پہ ہے کہ ہم تو تم سے ایمان ہی چاہتے ہیں' صحیح راستے پہ چلنا سکھاتے ہیں۔ پہلی ہی سورۃ فاتحہ کے اندر پہلا ورق الٹتے ہی یہ کہا کہ اِهْـدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) [1] یہ ہے جو خدا چاہتا ہے۔ وہ ہمیں صراطِ مستقیم پہ چلنے کے لیے دعا سکھاتا ہے' وہ یہ چاہتا ہے۔ یہاں جو کہا کہ بھئی! جو تم چاہتے ہو' وہ تم کرو۔ اس کے بعد یہ کہا کہ پھر تم وہی کیوں نہ چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ اور جو ہم چاہتے ہیں وہ قرآن میں ہم نے ورق ورق کے اوپر بتا دیا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہم تم سے جبراً یہ نہیں کراتے۔ ایسا جو مقام آ گیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں تم کرو تو یہ معلوم کرو کہ ایسے مقام پہ ہمارا خدا کیا چاہتا ہے۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ اب خدا ایک محبوب بن گیا' یہ تو شانِ محبوبیت ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ ایسے معاملات کے اندر میرا محبوب کیا چاہتا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم صحیح راستے پہ چلو۔ ہم بھی چلیں گے۔ تو ہم نے خدا کی ایک رضا بھی حاصل کر لی ہے' جبر نہیں پورے اختیار کے ساتھ صحیح راستے پہ چل نکلے۔ اور اس نے وہ کہہ دیا تھا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم صحیح راستہ اختیار کرو۔ اختیار کرو گے تو منزل مقصود پہ پہنچ جاؤ گے۔ اختیار کیا تو منزلِ مقصود پہ بھی پہنچ گئے۔ خدا کی مشیت کے ساتھ ہم آہنگی بھی ہو گئی۔ اس محبوب کی نظروں کے اندر ہم پسندیدہ بھی ہو گئے۔ شاباش تم نے وہی چاہا جو ہم چاہتے ہیں۔ یہی ہونا چاہیے تھا۔ کیا انداز ہے! عربی زبان کی رو سے ان آیات کے یہ معنی ہیں۔ انہی کے ہاں کے لغت اور انہی کے ہاں کی کتابوں کے اندر یہ معنی دیئے ہوئے ہیں۔ اس انداز میں جو بات آتی ہے وہ میں نے **ما تشآء ون** اپنی لغت میں لکھا ہے۔ اب بات صاف ہو گئی۔ لیکن جب یہ بات صاف ہوئی تو پھر درمیان میں سے جو ملوکیت ہے' وہ ختم ہو گئی' تم یہ نہ چاہو کہ یہ جو اقتدار کی کرسی پہ بیٹھا ہوا ہے جو یہ چاہتا ہے' تم وہ چاہو بلکہ اس کے علی الرغم جو ہم چاہتے ہیں وہ چاہو۔ یہ کہے تو کہو کہ تمہارا چاہنا نہیں ہے' خدا کا چاہنا ہے' ہم اس کے مطابق کریں گے۔ ہم وہ چاہیں گے جو ہمارا خدا چاہتا ہے اور وہ چاہتا یہ ہے کہ تمہیں اقتدار کی کرسی سے الگ کر دیا جائے لیکن یہ انہیں کیسے برداشت ہو سکتا تھا۔ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں۔

---

[1] بارالٰہا! زندگی کا وہ راستہ' سیدھا اور ہموار' ابھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں بلاخوف و خطر ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔

ہمارے ہاں کی مروجہ تفاسیر اور تراجم

عزیزانِ من! انہوں نے تفاسیر و تراجم کی رو سے آپ کا قرآن بدلا ہوا ہے آپ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھیے گا وہاں آپ کو یہی ملے گا: جس کا جی چاہے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرے۔ چاہے' تم جو چاہو لیکن تم چاہو گے ہی نہیں سوائے اس کے جو خدا چاہتا ہے۔ یہ ترجمہ آپ کو ملے گا۔ اسی ترجمے کے اوپر پھر آپ کو تفاسیر ملیں گی۔ یہی آیت یہاں ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (81:27) نوعِ انسانی کے لیے یہ تذکرہ ہے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (81:28) اس کے لیے یہ راہنمائی ہے: جو چاہتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پہ چلے' جو چاہتا ہے کہ وہ صحیح راستے پہ چلے' وہ چوراہے پہ کھڑا ہو کے دیکھے گا کہ اس نے یہ اشارہ کدھر کا دیا ہے۔ جو صراطِ مستقیم پہ جانا چاہتا ہی نہیں تو اس کے لیے فائدہ ہی کچھ نہیں ہے' آپ چوراہے پہ سائن پوسٹ لگائیے یا نہ لگائیے۔ اس نے تو اپنی مرضی سے راستہ اختیار کرنا ہے' اس اشارے کے مطابق نہیں چلنا ہے۔ اور آگے کہا ہے کہ جو وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ❶ (81:29) مروجہ تراجم و تفاسیر یہ کہتی ہیں کہ تم نہیں چاہ سکتے بجز اس کے جو خدا چاہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دو تین مقامات پہ یہ آیت ہے: تم وہی چاہو۔ پہلے یہ چیز ہے کہ تم یہی چاہو گے۔ اب چاہنا تمہارا اپنا ہے' ہم اس میں دخل نہیں دیتے۔ تمہاری مرضی ہے جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرو۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ تم صحیح راستہ اختیار کرو' تو تم بھی وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ کیا بات ہوگئی! کونسا راستہ ہم چاہتے ہیں کہ تم چاہو؟ کونسے رب کا راستہ ہم چاہتے ہیں کہ تم چاہو؟ اس کے لیے کہا کہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (81:29) اس خدا کے قانون کا جس نے تمام اقوامِ عالم کی نشوونما کا ذمہ لے رکھا ہے۔ یہ ذکر للعالمین ہے' وہ رب العالمین ہے' تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کرنے والا' نشوونما کرنیوالا' پرورش کرنے والا' وہ ہے خدا۔ تم وہی چاہو جو وہ چاہتا ہے۔ بات صاف ہوگئی۔

عزیزانِ من! سورۃ التکویر کی یہ آخری آیت ہے۔ وہ آج ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الانفطار لیتے ہیں۔ ❷

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم اپنے ذاتی رجحانات اور انفرادی مفادات کو ایک طرف رکھ کر وہی کچھ چاہو جو خدا کے قانون کا تقاضا ہے۔

❷ اسے الگ سے بعنوان "پندرھواں باب" اگلے صفحات میں دیا جا رہا ہے۔

پندرھواں باب: سورۃ الانفطار (آیات 1 تا 17)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! سورۃ التکویر آج اگست 1984ء کی 24 تاریخ کو اختتام پذیر ہوئی۔ اب سورۃ الانفطار شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 82 ویں سورۃ ہے۔

کائنات کے متعلق دو مختلف تصورات

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ٥ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ٥ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ٥ وَ اِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ٥ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ [1] (82:1-5)۔ عزیزانِ من! یہ وہی انداز ہے جو پچھلی سورتوں میں چلا آ رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پچھلی سورتوں میں میں نے بتایا تھا کہ اِن آخری دو پاروں کی سورتوں میں ایک انقلاب کی کچھ علامات بتائی گئی ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جو خارجی کائنات ہے' ہماری زمین' یہ کُرّے' یہ سورج' یہ چاند' یہ ستارے' یہ کچھ ان کے متعلق بھی یہ ہو کیونکہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **لِاَجَلٍ مُّسَمًّى** (39:5) یہ ایک معیاد تک چل رہے ہیں' انہوں نے ایک معیاد تک رہنا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ختم ہونا ہے۔ یہ ابدی نہیں ہیں۔ نہ یہ ازلی ہیں۔ خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ ایک دن یہ کچھ ان کے متعلق بھی ہو سکے گا۔ یعنی یہ کُرّے پھٹ جائیں گے' آپس میں ٹکرائیں گے' چورا چورا ہو جائیں گے' یہ ارض بھی۔ اور یہ بھی ہے کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ اس کے بعد یہ قیامت کی نشانیاں ہیں'

---

[1] (جس انقلاب کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ) فضا میں پھیلی ہوئی توانائیاں پھٹ جائیں گی (82:1)۔ اور ستارے منتشر ہو جائیں گے (یا چھوٹی چھوٹی جماعتیں بکھر جائیں گی اور صرف بڑی بڑی طاقتیں باقی رہ جائیں گی (82:2)۔ اور سمندر (یا دریا) بہ نکلیں گے۔ یعنی ان میں آمد و رفت تیز ہو جائے گی (82:3)۔ اور زمین کے دخائن کو کھود کر باہر نکالا جائے گا (82:4; 100:9) اُس وقت (انسان کی تمدنی دنیا میں بھی ایسا نظام متشکل ہو جائے گا جس میں) ہر شخص اپنے اگلے پچھلے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے گا (82:5)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیکن قرآن میں، جس انداز سے آگے بات کی ہے اس سے نظر آتا ہے کہ قرآن نے یہ کسی دَور کے آنے والے انقلاب کی علامات بتائی ہیں کہ اس زمین پر اس قسم کے واقعات ہونگے تو اس کے بعد وہ نظام آئے گا۔ وہی نظام جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے جس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا ہے۔ اس چیز کی بنیاد عدل ہے۔ ہر انسان کا ہر عمل وہ نتیجہ پیدا کرے جو نتیجہ اس میں پیدا ہونا چاہیے۔ یہ دور ہے کہ جس میں ہم کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ظلم ہے، یہ فساد ہے، یہ استبداد ہے۔ وہ ہے کیا؟ کہ ہر شخص کو اس کے عمل کا نتیجہ نہیں مل رہا۔ انسانی استبداد میں یا انسانی حکومت جو کسی بھی قسم کے اختیارات کی ہو، اس میں یہی ہوتا ہے: پھڑ لیا عملاں والیاں نوں چھڈ دے او گنہاراں نوں۔ ❶

قرآن کے نظامِ عدل کی خصوصیت

قرآن کا نظامِ عدل یہ ہے کہ اس میں کسی پر بھی کسی قسم کا جور و استبداد نہیں ہوگا، ہر چیز اس کے اپنے کام کے نتیجے کے مطابق ہوگی۔ اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی ان آیات میں جو الفاظ آئے ہیں ان سے مقصد خارجی کائنات کے اندر آنے والا کوئی انقلاب بھی ہوسکتا ہے لیکن قرآن نے ان شہادات کے بعد پچھلی آیتوں میں یہ بات کہی ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا، زمین ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی، اس کے بعد یہ ہے کہ پھر انسان اپنے اپنے عمل کا صحیح نتیجہ سامنے پائے گا۔ ٹھیک ہے، قیامت کا دن ہے، اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ وہاں نتائج آئیں گے لیکن یہ نہیں ہے کہ یہ قیامت تک کی بات ہے۔ جب بھی خدا کے قانون کے مطابق یہاں کوئی معاشرہ متشکل ہوگا، اس کی پہلی علامت یہ ہوگی کہ وہاں عدل ہوگا، دھاندلی نہیں ہوگی اور قرآن نے جو یہ علامات بتائی ہیں اس کے بعد کہا یہ ہے کہ پھر اس کے بعد دھاندلی نہیں ہوگی، عدل ہوگا، تو جس پہ میں اس کو ترجیح دیتا ہوں کہ یہ آیات جو قرآن میں آخری پاروں میں آئی ہیں، ان سے یہ دیکھا جائے کہ آخری دور میں وہی نظام، جو صدرِ اول میں قرآن نے متشکل کیا تھا، اسی قسم کا نظام بڑے وسیع پیمانے پر آئے گا اور اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ عدل ہوگا، دھاندلی نہیں ہوگی۔ اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ وہی آیا ہے۔ تو میں ان الفاظ کے معنی کے لیے مجازی معنی و مفہوم کو ترجیح دیا کرتا ہوں، لیکن اگر کوئی دوسرے معنی لینا چاہتا ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ جی! قربِ قیامت کے نزدیک یہ چیزیں ہونگی تو ٹھیک ہے میں ان میں مخل نہیں ہوتا مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ وہ جو عرب لوگ ہیں، ان کے ہاں عربی زبان کے اندر بھی یہ مجازی معنی ہیں، عرب وہ معنی بھی تو بڑی وسعت سے لیتے ہیں۔

الفاظ کے مجازی معنیٰ بلند حقائق بیان کرتے ہیں

عزیزانِ من! بلند حقائق کو تو بیان ہی الفاظ کے مجازی معنی میں کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً وہ شیر ہے شیر۔ تو وہ یہ شیر نہیں جو پھاڑ کھاتا ہے

---

❶ باعمل کو گرفتارِ بلا کرلیں اور بے عمل کو کھلی چھٹی دے دیں۔

بلکہ اس کے معنی ہیں کہ وہ بڑا بہادر ہے۔ یا جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ میں تو شرم سے پانی پانی ہوگیا' تو یہ نہیں ہے کہ میں بالکل پانی ہوگیا۔ یہ ان کو مجازی معنی کہتے ہیں۔ قرآن نے عربی مبین کا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ جو بسیط حقائق ہیں' Abstract Truth ہیں یعنی جو محسوس شکل میں سامنے نہیں آ سکتے' ان کو محسوس مثالوں سے' تشبیہات سے' استعاروں سے' بیان کرتا ہے' لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ ایک تشبیہ ہے جو ہم نے دی ہے' ایک مثال ہے جو ہم نے دی ہے' اس سے تم عبرت حاصل کرو۔ عبرت کے معنی ''پل'' ہوتے ہیں کہ ادھر سے اس کے اوپر سے گزر کر اصل مقام پہ پہنچ جائے۔ عربی زبان کے عجیب الفاظ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے یہی لغوی معنی ہی نہ لے لینا جیسے ہم نے یہ کہا ہے کہ وہ شیر ہے تو اس کے معنی سچ مچ کا شیر نہ لے لو۔ اسے مجازی معنی میں لو۔ اس طرح ان الفاظ کے مجازی معنی لینے سے قرآنِ کریم سمجھ میں آ تا ہے لیکن اگر کوئی لغوی معنی ہی لے تو میں اس پر اصرار نہیں کرتا۔

عزیزانِ من! الفاظ کے مجازی معنی کو ذہن میں رکھیے اور دیکھیے کہ سورۃ الانفطار میں کیا کہا جا رہا ہے۔ کہا کہ جس انقلاب کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ **اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ** (82:1) فضا میں پھیلی ہوئی توانائیاں پھٹ جائیں گی۔ **وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ** (82:2) اور ستارے منتشر ہو جائیں گے یا چھوٹی چھوٹی جماعتیں بکھر جائیں گی، اور صرف بڑی بڑی طاقتیں باقی رہ جائیں گی۔ **وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ** (82:3) اور سمندر (یا دریا) بہہ نکلیں گے یعنی ان میں آمد ورفت تیز تر ہو جائے گی۔ **وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ** (82:4) اور زمین کے دفائن کو کھود کھود کر باہر نکالا جائے گا (100:9)۔ اُس وقت انسان کی تمدنی دنیا میں بھی ایسا نظام متشکل ہو جائے گا جس میں **عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ** (82:5) ہر شخص اپنے اگلے پچھلے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے گا۔

عزیزانِ من! اب انسان کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ **يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ** (82:6) اے انسان! تو جو خدا کے قانون سے اس طرح سرکشی اختیار کر رہا ہے تو بتا کہ **مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ** (82:6) وہ کون سی چیز ہے جو تجھے خدا کی بھرپور' واجب التکریم' ربوبیت کے متعلق دھوکے میں رکھ رہی ہے اور اس کی خلاف ورزی کی جرأت دلا رہی ہے؟ کون سے خدا کی بھرپور ربوبیت کے متعلق دھوکا دے رہی ہے؟ اس کے لیے قرآنِ کریم نے خود ہی کہا کہ **الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ** (82:7) وہ خدا' جس نے (اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق) تمہیں مختلف تخلیقی مراحل سے گزارا۔ ایک کے بعد دوسری گردش دے کر حشو وزوائد کو الگ کیا اور تمہارے اخلاط وعناصر میں نہایت عمدہ توازن اور اعتدال پیدا کر دیا (95:4)۔ اور اس کے بعد **فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ** (82:8) اپنے قانونِ مشیت کے مطابق' تمہیں مناسب پیکر عطا کر دیا۔ کہا کہ **كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ** (82:9) سوچو کہ تم اُس خدا کے قانونِ مکافات (دین) کو جھٹلاتے ہو؟ لیکن تمہارے جھٹلانے سے کیا ہوتا ہے؟ کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں کچھ نہیں ہوتا؟

عزیزانِ من! اب بات بڑی اہم آ رہی ہے اور درس کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ اسے ہم آئندہ درس پر اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

عزیزانِ من! آج اگست 1984ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانفطار کی آیت 9 سے ہو رہا ہے: (82:9)۔

دین کے معنی جزا اور نتائج کے بھی ہیں

سابقہ آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ ان کی ساری مخالفت اس لیے ہے کہ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کے قائل نہیں ہیں۔ اس سے جی چراتے ہیں کیوں کہ ان کے جرائم' زیادتیاں' استبداد' غصب' سلب ونہب الغرض جو دھاندلیاں بھی انہوں نے کی ہوئی ہیں' وہ ان کے نتائج سے اپنے آپ کو مبرا سمجھتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ یہاں تو تم' اگر اس کا انتظام بھی کرلو کہ ان کا مواخذہ نہ ہو' تو بھی خدا کے نظام یا اس کے مکافاتِ عمل کے قانون کی رو سے نہ تم ان نتائج کو چھپا سکتے ہو' نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے کہ ان کے انجام سے' ان کے نتائج سے' تم مبرا ہو جاؤ۔ ابھی میں آگے جا کر عرض کرونگا کہ دین کی تو بنیاد ہی اس یقین اور عقیدے پہ ہے کہ انسان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوگا' اسے وہ نتیجہ بھگتنا پڑے گا بلکہ جو لفظ دین ہے اس کے ایک معنی جزا کے بھی ہیں' اعمال کے نتائج کے بھی ہیں۔ یہ کہا کہ یہ جو اس قسم کی حجتیں کرتے ہیں' مختلف اعتراضات کرتے ہیں مخالفتیں کرتے ہیں' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ **كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ** (82:9) یہ قانونِ مکافاتِ عمل سے جی چرا رہے ہیں' اس سے انکار کر رہے ہیں' اسے ماننا نہیں چاہتے۔ یہ ہے ان کی مخالفت کی بنیاد۔ ان کے ذہن میں یہ ہے کہ ایک تو سینکڑوں کام ایسے ہوتے ہیں جسے کہ کوئی دیکھتا ہی نہیں ہے جو ہم کر گزرتے ہیں' پھر ایسی صورت بھی ہے کہ اگر کہیں تفتیش بھی کی جاتی ہے' اس میں بھی ہم ایسا انتظام کر لیتے ہیں کہ گرفت میں نہ آسکیں اور پھر آگے جو معاشرے کا نظامِ عدل ہے اس کی رو سے تو پھر لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ یہ بڑے بڑے لوگ کس طرح کسی گرفت میں بھی نہیں آتے خواہ قوانین کتنے ہی زیادہ محفوظ کیوں نہ بنے ہوئے ہوں۔ ان چیزوں سے انہوں نے اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اسے کوئی دیکھنے والا ہی' نہیں پکڑنے والا ہی نہیں' تو اس کے نتائج اور عواقب ہمیں کیسے بھگتنے پڑیں گے؟ کہا کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ **وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ o كِرَامًا كَاتِبِيْنَ o يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ** [1] (82:10-12)

قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ بات مثالوں کے ذریعے سمجھاتا ہے جسے ہم تمثیلاً کہتے ہیں' تشبیہاً کہتے ہیں۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ یہ جو قانونِ مکافاتِ عمل ہے اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی لکھنے والا ہو' کوئی ساتھ پہرہ دینے والا ہو' تبھی وہ گرفت میں آسکیں' اگر ایسا نہ ہو تو وہ گرفت میں ہی نہ آسکیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کا جو دنیاوی نظام ہے' اس میں ایسا ہوتا ہے۔

---

[1] اس نے تم پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں...... نہایت معزز اور امین...... جو کچھ تم کرتے ہو' انہیں اس سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے ریکارڈ (Record) کرتے رہتے ہیں۔ (اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کراماً کاتبین کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کا تو نظام ہی اور ہے لیکن وہ سمجھا تا اسی طرح سے ہے: پہلے تو ان سے کہو کہ ہماری طرف سے ان پر محافظ مقرر ہیں۔ یہ وہی ہے جو ہمارے ہاں عام عوام میں عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے مونڈھوں ❶ پہ دو فرشتے ہوتے ہیں ''جنہیں'' کراماً کاتبین' کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں' پنجاب کے دیہات میں' تو ان کے لیے کراماً کاتبین کا لفظ ہی آتا تھا کہ وہ بیٹھے رہتے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔ یہ کراماً کاتبین کا لفظ یہاں آیا ہے۔ کہا کہ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (82:10) اس نے تمہارے اوپر محافظ مقرر ہیں۔ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (82:11) ریکارڈ کرنے میں نہایت معزز اور امین۔ وہ لکھتے رہتے ہیں۔ وہ کاتبین ہیں یعنی لکھنے والے ہیں اور اس کے ساتھ یہاں لفظ کراماً لگایا ہے۔ یہاں لکھنے والوں کا ہمیں پتہ ہے کہ وہ کس کس قسم کی رپورٹنگ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں روز یہ ہوتا ہے' اخبار میں بیان چھپ جاتا ہے' وہ دہائی دے رہا ہے کہ میں نے یہ کہا ہی نہیں تھا جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لاؤ وہ ٹیپ لاؤ' اب کہاں ہے؟ دوسرا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ نہیں' یہی تھا جو کچھ لکھا ہے۔ اور پھر بیانات کی رو سے عدالتوں میں جو کچھ ہوتا ہے' بیانات کی رو سے تھانوں میں جو کچھ ہوتا ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ روز یہ جھگڑے پڑتے رہتے ہیں کہ لکھنے والے ایسے ہیں' حتیٰ کہ غالب ❷ کو تو اس کی شکایت تھی کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ یہاں کے نظامِ عدل میں کوئی اپنا آدمی ساتھ ہونا چاہیے جو دیکھے کہ کیا لکھ رہا ہے۔ مگر یہاں تو دوسروں کے لکھے پر ہم پکڑے جاتے ہیں۔ اس ❷ کے کہنے کا انداز شوخ تھا۔

قرآنِ کریم نے کاتبین کے ساتھ کراماً کہہ دیا یعنی جو غلط بیانی نہ کریں' جھوٹ نہ بولیں' بڑے معزز ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں یہ لفظ ''ک ر م'' ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جسے ہم کرم کہتے ہیں۔ یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے۔ کسی میں انسانیت کی جتنی بھی حسنات اور خوبیاں ہونی چاہئیں وہ اس ایک لفظ کے اندر ہوتی ہیں۔ تو یہاں قرآن یہی ایک لفظ لایا: كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ❸ (82:11)۔ رسول کے متعلق بھی قرآن یہی لفظ لایا ہے' یہاں لفظ کاتبین لایا ہے۔ بات اتنی ہے کہ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (82:12) وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ یہاں تو یوں نظر آیا کہ جیسے واقعی کوئی لکھنے والے ہیں جو لکھتے ہیں' ہر شخص کے اوپر وہ مقرر ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے

---

❶ کندھوں

❷ اسد اللہ خان غالب (1797-1869)

❸ (جو کچھ تم کرتے ہو) اسے ریکارڈ کرنے میں نہایت معزز اور امین ہیں۔

ہو۔ بات تو یہی کہنی تھی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآن کا مفہوم تو تصریفِ آیات سے سمجھ میں آتا ہے کہ دوسرے مقام پہ اس نے اس کی وضاحت کس طرح کی ہے۔ وہ خود وضاحت کر دیتا ہے اور یہ جتنے بھی Abstract Truth (بسیط حقائق) ہیں، غیر محسوس ہیں، انہیں تو محسوسات کے ذریعے سمجھاتا بھی ہے اور پھر وہ غیر محسوس بات بھی سامنے لے آتا ہے کہ کہیں سچ مچ یہ نہ سمجھ لینا کہ واقعی لکھنے والے قلم دوات لے کر، کاغذ لے کر، بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ لکھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ یہ بات اس طرح سے نہ سمجھ لینا۔ دوسرے مقام پہ وہ سمجھا دیتا ہے کہ اصل چیز کیا ہے؟

آج کے علم النفس یعنی سائیکالوجی کی تحقیق

عزیزانِ من! اصل چیز جو چودہ سو سال پیشتر کسی اِنسان کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتی تھی، آج علم النفس (سائیکالوجی) کے ماہرین، آہستہ آہستہ تحقیق کے بعد، اس پہ پہنچے ہیں کہ انسان کے جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی Personality یا ذات یا شخصیت کہا جاتا ہے۔ یہ غیر مرئی، غیر محسوس ہے لیکن انسان کا ہر محسوس عمل ہی نہیں بلکہ اس کا خیال، خواہش، ارادہ، آرزو تک بھی، جو اس کے دل میں گزرتی ہے، انسان کی ذات پر اس کا بھی اثر ہوتا ہے، انسان کا ہر خیال اور اس کا ہر عمل اس کی ذات پر ایک نقش مرتسم کرتا ہے۔ جس قسم کا وہ خیال، ارادہ یا عمل ہوگا اس قسم کا نقش وہاں ہویدا ہو جائے گا اور یہی وہ انسان کے نقوش ہیں جن کو انسان کا اعمال نامہ کہا جاتا ہے۔ جسم یہاں موت کے بعد ختم ہو جائے گا، انسان کی ذات ان نقوش کو اپنے ساتھ لیے آگے چلے گی۔ اس سطح زندگی پر وہ نقوش ہماری نگاہوں سے پنہاں ہوتے ہیں، ہم ان کو نہیں دیکھ پاتے لیکن اگلی سطح زندگی پہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ نقوش بارز ہو کر، متمیز ہو کر، نمایاں ہو کر، ابھر کر، ہر ایک کے سامنے آ جائیں گے۔ یوں اس کا ہر عمل اور ارادہ جو محفوظ کیا گیا ہوگا، وہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر اس کے نتائج اُسے بھگتنے ہونگے۔ نتائج بھی سامنے آئیں گے بھگتنا کیا؟ انسان کی ذات ہی اس کو بھگتتی ہے۔

اب انسانی ذات کی یہ بات الگ سے آ گئی لیکن میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج علم النفس بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس کا اثر انسان کی ذات پر ہوتا ہے اور انسان کی ذات اس کے جسم کے ساتھ مرتی نہیں ہے۔ یہاں تک تو یہ سب لوگ پہنچ چکے ہیں۔ بات دُور چلی جائے گی ورنہ بات یہی ہے کہ جنگ (Jung: 1875-1961) [1] بھی Survival (بقا) تک پہنچا تھا کہ مرنے کے بعد وہ ذات تو باقی رہتی ہے۔ وہ Mortality (فنا پذیری) کی تفتیش کر رہا تھا کہ کیا وہ ابدی ہوتی ہے۔ یہ چیز تو آج کا علم النفس بھی طے کر چکا ہے کہ انسانی عمل کا اثر انسان کی ذات پر ہوتا ہے جسے Personality (شخصیت) یا سائیکی (Psyche) کہتے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس

---

[1] جنگ (Jung) سوئٹزر لینڈ کا طبیب نفسی اور تحلیل نفسی میں السابقون الاولون۔ اس کا مشہور زمانہ کام Psychology of Unconscious (1912) (نفسیاتِ غیر شعوریہ) ہے۔

کے اوپر محافظ مقرر ہیں' وہ اس کے اعمال لکھتے جاتے ہیں' وہ کراماً کاتبین ہیں۔ اس طرح وہ ایک رجسٹر مرتب کر دیتے ہیں جو ہمارے ہاں آئے گا۔ میں نے کہا کہ وہ تو ایسا ہی انداز ہے جیسا کہ عدالت کا بھی ایک انداز ہوتا ہے کہ عدالت ہوگی' خدا جج کی حیثیت سے بیٹھا ہوگا' اور اس ملزم کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لائیں گے' کچھ آگے ہونگے' کچھ پیچھے ہونگے' گواہ بلائے جائیں گے۔ وہ ایسا نقشہ بتاتا ہے جیسا ہمارا روزمرہ کا ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ بات تمثیلاً بیان کرتا ہے۔ کراماً کاتبین بھی تمثیلاً بیان کیا ہے۔ دوسرے مقام پہ بھی ہے۔ عزیزانِ من! یہ حوالے لکھتے جایئے' بڑے اہم حوالے ہیں' پھر یہ آپ کے سامنے نہیں آئیں گے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ وَ کُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیۡ عُنُقِہٖ (17:13) ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ کیا انداز ہے سمجھانے کا! فرق یہ ہے کہ یہاں وہ اعمال نامہ لپٹا ہوا ہے' اس لیے اس کے حروف اور نقوش اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں آتے۔ وَ نُخۡرِجُ لَہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ کِتٰبًا یَّلۡقٰہُ مَنۡشُوۡرًا (17:13) ❶۔ بس اتنی سی بات ہی ہے کہ وہ جو یوں لپٹا ہوا ہے جسے آپ قیامت یا محشر یا حشر کہتے ہیں' اس میں اسے یوں کھول دیا جائے گا۔ اب تو وہ رواج نہیں رہا' ورنہ پہلے جتنے زیادہ ضروری Documents یعنی دستاویزات ہوتی تھیں ان کو اس طرح گول لپیٹا جاتا تھا اور وہ جو ٹین کی بنی ہوئی نلکیاں ہوتی تھیں ان کے اندر ان کو رکھا جاتا تھا۔ یہاں کہا کہ یہ اعمال نامہ یوں سمجھیے کہ آج لپٹا ہوا ہے' قیامت کے دن اس کو یوں کھول دیا جائے گا۔ کیا انداز ہے بات کرنے کا! اور پھر آگے غالب ❷ کو بھی بتایا گیا ہے کہ تم فرشتوں کے لکھے پر نہیں پکڑے جاتے' وہ جو کھول دیا جائے گا' گویا وہ تمہارا اپنا لکھا ہوا ہے جو اب لپٹا ہوا ہے' اس وقت اسے کھول دیا جائے گا۔

سب کچھ انسانی ذات خود کرے گی

عزیزانِ من! ظہورِ نتائج کے وقت کہا جائے گا کہ اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ (17:14) اپنے نامہ اعمال کو تو خود ہی پڑھ۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی دوسرا پڑھے اور تم پھر یہ کہو کہ نہیں صاحب! میں نے "غلطی نہیں کی ہے"' وہاں یہ لکھا ہوا نہیں ہے' اس نے غلط پڑھ دیا ہے یعنی پھر وہاں دہائی مچ جائے۔ یہ بات نہیں ہے۔ بات تو یہ کہنے کی ہے کہ یہ سب کچھ تیری ذات ہی کرے گی' کوئی غیر' کوئی دوسرا' اس میں نہیں آئے گا۔ یہ تصور نہیں ہے کہ کوئی اور ان چیزوں کو کہے گا۔ وہ کھلے گا تمہارا ہی اعمالنامہ جو لکھا ہوا ہوگا۔ آج لپٹا ہوا ہے اُس دن کھول دیا جائے گا۔ تمہیں کہا جائے گا کہ خود پڑھو۔ اب یہ بات کہ خود پڑھنے کے بعد اس کا انجام نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کی Accountability (جواب دہی) کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا (17:14) تم سے کہا جائے گا کہ تم خود بتا دو کہ تمہارا کیا انجام ہونا چاہیے۔ خود تمہارا یہ نفس کا لفظ یہاں آ گیا ہے۔ یہ وہی ہے جسے آج Personality یا سائیکی (Psyche) کہتے ہیں' یہ علم

---

❶ ظہورِ نتائج کے وقت وہ اعمالنامہ ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ مرزا اسداللہ خان غالب (1797-1869ء): پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا۔

النفس کی زبان میں ہے۔قرآن کے اندر، عربی زبان میں بھی، اس کے لیے نفس کا لفظ آتا ہے۔اب یہاں وہ ساری بات قرآن کھل کر کہہ گیا ہے کہ یہ سارا سوال انسان کے نفس، اس کی ذات کا، ہے جس پہ یہاں یہ تمام اثرات مرتسم ہوتے رہتے ہیں، وہ انہیں مرنے کے بعد اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔یہی ہے جسے وہاں زندگی نصیب ہوگی اور یہی صورت ہے کہ یہاں یہ آنکھوں سے اوجھل ہے وہاں وہ چیز آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔لپٹا ہوا اعمال نامہ مــنشــورًا یعنی کھل کر سامنے آجائے گا اور پھر تمہیں خود کہا جائے گا کہ اپنے اعمال نامے کو آپ پڑھو، اور اتنی سی بات بھی نہیں کہ صرف اسے پڑھو ہی، بلکہ یہ کہا کہ اس کے بعد بتاؤ کہ تمہارا کیا حشر ہونا چاہیے؟ تم سے ہی پوچھا جائے گا کہ اپنے اعمالنامے کا خود حساب کرو، قانونِ مکافاتِ عمل تو درحقیقت یہ ہے، اس کا پروسیس، اس کا طریق یہ ہے۔سمجھانے کے لیے یہ بات کہی گئی کہ کراماً کاتبین ہیں۔

عزیزانِ من! اب یہاں دو گروہ ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور انسانوں کو بھی دو ہی گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، جسے ہم نیک اور بد کہتے ہیں، جسے ہم شریف اور بدمعاش کہتے ہیں، جنہیں جہنمی اور جنتی کہا جائے گا۔قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد جب یہ حساب ہوگا تو اِنَّ الۡاَبۡـرَارَ لَـفِیۡ نَعِیۡمٍ o وَ اِنَّ الۡـفُـجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ (1) (82:13-14)۔یہاں دو لفظ ''ابرار اور نعیم'' آئے ہیں۔لفظ ''نعیم'' کے اندر ہر قسم کی نعمتیں اور آسائشیں آگئیں۔''نعم'' اصل میں ان کے ہاں ایک بہت زیادہ لطیف اور نرم و نازک سا، جیسے پھول کی پتیاں ہوتی ہیں، ایک پودا ہوتا تھا۔ہر قسم کی آسائشیں اور نعمتیں اور زندگی کی خوشگواریاں کہی جاسکتی ہیں، وہ اس لفظ کے اندر آجاتی ہیں۔عربی زبان میں نعیم یہ ہے۔دوسرا لفظ ہے ابرار۔یہ ''ب رر'' سے ہے جس کے معنی ہیں: وسعت، فراخی اور کشادگی۔اس سے لفظ ابرار (2) ہے۔یہ ابرار ہو گیا۔اب یہ دیکھیے کہ دو الفاظ آئے: ابرار نعیم میں ہونگے اور فجار جحیم میں ہونگے۔

قرآن کا ایک ایک لفظ اپنے اندر الگ الگ مفہوم لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے کہا ہے ہمارے ہاں تو وہی نیکی اور بدی دو الفاظ ہیں۔قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے مومنین متقین مصلحین محسنین اور اس قسم کے اور متعدد الفاظ آتے ہیں۔ہمارے ہاں ہر ایک کا ترجمہ نیک کر دیا جاتا ہے۔اس کے مقابلے میں فاسقین ظالمین کفار مشرک ہیں۔یہاں یہ فجار آیا ہے۔جسے فاجر کہتے ہیں۔یہ مختلف الفاظ آتے ہیں۔ہمارے ہاں اس کے لیے گناہگار لفظ آجاتا

---

(1) اس قانون کے مطابق، جو لوگ انسانی زندگی میں وسعت اور کشادگی پیدا کرتے ہیں، آسائشوں میں رہیں گے اور جو عالم انسانیت، اور خود اپنی ذات میں انتشار پیدا کرتے ہیں ان کی نشوونما رک چکی ہوگی۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

(2) بِـرٌّ وہ کام ہوں گے جن سے کشادگی کی راہیں کھل جائیں، جن سے انفرادی طور پر نگاہ میں فراخی، قلب میں کشادگی اور انسانی ذات میں وسعت پیدا ہو جائے اور اجتماعی طور پر سامانِ زیست میں کثرت اور وسعت آجائے معاملات میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا جائے۔ایسے افراد ابرار کہلاتے ہیں۔اسی لیے قرآنِ کریم میں بر اور تقوی کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ (لغات القرآن۔پرویز ص 311)

ہےتو گویا یہ مختلف الفاظ جو قرآن نے استعمال کیے۔ یہ برائے وزنِ بیت ہیں۔ یوں سمجھیے جیسے کسی نے شاعری کی ہے۔ شاعری میں تو یہ ہوتا ہے کہ وزن کے لیے' کافیے کے لیے' ردیف کے لیے کوئی الفاظ لانے پڑتے ہیں۔ یوں ذہن میں آتا ہے کہ قرآن کچھ اس طرح سے مختلف الفاظ لے آیا ہے' جیسے شاعری میں' مصرعے میں' اگر شہد رکھنے سے وزن پورا نہ ہوتا ہو' تو اس کے لیے انگبین رکھ لیتے ہیں تاکہ وزن پورا ہو جائے' اس کے معنی ایک ہی ہوتے ہیں۔ گویا کچھ اس قسم کی شعر و شاعری کی کتاب سمجھ رکھا ہے کہ کہیں قرآن نے مصلحین لکھ دیا' کہیں محسنین لکھ دیا' کہیں مقربین لکھ دیا' کہیں مومنین لکھ دیا' کہیں متقین کہہ دیا' کہیں فاسقین لکھ دیا' کہیں ظالمین لکھ دیا کہ وہ اس طرح سے ہے۔ یہ کچھ کیا ہوا ہے۔ **معاذ الله معاذالله**

قرآن کا ایک ایک لفظ اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے پہاڑ کی طرح اٹل ہے' اور وہیں وہ آ سکتا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں آ سکتا' اور اس کا دوسرے الفاظ سے الگ مفہوم ہے۔ ہر مقام پہ جہاں یہ الفاظ آئیں' نہ تو یہ ہو کہ ہر لفظ کے معنی نیک بندے کر دیئے جائیں اور مقابل میں ہر لفظ کے معنی گناہگار کر دیئے جائیں۔ گناہ تو عربی کا لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ تو فارسی سے ہے۔ نیک بھی عربی کا لفظ نہیں ہے' نیکی بھی عربی کا لفظ نہیں ہے۔ یہ تو سارا' جتنا بھی' عجمی اسلام ہے وہ سارے اس کے اشتقاق ہیں اور اس کے مفاہیم' اس کے معنی' ہمارے ہاں وہاں سے آئے ہوئے ہیں۔

یہاں لفظ ابرار آیا تھا۔ میں نے اس لیے یہ بات چھیڑی کہ یہاں یہ آیت ہے: **اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ o وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ** [1] (82:13-14)۔ قرآنِ کریم کو سمجھنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ وہ متضاد چیزیں لاتا ہے۔ ادب اور انشا کے اندر یہ بڑا بلند اسلوب ہوتا ہے کہ ایک شے کے متضاد شے کو سامنے لا کر اس کا مفہوم واضح کیا جائے جیسے نور اور ظلمت' اندھیرا اور روشنی۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ ہمیشہ ان دو چیزوں کو ایک دوسرے کے سامنے لائے گا۔ یہ چیز جو غالب (1797-1869) کہتا ہے کہ ''لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی'' [2] اس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرح تضاد (Juxtaposition) سے' متضاد چیز سامنے لانے سے' بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے' ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ قرآن کے جہاں یہ الفاظ آئیں' آپ دیکھیے گا کہ وہ متضاد الفاظ لاتا ہے۔ یہاں ابرار کے مقابلے میں فجار لایا ہے۔ اب ہمارے ہاں پھر وہی دشواری ہے کہ دونوں کے معنی نیکوکار اور گناہگار کر لیے جاتے ہیں۔ یہ جس کو فجار کہا، فاجر ہی کی جمع ہو گئی۔ اس کا ترجمہ بھی گنہگار بدکار کیا جاتا ہے یا ترجمے میں کچھ اس قسم کے الفاظ آتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہاں یہی لفظ کیوں آیا؟ قرآن میں اس لفظ ابرار کے مقابلے میں فجار آ رہا ہے۔ یہ فجار بڑی عظیم چیز ہے۔

---

1. خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق' جو لوگ انسانی زندگی میں وسعت اور کشادگی پیدا کرتے ہیں' آسائشوں میں رہیں گے۔ اور جو عالم انسانیت' اور خود اپنی ذات میں انتشار (Disintegration) پیدا کرتے ہیں' ان کی نشوونما رُک چکی ہوگی۔ (2:27)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا (غالب)

عزیزانِ من! فجر کے معنی ہوتا ہے "کسی شے کو جسے Compact وحدت میں رہنا چاہیے' Integrated (اکملیت میں) رہنا چاہیے' اسے الگ الگ کر دینا' ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' پھاڑ کے رکھ دینا" اسے آپ فسق وفجور' فاسق وفاجر کہتے ہیں۔ اسے چھوڑ یئے' فاسق کے معنی تو پھر عرض کرونگا۔ لفظ فجار کے معنی کیا ہیں؟ قرآن یہ لفظ کیا لایا ہے؟ فاجر کون ہیں؟ فجور کیا چیز ہوتی ہے؟ ابھی بتایا ہے کہ اس کے معنی تو پھاڑ دینے کے ہیں' الگ الگ کر دینے کے ہیں۔ اور یہ بہت بڑا جرم ہے۔ یہ کسی چیز کا الگ الگ کر دینا ہے' سورۃ البقرۃ کے شروع میں ہی ہے کہ اَلَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ (2:27) خدا کے ساتھ جو معاہدہ کیا اُسے چھوڑتے ہیں۔ اگلی بات ہے کہ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ (2:27) جنہیں خدا نے جوڑنے کا حکم دیا تھا یہ انہیں قطع کرتے ہیں' الگ الگ کرتے ہیں۔

سب سے بڑا جرم اور سب سے احسن عمل

عزیزانِ من! بہت بڑا سنگین جرم بتایا کہ جنہیں خدا نے جوڑنے کا حکم دیا تھا انہیں یہ قطع کرتے ہیں' الگ الگ کرتے ہیں۔ قرآن نے کس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا تھا؟ قرآن کی ایک بنیادی تعلیم ہے جسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور وہ ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) پوری کی پوری انسانیت ایک واحد برادری ہے' ایک عالمگیر برادری ہے۔ یہ ہے جو مشیت یا منشائے خداوندی ہے کہ ایسی نوعِ انسان کو اس طرح کرہ ارض پہ رہنا چاہیے کہ پوری انسانیت ایک برادری' ایک قوم' ایک ملت ہو' اس میں کسی قسم کا کوئی تفرقہ نہ ہو' کوئی اختلاف نہ ہو' کوئی قطع کی ہوئی چیز نہ ہو۔ یہ كَانَ النَّاسُ کے لیے ہے لیکن انسانوں نے پھر باہم اختلاف کیا تو: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ (2:213) خدا نے انبیائے کرام کو اس مقصد کے لیے بھیجا کہ انسان جو اختلاف کر کے' آپس میں بٹ گئے ہیں' ان میں تفریق پیدا ہو گئی' یہ انبیائے کرام اس تفریق اور اختلاف کو ختم کر کے پھر سے ان کو جوڑ دیں۔ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ بتایا۔ یہ سلسلہ رشد و ہدایت وحی اور رسالت اس لیے ہے کہ انسانوں کے اندر اختلاف اور تفریق پیدا نہ ہو' یہ ایک برادری بن کر رہیں۔ یہ تھا جس کے لیے کہا کہ خدا نے جنہیں آپس میں جوڑنے کا حکم دیا تھا' یہ انہیں قطع کرتے ہیں' پھاڑتے ہیں' ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔ یہ ہیں جنہیں فاجر یا فجار کہا جاتا ہے یعنی تفرقہ پیدا کرنے والے' نوعِ انسانی کی ایک برادری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے۔ اگر آج بھی آپ دیکھیں' تمام مصیبتوں اور جہنمی مصائب کی بنیاد یہ ہے کہ انسانیت قوموں کے اندر تقسیم ہو چکی ہے۔ کیا ہو رہا ہے عراق اور ایران کے اندر؟ [1] دونوں انسان بنیادی طور پر' نسلی طور پہ بھی آگے جا کر دیکھیے تو قریباً برابر' وہاں تو کچھ مذہب کا بھی اشتراک پایا جاتا ہے' زمین کے ساتھ زمین ملتی ہے۔ کونسی چیز ہے جس نے قومیت میں اختلاف پیدا کیا؟ ایرانیوں کی الگ قومیت' عراق کی قومیت الگ۔

---

[1] 1980 تا 1988 کے دوران یہ عراق اور ایران کے درمیان ہونے والی جنگ کی طرف اشارہ ہے۔

اس قومیت کی بنیاد پر الگ مملکتیں' مملکتوں کے مفاد الگ۔ مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے' ٹکراؤ سے جنگ ہوتی ہے۔ یہ ایسی جنگ ہے کہ اتنے سال ہو گئے ہیں سلجھنے ہی نہیں پا رہی' اور ساری دنیا کے اندر اس وقت خوف و ہراس اور تشویش پھیلی ہوئی ہے' سپر پاورز بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ وہ دونوں انسان ہیں۔ کیا فرق ہے؟

قومیت کا تصور ہی جنگ کی بنیاد ہے

عزیزانِ من! وہ فرق یہ ہے کہ آج کرہ ارض کے اوپر بس صرف لکیریں کھینچی ہوئی ہیں' وہ بھی کوئی خدا کی کھینچی ہوئی نہیں ہیں' آسمان کی کھینچی ہوئی نہیں ہیں' خود ہی کھینچی ہوئی ہیں۔ وہ کہیں آگے بڑھ جاتی ہیں' کہیں پیچھے بھی ہٹ جاتی ہیں' مٹ بھی جاتی ہیں' نئی بھی کھینچی جاتی ہیں۔ خود لکیر کھینچتے ہیں اور اس ایک لکیر کے کھینچنے سے وہ دونوں انسانیت کی برادری کے دو افراد رہتے ہی نہیں' وہ کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک قوم دوسری قوم [1] کے مقابلے میں کھڑی ہے۔ دونوں انسان ہیں۔ بڑی کوششیں کرتے ہیں کہ صاحب! Basic Human Rights (بنیادی حقوقِ انسانی) مقرر کیے جائیں۔ آپ انسانیت کے قانون چارٹر کے اندر لگاتے رہیے' قوموں کے اندر تو پھر وہی قومیت ہی ہے' ایک ملک نے جو لکیر کھینچی ہے دوسرے ملک کا انسان اس ملک میں جا نہیں سکتا' وہاں کا شہری نہیں ہو سکتا' وہاں کا باشندہ نہیں بن سکتا' اتنا کچھ یگانگت کے باوجود دھکے دے کر نکالے چلا جاتا ہے' یعنی یہ اخوتِ اسلامی کے بعد کی ساری بات ہے۔

بہاریوں کی زبوں حالی

یہی ہمارے ہاں مشرقی پاکستان میں جس کے لیے اب بہر حال لفظ وہی مشرقی پاکستان ہی ذہن میں آتا ہے' بدقسمتی سے وہاں تقسیم کے زمانے میں کچھ بہار سے لوگ آئے تھے وہ وہاں آ کر بس گئے۔ وہ بھی مشرقی پاکستان تھا اور پاکستانی کی حیثیت سے وہاں بس گئے۔ اب اس کے بعد جو وہ الگ ہوا' بنگلہ دیش بنا' تو خود بنگلہ دیش والوں نے کہا کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ چار پانچ لاکھ کے قریب اس بری حالت میں ہیں۔ جو لوگ وہاں سے دیکھ کر آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان بیچاروں کے پاس چھت تک نہیں' زندہ رہنے کے لیے کھانے کو ٹکڑا تک نہیں ہے۔ بنگلہ دیش والے کہتے ہیں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں' یہ بنگالی نہیں ہیں' یہ بہاری ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے پاکستان قبول کیا تھا' پاکستانی ہیں۔ یہ جو ہم مغربی پاکستان والے ہیں' کہتے ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ ارے کوئی اور رشتہ نہیں تو قرآن نے کہا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) انسانیت کے رشتے کے اوپر ہم تو تمام نوعِ انسانی کو ایک ملت بنانا چاہتے ہیں۔ سوچیے کہ اگر ایک ملت بن جائے تو نوعِ انسانی اس صورت میں دنیا میں ہی جنت نہ بن جائے جو آج جہنم بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ ہیں کہ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (2:27) خدا نے جنہیں ملانے کا حکم دیا تھا یہ ان کو قطع کرتے ہیں' توڑتے ہیں' الگ الگ

---

[1] ایران اور عراق

کرتے ہیں' قومیتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور پھر جس قوم کو' جس ملت کو' جس امت کو' سب سے پہلے یہ ہدایت نامہ دیا گیا اور حکم دیا گیا تھا کہ تم نے انہیں جوڑنا ہے۔ آج ہماری کیفیت سیکولر حکومتوں سے بھی زیادہ بدتر ہے۔

سیکولر والوں سے بھی بدتر سلوک

یہ سیکولر حکومت والے اپنے دائرے' اپنی مملکت کے اندر' جتنے بسنے والے لوگ ہوتے ہیں' انہیں ایک قوم شمار کر لیتے ہیں' ان میں تو پھر کوئی تفرقہ نہیں ہوتا۔ یہ مسلمان نام رکھنے والے' آپ اپنے ہاں دیکھ لیجئے' کہ ایک مملکت کی بنا پر محدود ہوتے ہوئے بھی ہم دوسروں سے لڑ رہے ہیں: افغانستان کی طرف سے' وہ بھی مسلمان' ہم بھی مسلمان لیکن دو الگ قومیں ہیں' لڑ رہے ہیں۔ ایران مسلمان' ہم بھی مسلمان' عراق بھی مسلمان' لڑ رہے ہیں۔ بہرحال ایک مملکت کے اندر تو ایک وحدت ہو جانی چاہیے۔ یہاں سنی ہیں' شیعہ ہیں' وہابی ہیں' اہلحدیث ہیں' وہ دیوبندی ہیں' یعنی ایک قوم کے اندر پھر مذہب نے تفرقہ پیدا کر دیا۔ قیامت ہے' جس امت' جس ملت کو' یہ کہا گیا تھا کہ نوعِ انسانی کو تم نے ایک برادری بنانا ہے' سیکولرازم والے اپنی مملکت کے اندر تو ایک قوم بن جاتے ہیں' یہ مسلمان نام رکھانے والے ایک مملکت کے اندر بھی ایک قوم نہیں ہیں۔ ایک ایک مسجد کے اوپر فساد ہوتا ہے' دنگا ہوتا ہے' لڑائیاں ہوتی ہیں' پولیس آتی ہے' تالے پڑ جاتے ہیں' عدالتوں میں چلے جاتے ہیں' جیل خانے میں چلے جا رہے ہیں۔ کونسی قوم ہے یہ' جسے کہا گیا تھا کہ پوری انسانیت کو ایک برادری بنانا ہے' جسے ایک امت واحدہ کہہ کے پکارا گیا تھا؟ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) پوری انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں فاجر اور فجار کا عمل جاری ہے

عزیزانِ من! ان کی حالت یہ ہے کہ الحاد و بے دینی کی بنا پہ جو وحدت دنیا کی قوموں میں یعنی سیکولر قوموں کی طرح پیدا ہو رہی ہے' ان بدبختوں کے ہاں وہ اتحاد بھی نہیں پیدا ہو رہا' وہ وحدت بھی نہیں پیدا ہو رہی۔ ان کے ہاں قومیت بھی ایک نہیں' مذہب نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔

بات فجار سے چلی تھی۔ عربی زبان کی رو سے' اور قرآن کی اصطلاح میں' فاجر اور فجار اس قوم کو کہا جائے گا جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے' جو آپس میں تفرقے پیدا کر دے' اختلافات پیدا کر دے۔ اس کے مقابلے میں اب ابرار کے معنی سمجھ میں آ رہے ہیں۔ بر کے معنی تو صرف نیکی کیا جاتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! بر کے معنی ہوتا ہے کشادا اور وسعت۔ ابرار وہ ہو گیا جو ان تنگ ناؤں سے نکل کر پوری کی پوری انسانیت کو متحد کرے اس سے ان کے اندر وسعت ہو' وہ اپنا دامن اتنا وسیع کر لیں کہ تمام انسان اِن کے تابع آ جائیں۔ انہیں ابرار کہیں گے۔ خدا کی اپنی ایک صفت بھی البر ہے۔ یہ ایک جماعت تیار کی گئی تھی: أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:109)۔ انبیائے کرام

بھیجے گئے تھے اس مقصد کے لیے کہ یہ چھوٹے چھوٹے دائروں سے نکل کر' ٹکڑوں سے نکل کر' اپنے اندر اتنی وسعت پیدا کریں کہ انسانیت اس کے اندر سمو جائے۔ جتنی زیادہ وسعت پیدا کرنے والے افراد یا قوم یا کوئی ملت ہوگی اتنے ہی زیادہ وہ ابرار میں آئیں گے اور نعیم میں آئیں گے' اختلافات اور تفرقے جتنے کم ہونگے اتنی ہی آسائشیں بڑھیں گی اور اگر نوعِ انسانی ایک برادری بن جائے تو یہ دنیا جنت بن جائے اور بنے گی کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) آخرالامر انسانوں نے اس پہ آنا ہے' ایک عالمگیر امت بننا ہے۔ اب بھی آ رہے ہیں مگر ہم نہیں۔

آج کا دانش مند چیخ اُٹھا ہے

عزیزانِ من! ہم تو مذہب کی گروہ بندیاں بھی نہیں توڑ سکے' انسانیت کی گروہ بندیاں ہم کیا توڑ سکیں گے۔ وہ سیکولر قومیں جو عقل و فکر' تجربے' علم اور بصیرت کی رو سے حالات کو سوچتی ہیں آپ ان قوموں کا آجکل کا لٹریچر پڑھیے۔ ان کے دانشمند چیخ رہے ہیں' کہ ان قومیتوں نے ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے' کسی طرح ان کو مٹا دو۔ وہ مٹانے کی فکر کر رہے ہیں۔ ہم نئے نئے فرقے پیدا کر رہے ہیں' ایک قوم بھی نہیں بن رہے۔ کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیے گا برادرم! کہ کیا ہم ایک قوم بن چکے ہیں۔ ہم تو ان کے مقابل میں بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ انگریز کا بچہ جب انگلش مین کہے گا تو اسے اپنے آپ میں اس پر ایک فخر ہوگا اور اب تو سنا ہے کہ باہر جا کر انسان پاکستانی کہنے میں بھی شرماتا ہے لیکن بات تو فجار کی ہو رہی ہے اور ابرار کی ہو رہی ہے۔

تفرقہ قرآن کی رو سے شرک ہے۔ پوچھیے اس قوم کو کہ یہ فرقے اور فرقہ بندی وہی ہے جس کے لیے خود قرآن نے کہا تھا کہ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ** (3:31-32) تم کہیں مومن ہو کے پھر مشرک نہ بن جانا یعنی اپنے اندر فرقے نہ پیدا کر لینا۔ یہ قرآن کی آیات ہیں۔ یہ آپ کے ہاں کے جتنے واعظ حضرات' مولوی صاحبان ہیں وہ ان آیات پہ آتے ہی نہیں ہیں' ان کی نگاہ ان پہ ٹھہرتی نہیں ہے' وہ ان آیات پہ رکتے ہی نہیں ہیں: **اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ** [1] (3:31-32)۔ پھر ہر ایک خود فرقہ بن جاتے ہیں' پھر ہر فرقہ اس باب میں مگن ہوتا ہے کہ ہم ناجی ہیں اور باقی جہنمی ہیں اور پھر ایک روایت' ایک حدیث' اس قسم کی بیان کر دی جاتی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت تہتر فرقوں کے اندر بٹ جائے گی' گویا رسول اللہؐ نے بھی بتا دیا۔ اندازہ لگایئے تفرقہ جس کو شرک کہا جاتا ہے' اس کے جواز کے لیے یہ روایات کس قدر در آئیں' اور ان میں تہتر (73) میں سے بہتر (72) جہنمی ہیں' ایک جنتی ہے' اس ایک جنتی نے ہر ایک کو جنتی بنا دیا۔ اب ہر ایک بیٹھا ہوا کہہ رہا ہے وہ جو حضورؐ نے ایک کہا تھا: جنتی ہے' وہ ہم ہیں' اور یوں تہتر (73) کے تہتر (73) جنتی۔

---

[1] مشرکین وہ لوگ ہیں جو اپنے دین میں فرقوں میں بٹ جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن تو بڑی چیز تھی جسے قوم نے چھوڑا' عقل وفکر کو بھی چھوڑ دیا۔ ارے خالص فکری طور پر' عقلی طور پہ بھی' کھڑے ہوکر سوچا جائے تو یہ نظر آ جائے گا کہ اس طرح ہر فرقے کا یہ کہنا خلافِ قرآن ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تفرقے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں حق پہ ہوں باقی سارے باطل پر ہیں۔ یہی کیفیت ہماری ہوگئی۔ انہیں قرآن مشرکین کہتا ہے' ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اِنَّ الْاَبْـرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ o وَ اِنَّ الْـفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ❶ (82:13-14)۔ اب سمجھ میں بات آئی کہ صرف ابرار کا ترجمہ نیک اور فجار کا گناہگار کرنے سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بات بہت آگے ہے۔ یہ ہے اُن کی نشانی جو نعیم والے' جو جنت والے ہیں' اور جو فجار ہیں ان کے متعلق کیا بات ہے قرآن کی! یہاں ان کے لیے جہنم نہیں کہا۔ اس کے ہاں جہنم کا بھی لفظ ہے' اس کے ہاں جحیم کا بھی لفظ ہے مگر یہاں جحیم کہا کیونکہ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے والے ہیں۔ آپ اپنے ہاں کی صورتِ حال لے لیجیے۔ آپ اتنے ٹکڑوں میں' فرقوں میں' پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ کہہ یہ رہے ہیں کہ ہم ساری دنیا میں پست ہیں جبکہ قومیں بہت آگے چلی گئی ہیں۔

جحیم کے معنی ہی یہ ہیں کہ جن کی ترقی رُک جائے' کہیں ایک مقام پر کھڑے ہوجائیں' آگے نہ بڑھ سکیں۔ جس قوم کے اندر یہ فجار والی بات پیدا ہوجائے گی' وہ قوم ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی' وہ قوم زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے اہل ہی نہیں رہ سکتی' اس کی ترقی رک جائے گی۔ جحیم کے معنی ہی رک جانے کے ہیں۔ زندگی تو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے چلتی ہے۔ قومیں یہاں چلتی ہیں پھر قرآن کی رو سے یہ ہے کہ جو زندگی بسر کرنے والے ہیں ان کے آگے اور مقامات بھی ہیں جن پر انہیں جانا ہے' کہیں رکنا نہیں ہے لیکن جو فجار کی قسم کے لوگ بنتے ہیں وہ رک جاتے ہے۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتے' جحیم کے یہ معنی ہیں۔

موجودہ وعظ کبھی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے

عزیزانِ من! صرف جہنم کہہ دینے سے تو بات نہیں چلتی۔ یہ تو ہمارا روز کا تجربہ ہوگیا کہ واقعی فجار قومیں آگے نہیں بڑھ سکتیں' جحیم میں ہوتی ہیں' رک جاتی ہیں۔ ہم روز چلاتے ہیں کہ اتحاد پیدا کرو' وحدت پیدا کرو۔ یہ وعظ ہے' کیسے پیدا کرو؟ یہ وعظ کرتے کرتے ہی جس وقت اذان ہوتی ہے تو اسی وقت ان کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ کوئی اِس مسجد میں جاتا ہے' کوئی اُس مسجد میں جاتا ہے۔ کیا اس روش کے ہوتے ہوئے' اس قوم کے اندر اتحاد اور وحدت' وعظ کہنے سے' لیکچر دینے سے' پیدا ہوجاتی ہے؟ نہیں قومیت کے اعتبار سے ہم فجار

---

❶ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق' جو لوگ انسانی زندگی میں وسعت اور کشادگی پیدا کرتے ہیں' آسائشوں میں رہیں گے۔ اور جو عالم انسانیت' اور خود اپنی ذات میں انتشار (Disintegration) پیدا کرتے ہیں' ان کی نشو ونما رُک چکی ہوگی۔ (2:27)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہیں: افغانی' یہ ایرانی' یہ ہندی' یہ خراسانی۔ یہ وہ ہیں جو اقبالؒ (1938-1877) نے گنائے ہیں۔ کیا اس وقت ساری دنیا کے مسلمان مختلف قوموں میں بٹے ہوئے نہیں ہیں؟ فجار مسلمانوں میں' ہر قوم کے اندر مذہبی فرقہ بندی ہے اور زیادہ ہے' فاجر سے بھی فجار' تو یہاں ان کے لیے جحیم نہیں ہوگا تو اور کیا نعیم ہوگا؟ یہاں کہا ہے کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ o وَ اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ❶ (82:13-14)۔ یہ کیسے ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یَّصۡلَوۡنَهَا يَوۡمَ الدِّيۡنِ ❷ (82:15)۔ یہ وہی یوم الدین آیا ہے یعنی مکافاتِ عمل' اعمال کے نتائج۔ جب ان کی روشِ زندگی کے نتائج سامنے آئیں گے تو یہ اپنے آپ کو دیکھیں گے کہ ہم تو واقعی رک گئے ہوئے ہیں' قوموں کی صف میں آگے نہیں بڑھ رہے ہیں' بہت پیچھے رہ گئے ہیں' ہمارے لیے ترقی رک چکی ہے' ارتقا کی منازل ختم ہوگئیں۔ یہ جحیم ہے۔

یَّصۡلَوۡنَهَا (82:15)۔ کیا بات ہے! کہا کہ جحیم یا جہنم کے متعلق ان کا تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک قیامت آئے گی' کوئی جہنم وہاں رکھی ہوئی ہے اور ہمارے ذہن میں بھی ایسے ہے کہ وہاں کوئی ایک بہت بڑا میدان ہوگا' جہاں قیامت اور حشر ہوگا' وہاں میزان ہوگی' وہاں قومیں آئیں گی' پھر ذہن میں ایسے تصور آتا ہے کہ ایک طرف جائیں گے تو وہاں باغات ہونگے' وہ جنت ہوگی۔ دوسری طرف جہنم ہے جیسے کوئی بہت بڑے گڑھے کھودے ہوئے ہوں' اس میں آگ جل رہی ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے' وہ تم سے' تمہاری نگاہوں سے' کہیں دُور نہیں ہے: وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ (82:16) تم تو اسے آج نہیں دیکھ رہے مگر وہ تمہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ وہ نکبت و زبوں حالی جو قوموں پہ آتی ہے وہ تو قوموں کو دیکھ رہی ہوتی ہے' قومیں اسے نہیں دیکھ رہی ہوتیں۔ یہ جہنم یا جحیم کے متعلق کہا ہے: وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ (82:16) وہ اب بھی جہنم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔

اس کے باوجود مسلمان قیامت کی جہنم کے منتظر ہیں

عزیزانِ من! یہ اس جہنم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ وہ انہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ جہنم کی تو یہ کیفیت ہے۔ پہلے بھی یہ مقامات آچکے ہوئے ہیں' دو ایک مقامات بڑے اہم ہیں۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ آخری پارہ ہے آخری بار یہ باتیں آرہی ہیں۔ پہلے اگر آپ احباب نے اس کے حوالے نہیں لکھے تو اب لکھ لیجیے گا۔ یہ کام آئیں گے۔ کہیں اور نہ دیکھنا ہو تو جو میری تبویب القرآن ہے اسے Consult (دیکھ) کر لیجیے گا' اس میں بھی یہ چیز مل جائے گی۔ یہاں تو یہ کہا ہے کہ وہ تمہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ دوسری جگہ کہا

---

❶ جو لوگ انسانی زندگی میں وسعت پیدا کرتے ہیں' آسائشوں میں رہیں گے اور جو عالم انسانیت اور خود اپنی ذات میں انتشار پیدا کرتے ہیں ان کی نشو و نما رُک چکی ہوگی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ ظہورِ نتائج کے دن اپنے آپ کو جہنم میں پڑا دیکھیں گے۔ (ایضاً)

ہے کہ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (29:54) وہ تو تمہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اس وقت، تمہیں دکھ ہی نہیں رہی وہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ پریشانیاں، مصیبتیں، نکبت، زبوں حالی، مفلسی اور ناداری ہماری قوم کی ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں چھایا ہوا کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے محیط کہتے ہیں۔ وہ تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، تمہی آنکھیں نہ کھولو تو اور بات ہے۔ تمہیں وہ نہ نظر آئے تو اور بات ہے۔ وہ تو دکھ بھی رہی ہے، تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک اور حوالہ ہے: اس وقت وہ جہنم نگاہوں سے جیسے اوجھل ہے، پنہاں ہے، دبا ہوا ہے، سامنے نہیں ہے۔ اُس وقت کیا کیا جائے گا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ (79:36) اسے نمایاں کر دیا جائے گا، ابھار کر سامنے لایا جائے گا۔ بارز اور متبرز دو الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ گرامر کے بھی ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی چیز کو جو آنکھوں سے اوجھل یا نمودار نہ ہو، اسے نمودار کر دینا، جو پنہاں ہے، اس کو بارز کر دینا، بلند کر دینا، سامنے لے آنا''۔ یہاں کہا کہ جہنم کو بارز کر دیا جائے گا۔ وہ اب بھی تمہیں گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن اگلا لفظ ہے، عزیزانِ من! جہاں انسان کو وجد آ جاتا ہے: بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ (79:36) جحیم کو نمایاں کر دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کس کے سامنے؟ کہا کہ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) لیکن صرف اس کے سامنے جو دیکھ سکتا ہے، آنکھوں والے کے لیے ہے اندھا اسے پھر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ کیا بات ہے! یہاں سے ایک دوسری چیز سامنے آئی ہے اور وہ بڑی ہی عمیق اور لطیف ہے، ایک بہت بڑا عظیم نکتہ ہے، ویسے کونسا نکتہ قرآن کا عظیم نہیں ہے! جہنم کو نمایاں کر دیا جائے گا، ابھار کے سامنے لے آیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ آخر یہ ہوگا کیا؟

سوال یہ ہے کہ آخر یہ کیا ہوگا؟ جہاں پھر وہی جحیم یا جہنم ہی کا لفظ ہے۔ یہ ہے، عزیزانِ من! جسے نوٹ بھی کیجیے گا اور اس پر بار بار غور بھی کیجیے گا۔ یہاں اس کا جزا، سزا اور جہنم کا سارا فلسفہ آ گیا ہے: دو چار الفاظ کے اندر، ایک ہی آیت کے اندر۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کو نمایاں کر دیا جائے گا؟ کہا کہ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا [1] (39:51) جو کچھ تم نے ناہمواریاں کی ہونگی، اور جو غلط کام کیے ہونگے، وہ فَاَصَابَهُمْ [2] ہیں، انہیں نمایاں کر کے تمہارے سامنے لے آیا جائے گا، اُن کے نتائج تم تک آ پہنچیں گے، تمہیں گھیر لیں گے تو گویا یہی جہنم ہے، انسان کی جتنی بھی غلط کاریاں ہیں، وہی جہنم ہیں۔

---

[1] ان کی غلط روش کی پیدا کردہ ناہمواریاں ان کے سامنے آ جائیں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] ان کے نتائج ان تک آ پہنچیں گے۔

جہنم کے بے نقاب پہلو

اقدارِ خداوندی کے خلاف جو کچھ بھی اُس نے کیا ہوا ہے' لوگوں کی نگاہوں سے بھی وہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور اکثر تو خود اس کی اپنی نگاہوں سے بھی چھپا ہی رہتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ جسے کہا ہے کہ جہنم تو **بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ** (79:36) ہے' نمایاں کر کے جہنم کو سامنے لے آیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کو ابھارا جائے گا؟ اس کے لیے کہا کہ **فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا** (39:51) تم نے جو کچھ کیا تھا وہ اپنی نگاہوں سے تم نے اوجھل کر دیا تھا' اسے محسوس طور پر تمہارے سامنے لے آیا جائے گا۔ یہ ہے جہنم' اور جب اس خصوصیت کو سامنے لایا جائے گا' جو قرآن نے کہا ہوا ہے' تو عزیزانِ من! وہاں پہنچ کر تو میں عرض کرتا ہوں کہ انسان کی چیخ نکل جاتی ہے کہ وہاں کیفیت یہ ہوگی کہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی ہونگے۔ یہاں ہم ایک دوسرے میں رہتے ہیں' معاشرے میں تعلقات ہوتے ہیں' بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جو ہم اس سے چھپا کر کرتے ہیں' محبت ظاہر کرتے ہیں' تعلق ظاہر کرتے ہیں' دوست بنتے ہیں' ہمدرد بنتے ہیں' مگر دل میں یہ ہوتا ہے کہ ذرا اِدھر ہو پھر دیکھو تو سہی کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ ساری زندگی اس طرح سے گزرتی ہے کہ اس کو پتہ ہی نہ چلے' بڑے معتبر بنے بیٹھے ہیں' میں بھی درسِ قرآن دے رہا ہوں' معزز بنا ہوا ہوں' مقرر بنا ہوا ہوں' بزرگ بنا ہوا ہوں' متقی ہوں' پرہیزگار ہوں' سب کچھ بنا ہوا ہوں' سینے کے اندر کچھ اور ہے' اس کے خلاف ہے جسے نہ یہ معتقدین دیکھ سکتے ہیں' نہ یہ دوست ملنے والے دیکھ سکتے ہیں' ان کے اندر بڑا معزز بنا ہوا ہوں' اور دنیا سے جیسا ہوں' سوچیے عزیزانِ من! کہ وہاں یہ لوگ سامنے موجود ہوں اور وہ جو سینے میں' میں نے چھپا کر رکھا ہوا تھا' وہ بے نقاب ہو جائے تو اس سے بڑا جہنم ان کے سامنے اور کیا ہوگا' اف! یہ ہے جو کہا **فَاَصَابَهُمْ** (39:51) وہ چیزیں جو تم ان لوگوں سے چھپائے ہوئے تھے' یہ سامنے ہونگے اور وہاں تمہارا یہ سینہ شق کر کے' ایک ایک کی بات نمایاں طور پہ سامنے لے آئیں گے کہ یہ تھی جو اس کے متعلق ہم سوچتے تھے اور یہ تھا جو تم دکھاتے تھے۔ منافق کی تو ایک بات کہیں کھل کر سامنے آ جائے' اگر اس میں غیرت اور حیا باقی ہے تو وہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے اور جہاں پوری کی پوری زندگی کی ساری منافقتیں ان لوگوں کے سامنے آ جائیں' جن کے خلاف یہ کچھ کیا تھا' جن کے درمیان ہم معتبر اور ان کے دوست بنے ہوئے تھے' تو اس سے بڑا جہنم اور کیا ہوگا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے کیا کہا۔ ایک دفعہ کہا کہ جہنم کو بارز کر دیا جائے گا' نمایاں اور نمودار کر دیا جائے گا۔ دوسری جگہ کہا کہ خود تمہارے جو اعمال تھے' جو تم نے چھپائے ہوئے تھے' ان کو باہر لے آیا جائے گا' عزیزانِ من! یہ کچھ ہوگا اور میں سمجھتا ہوں کہ آگ میں جسم کا جلنا اور چیخنا وہ جہنم تو کوئی شے ہی نہیں ہے۔ جہنم تو یہ ہے جو قرآن بتا رہا ہے اور یہ کب ہوگا؟ اس کے لیے وہی **یوم الدین** کہا: اعمال کی جزا کا دن۔

آ گے عزیزانِ من! بڑی عظیم چیز کہی ہے۔ پہلے ہی سورۃ الفاتحہ میں **مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ** (1:3) کہا ہے۔ وہ جو سارے قرآن میں یوم الدین آیا ہے' اس کے بارے میں کہا ہے کہ **مَـآ اَدۡرٰکَ مَـا یَوۡمُ الدِّیۡنِ** (82:17) کچھ پتہ بھی ہے کہ یوم الدین کیا ہوتا ہے؟ تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین (ظہورِ نتائج کا دَور) کیسا ہوگا؟ پھر کہا کہ **ثُـمَّ مَـآ اَدۡرٰکَ مَـا یَـوۡمُ الدِّیۡنِ** [1] (82:18)۔ عزیزانِ من! اب وقت ہوگیا اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

---

[1] یقیناً خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ اُس دَور کی کیفیت کیا ہوگی۔

سولھواں باب: سورۃ الانفطار (آیات 18 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1984ء کی 14 تاریخ ہے۔ سابقہ جمعہ کو عید الاضحیٰ تھی، درس کا ناغہ رہا تو آج کا درس سورۃ الانفطار 82 ویں سورۃ کی آیت 18 سے ہو رہا ہے۔ اس ایک ہی آیت میں قرآن کی ساری تعلیم کا نچوڑ آ گیا ہے۔ آپ سوچ لیجیے کہ کتنی اہم چیز ہے جو آ رہی ہے۔ اس کا ملخص، پنجابی اچ جے کہوتے تت کڈیا ہویا،❶ کہ یہ بات ہے کیا۔ اس سے پہلی آیت میں آیا تھا کہ **یَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ** (82:15) وہ ظہورِ نتائج کے دن اپنے آپ کو جہنم میں پڑا دیکھیں گے۔ اور ایک آیت کے بعد اگلی یہ آیات شروع ہوئیں کہ **مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ** ❷ (82:17)۔ کہا تھا کہ یوم الدین میں یہ واقعہ ہوگا۔

قرآنِ کریم کا پہلا ورق الٹیے، اس کے Introduction (تعارف) میں، جسے فاتحہ کہتے ہیں، مٰلک یوم الدین ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں تراجم میں یہ ہے: مالک دن جزا کا اور جزا کا دن قیامت کا۔ تو گویا یہ بات کچھ قیامت کی ہو رہی ہے۔ جیسا کہ آپ نے درس میں اکثر سنا ہوگا قرآنِ کریم کے یہ جتنے بھی مقامات ہیں، ان کو قیامت تک کے لیے اٹھا رکھا ہوا ہے اور قیامتِ موجود کی کوئی بات نہیں ہوتی، حالانکہ قرآن اس دنیا میں انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ قیامت، مرنے کے بعد کی زندگی، آخرت، جزا اور سزا وہ اپنے مقام پہ ہے لیکن وہ اس زندگی کے بعد کی بات ہے۔ قرآن اس دنیا میں انسان کو رہنا سکھاتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ دیکھنی ہوگی کہ اس دنیا میں اس مٰلک یوم الدین کا کیا تعلق ہے۔ ''یوم'' کے معنی دن کر لیا۔ الدین کے جزا کا دن۔ اس کے معنی قیامت رکھ لیا لیکن جو الدین ہے وہ صرف جزا کی بات نہیں ہے، اس کے معنی تو نظامِ زندگی ہیں، اور اسی دنیا میں اس الدین کے متعلق خود قرآن واضح کر دیتا ہے۔ وہ انسان کے ذہن پہ کوئی چیز چھوڑتا ہی نہیں ہے کہ ہم لوگ خود اس کے کچھ معنی متعین کریں، وہ اپنی ساری بات خود متعین کر دیتا ہے، کہ یہ الدین اس دنیا کے اندر ہے اور یہ جو یوم ہے، یہ الدین کا دور ہے، عہد ہے، age ہے جس دَور میں الدین غالب ہوگا، جب دین کا دَور ہوگا۔

---

❶ اس کا ملخص اگر پنجابی زبان میں بیان کروں تو یہ ہے کہ یہ اس کا نچوڑ نکالا ہوا ہے۔

❷ تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین (ظہورِ نتائج کا دَور) کیسا ہوگا؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! زندگی کے جن ادوار سے ہم گزر رہے ہیں ان کو دین سے کچھ تعلق نہیں ہے' اگرچہ مذہبی پیشوائیت کے اعتبار سے تو لادینی اتنی ہی ہے کہ سوٹ پہنا ہوا ہے' فیشن ہے سگریٹ پی رہا ہے' تو یہ لادینی ہو جاتی ہے۔ گویا اپنا جو دور ہے جس میں کچھ وضع قطع تراش خراش اس انداز کی ہو جائے جیسا وہ سمجھتے ہیں کہ شرعی ہے' وہ دینی ہو جاتا ہے۔ دینی اور لادینی یہ نہیں ہے صاحب! قرآن بتا رہا ہے کہ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ (9:33) خدا نے رسول کے ذریعے راہنمائی دیدی اور دین الحق بھیجا۔ کاہے کے لیے بھیجا؟ کیا مقصد تھا؟ اس کے لیے کہا کہ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ (9:33) تاکہ وہ تمام نظامہائے عالم پر غالب آ جائے۔ اب یہاں دین کا ترجمہ آ گیا۔ تمام نظامہائے حیات جو انسانوں نے وضع کیے ہوں' ان تمام کے تمام' کُلِّـهٖ' نظاموں کے اوپر غالب آ جائے۔ تو وہ تو اس دنیا میں ہی غالب آئے گا۔

دین کا مفہوم نظامِ زندگی ہے

یہ سارے نظام جو باقی ہیں' کُلِّـهٖ' وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظامِ حیات ہیں۔ یہ سیاسی ہوں' معاشی ہوں' معاشرتی ہوں' مگر جسے بھی آپ نظامِ زندگی کہتے ہیں وہ تو اس نظام کے مختلف گوشے' شعبے اور اجزا ہوتے ہیں' نظامِ زندگی ایک کلی چیز ہے۔ دین کے معنی نظامِ زندگی ہیں۔ آپ میرے لغت میں دیکھیے کس طرح میں نے قرآن کی آیات سے اور عربی زبان کی اسناد سے یہ بتایا ہے کہ اس کے معنی نظامِ حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے راہنمائی بھیجی اور الحق پر مبنی' ایک نظامِ حیات بھیجا۔ وہ اس لیے بھیجا: لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ (9:33) تاکہ جتنے بھی باقی ادیان ہیں' وہ ان پر غالب آ جائے۔ اب یہاں ادیان کے معنی آپ سوچ لیجیے۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ کہا جاتا رہا کہ صاحب! اسلام سب سے زیادہ افضل مذہب ہے۔ مذاہب کے ساتھ ہم مناظرے کرتے رہے۔ مذہب کا تو قرآن میں لفظ ہی نہیں ہے۔ جب دین کو مذہب بنا دیا تو وہ تو دین ہی نہیں رہا۔ یہ نظامِ حیات ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے جو نظام ہائے حیات ہیں' جیسے سیاسی' معاشی' عمرانی یہ ان تمام پر غالب آئے گا۔ لہٰذا اس دین کو' اس نظام کو' یعنی الدین کو' دیا ہی اس لیے گیا ہے کہ یہ دنیا میں باقی ادہان یا باقی نظام ہائے عالم پر غالب آ کر رہے۔ بات اسی دنیا کے نظاموں کی ہو رہی ہے' جو یوم الدین کہا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے شروع میں ہی' اس دَور کی بات کی ہے کہ جس میں الدین غالب آئے گا اور اس کے لیے ایک ہی خصوصیت بتائی ہے کہ اس میں صاحبِ اختیار' صاحبِ اقتدار' صرف خدا ہو گا۔ یہ اس کی خصوصیت ہے' باقی جو انسانوں کے بنائے ہوئے ادیان یا نظامہائے زندگی ہیں' ان میں کسی نہ کسی نوعیت سے انسان صاحبِ اختیار اور صاحب اقتدار ہوتا ہے۔ ان میں انسانوں کو' دوسرے انسانوں پر اختیار ہوتا ہے۔ یہ شرک ہے۔ شروع میں ہی خصوصیت یہ بتائی کہ جو دین' الدین ہے وہ **مٰلک یوم الدین** والا دین ہے' یہ الدین خدا کی طرف سے ہے۔

اس نظام میں نہ کوئی محکوم ہوگا' نہ حاکم' نہ محتاج' نہ محروم

عزیزانِ من! اس میں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سوائے خدا کے کسی کا اقتدار نہیں ہوگا۔ یہ ہے دَور جس میں اسلام بحیثیت الدین غالب ہوگا' خدا صاحبِ اقتدار ہوگا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس آیت میں قرآن کی تعلیم کا ملخص جوہر' تت'[1] دیدیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے کیا؟ قرآن کی تعلیم کیا ہے؟ یہ تعلیم کاہے کے لیے آتی ہے؟ کیا منتہیٰ ہے؟ میں پھر بار بار یہ عرض کرونگا آخری پارے کی یہ آخری سورتیں ہیں۔ آخری بار سمجھنے کے لیے یہ بات عرض کر رہا ہوں' سمجھ لیجیے کہ قرآن کی رو سے یہ بات خدا سے شروع نہیں ہوتی۔ خدا تو اس انسان کے لیے جو راہنمائی دیتا ہے' وہ اپنی بات انسانوں سے شروع کرتا ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ خدا کے نزدیک دین کا ملخص تکریمِ انسانیت ہے' انسانوں کی مساوات ہے' ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ یہ ہے جو دین کا دور ہے۔ جو قرآن کا نظام ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا نہ محتاج ہوگا' نہ محکوم ہوگا۔ تکریمِ انسانیت اسی صورت میں باقی رہتی ہے کہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہ ہو' محتاج نہ ہو۔ وہ جو اقبالؒ (1938-1877) نے اپنے ہاں بہشت کا ایک نقشہ کھینچا ہے اس میں اس دور کا' اس نظام کا یہ بتایا ہے کہ

کس در ایں جا سائل و محروم نیست

اس میں کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے نہ محتاج ہے' نہ محروم ہے۔

عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہاں کوئی رعیت نہیں' بادشاہ نہیں' حاکم نہیں' سربراہ نہیں' کوئی محکوم نہیں' کوئی حاکم نہیں۔ انسان کی تکریم یا تکریمِ انسانیت ہے۔ ہر فرد یکساں واجب التکریم اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی حاکم نہ ہو' وہ کسی کا محتاج نہ ہو' کسی کا محکوم نہ ہو۔ اسی کا نام مساواتِ انسانیہ ہے' یعنی یکساں انسان ہوں۔ وہ جو آگے جا کر اس کے اعمال ہیں' وہ اس کے میرٹ ہیں' اس کی Qualifications (خصوصیات) ہیں۔ جو خصوصیات اس نے خود حاصل کی ہیں وہ ہر فرد کی الگ الگ ہونگی۔

قرآنی معاشرہ میں صرف جوہرِ انسانی کا تقابل ہوگا

عزیزانِ من! ان اعمال کے اعتبار سے ایک انسان کا دوسرے انسانوں سے تقابل و موازنہ ہوگا کہ کس کے اعمال زیادہ اچھے ہیں اور کس کے برے ہیں لیکن انسان ہونے کی جہت سے وہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں یکساں واجب التکریم ہوگا۔ یہ الدین تھا جو

---

[1] ملخص' جوہر

نبی اکرمؐ یا جسے ہم صدرِ اول کا اسلام کہتے ہیں' میں بحیثیت ایک نظامِ زندگی غالب تھا' اور اس میں مساوات کی صورت یہ تھی کہ عمرِ فاروقؓ (581-644/45) بلال رضی اللہ عنہ حبشی کو سیدنا بلال کہہ کر سلام کرتا تھا۔ میں نے یہ تقابل اس لیے کیا ہے کہ ان کے معیار کے مطابق' اس بلالؓ سے بلند ترین کوئی اور نہیں تھا۔ ان قریش میں حسب' نسب اور نسل کے اعتبار سے عمر اور پھر عمرؓ سربراہِ مملکت کے اعتبار سے فاروقِ اعظمؓ تھا' دوسری طرف انہی نسبتوں سے' حبش کا رہنے والا بلالِ حبشیؓ تھا۔ عرب تو غیرِ عرب میں بڑے سے بڑے نسبی کو بھی اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے' چہ جائیکہ حبشی ہو اور وہ غلام ہو' پھر غلامی کی حیثیت سے انہی نے اُسے چھڑایا بھی ہو۔ اور کیفیت یہ ہے کہ عمرؓ (581-644/45) اس کے جوہر کے اعتبار سے اس کو سیدنا کہہ رہا ہے۔

ملوکیت اور خلافت میں فرق

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ [1] مصر کے گورنر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے مکان کے آگے ایک ڈیوڑھی بنوالی ہے کہ لوگ وہاں آ کے بیٹھ کر انتظار کیا کریں۔ انتظار گاہ سمجھ لیجیے۔ وہ گھر کے اندر ہوں اور لوگ باہر سے آ کر اس کا انتظار کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا۔ انہوں نے وہ خط لکھا۔ جس کا یہ جملہ بڑا مشہور ہے کہ ''عمروؓ' عمرو ابنِ عاص ان کا بھی نام تھا' ''ابنِ عاص! تم نے انسانوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا' ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔'' وہ یہ فرق بھی نہیں چاہتے تھے کہ یہ حاکم' اپنے ہاں بڑا بنا ہوا' اندر بیٹھا ہو اور یہ جو باقی ہیں وہ باہر ڈیوڑھی میں' انتظار گاہ کے اندر اس کا انتظار کریں' اتنا بھی نہیں تھا۔ آپ سوچ لیجیے کہ پھر کیا صورت ہوئی' اور اس کے بعد جب ملوکیت آئی ہے تو ملوکیت میں کیا ہوا؟ عام دنیاوی نقطہ نگاہ سے مملکت کی وسعتیں بڑی بڑھ گئیں' دولت بے شمار آ گئی' فارغ البالیاں آئیں' خوشحالیاں آئیں۔ یہ سب کچھ ہوا۔ وہ جو دین کی بنیاد تھی' وہ منہدم ہو گئی۔ تکریمِ انسانیت نہ رہی۔ حاکم اور محکوم ہو گئے۔ ملوکیت کے دور میں خود اپنے آپ کو سلطان کہلانا شروع ہوا اور باقی انسان۔ یہ خطاب [2] اور یہ الفاظ!!! انہی الفاظ کی بنا پر انسانوں پہ غلبہ پایا جاتا ہے' حکومت کا رنگ پایا جاتا ہے' دوسرے انسانوں کے اوپر تسلط پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس طرح جب یہ تکریمِ انسانیت کی بنیاد منہدم ہو گئی تو پھر کس کس قسم کی زنجیریں تھیں جن میں انسان جکڑے گئے' کون کون سے طوق تھے جو انہیں پہنائے گئے۔ ہر ایک نے صرف اپنی اپنی حکومت جمالی۔

---

[1] مطالب القرآن فی درس الفرقان سورۃ الکہف و سورۃ مریم جو مئی 2004ء میں ادارہ طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق کی ادارت میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی اس کے ص 94 کی دوسری لائن میں عمرو بن عاصؓ کے بجائے طباعت کی غلطی سے ''بناس'' چھپ گیا ہے' اسے بن عاصؓ پڑھا جائے۔

[2] Title

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ

بادشاہوں نے ملوکیت کے رنگ میں اقتدار جمالیا۔ مذہبی پیشوائیت سے، جسے آپ تھیا کریسی کہتے ہیں سمجھوتہ کیا۔ شریعت کو سیاست سے الگ کرلیا، اس سیاست میں جو بادشاہت یا اقتدار یا حکومت تھی، وہ بادشاہوں کی، سلطان کی تھی اور ان کا جو شریعت کا میدان تھا اس میں مذہبی پیشوائیت کی حکومت تھی۔ بادشاہ کو تو کسی کو قتل کرانے کے لیے، پھر بھی کسی نہ کسی قسم کا کچھ بہانہ ہی سہی، کرنا پڑتا تھا، کوئی دلیل دینی پڑتی تھی، کوئی مقدمہ چلانا پڑتا تھا، مگر ان کے ہاں تو اس قدر خوف یعنی فتویٰ کفر کا عائد کیا، مرتد قرار دیا، اور اس کا قتل مباح ہو گیا کہ جس کا جی چاہے اس کو قتل کردے۔ اس قسم کا اقتدار اور غلبہ اور حکومت بادشاہ کو بھی نصیب نہیں تھی۔ یہ تو ایسے واقعات تھے کہ جن میں فتوے دے کر بادشاہوں کو نیلام کرادیا کرتے تھے۔ ان کے غلبے اور حکومت کے کیا کہنے! خدا کے نظام کے غلبہ اور حکومت کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جب وہ نظام ہی نہ رہا اس کی جگہ انسانوں کا نظام آیا تو اس میں بدترین قسم کے نظام کی صورت پیدا ہوئی، جسے آج ملوکیت کہتے ہیں۔ اس میں اس قدر مختلف نوعیتوں کی زنجیریں اور طوق تھے جو گنائے نہیں جاسکتے، دیکھے نہیں جاسکتے۔ ایک بڑا جامع شعر ہے، مگر ہے وہ وہی فارسی میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ جال کس قسم کا تھا، اس کے نیچے جو دانے بکھرے ہوئے تھے وہ کس قسم کے تھے۔ ایں قدر دانم۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ...... زفرق تابقدم، ہر چہ است در بند است

میرے سر سے پاؤں تک جو کچھ بھی ہے اس کا بند بند زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ یعنی مجھے پتہ نہیں کہ وہ دام کیا تھا اور وہ دانہ کس قسم کا تھا۔ میں تو اب یہی جانتا ہوں کہ سر سے پاؤں تک میرا بند بند جکڑا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! مسلمانوں کا بند بند جکڑا گیا ہے۔

دورِ محکومی میں قرآنی اصطلاحات کا رنگ ہی بدل دیا گیا

اس الدین کی جگہ جب انسانی نظام آیا ہے تو جس نظام میں ساتھ تھیا کریسی یا مذہبی پیشوائیت کا بھی نظام ہو تو اس کا تو پوچھو نہیں کہ وہ بند کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ بند تھے۔ اُدھر یہ **مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** وغیرہ کی جتنی بھی قرآن کی Terms یعنی اصطلاحات تھیں، ان کو قیامت پر اٹھادیا کہ اس دنیا میں نہ **يَوْمِ الدِّيْنِ** رہا، نہ اس **يَوْمِ الدِّيْنِ** میں مالکیت خدا کی رہی۔ خدا تو کہیں آتا ہی نہیں ہے۔ قرآن نے **مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** (82:17) کی یہاں تشریح کی ہے۔ کہا ہے کہ کیا تم جانتے ہو یوم الدین کیا ہوتا ہے؟ کیا خوب انداز ہے! **مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ** (82:17) لیکن یہ بات تمہیں خدا کے سوا کوئی نہیں بتاسکتا، خدا ہی بتائے گا کیونکہ یہ بڑی اہم چیز تھی، دو دفعہ کہا کہ **ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ** (82:18) ارے پھر سنو کہ یہ صرف خدا بتائے گا، کوئی انسان نہیں بتاسکتا کہ یوم الدین ہوتا کیا ہے۔ جب دین کا نظام قائم ہوتا ہے تو اس دور کی خصوصیت کیا ہوتی ہے، یہ خدا ہی بتاسکتا ہے۔

عزیزانِ من! سنیۓ لکھ رکھیۓ نوٹ کر لیجیۓ ہمیشہ کے لیے اس کو ذہن میں رکھیے کہ یہ الدین ہوتا کیا ہے؟ اس میں ہوتا کیا ہے؟ کہا کہ اس میں یہ ہوتا ہے یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (82:19)۔ ''اس دور میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پہ کوئی اختیار نہیں ہوتا'' یہ ہے جی الدین کا یوم۔ عزیزانِ من! میں کیا کیا عرض کروں' پتہ نہیں زندگی میں' دوبارہ عرض کرنے کا وقت آئے گا یا نہیں۔ اسلامی نظام' اسلامی معاشرہ' اسلامی قوانین' اسلامی مملکت' پوچھو نہیں کیا کیا اسلامی ہے' یہ اسی تھیا کریسی یا مذہبی پیشوائیت کے دام [1] کی مختلف کڑیاں ہیں۔ یہ اسلامی تو قرآن نے بتایا یعنی یہ بتایا ہے کہ کہ اس میں الدین ہوتا کیا ہے یہ وہ دور ہے جس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (82:19) کوئی فرد کسی دوسرے فرد پر کسی قسم کا کوئی اختیار' کوئی اقتدار' کچھ نہیں رکھے گا۔ نہ کوئی کسی کے لیے کچھ کر سکے گا' نہ کوئی دوسرے کا محتاج ہوگا' نہ اس سے کرانا چاہے گا۔ اللہ اکبر! یہ آزادی انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔

آج انسان حقیقی آزادی کے لیے ترساں ہے

عزیزانِ من! آزادی کے لیے انسان متلاشی ہے' آج زیادہ سے زیادہ سیاست میں' وہ جمہوریت تک پہنچا ہے۔ وہ بھی ایک انسان کی محکومی نہیں' انسانوں کا ایک گروہ ہو جاتا ہے جس کی محکومی اختیار کرنا ہوتی ہے۔ جس کو 51 فی صد کہتے ہیں' یہ ان کی غلامی ہوتی ہے۔ انسان تو اس وقت تک بھی انسانوں کی غلامی اور محتاجی سے نکل ہی نہیں سکا' حالانکہ یہ آسمان تک ہو آیا ہے اور اس سے بھی آگے جا رہا ہے لیکن ''کار زمیں راں نکو ساختی'' جو سعدی (1291-1184) نے کہا تھا وہ یہی ہے کہ

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ بر آسماں نیز پرداختی

زمین کے معاملات تم نے سنوار لیے ہیں کہ اب آسمان کی سوجی ہے؟ سعدی (1291-1184) نے چھ سو [2] سال پہلے کہا تھا۔ زمین کے معاملات میں افراد ہی نہیں' قوموں کی قومیں' دوسری قوموں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں' محتاج بھی ہیں' محکوم بھی ہیں۔ ان حالات میں آپ سوچیے کہ الدین اور الاسلام کا واسطہ کیا ہے؟ اور قرآن کہتا ہے کہ جب یوم الدین ہوگا' جب کہیں دین کا نظام ہوگا' تو اس کی پہچان یہ ہوگی کہ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار اور اختیار نہیں رکھے گا۔

---

[1] پھندا

[2] یاد رہے یہ ستمبر 1984ء کی 14 تاریخ کو کہا گیا تھا۔

اس دَور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی

اب یہاں یہ بات پیدا ہوئی کہ جب اقتدار اور اختیار نہیں ہوگا تو کیا پھر لاقانونیت ہو جائے گی' معاشرے میں کوئی قانون ہی نہیں ہوگا' حکومت ہی نہیں ہوگی؟ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' جونہی یہ چیز سامنے آئی کہ کسی انسان کا' کسی دوسرے انسان پہ اقتدار نہیں ہوگا تو آگے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ **وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ** (82:19) اس دَور میں' حکومت' قانون' اختیار' صرف خدا کا ہوگا اور خدا کا اقتدار خدا نے خود بتا دیا کہ یہ **ما انزل الله** کا اقتدار ہے۔ اس نے کہا کہ ہم بھی ایک ڈکٹیٹر (مطلق العنان) کی طرح اپنی حکومت نہیں قائم کرنا چاہتے کہ جس وقت ہمارا جی چاہے' یہ حکم دیدیا' جس وقت جی چاہے وہ دیدیا' ہم قانون کے ذریعے حکومت کرنا چاہتے ہیں اور قانون کا ضابطہ' مکمل غیر متبدل ہے جو کہ ہم نے قرآن کی شکل میں دیدیا' اور اب ہم اس میں تبدیلی بھی نہیں کریں گے۔ اللہ اکبر! اس قسم کا قادرِ مطلق' اس قسم کا صاحبِ اقتدار' اور اپنے اوپر پابندی یہ عائد کی کہ ضابطہ ہدایت' ضابطہ قوانین مکمل دیا اور کہا کہ ہم اس میں اضافہ وتبدیلی نہیں کریں گے: **لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) ہم اس میں تبدیلی نہیں کریں گے۔ اور ہم نے اسے محفوظ کر دیا۔ کوئی اس میں کسی طرح سے ردوبدل نہیں کر سکے گا۔ یہ محفوظ' غیر متبدل' مکمل ضابطہ ہدایت دیدیا اور کہہ دیا کہ اب اس کا اقتدار ہوگا۔ ہمارا اقتدار' جسے خدا کا اقتدار کہتے ہو' وہ ہمارے اس ضابطے کا اقتدار ہوگا۔

آج کل اسے Rule of the Law (قانون کی حکمرانی) کہا جاتا ہے کہ انسان نے سب سے بڑی چیز جو کہی ہے' وہ یہ ہے کہ انسان کی حکومت نہیں' Rule of the Law ہے یعنی قانون کی حکومت ہے لیکن یہاں اپنے بنائے ہوئے نظام میں انسان بات چھپا گیا اور وہ اس طرح کہ قانون تو خود انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ براہِ راست حکم نہ دیا' قانون بنا کر حکم دیدیا۔ یہ ساری دنیا میں جتنی غلامیاں اور محکومیاں چل رہی ہیں' ان قوانین کی چل رہی ہیں' جو صاحبِ اقتدار لوگوں نے بنا رکھا ہے' ان کی کوئی شکل بھی کیوں نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے لیے قانون بنانے کا اختیار ہو۔ مکمل غیر متبدل محفوظ ضابطہ حیات دیا ہے۔ اس کی محکومی یا اس کی حکمرانی قائم کرنا' یہ ہے یوم الدین۔ یہ ہوگا جس میں خدا کے اس ضابطہ حیات کی حکمرانی ہوگی' اسی کا اقتدار ہوگا' اسی کا اختیار ہوگا۔ کسی انسان کو کوئی اقتدار اور اختیار نہیں ہوگا۔ اب آپ نے غور فرما لیا کہ الدین کسے کہتے ہیں' یوم الدین کیا ہوتا ہے' الاسلام یا جسے ہم اسلامی کہتے ہیں اس کی خصوصیت کیا ہے۔ کوئی ضابطہ' کوئی قانون' کوئی نظام' جس میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہے' وہ ہے الدین' وہ ہے الاسلام' وہ ہے اسلامی اور جس میں ذرا بھی کسی انسان کا اقتدار و اختیار آ گیا وہ شرک ہے' توحید نہیں ہے' غیر اسلامی ہے' اسلامی نہیں ہے۔ اسی لیے کہا کہ **لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا** (18:26) خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

عزیزانِ من! بات دُور چلی جائے گی۔ اس نے تو یہ کہا ہے کہ کسی نبی کو بھی یہ اختیار نہیں ہوتا کہ کسی انسان سے یہ کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بن جاؤ۔ یہ ہے یوم الدین۔ یہ ہے الدین۔ یہ ہے الاسلام۔ کسی انسان کی ذرا سی بھی تذلیل اور توہین ہوئی تو اس میں

اسلام نہ رہا۔ وہ واقعات بار بار آتے ہیں، دہرانے بھی پڑتے ہیں۔ حضرتِ عمرؓ کے زمانے (634-644/45ھ) میں مصر کے گورنر ❶ تھے۔ وہ بڑے بلند پایہ گورنر تھے۔ کسی یہودی کو یعنی غیر مسلم جسے محکوم کہتے ہیں، وہ تو بہرحال محکوم یا رعایا کی حیثیت سے رہتے تھے، رعایا کی حیثیت سے رہنے والا غیر مسلم تھا، جس پر آپ کو کسی طرح سے غصہ آ گیا۔ آپ نے کہیں یہ کہہ دیا کہ "خدا تجھے ذلیل کرے۔" وہ خود نہیں ذلیل کرے، بلکہ کہا کہ خدا تجھے ذلیل کرے اور اس کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو سوچا۔ کہا کہ اس میں تو اسکی تذلیل ہوگئی۔ اسی وقت قلمدان ٹھپ دیا اور سیدھے بارگاہِ خلافت میں پہنچے استعفٰی پیش کر دیا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی اقتدار یا کوئی منصب رکھوں۔ میں نے ایک انسان کی تذلیل کر دی ہے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45ء) نے انہیں فرمایا کہ کوئی بات نہیں، یونہی یہ کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ یہ تو تم نے ایک لفظ کہا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ جس کو دوسرے انسان کی تذلیل کے وقت اپنے آپ پہ اتنا اقتدار نہیں رہتا کہ وہ سمجھے کہ کیا کہہ رہا ہے اس کو حق نہیں پہنچتا کہ اسلامی مملکت میں کوئی منصب بھی لے۔ نہیں گئے۔ اسی عمرو بن عاصؓ نے کسی کو منافق کہہ دیا تھا۔ حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے اسی وقت کہا کہ اس سے معافی مانگو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو میں تمہیں سزا دیدونگا۔ منافق کہنے سے تو اس کی تذلیل ہوگئی۔ یہاں روز کفر کے فتوے جڑے جاتے ہیں۔ یوم الدین میں تو یہ بات نہیں ہوتی۔ **مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ o ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ o يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ** ❷ (82:17-19) اللہ اکبر! چار الفاظ میں اسلام کا سارا ہی نچوڑ آ گیا اور اسی پہ یہ سورۃ الانفطار ختم ہوئی، عزیزانِ من! کیسا حسین خاتمہ ہے۔ ❸

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ عمرو بن عاصؓ

❷ تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین (ظہورِ نتائج کا دور) کیسا ہوگا؟ (82:17) یقیناً خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ اُس دور کی کیفیت کیا ہوگی (82:18)۔ یہ وہ دَور ہوگا جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار ہوگا۔ اختیارات تمام کے تمام قوانین خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف ان قوانین کی ہوگی، کسی اور کی نہیں ہوگی۔ (82:19)۔ (یعنی وہ دور جس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا، نہ محتاج، اور نہ ہی کوئی کسی مجرم کو اس کے جرم کی پاداش سے چھڑا سکے گا۔ یہ ہوگا یوم الدین (1:3) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ اِسی درس میں سورۃ المطففین کا آغاز ہو گیا تھا تا کہ سورۃ الانفطار کے فوراً ہی بعد اس کی پہلی چار آیات تمہیدی انداز میں قارئین کے سامنے آ سکیں۔ تاہم اسے "سترھواں باب" کے تحت آگے دیا جا رہا ہے

سترھواں باب: سورة المطففين (آیات 1 تا 4: تمہید)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج سورۃ الانفطار کے اس حسین خاتمے پر ساتھ ہی سورۃ المطففین کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ 83 ویں سورۃ ہے اور اس سابقہ سورۃ سے اس کا گہرا تعلق ہے جو ایک عجیب انداز لیے ہوئے ہے۔

یہ ایک غلط سوچ ہے کہ قرآن میں ربط نہیں

کہتے ہیں کہ قرآن کے اندر ربط نہیں، مگر عجیب بات یہ ہے کہ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا۔ سورۃ الانفطار کی آخری آیت میں کہا ہے کہ **اَلْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** ❶ (82:19) اس دور میں **لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا** ❷ (82:19) ''یعنی اس دور میں کسی انسان کی حکومت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا ہے مگر آج اختیارات سیاسی نظر آتے ہیں۔ دوسری چیز جو میں نے ابھی عرض کی ہے وہ یہ ہے کہ محتاجی تو معاش میں ہوتی ہے۔ یہ بڑی محتاجی ہوتی ہے اقبالؒ (1938-1877) نے کہا تھا کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

اس شخص کا خوب انداز تھا! کہا کہ کوئی فرد کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ یہ شریعت کا نقطۂ ماسکہ ہے اور بس! بات ختم ہوئی۔ سورۃ الانفطار کے آخر میں محکومیت کی نفی کی گئی تھی۔ کہا تھا کہ اس دور میں کسی انسان کی کسی دوسرے انسان پہ حکومت نہیں ہوگی۔ اب باقی رہی احتیاج کی شکل، تو ساتھ ہی اگلی سورۃ آ گئی، جس میں کہا ہے کہ **وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ** (83:1) تباہی ہے مطففین کے لیے۔

---

❶ اختیارات تمام کے تمام قوانین خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف اُن قوانین کی ہوگی کسی اور کی نہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار واقتدار رہوگا۔ (ایضاً)

عزیزانِ من! قرآن کی بڑی جامع اصطلاحات ہیں۔ اُس دور میں جسے آپ Capitalism یعنی نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں' ساری دنیا میں ایک منظّم شکل میں نہیں آیا تھا' جس طرح آج ہمارے اس دور میں آ کر اس نے ایک تنظیمی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب یہ ایک ازم بن گیا ہے' اُس دور میں یہ ابھی ایسا نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک جامع اصطلاح تو نہیں تھی لیکن سرمایہ داری کے نظام کے جتنے بھی عناصرِ ترکیبی ہیں' Constituents ہیں جن سے یہ مرکب ہوتا ہے' جو اس کی الگ الگ خصوصیتیں ہیں' یہ سب موجود تھیں۔ قرآن میں ان کو الگ الگ گنا کر جب جمع کیا جائے تو یہ نظامِ سرمایہ داری بن جاتا ہے۔ ان عناصر ترکیبی کے لیے الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ ان میں ایک اصطلاح ''مترفین'' کی ہے۔ اس کا مفہوم آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ پہلے آ چکا ہے۔ یہ ہے دوسروں کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرنے والے۔ اب یہاں دوسری اصطلاح مطففین یا تطفیف کی آئی ہے۔ یہ کیا ہے؟ اگلی آیات میں خود ہی بتا دیا' لیکن اس تک آنے کے لیے بھی ایک تمہیدی تعارف کی ضرورت ہے۔ چین کی آزادی کے زمانے میں جو ان کی لڑائیاں ہوئیں آپ احباب کو شاید علم ہو کہ چیانگ کیائی شک کے ساتھ ان کا بڑا مقابلہ تھا۔ وہ انہی میں سے تھا' انہی کے خلاف تھا۔ وہ جنگ اس کے ساتھ اس لیے اہم تھی کہ امریکہ اس کے پیچھے تھا۔ تو گویا امریکہ کے ہی ساتھ اس جنگ کو گنا جا سکتا ہے۔ چیانگ کیائی شک کی کیفیت یہی تھی۔ یہ جتنی بھی سرمایہ پرست اور استعماریت پرست حکومتیں ہیں' یہ ہمیشہ دوسروں کو آگے رکھ کر آپ پیچھے رہتی ہیں۔ کٹھ پتلی مرواتی ان کو ہیں۔ یہ اس زمانے کی بڑی اہم جنگ تھی اور ایک دنیا جانتی تھی کہ چیانگ کیائی شک ایک پٹھو کی حیثیت سے تھا۔ امریکہ اس کے پیچھے تھا لیکن بہر حال وہ جنگ بڑی سخت ہوئی اور اس میں اسے بہت بڑی شکست ہوئی' چین سے بھاگنا پڑا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نے الگ جا کے پھر وہ حکومت قائم کی۔

اس شکست کے اسباب کیا تھے؟

اس شکست کے بعد امریکہ نے اپنے ہاں یہ سوچنا شروع کیا کہ ہمارے پاس اتنا ساز و سامان اور اسلحہ تھا اور افراد کی بھی کثرت تھی پھر وہی سب کچھ چیانگ کیائی شک کے ساتھ بھی موجود تھا' یہ فوجیں بھی تھیں تو اس کے باوجود ہمیں شکست کیوں ہوئی۔ چیانگ کیائی شک کو شکست کیوں ہوئی؟ اس کے اسباب ڈھونڈنے چاہئیں تاکہ آئندہ کے لیے ہم احتیاط برتیں اور جو اس قسم کے Loop Holes (اسقام) رہ گئے ہیں' ان کا تدارک کریں۔ ان اسقام کو بند کرنے کی غرض سے' ان اسباب و عمل پر تحقیق کرنے کے لیے' امریکہ سے اربابِ سیاست بھی آئے' بڑے بڑے دانشمند بھی آئے' بڑے بڑے اربابِ صحافت بھی آئے۔ انہوں نے آ کر اپنے اپنے دائرے کے اندر شکست کے اسباب معلوم کرنے کی بڑی Inquiries (تفتیشیں) کیں۔ ان صحافیوں میں ایک نامور صحافی جیک بیلجن (Beljon) تھا۔ اس نے آ کر بڑی وسیع تحقیق کی اور پھر ایک کتاب لکھی: China Shakes the World چین نے دنیا کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ یہ کتاب کا نام تھا۔ اور اس میں بحث اسی سے کی گئی تھی کہ چیانگ کیائی شک کو شکست کیوں ہوئی ہے۔ اس کتاب کا جو Preface ہے' آپ اسے دیباچہ کہیے' تمہید کہیے' تعارف کہیے' کچھ بھی کہیے۔ یہ پہلا ہی صفحہ ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ اربابِ سیاست بھی گئے'

دانشور بھی گئے' اقتصادیات کے ماہر بھی گئے' صحافی بھی گئے' اپنے اپنے دائرے میں انہوں نے تحقیق بھی کی' مختلف نتیجے پہ پہنچے۔ میں بھی گیا اور میں نے جس نگاہ سے اس کا مطالعہ کیا تو میں ایک ہی نتیجہ پہ پہنچا ہوں۔ وہ اس کے تعارف میں لکھتا ہے' عزیزانِ من! غور کیجیے کہ یہ لوگ کہاں تک پہنچے تھے۔ اس نے کہا ہے کہ بات ساری یہ تھی کہ چیانگ کیائی شک کو کوئی وہ کچھ کہنے والا نہیں تھا جو محمد ﷺ نے قریش سے کہا تھا۔

شکست کی وجہ تکریم آدمیت کا فقدان ہوتا ہے

محمد ﷺ نے قریش سے کہا تھا کہ **بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ o وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (89:17-18) قریش تمہیں شکست اس لیے ہوئی ہے کہ تم ان لوگوں کی تکریم نہیں کرتے تھے جو اکیلے رہ جاتے تھے' تم مفلسوں محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ وہ صحافی (جیک بیلجن) کہتا ہے کہ چنکیائی شک کو کہنے والا محمد ﷺ نہیں تھا اسی لیے چنکیائی شک کو شکست ہوگئی۔ اس نے کہا کہ میں تو اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں۔ اس کے بعد اس نے یہ ایک چیز کہی ہے کہ جہاں اور جس قوم میں محمد ﷺ قریش کی طرح کہنے والا ہوگا' اسے شکست نہیں ہوسکتی' شکست اسے ہی ہوگی جہاں یہ کچھ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ یہ چنکیائی شک کا اور چین کا ہی معاملہ نہیں ہے' یہ دنیا کی سیاست کا ایک بنیادی اصول ہے۔ سو یہ کہنے والے نے کہا تھا: **بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ** [1] (89:17)۔ اس نے یہ آیت نقل کی ہے اور یہ بھی کہ **وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** [2] (89:18)۔ جی چاہتا ہے کہ دو چار اور آیتیں جو اس کے ساتھ ہیں وہ بھی میں یہاں ملا ہی دوں۔ یہ درمیان کی آیات ہیں۔ قرآن میں ہے کہ انسان کی عجیب کیفیت ہے۔ جب وہ وحی کی روشنی سے منہ موڑ لیتا ہے اور عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے تو قانون کا تصور ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ قانون کے تصور سے مراد یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے کسی نہ کسی انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کے سامنے یہ حقیقت نہ ہو وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے یونہی اتفاقی طور پر واقع ہوجاتا ہے۔ اس کی اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مثلاً **فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ** [3] (89:15)۔ ذرا خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو

---

1. تم ان لوگوں کی تکریم نہیں کرتے تھے جو اکیلے رہ جاتے تھے۔
2. اور تم مفلسوں محتاجوں (یعنی وہ جن کی چلتی گاڑی' کسی حادثے کی وجہ سے رک گئی ہو اور وہ سامانِ زیست سے محروم ہوگئے ہوں) کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے۔
3. جب کسی کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عزت اور آسائش عطا کردیتا ہے۔" (یعنی اُس کے ہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پھولا نہیں سماتا' فخر سے یہ کچھ کہتا ہے اور وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ [1] (89:16)۔ دیکھیے قرآنِ کریم کی رو سے رزق کی کتنی اہمیت ہے کہ جب اسے ذرا بھی گردش آتی ہے اور رزق ذرا ناپا تلا سا ملتا ہے تو فَيَقُوْلُ (89:16) کہنا شروع کر دیتا ہے کہ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (89:16) میرے خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا' میں نے تو کچھ ایسا کیا ہی نہیں تھا۔ جواب ملتا ہے کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا' تم کہتے ہو کہ تم نے کیا ہی کچھ نہیں تھا' تمہیں یاد نہیں ہے۔ كَلَّا (89:17) یہ بات نہیں جو تم کہتے کہ تم نے کچھ نہیں کیا تھا۔ تم نے کیا کیا تھا' سن لو: كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (89:17-18) تم ان کی عزت نہیں کیا کرتے تھے جو تنہا رہ جایا کرتے تھے۔ تم جتھے والوں کی' پارٹی والوں کی' گروہ والوں کی' تو عزت کرتے تھے۔ تمہیں ان سے ووٹ لینے ہوتے تھے' مگر معاشرے میں جو اکیلا رہ جاتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کیا کرتے تھے اور تم مسکین' جس کا چلتا ہوا کاروبار کہیں بند ہو جاتا تھا' وہ کہیں معذور ہو جاتا تھا' تم اس کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔

خدا کسی کو ذلیل نہیں کرتا

عزیزانِ من! اگلی دو آیات بھی ساتھ ہی لے لیجیے: وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا [2] (89:19) اور وہ جو وراثت میں تمہیں جاگیر مل جاتی تھی تو وہ شیرِ مادر کی طرح اکیلے ہی کھا جاتے تھے۔ قرآن تو وراثت بھی اکیلے نہیں کھانے دیتا اور تمہاری یہ کیفیت تھی کہ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا [3] (89:20)۔ یہاں ''جما'' عجیب لفظ ہے۔ کہیں نشیب میں گڑھا کھود لیا جائے کہ اِدھر سے جتنی بارش کا پانی ہو' وہ آگے نہ جانے پائے' اس گڑھے میں جمع ہو جائے۔ یہ ''جما'' ہے۔ کہا کہ تم مال کے لیے ایک گڑھا کھود لیا کرتے تھے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ کر تمہارے گڑھے کے اندر آ جائے۔ تمہاری یہ کیفیت تھی۔ اس لیے تم یہ جو کہتے ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا وہ یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ تمہارا نظام یہ تھا' تم یہ کرتے تھے' یہ ایک فرد کی بات نہیں نظام ہے' تو یہ ہے سارا نظامِ سرمایہ داری۔ تم جو اس وقت ذلیل ہوئے ہو' خوار ہوئے ہو' شکست کھائی ہے' محتاج ہوئے ہو وہ اس نظام کے نتیجے کے طور پر ہوا

---

[1] اور جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس کی کسی غلط روش کا نتیجہ ہے۔

[2] اور تم کرتے یہ تھے کہ جو کچھ تمہارے باپ دادا سے تمہارے قبضے میں آ جاتا' اُسے بھی سمیٹ کر کھا جاتے۔

[3] اور اس کے ساتھ ایسی تدابیر کرتے تھے کہ دوسروں کا مال بھی' اِدھر اُدھر سے سمٹ کر' اس طرح تمہاری طرف کھینچ کر چلا آئے' جس طرح وادی کا تمام پانی' نشیب زمین کی طرف بہہ کر آ جاتا ہے (یعنی ایسا نظام سرمایہ داری جس میں چھوٹے چھوٹے سرمائے' بڑے سرمائے کے اندر جذب ہوتے چلے جائیں اور اس طرح دولت چند افراد کے پاس مرتکز ہو کر رہ جائے۔ اس قسم کا نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ تم اس قدر ذلیل و خوار ہو گئے ہو۔ ہمارے ہاں سے عزت و تکریم نہ یونہی اندھا دھند ملتی ہے نہ اندھا دھند چھنتی ہے۔ وہ بھی انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی اپنی کرتوتوں کا انجام۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے۔ یادرکھو اور یہی چیز ہے جو آئی کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ❶ (83:1) کیا بات ہے! تباہی ہے مطففین کے لیے۔

للمطففین کا مفہوم

پہلے تو اس لفظ کے مادے ''ط ف ف'' کے اعتبار سے بنیادی معنی دیکھ لیں۔ کیا بات ہے عربوں کی اِس زبان اور قرآن کے اس انتخاب کی! تطفیف کہتے ہیں ''کسی کو کچھ دینا تو نا تمام شکل میں دینا کہ وہ اس کے کسی کام نہ آ سکے' اونٹنی کا وہ بچہ ❷ جسے ششمایا ❸ کہتے ہیں' Undeveloped (غیر نشو ونما یافتہ) سا ہوتا ہے' اس کی شکل تو بن گئی ہوتی ہے لیکن وہ کچھ کام کا نہیں ہوتا۔'' ہمارے ہاں ایسے بچے ہوتے ہیں۔ اب پھر آپ کہیں گے کہ میں پنجابی میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ساڈے اینوں اوت جانا کیندے ہیگے نیں۔ ❹ ناتمام بچے کا پیدا ہو جانا۔ اس تطفیف میں یہ ایک چیز ہوتی تھی کہ کسی کو دینا تو اس شکل میں دینا کہ وہ اس کے پورے کام نہ آئے' ناتمام ہو۔ اونٹنی کے پاؤں باندھ ❺ دینا کہ اپنی رفتار سے نہ چل سکے' جتنا تم چاہو اتنا ہی چلے' اس سے آگے نہ چلے۔ وہ نظام کہ جس میں دینے والا دوسرے کو اس طرح دے کہ وہ ایک Undeveloped (غیر نشو ونما یافتہ) سا بچہ ہو۔ وہ تو اس کے لیے مصیبت ہو جائے گی' کام ہی نہیں آئے گا' وہ دے اس طرح کہ اس کے پاؤں ہاتھ باندھ دے کہ آزادی سے' اپنی رفتار سے چل نہ سکے' اس کی صلاحیتیں پورے طور پہ نشو ونما پا ہی نہ سکیں' جتنا یہ چاہتا ہے وہ اتنا ہی چلے' کسی کو اس سے آگے نہ جانے دے۔ ایک لفظ کے ایک مادے کے اندر یہ معنی ہیں۔ پہلی ہی آیت میں کہا کہ تباہی ہے ان کے لیے جو یہ نظام قائم کریں' جو تطفیف کا نظام قائم کریں۔ یہ تو مادے کے اعتبار سے اس کے معنی ہوئے۔ قرآن تو فوراً ہی خود اس کا مفہوم' اس وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ پھر کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہی تفسیر ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں کہا کہ الَّذِيْنَ (83:2) یہ وہ لوگ ہیں الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (83:2) جب دوسروں سے کچھ لیتے ہیں تو پورا پورا ماپ تول کر' نچوڑ کر' لیتے ہیں' اس میں ایک پائی بھی کم نہیں کرنے دیتے' اور دوسری طرف وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (83:3) اور جب دوسرے کو دیتے ہیں خواہ وہ ماپ تول ہو یا وزن ہو تو پورا نہیں دیتے' ڈنڈی مار دیتے ہیں۔ یہ يُخْسِرُوْنَ (83:3) عجیب لفظ ہے۔ ہمارے ہاں ایک محاورہ ڈنڈی مار دینا ہے۔ بنیے ہوتے تھے' ان کے ہاں یہ چیز ہوتی تھی: ڈنڈی مار دینا یعنی وہ

---

❶ تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

❷ اَطَفَتِ النَّاقَةُ: اونٹنی نے ناتمام بچہ دیا۔

❸ شش ماہی۔ چھ ماہ کا

❹ ہمارے ہاں اسے ناتمام پیدا ہو جانا کہتے ہیں۔

❺ طَفَّ النَّاقَةَ يَطُفُّهَا: اُس نے اونٹنی کے پاؤں باندھ دیئے۔

پورا نہیں دیتے۔ بظاہر وزن تو نظر آتا ہے کہ وہ ترازو سے تولتے ہیں لیکن اس کا ڈنڈی مارنے کا عجیب ڈھنگ ہوتا تھا کہ جب دوسرے کو ماپ سے' تول سے' دیتے ہیں تو ڈنڈی مار دیتے ہیں' ان کو کبھی پورا نہیں دیتے جتنا واجب ہوتا ہے۔ لیتے ہیں تو پورے کا پورا لیتے ہیں' دیتے ہیں تو کبھی پورا نہیں دیتے۔ یہ ہے مطففین۔

نظامِ سرمایہ داری کا دوسرا نام ہی نظامِ تطفیف ہے

عزیزانِ من! اب سوچ لیجیے کہ یہ کون تھے۔ سوچ لیجیے کہ قرآن نے نظامِ تطفیف کہا ہے وہ کس کے لیے ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے Capitalism یا نظامِ سرمایہ داری کہیں گے۔ اس میں پورا پورا محنت کش سے لیتے ہیں' اس کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیتے ہیں' اور دیتے ہیں تو وہ اس قسم کا اونٹنی کا بچہ جو اس کے کسی کام نہ آسکے' جو اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ بھی نہ پل سکے' وہ کچھ ترقی کرنا چاہتا ہے تو اس میں اس کو پوری آزادی نہیں دیتے کہ اور آگے بڑھ جائے اور ان کے مقابل آجائے۔ جہاں تک ان کے لیے مفیدِ مطلب ہوتا ہے وہاں تک بڑھنے دیتے ہیں۔ اس سے آگے اسے بڑھنے نہیں دیتے۔ میں نے بتایا ہوا ہے کہ آپ دیکھیے گا کہ جناح گارڈن میں یہ جو Hedge [1] لگی ہوئی ہوتی ہے اس میں ایک مالی ہوتا ہے' بڑا قینچ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس میں سے کوئی شاخ' کوئی پتہ' جو ذرا اس کے اپنے نقشے سے اونچا سر کھینچتا ہے' وہ اسے قرچ [2] کر دیتا ہے۔

عملِ تطفیف کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ ہے نظامِ سرمایہ داری' یہ ہے عملِ تطفیف کہ اپنے نقشے کے مطابق دوسرے کو رکھنا' اتنا ہی دینا اور اگر ذرا اس سے آگے بڑھنے لگے تو اسے فوراً قرچ کر دینا۔ یہ عملِ تطفیف ہے۔ یہاں کہا ہے کہ لیتے ہیں تو پورے کا پورا لیتے ہیں' دیتے ہیں تو کبھی پورا نہیں دیتے' اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے ہی نہیں دیتے' اس کو اتنی آزادی نہیں دیتے کہ وہ ان کے برابر ہو جائے یا اپنی روٹی کے اندر خود آزاد ہو جائے' ساری عمر ان کا غلام' غلام ہی رہے۔ یہ ہے تطفیف۔ اور اس میں تو ایک اور بھی نکتہ بڑا عجیب ہے۔ پہلے تو یہ ہے کہ **اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ** [3] (83:2)۔ قرآنِ کریم کے یہ الفاظ بھی عجیب ہیں۔ جب آدمی اِن پہ نگاہ ڈالتا ہے تو وجد میں آجاتا ہے۔ یہاں تو یہ ہے کہ جب وہ کسی سے کچھ لیتے ہیں تو پورے کا پورا لیتے ہیں۔ آگے جو لفظ ہیں ان کے معنی بھی یہ ہیں کہ جب کسی کو

---

[1] ساتھ ساتھ لگی ہوئی جھاڑیوں کی باڑ۔

[2] کاٹ دینا۔

[3] دوسروں سے اپنے واجبات پورے کے پورے لیتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دیتے ہیں تو جتنا دینا ہوتا ہے اس سے کم دیتے ہیں۔ وہاں لفظ ہے: **وَإِذَا كَالُوهُمْ** (83:3)۔ اگر آپ کے پاس نسخے ہیں تو دیکھیے گا' اس کے اندر یہ بڑی عجیب چیز ہے' بڑا لطیف فرق ہے' جو قرآن نے یہاں کیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ** (83:3) جب ان انسانوں کو ماپتے ہیں' تو ان کا ماپ پورا نہیں دیتے۔ ''ان انسانوں کو جب ماپتے ہیں''!! اب بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ان کو کچھ دیتے ہیں تو پھر بھی یہ ایک جنس کی چیز ہوگئی' ایک میٹریل (مادی) چیز ہوگئی کہ جتنا ان کی محنت کا معاوضہ تھا اتنا نہیں دیتے' وہ کمی محسوس ہو جاتی ہے۔ لینے والا بھی دیکھتا ہے کہ میرا اتنا بنتا تھا' اتنا اس نے دیا ہے۔ یہ کچھ ہے۔

(امیدوار) Candidate کے ساتھ حسنِ سلوک

جب کوئی Candidate (امیدوار) کسی منصب کسی معاملے کے لیے جاتا ہے تو وہ دیکھتے ہیں کہ اِس کی Worth (قدر وقیمت) اتنے کی ہے۔ وہ کبھی بھی اس کی Worth (قدر وقیمت) اس کو نہیں دیتے' یعنی قرآن کی رو سے بات یہ ہوگئی کہ وہ کبھی ان کی صلاحیتوں کو نہ پورا ماپتے ہیں' نہ پورا وزن کرتے ہیں' کم ہی بتاتے ہیں' کم ہی رکھتے ہیں کہ ''ہاں' ٹھیک ہے' کام چل جائے گا' اگرچہ بھئی! ہمارے ہاں تو کچھ اور قسم کا چاہیے تھا' اس کی اور Qualifications (تعلیمی قابلیت کی اسناد) چاہیے تھیں لیکن تم آ گئے ہو' پھر تم یہ سفارش بھی تو بہت بڑی لے آئے ہو' حالانکہ' خواہ وہ ان کے باپ سے بھی زیادہ کوالیفائیڈ ہوں' ''اس کو Discourage ہمت شکنی کریں گے کہ نہیں ایسے نہیں' لیکن بہر حال ٹھیک ہے' رکھ لیتے ہیں' محنت کرنا' ایک دن ٹھیک ہو جاؤ گے' ہم اس چیز کو Watch کریں گے' تم اس چیز کو بس ایسے ہی سمجھ لو۔'' یہ ہے جو قرآن کہتا ہے **اِذَا كَالُوهُمْ** (83:3) جب انسانوں کی قیمت متعین کرتے ہیں' وہ جب انہیں ماپ کرتے ہیں **أَو وَّزَنُوهُمْ** (83:3) جب خود ان کو تولتے ہیں' ان کو ماپتے ہیں تو نہ ان کا ماپ' صحیح اور پورا دیتے ہیں' نہ ان کا وزن صحیح اور پورا دیتے ہیں۔ وہیں سے وہ سرمایہ داری شروع کر دیتے ہیں' انسان کی Worth (قدر وقیمت) انسان ہونے کی جہت سے دیتے ہی نہیں ہیں۔ کون ہیں مطففین؟ کہا کہ یہ ہے تطفیف اور یہ ہے مطفف۔ سوچیے کون ہیں؟ ان کے لیے کہا کہ **وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ** [1] (83:1) یعنی جہاں سے پچھلی سورۃ ختم ہوئی کہ الدین وہ ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوگا اور قرآن فوراً احتاجی کی طرف آ گیا کہ اب دوسری چیز جو ہے وہ یہ ہے۔ الدین وہ ہے جس میں ماپ تول پورا ہوگا' ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا' محنت کا پھل دیا جائے گا اور جو انسان کی Worth (قدر وقیمت) بحیثیت انسان کے ہے' وہ اسے پوری کی پوری قیمت دے' انسانوں کو پورے کا پورا ماپا تولا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے اِن عمل تطفیف والوں کو' جنھوں

---

[1] تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نے یہ نظام قائم کر رکھا ہے' کہا کہ **اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ** [1] (83:4)

نظامِ مطففین میں انسان کا کچومر نکال دیا جاتا ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا یہ ہے کہ یہ جو اس قسم کا نظامِ مطففین قائم کر لیتے ہیں' انہوں نے بڑے انتظامات کیے ہوتے ہیں کہ یہ ان کا نظام فیل نہ ہو' اس پہ کہیں سے حملہ نہ ہو۔ کہا کہ یہ اس زعمِ باطل میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ ان کا یہ نظام کسی زد میں نہیں آئے گا۔ کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا' کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ عزیزانِ من! اب میں اگلے لفظ کے مفہوم بتانے سے پہلے جو مروجہ مفہوم ہے وہیں لے جاؤں گا۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ وہی قیامت کی بات ہے' جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیامت کو اٹھائے نہیں جائیں گے؟ ارے بھائی وہ تو یہاں انسانوں کا کچومر نکال رہے ہیں' کیا قیامت تک ان کا یہ تیل نکلتا ہی رہے گا' ان کو کوئی ایسا پوچھنے والا ہی نہیں ہوگا؟ کیا ایسا ہی ہے وہ نظامِ دین' جسے قرآن نے کہا ہے کہ جس میں یہ کیفیت ہوگی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر کوئی حکم نہیں چلا سکے گا؟ اس کے برعکس اگر وہ نظام ایسا ہے کہ اس نے **لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ** [2] (61:9) ہونا ہے' اس نے غالب آنا ہے تو کیا اس نظام کے اندر بھی یہی کیفیت رہے گی کہ جو جی میں آئے یہ انسانوں کے ساتھ کریں' کوئی ان کو پوچھنے والا نہ ہو' وہ پوچھنے والا قیامت کے دن ہوگا' وہاں اگر ان کو پوچھ بھی لیا تو ہمارا کیا بنا! خوب کہہ گیا ہے: غالب

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

قرآن یہاں انسانیت کے دکھوں کی دوا کرتا ہے۔

قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنا ہوگا

میں نے عرض کیا ہے کہ اگر آپ قرآن کے ان مفردات والفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر لیں تو پھر قرآن کی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ قرآنِ کریم کے یہ سارے مفاہیم' تراجم' تفاسیر دورِ ملوکیت کے ہیں۔ اس دور میں جتنی روایات' جتنے فقہی قوانین' جتنی تفاسیر لکھی گئیں ہمارے تمام تراجم ان پہ مبنی ہیں' ان کا مفہوم ہی ان کے مطابق ہے۔ تراجم میں بھی یہی ملے گا کہ ''کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیامت کے دن

---

[1] کیا یہ لوگ اس زعمِ باطل میں مبتلا اور اس خیالِ خام میں مدہوش ہیں' کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسا ہی رہے گا' اس کو کوئی بدل نہیں سکے گا؟ ان کا یہ فریب نفس ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ جن لوگوں کو انہوں نے یوں اقتصادی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے وہ انہیں راستے سے ہٹا کر' آزادی حاصل کر لیں گے۔

[2] دنیا کے تمام باطل نظاموں پر غالب آنا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اٹھائے نہیں جائیں گے؟ یہاں ''بعث'' کا لفظ آیا ہے۔اس کے معنی ہیں: کسی کو راستے سے ہٹا دینا۔لفظ کے بنیادی معنی سے بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔کہا کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو انسانیت کی راہ میں سدِ راہ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں' رکاوٹیں بن کر بیٹھے ہوئے ہیں' انسان کو اپنے پورے ماپ تول کا نہیں دیتے' کیا یہ اپنے ذہن کی رو سے زعم باطل (ظن) میں بیٹھے ہیں کہ ان کو راستے سے اٹھایا نہیں جائے گا' راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا' تو پھر تو انسانیت کے لیے بڑی ابدی مایوسی ہے کہ یہ یہی کچھ اسی طرح سے یہ رہے گا' یہ قیامت تک کے لیے ہے' کہا کہ کیا یہ اس زعمِ باطل میں بیٹھے ہیں کہ ان کو ہٹایا نہیں جائے گا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اسی دور میں یعنی نبی اکرم ﷺ کے صدرِ اول کے دور میں یہ ان سے مخاطب ہوئے تو پھر بتا دیا کہ یہ دیکھیے' یوں تمہیں راستے سے ہٹایا جاتا ہے۔یہ سارے نظام' جو اس دور میں سامنے تھے' ان تمام نظاموں کو مٹا کر' ہٹا کر' ان کے اوپر یہ نظامِ الدین غالب آیا۔کوئی کسی کا محتاج نہیں تھا' کوئی کسی کا محکوم نہیں تھا۔ یہ سب سے بڑے سرمایہ دار' یہ سب سے بڑے مذہبی پیشوائیت کے صاحبِ اقتدار تو قریش تھے۔ان کے ساتھ جو کشمکش ہو رہی تھی وہ کوئی بت پرستی کی بات نہیں تھی۔ہمارے ہاں تو صرف یہی کہا جاتا ہے کہ صاحب! وہ بت پوجتے تھے' کعبے میں بت رکھے ہوئے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ ہم بت نہیں پوجنے دیں گے' چلو جی! بتوں کو کعبے سے اٹھا دیا' کشمکش ختم ہوگئی۔تو ہمارے ہاں تو کوئی کشمکش ہی نہ ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں تو بظاہر وہ بت رکھے ہوئے ہوتے نہیں ہیں۔

قرآنی نظام کی اصل جنگ مطففین اور مترفین کے ساتھ ہے

عزیزانِ من! یہ بت پرستی کی بات نہیں تھی' بتوں کو تو خدا قرآن میں یہ ہے کہ ان کے معبودوں کو برا نہ کہو۔وہ تو برا بھی نہیں کہنے دیتا' گالی بھی نہیں دینے دیتا۔یہ تھے وہ تصادم اور کشمکش جو ان مطففین' مترفین کے ساتھ تھی۔جو کہا ہے کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو راستے سے کوئی نہیں ہٹائے گا؟ ان کے لیے کہا کہ یہ ضرور راستے سے ہٹائے جائیں گے' اٹھائے جائیں گے۔سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے اٹھائے جائیں گے' کس وقت اٹھائے جائیں گے؟ جواب میں کہا کہ **لِيَوْمٍ عَظِيمٍ** (83:5) ایک بنیادی انقلاب آئے گا۔اس میں یہ راستے سے ہٹائے جائیں گے۔وہ بنیادی انقلاب ہمارے ہاں تاریخ میں تو ہے۔یہ وہی صدرِ اول کا انقلاب ہے جو **محمد الرسول الله و الذین معه** کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا۔جب پھر یہی نظامِ سرمایہ داری اسی طرح مسلط ہو گیا اور پھر اس کے بعد تو ہزار برس سے چلا آ رہا ہے' خود ہمارے ہاں بھی اور اب تو ساری دنیا کے اندر وہ پھیل چکا ہے' تو کیا یہ چیلنج صرف انہی چند قریش کے لیے ہی تھا اور وہاں ان کو راستے سے ہٹا دیا گیا تو کیا قرآن کا یہ مسئلہ ختم ہو گیا؟ قرآن تو قیامت تک کے انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ہے۔پھر وہی نظام آ گیا' ملوکیت کا بھی آ گیا' سرمایہ داری کا بھی آ گیا' مذہبی پیشوائیت کا بھی آ گیا' تو یہ تو ان سب کے خلاف چیلنج ہے۔آج کا

نظامِ سرمایہ داری بھی آ گیا۔قرآن کی ہدایت اور راہنمائی کی رو سے انہیں بھی راستے سے ہٹایا جائے گا۔اس کے لیے ''عظیم'' کا ایک لفظ آ گیا ہے۔اس لفظ کے ایک معنی ہوتے ہیں: بنیادی [1] اساس و بنیاد۔ عَظْمٌ [2] کے معنی ہوتا ہے وہ ہڈیاں جن کے اوپر انسان کا یہ جسم استوار ہوتا ہے۔یہ لفظ بنیادی کے معنی میں ہوتا ہے۔یہ چیز ایک بنیادی انقلاب ہے۔کہا کہ اس انقلاب کے نتیجے میں ان کو راستے سے ہٹایا جائے گا۔

عزیزانِ من! وہ انقلاب کیا ہے اور کب آئے گا؟ اب وقت نہیں ہے اسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا سکتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

1. عَظْمُ الْفَدَّان: کسان کے ''ہل'' کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جس کے آگے لوہے کا ''پھل'' لگا ہوتا ہے۔''ہل'' میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔عَظْمُ الطَّرِیْقِ راستہ کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔اسی طرح عَظَمَاتُ الْقَوْمِ قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔
2. عَظْمٌ: ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ (لغات القرآن۔ پرویز۔ص 1175-1174)

اٹھارواں باب: سورة المطففين (آیات 1 تا 13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1984ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المطففین کی ابتدائی آیات سے ہی ہو رہا ہے اگرچہ اس کا آغاز سابقہ درس میں ہو گیا تھا۔

قرآنی نظام میں نظامِ سرمایہ داری کی رکاوٹ

سورۃ کی ابتدا ہی اس سے ہو رہی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ اعلان سرمایہ داروں کے لیے باور کرنے کا ہی نہیں تھا۔ دراصل وہ اسے باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ یہ بات اکنامکس (معاشیات) کے طالبعلم جانتے ہیں کہ ابتدا میں غلامی کا عہد ہوٗ جاگیرداری کا نظام ہوٗ پھر اس کے بعد یہ Capitalism کا نظام ہوٗ یہ سارے نظام حقیقت میں سرمایہ داری ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ انسانوں کی تاریخ میں اتنی صدیوں سے بھی زیادہ عرصے سے یہ ایک ہی نظام مسلط چلا آ رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظام پنپ ہی نہیں سکا اور پھر یہ اتنا عالمگیر ہو گیا کہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔ اس کے متعلق یہ کہنا اور آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کہنا کہ یہ نظام تباہ ہو جائے گا' بہت بڑی بات تھی۔ یہ خدا ہی کہہ سکتا تھا' اور یہ کبھی اس کو باور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ آج بھی تیار نہیں ہیں' وہ تو دَور ہی کچھ اور تھا۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ لوگ جو کاروانِ انسانیت کے راستے میں اس طرح رکاوٹ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہیں کوئی اس راستے سے ہٹا نہیں سکتا۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہ یہ سرمایہ دار اس دور میں بھی انسانیت کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے۔ یہ نظامِ سرمایہ داری یوں کہیے کہ تاریخ میں اپنے عروج پہ پہنچا ہوا ہے۔ آج بھی اگر آپ دیکھیں تو ان کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں ہوگی۔ باقی سب وہ ہونگے جن کی محنت کو' کسی نہ کسی رنگ میں' کسی نہ کسی شکل میں' غصب کیا جا رہا ہے۔ یہ جو ایک فیصد یا جتنا

بھی آپ سمجھیں' اس سے بھی کم ہیں' یہ ہیں کیا؟ یہ انسانیت کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں' آگے نہیں بڑھنے دے رہے۔ دو چار ہزار سال پہلے بھی جہاں محنت کش' مزدور' غلامی کی محکومی کی حیثیت برداشت کر رہا تھا' اسی طرح آج بھی مفلسی' غریبی میں ہے اور یہ اس کو آگے ہی نہیں بڑھنے دیتے۔ میں نے اس سے پیشتر بھی کہا تھا کہ قرآن نے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ o الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ o وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ❶ (83:1-3) کہا ہے۔ عربی زبان میں تطفیف کے معنی ہیں ''اونٹنی کا ایسا بچہ جن دینا جو نا تمام ہو' اونٹنی کے پاؤں باندھ دینا کہ یہ اپنی رفتار سے نہ چل سکے۔'' یہ ہے لفظ تطفیف۔ مطفف وہ ہیں جو یہ کچھ کرنے والے ہیں۔ نا تمام بچہ دینے سے تو اونٹ کا وہ بچہ اونٹنی نہیں بن سکتا' پاؤں باندھ دیئے جائیں تو وہ اپنی رفتار سے چل نہیں سکتی۔ قرآن تو ایک لفظ کے اندر اتنی بڑی حقیقت بیان کر جاتا ہے۔

مغربیت آج بھی وہیں کھڑی ہے

یہ لوگ جو نظامِ سرمایہ داری کے حامل ہیں' وہ انسانیت کی یہ شکل کرنے والے ہیں تو یہ جو کہا ہے کہ یہ لوگ ان کے راستے میں رکاوٹیں بن کر کھڑے ہیں' انسانیت آگے ہی نہیں بڑھ سکی' آج بھی بھوکے' ننگے' مفلس' بیکار' بیچارے رونے چیخنے والے موجود ہیں۔ ان کو دیکھیے تو تعداد کے اعتبار سے ان کی زیادہ کثرت ہے' کثرت ہی ان کی ہے' انسانوں کی آبادیاں ہی وہی نظر آ رہی ہیں' ان کو آگے ہی نہیں بڑھنے دیا' جہاں وہ دس ہزار سال پیشتر بلکہ اس سے بھی پہلے جس مقام پر تھے وہ آج بھی اسی مقام پہ ہیں۔ انہوں نے انکو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ یہاں کہا ہے کہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں کون راستے سے ہٹا سکتا ہے اس لیے کہا کہ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ❷ (83:4)۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے اور اس طرح لِيَوْمٍ عَظِيمٍ (83:5) ایک انقلابِ عظیم آئے گا' ایک دور آئے گا۔ یہاں ''یوم'' کے معنی دَور کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ تاریخ نے بھی اپنے ہاں جو اصطلاحات وضع کی ہیں اس میں دور کی بھی

---

❶ تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا (83:1)۔ اس ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لیے جائیں لیکن جب اُن کے واجبات دینے کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی ماردی جائے۔ دوسروں سے کام پورا لیا جائے لیکن اس کا معاوضہ کبھی پورا نہ دیا جائے۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ کمایا جائے۔ چیزوں ہی کی نہیں' بلکہ خود انسانوں کی قیمت متعین کرتے وقت بھی یہی خیال رہے' اور کوشش یہ کی جائے کہ ان کی صلاحیتیں دبی' سمٹی' سکڑی اور بندھی رہ جائیں۔ انہیں پوری جولانی کا موقعہ ہی نہ ملنے پائے۔ انہیں اتنا ہی ابھرنے دیا جائے جتنا سرمایہ لگانے والے کے لیے مفید ہو۔ انہیں اس سے زیادہ آزادی دی ہی نہ جائے۔ (مفہوم القرآن)

❷ کیا یہ لوگ اس زعمِ باطل میں مبتلا اور اس خیالِ خام میں مدہوش ہیں کہ یہ نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسا ہی رہے گا' اس کو کوئی بدل نہیں سکے گا؟ ان کا یہ فریبِ نفس ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ جن لوگوں کو انہوں نے یوں اقتصادی زنجیروں (Economic Bonds) میں جکڑ رکھا ہے' وہ انہیں راستے سے ہٹا کر آزادی حاصل کر لیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ایک اصطلاح ہے۔ یہ جو اکنامکس کے' اقتصادیات کے' نظام ہیں ان کو بھی مختلف ادوار کہا جاتا ہے۔ کہا کہ ایک دور آئے گا' وہ انقلاب کا بہت عظیم دَور ہے۔

اب جو اگلی بات کہی گئی ہے وہ بڑی ہی غور طلب ہے۔ کہا کہ **یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (83:6) نظام سرمایہ داری کے خلاف جو معاشی نظام قرآن دے رہا ہے وہ ربوبیت عالمینی کا ہے' تمام افرادِ انسانیہ کی نشو ونما کا نظام ہے' عالمین کا ہے۔ اس میں اقوام بھی آئیں گی' اقوام کے افراد بھی آئیں گے یعنی تمام افرادِ انسانیہ کی ربوبیت ہے۔ یہیں سے قرآن کے افتتاحیہ کا آغاز ہوا ہے: **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** ❶ (1:1)۔ یہ ہے وہ دَور جس کی قرآن نشاندہی کرتا ہے' یہ ربوبیتِ عالمینی کا دور ہے۔ اب یہاں ایک غور طلب چیز ہے جس پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔

نزولی ترتیب کی ایک اہم بات

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ** (83:6) جس دور میں ربوبیتِ عالمینی کا نظام قائم کرنے کے لیے الناس اٹھ کھڑے ہوں گے۔ الناس انسانوں کو کہتے ہیں لیکن آج سمجھنے کے لیے جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے اسے The People (جمہور) کہا جاتا ہے۔ اس کا Concept (تصور) کچھ اس قسم کا ہے۔ People عوام' جمہور کو کہا جاتا ہے۔ میں کیا عرض کروں یہ چیزیں بہت وقت چاہتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات کی نزولی ترتیب' جن لوگوں نے قائم کی ہے' اس کی رو سے ایک بڑی عجیب نمایاں چیز نظر آتی ہے کہ حضور ﷺ کی مکی زندگی میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان میں الناس کہا گیا ہے۔ ان میں ابھی مومنین نہیں کہا گیا کیونکہ ابھی یہ جماعت اس شکل میں یا نظام اس شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ وہاں مومنین کا لفظ نہیں ہے' الناس کا لفظ ہے۔ مدنی زندگی کے اندر جو آیات آئی ہیں وہاں مومنین کا ذکر ہے کہ انہی الناس میں سے ایک جماعت متشکل ہوگئی اور اس جماعت نے عملاً وہ کچھ کر دکھایا جو نظری طور پر مکی زندگی میں کہا جا رہا تھا۔ نظری طور پر وہاں بھی یہ کہا جا رہا تھا کہ یہ نظامِ ملوکیت' یہ نظامِ سرمایہ داری' یہ نظامِ برہمنیت' مذہبی پیشوائیت' نہیں رہے گا۔ الناس کو بتایا جا رہا تھا کہ یہ جو باطل کے نظام ہیں یہ نہیں رہیں گے۔

---

❶ جب انسان اس کارگہہ کائنات کے نظم ونسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آ جاتی ہے کہ اس میں ہر شے کو وہ سامانِ نشو ونما کس طرح بلا مزد ومعاوضہ ملتا چلا جاتا ہے جس سے وہ اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر' ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے ساختہ کلماتِ تحسین وآفرین آ جاتے ہیں' اور وہ بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ: ''اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے اس کائنات کی کسی شے کو نہ بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج کے لیے۔'' (3:189-90)۔ یہی وہ اربابِ علم وایقان ہیں جو صحیح معنوں میں خدا کی حمد کرنے والے ہیں (9:112; 35:27-28)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! مدنی زندگی میں ایک جماعت متشکل ہوئی۔ اس جماعت نے ان نظریات کو عمل میں لا کر دکھا دیا کہ اس طرح ہوا۔ وہ جو اسلام کا نظام متشکل ہوا ہے وہ مدنی زندگی میں آ کر ہوا ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ اس میں یہ تینوں ہی علامتیں نہیں تھیں۔ ملوکیت نہیں تھی۔ ملوکیت کیا ہے؟ کسی انسان کا دوسرے انسانوں کے اوپر حاکم بننا۔ یہ کسی شکل میں ہو' کسی رنگ میں ہو' اس کا کوئی نام رکھ لیا جائے' اس کے لیے قرآن نے اعلان کیا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ (3:78) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اس کے پاس ضابطہ قانون ہو۔ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ (3:78) Executive Powers (نفاذی قوتیں) ہوں اور نبوت بھی کیوں نہ۔ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ (3:78) اس کے بعد وہ انسانوں سے کہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:78) خدا کے محکوم نہیں' میرے محکوم بن جاؤ۔ محکومیت کو تو اس طرح سے اڑا دیا۔ مذہبی پیشوائیت کا سوال ہی نہیں تھا کہ مذہب کا لفظ ہی قرآن میں نہیں آتا۔ وہاں تو دین ہے' ایک نظام ہے' اور سرمایہ داری کی تو جڑیں کاٹ کر رکھ دیں۔ کسی کے پاس زائد از ضرورت پیسہ ہی نہیں رکھا۔ مدنی زندگی میں آ کے تو جب مومنین کو یہ مخاطب کیا گیا ہے تو وہ یہ جماعت تھی جس نے یہ کر کے دکھا دیا۔ اب اس کے بعد یہ دور نہیں رہا۔ درس میں تو تفصیل میں جانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ میں تاریخی طور پر عرض کروں کہ یہ کیوں نہ رہا۔ یہ نہیں رہا۔ ملوکیت آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت آ گئی۔ تھیاکریسی اور اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری آ گیا اور یہ نظامِ سرمایہ داری چلا آ رہا ہے۔ جس طرح باقی دنیا میں چل رہا تھا مسلمانوں کے ہاں بھی وہ جو چلا ہے تو اس وقت سے چلا آ رہا ہے۔

عالمگیر تحریکوں کی شکل میں نظام ربوبیت کا اشارہ

اب قرآن بتا یہ رہا ہے' یہ بڑا غور طلب معاملہ ہے کہ یہ کب راستے سے ہٹائے جائیں گے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ ایک دور آئے گا۔ اب یہاں وہ الفاظ يَقُوْمُ النَّاسُ ہیں۔ یہاں جمہور' The People' ہیں اور اس کا کیا ترجمہ کیا جائے۔ یہ جمہور ربوبیتِ عالمینی کے نظام کو برپا کرنے کے لیے' اٹھ کھڑے ہونگے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو The People (جمہور' عوام) کا لفظ ہمارے ہاں بطور اصطلاح آئی ہے وہ ان کے لیے ہی ہے' اگرچہ پھر وہ جو The People (عوام' جمہور) ہے وہ تو وہی ہیں۔ وہ ہے:

Government of the People, for the People, by the People

وہ Government of the People (عوام کی حکومت) اسی سرمایہ داری کے نظام کے لیے' ملوکیت کے لیے ہوتی ہے لیکن بہرحال فریب ہی سہی The People (جمہور' عوام) تو کہا جا رہا ہے۔ یہ الناس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ کوئی Particular Community (خاص کمیونٹی) یا جماعت یا کوئی قوم یوں نہیں ہے۔ الناس ہے۔ ہزار سال کو تو چھوڑ دیجیے' عزیزانِ من! اپنے اس دور کو دیکھیے۔ مزدوروں کی عالمگیر تحریکیں شروع ہو رہی ہیں۔ دنیا کے اندر اس نظام کے خلاف ان محنت کشوں کی تحریکیں شروع ہو رہی ہیں'

یہ دُور کی بات نہیں ہے۔ میں خود اپنے بچپن کے زمانے کی بات کہہ رہا ہوں۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کہہ لیجیے کہ جن مزدوروں محنت کشوں کو کام مل جاتا تھا' کہیں بھی مل جائے' وہ مطمئن ہوتے تھے' خوش ہوتے تھے' کہیں اس کا نام ہی نہیں تھا کہ کارخانے کے مزدوروں نے کارخانے والے کے خلاف Agitation (اشتعال) شروع کر دی ہو'راج مزدور نے لوگوں کیخلاف Agitation (اشتعال) شروع کر دی ہو۔ مزارع جو کاشتکار تھے انہوں نے زمینداروں کے خلاف Agitation (اشتعال) شروع کر دی ہو۔ میں اپنے اتنے دور کی بات کررہا ہوں۔ اس کا نام ہی نہیں تھا۔ جسے کام مل جاتا تھا وہ خدا کا شکر کرتا تھا' مطمئن ہوتا تھا' اس کا مرہونِ منت ہوتا تھا وہ جو اس کو مزدوری پہ لگا لیتا تھا' کام دیدیتا تھا۔ وہ اس کے حق میں بالکل دعائیں دیتا تھا' یہ نظام ایسا تھا جس میں یہ مطمئن ہوجاتا تھا جس کو کام ملتا تھا۔ جس کو نہیں ملتا تھا وہ منتیں کرتا تھا' خوشامدیں کرتا تھا' سفارشیں کرتا تھا کہ کسی طرح کام مل جائے' اس کے خلاف Agitation (اشتعال' مظاہرہ) نہیں کرتا تھا۔

قومیں اُٹھ کھڑی ہوں گی

ابھی کل تک یہ دَور تھا کہ یہ The People' یہ عوام' تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات ہی نہیں تھی کہ یہ جو نظام ہے یہ باطل ہے' یہ ہماری محنت کی کمائی کو ہضم کیے چلا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھائی جاسکتی ہے' یہ تصور نہیں تھا۔ یہ ابھی ابھی کی بات ہے' تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے۔ یہ جو چیز مزدوروں' محنت کشوں' میں اٹھی ہے اس وقت جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ روز الناس کی یہ تحریکیں اٹھتی ہیں وہ الناس جسے قرآن نے کہا ہے: يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) الناس ربوبیت عالمینی کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے۔ ابھی تو اس کا آغاز ہے جن ملکوں میں اس قسم کی آزادی ہے وہاں منظّم طریقے پر بھی یہ چیز شروع ہوگئی ہے لیکن قرآن تو بتاتا ہے کہ یہ دور آنے والا ہے جس میں یہ The People (جمہور' عوام)' یہ لوگ ان کو راستے سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے' اور اٹھ کھڑے ہونگے لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کیا بات ہے! یہ وہی مقام ہے جہاں سے قرآن نے اپنے نظام کے تعارف کی ابتداء کی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1)۔ اس لرب العلمین میں یقوم الناس آیا ہے۔ اب قرآن کوئی ایک جماعت کی بات نہیں کررہا۔ کہہ رہا ہے کہ اس کے لیے نظام سرمایہ داری کے خلاف الناس اٹھ کھڑے ہونگے۔ یہ وہی ہے جو پہلے کہا تھا کہ ان کو راستے سے ہٹانے کے لیے الناس اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ بات درسوں میں آچکی ہے کہ اس قسم کے انقلابات برپا کرنے کا ایک طریقہ تو وہی جسے انقلابی کہا جاسکتا ہے۔ وہ By Revolution ہوتا ہے جس میں تھوڑے سے وقت کے اندر یہ انقلاب برپا کیا دیا جاسکتا ہے۔ یہ جماعتِ مومنین نے وحی کی روشنی میں کیا اور دوسرا طریقہ وہ ہوتا ہے جسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ایک عجیب چیز ہے۔ یہ Philosphy of History کی جو کتابیں یورپ والوں کے ہاں ہیں یعنی History of Philosphy نہیں بلکہ Philosphy

of History' تاریخ کا فلسفہ کی ہیں' یہ چیز اس کے اندر آتی ہے کہ عقلِ انسانی اپنے تجرباتی طریق سے کرتی یہ ہے کہ کسی ایک نظریئے کو' ایک نظام کو اپناتی ہے' اس پہ عمل کرتی ہے' کچھ عرصہ آگے چل کر اور وہ عرصہ ہزار سال کا بھی ہوسکتا ہے' قرآن نے تو پچاس پچاس ہزار سال کا ایک ایک دن بھی کہا ہے' وہ دیکھتی ہے کہ یہ ناکام رہا ہے' وہ اس کو چھوڑتی ہے۔ تو پھر کیا کرتی ہے؟ اس کے جو اچھے پہلو ہوتے ہیں ان کو لیتی ہے اور چونکہ اس کے سامنے یہ بات نہیں ہوتی کہ مکمل نظام اس کی جگہ کونسا ہے وہ ایک اور نظام وضع کرتی ہے جس میں اپنے تجربے کی بنا پر جو پہلے نظام کے اچھے پہلو ہوتے ہیں' ان کو ساتھ رکھ لیتی ہے پھر دوسرے نظام کو اپنے ہاں لیتی ہے اور اس پہ چل نکلتی ہے۔ اسی طرح اس کے اوپر صدیوں تک عمل کرتی ہے' ہڈیاں ٹوٹتی ہیں' خون کے دریا بہتے ہیں' آگ برستی ہے۔ ان تجربات میں انسانیت کے ساتھ جو کچھ بیتتی ہے وہ تاریخ بتا رہی ہے' اور کچھ عرصے کے بعد جا کر پھر وہ دیکھتی ہے کہ یہ بھی ناکام رہا' پھر وہ اس کے اور پہلے تجربے کے اچھے پہلوؤں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب پراسیس (عمل) ہے' یہ تقاضوں کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے' اسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ عقل اپنے تجرباتی طریقوں سے بھی جس طرف انسانیت کا رخ کرتی ہے وہ منزل وہی ہے جو قرآن نے متعین کی ہوئی ہے۔ اس میں بڑا لمبا عرصہ لگ جاتا ہے' پہنچا دیتی ہے' اس منزل کی طرف لے جاتی ہے مگر اس میں بڑا عرصہ دراز لگتا ہے' انسانیت اس تک پہنچنے کے لیے بڑی ہی اعصاب شکن منزلوں سے گزرتی ہے' پھر وہی اقبالؒ (1877-1938) کا شعر ہے' اقبالؒ نے یہ چیزیں قرآن سے لی ہوئی ہیں:

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیرِ کارواں

دونوں ہی انسانیت کو منزل کی طرف لے جا رہے ہیں' عقل اور وحی دونوں ہی اس کاروان کے امیر کارواں ہیں۔

عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

اور فرق یہ ہے کہ یہ جو انسانی عقل و خرد ہے یہ اس کو اس طرح سے تجرباتی طریق سے آگے لے جاتی ہے اور جو وحی ہے وہ By overnight revolution (شبا شب انقلابی حیثیت سے) اس کو لے جاتی ہے۔ یہ عقلِ انسانی تجرباتی طریقے سے بھی لے جاتی ہے۔ اس میں تاریخ ایک چیز بتاتی ہے کہ اس میں بڑی Destruction (تباہی) ہوتی ہے اور پھر یہ کہ وہ پچھلے نظام کو توالٹ سکتی ہے' انسانیت کے لیے ایک مکمل نظام بنا سکتی' اس میں لَا کا حصہ تو آتا ہے الا کا حصہ نہیں آتا۔ اِلَّا کے لیے انسانیت وحی کی راہنمائی کی محتاج ہوتی ہے۔

الناس کے امراضِ کہن کا علاج صرف اُم الکتاب میں ہے

روس کا انقلاب (1917) جب آ رہا تھا تو اقبالؒ (1877-1038) کو دیکھیے جس انداز سے اس نے یہ بات کہی ہے کہ یہ ٹھیک ہے

تمہارے دلوں کے اندر انسانیت کا درد بھی موجزن ہے ان پادریوں کے ہاتھوں سے، اس مذہب کے ہاتھ سے، سرمایہ داری کے ہاتھ سے، تم تنگ بھی آئے ہوئے ہو، اس کو الٹ بھی رہے ہو، تم الٹ بھی دو گے لیکن یہ تو حصہ لَا ہوگا، بنیادیں اکھیڑنا ہوگا، تخریب ہوگی، ان کو راستے سے ہٹانا ہوگا، اس کی جگہ نظام کونسا آئے گا۔

اے کہ مے خواہی نظام عالمے
جستۂ اورا اساس محکمے

اس زمانے میں یہ روس سے کہہ رہا تھا کہ تمہارا یہ نظام کامیاب نہیں ہوگا۔ تم ایک ایسا نظام چاہتے ہو جو عالمگیر ربوبیت کا ہو۔ کیا اس نظام کے لیے تم نے بنیادیں تلاش کر لی ہیں؟ وہ ام الکتاب میں ملیں گی۔ وہ ٹھیک ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تو یہ تحریکیں اٹھیں خواہ وہ روس کی تھیں یا چین کی تھیں، تعمیری نظام قائم نہیں کر سکیں۔ وہاں پھر وحی کی ضرورت تھی، یہ مقامات انسانیت کی ہسٹری (تاریخ) میں بڑے اہم موڑ ہوتے ہیں یہاں پہنچ کر اگر وہ اساسِ محکم کسی طرح انہیں مل جائے یا وہاں کوئی دینے والا ہو، کوئی قوم ایسی ہو جو انہیں یہ دیدے تو پھر کاروانِ انسانیت صحیح منزل پہ پہنچ جاتا ہے۔ اگر نہ ملے تو پھر وہی اپنا پہلا ہی لَا کا تجرباتی طریق ہے اس لَا کے بعد اِلَّا کے لیے پھر وہ شروع ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے کہ اس نے الناس کو، انسانیت کو، کہاں کہاں مخاطب کیا ہوا ہے۔ نوعِ انسانی یا انسانیت ہی اس الناس کا ترجمہ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس دور میں اس کے لیے The People (جمہور) آتا ہے، جمہوریت کا لفظ آتا ہے، اسے عالمگیر انسانیت کہہ لیجیے، تمام لوگ، تمام انسان، کہہ دیجیے۔ قرآن اس کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا ہے کہ وَ اَرۡسَلۡنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا (4:79) للناس کی طرف، تمام نوعِ انسانی کی طرف، رسول بھیجا۔ حضور ﷺ کی یہ مادی زندگی خواہ وہ 63 برس کی تھی، رسالتِ محمدیہ ﷺ تو ابدی ہے، قیامت تک جاری رہنے والی ہے اور پوری انسانیت کے لیے ہے، یہ للناس ہے۔

رسول خدا ﷺ کی شخصیت الناس کے لیے ہے

حضور ﷺ انہی چند مومنین کے لیے رسول نہیں تھے جنہوں نے حضور ﷺ کی زندگی میں، حضور ﷺ کے زمانے میں، اسلام قبول کیا اور اس جماعت میں شریک ہو گئے۔ یہ تو الناس کے لیے تھا، جو جماعت آپ ﷺ نے تیار کی تھی وہ بھی مقصود بالذات نہیں۔ وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی امت بنایا جو تمام اقوامِ انسانیت سے برابر فاصلے کے اوپر ہے۔ یہ بڑی عجیب تشبیہ ہے، جیسے مرکز ہوتا ہے جہاں محیط کا ہر نقطہ اس سے یکساں فاصلے پہ ہوتا ہے، نہ کسی قوم سے تم کھنچے ہوئے ہو نہ کسی کی طرف جھکے ہوئے ہو۔ پوری انسانیت کے لیے، یکساں فاصلے کے اوپر ہو۔ قرآن کا ایک ایک لفظ، عزیزانِ من! پوچھو نہیں، کیا معنی کے دریا اپنے رکھتا ہے۔ وسطًا کاہے کے لیے ہے؟ لِتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ

(2:143) تا کہ تم الناس کے اعمال کی نگرانی کر سکو۔ یہاں پھر وہی الناس آ رہا ہے۔ یہ جو اسلام کا نظام ہے اس کا سب سے اہم پہلو، جسے کعبہ کہتے ہیں، اب حج کہتے ہیں، وہ جو ایک رسم بن کے رہ گیا، وہ بڑی اہم چیز تھی۔ یہ وہ مرکز تھا۔ ❶

جہاں کعبہ وحج کا ذکر ہے وہاں الناس سے خطاب ہے

قرآن کا مقصود انسانیت کو جمع کرنا تھا اور جب بھی انسانیت کی کوئی عالمگیر تحریک اٹھے گی وہ اسی مرکز کے اوپر جمع ہو گی۔ قرآن یہ چیز کہہ رہا ہے، اقوامِ عالم میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ایک مرکز کی ضرورت ہے جہاں انسانیت جمع ہو جائے۔ حج کے متعلق میرا ایک مضمون ''حج کا مقصود'' طلوعِ اسلام کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، اس میں ایک بات آپ دیکھیں گے سارے قرآنِ کریم میں جہاں جہاں کعبہ اور حج کا ذکر آیا ہے وہاں مومنین سے خطاب نہیں ہے، الناس سے خطاب ہے۔ گویا یہ ایک ایسی تحریک کا مرکز ہے جو عالمگیر انسانیت کے لیے ہے۔ جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ❷ کے ہاتھوں سب سے پہلے کعبے کی تعمیر ہوئی، اس مقام کے اوپر کہا ہے وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا (2:125) اسے ہم نے پوری نوعِ انسانی کے لیے جمع ہونے کا مقام بنایا اور امن کا مقام بنایا۔ انسانیت امن کی تلاش میں ہے۔ اسے پوری انسانیت کے لیے امن کا مقام اور جمع ہونے کا مقام بنایا۔ یہ تھا بیت اللہ کا مقصد اور اس کے بعد یہ کہا کہ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ❸ (2:125)۔ بات دُور نکل جائے گی۔ ہمارے ہاں تو اب یہ ہے کہ تم مقامِ ابراہیمی کو اپنا مصلیٰ بناؤ۔ وہاں خانہ کعبہ کے پاس میں نے بھی دیکھا کہ ایک چھوٹی سی جگہ بنائی ہوئی ہے، کچھ چھوٹی سی چار دیواری سی ہے، اسے مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں نماز پڑھی تھی اور وہاں دو نفل پڑھنے ہوتے ہیں۔ اب وہ یہ بات رہ گئی۔ قرآن نے یہ کہا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ ایک ایسے مقام کی بنا رکھ دی ہے، بنیاد رکھ دی ہے جو انسانیت کے لیے مرکز بننے والا ہے اور پھر جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کو اپنی منزل بناؤ۔

مقامِ ابراہیمی کیا تھا؟

مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کیا تھا؟ جب وہ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے یا ان منازل سے گزرے تو خدا نے یہ کہا: اِنِّیْ جَاعِلُکَ

---

❶ اس نکتے کی مفصل تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء

❷ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا زمانہ 220 ق م کے لگ بھگ ہے۔ (پرویزؒ: جوئے نور، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1994، ص۔2)

❸ مقامِ ابراہیمی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے مسلک و منہاج کے پیچھے پیچھے چلو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) تمام نوعِ انسانی کی جولیڈرشپ یا امامت ہے' وہ ہے جو تمہارے حصہ آئی ہے۔ جب قرآن تم یا تمہارا کہتا ہے تو اس سے ایک فرد مراد نہیں ہوتا' اس فرد کا مسلک مراد ہوتا ہے' اس کا مقصود و منزل مراد ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے سامنے جو نصب العین تھا وہ نوعِ انسانی کی امامت تھی۔ جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم اس مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کو حاصل کرو۔ یہاں وہی للناس آیا ہے اور پھر واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ انسانیت بیشک ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے' بری طرح سے نسلوں میں' قوموں میں' جغرافیائی حدود میں' ملکوں میں' بٹی ہوئی ہے لیکن كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) انسانیت کو ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا ہے۔ یہ پہلے ابتدائی دور میں ایک برادری تھی' پھر اس کے بعد ان میں اختلافات پیدا ہوئے' ہم نے انبیائے کرام کو بھیجا کہ وہ اختلافات ختم کر کے ان کو ایک برادری بنائیں اور انہوں نے بالآخر ایک برادری بن کر رہنا ہے۔ آپ میں سے بھی جو احباب مغرب کے دانشوروں کے کچھ لٹریچر پڑھ رہے ہونگے اور میں تو بہرحال اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں' میری زندگی کا مشن ہے' یہ سارے جتنے بھی اقوامِ یورپ وغیرہ' جتنی قومیں ہیں' جنہوں نے کل تک نیشنلزم کو' قومیت کو' انسان کا سب سے بڑا معالج قرار دیا تھا' آج وہ اس کے ہاتھوں چیخ رہی ہیں' کسی ایسے نظام کو تلاش کر رہی ہیں جس میں قومیت کا مدار نظری اشتراک ہو' نسل رنگ زبان جغرافیہ وطن پہ نہ ہو۔ ابھی یہ چیز ان کے ذہنوں میں تو آ رہی ہے۔ ہمیں تو چھوڑ دیجیے' ہمارا شمار تو کسی چیز میں ہے ہی نہیں' وہ لوگ' جو ان چیزوں پہ تحقیق کر کے' قومیت کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں' وہ اس وقت قومیت کے ہاتھوں از حد نالاں ہیں۔ وہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) کا تصور ذہن میں لیے ہوئے ہیں۔ اس پر ان کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں کہ Humanity (نوعِ انسانی) کی بنا پر ایک قومیت بنی چاہیے۔ [1] قرآن نے یہ کہا کہ یہ چیز ہونی ہے۔

قرآن کے شروع میں بھی الناس اور تکمیل پر بھی الناس

میں نے عرض کیا ہے کہ خدا نے اپنا پیغام رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) سے شروع کیا۔ وہ عالمین کا رب ہے' کسی قوم کا نہیں' کسی نسل کا نہیں' کسی وطن کا نہیں' عالمین کا ہے' الناس کے لیے ہے اور جب قرآن کا اختتام ہوا ہے تو اس پر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ (114:1-3)۔ اس نے تو بات ہی الناس پہ ختم کی ہے' اس نظام کی' اس تعلیم کی تکمیل ہی الناس سے ہوتی ہے۔ یہ قرآن کے آخری الفاظ ہیں: الناس کا رب بھی' الناس کا حاکم بھی' اور ان کا الٰہ بھی وہی' کسی کی عظمت اور بلندی کے جتنے تصورات ہو سکتے ہیں وہ سارے کے سارے خدا کی ذات میں ہیں اور وہ پھر الناس کے لیے آئے گا۔ اب الناس کے بعد آپ پھر دیکھ لیجیے کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) جس دور میں الناس اٹھ کھڑے ہونگے۔ کاہے کے لیے؟ ربوبیتِ عالمینی کے

---

[1] ان نکات کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ ادارۂ طلوعِ اسلام' کراچی' 1955' ص ص 215-221' 285-276' 292-303۔

لیے۔اس سے پہلے جو قوم بھی اٹھتی ہے' کوئی قوت حاصل کر لیتی ہے' وہ دوسری قوموں کی تباہی کے لیے' ان کے استحصال کے لیے' ان کی جڑیں کاٹنے کے لیے' ان کو کمزور کرنے کے لیے' اپنی قوم کو طاقتور بنانے کے لیے' اٹھتی ہے۔قومیت کے نظریئے کا یہ تقاضا ہے۔قرآنِ کریم نے کہا کہ پھر یہ عوام الناس ربوبیتِ عالمینی کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے۔اس دور میں کیا ہوگا؟ بڑی عجیب چیزیں آ رہی ہیں۔کہا کہ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (1) (83:7)۔یہاں ''کتاب'' کالفظ آیا ہے۔یہ وہی ہے جسے اعمالنامہ کہا گیا ہے۔وہی بات ہے کہ یہ جو نظام قائم کیے ہوئے ہیں ان کے نتائج کو ''فجار'' کہا ہے۔میرا خیال ہے پہلے یا اس درس سے پہلے درس میں یہ فاجر اور فجار آ چکا ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں: ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے۔تو بات صاف ہوگئی' نوعِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے' نیشنلزم کے مسلک کے داعی۔انسانیت کو تو قرآن نے ایک عالمگیر برادری قرار دیا ہے مگر یہ الگ الگ کر دینے والے ہیں اور اُس درس میں' میں نے قرآن کی آیات سے بتایا تھا' قرآن نے کہا تھا کہ جنہیں خدا نے ملانے کا حکم دیا تھا' یہ ان کو الگ الگ کرتے ہیں۔

فاسق اور فاجر کون؟

میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں فاسق اور فاجر کا لفظ آ رہا ہے۔یہ صرف الفاظ رہ گئے ہیں' کوئی کھڑے ہو کر سوچتا ہی نہیں کہ اس کے معنی تو دیکھ لیجیے کہ کیا ہیں۔اس کے معنی ہیں: الگ الگ کر دینے والے' ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے۔یہ اسے کیوں سوچیں۔سب سے بڑے الگ الگ ٹکڑے کرنے والے تو یہ خود ہیں۔عالمگیر انسانیت کو ایک برادری بنانا تو ایک طرف' انہوں نے تو مسلمانوں کے ٹکڑے کر رکھے ہیں۔کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کون ہیں؟ کہیے کہ میں مسلمان ہوں۔او ہو نہیں صاحب! مسلمان تو ہوئے۔آپ یہ بتایئے کہ آپ کونسے مسلمان ہیں؟ یعنی تسلی نہیں ہو رہی ہے مسلمان سے۔سنی ہو شیعہ ہو؟ کہ جی میں سنی ہوں۔نہیں بھئی' سنی سے بات نہیں چلتی۔آگے بات کرو۔اہلحدیث ہو' اہلِ فقہ ہو' کونسے ہو؟ کہ جی میں اہلِ فقہ ہوں۔اچھا اچھا' کونسی فقہ کے ماننے والے ہو: حنفی ہو' مالکی ہو' شافعی ہو' حنبلی ہو' چلیے جی اور ٹکڑے۔ٹکڑے در ٹکڑے کرتے چلے جاؤ' گویا کہ ملا کو خدا نے یہ حکم دے رکھا ہے۔جی فقہ حنفی کا ہوں۔اچھا اچھا شکر الحمدللہ۔یہ بتاؤ کہ دیوبندی ہو' بریلوی (2) ہو؟ خدا کا نام مانو بابا! میں کچھ بھی نہیں ہوں۔پہلے ہی غلطی کر چکا جو کہہ دیا' مسلمان ہوں یعنی

---

(1) اُس وقت' اُن لوگوں کا اعمال نامہ' جنہوں نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے' خود جکڑ باندھ کر رکھ دے گا (اور یوں ان کا اپنا وضع کردہ نظام خود ان کی تباہی کا موجب بن جائے گا۔) (مفہوم القرآن۔پرویز)

(2) مزید دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج: ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 373- 375۔

یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ ❶ (2:27)۔تو یہ کیوں ان آیات پہ غور کریں گے۔قرآن کا مقصود تو انسانیت کو عالمگیر برادری بنانا ہے اوران کا مقصدِ دینی' جن کو یہ شرعی کہتے ہیں' خود انسانیت تو ایک طرف رہی' جو مسلمان امتِ واحدہ تھی' اس امتِ واحدہ میں بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے اور اپنے اپنے فرقے میں متشدد ہیں' بڑے فخر سے اعلان ہوتے ہیں' کبھی ان کے اخبارات پڑھیے: الحمدللہ' فلاں جگہ' فلاں مسجد میں' فلاں مولوی صاحب کے ہاتھ' فلاں نے آ کر اسلام قبول کرلیا' بیعت کرلی۔ مسلمان ہے پہلے وہ فقہ کو مانتا تھا' پھر حدیث کو ماننے لگ گیا تو یہ تب مسلمان ہوا۔

آخر تم کون سے فرقے کے مسلمان ہو؟

یہ گرہیں اتنی شدت سے کسی جاتی ہیں کہ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا۔جس قوم کی اپنی حالت یہ ہو کہ وہ مومن کہلانے کے باوجود' خدا نے تو مسلم ہی ان کا نام رکھا تھا' اب صرف مسلم یا مسلمان نام تسلی کی وجہ نہیں رہا' بلکہ آگے پھر ٹکڑے ٹکڑے کیے جاتے ہیں۔ وہ بھی بتانا پڑتا ہے' تو جو قوم اس کو اپنے ہاں دین سمجھ رہی ہو' اسلام سمجھ رہی ہو' وہ عالمگیر انسانیت کا تصور ہی نہیں کرسکتی۔ کسی قوم کے اندر اب قوم بھی کہا جائے تو قوم تو ہے ہی نہیں' مسلمان کہلانے والا ہی سہی جو کچھ بھی ہے۔ دیکھ رہے ہیں چار چار سال سے آپس میں جنگیں شروع ہوئی ہیں' بڑے فخر سے اعلان ہوتا ہے کہ ہم نے کل ایک دن کے اندر دس ہزار عراقی ❷ مار دیئے' وہ کہتے ہیں ہم نے ان کے اتنے جہاز ڈبو دیئے۔

اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

او' کس کے دس ہزار مار دیئے اور تم نے کس کے جہاز ڈبو دیئے' عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ یہ قوم مذہب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ جو بھی مذہب کے پھندوں میں پھنس جائے وہ شاید ہی کہیں عالمگیر انسانیت پہ آئے۔وہ قومیں آئیں گی جو ان مسائل کو صرف آن میرٹ On Merit سوچتی ہیں کہ قومیت کے خطوں میں تقسیم ہونے سے ہمارا کتنا نقصان ہو گیا ہے۔ وہ ان مسائل کو Discuss (زیر بحث لانا) ہی اس نقطۂ نگاہ سے کرتی ہیں کہ اگر اس کے بعد ان تفرقات کو ہٹا دیا جائے' تو ہمیں کس قدر فائدہ ہوگا۔ وہ اس بنا پہ کر رہے ہیں۔ مگر

---

❶ یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام ذمہ داریوں کے قبالہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں جو ان پر خدا کی ربوبیت عالمینی کی رو سے عائد ہوتی ہیں' انسانیت کے تمام رشتوں کو منقطع کر کے (13:21; 13:25) انفرادی مفاد پرستی کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں حالانکہ خدا کے قانونِ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ان رشتوں کو جوڑ کر' تمام نوعِ انسان کو ایک برادری کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں سمجھا جائے (2:213; 10:19; 31:28)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ ایران عراق کی جنگ کی طرف اشارہ ہے جو 1980 سے 1988 تک لڑی گئی۔

ہمارے ہاں اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ ایک مسجد بنتی ہے' اس پر لڑائی فساد شروع ہو جاتے ہیں' پولیس آ جاتی ہے' مقدمے چلتے ہیں کہ اہلحدیث کے لیے ہوگی یا اہلِ فقہ کے لیے ہوگی۔ خدا نے کہا تھا اَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ (72:18) مسجد صرف اللہ کے لیے ہوگی' اہلحدیث کے لیے ہوگی تو گویا خدا اہل حدیث ہوا' وہ کہتے ہیں: نہیں' وہ حنفی ہے' تو اللہ کے لیے جو مسجد ہے تو پھر وہ کہتے ہیں حنفیوں کے لیے ہونی چاہیے۔ مذہب پرست قوم اس پہ نہیں آ سکتی۔ اس لیے کہا کہ کَلَّاۤ اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ (83:7) یہ ہیں فجار' انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے۔ ان کے اعمالنامے کے نتیجے میں لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ ❶ (83:7)۔ سجن ویسے تو جیل خانے کو کہتے ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: کسی کو روک دینا' کسی کو بند کر دینا' رکاوٹیں پیدا کرنے والے۔ کہا کہ یہ جو انسانیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے تھے' خود ان کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دی جائیں گی کہ یہ اپنا نظام نہیں آگے بڑھا سکتے۔ اور یہ عجیب بات ہے' کتاب جو کہا ہے۔ یہ کسی خارجی قوت یا طاقت کی بنا پہ نہیں ہوگا' جو ان کا نظام تھا اس کے لیے کہا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا

یہ شخص ❷ قرآن سے یہ مفہوم لیتا تھا۔ یہ جو تمہارا اعمالنامہ ہے' تمہارے لیے وہی جیل خانہ بن جائے گا' کیا بات ہے اور کیا انداز ہے! اور پھر عربی زبان! اگر آپ دیکھیں تو آپ کو ادبی چاشنی بھی آ جائے گی: وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا سِجِّیۡنٌ (83:8) ہمارے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ جو کہہ رہے ہیں کہ جیل خانہ ہے تو بتائیں گے کہ کوٹ لکھپت کا جیل خانہ ہے یا یہاں کا جو وہ پہلے بنایا ہوا تھا' یا فلاں سنٹرل جیل ہے' کچھ نشاندہی کریں گے کسی جیل خانے کی' کہ جیل خانہ جو کہہ دیا۔ او کہا کہ یہ جیل خانہ نہیں ہے۔ یہ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ (83:9) ہے اعمالنامہ ہے جی۔ کیا بات ہے قرآن کی! مَاۤ اَدۡرٰىکَ (82:18) تم پوچھو گے کہ جی' کونسا جیل خانہ ہے؟ کہا کہ جیل خانہ نہیں بلکہ یہ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ (83:9) ہے۔ یہ تمہارا اعمالنامہ ہے۔

تباہی کیوں آئی؟ پہلے تھا وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ (83:1) تباہی کیوں آئی؟ قرآن کا انداز اور سنت اللہ ہے کہ وہ غلط نظام کے حامل قوم کو پہلے وارننگ دیتا ہے کہ یاد رکھو' تباہی ہو جائے گی' برباد ہو جاؤ گے' رک جاؤ' باز آ جاؤ۔ ہر رسول آ کر یہی کرتا تھا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی قوم کو تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ پہلے اس کو وارن (Warn) نہ کر دیا جائے۔ تنذیر یا انذار رسالت کی سب سے پہلی چیز ہے۔ ان کو وارن کر دیا جائے کہ جس راستے پہ تم جا رہے ہو' یہ تمہیں اندھے کنویں میں گرا دے گا۔ اس کو وارن (Warn) کر دیا جاتا ہے۔ بار بار

---

❶ خود انہیں جکڑ بندھ کر رکھ دے گا (ان کا اپنا وضع کردہ نظام خود ان کی تباہی کا موجب بن جائے گا۔)

❷ مفکر قرآن ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) مراد ہے۔

وارن (Warn) کیا جاتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ ارے باتیں کر رہے ہو، سب جھوٹ ہے جو کچھ تم کہتے ہو' یہ اتنا بڑا صدیوں سے ہمارا عالمگیر نظام چلا آ رہا ہے۔ عزیزانِ من! میں کبھی اس نظام کے متعلق عرض کروں گا۔ کبھی آپ اکنامکس کو دیکھیں یہ جو نظام سرمایہ داری ہے پوری قوت اور اور شدت کے ساتھ یہودیوں کے اندر ہے۔ یہ تو کل کی بات ہے کہ ان کو یہ سلطنت حاصل ہوگئی ورنہ یہ دواڑھائی سو سال سے Wandrer خانہ بدوش تھے۔ اس اتنی وسیع و عریض زمین پر چپہ بھر زمین ایسی نہیں تھی جہاں ان کی حکومت ہو' ان کی مملکت ہو۔ قرآن نے کہا تھا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) نکبت اور زبوں حالی' محکومی اور غلامی اِن کے پیچھے سائے کی طرح لگی چلی آ رہی تھی۔ کل تک یہ صورت تھی لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں سرمایہ داری نظام کی اتنی محکمیت تھی کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں ان کی محتاج تھیں۔ آج بھی اگر امریکہ میں الیکشن ہو رہا ہے تو آپ نے یہ دیکھا ہے کہ ساری دنیا کی نگاہیں لگ رہی ہیں۔ اپنے اپنے کاروبار ٹھپ کر کے رکھے ہوئے ہیں کہ دیکھ لیں کہ الیکشن کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ سپر پاور یہ ہوتی ہیں۔

سپر پاور کی نشانی

عزیزانِ من! الیکشن وہاں ہو رہا ہے تو فیصلہ کن بات یہ ہوگی کہ یہودی کس کی طرف ہوتا ہے۔ مملکت امریکہ کی ہے۔ اور آپ حیران ہونگے کہ روس کی مملکت کے اندر بھی کیفیت یہ ہے۔ وہ بھی ان کے دست نگر ہیں۔ یہ ہے نظامِ سرمایہ داری۔ تو ان سے یہ کہنا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے' تمہارا نظام تباہ ہو جائے گا' وہ تو یہی کہیں گے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اسی لیے کہا کہ تمہیں بتائیں کہ تباہی کس کے لیے ہے: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (83:10) یہ اُن کے لیے ہے جنہیں کہا جا رہا تھا' وہ کہتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے' یہ تباہی ان کے لیے ہے۔ یہ کون ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے؟ آپ کے کتنے سیمینار ہوتے ہیں؟ کتنی کانفرنسیں ہوتی ہیں؟ کس قدر مذاکرات ہوتے ہیں؟ اب تو عالمگیر ہو رہے ہیں مگر ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔

مگر ہم اپنی خُو کیوں چھوڑیں' وضع کیوں بدلیں ❶

عزیزانِ من! ابھی حال ہی میں' ابھی کل تک اسلام آباد میں تمام ممالک اسلامیہ کا ایک سیمینار تھا' کاہے کے لیے تھا؟ متحد ہو جاؤ' اتحاد پیدا کر لو' اختلافات چھوڑ دو۔ اور تو اور رہے' خود یہی جو عالمِ اسلام ہے' وہ تو ہمارے عالمِ اسلام کی ایک تنظیم ہے' پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا جب یہ وجود میں آئی ہے۔ اس زمانے سے یہ مذاکرات بھی ہو رہے ہیں' کانفرنسیں بھی ہو رہی ہیں' ریزولیشن بھی پاس ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہر مقرر اٹھ کر یہ کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' بربادی ہوگا۔ پھر کیا بات ہے کہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔ ہر

---

❶ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے' ہم اپنی وضع کیوں بدلیں سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟ (غالب)

قوم یہ کہتی ہے کہ یہ جھوٹ ہے، تباہی نہیں ہوگی۔ یہی معنی ہیں ورنہ اگر کسی کو واقعی یقین آ جائے کہ تباہی ہوگی تو گھر جانے سے پہلے ہی اس سے پلٹ جائے۔ مگر ہماری کیفیت یہ ہے کہ:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

خبطِ دوا ہے! کیوں؟ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ (83:10)۔ وہ کہنے والے ہیں کہ "جھوٹ کہتے ہوا ایسا نہیں ہوگا۔" اَلَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ (83:11) یہ وہ لوگ ہیں جو اس چیز کو جھٹلاتے ہیں۔

یہاں کہا ہے کہ یہ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ (83:11) ہے یہ تیرا دین آ گیا ہے۔ عزیزانِ من! جو یہ کہتے تھے کہ نہیں، الدین کے معنی مسلک یا اعمال کی خبر یا نتیجہ ہے اگر مسلک یا اعمال کی جزا یا نتیجہ لینا ہو تو وہ بھی معنی ہیں مگر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اس مسلک کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا۔ جو تم کہہ رہے ہو، یہ جھوٹ ہے۔ اور اگر یہ ہو کہ ایسا نظام، ایسا دور آنے والا ہے جس میں تم تباہ ہو جاؤ گے اور دوسرا نظام قائم ہوگا تو وہ اس کو بھی جھٹلاتے تھے۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکیں گے۔ الدین وہ نظام ہے جس کا ذکر کیا جا رہا ہے اور وہ چونکہ ان کے اپنے ہی غلط مسلک کا نتیجہ ہوگا اس لیے الدین کے معنی جزائے اعمال لیا جائے تو وہ بھی معنی ہیں۔ بات تو دونوں میں ایک ہی ہے کہ يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ [1] (83:11)۔ عجیب بات ہے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ [2] (83:12)۔ یہ قرآن ہے، عزیزانِ من! معاف رکھیے، میں تو اس سے وجد میں آ جاتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں بات کروں۔ کون تھے یہ لوگ جو نہیں مانتے تھے، جو کہتے تھے کہ غلط ہے، تباہی نہیں آ سکتی؟

عاصی کا ترجمہ

ہمارے ہاں تو ان الفاظ کے ترجمے گناہگار کیے جاتے ہیں۔ وہ ہر جگہ گناہگار ہے۔ اور جو پھر گناہ اور گناہگار ہے اس کے متعلق تصور ہی نہیں ہے کہ یہ کیا ہے۔ بڑے فخر سے اپنے نام کے ساتھ عاصی لکھتے ہیں۔ اپنے نام کے ساتھ گناہگار لکھتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ گویا ان کے ہاں گناہگار کچھ فخر کی بات ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک صاحب سے کہا تھا، جو فخر سے لکھتے تھے کہ وہ عاصی اور معاصی ہیں۔ میں نے

---

[1] وہ لوگ قانونِ مکافات کی تکذیب کرتے ہیں۔

[2] اور یہ ظاہر ہے کہ اس قانونِ مکافات کی تکذیب وہی شخص کر سکتا ہے جو ہر قسم کے جرائم نہایت جرأت اور بے باکی سے کرتا چلا جائے۔ ایسے جرائم بھی جن کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود ہو اور ایسے بھی جو متعدی ہوں۔ وہ جرائم بھی جو سرکشی کے جذبات ابھاریں اور وہ بھی جن کا نتیجہ افسردگی اور اضمحلال ہو۔ (ایسا شخص یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ ایسا کوئی قانون نہیں جس کی رو سے مجھے میرے جرائم کی سزا مل سکے۔ یہی کیفیت غاصب اقوام کی ہوتی ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہا کہ یہ جو عاصی لکھتے ہو معصیت جرم کو کہتے ہیں، تو اپنے نام کے ساتھ مجرم لکھا کرو تھوڑی دیر بعد دوسرے ہی دن حوالات میں ہوتے ہیں یا نہیں۔ گناہگار کہہ دینے سے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں، کسی کو مجرم کہیے پھر دیکھیے، ہے لفظوں میں الجھاؤ! تو گویا گناہگار فخر کی بات ہے۔ قرآن مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ (83:12) میں الگ الگ الفاظ لاتا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں کیا ہوتا ہے؟ دولت کا نشہ سرکشی سکھا دیتا ہے، حدود فراموشی سکھا دیتا ہے۔ خود دولت کا نشہ کہا جاتا ہے اور جتنی سرکشیاں حدود فراموشیاں یہ استبداد ہوتا ہے، یہ دولت کے زور پہ ہوتا ہے، سرمایہ کے زور پر ہوتا ہے۔ یہ معتدٍ ہے، یہ حدود فراموش ہے، سرکشی کر جانے والا ہے۔ ابھی دوسرے معنی بھی میں عرض کرونگا۔ یہ تو عربی زبان ہے۔ تو ایک طرف تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ قوت کے نشے میں سرکش اور حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ معتدٍ میں ایک چیز تو یہ ہے کہ دخان کی طرح آگے بڑھ جانے والا ہے۔

محنت نہ کرنے کی بنا پر انسانی صلاحیتیں ہی تباہ ہوتی ہیں

جو سرمایہ کار اور سرمایہ دار ہے، وہ محنت نہیں کرتا، اس کا روپیہ کما کر لاتا ہے وہ خود محنت نہیں کرتا۔ محنت نہ کرنے کی وجہ سے اس کے قوائے عملیہ سست پڑ جاتے ہیں، اسی لیے اگر کہیں ان کروڑ پتی کے اوپر بھی ایک دھچکا لگ جائے تو اس کا ہارٹ (دل:Heart) فیل ہو جاتا ہے۔ مزدور کو اگر ایک دن مزدوری نہ بھی ملے تو کوئی بات نہیں، وہ دوسرے دن پھر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ کار اس قسم کے دھچکے کو برداشت ہی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ جو مدافعت کی قوت ہوتی ہے، یہ جو محنت کرنے کی قوت ہے وہ نہیں رہتی، مضمحل ہو جاتی ہے، سست ہو جاتی ہے۔ اثیم کے یہ معنی ہوتے ہیں: سست ہو جانے والا، مضمحل ہو جانے والا۔ اب سرمایہ کار کی دونوں خصوصیتیں یا دونوں گوشے قرآن سامنے لے آیا۔ دولتِ فراواں آتی ہے تو یہ اس کے نشے کے اندر حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ محنت کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اسی لیے کہا کہ كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ (83:12)۔ اور معتد کے معنی میں دوسری طرف جائیے یہ جو متعدی امراض ہوتی ہیں ایک تو یہ امراض ہوتے ہیں کہ دوسرے کو بھی لگ جاتے ہیں۔ ان کے ہاں کے جو سرمایہ داری یا دولت کے پیدا کردہ عیوب ہوتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کو بھی متاثر کرتے ہیں، متعدی مرض ہوتا ہے۔ چھوٹا سرمایہ دار بھی وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے جو بڑا سرمایہ دار کرتا ہے۔ متعدی مرض ہوتا ہے، اور بعض عیوب ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی اپنی ذات تک ہوتے ہیں، متعدی نہیں ہوتے، اس کی ذات کو مضمحل کرتے چلے جاتے ہیں۔ شراب کا نشہ ہے۔ وہ سرکشی پیدا کرتا ہے: اوئے ساڈے سامنے نہ آئیں۔ [1] شراب یہ کرتی ہے۔ رنجیت سنگھ ہاتھی پہ چڑھا جا رہا تھا۔ وہاں سے ایک جاٹ نشے میں گزرا۔ کہنے لگا: اوکانے آ! اے کٹا ویچنا ای؟ اونے کیا اینوں

---

[1] اوکمبخت! ہمارے سامنے نہ آنا، بھسم کر کے رکھ دیں گے۔

لاؤ پھڑ کے۔ ❶ لے آئے۔ دوسرے دن وہ آیا۔ رنجیت سنگھ نے کہا کہ کیوں سردار جی! کٹا خریدنا جے؟ کہنے لگا: جی اوکل والے بیوپاری لد گئے۔ ❷ دولت کا نشہ یہ بھی کرتا ہے۔ ایک شراب کا نشہ ہے' ایک نشہ افیون کا ہوتا ہے' جس میں بیٹھے رہے تصور جاناں کیے ہوئے۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

عزیزانِ من! یہ جو امراض ہیں یہ اپنی ذات کو ہی بھلا دینے والے ہیں' سرمایہ داری کا نشہ' شراب کا بھی ہوتا ہے' افیون کا بھی ہوتا' معتد بھی ہوتا ہے' اثیم بھی ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہیں جو جھٹلاتے تھے کہ ''کون کہتا ہے یہ آ کر رہے گا۔''

کیوں جی کوئی دو چار منٹ ہیں؟ بہر حال ایک بات' ایک آیت تو اور لے لوں: اِذَا تُتْلٰی عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا (83:13) ان کے سامنے تاریخی شواہد پیش کیے جاتے ہیں کہ اقوامِ سابقہ کو دیکھو۔ جس قوم نے بھی یہ نظام اپنے ہاں قائم رکھا' دیکھو اس کا انجام کیا ہوا؟ قارون کا انجام دیکھو' فرعون کا انجام دیکھو' قومِ مدین کا انجام دیکھو۔ قرآنِ کریم نے تمام اقوامِ عالم' جو سابقہ تھیں' ان کے نظامِ سرمایہ داری کا انجام بتایا ہوا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو تم بیان کر رہے ہو' وہ واقعہ تھوڑا ہے۔ کہانیاں ہیں پرانے لوگوں کی! حالانکہ قرآن نے کہا ہے' اس نے تاریخ کی اہمیت بتائی ہے کہ ہم یہ کہانیاں نہیں بیان کرتے ہیں۔ ہم یہ بتاتے ہیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا' دوسری قوم نے ایسا نظام قائم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ یہ معنی ہیں' وہ تاریخ اور واقعات کے نظریئے سے تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے۔ بتایا بھی جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں' اس زمانے کی باتیں ہیں' ہم پہ اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بعینہٖ (اسی طرح) ہم کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا کہ یہودیوں نے یہ کچھ کیا تو ذلت اور نکبت ان کے پیچھے لگ گئی۔ ہم نے کہا کہ یہ یہود کے متعلق ہے' ہمارے متعلق نہیں ہے۔ عیسائیوں نے شرک کیا تو ان کے ہاں تو برہمنیت اس طرح چمٹ گئی تو ہم نے کہا کہ اچھا اچھا یہ عیسائیوں کے متعلق ہے' یہ قومِ مدین کے متعلق ہے' یہ فرعون کے متعلق ہے' یہ قریشِ مکہ کے متعلق ہے۔ ارے یہ سارا کچھ جتنا بھی ہے یہ تو ان کے متعلق ہو گیا:

آنکھ نرگس کی ' دہن غنچے کا ' حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

---

❶ ارے او کانے! کیا تو نے بھینس کا یہ بچہ بیچنا ہے؟ اس نے کہا: اسے پکڑ لاؤ۔

❷ کیوں سردار جی! کیا بھینس کا بچہ خریدنا ہے؟ وہ کہنے لگا: جی' وہ کل والے بیوپاری چلے گئے۔

کوئی اس قرآن میں تمہارے متعلق بھی ہے کہ نہیں۔ کہ ہیں جی، تو کیا چیز ہے؟ او جی جو جنت معلٰی ہے وہ ہمارے ہی لیے لکھی ہوئی ہے۔ سچ کہا تھا قرآنِ کریم نے کہ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ❶ (83:13)۔ان کے سامنے قرآن جب اس قسم کے واقعات اور ان کے نتائج بیان کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ ان کے متعلق ہے جو گزر گئی، ہمارے متعلق نہیں ہے۔ وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (83:13) غلط نظام کے انجام کو جھٹلانے والے تباہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخی شواہد بھی پیش کیجیے تو کہتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں، ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عزیزانِ من! آگے پھر قرآن بتاتا ہے کہ یہ جو نقطۂ نگاہ ہے، یہ جو ذہنیت ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔ سورۃ المطففین کی آیت 13 تک ہم آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ جب اس کے سامنے وہ تاریخی حقائق پیش کیے جائیں جن میں بتایا گیا ہو کہ سابقہ اقوام میں سے جنہوں نے اس قسم کے جرائم کیے وہ تباہ و برباد ہو گئیں، تو وہ، بجائے اس کے ان شواہد سے عبرت حاصل کرے، یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ یہ محض عہد پارینہ کی داستانیں ہیں۔ (مجھ سے ان کا کیا تعلق؟) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

انیسواں باب: سورۃ المطففین (آیات 14 تا 25)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1984ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المطففین کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (83:14)۔ بات یوں چلی آ رہی تھی کہ یہ جو مخالفت کرنے والے ہیں وہ کسی بات کا بھی دلیل و برہان سے جواب نہیں دیتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سورۃ کا نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ سورۃ سرمایہ داروں کے متعلق ہے اور پھر یہ بات کہ جس قسم کے وہ سرمایہ دار جھگڑے کرتے ہیں، جس قسم کے اعتراضات کرتے ہیں، انہی کے متعلق بات چلی آ رہی تھی اور آخری بات یہ تھی کہ جب ان سے کوئی بات دلیل و برہان کی رو سے کی جاتی ہے تو یہ اس کا جواب کسی دلیل سے، علم و بصیرت کی رو سے، نہیں دیتے۔ جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمارے اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے، ہم اسی راستے پہ چلتے جائیں گے۔ جب ان سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے اسلاف کی بات کرتے ہو، تاریخ کے نوشتوں سے کیوں سبق نہیں حاصل کرتے کہ ادوارِ سابقہ میں جس قوم نے بھی اس قسم کا نظام قائم کیا اس کا انجام تباہی ہوا۔ تو یہ سن کر وہ کہتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ کوئی حقائق نہیں ہیں کہ ہم ان سے کوئی سبق حاصل کریں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ علم و بصیرت کی رو سے کوئی بات کی جاتی ہے، دلائل و براہین کی رو سے، اسے پیش کیا جاتا ہے، تو اس کے باوجود کیا بات ہے کہ ان پہ یہ چیزیں اثر نہیں کرتیں۔ اثر نہ بھی کریں، دلیل کا جواب تو دلیل سے دیں، اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ **هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ** (27:64) سچے ہو تو اس کے جواب میں دلیل لاؤ۔ تو یہ کیا چیز ہے؟ یہ ذہنیت کس قسم کی ہے؟ ان کا یہ Attitude (روّیہ) کیا ہے؟ یہ ایسا کیوں ہے؟ قبل اس کے کہ میں اس آیت پہ آؤں، جس میں یہ جواب دیا گیا ہے، میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جو میں بار بار کہتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے جو ہمارے ہاں متداول ترجمے چلے آ رہے ہیں، وہ ان تفاسیر پر مبنی ہیں جو اسلاف سے ہمارے ہاں چلی آ رہی ہیں۔ یہ انہی روایات پر مبنی ہیں جو پہلے

بزرگوں نے کردی ہیں۔ یہ اسی پر آگے چلتے آ رہے ہیں۔ تو یہ کیا چیز ہے؟ یہ ذہنیت کیا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

کیا غیر مسلموں کے اعتراضات حقیقت پر مبنی ہیں؟

میں نے عرض کیا تھا کہ ان تراجم کی رو سے یہی نہیں ہے کہ قرآن کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی بلکہ اس کے متعلق بڑے اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور یہ جو غیر مسلم اسلام پر اس قدر اعتراض کرتے ہیں وہ وہی اسلام ہوتا ہے جو ہمارے ہاں متداول چلا آ رہا ہے اور ہمارے ہاں اسے اسلاف اور سلف صالحین کا مسلک کہہ کر منوایا جاتا ہے۔ آنے والی نسلیں اور خود جو ہماری نسلیں ہیں' وہ اس سے برگشتہ ہو رہی ہیں بلکہ اسلام سے سرکشی نہیں متنفر ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ اس کے لیے قرآن نے خود اپنے سمجھنے کا تصریفِ آیات سے طریق بتایا ہوا ہے کہ ایک بات اگر ایک جگہ کہی گئی ہے تو تم دوسرے مقامات میں دیکھو کہ قرآن خود اسکی وضاحت کس طرح کرتا ہے۔ اس تصریح کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ آیت سامنے آتی جا رہی ہے کہ وہی تصریفِ آیت کی رو سے وہ بات سمجھ میں آئے گی۔ قرآنِ کریم کی ابتدا میں سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلی سورۃ البقرۃ کی پہلی ہی آیت کے اندر ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ راہنمائی یا ہدایت متقیوں کے لیے ہے اور متقی تو آپ جانتے ہیں کہ وہ تو مومن سے بھی اگلا درجہ ہوتا ہے: پکا' صاحبِ ایمان' پرہیزگار۔ تو ہدایت ہے' متقیوں کے لیے۔ جو پہلے ہی متقی ہیں' ان کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ہدایت یافتہ ہیں اور جو ہدایت یافتہ نہیں ہیں ان کے لیے یہ ہے نہیں۔

جو پہلے ہی متقی ہے اس کے لیے ہدایت چہ معنی دارد؟

اس کتاب کا کیا مصرف ہوا کہ جو پہلے ہی متقی ہیں ان کے لیے یہ ہدایت ہے' جو متقی نہیں ہیں ان کے لیے تو پھر یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ کیا یہ ہے مصرف قرآن کا؟ پہلی ہی آیت میں آپ دیکھیے کہ ایک ترجمے سے بات کہاں سے کہاں چلتی ہے۔ آگے بات چلتی ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6) یہ جو کافر ہیں' جو نہ ماننے والے ہیں' تمہارے لیے برابر ہے کہ تم انہیں آگاہ کرو یا نہ آگاہ کرو۔ انہوں نے تو ایمان لانا ہی نہیں ہے۔ کفار کے لیے تو یہ برابر ہو گیا کہ ان تک یہ پہنچاؤ یا نہ پہنچاؤ' ان کو آگاہ کرو یا نہ آگاہ کرو' انہیں تعلیم دو یا نہ تعلیم دو۔ انہوں نے تو ماننا ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ سر کھپانے کا کیا فائدہ ہے۔ ہدایت تو متقیوں کے لیے ہے۔ نہ ماننے والے' جن کو کفار کہا گیا ہے' ان کے متعلق یہ ہے کہ صاحب! ان کو سمجھانے کا یا نہ سمجھانے کا فائدہ ہی کچھ نہیں ہے' ان کے لیے سمجھانا یا نہ سمجھانا یکساں ہے۔ کیوں؟ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (2:7) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ آپ غور کر رہے ہیں کہ یہ پہلا ہی فرق ہے یہ جو قرآنِ کریم کے ان تراجم سے سامنے آتا ہے۔ ان کے دلوں پہ مہر لگا دی ہوئی ہے' تو ٹھیک کہا پھر رسول اللہ ﷺ کی خوامخواہ کے لیے سر کھپانے کی ضرورت کیا ہے کیونکہ اللہ نے ان کے دلوں پہ مہر لگا رکھی ہے۔

خدا نے جن کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہو' اس مہر کو کون توڑ سکتا ہے اور پھر ان کا اس میں کیا اختیار اور کیا قصور' تو یہ تو یہ ہونا چاہیے کہ یہ مرفوع القلب ہیں' خدا نے ان کے دلوں پہ مہر لگا دی' اب انہیں سمجھاؤ یا نہ سمجھاؤ' ان کے لیے یکساں ہے۔ پھر اگلی بات جزا اور سزا کی ہے۔ اس سے تو یہ سلسلہ ختم ہوا۔ ان کے تو دلوں پہ خدا نے مہر لگا دی تو وہ کہیں گے کہ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے' ہم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی تم نے نہیں رکھی تھی۔ یعنی خدا نے مہر جو لگا دی۔ یہ جتنی بھی اس قدر الجھنیں پیدا ہوتی ہیں' ان کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں کے جنہیں اسلاف کہا جاتا ہے' یا جو بھی اس مسلک کے پیرو ہیں' وہ دو باتوں کو اکٹھا نہیں کرتے۔ اسی آیت میں **خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَ عَلٰی سَمْعِھِمْ وَ عَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ** ❶ (2:7) دلوں پہ مہر' کانوں میں ڈاٹ' آنکھوں پہ پردے' خدا نے لگا دیئے' اور اسی آیت کے اگلے دو لفظ یہ ہیں جہاں یہ آیت ختم ہوتی ہے: **وَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ** ❷ (2:7) ان کو سخت عذاب دیا جائے گا۔

غور طلب پہلو

یہ عجیب قسم کا تصور ہے کہ خدا نے مہر لگا دی' سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سلب کر لیں۔ رسول سے کہہ دیا کہ انہیں سمجھاؤ یا نہ سمجھاؤ ان کے لیے بات ایک ہی جیسی ہے' ان میں تو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تو چلیے مرفوع القلب ہوئے' جیسے پاگل کہ اسے دنیا میں کوئی سزا ہی نہیں دیتا' وہ مجرم ہی نہیں ہوتا' یہ لوگ تو اس کیٹگری میں آ گئے اور اس کے بعد یہ کرنے والا' **ختم اللہ** (2:7) خدا نے مہر لگا دی' خود ہی کہہ رہا ہے کہ **وَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ** ❷ (2:7) ہم انہیں سخت سزا دیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ چیزیں میرے ذہن میں کیوں آ گئیں' میں آپ کو کیوں سمجھا رہا ہوں کیوں زور دے رہا ہوں کہ اس طرح سمجھو۔ اس لیے کہ قرآن نے کہا تھا کہ قرآن میں تدبر کیا کرو' تفکر کیا کرو' غور کیا کرو' فکر کیا کرو' عقل و فہم سے اس کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ تو انسان جب بھی کھڑا ہو گا اور عقل و فہم سے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو اس کے سامنے یہ دو متضاد چیزیں آئیں گی کہ اگر خدا نے مہر لگا دی ہے تو اس کے بعد **وَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ** (2:7) کیوں ہے؟ پھر عذاب کیوں؟ تو اس طرح سے خدا کا کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ خود ہی مہریں لگا دیں' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر دی' کہہ دیا قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے' رسول سے کہا ان کو سمجھاؤ یا نہ سمجھاؤ ان کے لیے یکساں ہے۔ او بابا! یہ تو مرفوع القلب

---

❶ ان لوگوں کی اِس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِن میں دیکھنے بھالنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی (جس طرح غصے میں انسان پاگل ہو جاتا ہے)۔ ان کی آنکھوں پر جذبات پرستی کے ایسے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ نشاناتِ راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ جاتے ہیں کہ وہ آوازِ جرس سے بھی کارواں کا سراغ نہیں پا سکتے۔ ان کے قلب و دماغ پر اس قسم کے غلاف چڑھ جاتے ہیں کہ وہ گرد و پیش پر غور کرنے سے بھی صحیح سمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ سب اِن کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ (17:46; 83:14; 45: 23; 41: 4-5; 18:57)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ لوگ اپنے آپ کو زندگی کی حقیقی شیرینیوں سے محروم کر لیتے ہیں اور تباہی و بربادی کے جہنم میں گر جاتے ہیں۔ کس قدر الم انگیز ہے ان کا یہ انجام! (ایضاً)

ہیں، یہ تو پاگل ہیں اور اس کے بعد کہا وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7) یہ کیا بات ہے؟ معاذ اللہ خدا کا کلام تو ایک طرف، اور وہ بھی آخری کلام، کسی انسان کی کتاب میں بھی اس قسم کی چیز ہو، تو آپ اس کو اٹھا کر پھینک دیں گے۔ معاذ اللہ، کہ یہ ہے کیا چیز؟ اور اسی آیت میں وہی ختم اللہ کر کے کہا کہ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7)۔

قرآن کو سمجھنے کا طریق صرف تصریفِ آیات ہے

ساری بات قرآنِ کریم کو تصریفِ آیات [1] کی رو سے سمجھنے کی ہے۔ خدا نے خود کہا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کا یہ طریقہ ہے کہ جو موضوع کسی ایک مقام پہ آیا ہو یہ دیکھیے کہ دیگر مقامات میں قرآن نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔ اس کا یہی دعویٰ ہے اسی سے قرآنِ کریم سمجھ میں آتا ہے۔ درمیان میں کبھی وہی میں آ ہی جاتی ہے: بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر۔ مجھے اس طریق پر عمل کرتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے۔ بات بڑی ہے، منہ چھوٹا سا ہے لیکن اس کا یہ فضل وکرم ہے کہ اب قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں مجھے کوئی الجھن پیدا ہوتی ہو۔ اس لیے کہ میں نے تصریفِ آیات سے سمجھا ہے۔ ایک وقت میں جو آیت میرے سامنے آتی ہے قرآن کے سارے مقامات میرے سامنے ہوتے ہیں، وہ خود اپنے مقامات کو واضح کرتا چلا جاتا ہے، اور وہیں سے یہ نظر آتا ہے کہ قرآن کا اعجاز کیا ہے۔

اب کسی ایک چیز کو لے لیجیے جس کے لیے میں نے یہ تمہیدی تعارف ضروری سمجھا۔ یہ جو آیت ہمارے سامنے آئی ہے کہ ہم نے دلوں پر مہر لگا دی۔ کہا یہ ہے کہ انہیں اتنا سمجھایا جاتا ہے، اتنی کوشش کی جاتی ہے، اس کے باوجود یہ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ماننا تو ایک طرف رہا کم از کم سمجھنے کے بعد انکار کریں، کوئی اعتراض کریں، کوئی دلیل دیں، تو کچھ بات بھی ہوئی۔ لیکن اگر وہ پہلی ہی آیت میں آئیں گے کہ صاحب! بات تو صاف ہے۔ آپ نے خود ہی ہمارے دلوں پہ مہریں لگا دی ہوئی ہیں تو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے یہیں بات صاف کر دی کہ جسے یہ دلوں پہ مہر لگنا کہتے ہیں، یہ کیا چیز ہے۔ یوں، عزیزانِ من! دو آیات ملائیے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہا کہ كَلَّا (83:14) بات یوں نہیں جیسے یہ کہہ رہے ہیں۔ دیکھا قرآن کا یہ ''کلاّ'' کہاں آتا ہے: یوں نہیں ہے، بَلْ (83:14) بلکہ بات اصل میں یہ ہے کہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (83:14) جو ان کے اعمال ہیں، وہی زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں۔ اب نہ ان آیات کے سمجھنے میں کوئی اشکال رہا، نہ کوئی اعتراض رہا، نہ کوئی الجھن رہی۔ اب رہی یہ چیز کہ وہاں اللہ ان چیزوں کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے۔ آپ اسے یاد رکھیے کہ جو چیز بھی خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے، خدا اسے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ معاف رکھیے کہ یہ پیش پا افتادہ سی مثال تھی کہ انسان خود اولاد پیدا کرتے ہیں، اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم جس کو

---

[1] قرآنِ کریم سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، انتیسواں پارہ، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006، ص ص۔

چاہیں، بیٹا دیتے ہیں، جس کو چاہیں بیٹی دیدیتے ہیں۔ یہ اس کا سمجھانے کا انداز ہے۔ اور بات یہ ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ اس قانون کی طرف اشارہ کر دیتا ہے، کبھی وہ قانون دینے والے کی طرف یا قانون بنانے والے کی طرف اشارہ کر دیتا ہے، وہاں اشارہ خدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ دوسرے مقام کے اوپر وہ اس قانون کو واضح کر دیتا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ جب خدا نے اپنے متعلق کہا تھا تو اس کے معنی یہ تھے۔ اس کا ترجمہ یوں کیجیے، اس کا مفہوم یوں سمجھائیے کہ خدا کے قانون کے مطابق ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور قانون یہ ہے کہ جس قسم کا کوئی عمل کرتا ہے اسی قسم کا اس کا قلب اور ذہنیت ہو جاتی ہے۔ یہ چیز نہیں ہے کہ میں نے اپنی طرف سے یہ مفہوم لیا ہے۔ میں نے قرآن کا مفہوم اس طرح تصریفِ آیات سے متعین کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ میں نے متعین کیا ہے۔ قرآن نے اپنے دوسرے مقامات میں خود ہی اس کو متعین کیا ہے۔ میرا تو اتنا ہی ہے کہ قرآن کا جو ایک مقام آتا ہے اس کا مفہوم دوسرے مقامات کو سامنے رکھ کر متعین کرتا ہوں اور وہاں ریفرنسز (حوالے) دیتا جاتا ہوں۔ تو اب جب یہ آیت آ گئی کہ انسان کے اپنے اعمال ہی زنگ بن کر اس کے دل پر لگ جاتے ہیں تو وہ جو پہلی آیت تھی اس میں ختم اللہ کی بات ثابت ہو گئی کہ خدا کے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال کے نتائج زنگ بن کر اس کے قلب و دماغ پر محیط ہو جاتے ہیں اور یوں انسان اپنی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو خود کھو دیتا ہے اور جب وہ خود یہ کچھ کرتا ہے تو پھر وہ ٹھیک بات ہے کہ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7) اس کی سزا بھگتا ہے، سزا نہیں بھگتتا بلکہ اس کا نتیجہ بھگت رہا ہے۔ جب آپ کانوں میں انگلیاں دے لیں گے اور آپ سنیں گے نہیں تو آپ ان چیزوں سے جو سماعت کی رو سے آپ تک پہنچ گئی ہیں محروم رہ جائیں گے، اسی کو غشاوة کہتے ہیں۔ جب آپ سورج نکلنے کے باوجود آنکھیں بند کر لیں گے تو کوئی چیز آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

عزیزانِ من! تم نے آنکھیں بند کیں تو تاریکی چھا گئی۔ اسے یوں سمجھو کہ خدا نے تمہارے سامنے تاریکی پیدا کر دی۔ دوسری جگہ کہے گا کہ جو آنکھیں بند کرے گا اس پہ تاریکی چھا جائے گی۔ اس کا نتیجہ بہر حال دونوں صورتوں میں یہی تاریکی ہوگا۔ دونوں صورتوں میں نہیں بلکہ یہ کہنے کے دو طریقے ہیں کہ جو آنکھیں بند کر لے گا اس پہ راستہ روشن نہیں ہوگا۔ اس کا یہ نتیجہ نکل آیا۔ اگلی بات یہ ہو گئی کہ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (2:7) اس کے لیے تباہی ہے۔ غلط راستوں پہ چلے گا، کنواں راستے میں آئے گا تو اس میں گر جائے گا۔ تو قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریق یہ ہے۔

عزیزانِ من! میں نے یہ طریقہ اپنے لیے اختیار کیا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ قرآن اپنی بات آپ صاف کرتا ہے۔ خدا نے خود کہا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا، ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس نے یہ کتاب واضح کر دی ہے، اس کے لیے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ سورج کو لیمپ سے نہیں ڈھونڈا کرتے کہ وہ کہاں ہے۔

انسان کو سزا نہیں ملتی، یہ تو اُس کا اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہے

یہ قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ جو بھی اس پہ محنت کرے گا وہ اس دعوے کی صداقت کو خود پا لے گا۔ یہاں کہا کہ کَلَّا (83:14) یوں نہیں، جیسا تم کہہ رہے ہو کہ خدا نے مہریں لگا رکھی ہیں بالکل نہیں، ایسے نہیں۔ بَلْ (83:14) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ❶ (83:14) اور پھر یہ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (83:14) ہے۔ قرآن کا تو ایک ایک لفظ ہمارے لیے پہاڑ ہے۔ قرآن کا کہنے کا عجیب انداز ہے۔ کہا کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہی زنگ بن جاتا ہے: مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ تو پھر اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا۔ جب آنکھیں بند کر لی جائیں گی تو تاریکی چھا جائے گی، انسان روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ اس لیے اگلی ہی آیت میں قرآن نے کہا کہ کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ❷ (83:15)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پھر خدا کی یہ جو تمام عطا کردہ خوشگواریاں، نعمتیں، آسائشیں ہیں، تم ان تمام سے محروم ہو جاتے ہو۔ آنکھیں بند کر لینے والا جب روشنی سے محروم ہوتا ہے تو روشنی کی وجہ سے جس قدر بھی انسان کو نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہونی ہوتی ہیں وہ اپنے آپ کو ان سے محروم کر لیتا ہے۔ یہ لَمَحْجُوْبُوْنَ ہے۔ ویسے تو حجاب کے معنی نقاب کے ہوتے ہیں، پردے کے ہوتے ہیں مگر ''حجب'' کے معنی ہوتا ہے: محروم ہو جانا۔ وہ اپنے آپ کو محروم کر لیتے ہیں۔ یہ روش، یہ ذہنیت، اختیار کی جائے تو پھر خود اپنے آپ کو محروم کر لینا ہے۔ یہ محرومی کیا ہے؟ قرآن کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے۔ قرآن کی تعلیم کیا ہے؟ انسانیت کا ارتقا۔ یہ وہی ہے جسے عام طور پہ Evolution (ارتقا) کہتے ہیں۔ قرآن نے پہلے تو Physical Evolution یعنی مادی دنیا کے ارتقا کی بات کی ہے۔ وہ ایک موضوع کچھ Scientific (سائنسی) سا، یا فنی سا ہے کہ کس طرح زندگی مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کو ارتقا کہتے ہیں، یہ اس کے لیے Evolution کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن قرآن نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ عربی زبان میں ارتقا ❸ کا لفظ ہے۔ اس میں بلندی کی طرف آنے کے معنی ہوتے ہیں اور سائنس کی تحقیق یہی چیز بتا رہی ہے کہ زندگی ان مراحل سے گزر کر بلندیوں کی طرف آتی جاتی ہے۔ انسان حیوانات سے بلند مقام پر ہے اور اس سے پہلے منازل میں، جہاں یہ زندگی تھی، کہیں کیکڑے تھے، کہیں سانپ تھے، کہیں یہ مگرمچھ تھے، یہ ان سے گزرتے ہوئے آئے تو پھر انسان ہی بلند

---

❶ ان کے غلط اعمال اس طرح زنگ بن کر ان کے دلوں پر جم گئے کہ ان میں اب سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ لوگ (اُس دور میں جب عالمگیر انسانیت کی ربوبیت عامہ کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی) اس کے ثمرات سے محروم رہ جائیں گے۔ ان کی مزرعِ ہستی زمین شور کی طرح بے برگ و گیاہ رہ جائے گی (اس دنیا میں بھی ان کی یہی حالت رہے گی اور اُخروی زندگی میں بھی)۔ (ایضاً)

❸ ''ر ق ی'' کا مادہ (Root) ہے۔ رَقِیَ۔ یَرْقٰی۔ رُقِیًّا۔ رَقِیًّا اوپر چڑھنا۔ نیز اِرْتَقٰی وَتَرَقّٰی ۔اوپر چڑھنا۔ رَقَا الطَّائِرُ کے معنی ہیں ''پرندہ اپنی اڑان میں بلند ہو گیا''۔ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی تالیف ''مقاییس اللغۃ'' میں کہا ہے کہ رَقْـــیٌ کے بنیادی معنی ہیں (۱) چڑھنا اور (۲) تعویذ منتر وغیرہ شامل ہیں۔ اَلْمَرْقَاةُ وَالْمِرْقَاةُ سیڑھی کو کہتے ہیں اور اَلرِّقَاءُ پہاڑیوں پر چڑھنے والا۔ صاحب تاج العروس نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔

مقام کے اوپر ہے۔ اس کے لیے ارتقا کا لفظ نہایت موزوں ہے یعنی یہ آگے بڑھنے کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ انسانیت کا ارتقا کرے گا' اس کو آگے بڑھائے گا۔ قرآن کے قوانین یا قوانینِ خداوندی کے اتباع سے یہ ہوتا ہے یا یہ ہوگا کہ زندگی آگے بڑھ جائے گی' زندگی بلند ہوجائے گی' پستیوں سے اوپر آجائے گی۔

کسی مقام پر رُک جانا ہی عذاب ہے

عزیزانِ من! جب انسان ان قوانین کا اتباع چھوڑ دے گا' سوچنا سمجھنا چھوڑ دے گا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی جس مقام پر ہے وہاں رک جائے گی' پھر آگے نہیں بڑھے گی' پھر بلند نہیں ہوگی' جامد ہوجائے گی۔ یہ جو کسی جگہ فرد کا اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے' قوموں کا باقی اقوام کے مقابلے میں' خود زندگی کے کاروان کا آگے بڑھنے سے کسی مقام کے اوپر رک جانا ہے' جامد ہوجانا ہے یا کھڑے ہوجانا ہے' یہ ہے جس کو عذاب کہا گیا ہے۔ یعنی رک گیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ جب یہ سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لیں گے' زندگی جامد ہوجائے گی۔ اس کے لیے کہا کہ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ❶ (83:16)۔ ہمارے ہاں تو جہنم کا ترجمہ بھی دوزخ اور جحیم کا ترجمہ بھی دوزخ اور نار کا ترجمہ بھی دوزخ کیا جاتا ہے اور دوزخ عربی کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اس سے ذہن میں تصور نہیں آتا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ قرآن کہہ یہ رہا ہے کہ یہ فہم و عقل و فکر سے کام نہیں لیتے' دلیل و برہان سے بات نہیں کرتے۔ یہ کہتے ہیں کہ جو اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے ہم تو وہی کرتے چلے جائیں گے' اس سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس نے کہا کہ یہ جو ہزار برس پہلے کے کسی بزرگ نے یا ان کے کسی بڑے نے کہہ دیا اگر اسی کے اوپر رک گئے تو انسان کا تدبر تو ہزار برس پہلے تک رہ گیا' وہیں رک گیا' آگے بڑھا ہی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم تو قدم قدم پر تدبر اور تفکر کا حکم دیا ہے اور قرآن کا یہ حکم نہ کسی خاص زمانے کے لیے ہے' نہ خاص مقام کے لیے ہے' نہ خاص اشخاص کے لیے ہے۔ یہ قیامت تک کے لیے' تمام نوعِ انسانی کے لیے' ہر دور میں ہر مقام میں راہنمائی دیتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کے لیے تدبر کا حکم ہے۔ کوئی ذہنیت' کوئی مسلک' کوئی روش' جو تدبر سے روک دیتی ہے وہ انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے اور ہمارے ہاں سب سے بڑی چیز ہی یہ ہے جس کو بڑا ہی مقدس سمجھا جاتا ہے' ٹھیک ہے' وہ سلفِ صالحین ہیں' بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہے' ان کا احترام ہے' ان کی تکریم ہے لیکن جس مقام کے اوپر ان کا تدبر پہنچا تھا وہاں تدبر رک تو نہیں گیا' جامد تو نہیں ہوگیا اور زندگی تو آگے بڑھ رہی ہے' زمانے کے ساتھ ساتھ انسانی علم کی سطح بلند ہوتی چلی جارہی ہے' اب یہ سمجھنا کہ صاحب! نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر وہ نبوت تو ختم ہوئی اور ختمِ نبوت سے کچھ کمی واقعہ نہیں ہوئی' قرآن محفوظ ہوگیا۔ نبوت تو قیامت تک ختم ہوئی۔ اگر ہم سمجھیں کہ غور و فکر بھی ہزار برس کے انسانوں تک ختم ہوگیا' آگے بڑھا ہی نہیں

---

❶ ان کی نشوونما رک جائے گی (کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما تو دوسروں کی ربوبیت سے ہوتی ہے' نہ کہ ان کے حقوق تلف اور ان کی محنت سلب کر لینے سے)۔ یوں وہ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے' تو یہ انسان تو جامد ہو گیا' اس کی فکر جامد ہو گئی' دنیا کی باقی قومیں فکری ارتقا سے کہیں سے کہیں جا پہنچیں اور یہ ہزار برس پہلے کے فکر میں ہی پھنس کر رہ گیا۔

روایات کی روشنی میں آسمان کا تصور

عزیزانِ من! اگر انہی اسلاف کے کہنے کے مطابق' جو اسے نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیتے تھے' یہ مانا جائے کہ صاحب! یہ سات آسمان ہیں۔ایک آسمان کے اوپر دوسرا آسمان ہے اور یہ آسمان شیشے کا ایک ڈل ہے جس کے اندر یہ ہیرے موتی جڑے ہوئے ہیں' جن کو ستارے کہتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان اتنے اتنے یعنی پانچ پانچ سو سال کا فاصلہ اور ہے۔اگر آپ یہ تصور کرلیں تو تدبر اور غور وفکر کا راستہ تو بند ہو گیا۔

آج بھی یہ تصور اسلاف کے اتباع کے اندر ہے: ''کل خیر فی اتباع سلف۔'' یہ ان کا مسلک ہے کہ جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں بس وہی حرفِ آخر ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی مدینہ یونیورسٹی کے صدر یہ کہہ رہے ہیں کہ زمین نہیں گھومتی ہے' یہ ساکن ہے۔اور وہ کہتے ہیں کہ جو یہ مانتا ہے کہ یہ زمین گردش کرتی ہے' وہ کفر ہے' ارتداد ہے' اسے پھانسی دے دینا چاہیے۔دلیل کیا ہے؟ ہزار برس پہلے سے تفسیر میں یہ آ گیا' کسی روایت میں یہ آ گیا۔آپ اسے کیا کہیں گے' انسانی زندگی کی دوسروں کے ساتھ جو مسابقت ہے وہ تو غور وفکر' عقل وتدبر' تحقیق وتجسس کی بنا پر ہے۔جو اس میں آگے بڑھتا ہے وہ آگے بڑھا جاتا ہے' اور جہاں انہوں نے یہ ذہنیت پیدا کی کہ اس سے آگے کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تو انسانی زندگی کی دوسروں کے ساتھ مسابقت ختم ہو گئی۔خود نیچر یعنی فطرت کا کچھ ایسا قاعدہ ہے کہ جس عضو سے کوئی کام لینا بند کر دے' فطرت اس عضو کو ہی ختم کر دیتی ہے۔یہ انکی تحقیق ہے کہ کبھی چمگادڑوں کی آنکھیں بھی دیکھا کرتی تھیں' روشنی کو برداشت کرلیا کرتی تھیں۔انہوں نے اِن کو بند رکھنا شروع کر دیا۔فطرت نے کہہ دیا کہ ان کے لیے یہ چیز بیکار ہے۔اُس نے انہیں آنکھیں دینی بند کر دیں۔

عزیزانِ من! جو انسان بھی یا جو قوم بھی' صدیوں تک فکر وتدبر سے کام لینا چھوڑ دے' اس میں فکر وتدبر کی صلاحیتیں اگر مفقود نہیں ہوتیں تو مفلوج ضرور ہو جاتی ہیں۔جو قوم اپنے لیے یہ مذہبی مسلک اور عقیدہ بنا لے کہ ہزار برس پہلے کی جو سوچ تھی اس سے آگے جو سوچ ہے' وہ ارتداد ہے' کفر ہے' الحاد ہے' سوچنا ہی نہیں' تو فطرت کہے گی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں اس قوم کے لیے بیکار ہے' کسی اور قوم کو یہی کچھ دیجیے جو ان سے کام لے۔یہ وجہ ہے کہ قرآن نے اسے جحیم کہا ہے: وہ مقام جہاں ارتقا رک جائے۔روک کے معنی میں یہ جحیم آتا ہے جہاں آگے نہ بڑھ سکے' تھم جائے' اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔میں نے اس کے لیے یہ مثال دی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عقیدہ ہے کہ جو کچھ پہلوں نے سوچ لیا' وہی حرفِ آخر ہے اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا اس کے متعلق قرآن خود کہتا ہے کہ یہ ایسی باتیں تھیں جو نبی اکرمؐ یا

اس زمانے کے صحابہؓ کے درمیان اور اس زمانے کے نہ ماننے والوں کے درمیان تھیں' یہ قیامت تک کی باتیں نہیں ہیں۔ وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (2:170) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ما انزل الله یعنی قرآن کی طرف آؤ تو قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا (2:170) یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم قرآن کی طرف نہیں آئیں گے' ہم نے اپنے بزرگوں کو جس روش پہ چلتے دیکھا ہے ہم اسی کی طرف چلتے جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ (2:170) خواہ وہ بزرگ یا اسلاف یا جو پہلے گزرے ہوئے لوگ ہیں' نہ تو وہ اتنی عقل وفکر رکھتے ہوں' نہ قرآن کے راستے کے اوپر ہوں' اس کے باوجود یہ اسی راستے کے اوپر چلے جائیں گے۔ وہ اس کا نتیجہ بتاتا ہے کہ صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ (2:171) سوچنے سمجھنے کو چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اندھا بہرا گونگا بن جاتا ہے تو فَهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ (2:171) عقل وفکر کی صلاحیت نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ جسے آپ سزا کہہ لیجیے یا نتیجہ کہہ دیجیے اس چیز کا جو سوچنے کی بات ہو۔ یہ ہے وہ زنگ جو بن جاتا ہے کہ جب انسان روش یا ذہنیت یہ اختیار کر لے کہ جو کچھ سوچا جانا تھا سوچا جا چکا' اب عقل وفکر سے کام لینا حرام ہے' ان سے الگ کوئی بات کہنا ارتداد ہے' کفر ہے' تو اس کے بعد نتیجہ یہ ہے کہ یہی چیز زنگ بن کر لگ جاتی ہے' یہ جو انسان میں سمجھنے سوچنے' فکر وبصیرت کی استعداد ہے اس کے اوپر زنگ بن کر لگ جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم وہیں کی وہیں کھڑی رہ جاتی ہے' آگے نہیں بڑھ سکتی۔

ملتِ اسلامیہ کے بحرِ زخار کی ناگفتہ بہ حالت

عزیزانِ من! کبھی آپ نے سوچا کہ ساری دنیا کے مسلمان' عددی اعتبار سے' قریباً ایک ارب کے قریب ہیں' پچاس کے قریب ان کی آزاد مملکتیں ہیں۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک موجیں مارتا ہوا بحرِ زخار ہے' دنیا کی کوئی قوت ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ اس کے باوجود یہ ساری دنیا کے اندر پست کیوں ہیں' ذلیل کیوں ہیں؟ اس لیے کہ انہوں نے سمجھنا سوچنا چھوڑ رکھا ہے۔ جس نے ذرا سمجھ سوچ کر' کوئی ایسی بات کی' اس پہ اعتراض یہ ہے کہ کیا پہلے بھی کبھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ تو کوئی بات ہو' اگر پہلوں کا ریفرنس دے دیا جائے تو وہ تو قابلِ تسلیم ہے' اگر انہوں نے یہ نہیں کہا' تو یہ ارتداد ہے۔ اگر آپ آج کہہ دیں کہ ہاں صاحب! انسان چاند پہ جا سکتا ہے تو وہ پوچھیں گے کہ پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے۔ چاند پہ جانے والوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ پہلے بھی کوئی گیا ہے یا نہیں گیا۔ انہوں نے کہا کہ دیکھ تو لیں کہ آیا کوئی جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہاں یہ مانتے ہی نہیں تھے۔ جس زمانے میں یہ پہلے رشین آسمان پہ گئے ہیں۔ [1] یہ مانتے ہی نہیں تھے۔ کہتے تھے: جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا کوئی کبھی چاند پہ بھی جا سکتا ہے؟ بہرحال اس بحث میں' میں نہیں جانا چاہتا۔ وہ دلائل کیا دیا کرتے ہیں؟ اب ان دلائل کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو آئے دن' ایسے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا جحیم جس میں مبتلا ہیں۔ اس لیے

---

[1] 4 اکتوبر 1957ء میں روس نے سپٹنک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا۔

قرآن کہتا ہے کہ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ❶ (83:17) وہاں کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ نتیجہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے کہ نہیں صاحب! ہماری اس روش کا یہ نتیجہ نہیں ہوگا۔ یہ ہے وہ نتیجہ جو اس روش کا ہے، دیکھ لیا تم نے اپنی آنکھوں سے۔ یہ ایک کیٹگری تھی۔ ایک گروہ تھا۔ قرآن ان آیات میں، ان سورتوں میں، جیسے میں نے عرض کیا ہے، اس کی طرف اشارے کرتا آرہا ہے، جو اس کی رو سے انسانوں نے ان مختلف منازل میں سے گزر کر آخر تک پہنچنا ہے۔

آخر کار قرآنی نظام ہی غالب آئے گا

عزیزانِ من! آخر میں قرآنِ کریم نے دعویٰ کیا ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے جو اس نے کہا ہے کہ آخر کار قرآن کے اس نظام نے دنیا کے ہر نظام پہ غالب آنا ہے۔ وہ اس دَور کی کچھ علامات بتاتا چلا جاتا ہے کہ جس میں یہ انقلابِ عظیم پیدا ہوگا۔ اس نے کہا ہے کہ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) ہاں، یہ الناس، The People، عوام، ربوبیتِ عالمینی کے لیے کھڑے ہو جائیں گے، وہاں وہ کہتا ہے کہ انسانیت چھٹ کر دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک تو یہ گروہ ہوگا کہ نہیں صاحب! سمجھنا سوچنا ہی نہیں، دوسروں کے ساتھ چلنا ہی نہیں۔ ان کی کیفیت تو یہ ہوگی کہ یہ جحیم کے اندر کھڑے ہو جائیں گے، تباہی بربادی ان کا مقدر ہوگا اور اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ ہوگا كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِىْ عِلِّيِّيْنَ ❷ (83:18)۔ اُس نے (83:7) میں سجین کہا تھا یعنی ان کے لیے جو رکنے والے ہیں، جو پستیوں کے اندر جانے والے ہیں۔ یہاں پھر وہی ارتقا کی رو سے علیین کہا جو بلندیوں کی طرف جانے والے ہیں۔ یہ دوسرا گروہ ہے۔ اس کے لیے ابرار کا لفظ آیا ہے۔ میرا خیال ہے دو ایک درس پہلے یہ لفظ آیا تھا اور میں نے اس کی پوری وضاحت کی تھی کہ یہ بات کیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو ''بر'' کا ترجمہ بھی نیکی، محسن کا ترجمہ بھی، نیک کیا جاتا ہے۔ بس ایک لفظ نیکی ہے اور دوسرا بدی، اس کے علاوہ تصور ہی ذہن میں نہیں آتا کہ وہ نیکی کیا ہے، پھر وہ نیکی کے ہمارے ذہن میں کچھ خاص تصورات ہیں جیسے متقی پرہیزگار کا ایک تصور ہے۔ خدا کے نیک بندوں کا تصور ہے۔ قرآن نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں اور ہر لفظ کے اندر معنی کی، مفہوم کی، ایک دنیا پنہاں نظر آتی ہے۔ میں نے اس دن یہ کہا تھا کہ ''بر'' کا لفظ بڑا ہی اہم ہے۔ قرآن ایک چیز تنگ نظری کہتا ہے۔ انسانوں کو تنگ نظری، پست ذہنی محدودیت اور طبقات میں تقسیم کر دینا قرآنِ کریم نے جرم گنایا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک خصوصیت بتائی جسے ''بر'' کہا گیا ہے۔ یہ وسعت، کشادہ عالی ظرفی ہے۔ یہ ان لکیروں کو مٹانے کے لیے، انسانیت کو ایک عالمگیر برادری بنانے کی سی وسعت ہے۔

---

❶ وہاں ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے ہمارے اس قانونِ مکافات کی رو سے تمہارے اعمال کا نتیجہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ (مفہوم القرآن - پرویز)

❷ ان کے برعکس، ان لوگوں کا مقام، جو زندگی میں وسعت اور کشاد پیدا کرتے ہیں، بلندیوں پر ہوگا۔ وہ زندگی کے ارتقاء کی اگلی منزل میں ہوں گے۔ (مفہوم القرآن - پرویز)

یہ سارا کچھ اس لفظ کے اندر آتا ہے۔ اس کے لیے پھر میں نے عرض کیا تھا کہ جو اس نے کہا ہے کہ یہ یہ بِر نہیں ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) مشرق کی طرف منہ کر لینا یا مغرب کی طرف منہ کر لینا بِر نہیں ہے۔

ابرار کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے بِـرّ کے لیے کہا ہے کہ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اسے ان کے لیے کھلا رکھنا جن کو اس کی ضرورت ہے۔ یہ بِرّ کی پہلی نشانی ہے۔ اب وسعت آ گئی اس میں کشاد آ گئی اس کے اندر طبقات کی تقسیم کو مٹا دینا آ گیا۔ یہ کتنی بڑی چیزیں ہیں جو ایک لفظ کے اندر آ گئیں۔ اس کا ترجمہ نیکی کیجیے تو ذہن میں یہ تصور ہی نہیں آتے۔ یہ جو اس قسم کی خصوصیات کے حامل ہیں ان کو ابرار کہا گیا ہے۔ ابرار کی کیفیت یہ ہے کہ وہ علّیین میں ہیں۔ اس کے لیے عِلِّيِّيْنَ (83:18) ہی ایک لفظ ہے وہ علّیین کے اندر ہونگے۔ ذہن میں ایسا آتا ہے کہ اس قسم کا کوئی مقام ہے جہاں یہ ہوگا وہ فائیو سٹار ہوٹل کے اندر ہونگے اور یہ کسی سرائے (Inn) میں ٹھہرے ہوئے ہونگے۔ قرآن کی رو سے یہ چیزیں مقام اور زمان کی نہیں ہیں یہ کیفیات کی چیزیں ہیں۔

لفظ مقرب کا مفہوم

سوال یہ ہے کہ یہ علّیین کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے آگے خود ہی بتا دیا کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (83:19) تمہیں کون بتائے کہ یہ علیون کیا ہے؟ جو ہم نے لفظ استعمال کیا ہے یہ کیا چیز ہے؟ کوئی مقام ہے؟ کوئی جگہ ہے؟ کوئی کمرہ ہے؟ کوئی ملک ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں یہ ''کتاب'' ہے۔ یہ خود ان کا اپنا اعمالنامہ ہی ہے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (83:20) ہے۔ ان کا اعمالنامہ ہے۔ وہاں کہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ زنگ بن کر ان کے اوپر لگ گیا ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ یہ دوسری قسم کا ایک اعمالنامہ ہے۔ وہ اعمالنامہ بھی یوں نہ کہیے کہ کوئی لکھی ہوئی دستاویز ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اس کا Sum Total (مجموعہ) ہے جو اس کے اوپر نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو اس کی ذات پر اس کی Personality پر ہے۔ وہ ہے جسے اس کا اعمالنامہ کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ تو کچھ Abstract (غیر محسوس) سی بات ہے کہ یوں لکھا ہوا کاغذ تو ہے نہیں جو سامنے آئے۔ کہا کہ ٹھیک ہے يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (83:21) جو مقرب ہیں وہ اسے دیکھ سکتے ہیں۔

اب ہمارے ہاں پھر مقربین بارگاہِ الٰہی کی اصطلاح آئی: وہ حضرات حضرت صاحب بزرگ اولیائے کرام کرامتیں دکھانے والے وہ ان کا آخری درجہ وہ مجذوب ہوتا ہے ننگ دھڑنگ کہیں پڑا ہوا مقربین بارگاہِ خداوندی۔ وہ ایک کیٹگری بنالی۔ مقرب کے معنی ہوا اس کے قریب۔ اب اگر اس معنی میں لیا جائے تو پھر تو خدا کو پہلے کسی مقام پر بٹھانا چاہیئے پھر یہ ہوگا کہ اس کے قریب ہے یا اس سے

بعید ہے۔قرب Measure (پیمائش) کیا جائے گا۔اگر کسی کو ایک مقام پہ نہ بٹھایا جائے تو پھر وہاں قریب اور بعید کا لفظ ہی نہیں آ سکتا۔ آپ اس کے قریب ہیں۔دو جگہ ہے۔غور کیجیے گا یہ بڑی اہم چیز ہے جس کو مقرب کہتے ہیں۔انہوں نے تو تصور ہی یہ کیا ہوا ہے۔اب میں ادھر چلا جاؤں گا۔میری تو اپنی زندگی انہی وادیوں میں گزری ہوئی ہے۔ایسا نظر آتا ہے جیسے روز رات کو خدا کے ساتھ جا کر یہ کھیل کھیلتے ہیں، مقرب جو پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔یوں اس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔خدا کا قرب کسی مقام کا قرب تو ہے نہیں۔

قرب کیا ہے؟ خدا نے یہ خود کہا ہے کہ یہ خدا کے رنگ میں رنگے جانا ہے۔یہ صبغۃ اللہ محاورہ ہے یعنی ہم آہنگ ہو جانا' جسے ہم' یک رنگ ہو جانا کہتے ہیں۔کیا چیز ہے خدا کی جس سے یک رنگ ہیں؟ جتنی صفاتِ خداوندی خدا نے خود بیان فرمائی ہیں جماعتِ مومنین کے متعلق یہ کہا ہے کہ تم حدِ بشریت کے اندر ان صفات کو اپنے اندر منعکس کرو مثلاً اس نے اپنے آپ کو رازق کہا ہے' تو اپنی استطاعت کے مطابق تم دوسروں کے رازق بن جاؤ۔اس نے عزیز کہا ہے تو تم اپنی وسعت کے مطابق دوسروں کی محافظت کے ذمہ دار بن جاؤ۔یہ جو خدا کی صفات ہونگی' کوئی علیم ہے' خبیر ہے' سمیع ہے' اور پھر رب العلمین ہے' ربوبیتیں ہیں' یہ جتنی صفات خداوندی یا اس کی ذات سے متعلق خصوصیت ہیں کہ ھوالاول ہے کہ وہ اس وقت تھا جب کوئی نہیں تھا' تو وہ تو انسان اپنے اندر منعکس نہیں کر سکتا' جتنی دوسری خدا کی صفات ہیں' انہیں انسان اپنے اندر منعکس کرے' ان سے ہم آہنگ ہو۔اسے پھر یاد رکھیے جو میں بار بار کہتا ہوں: علی حدِ بشریت منعکس کرتا ہے۔خدا کی صفات تو لامنتہیٰ ہیں' انسان کا ہر عمل جو ہے وہ محدود ہوگا' کیونکہ یہ خود Finite (محدود) ہے Infinite (غیر محدود' لامنتہی) نہیں ہے' تو یہ جو اس کے ہاں کی محدودیت ہے' اس محدودیت کی حد کے اندر خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنا۔یہ ہے قربِ خداوندی۔خدا کی جتنی صفات کسی کے اندر منعکس ہوں گی جس حد تک وہ منعکس ہوں گی' وہ اس حد تک اس صفت کے اعتبار سے خدا کا مقرب ہو جائے گا۔خدا نے جو اپنے بندوں کو مقرب کہا ہے یہ وہ لوگ ہیں اور یہی تھی وہ جماعتِ مومنین جن کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ ہماری صفات اپنے اندر اپنی وسعت کے مطابق منعکس کر لیں اور جو ذمہ داریاں ہم نے انسانوں کے متعلق لے رکھی ہیں یہ ان کو پورا کرتے ہیں۔وہ ایسے ہی نہیں کہ صفات کو منعکس کر لیا تو کہنے لگے کہ بس ٹھیک ہے' راوی عیش لکھتا ہے' موج ہوگئی' آپ حجرے کے اندر آرام سے بیٹھ گئے' لوگ کمائیں آپ کھائیں۔یہ بات نہیں ہے۔اس میں بہت بڑی ذمہ داری ہے' جتنی ذمہ داریاں خدا نے انسانوں کے متعلق لے رکھی ہیں وہ ان کے ذریعے سے پوری کراتا ہے۔لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا۔یہ ہوا مقرب۔ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (83:21) وہ ہیں جسے یہ مقربین اپنے سامنے کھلا ہوا دیکھتے ہیں۔یہ چیز ہے جو یہ مقربین دیکھتے ہیں کہ یہ علیین کیا ہے' مقام کی بلندی کیا ہے' صفات کی بلندی کیا ہے۔ہم مقام بولتے ہیں تو اس کے معنی بھی کوئی کنکریٹ (محسوس) قسم کی جگہ نہیں ہوتی' یہ وہ ہے جسے ہم پوزیشن کہہ سکتے ہیں۔وہ اس کو دیکھتے ہیں' محسوس کرتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔صفاتِ خداوندی کے منعکس ہونے سے جو انسان کی

ذات میں ایک ارتقاء واقع ہوتا ہے وہ لوگ ہیں جو اس کو دیکھتے ہیں' جو اسے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ابرار کی کیفیت ہے۔ اسی لیے کہا کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ❶ (83:22) یہ ہے نعیم۔

لفظ نعیم کا مفہوم

سب سے بڑی چیز' جو قرآن نے شروع میں ہی سورۃ الفاتحہ میں کہی ہے' وہ ہے: اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ ❷ (1:5-6)۔ اس آیت میں ''اَنعمت'' آیا ہے۔ یہ ''نَعم' نعمت' نعیم'' وہیں سے آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا بھی اور قرآن کریم کا بھی بڑا جامع لفظ ہے۔ اس قوم کی یہ عجیب بات تھی کہ یہ کیا کیا متضاد چیزیں اکٹھی کرتی تھی۔ ''نعمت یا نعیم'' میں روانی بھی آتی ہے۔ ان کے ہاں ندی کی سی روانی اور چنبیلی کے پھول کی پتی کی سی نزاکت کی تشبیہہ دی جاتی ہے۔ یہ جو اوپر کا مقام ہے' جو دوسری اگلی ارتقا کی منزل ہے' اس میں اس قسم کی بلندی ہے' چٹان جیسی سختی ہے' پھول جیسی نرمی ہے۔ یعنی وہ عرب اس قسم کی صفات اکٹھی کرتے تھے۔ اسے وہ انعم کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان صفات کے حامل افراد کی ڈیوٹی کیا ہوتی تھی' ان کا فریضہ کیا ہوتا تھا یا وہ خود کیا کرتے تھے؟ آپ کو معلوم ہے کہ عربوں کے ہاں آج بھی پانی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے' پھر ٹھنڈا میٹھا تازہ پانی بڑی چیز تھی۔ ''کنویں کی منڈیر پر کھڑا ہو کر جو مسافروں کو آواز دیتا تھا کہ اِدھر آؤ' میں تمہیں پانی پلاتا ہوں' وہ منعم ہوتا تھا''۔ یعنی صفاتِ خداوندی کا حامل' پیاسوں کو بلا بلا کر پانی پلانے والا یہ تھا منعم' یہ تھی وہ قوم' یہ تھی اس قوم کی زبان۔ قرآن اسی زبان میں نازل ہوسکتا تھا۔

یہاں کہا کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ❶ (83:22)۔ قرآن اس ایک لفظ ''نعیم'' میں یہ ساری بات کہہ گیا کہ جامد (Static) نہیں ہیں' ان میں روانیاں بھی ہیں' پتھر جیسی سختی ہی نہیں' پھول جیسی نرمی بھی ہے' نرمی ہی نہیں' چٹان جیسی سختی بھی ہے' پستی نہیں' بلندی بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کا فریضہ کیا ہے؟ ہر پیاسے کو آواز دے کر پانی پلاتا ہے۔ اللہ اکبر! صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ (1:6) ان کا جو راستہ ہے اس کے لیے التجا کی گئی ہے۔ آگے پھر دو الفاظ آئے۔ دنیا میں ان کا فریضہ حیات کیا ہے؟ مقام کیا ہے؟ یہ حجروں میں بیٹھ کر صرف تسبیح پھیرنا نہیں ہے' عزیزانِ من! یہ عَلَی الۡاَرَآئِکِ (83:23) ہے یعنی اقتدار کی مسندوں پر فائز ہونا ہے۔ یہ ان میں پہلی بات ہے۔ یہاں عام تصور کا گلا کاٹ کر رکھ دیا۔ اس عام تصور میں تو دنیا ایک لاش گنائی جاتی ہے' ایک قید خانہ گنایا جاتا ہے' اس کو

---

❶ یہ ابرار' یعنی وسعتوں کے مالک' زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے بہرہ یاب ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ افراد (جماعت مومنین) جب سفر حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں تو' یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں' دعا بن کر ان کے لبوں تک آ جاتی ہیں کہ بارِ الٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ ابھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں' بلا خوف و خطر' ہماری منزل مقصود تک لے جائے۔ یعنی وہ راستہ جس پر چل کر' سعادت مند امم سابقہ' زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں۔ اس سے انہوں نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے' اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ (2:47; 31:20) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ترک کر دینا ہے۔ اِسے جتنا ترک کرتے چلے جاؤ گے' اتنا ہی ان کے نزدیک روحانیت بلند ہوتی چلی جائے گی' تو اس لیے ان کے ہاں اقتدار' مملکت' سلطنت اور حکومت کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ تو کہتے ہیں کہ ہو جا ککھ مسیت دا۔ سارے تینوں پیراں دے تھلے مسلدے ترے جان' تے توں رڑکیں وی نا۔ ❶ مگر یہاں کہا ہے کہ عَلَى الْاَرَآئِکِ (83:23) اقتدارات واختیارات کی مسندوں پر فائز ہوں۔ اگلا لفظ سنیئے' عزیزانِ من! اور جھوم جایئے۔ اقتدار کی مسند پہ فائز ہونے والا تو اندھا ہو جاتا ہے' اسے پھر کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ یہاں کہا ہے کہ یہ یَنْظُرُوْنَ ❷ (83:23) ہیں۔ یعنی اس مسند پہ بیٹھے ہوئے ہیں اور دنیا کی اقوام کو دیکھ رہے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ❸ (2:143)۔ یہ ہے جسے آپ اسلامی مملکت' اسلامی حکومت' اسلامی اقتدار کہتے ہیں۔ وہ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:147) ہے یعنی وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرنے والی' نگہداشت کرنے والی' دیکھنے والی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے اور وہ کیوں کر رہا ہے' ذرا سا بھی غلط انداز ہو تو وہیں روک دینے والی ہے۔ قرآن نے یہاں یَنْظُرُوْنَ کے ایک لفظ میں بتا دیا کہ وہ ہر بات کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے ہیں یعنی وہ جہاں بانی اور جہاں بینی' دونوں خصوصیات کے مالک ہیں۔ اور ارائک پہ بیٹھے ہیں۔ اختیارات واقتدارات کی مسندوں پہ بیٹھنے سے اس دولت اور قوت کے نشے میں پھر انسان اندھا ہوتا ہے۔ ان کے لیے کہا کہ ان کا یہ مقام نہیں ہوتا۔ یہ تو بیٹھیں گے تو ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی ساری نظریں اقوامِ عالم کے اوپر ہونگی' سب کو دیکھ رہے ہونگے۔ اقبالؒ (1877-1938) کہاں کہاں سے یہ چیزیں لیتا ہے۔ اسے فطرت نے کسی چیز کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت بخشی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی

دیکھا دونوں لفظ آ گئے: ارائک بھی آ گیا اور ینظرون بھی۔ وہ عَلَى الْاَرَآئِکِ (83:23) ہیں: اختیارات واقتدارات کی مسندوں پر متمکن ہیں اور **ینظرون** (83:23) ہیں: ہر بات کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے:

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

یہ ہے وہ نظر' یہ ہے مومن کی مملکت' یہ ہے اس کا اقتدار' یہ ہے اس کی حکومت۔ یہ نگاہ پیدا کرنا ہے۔ یہ اقتدار اور قوتوں کی مسندوں پر

---

❶ تم ایسے ہو جاؤ جیسے تنکا مسجد کے اندر ہوتا ہے کہ لوگ تجھے اپنے پاؤں تلے مسلتے چلے جائیں اور تم کسی کو کہیں محسوس تک نہ ہو۔

❷ تمہیں ایک ایسی قوم بنایا جائے جسے تمام دنیا میں' بین الاقوامی' پوزیشن حاصل ہو۔ جس سے دنیا کی ہر قوم' یکساں فاصلے پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اور اُس کا فریضہ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب ونگران ہو۔

❸ وہ ہر بات کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے ہیں' جہاں بیں ہیں۔

براجمان ہونے کے بعد آنکھیں بند کرنا نہیں ہے۔ ساری دنیا پہ نظر رکھنا ہے۔ یہ جہاں بینی ہے۔ یہ ہے مومن کی صفت۔ یہ ہیں مقربین جو نعیم میں ہونگے۔ یہ ان کی صفات ہونگی ارائک پہ براجمان ہونگے' ان کی نگاہ بڑی بلند ہوگی اور **تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ** ❶ (83:24)۔

چہرے پر قلبی کیفیات کا عکس

عزیزانِ من! اب اس دورِ حاضرہ کی سائیکالوجی (نفسیات) کی طرف آئیں۔ ان کو یہ جنتی نعیم کی چیزیں' ہر قسم کی آسائشیں ملیں گی' محسوس ہونگی' کنکریٹ ہونگی' نظر آئیں گی۔ قرآن نے جنت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس قسم کا آسائشوں کا ماڈل دیا ہے کہ ابھی تو کسی قوم کی ان پر نظر ہی نہیں پڑی۔ ان بڑی سے بڑی اقوام کے حصے میں بھی وہ چیزیں نہیں آئیں جہاں وہ پہنچا ہے لیکن یہ چیزیں تو محسوس ہوتی ہیں۔ ان سے جو قلبی اطمینان نصیب ہوتا ہے وہ ہے جو مومنین کا حصہ ہے۔ وہ اطمینان کیوں نصیب ہوتا ہے؟ کہ وہ ان تمام چیزوں کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ ایک تو قلبی کیفیت ہوتی ہے تو وہ تو محسوس شے نہیں ہے' وہ نظر نہیں آتی لیکن عجیب بات ہے قرآن کہتا ہے کہ ان کے قلب کے اندر کی آسائشیں اور اطمینان تو یوں نظر نہیں آسکتا۔ **تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ** ❶ (83:24) وہ آسائشیں' ان کی خوشگواری' ان کی بشاشت' ان کی نضرۃ' ان کے چہروں سے معلوم ہوجاتی ہے۔ یہ ہے جو سائیکالوجی (نفسیات) کہتی ہے۔ اب تو ماہرین نفسیات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں' وہ اس سے عدالتوں میں مجرمین کی شناخت کرتے ہیں اور یہ بھی قرآن نے بتایا ہے۔ یہ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ انسان کے قلب کے اندر گزرنے والی کیفیات کی غمازی اس کا چہرا کر دیتا ہے۔ اب آپ بھی نگاہ دوڑائیے اور کئی چہرے آپ کے سامنے آئیں گے کہ ان کی چھپائی ہوئی چیزیں تھیں جو خود ان کے چہرے نے اُن کی غمازی کردی: **یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ** ❷ (55:41)۔ ایسی کیفیت ہوگی کہ وہ نگاہ پیدا ہوجائے گی کہ مجرم اس کی پیشانیوں سے پہچانا جائے گا کہ یہ مجرم ہے اور یہاں یہ کہا کہ **تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ** ❶ (83:24) ان کے قلب جس طرح مطمئن ہونگے' سکون میں ہونگے' آسائشوں میں ہونگے' اس کی علامات وآثار ان کے چہروں سے عیاں ہونگی۔ قرآن زندگی میں توانائی پیدا کرتا ہے' حرارت پیدا کرتا ہے۔ راہِ حیات میں چلنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ارتقائی منازل طے ہی اس صورت میں ہوتی ہیں۔

ان کے ہاں کا ارتقاء کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہر منزل میں اس زندگی کا اپنے سے غیر کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ میں اگر یہ زندگی

---

❶ ان آسائشوں اور طمانیتوں کی پیدا کردہ شگفتگی وشادابی کے آثار ان کے چہرون سے نمایاں ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ہر مجرم اپنی پیشانی سے پہچانا جائے گا۔ اس کی نفسیاتی کیفیت اس کے چہرے سے عیاں ہوگی۔ (ایضاً)

غالب آ جاتی ہے تو یہ اگلی اسٹیج پہ پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے تو قوت اور توانائی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کمزوری' پستی' ناتوانی اور ضعف' شکست کی علامت ہوتا ہے۔ قرآن اسے اب اپنے مخصوص تشبیہی انداز کے اندر بیان کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآنِ کریم نے شروع میں یہ کہا تھا کہ جنت کا جتنا بھی بیان ہے وہ تمثیلی بیان ہے۔ مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِیۡ ❶ (13:35) جنت مثال کے ذریعے سے ہم واضح کرتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں بھی مومنین کی جو جنت ہے' جو مومنین کی کیفیات ہیں' انہیں تشبیہات کی رو سے بیان کرتا ہے اور پھر وہ تشبیہات عمدہ اسلوب لیے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی ادب میں بھی قرآن بلند ترین مقام پر ہے۔ بڑے سے بڑے ادیب بھی' کوشش کرنے کے باوجود' ادبی نکتہ کے لحاظ سے بھی' اسلوب کے لحاظ سے بھی' قرآن کی مثل کوئی عبارت نہیں لکھ سکے۔ یہ تو بہر حال عربی زبان جاننے سے ہوگا۔ اس کا انداز میں نے عرض کیا' تشبیہی ہے۔ کیا بات ہے اس کی صاحب! کس چیز سے چہروں پہ سرخی آتی ہے' خون میں حرارت پیدا ہوتی ہے' گردش تیز ہوجاتی ہے' وہ کونسی چیز ہے' سنا ہے شراب ہی ہے' وہ یہ کہتا ہے:

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

کیا بات ہے! یہ تو ہے ہی وہ چیز کہ جس کے لیے کہا ہے کہ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی۔ بہر حال یہ چیز تو یوں نہ ہوئی اور جس شراب کا یہ ذکر کرتا ہے وہ تو قرآن میں الفاظ میں ہی سننے میں آیا ہے' ہم بدنصیبوں کے حصے میں دیکھنے وہ چہرے کہاں' اُن کے لیے تو قرآنِ کریم میں یوں آیا ہے: یُسۡقَوۡنَ مِنۡ رَّحِیۡقٍ مَّخۡتُوۡمٍ ❷ (83:25)۔ رحیق بھی شرابِ خالص کو کہا جاتا ہے جس میں شرک کی بوتک نہ ہو اور شراب کے متعلق ان کے ہاں کی ایک چیز سننے میں آتی ہے۔ ہم نے ادب میں' شاعری میں' بھی یہ چیزیں سنیں۔ وہ اسے ''ہوا خوردہ'' کہتے ہیں۔ جس بوتل کا کارک کھل جائے' اور وہ کچھ عرصے کے لیے ویسی ہی کھلے کارک سے رہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی تندی اور تیزی ختم ہوجاتی ہے اسی لیے کہا کہ یہ سربمہر آبگینوں میں بند ہے۔

قرآن کی پیش کردہ شراب کی کیفیت

عزیزانِ من! خالص شراب اور اس پہ پہلے لگا ہوا ایسا کارک' پھر اس میں سیل (Seal) یعنی مہر لگی ہوئی' تا کہ وہ محفوظ رہے' یہ قرآن کے محفوظ ہونے کے لیے ہے۔ یہ ایک لفظ مختوم ہوا اور یہی ہے وہ ختمِ نبوت Sealed۔ اب توانائی کی بات ہے' بوتل میں جو بھری ہوئی

---

❶ اس جنت کی مثال یوں سمجھو کہ............ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ انہیں (زندگی کی توانائیوں کے لیے) بادۂ خالص پینے کو ملے گا جو ہر قسم کی آلائش و آمیزش سے پاک ہوگا' یعنی سربمہر آبگینوں میں بند۔ (ایضاً)

ہے، وہ سرتاپا توانائی ہے، تندی ہے، تیزی ہے، سرکشی ہے، یہ جو سیل لگی ہوئی ہے یہ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُہٗ مِسْکٌ ❶ (83:25-26) اس مشروب پہ مشک کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آپ نے طبِ یونانی میں مشک اور زعفران کا سنا ہے۔ یہ تو پوچھو ہی نہیں کہ قوت میں کہاں تک لے جاتے ہیں، فالج وغیرہ کا علاج مشک سے ہوتا ہے۔ یہ چیزیں بھی اب سننے میں آتی ہیں وہ تو معلوم ہی نہیں کہ جو مشک کہہ کے ملتی ہے وہ ہوتا کیا ہے۔ وہ یا تو یہاں کا کوئی برادہ ہوتا ہے یا ولایت کی سینٹ (Scent) ہوتی ہے، لیکن قرآن خِتٰمُہٗ مِسْکٌ ❷ (83:26) کہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارا کچھ، یہ اس قسم کی شراب' کا ہے کے لیے ہے؟ اس کا کیا نتیجہ ہے؟ اس کے پینے سے کیا ہوگا؟ یہ شرابیں، جو یہ لوگ پیتے ہیں، اُن میں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ چلتا ہوا گر پڑتا ہے مگر قرآنِ کریم کی یہ وہ شراب ہے جس کی یہ کیفیت ہے۔ یہ میں نے زندگی کی ایک بات کہی تھی کہ ارتقائی منازل کے اندر ایک دوسرے سے بڑھنے کا نام زندگی ہے۔ یہاں کہا کہ یہ جو شراب ہے اس کے پینے والے وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) ہیں۔ یعنی جو آگے بڑھنا چاہے گا، وہ اس شراب کو پی کر دوسروں سے آگے بڑھ جائے گا۔ آؤ، جو آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ انداز یہ ہے۔ آؤ، آگے بڑھنا چاہتے ہو تو آؤ۔ یہ قرآن کی شراب ہے، اس سے انسان آگے بڑھتا ہے۔ زندگی میں آگے بڑھو، یہ جامد نہیں، جمود نہیں ہے، سکوت نہیں ہے۔ ارتقا کی منازل میں آگے بڑھنا: افراد نے بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے، اقوام نے بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے۔ یہ ہے جو کچھ وہ شراب ہے، وہ ہے جنت کی زندگی۔ صفاتِ خداوندی سے یہ توانائیاں انسان کے اندر پیدا ہونگی لیکن یہی چیز مزید وضاحت بھی چاہتی ہے۔ آگے بڑھنا دو قسم کا ہوگا۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت ختم ہوگیا اسے ہم اب آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ سورۃ التطفیف کی پچیسویں آیت تک ہم آ گئے، چھبیسویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ ایسا مشروب جو اس طرح محفوظ کیا ہوا کہ بعد میں بھی اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا امکان نہ رہے۔ زندگی کی پاکیزہ سرور آور خوشگواریاں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ختمہ مسک (83:26) اس کی مہر (یا وہ ذائقہ جو منہ میں باقی رہ جائے) مشک کا ہوگا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ان آبگینوں کی مہریں بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہیں۔ (ایضاً)

بیسواں باب: سورة المطففين (آیات 26 تا 33)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1984ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مطففین کی آیت 26 سے ہو رہا ہے: (83:26)۔

قرآنی شراب کی مزید وضاحت

رحیق مختوم کی' سر بمہر شراب کی بوتلوں کی بات چلی آ رہی تھی۔ میں سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ہی آغاز کرتا ہوں کیونکہ یہ رحیق مختوم کا نکتہ بڑا ہی اہم ہے اور اس کی وضاحت تفصیل طلب ہے۔ قرآنِ کریم میں' جیسا کہ متعدد درسوں میں یہ بات سامنے آ چکی ہے' جنت کی تفصیلات کا بیان تمثیلی انداز میں ہوا ہے۔ تشبیہات' استعارات اور تمثیلات کے طور پر تو قرآن نے خود کہا ہے کہ **مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي** (13:35) [1]۔ تشبیہی آیات کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ عربوں کے ہاں قرآن سے پہلے نثر کی تو کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ شاعری تھی اور بھرپور شاعری تھی۔ اس شاعری میں بھی اور خود عربی معاشرے میں بھی' قوت' جوش حرارت' حدّت کے لیے شراب کا استعارہ استعمال ہوتا تھا۔ شراب ویسے ہی عام استعمال ہوتی تھی۔ وہ تو سارا معاشرہ ہی شراب کے مٹکوں میں گویا ڈوبا ہوا تھا۔ ویسے بھی ساری دنیا میں شراب کو قوت' جوش' حدت اور حرارت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عربوں سمیت دنیا کے ادب میں ہر مقام پہ یہی چیز آتی ہے۔ عربوں کے ہاں سے جو شاعری نکلی ہے تو ایران کے راستے ہوتی ہوئی ہمارے ہاں پہنچی۔ تو گویا شراب کی ندیوں میں سے ان کی کشتیاں یہاں تک آئی ہیں۔ میں اپنی شاعری کو لٹریچر سمیت یہی کہونگا لیکن اگر آپ' بالخصوص اس شاعری کو نچوڑیں' تو اس میں سے نوے فیصد

---

[1] جنت کی مثال یوں سمجھو کہ..................

شراب ٹپکے گی اور شراب بھی ایک انقلاب آفریں استعارے کے طور پر ہے:

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

اس موضوع پہ اگر میں آپ کے سامنے شعر شروع کر دوں تو شام ہو جائے گی لیکن یہ جو بات سامنے آ رہی ہے‘ اس کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ عرب شراب سے کیا مفہوم لیتے تھے۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

اور پھر عربی شاعری تو پوچھیے نہیں کس کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ عربوں کے ہاں ذکر ہو شراب کا‘ زبان ہو عربی کی‘ اور شاعر ہو عہدِ جاہلیہ کا‘ تو پھر تو پوچھو نہیں آدمی کو شعر سنتے سنتے نشہ چڑھ جاتا ہے‘ لیکن دوسری طرف اگر آپ اسلام کو دیکھیے تو یہ ضعف و ناتوانی‘ بے کسی اور بے بسی‘ محکومی اور محرومی‘ غربت اور افلاس‘ پژمردگی اور افسردگی‘ یاس اور ناامیدی کا مذہب نہیں ہے۔ یہ تو قوت و اقتدار‘ شوکت و حشمت‘ عزت و وقار‘ غلبہ و سطوت‘ حکمرانی و جہاں بانی کا دین ہے۔ تو اس دین کے لیے بھی استعارہ شراب کا ہی بہتر ہو سکتا ہے۔ قرآن نے جہاں جہاں جنت کی شراب کا ذکر کیا ہے‘ وہ حقیقت میں اس دین کی شوکت و حشمت اور غلبہ و اقتدار کا استعارہ ہے‘ یعنی وہ نظام‘ وہ حقائق‘ وہ تعلیم‘ جس سے اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں عروقِ مردہ میں‘ خونِ زندگی دوڑ جائے‘ شراب کے معنی عربی زبان میں ہر پینے کی چیز کے لیے ہیں‘ کولڈ ڈرنکس (Cold Drinks: مشروبات) کے لیے بھی شراب کا ہی لفظ اب استعمال ہو رہا ہے‘ یعنی یہ پینے کی چیز ہے۔ اس میں یہ چیز آ جاتی ہے لیکن خود جو شراب کے لیے الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ الفاظ بھی قرآن نے استعمال کیے ہیں۔ یہ یاد رکھیے کہ یہ سب استعارہ کے طور پہ ہے‘ تمثیل کے طور پہ ہے‘ تشبیہ کے طور پہ ہے۔ اس سے مقصد اسلام کے دین کی شوکت اور حشمت‘ قوت اور اقتدار‘ کا اظہار ہے‘ یعنی اس دین کے علمبرداروں کو ایسا ہونا چاہیے‘ ان کی رگوں میں اس قسم کا خون دوڑنا چاہیے جس میں حدت اور حرارت ہو‘ جیسا کہ یہ چیز شراب سے پیدا ہو جاتی ہے‘ یہاں کہا ہے کہ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ❶ (83:25)۔ رحیق عربوں کے ہاں خالص شراب کو کہتے تھے۔ یہ شراب کی ایک خاص قسم تھی‘ پھر یہ ہے کہ یہ شراب مختوم ہے‘ سربمہر ہے۔ شراب والے یہ کہتے ہیں کہ اگر اسے ہوا لگ جائے تو اس کی تندی اور تیزی میں فرق آ جاتا ہے اس لیے کہا ہے کہ یہ شرابِ خالص سربمہر ہے۔

---

❶ انہیں (زندگی کی توانائیوں کے لیے) بادۂ خالص پینے کو ملے گا جو ہر قسم کی آلائش و آمیزش سے پاک ہوگا۔ یعنی سربمہر آبگینوں میں بند۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

شرابِ طہور یعنی توحید کا دین' قرآن کی تعلیم' خدا کا کلام

عزیزانِ من! ایک تو یہ ہے کہ قرآن نے شراب کو کہا ہی طہوراً ہے یعنی پاکیزہ جس میں کسی قسم کی کوئی غلط آمیزش نہ ہوئی ہو۔ یہ خالص پورا توحید کا دین ہے' پھر اس کے بعد وہ جن بوتلوں میں بند ہے وہ سربمہر ہیں یعنی سیل کی ہوئی ہیں۔قرآن نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے۔ یہ وہ مہر (Seal) ہے جو خدا نے خود ان بوتلوں کے اوپر لگا دی ہے۔ یہ جو ہمارے سامنے الفاظ' اوراق' اور صفحات کے پیکروں کے اندر' خدا کا کلام ہے یہ تو وہ شراب ہے اور یہ جو الفاظ یا اس کا یہ مادی پیکر ہے' جسے ہم قرآن کا نسخہ کہتے ہیں' یہ وہ بوتل سمجھ لیجیے۔ تو اس کی حفاظت خدا نے اپنے ذمہ لی ہے۔تو استعارۃً کہا کہ وہ رحیق' وہ خالص شراب' جس پہ مہر (Seal) خود خدا نے لگائی ہے اور وہ مہر بھی چونکہ قوت اور طاقت کا استعارہ ہے' غلبہ اور استیلاء کا' شوکت اور حشمت کا' استعارہ ہے' وہ مہر (Seal) بھی مشک کی لگائی ہوئی ہے۔ جسے ہم عربی میں مشک کہتے ہیں اس کو مسک کہتے ہیں' یونانی طب میں ہمارے ہاں ایک دوائی ہوتی تھی جس کا نام دواء المسک تھا۔اب وہ مشک ہی نہیں ملتی تو مسک کیا ہو۔اس کے اوپر جو سیل (Seal) ہے وہ بھی اس چیز کی ہے جو یونانی طب میں مسک تھی یا مشک تھی۔ یہ بڑی تیز چیز ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں کے حکیم اجمل خاں صاحب نے یہ بتایا تھا کہ بند شیشی کے اندر خالص مسک کو کُرتے (یعنی قمیض کے نیچے) یا واسکٹ کی اس جیب میں نہیں رکھنا چاہیے جس کے نیچے قلب ہوتا ہے۔اس سے دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔تو جو ایسی شے ہے' اس پر سیل اس کی لگی ہوئی ہے۔ایک تو وہ رحیق ہے' پھر وہ مختوم (سربمہر) ہے' پھر اس کے اوپر جو سیل ہے وہ بھی مسک کی ہے' مشک کی ہے۔تو یہ اسلام کے نظام کے اقتدار اور قوت' حشمت اور شوکت کا پورا استعارہ ہے' ضمناً یہ جو مختوم پہ ہمارے ہاں خاتم النبین کی بحث چلتی ہے کہ یہ خاتم' ت کے زیر کے ساتھ' بحثیں ہیں' ان کا سوال ہی نہیں ہے۔قرآن میں آپ دیکھیے یہ جو ختم خاتم کے الفاظ جو ہیں ان کا اردو ترجمہ مہر کر دیا جاتا ہے اور مہریں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ایک تو وہ جو انگریزی میں اسٹمپ Stamp کہلاتی ہیں۔اور دوسری ایک سیل (Seal) ہوتی ہے۔ تو ایک اسٹمپ Stamp ہے۔اور دوسری سیل اردو میں اس کے لیے دوسرا لفظ ہی نہیں ہے۔ وہ اسٹمپ (Stamp) لگا کر آپ کسی چیز کو Attest (نقل بصورت اصل) کر دیتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ صاحب اس کے نیچے اپنی اسٹمپ Stamp لگا دیجیے۔اور اس کے علاوہ ایک کسی چیز کو سیل کر دینا ہوتا ہے' سیل (Seal) کے معنوں میں قرآن کے اندر خاتم کا لفظ استعمال ہوا ہے' سٹیمپ کے معنوں میں نہیں استعمال ہوا۔وہ کہتے ہیں کہ جس کی درخواست پر رسول اللہؐ کی مہر لگ گئی وہ نبی بن گیا۔اصل چیز یہ تھی کہ نبوت کی فہرست کے اوپر جو رسول اللہؐ کی سیل (Seal) لگ گئی تو اب اس میں اضافہ ہی نہیں ہو سکتا۔قرآن نے تو خود مختوم کہہ دیا۔تو جب قرآن مختوم ہو گیا' نبوت خود مختوم ہو گئی۔اس اعتبار سے رسول اللہؐ سیل ہیں اسٹیمپ نہیں ہیں۔ضمناً مختوم کی بات آ گئی' پھر قرآن نے اس استعارہ اور تشبیہ کے بعد بھی ذہنوں کو صاف کیا ہے کہ کہیں یہی شراب نہ سمجھ لیا جائے۔

شراب میں کافور کی آمیزش

شراب کی ایک ہی خصوصیت تندی اور تیزی سرکشی اور قوت ہی نہ سمجھی جائے۔ اب اس شراب میں پینے والے کچھ ملاتے ہیں۔ عام طور پہ شاید سوڈا یا کچھ اور بھی ملاتے ہیں۔ قرآن نے بھی اس کے اندر کچھ ملایا ہے' اور اس طرح اپنے نظام کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس ملانے سے وہ نظام اپنا توازن برقرار رکھتا ہے۔ اس نظام میں شدت ہے' تندی اور تیزی بھی ہے' نرمی بھی ہے۔ اب قرآن یہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں ذرا اس معیار یا اسٹینڈرڈ سے سرکشی اور قوت اونچی ہوئی تو اس شراب میں ہم کافور (76:5) ملا دیتے ہیں۔ طبِ یونانی والے جانتے ہیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ کافور بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جس چیز کی حدت کو کم کرنا ہو' اس میں کافور ملا دیتے ہیں۔ ویسے عربی زبان کا یہ لفظ ہی کسی چیز کو دبا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ کفر تو ہوتا ہی یہ ہے کہ وہ شرفِ انسانیت کو دبا دیتا ہے۔ تو کافور اس حدت کو ذرا سا دبا دیتا ہے۔ عربوں کی یہ زبان عجیب چیز ہے۔ اس حدت کو فنا نہیں کرتا' اس میں جو تیزی آ گئی ہوتی ہے' وہ اسے ذرا سا دبا دیتا ہے۔

شراب میں زنجبیل کی آمیزش

اگر اس معیار سے وہ حدت' تندی' تیزی اور قوت ذرا کم ہوئی ہے تو قرآن کہتا ہے کہ ہم اس میں زنجبیل ملا دیتے ہیں (76:17)۔ ادرک کی ملونی اس میں ہو جاتی ہے' یعنی اس نے توازن برقرار رکھنا ہے۔ یہ میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ** [1] (48:29) اس کے اندر بڑی تیزی ہے لیکن **رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** [2] (48:29) فوراً انہیں نیچے لے آتا ہے کہ کہیں بڑھتے ہی نہ چلے جائیں اور پھر اس کے بعد تو قرآنِ کریم نے بڑی ہی محسوس مثال دی ہے کہ تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے جھک جاتے ہیں' اور قوانین خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ یہی تو قیام یعنی کھڑا ہونا ہے اور اس کے ساتھ فوراً رکوع و سجود ہے۔ تندی اور تیزی کے اندر اس نے کس قدر اور تفاوت پیدا کیے' یہ نماز کا قیام اور اس کے ساتھ رکوع کی بات ہی یہ ہے کہ زندگی ہر وقت قیام ہی نہیں چاہتی۔ یہ اپنے موقع پر ہی قیام چاہتی ہے۔ اس کے موقع کے ساتھ وہ رکوع بھی چاہتی ہے' وہ سجود بھی چاہتی ہے لیکن رکوع اور سجود میں یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ رکوع میں جھکے ہی رہیں اور سجدے میں پڑے ہی رہیں۔ پھر قیام بھی ہوتا ہے۔ قرآن نے جہاں بھی شراب کی' رحیق کی تشبیہہ دی ہے وہ یہی عمل ہے۔ شراب کی تشبیہہ بھی ہے اور رحیق کی بھی ہے۔ یہ اس تندی اور تیزی کی آمیزش ہوتی ہے۔ وہ کہیں یہ آمیزش کافور کی کرتا ہے' کہیں وہ زنجبیل کی کرتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ

---

1. محمد رسول اللہ اور اس کے رفقائے کار کی کیفیت یہ ہے یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. باہم گر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد ہیں۔ (5:54) (ایضاً)

میں اکثر اقبالؒ (1877-1938) کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔ اس نے اپنے حقائق کی لم قرآن کی تعلیم سے دی تھی۔ اگر قرآن کے یہ مقامات سامنے ہوں، اقبالؒ کا شعر سامنے ہو، تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

خودی کی تندی و تیزی میں کبر و ناز نہیں

آپ سمجھے کہ وہ کیا خودی کی بات کہہ گیا ہے۔ جس کو شراب کہا گیا ہے وہ یہی تعلیم ہے اور یہی دین کا نظام ہے۔ وہ پورا شعر یوں ہے:

خودی کی تندی و تیزی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں

خدا نے ہمیشہ اپنی بات انسان سے شروع کی ہے

فوراً مزاجِ کافور [1] آ جاتا ہے۔ یہ قرآن کی شراب کاہے کے لیے ہے؟ اب تو آپ احباب کو معلوم ہی ہے، عرصہ ہو گیا ہے یہ کچھ سنتے ہوئے، جو میں کہا کرتا ہوں کہ دین یا اسلام اپنی بات خدا سے، اللہ سے، شروع نہیں کرتا بلکہ آدمی سے شروع کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو، آدمی کو، ہم نے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ہر وہ نظام، ہر وہ سلوکِ زندگی، جو اس کی تکریم کے راستے میں حائل ہو، تذلیلِ انسانیت ہو، وہ کفر ہے۔ تکریمِ انسانیت اس طرح سے قائم رہ سکتی ہے کہ کوئی انسان نہ کسی دوسرے کا محکوم ہو، نہ کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ تو جب وہ انسانوں میں سے کسی کا نہ محکوم ہوگا، نہ محتاج، تو پھر یا تو انارکی (Anarchy: انتشار و افتراق) ہو جائے گی کہ کوئی حکومت ہی نہیں ہوگی، کوئی قاعدہ ہی نہیں ہوگا، کوئی ضبط ہی نہیں ہوگا۔ انارکی (Anarchy) تو نہیں چل سکتی۔ انسان کسی کا محکوم نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ خالق کا محکوم ہے۔ جس نے پیدا کیا ہوا ہے اس کی محکومی وجہ ذلت نہیں ہوتی۔ وہ کسی کا محروم بھی نہیں، وہی رزاق، وہی حاکم ہے۔ مقامِ انسانیت یہ ہے کہ دنیا میں ایک انسان کسی دوسرے انسان کا نہ محکوم ہو، نہ محتاج ہو۔ اگر انسان اس مقام سے گر جائے تو **اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ** (95:5) یہ بھی ہے۔ اپنی وجہ سے ہی گر جاتا ہے۔ اگر اس مقام سے گر جائے تو یہ جو قرآن کی شراب ہے یہ اس کو اس کا مقام عطا کر دیتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

---

[1] یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: یُسۡقَوۡنَ فِیۡہَا کَاۡسًا کَانَ مِزَاجُہَا زَنۡجَبِیۡلًا (76:17) وہاں انہیں ایسا کچھ پینے کو ملے گا جو زندگی بخش توانائیوں اور حرارتوں سے بھرپور ہوگا۔ اس سے وہ اس قابل ہو سکیں گے کہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اوپر چڑھتے اور آگے بڑھتے جائیں (83:27)۔ (یعنی ایک طرف یہ کیفیت کہ جذبات میں ذرا سا اشتعال پیدا ہونے لگے تو وحی خداوندی کی پابندی، ان میں ٹھنڈک پیدا کر کے، مزاج کو اعتدال پر لے آئے (76:5) اور دوسری طرف یہ حالت کہ حرکت و عمل میں ذرا سی سستی آنے لگے، تو بھرپور حرارت و توانائی مل جائے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

قرآن کی شراب انسان کو اس کا مقام عطا کر دیتی ہے۔ جو انسان بھی اپنے مقام سے گر گیا ہو اس کو اس کا مقام عطا کر دیتی ہے۔ یہ ہے دین' یہ ہے نظامِ اسلام کا مقصود و مطلوب۔ یعنی انسان کو اس کا مقام عطا کر دینا اور مقامِ انسانیت' تکریمِ انسانیت' احترامِ آدمیت اس طرح قائم کر دینا کہ انسان عملاً نہ کسی کا محکوم ہو' نہ کسی کا محتاج ہو بلکہ ایک خدا کا محکوم ہو' اسی کا محتاج ہو۔ یہ ہے مقامِ آدمیت' مقامِ انسانیت۔ قرآن کی شراب انسان کو یہ مقام عطا کر دیتی ہے' کیا بات ہے اس شخص [1] کی بھی! اگر میں شعروں میں آ جاؤں تو پتہ نہیں کہاں سے کہاں مقامِ انسانیت پر لے جاؤں۔ کہا:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

(اقبالؒ: بانگِ درا)

قرآن کی شراب گرتوں کو تھام لیتی ہے

عزیزانِ من! قرآن گرتوں کو تھام لیتا ہے۔ اس کی شراب نشہ پلا کر گراتی نہیں ہے' گرتوں کو تھام لیتی ہے اسی لیے کہا کہ **يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ o خِتٰمُهٗ مِسْكٌ** [1] (83:25-26) اور اگلے دو الفاظ ہیں' عزیزانِ من! وہی جو میں پنجابی میں کہا کرتا ہوں: تت کڈیا ہویا۔ [2] یہ وہی ہے جو ارتقا ہے' جس میں انسان آگے بڑھتا چلا آیا ہے۔ یہ زندگی آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ مقامِ انسانیت میں پہنچ کر جسے وہ Instinct (جبلت) کہتے ہیں' کچھ وہ چیزیں اس کے اندر ہیں اور وہ جذبہ ہے: Self-preservation (تحفظ خویش) کا۔ یعنی اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا۔ حیوانی سطح پہ بھی آپ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ننھی سی جان چیونٹی ہے۔ آپ اس کے راستے میں ذرا سا تنکا یوں کریں تو دیکھیے وہ کس طرح اپنے آپ کو محفوظ رکھنے اور بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتی ہے۔ زندگی جہاں ہے' اس کا تقاضا' اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے۔ تو یہ Self-preservation (تحفظ خویش) کا تقاضا انسان

---

1. یہ اشارہ مفکرِ قرآن' علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔
2. انہیں (زندگی کی توانائیوں کے لیے) بادۂ خالص پینے کو ملے گا جو ہر قسم کی آلائش و آمیزش سے پاک ہو گا۔ یعنی سربمہر آبگینوں میں بند۔ ان آبگینوں کی مہریں (Seals) بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہوں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
3. نچوڑ نکالا ہوا ہے۔

کے اندر ہے۔ Self-preservation (تحفظ خویش) کے لیے ضروری ہے کہ جو قوت بھی مقابلے میں آئے' اس پہ آپ غالب آ جائیں۔ اسے باہمی مقابلے کی قوت کے اوپر غلبہ پالینا کہتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے کہ جب اس کو ہم زندگی کی ریس کے استعارہ سے بیان کریں گے تو اس کے معنی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا ہوگا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ قرآن نے جو Evolution (ارتقا) کا نظریہ بتایا ہے' اس کی ساری تعلیم یہ ہے کہ زندگی آگے بڑھ جانے کے لیے Struggle (جدوجہد) کرتی ہے۔ اگر کسی مقام کے اوپر زندگی رک جاتی ہے تو اب آپ کو معلوم ہوگا قرآن میں اس جہنم کے لیے جحیم کا لفظ ہے۔ جحیم کے معنی ہیں جہاں کوئی رکاوٹ ہو' آگے نہ بڑھ سکے' وہیں جامد ہو کر کھڑا ہو جائے۔

زندگی کا مختلف مقامات پر رکنا نہایت ضروری ہے

سلسلہ ارتقا میں جو Species (نوع) ایسی آئی ہیں جن میں مدمقابل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں تھی' وہ یا تو مٹ گئیں یا وہیں جامد ہو کر رہ گئیں۔ ان کا بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ ان کی تحقیقات دیکھیے کہ یہ زندگی جو ہمیں ادنیٰ پست پیمانوں میں نظر آتی ہے کہیں چھپکلی' کہیں چڑیا' کہیں بلی' کہیں کتا کی شکل میں' یہ وہ زندگی یا جسے آپ لائف کہتے ہیں جو مختلف مقامات میں رکی ہوئی ہے۔ یہ جو (Species: نوع) پیچھے رہ گئی ہیں یہ ساری جحیم میں ہیں۔ انسان آگے بڑھا ہے' زندگی آگے بڑھی ہے' پیکرِ انسانیت میں آئی ہے۔ ہر بار میں کہتا ہوں اِسے زندگی کہنا چاہیے۔ یہ زندگی ہے جو Struggle (جدوجہد) کر کے یہاں تک آئی ہے۔ اب انسان کے پیکر میں آنے کے بعد وہی جو پہلے سے اسلوب چلا آ رہا تھا وہ اسلوب رہنا چاہیے۔ اس نے ارتقا کی مزید منازل طے کرنا ہیں۔ اب یہاں پہنچ کر دو قسم کے نظریات آئے۔ ایک تو یہ کہ زندگی یہی طبعی زندگی Physical Life ہی ہے۔ کھانا پینا افزائشِ نسل کرنا اور مر جانا یعنی جیسے پیدا ہوئے تھے اسی طرح سے دنیا سے چلے گئے' وہیں کے وہیں رکے رہے' آگے نہیں بڑھے۔ یہ جحیم ہے۔ ہمارے ہاں تو بس ایک ہی لفظ دوزخ ہے' ترجمے میں تو ہر چیز کچل کر رکھ دی جاتی ہے بس اس رکنے کے لیے ایک ہی لفظ دوزخ آیا ہے' وہ جحیم ہو وہ جہنم ہو' وہ نار ہو' وہ سقر ہو تو بھی وہ دوزخ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن شاعری کرتا ہے؟ کہ کہیں وزنِ شعر کے لیے سقر کہہ دیا' کہیں نار کہہ دیا' کہیں جحیم کہہ دیا (معاذ اللہ)۔ قرآن پیغمبر کے متعلق کہتا ہے کہ اسے شاعری زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ خدا خود شاعری کرنے لگ جائے۔ یہ شاعری نہیں ہے۔ ہر مقام پہ ہر لفظ کے اپنے متعین معنی ہیں۔ دوسرے الفاظ سے اس میں کچھ شیڈ کا فرق ہوتا ہے' یہ طبعی زندگی کہ جیسا پیدا ہوا اسی قسم کا وہ مر گیا' جحیم کی زندگی ہے۔ ویسے کا ویسا رہا' آگے نہیں بڑھا۔ اس کے برعکس دوسرا نظریہ زندگی یہ ہے کہ نہیں' زندگی ایسی بسر کرنا ہوگی کہ جس میں اس دنیا کے اندر Struggle (جدوجہد) کرنا ہے Preservation of self (تحفظِ خویش) کے لیے طبعی جدوجہد کی ضرورت ہے جبھی آپ زندہ رہیں گے۔ اس طبعی زندگی میں کچھ بننا ہے' As you were (جیسے تھے ویسے کے ویسے ہی رہے) نہیں ہے۔

جنت میں پیشانی کا نور

طبعی زندگی کے آگے بڑھنے کے لیے دنیاوی زندگی کی جدوجہد لازم ہے۔ اس کے لیے تمام ذرائع اسباب مہیا کرنے ضروری ہیں۔قرآن میں **اٰتینا فی الدنیا حسنۃً** ❶ پہلے آیا ہے‘ اگر فی الدنیا حسنات نہیں ہیں‘ یہ تمام چیزیں میسر نہیں ہیں‘ تو زندگی یہیں ختم ہو جائے گی پھر کیا آگے بڑھے گا اور کیا آگے چلے گی‘ یہ بات ہی ختم ہو گئی۔ یہاں Preservation of self (تحفظ خویش) سے زندگی کو اس مقام پہ رکھا اور اگر اسی مقام کو منتہیٰ اور مقصود سمجھ لیا تو یہ جہنم ہو گی۔ اور اگر اس میں آگے بڑھنے والی چیزیں ہونگی تو یہ ہے وہ جس کو آپ جنت کا مقام کہتے ہیں۔ زندگی کے مقام میں جنت بھی آخری مقام نہیں ہے‘ وہ بھی آگے بڑھنے کے لیے ایک میدان ہے۔ جنت والوں کے متعلق بھی قرآن میں یہ ہے کہ ان کی پیشانی کا نور ان کے راستے روشن کرتا چلا جائے گا۔ راستے روشن کرنے کا مقصد تو یہی ہے کہ آگے بھی چلنا ہو گا۔ وہ اور بات ہے۔ یہاں کی زندگی کے بعد تو بہرحال ارتقائی منازل طے کر کے آگے چلنا ہے‘ آگے بڑھنا ہے۔

طبعی زندگی کی شراب اور قرآنی شراب میں فرق

قرآن اپنا نظام آگے بڑھنے کے لیے دیتا ہے۔ اب جہاں اس قوت اور اقتدار کا ذکر چلا آ رہا ہے جو اس نظام سے‘ اس شراب سے ملتا ہے۔ آپ دیکھیے گا‘ میں پھر عرض کر رہا ہوں‘ آپ کے پاس نسخے نہیں ہیں‘ ورنہ قرآن کے الفاظ پہ نگاہ ہو‘ آدمی جھوم جاتا ہے۔ میں خود پڑھے دیتا ہوں: **یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ o خِتٰمُهٗ مِسْكٌ** ❷ (83:25-26)۔ عزیزانِ من! ابھی یہ آیت ختم نہیں ہوئی ہے یہاں کامہ (Comma: وقفہ) ہی ہے۔ آگے **خِتٰمُهٗ مِسْكٌ** (83:26) آیا ہے۔ خود ہی اس کا مقصود بتایا ہے کہ **وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ** (83:26) یہ اس لیے دی گئی ہے کہ جو آگے بڑھنا چاہے آگے بڑھتا چلا جائے۔ طبعی زندگی کی شراب تو گرا دیتی ہے۔ یہ ہے قرآن کا مقصود۔ افراد میں بھی جو ایک فرد کے اندر جوہر ہیں وہ اتنی جدوجہد کرے کہ باقی افراد سے آگے نکل جائے اور من حیث القوم تو قرآن نے کہا کہ یہ قوم اعلون رہے گی **اَعْلَوْنَ** ❸ (3:138) تو Superlative ڈگری ہے یعنی سب سے آگے‘ سب سے اوپر۔ تو یہ شراب اس لیے ہے کہ اس سے آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے جائیں۔ یہ موضوع قرآنِ کریم کے مختلف

---

❶ ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں عطا فرما۔

❷ انہیں (زندگی کی توانائیوں کے لیے) بادۂ خالص پینے کو ملے گا جو ہر قسم کی آلائش و آمیزش سے پاک ہو گا۔ یعنی سربمہر آبگینوں میں بند۔ ان آبگینوں کی مہریں (Seals) بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہوں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ تم پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا (4:141)۔ (ایضاً)

مقامات پر آیا ہے۔ایک مقام پہ ہے کہ اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ❶ (56:10)۔ایک دوسری جگہ تو اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ❷ (74:37)۔کہا کہ یہ سب کچھ کا ہے کے لیے ہے؟ پیچھے سے بڑی عجیب آیات آ رہی ہیں' بہرحال قرآنِ کریم کی تعلیم کے مختلف مراحل گناتے ہوئے کہا کہ یہ سارا کچھ کا ہے کے لیے ہے؟ قرآن کے الفاظ غور سے سنیے گا۔کہا کہ یہ اس لیے ہے تا کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ❷ (74:37) تم میں سے اس کی رو سے جو آگے بڑھنا چاہے وہ آگے بڑھ جائے اور جو پیچھے رہنا چاہے وہ پیچھے رہ جائے۔وہ تو اس لیے ہے کسی ایک مقام پہ کھڑے ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔

پست سے پھر پست تر کی طرف

عزیزانِ من! ایک مقام پر کوئی شے رہ ہی نہیں سکتی۔یہ عجیب چیز ہے۔ایک دوسری طرف میں چلا جاؤ نگا۔یہ سائنس کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ایک مقام پر رہنے سے وہ شے اپنی اصلی حالت سے نیچے آ گئی ہوئی ہوتی ہے۔وہ جو اس کے اندر آگے چلنے کی حرکت ہوتی ہے وہ سلب ہو چکی ہوتی ہے۔یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ٹھہرتی ہے۔کوئی ٹھہری ہوئی شے ویسے کی ویسے نہیں رہتی پست ہوتی چلی جاتی ہے' اس میں تبدیلی آتی ہے' تغیر آتا ہے۔یہ تغیر پستی کی طرف آتا ہے' تغیر تو ہر حال میں آنا ہے۔اگر وہ حرکت اور حرارت سلب ہوئی ہے تو پستی کی طرف' نیچے کی طرف' گرے گی۔پہاڑ کی چوٹی سے جو چیز آئے گی وہ نیچے کی طرف گرے گی۔اور اگر وہ حرکت اور حرارت ہے' تبدیلی اس میں آنی ہے' آگے بڑھنے کے لیے اس میں تبدیلی آئے گی: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37) کیا بات ہے قرآن کی! جس کا جی چاہے' یہ شراب پیئے' آگے بڑھ جائے' انفرادی حیثیت میں بھی' اجتماعی حیثیت میں بھی' انسانیت کی تاریخ میں بھی۔یہ ریس کورس (دوڑ کا میدان) ہے۔آپ کو پتہ ہے اور آپ کو یاد ہوگا' میں نے پچھلے کسی درس میں لفظ مصلی کی وضاحت کی تھی۔قرآنِ کریم میں صلوٰۃ کے تحت جو کچھ آتا ہے اس کی ادائیگی کرنے والے کے لیے یہ مصلی کا لفظ آتا ہے۔مصلی ریس کورس کا وہ گھوڑا ہوتا ہے جو باقی گھوڑوں سے سب سے آگے' لیکن اگلے گھوڑے سے پیچھے ہوتا ہے' لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37) جس کا جی چاہے' کیا بات ہے قرآن کی! کوئی روک نہیں اس کے راستے کے اندر' جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔

---

❶ مصاف زندگی میں سب سے آگے آگے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔(اس تمام رشد و ہدایت اور کشمکش حق و باطل سے مقصود یہ ہے کہ جو شخص چاہے اپنی کوشش سے زندگی کے ارتقائی منازل میں آگے بڑھ جائے' جو پیچھے رہنا چاہے' پیچھے رہ جائے۔) (مفہوم القرآن۔پرویز)

پیالے کے مطابق شراب کا حصول

جتنا بڑا پیالہ لاؤ گے اتنی شراب مل جائے گی۔ ان شرابیوں کی شاعری بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ کیا بات ہے۔ دعوتِ عام است۔ وہاں رکاوٹ نہیں ہے۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ تم اپنا پیالہ کتنا بڑا لے کر آتے ہو وہ جتنا بڑا لاؤ گے اتنی ہی مل سکے گی۔ وہاں تو اس کے لیے کوئی انتہا ہی نہیں، کوئی حد ہی نہیں، کوئی نہایت ہی نہیں ہے۔ وہاں تو مٹکے بھرے ہوئے ہیں، ختم ہی نہیں ہو سکتی۔ اب جتنا پیالہ کوئی لائے گا اتنا ہی ملے گا۔ زیادہ لینی ہے، بڑا پیالہ لے آؤ: لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّتَقَدَّمَ اَوۡ يَتَاَخَّرَ (74:37) اور یہی چیز ہے جو قرآن نے یہاں کہی ہے کہ فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ (83:26) منافست، مسابقت، ایک دوسرے کے آگے بڑھنے کا، ارتقا کی منزل میں آگے سے آگے چلے جانا، اوپر سے اوپر چلے جانا ہے۔ قرآن نے یہ دونوں چیزیں کہی ہیں: یہ آگے بڑھنا اور بلندیوں کی طرف جانا ہے اسی لیے اس کو قرآن نے پہاڑی کی گھاٹی پر چڑھنے سے تشبیہ دی ہے۔ کیا تشبیہات ہیں قرآن کی! آگے بھی ایسا راستہ چلے کہ جو سیدھا بھی جا رہا ہو اور ساتھ کے ساتھ اونچا بھی ہوتا چلا جا رہا ہے، اس کے اندر بلندیاں بھی ہیں اور آگے بڑھنے کی بات بھی ہے۔ اب اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے اور سلسلہ ارتقا میں ارتقا تو کہتے ہی بلندی کی طرف جانے کے لیے ہیں: فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ (83:26) اب اس شراب کے اندر کچھ تھوڑا سا ''سوڈا'' ملانا ہے۔ ان بلندیوں کو ذہن میں رکھیے گا [1] اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَمِزَاجُهٗ مِنۡ تَسۡنِيۡمٍ [2] (83:27)۔ کیا بات ہے! اس میں ملایا جائے گا تھوڑا سا پانی: تسنیم۔ سنام بلندی کو کہتے ہیں۔ اب ان عربوں کے ہاں ابتدا بلندی کے لیے تو اونٹ کی کوہان ہی بڑی چیز تھی۔ یہ اس کو بھی سنام کہتے تھے اور پھر جو پہاڑیوں کی چوٹیاں ہوتی تھیں وہ بھی سنام کہلاتی تھیں۔ تسنیم: بلندیوں سے اترتا ہوا، آبشار کی طرح جو پانی آ رہا ہو اس کو تسنیم کہتے ہیں۔ پھر اس میں بلندی ہے، اس میں پانی بھی ملا رہا ہے تو بلندیوں کی تشبیہ کیساتھ ملا رہا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم آگے بڑھانا، بلند لے جانا ہے: وَمِزَاجُهٗ مِنۡ تَسۡنِيۡمٍ (83:27) وہ

---

1. پرویزؒ (1903-1985) نے درسِ قرآن کا یہ سلسلہ 1960ء میں، کراچی سے لاہور منتقل ہونے کے بعد اپنی رہائش گاہ B-25 گلبرگ لاہور سے شروع کیا تھا جو 21 دسمبر 1967ء کو 7 سال کے عرصہ میں اختتام پذیر ہوا۔ درس قرآن کا ان کا یہ دوسرا دور، تصریف آیات کی روشنی میں، پہلے کی نسبت زیادہ مفصل انداز میں شروع کا ای گیا تھا۔ یہ دور 5 اکتوبر 1984ء تک (17 سال مسلسل) کاروانِ شوقِ عمل و آگہی کے لیے، علم و عرفان کے موتی بکھیرتا، نوعِ انسانی کے تاریک راستوں کو منور کرتا، 30 ویں پارے کی اس سورۃ المطففین کی آیت 26 تک ہی پہنچا تھا کہ آپ بیمار ہو گئے اور آخر کار، سورج کی شعاعوں سے وقت کشید کرنے والی یہ شخصیت اور فکرِ قرآنی کا یہ چراغ 26 فروری 1985ء کی شام ملت اسلامیہ کو قندیل آسمانی کے علم سے مالا مال کرتا ہوا جہانِ فردا کی پرنور اور حسین و جمیل وادیوں کی جانب زندگی کے اگلے سفر کی طرف جادہ و پیما ہو گیا۔ بقیہ دروس ان کے دورِ اوّل (1960 تا 1967ء) کے کیسٹ سے مدون کیے گئے ہیں۔
2. اس ''بادۂ رحیق'' میں اس چشمے کا آبِ خنک و شیریں ملایا جائے گا جو شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کی بھرپور نشو و نما میں ممد و معاون ہوتا ہے (76:17)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پہاڑ کے اوپر سے ایک آبشار ہے اس کا جو پانی گرے گا وہ کسی چشمے سے نکلتا ہوا اوپر سے گرنے والا پانی ہے۔ کیا ہی خوب یاد آیا! ہماری بدنصیبی تھی کہ کشمیر کی وہ وادیاں دیکھ لیں۔ مجھے تو وہ بار بار یاد آتی ہیں۔ بلندیوں سے پانی آتا ہے' آبشاروں کی طرح گرتا ہے' اور اس کے ہاں کے مختلف طبقے ہیں' وہ گرتا ہوا پانی ڈل میں آ جاتا ہے۔ وہ عجیب منظر ہوتا ہے۔ وہ جو کینیڈا کی ایک جھیل ہے جسے ساری دنیا کے لوگ دیکھنے کو جاتے ہیں۔ یہ ہے کیا؟ بلندی سے ہی پانی گر رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے اندر آمیزش بھی ہوگی تو اس پانی کی ہوگی جو بلندیوں سے گر رہا ہے۔ **عَیْناً** (83:28) پانی چشمے سے نکلتا ہے۔ چشمہ ہے جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ **عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ** [1] (83:28) جسے پینے کے بعد زندگی اور اس کی توانائیاں حاصل کرتے ہیں۔

مقرب اور فاصلے میں فرق

عزیزانِ من! اسے تشبیہ سے یوں سمجھئے کہ اس ''شراب'' کو پینے کے بعد اگر کوئی گرتا بھی ہے تو خدا کے قدموں میں جا کر گرتا ہے۔ یہ مثال کے طور پہ' تشبیہ کے طور پہ ہے۔ مقرب ہے قرب ہے۔ لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اس کے حقیقی معنی نہیں ہیں۔ اس طرح فزیکلی (جسمانی طور پر) کسی کے قریب ہونے کے تو معنی یہ ہیں کہ خدا کسی مقام میں بیٹھا ہے یا کھڑا ہے۔ جہاں کسی بھی مقام میں ہے فزیکلی' جغرافیکلی Distance (فاصلے) کے اعتبار سے اس سے قریب ہو جانا خدا کے متعلق تو یہ تصور ہی نہیں ہے کیونکہ **هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ تم بھی اس کے ساتھ ہو یا نہیں؟ اس کے ساتھ ہونے سے تو گویا ہم سب مقرب ہیں۔ قرآن کا انداز دیکھیے کہ وہ تو سب جگہ ہے' تم اس کے مقرب ہو سکتے ہو کہ نہیں؟ تو یہ جو قرب ہے' یہ فاصلے کا Distance کا نہیں ہے' طبعی زندگی کا قرب نہیں ہے۔ وہ تو قرآن کی تشبیہ میں خدا کے رنگ میں اس کی صفات میں رنگے جانا ہے ایک تو میں پھر دہرا دوں' یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ اس کی صفات میں ایک تو وہ ہیں جو اس کی ذات کی صفات ہیں یعنی **هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ** (57:3) وہ اول تھا' جب کوئی اور نہیں تھا تو اس میں تو کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا' لیکن اس کی جو دوسری صفات ہیں مثلاً وہ رزاق ہے' خبیر ہے' علیم ہے' وغیرہ وغیرہ یہ وہ صفات ہیں جنہیں انسان علیٰ حد بشریت اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔

حدودِ بشریت میں صفات خداوندی کو منعکس کرنا

خدا کے ہاں یہ صفات لامحدود ہونگی۔ انسان چونکہ محدودیت میں گھرا ہوا ہے' یہ صفات بھی محدود پیمانے کے اندر اپنے اندر منعکس کرتا چلا جائے گا۔ جتنی زیادہ یہ صفات اس کے اندر منعکس ہونگی' قرآن کی اصطلاح میں اتنا ہی زیادہ اس کو خدا کا مقرب کہا جائے گا' یعنی

---

[1] یہ وہ چشمہ ہے جس سے' وہ لوگ جو اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حد بشریت) منعکس کر لیں' زندگی اور اس کی توانائیاں حاصل کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

صفات میں اس سے قریب۔ یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں اصطلاح میں ہم رنگی' یک رنگی کہتے ہیں: ہم آہنگی اور یک رنگی۔

خدا کے ساتھ تصوف والوں کا قرب

اس کے بعد تو آپ نے تصوف والوں کے ہاں دیکھا ہوگا' صاحب! وہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہیں' ان کا تصور ہی عجیب قسم کا ہے: فاقہ مست' زردرو' نہ کھانے کو روٹی' نہ پہننے کو کپڑا' نہ رہنے کو مکان۔ وہ لطیفے والے بات کرتے تھے کہ معاشرے میں مختلف قومیں گزریں گی اور آواز آئے گی کہ یہ وہ قوم آئی' یہ وہ قوم آئی' اور پھر ایک قوم آئے گی کہ یہ خدا کے مقربین کی قوم ہے' وہ چلی آرہی ہے: نہ خدا کھاتا ہے' نہ ان کو کھانے کو ملتا ہے' نہ وہ پہنتا ہے نہ ان کے پاس کپڑا ہے' نہ اس کا مکان ہے نہ ان کا کوئی مکان ہے۔ یہ ہیں ہمارے ہاں کے مقربین' ان مقربین پر فارسی میں ایک شعر بڑا خوبصورت کہا ہے:

زِ تیرہ بختی ' آئینہ حیرتے دارم
ترا کشید در آغوش آفتاب نہ شد

آئینے کی تیرہ بختی یا بدنصیبی پر مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے' کیونکہ اس نے تجھے اپنے آغوش میں سمٹا لیا مگر خود سورج نہیں ہوسکا' شیشے کا شیشہ ہی رہا ہے۔ کیا بات ہے اس کی بدنصیبی کی! یہ خدا کے مقرب بھی ہوئے مگر خدا کی جو جلال واقتدار اور غلبہ وتسلط کی صفت تھی وہ پیدا نہ ہوئی۔

تصوف میں یہ نہیں ہوسکتا' جب کہ قرآن یہ چیز پیدا کرتا ہے: صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ❶ (2:138)۔ یہ ہے خدا کا رنگ۔ لیکن اس رنگ سے تو ہر شخص ڈرتا ہے۔ پورے کے پورے کرتے پہ اگر ایک رنگ آجائے تو پہلے کے سارے رنگ اس میں ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ ان رنگوں کو ختم نہیں کرنا چاہتے اس لیے اپنے آپ کو اس رنگ کے مٹکے میں ڈبونا ہی نہیں چاہتے عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِهَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ ❷ (83:28)۔ یہ ایک بات درمیان میں اور آگئی۔ میں نے کہا تھا کہ آگے بڑھنے کا جذبہ ہر ایک کے اندر ہے۔ طبعی زندگی کے اندر بھی آگے بڑھنے کا وہ جذبہ تو ہمارے سامنے ہے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے سے یہ دنیا پاگل ہوئی جاتی ہے' ایک تو ضرورت کی چیز ہے' ضرورت کے لیے دو روٹیاں سالن' پہننے کے لیے کرتہ پاجامہ' رہنے کے لیے ایک کوٹھڑی مکان ہے۔ ضرورت تو مگر اس کی انتہا کی ہوتی ہے' محدود ہوتی ہے۔ وہاں ضرورت ختم ہوجاتی ہے' دو روٹیاں کھانے والے کے سامنے روٹی کا ڈھیر لگا ہو وہ تیسری کھا

---

❶ نجات وسعادت قانونِ خداوندی...... صفاتِ خداوندی...... سے یک رنگ وہم آہنگ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کون سا ہوسکتا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ وہ چشمہ ہے جس سے' وہ لوگ جو اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حد بشریت) منعکس کرلیں' زندگی اور اس کی توانائیاں حاصل کرتے ہیں۔ (ایضاً)

ہی نہیں سکتا' لیکن ہوس تو کہیں ختم ہی نہیں ہوتی اور پھر جب وہ ہوس ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی ہو: اچھا بھلا موٹر موجود ہے' وہ دوسرا جو میاں صاحب ہے انہوں نے ایک اور موٹر لے لی۔ اب یہ ہے کہ ہمارے پاس بھی ہونی چاہیے بلکہ ان سے آگے تین ہونی چاہئیں' یہ جس قدر پاگل پن آپ دنیا کے اندر دیکھ رہے ہیں جو اس وقت آ رہا ہے' وہ اس ہوس کی وجہ سے ہے۔

ایک روشن منزل سے غافل کر دینے والا جذبہ

دنیاوی اسباب وسامان میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ o حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ** ❶ (102:1-2)۔ یہ جذبہ انسان کو حقیقی مقصودِ زندگی سے غافل کر دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے ان طبعی اسباب وسامان اور آسائشوں میں دوسروں سے آگے نکل جانا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ضرورت کی تو حد ہوتی ہے۔ مگر ان سے آگے نکل جانے کا یہ جذبہ انسان کو قبر تک لے جاتا ہے یعنی **حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ** (102:2)

تکاثر اور تنافس کا قرآنی مفہوم

تَکَاثُرُ (102:1) وہاں بھی ہے' **تنافس** (83:26) یہاں ہے۔ آپ عربی زبان جانیں تو آپ کو پتہ چلے کہ جو تکاثر یا کثر ہے' جو کثرت ہے' وہ محسوسات کے لیے ہوتا ہے' اس میں چیزیں فزیکلی (جسمانی طور پر) نظر آ جاتی ہیں' چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔ تکاثر ان محسوس ہونے والی چیزوں' جسمانی طور پر نظر آنے والی چیزوں' محسوس ہونے والی چیزوں کے اندر ہے اِس کے برعکس تنافس نفس کی چیز ہے' انسانی ذات کی چیز ہے۔ یہاں اس کا آگے بڑھنا ہے۔ قرآن تنافس سکھاتا ہے' منافست سکھاتا ہے۔ تکاثر کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ تو قبر تک پہنچانے کی چیز ہے۔ قبر میں پہنچا تو پھر خاتمہ ہو گیا' نہ تو تکاثر کا جذبہ رہا اور نہ یہ جذبے والا باقی رہا۔ اور تنافس یا منافست کے اندر یہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ ختم ہو جائے گا تو تکاثر والا جسم ختم ہو جائے گا۔ یہ ذات' جس کو آگے بڑھانے کے لیے اتنا کچھ کیا تھا' یہ تو آگے چلے گی' پھر یہ تو جوئے رواں ہے' جو صحرا سے گزر کر گلستاں میں آ جائے گی۔ جو تکاثر ہے وہ انسان کو اس کے مقصودِ حیات سے غافل کر دیتا ہے اسی لیے کہا کہ **اَلۡھٰکُمُ التَّکَاثُرُ** ❷ (102:1)۔ تکاثر تو انسان کو غفلت میں ڈال دیتا ہے اور پھر یہ تکاثر ختم ہی نہیں ہوتا۔ پھر

---

❶ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں انسانیت کی صحیح منزلِ مقصود کی طرف سے یکسر غافل کر دیتی ہے؟ وہ چیز ہے مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس (83:26; 57:20)۔ اگر تم اپنی طلب کو' اپنی ضروریات پورا کرنے تک محدود رکھو تو اس کی ایک حد ہو گی لیکن جب جذبہ محرکہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا ہو تو اس کی کوئی حد ہی نہیں ہو سکتی۔ اس جذبہ کے ماتحت کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں انسانیت کی صحیح منزلِ مقصود کی طرف جانے سے یکسر غافل کر دیتی ہے؟ وہ چیز ہے مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس (83:26; 57:20) (ایضاً)

آدمی کسی اور کام ''جوگا'' ❶ رہتا ہی نہیں۔ اگر تین موٹریں لے لو گے تو چار موٹروں والا آ جائے گا' دس کوٹھیاں بنالو گے تو پندرہ والا سامنے آ جائے گا' چل سو چل آخرالامر یعنی یہاں تک کہ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔ مگر یہاں تنافس یا منافست کے سلسلے میں کہا کہ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ❷ (83:28)۔ میں نے کہا ہے کہ یہ مقرب ہیں جن کے لیے یہ کہا ہے۔

دل کی چٹانوں سے نکلنے والا چشمہ

یہ جو عین ہے یہ چشمہ ہے۔ اس سے پھر ذہن میں آ گیا کہ خدائے علیم و خبیر' ہمارے دلوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ یہاں چشمہ کہا تو چشمہ تو مادی ہوتا ہے' پہاڑ کی چوٹیوں سے نکلتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ چشمہ وہ نہیں ہے جو کہیں باہر سے پانی پھوٹ کے آتا ہے۔ یہ تو يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ❸ (76:6) ہے۔ یہ تو وہ چشمہ ہے جسے مومن اپنے دل کے چٹانوں سے خود نکال کر لاتے ہیں۔ چشمہ بھی وہ خود نکالتے ہیں:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

یہ شخص ❹ کیا بات کر جاتا ہے! قرآن سے لیتا ہے' اسی لیے اس کی فکر میں بلندیاں بھی ہیں اور لطافتیں بھی ہیں' اور گہرائیاں بھی ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن سے لیتا ہے۔

قرآنِ کریم نے کہا کہ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (76:6) مومن اس چشمے کو اپنے دل کی گہرائیوں کی چٹانوں سے خود پھاڑ کر باہر لے آتا ہے۔ اس چشمے کا نام قرآن نے سلسبیل دیا ہے۔ یہ کسی ایک مقام کے جھیل کی طرح بند ہو کے ہی نہیں رہ جاتا۔ یہ بہتا ہوا چلا جاتا ہے' ہر ایک کے گھر سے گزرتا ہوا' آواز دیتا ہوا کہ پانی کی ضرورت ہے تو لے لو' میں آ گیا ہوں۔ یہ ہے سلسبیل۔ راستے میں لوگوں سے پوچھتا ہوا کہ ''چاہیے' میں آ گیا ہوں۔'' یہ ہے وہ چشمہ جو مومنوں کے دلوں کی چٹانوں سے ابھر کر باہر آتا ہے۔ یہ ہیں مقربون۔

---

❶ کے لائق

❷ یہ وہ چشمہ ہے جس سے' وہ لوگ جو اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حد بشریت) منعکس کر لیں' زندگی اور اس کی توانائیاں حاصل کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ خود اپنے دل کی گہرائیوں سے نکال کر لاتے ہیں۔ یہ ان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ (اس چشمے کی نالیوں کا رُخ) جدھر جی چاہے کر دیں۔

❹ یہ اشارہ مفکرِ قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں مجرم کا مفہوم

قرآن کریم نے کہا کہ یہ تو مقربون کی کیفیت ہے۔اس کے بعد ان کے خلاف دوسرے بھی ہیں وہ ہیں اَجۡـرَمُوۡا ❶ (83:29)۔ ''جرم تو آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں بنیادی طور پر'' دوسروں کے درخت سے پھل کاٹ کر خود لے آنا ہے۔'' یہ ہیں وہ جنہیں اب مجرم ہی نہیں قرار دیا جاتا۔اب وہ سب سے زیادہ شریف' بھلے مانس سمجھے جاتے ہیں۔ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّـذِیۡـنَ اَجۡرَمُوۡا کَـانُـوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ❷ (83:29) کہا کہ تم دیکھو گے یہ عجیب چیز ہے' یہ اٰمنوا والے کیا کہتے تھے؟ کیا کرتے تھے؟ یہ کہتے تھے کہ جان مار کر محنت کرو' اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی لے کے آؤ' اپنے لیے کم از کم ضرورت کے مطابق رکھو اور اس زائد جو کچھ بچے' دوسروں کی ضرورت کے لیے دیدو۔تو وہ کہتے ہیں کہ ان پاگلوں کو دیکھو۔ان کا جو سردار نبی اکرمؐ ہے قرآن میں ہے' کہ وہ مجنون یعنی پاگل ہو گیا ہے۔یہ تو ایسی سوچ رکھنے والے کو ہی پاگل کہیں گے۔بہرحال آپ کے ہاں اور ہمارے ہاں بھی تو یہی مسئلہ ہے کہ پاگل ہو گیا ہے' اس کو اپنے نفع نقصان کی بھی فکر نہیں۔اپنا نفع نقصان!! اس کا پیمانہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ' سارے کا سارا' خود رکھے' تو پھر یہ بھی ہوشمند ہے لیکن اگر اس کی یہ کیفیت ہو جائے کہ کم از کم اپنے لیے رکھے باقی سارا دوسروں کو دیدے تو ان کے پیمانے اور ان کے معیار کے مطابق تو یہ پاگل ہی ہے۔کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے تو یہ ہنستے ہیں: یہ دیکھیے' یہ کہتے کیا ہیں۔کیسا عجیب منظر ہے یہ ہنسنے کا! اگر سامنے نہیں ہنستے تو پیٹھ پیچھے ہنستے ہیں۔اگر اس وقت کہیں کوئی دیانتدار ان کے سامنے نظر آئے کہ اس کی کیا کیفیت ہے: اپنا کیپٹل لگایا تھا' تھوڑے سے پیسے تھے' دیانتدار بن کے دوکان چلائی ہے' سب کچھ لٹ گیا میاں کا۔اور یہ لوگ پھر اس کے اس عمل پر ہنستے ہیں۔دیکھیے! یہ ہنسنے والے کون ہیں؟ ان کے لیے ''اجرموا'' کا لفظ دیکھیے' جن کی کیفیت یہی نہیں کہ اپنے درخت کا پھل آپ رکھتے ہیں' دوسروں کے درخت کا پھل بھی کاٹ کر اپنے گھر لے آتے ہیں۔یہ تو یہ ہیں تو ان پہ کیوں نہ ہنسیں گے کہ جو نہایت محنت سے اپنے ہاں پھل اگائیں' اپنی کم از کم ضرورت پوری کریں اور باقی سب دوسرے ضرورت مندوں کے لیے دے دیں۔اٰمَـنُـوۡا یَـضۡحَکُوۡنَ ۝ وَ اِذَا مَـرُّوۡا بِهِـمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ (83:29-30) گزرتے ہیں تو ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے کہتے ہیں: ذرا ان کو دیکھنا! دیکھیے! عزیزانِ من! قرآن کا یہ کیسا محاکاتی انداز ہے۔کن اکھیوں سے' غمزے سے' اشارے سے کہتے ہیں: یہ ہیں وہ جو کہا

---

❶ جو دوسروں کی محنت کے پھل نوچ کھسوٹ کر اپنے ہاں لے جاتے ہیں۔

❷ جب وہ لوگ' جو دوسروں کی محنت کے پھل نوچ کھسوٹ کر اپنے ہاں لے آتے ہیں' ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں' اور اس کے قیام کے لیے کوشاں رہتے ہیں' تو ان پر ہنستے ہیں (کہ ان بیوقوفوں کو دیکھو جو جان مار کر محنت کرتے ہیں اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضرورت کے لے کر' باقی سب' حق کا بول بالا' اور دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا فائدے کا سودا ہے!) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کرتے ہیں، دیکھیے جان مار کر محنت کرتا ہے اور آپ دیکھیے اس شخص نے پہنا ہوا کیا ہے **وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا فَكِهِيۡنَ** (83:31) اور جب گھر لوٹتے ہیں تو گھر میں جا کر بھی یہی باتیں کرتے ہیں کہ اس قسم کی ایک جماعت بالکل پاگلوں کی یہاں پیدا ہوگئی ہے، ایک لفظ اور بھی ہے: **وَ اِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ** (83:32) یہ ہمیں کہتے ہیں کہ تم غلط راستے پہ جا رہے ہو۔ سب سے بڑے غلط راستے پہ تو یہ جا رہے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جان مار کر محنت کرو اور ضرورت سے زائد دوسروں کو دو۔ **لَضَآلُّوۡنَ** (83:32) یہ ہیں جو گمراہ ہیں، یہ ہیں جو بالکل بہک گئے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

خرد کے عمل کا نتیجہ اور جنون کا ماحصل

عزیزانِ من! یہ باتیں کون سمجھے گا کہ واقعی خرد کا تقاضا کیا ہے اور جنون کسے کہتے ہیں۔ یہ جو جنون ہے، حقیقت میں یہی خرد ہے۔ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں، قرآن نے اور اس کی روشنی میں اقبالؒ نے بھی اسی لیے دونوں میں فرق کیا ہے۔ عقلِ خود بیں سب اپنے لیے سمیٹنے والی ہے، عقلِ جہاں بیں دوسروں کو دیدینے والی ہے۔ یہی فرق ہے قرآن کی تعلیم اور سیکولرازم میں یا اس قسم کے اسلام میں جو ہمارے ہاں رائج ہو رہا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ المطففین کی آیت 33 پہ ہم آ گئے، 34 سے ہم آئندہ لیں گے۔ [1] اتنی سی بات اور کہہ دوں قرآنِ کریم مومنین سے کہتا ہے کہ انہیں یہ کہنے دو لیکن یہ بات ان کے گوش گزار کر دو کہ **وَمَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَيۡهِمۡ حٰفِظِيۡنَ** [2] (83:33) ہم نے تمہیں ان پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کو مار مار کر ٹھیک کرنا اور ان کے اعمال کا محاسبہ کرنا ہے۔ تم نے صرف ان تک بات پہنچانی ہے، پھر اس کے بعد یہ ہے کہ **فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ** [3] (18:29)۔ اس لیے انہیں ہنسنے دو۔ عزیزانِ من! آگے آتا ہے کہ ابھی وہ دن آئیں گے، قریب ہی آ جائیں گے، کہ جب تم ان پہ ہنسو گے۔ اس وقت جب یہ انقلابی پروگرام اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے، ظاہر بیں نگاہوں کو ایسا ہی نظر آتا ہے کہ یہ دیوانوں کی جماعت ہے جسے اپنے نفع نقصان کا کوئی خیال نہیں اور یہی وجہ ہے جو یہ ان پر ہنستے ہیں لیکن **فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ** (83:34) جب یہ پروگرام اپنی تکمیل تک پہنچ جائے گا تو

---

[1] بقایا آیات 34 تا 36 کا درس اگلی سی ڈی میں موجود نہیں ہے۔ ان آیات کا مفہوم، مفہوم القرآن سے مرتب کر کے یہاں دیا گیا ہے۔

[2] انہیں، ان (مومنین) پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا (کہ وہ ان کے اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں۔)

[3] اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے، اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

یہی ایمان والے ان لوگوں پر ہنسیں گے جو ہمارے قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں۔ اُس وقت یہی ایمان والے **عَلَى الْاَرَآئِکِ يَنْظُرُوْنَ** (83:35) اختیارات واقتدارات کی مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے ان مذاق اڑانے والے لوگوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ یہی لوگ تو ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی یہ حالت کن اعمال کا نتیجہ ہے؟ قرآنِ کریم اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ **هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ** (83:36) ان کی یہ حالت خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کا عمل لوٹ کر اس کی طرف آ جاتا ہے۔ اُسی سے اس کی جنت یا جہنم مرتب ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ المطففین یہاں ختم ہوئی۔ اب ہم آئندہ درس میں سورۃ الانشقاق لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

اکیسواں باب: سورة الانشقاق (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موجودہ دور کی تاریکی میں جہانِ نو کی امید کے آثار

عزیزانِ من! آج کا یہ درس سورۃ الانشقاق (84 ویں سورۃ) کی پہلی آیت سے شروع ہو رہا ہے: (84:1) اس سورۃ میں پھر اسی دور کی طرف اشارات ملتے ہیں جو میں نے سورۃ التکویر کے درس میں کہا تھا کہ قرآن اُس دور کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کچھ ایسا پر اُمید ہو رہا ہوں کہ جتنا یہ دَور زیادہ تاریک ہو رہا ہے' اس میں اتنی ہی زیادہ امید کی ایک کرن نظر آ رہی ہے کہ شاید وہ دور بہت قریب آ رہا ہے۔ اس سورۃ کی پہلی آیت ہے کہ **اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ** (84:1) جب فضاؤں کے اندر پھیلی ہوئی یہ توانائیاں پھٹ جائیں گی۔ یہ جو ایٹم (Atom) کا پھٹنا ہے' اسے آج آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ اور اگلی آیت ہے کہ **وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ** (84:2) اور یہ کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا جو تمام کائنات کا نشوونما دینے والا ہے۔ اسی کے قانون کے تابع یہ تمام سلسلہ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اس نے اسے بنایا ہی اس انداز سے ہے کہ ہر حادثہ اس کے پروگرام میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔ یہ تو ہماری کوتاہی تھی کہ ہم اس سے پیشتر اسے جان نہیں سکے۔ ایٹم کا ایک ذرہ جس کے متعلق انسان کی لاعلمی نے کسی دور میں کہا تھا کہ یہ ایسا ایٹم ہے جو جزو لایتجزّیٰ [1] ہے اور اُسے آنکھ سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ یعنی یہ اس درجے تک چھوٹی چیز ہے لیکن آج یہ کہا گیا ہے کہ وہ چیز غلط ہے۔

---

[1] اس نظریئے کا ابوالآباء یونان کے فلاسفر دیمقراطیس (Democritus: 460-370BC) کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے مکتبِ فکر کا نام نظریہ جوہریت (Atomism) رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ تمام کائنات ان اجزا (Atoms) سے بنی ہے جن کی مزید تقسیم ناممکن ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تسلیم کیا جاتا تھا کہ (۱) یہ تمام لایتجزیٰ اجزا (Atoms) مادی ہیں' (۲) ہر شے انہی ذرات سے مرکب بنے (۳) جب یہ باہم مل کر کسی شے کو ترتیب دیتے ہیں تو ان کے درمیان خلا (Empty Space) رہ جاتا ہے' (۴) یہ ذرات ناقابلِ فنا (Indestructible) ہیں' (۵) یہ ہمیشہ سے حرکت میں ہیں اور ہمیشہ حرکت میں رہیں گے اور (۶) نفسِ انسانی بھی انہی اجزا سے مرکب ہے اور انسانی فکر (Thoughts) ان اجزا کی طبعی ترتیب سے ظہور میں آتا ہے۔ ان نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رسل (Russall) کی کتاب History of Western Philosophy (تاریخ مغربی فلسفہ)

یہ ایٹم (Atom) وہ چیز ہے جس میں بے پناہ قوت ہوتی ہے اور اس کے ٹوٹنے سے جو قوت نکلتی ہے آج اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ ایک ایٹم کرہ ارض کو بھی تباہ کر سکتا ہے۔ ان توانائیوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ **اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ** (84:1) جب یہ فضا میں پھیلی ہوئی توانائیاں پھٹ جائیں گی اور یہ کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا جو تمام کائنات کا نشو ونما دینے والا ہے۔ اس نے اسے بنایا ہی اس طرح سے ہے۔ پھر کہا کہ **وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ** (84:3) یہ زمین، ٹرانسپورٹ کے ذرائع رسل و رسائل نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بٹی ہوئی تھی، پھیل جائے گی۔ **وَاَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا وَتَخَلَّتۡ** (84:4) اور اس کے اندر معدنیات کے جو مدفون خزانے ہیں، یہ سارے اگلنے شروع کر دے گی، اس کا پیٹ خالی ہونا شروع ہو جائے گا۔ **وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ** (84:4) اور یہ بھی خدا کے قانون کے مطابق ہوگا جس کی اطاعت اشیائے فطرت کا فریضہ ہے۔ اس نے اسے بنایا ہی اسی طرح سے ہے۔

بنی آدم کے سامنے صراطِ مستقیم تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں

یہاں قرآنِ کریم نے نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ** [1] (84:6)۔ میں ہمیشہ قرآنِ کریم کے اس نکتہ کو واضح کرتا رہا ہوں کہ حق کے مقام تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ وحی کے ذریعے سے ہے۔ اگر آپ اسے لے لیں تو نہایت آسانی سے کم از کم وقت کے اندر آپ حق کے اس مقام پہ پہنچ جائیں گے۔ دوسرا راستہ وہی ہے جو میں نے کہا تھا کہ جب آپ حساب کا کوئی سوال یا جزو، کسی فارمولے یا قاعدے کی رو سے نکالیں گے تو فوراً نکل آئے گا اور اگر اس فارمولے کی رو سے نہ نکالیں تو پھر Trial& Error (سعی وخطا) کا جو طریقہ ہے اس سے کرتے چلے جایئے۔ پھر دوسرا طریقہ استعمال کیجیے۔ اگر جواب غلط آیا، پھر تیسرا استعمال کیجیے، پھر جواب غلط آیا تو چوتھا طریقہ استعمال کیجیے۔ اسی طرح چلتے جایئے۔ اس سے بھی بالآخر آدمی صحیح نتیجے پہ پہنچ جاتا ہے لیکن اس سے بڑا لمبا عرصہ لگتا ہے اور جب کاروانِ انسانیت نے اس طرح منزل پہ پہنچنا ہو تو پھر تو آپ سمجھتے ہیں کہ راستے میں کتنی خون کی خندقیں پیرنی پڑتی ہیں، آگ کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں، کتنی کتنی عظیم جنگیں ہوتی ہیں، کتنی ہڈیاں ٹوٹتی ہیں، خونریزیاں ہوتی ہیں، فساد انگیزیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر، صدیوں کے Trial& Error (سعی وخطا) کے بعد، یہ اس نتیجہ تک پہنچتی ہے کہ شاید یہ چیز صحیح نظام نہیں ہو سکتا۔ میں نے مثال کے طور پر یہ کہا ہے اور اگر وحی کا گر لے لیا جائے، اس کے مطابق بات کی جائے، تو وہ بات فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے۔ حق تک پہنچنے کے دونوں ہی راستے ہیں۔ ایک لمبا ہے، پُر مشقت ہے، پُر خطر ہے۔ دوسرا سمٹا ہوا ہے، محفوظ ہے۔ دونوں ہی طریقوں سے آدمی اس منزل پہ پہنچ جاتا ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے اس کو کس حسین انداز میں کہا تھا:

---

[1] اے انسان! اس میں شبہ نہیں کہ تو اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر بھی آخر الامر اس نظامِ خداوندی تک پہنچ جائے گا جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ضامن ہے لیکن ایسا بڑی جانکاہ مشقتوں اور استخواں شکن ٹھوکروں کے بعد ہوگا۔ (مفہوم القرآن، پرویزؒ)

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں

یہ دونوں ہی امیر کارواں ہیں، دونوں ہی منزل کی طرف کھنچے چلے جارہے ہیں لیکن

عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں ❶

بات صرف اتنی سی ہے۔ یہ وہ چیز ہوتی ہے کہ......

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

قوانین فطرت اور انسانی زندگی کے لیے وحی خداوندی کا مقام

یہ عشق یعنی وحی خداوندی کی وہ جست ہے جو معاملات کا حل دیتی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ وحی خداوندی سے آپ کو قانون ملتا ہے۔ قانون نام ہے، عزیزانِ من! قوانینِ فطرت کا اور انسانی زندگی سے متعلق وحی خداوندی کے ذریعے ملنے والے قوانین کا۔ فطرت کے قوانین کو Discover (منکشف) کرنا ہے اور انسانی زندگی کے متعلق وحی کے ذریعے ملنے والے قوانین کے تحت زندگی بسر کرنا ہے۔ جب آپ کو قانون مل جائے تو ان دونوں قوانین ❷ کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔

قانون کی رو سے آپ دیکھیے کہ انسانیت اتنی تیزی سے ترقی کرتی چلی جارہی ہے لیکن انسان کی دنیا کے اندر جتنے قوانین نافذ ہونے چاہئیں وہ انسان نہیں پا سکا۔ اس لیے اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ یہ وحی کو اپنا امام بنالیتا۔ اس نے اسے نہیں بنایا۔ دیکھیے، قرآن کس انداز سے کہتا ہے کہ ان چیزوں میں زمین کا تَخَلَّتْ ❸ (84:4) ہونا، اس کا اتنا پھیل جانا، مواصلات کی وجہ سے اس کی طنابوں کا کھنچ جانا، یہ تمام خدا کے قانون ہی کے مطابق ہوگا جس کی اطاعت ان اشیائے فطرت کا فریضہ ہے۔ یہ بنائی ہی اس طرح گئی ہیں۔ آیت (84:5) میں کہا کہ یہ بھی خاص حقیقت تک پہنچنے کے لیے عقل کا ایک Process (عمل) ہے۔ اس لیے کہا کہ یَـٰٓأَيُّهَا الْإِنسَـٰنُ (84:6)۔ میں نے کہا تھا کہ جب قرآن ''الانسان'' کہتا ہے تو اس سے مراد وہ ہوتے ہیں جو وحی کی روشنی کے بغیر اپنی تدبیروں سے منزل پہ پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہاں اسے مخاطب کیا ہے کہ اے انسان! پھر کہا کہ اِنَّکَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّکَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (84:6) ❹

---

❶ عقل ظن و تخمین کی وادیوں میں بھٹکتی ہے۔ وحی اسے علم و یقین کے صحیح مقامِ محمود تک پہنچا دیتی ہے۔ عقل کی راہ نمائی اور عشق کی راہ نمائی میں یہی فرق ہے۔

❷ قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق وحی خداوندی کے ذریعے ملتے والے قوانین (جنہیں مستقل اقدار بھی کہا جاتا ہے۔ قوانین فطرت کو ان مستقل اقدار کے تحت استعمال میں لانا مقصودِ اسلام ہے۔

❸ خالی اور صاف ہونا۔ یہاں معنی ہیں: وہ اپنی معدنیات اور دیگر ذخائر اگل دے گی، اور اندر سے خالی ہوتی جائے گی (84:4)

❹ اے انسان! اس میں شبہ نہیں کہ تو اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر بھی آخرالامر اس نظام خداوندی تک پہنچ جائے گا جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ضامن ہے لیکن ایسا، بڑی جانکاہ مشقوں اور استخواں شکن ٹھوکروں کے بعد ہوگا۔ (3-4 مفہوم القرآن از پرویز)

تو اپنے خدا سے جا کر Easily (آسانی سے) مل جائے گا لیکن بڑے ہی پر مشقت راستوں سے گزر کر ملے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ اگر اس راستے سے چلو گے تو بلا مشقت اور کم وقت میں منزل پر پہنچو گے' ناکام تجارت کی تلخ کامیوں سے بھی محفوظ رہو گے۔ اس کے لیے کہا کہ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ o فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ❶ (84:7-8)۔ جس کو وحی کا یہ ضابطہ مل جائے' اس کا حساب بڑا آسان ہو جاتا ہے یعنی وہ مثال بھی حساب کے سوال کی دے رہا ہے۔ کہا کہ اس کے لیے حساب کا سوال نکالنا بڑا آسان ہو جاتا ہے اور اس کے بعد یہ کہا کہ اگر اسے سوال آسان مل جائے تو پھر وہ Examination (امتحان) ہال سے یا انٹرویو کے بعد' صحیح جواب دے کر جس طرح نکلتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے: وَیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (84:9) وہ اپنے گھر والوں کی طرف شاداں وفرحاں بھاگتا دوڑتا ہوا چلا آتا ہے۔ وحی کی رو سے یہ کیجیے' حساب کا سوال یوں آسان ہو جاتا ہے۔ وہ جواب تم نے دیا تو دوڑتے ہوئے گھر والوں کی طرف آ رہے ہو گے' کوئی دشواری نہیں ہو گی۔

عزیزانِ من! اب اگلی آیت میں دیکھیے کہ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! یہ کہ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (84:10)۔ جو ان چیزوں کے لیے مستقبل کی طرف نہیں دیکھتے' بلکہ ہمیشہ نگاہیں پیچھے کی طرف رکھتے ہیں' وہ آگے نہیں چل سکتے۔ قرآن نے جہنم کے متعلق کہا ہے کہ وہاں بدترین چیز یہ ہو گی کہ ان کی آنکھیں پیشانی کی بجائے گدی میں لگی ہوئی ہوں گی یعنی ماضی سارا درخشندہ' مستقبل سارا تاریک۔ جب گری ہوئی قوم کا ذکر کیجیے تو وہ اپنے آباؤ اجداد کے افسانے آپ کو سنائیں گے مثلاً یہ کہ بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے۔ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (84:10)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ جس کا اعمال نامہ اس کے پیچھے سے شروع ہوتا ہے' اُسے اپنا پچھلا راستہ (ماضی) تو روشن دکھائی دیتا ہے اور سامنے کا راستہ (مستقبل) تاریک۔ کیا بات ہے قرآن کی! کیا اعجاز ہے قرآن کا! اس کے لیے کہا کہ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا (84:11)۔ یہ نہیں ہے کہ تباہیاں اسے ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں' بلکہ وہ خود تباہیوں کو آواز دے دے کر بلا رہا ہوتا ہے: او کدھر جا رہی ہو' یہ ہے تمہارا گھر۔ وہ تباہیوں کو بلا رہا ہوتا ہے۔ اس کا ماضی درخشندہ ہے اور مستقبل سارا تاریک۔ وَیَصْلٰی سَعِیْرًا (84:12) اور یوں جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس طرح یہ ہے وہ کہ جو' ان شعلوں کی نظر ہو جائے گا جو سب کچھ جلا کے راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ اِنَّهٗ کَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (84:13) وہ امتحان میں جانے سے پہلے گھر کے اندر بڑا خوش تھا۔ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (84:14) اسے اس کا وہم وگمان تک بھی نہ تھا کہ اس کی حالت میں تبدیلی آئے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسی طرح اپنی من مانی کرتا رہے گا۔ اس کی قوت وحشمت میں کبھی کمی واقع نہیں

---

❶ حقیقت یہ ہے کہ وحی کا اتباع کرنے والے کے اعمال یمن وسعادت کے حامل ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کے معاملات بڑی آسانی سے طے پا جاتے ہیں۔ (مفہوم القرآن از پرویز)

ہوگی۔ وہ سمجھ یہ رہا تھا کہ نہیں، صاحب! یہ ہمارے ہیں، اس وقت امت کی جو حالت ہے، اس میں اتنی بڑی دولت مندیاں ہیں، اتنی بڑی آسائشیں ہیں، اس میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ ان کے ذہن میں کبھی بھی یہ نہیں آتا تھا کہ اس میں کبھی تغیر بھی آئے گا۔ کہا کہ بَلٰٓی (84:15) یہ ان کی بھول ہے، ان سے کہو کہ سن رکھیں کہ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (84:15) کسی اور کی نگاہ، تمہاری ان تدبیروں کے اوپر ہو یا نہ ہو لیکن خدا کی نگاہ ان کے اوپر ہوتی ہے، وہ جانتا ہے کہ اس میں کہاں کہاں خامیاں ہیں۔ تغیر آئے گا۔ نہ تو تمہارا یہ سورج ہمیشہ کے لیے چمکتا رہے گا، نہ ان کی یہ راتیں اس طرح تاریک رہیں گی۔

نظامِ فطرت کی محسوس مثال

عزیزانِ من! سن لیجئے، قرآن کیسے سمجھا رہا ہے کہ تغیر (Change) آئے گا۔ کہا کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ پھر کہا کہ آؤ، میں تمہیں شہادت دے کر بتاتا ہوں، وہاں سے بات تمہاری سمجھ میں آئے گی: فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (84:16) سورج، جو نصف النہار پہ تھا، اتنی بلندیوں پر تھا، کبھی اس کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میں بھی کسی وقت ڈوب جاؤں گا، حالانکہ ڈوبتا ہے تو اپنے پیچھے کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ یہ کہتے تھے کہ یہ تغیر (Change) اتنی جلدی ہمارے اوپر کیوں نہیں آتا۔ کہا کہ سنو! سورج ڈوبنے کے بعد بھی کچھ عرصے کے لیے اس کی شفق باقی رہتی ہے۔ یہ جو تمہیں اپنے ہاں ابھی تک سرخی نظر آرہی ہے، یہ غروب آفتاب ہے۔ شفق کی یہ سرخی کچھ دیر تک باقی رہتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سرخی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (84:17) اس کے بعد تم رات کی تاریکیاں دیکھو گے۔ وہ تاریکیاں آکر ہر چیز کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا کرتی ہیں۔ اسی تاریکی کی چادر سے وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (84:18) اور پھر چاند نمودار ہوتا ہے، جسے تم ناخن جیسا باریک دیکھتے ہو، منزل بمنزل چلتا ہوا ایک دن کیسے بن جاتا ہے۔ اب دیکھا تم نے، نظامِ فطرت میں، کس طرح سے ان تاریکیوں کے بعد سحر کی یہ تابناکیاں آتی ہیں! کیسے چاند روشن ہوتا ہے! کیسے منزل بمنزل اوپر کو چڑھتا ہے! لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19)۔ یہ بڑی جلیل آیت ہے۔

نظریہ ارتقاء کی مسافت ایک نہ ختم ہونے والا سفر

برادرانِ عزیز! Evolution (ارتقاء) کی تھیوری (نظریہ) کے مطابق، نظریہ ارتقاء کی رو سے، زندگی ایک جرثومے سے چلی، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں مراحل سے گزرتی ہوئی پیکر انسانیت میں آئی، اور یہاں پہنچنے کے بعد آپ نے کہہ دیا کہ بس یہ اس کی منتہیٰ ہے۔ یہ سارے کا سارا جو اتنا لمبا چوڑا سلسلہ تھا، بس یہاں تک آکر یہ ختم ہوگیا۔ اس کارواں کو اس صحراؤں میں گم ہونا تھا۔ اس کی کوئی اور منزل نہیں تھی۔ یہ Materia listic (مادی) نظریہ ہے۔ قرآن اس کے خلاف ایک دوسرا نظریۂ زندگی دیتا ہے اور وہ نظریۂ زندگی یہ ہے کہ جس طرح پیچھے سے، عملِ ارتقاء سے، چلا آرہا ہے، یہاں تک جو پہنچا ہے، تو یہ اس کی آخری منزل نہیں ہے۔ ارتقاء کے تو معنی خود اوپر

کی طرف چڑھنا ہوتا ہے۔اس لیے کہا کہ یاد رکھو! لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) ہم انسان کو اسی طرح سے منزل بمنزل‘ طبقاً طبقاً‘ درجہ بدرجہ‘ اوپر چڑھاتے چلے جائیں گے۔اس نے تو ابھی اور منازل طے کرنا ہیں۔اس کا ترجمہ ”شہسوار“ کیا جائے گا۔شہسوار! انسان کی ارتقائی منازل کے لیے‘ جمود کے مقابلے میں‘ گھوڑے کا شہسوار۔سائنسدان آئیں گے‘ وہ بطور نصاب اس کو پڑھائیں گے تو پتہ چلے گا کہ قرآن یہ کیا کہہ گیا ہے۔

یہاں ”طبق“ کا لفظ ہے اور اس کے بعد ”عن“ آیا ہے۔عربی زبان میں تو اس کے لیے کئی اور بھی بیسیوں الفاظ آ سکتے تھے مگر یہاں یہ لفظ ”طبق“ کیوں آیا اور اس کے بعد ”عن“ کیوں؟ ”عن“ کے اندر ایک چیز ہوتی ہے۔زندگی کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ یہ چیز ہو۔جب یہ اس میں پوری طرح سے Adjust (ہم آہنگ) ہو جائے‘ اس میں ثبت ہو جائے‘ اس سے مطابقت پیدا کر لے تو وہ Survive (بچ رہتا ہے) کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔یہ جو مطابقت (Adjustment) ہے‘ یہ ضروری چیز ہے۔یہاں قرآن نے لفظ وہ انتخاب کیا ہے یعنی طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) کہ ایک اسٹیج (Stage) کے اندر جب یہ اس کے ساتھ Adjust (آہنگ) کر لیتا ہے‘ اس کے بعد پھر اس میں یہ اس قسم کی توانائی پیدا ہوتی ہے۔اِس ”لترکبن“ کے بعد وہ اوپر کی طرف چڑھتا ہے۔پھر اس اسٹیج (Stage) کے اندر جا کر مطابقت پیدا کرتا ہے تو پھر اور اوپر چلا جاتا ہے۔

یہاں کہا ہے کہ پیچھے سے بھی یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے اور یہ انسان کی آخری اسٹیج نہیں ہے۔اس نے تو مرنے کے بعد بھی یہی کچھ جاری رکھنا ہے: طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) اس نے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔مثال یہ دی ہے کہ دیکھتے نہیں ہو کہ پہلی رات کا ہلال‘ کس طرح‘ اپنی منال طے کرتا ہوا‘ کامل بن جاتا ہے۔وہاں پھر صورت یہ ہے کہ اس کے بعد وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے لیکن انسان کی صورت میں یہ ہے کہ جب یہ انسان کامل بنے گا تو یہ گھٹے گا نہیں۔یہ اس سے اور آگے بڑھے گا۔اس کے لیے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔وہ اس آسمان سے کسی دوسرے آسمان پہ جا کر اوپر اٹھے گا۔[1] اس لیے کہا کہ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (84:20) حیرت ہے کہ اس قدر واضح حقائق اور دلائل کے بعد تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اس قسم کی بات بھی نہیں مانتے۔نہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان لاتے ہو‘ نہ حیاتِ اُخروی پر‘ جو زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کا دوسرا نام ہے۔

---

[1] یعنی یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔

مذہب کے اندر قرأت کے دوران لایسجدون کا غلط مفہوم

وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا يَسۡجُدُوۡنَ (84:21) اور جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا جاتا ہے تو اس کے آگے اپنا سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ اسے یوں سمجھیے کہ اس قسم کے ان کے سامنے قوانین پیش کیے جاتے ہیں' یہ ان کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم نہیں کرتے' ان کے سامنے نہیں جھکتے' انہیں نہیں مانتے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ قرآن کی قرأت اس لیے ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اسے پڑھا اس لیے جاتا ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ ورنہ برادرانِ عزیز! اگر اس کو بغیر سمجھے پڑھنا ہے' اور سمجھنے کے بعد اس کے اوپر عمل نہیں کرنا ہے' تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہی لَا يَسۡجُدُوۡنَ (84:21) ہے۔ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔

مذہب نے کیا کیا؟ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن شریف کے نسخوں میں بعض جگہ Margin (حاشیے) پہ السجدہ لکھا ہوا ہوتا ہے تو وہ یہ مقام ہوتے ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ جب قرآن ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس کے قوانین کی اطاعت نہیں اختیار کرتے مگر ہمارے ہاں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآن پڑھتے ہوئے۔ جب اس مقام پہ پہنچتے ہو تو قرآن اِدھر رکھ کر وہاں سجدہ کرو۔ یہ جو قرآن کا حکم تھا تو اُس پہ تو عمل یوں ہو گیا کہ سجدہ کر لیا اور بس۔ مگر یہاں کہا گیا ہے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے کہ اس قسم کے ضوابط سامنے پیش کیے جاتے ہیں' یہ سجدہ نہیں کرتے یعنی یہ انہیں نہیں مانتے' ان کے مطابق اپنی زندگی کو نہیں ڈھالتے۔ اس طرح اُس نے تو خود ''سجدے'' کا قرآن کو ایک طرف رکھ کر سجدہ کرنے کے اِس قسم کا مفہوم لینے والوں کو پھٹکار کے رکھ دیا ہے جب کہا کہ بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُكَذِّبُوۡنَ [1] (84:22)۔ یہاں ''يَسۡجُدُوۡنَ'' کے مقابلے میں ''یکذبون'' کا لفظ آیا ہے۔ یعنی سجدہ نہیں کرتے' بلکہ تکذیب کرتے ہیں تو سجدہ میں بھی' مصدق اس کو کہتے ہیں جو کسی قانون کو' کسی فارمولے کو' کسی اصول کو' سچ کر دکھائے۔ یہ دعوے تو ہر جگہ ہی تھے کہ سچ بولا کرو' جھوٹ نہ بولا کرو' چوری نہ کیا کرو۔ وہ صرف وعظ تھا۔ یہاں ایک عملی نظام دیا جائے گا جس میں یہ ساری چیزیں تمہارے سامنے سچ ہو کر آ جائیں گی۔ جرم نہیں' جرم کے محرکات کو قرآن دُور کر دے گا۔ اُس دور کے اندر کوئی چوری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پائے گا۔

سجدہ نہ کرنے اور کرنے والی کیفیت

یہاں پھر وہ سوال پیدا ہوا کہ صاحب! یہ کون لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے بھی ہیں' یوں سجدہ بھی کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد جیسا قرآن کا انداز ہے وہ بات کو مبہم رکھتا ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ خود بتاتا ہے کہ یہ کون ہیں تاکہ تم اپنے ہی ذہن سے فیصلے نہ کر لو کہ یہ کون ہیں؟ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُوۡعُوۡنَ (84:23) اور خدا جانتا ہے کہ تم میں سے وہ کون ہیں جو سب کچھ سمیٹ کر

---

[1] بلکہ اس کی صداقتوں سے انکار کرتے اور اس کے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اپنی اس گٹھڑی میں ڈالتے ہیں اور پھر اسے صرف اپنی ذات پر خرچ کرنے کے لیے کس کر اس کا منہ باندھ دیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اس کی صداقتوں سے انکار کرتے اور اس کے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔

برادران عزیز! کیا بات ہے اس کی! کوئی بات بھی ایسی ہے جو مبہم رہنے دے! اگر مبہم رہنے دیا تو خدا کا کلام کیا ہوا۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کی کیفیت یہ ہے۔ یہ عرب "یوع" کہتے ہیں: "تھیلی میں ڈال کر، اس کو اوپر سے کس کر باندھ دینا۔" کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ ان کا انجام کیا ہوگا؟ ان کے متعلق کہا کہ **فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ** (84:24) [1] ان کے سامنے اعلان کر دو کہ یہ بات یوں نہیں چل سکے گی۔ وہ دور آئے گا کہ جس میں اس کا نتیجہ بڑا دردانگیز تباہیوں کا عذاب ہوگا۔ اس تباہی سے وہی لوگ بچ سکیں گے جو **اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (84:25) خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھ کر عالمگیر انسانیت اور خود اپنی ذات کو سنوارنے والے کام کریں گے۔ یہاں یہ کچھ "یوعون" کے مقابل میں آیا ہے۔ یعنی جو ان اصولوں کی صداقتوں پر یقین رکھیں گے اور ایسے کام کریں گے جن سے ان کی اپنی صلاحیتیں بھی نشو ونما پائیں اور باقی انسانوں کی صلاحیتیں بھی نشو ونما پائیں تو اس کے لیے تھیلی کی گرہ کھولنی پڑے گی۔ انفاق کے یہی تو معنی ہوتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! ہم نے "انفاق" کے معنی خرچ کرنا کر دیا ہے۔ وہ عرب "نفق" اُس قسم کی میانی کو کہتے ہیں جس کے دونوں سرے کھلے ہوئے ہوں۔ سَرَبٌ وہ ہوتی ہے جس کا روپیہ ڈالنے کا، ایک سرا کھلا ہوتا ہے، نکلنے کا راستہ بند ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ عملِ صالح وہ ہیں جن کی میانیاں اس قسم کی ہیں کہ جن کے دونوں سرے (Ends) منہ کھلے ہوتے ہیں: ڈالنے والا بھی اور نکالنے والا بھی۔ یہ اعمالِ صالحہ والے ہیں۔ ان کے لیے کہا کہ **لَهُمْ اَجْرٌ** (84:25) اُن کے لیے، زندگی کی یہ جتنی بھی خوشگواریاں سرفرازیاں ہم نے کہی ہیں، یہ ان کے لیے ہیں۔ یہاں پھر ذہن میں وہ بات آئی کہ کیا یہ سب خوشگواریاں اور سرفرازیاں خدا کی بخشش ہوگی؟ بھیک مانگنے والی قوم نے "ایتھے وی منگ کے کھانا، تے اوتھے وی منگ کے کھانا۔ منگ کے کھان دی جنوں عادت پے جائے، تے او کدی نئیں کما کے کھا سکدا، او جنت وی منگویں لیندا پیا۔" [2] احسان لینا اس کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! میں جو کہا کرتا ہوں کہ جب اس قسم کے خدا کا تصور سامنے آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں

---

[1] اے رسول! انہیں متنبہ کر دے کہ اس روش زندگی کا نتیجہ بڑا الم انگیز ہوتا ہے۔ (9:34-35) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یہاں بھی بھیک مانگ کر کھانا ہے اور وہاں بھی بھیک مانگ کر۔ جسے بھیک مانگ کر کھانے کی عادت پڑ جائے وہ کبھی بھی کما کر نہیں کھا سکتا۔ وہ تو جنت بھی بھیک مانگ کر لیتا ہے۔

جنت بطورِ بخشیش نہیں ملتی بلکہ انسانی اعمال کی اجرت ہوتی ہے

یہاں کہا کہ یہ سب کچھ انہیں ملے گا: اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (84:25) اس کا ان پر کچھ احسان نہیں ہوگا۔ احسان کا ہے کا؟ یہ تو اجر ہے' یہ تو Wages (اجرت) ہے' یہ تو مزدوری ہے۔ احسان نہیں ہوگا اور آج کے معاشرے میں' عزیزانِ من! آپ نے دیکھا ہوگا کہ خون پسینہ ایک کر کے مزدوری کرنے والا' شام کو اس طرح سے آ کر اپنی مزدوری مانگتا ہے جیسے بھیک مانگنے والا فقیر۔ وہ مزدور دوڑتا ہوا میاں صاحب کے سامنے نہیں جاتا۔ بچے بھوک سے مر رہے ہیں' شام ہوگئی ہے' گھر میں دیا نہیں ہے' دن بھر محنت کی ہے' آ کے اس نے اپنی محنت کا معاوضہ لینا ہے۔ وہ اس طرح سے آ کے کھڑا ہے جس طرح وہ بھیک مانگنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ اول تو اندر سے آواز آ جاتی ہے کہ فرصت نہیں ہے۔ گویا جب آپ کو فرصت ملے تب اُسے بھوک لگنی چاہیے۔ پھر اس کے بعد وہ بیچارہ اپنی مزدوری لینے کے لیے ترلے منّتیں ڈالتا ہے تو پھر اس کی طرف یوں پھینکا جاتا ہے جیسے خیرات کا ٹکڑا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی جنت ایسے نہیں ملتی۔ [1] نہ تو وہ مفت میں خیرات کی طرح ملتی ہے' نہ ہی جب ملتی ہے تو اس کا احسان دھرا جاتا ہے۔ یہ تو لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (84:25) ہے۔ اس کے دو ہی معنی ہوتے ہیں۔ اس کے ایک معنی غیر منقطع ہونے کے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ یہ کرتے رہیں گے یہ ہوتا رہے گا اور جس معاوضے کو' اجر کو' دینے سے ان پہ پھر کوئی احسان نہیں کیا جائے گا' وہ تو اپنی مزدوری کا معاوضہ لیں گے۔ یہ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں۔ اس طرح کہہ دیا کہ خدا کے قوانین پر یقین رکھ کر' عالمگیر انسانیت اور خود اپنی ذات کو سنوارنے والے کام کرنے والوں کے لیے ایسی آسائشیں اور راحتیں ہوں گی جن کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا' مگر یہ کچھ انہیں بطور ''احسان'' یا خیرات نہیں ملے گا بلکہ وہ اسے بطور اپنے حق کے (As of Their Right) حاصل کریں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ انشقاق تو اب ختم ہوئی۔ اگلے درس میں سورۃ البروج لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

[1] جنت تیری پنہاں ہے تیرے ہی خونِ جگر میں۔ اقبال

بائیسواں باب: سورة البروج (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ البروج سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 85 ویں سورۃ ہے۔

کائنات کی ہر شے قانون کے دائرے میں ہے

یہ حقیقت اب آپ کے سامنے واضح طور پر آ چکی ہے کہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اس سلسلہ کائنات میں' اور خود انسانوں کی اپنی دنیا میں' ہر شے ایک قاعدے اور قانون کے مطابق طے ہوتی ہے۔ اس پوری کائنات میں Law & order (قانون وضابطہ) کی کارفرمائی ہے۔ نہ تو یہاں کوئی شے یونہی الل ٹپ By chance (اتفاقیہ) واقع ہو جاتی ہے اور نہ ہی یہاں خدا کا تصور اس قسم کا ہے کہ جیسے ہمارے ہاں کے یہ آمر مطلق (Dictators) ہوتے ہیں جن کے احکام اور اعمال کسی اصول اور ضابطے کے مطابق نہیں ہوتے۔ یہاں باہر کی دنیا کے اندر جب قانون کی کارفرمائی ہے تو انسانوں کی دنیا کے اندر بھی قانون ہی کی کارفرمائی ہونی چاہیے۔ انسان اپنے نظام کے اندر قانون کی کارفرمائی کو بروئے کار لائے یا نہ لائے لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ ہے اصل و بنیاد قرآن کریم کی تعلیم کی' اور یہی ہے وہ محور جس کے گرد' خواہ اقوام سابقہ کی ساری داستانیں ہوں یا خارجی

کائنات کے شواہد ہوں' انسان کی دنیا کے اخلاقی ضوابط ہوں یا سیاسی معاشی یا معاشرتی نظام ہوں' یہ سب کے سب گردش کرتے ہیں۔ وہ جس چیز کو بھی بیان کرتا ہے اس کا نقطہء ماسکہ یہی ہوتا ہے کہ یہاں ہر شے قانون اور ضابطے کے دائرے میں چلتی ہے' اس کے باہر نہیں جاتی۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے وہ ہمیشہ نظامِ کائنات کو سامنے لاتا ہے کہ نظام کائنات میں قانون کی کارفرمائی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے لیکن آپ غور کریں تو یہ حقیقت آسانی سے' ہمارے اس دور میں' جسے ہم Scientific (سائنسی) دور کہتے ہیں' سمجھ میں آتی ہے اور یہ تو بڑی Recent یعنی حال ہی کی چیز ہے خود یورپ میں بھی یہ کوئی سترھویں صدی کی شے ہے لیکن قرآن تو چھٹی صدی عیسوی کی باتیں کررہا ہے۔ یہ باتیں اس دور میں کہی گئی تھیں تو آپ غور کیجیے کہ کس زمانے میں قرآن نے یہ چیزیں کہیں اور دنیا کس طرح اپنی علمی ترقیوں کے ساتھ' انسان اپنے تجربات کے ساتھ' Trial & errors (سعی وخطا) کے ذریعے ہی سہی' اس طرح رفتہ رفتہ بتدریج اس حقیقت تک آتا چلا گیا' اور آتا چلا جارہا ہے کہ یہاں قانون کی کارفرمائی ہے' یہاں کوئی شے بھی یونہی ہنگامی طور پر وجود میں نہیں آجاتی۔ خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی کے لیے عربوں جیسی قوم کو سمجھانے کے لیے قرآن ہمیشہ ستاروں کو سامنے لایا کرتا ہے۔ ان سے دلیل دیا کرتا ہے کہ یوں بات ان کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی تھی۔

صحرانوردوں کے لیے ستاروں کی رہنمائی

جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ عرب صحرانورد قوم تھی' شہروں اور بستیوں میں بہت کم آبادی تھی' جنگلوں اور ریگستانوں میں وہ چلتے رہتے تھے' ہر صبح سفر' ہر شام سفر' بلکہ صبح کو تو ان کا بہت کم سفر ہوتا تھا کہ سورج کی گرمی اور تمازت میں ریگستان انہیں اجازت ہی نہیں دیتا تھا کہ دن کے وقت سفر کریں۔ راتوں کو سفر کرنا ان کا معمول تھا مگر راتوں کا سفر بھی کوئی جی ٹی روڈ [1] کے اوپر نہیں ہے کہ یہاں سے وہاں تک ایک پکی سڑک لگی بندھی چلی جارہی ہے۔ ریگستانوں میں سفر تھا جہاں کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی سڑک نہیں' کوئی شاہراہ نہیں' کوئی پگڈنڈی نہیں' راستے کے نشانات بھی نہیں ہوتے تھے۔ نشانات کی یہ کیفیت تھی کہ اگر صبح کے وقت کہیں ریت کا ٹیلہ ہے تو دوپہر کے وقت وہاں دیکھیے تو چٹیل میدان ہوگا' وہ ٹیلہ وہاں سے کہیں اور پہنچ چکا ہوتا ہے۔ کوئی نشان راہ نہیں' کوئی راستہ متعین نہیں۔ رات کی تاریکیوں میں وہ سفر کرتے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھول جاتے۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ بھول جاتے ہوں۔ انہی سے پوچھا جاتا تھا کہ یہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم اسطرح اپنے سفر میں متعین راستوں پہ چلے جاتے ہوں۔ ان کے لیے ایک ہی ہادی' طریقت' ایک ہی رہنما ہوتا تھا اور وہ رہنمائی ہوتی تھی ستاروں کی۔ وہ لوگ ان ستاروں سے اپنے راستوں کو متعین کرتے تھے اور اسی لیے ستاروں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ آپ سوچو تو سہی کہ اگر اس کائنات میں یونہی جو کچھ ہو رہا ہے' ہنگامی طور پر

---

[1] Grand Trunk Road

ہی ہوتا ہو' قاعدے اور قانون کے تابع نہ ہوتا ہو' تو یہ ستارے تمہیں ہمیشہ صحیح راہنمائی کس طرح دے سکتے ہیں؟ کیا تم اسی سے نہیں سمجھتے کہ یہاں کار فرمائی قانون کی ہے؟ یہ ایسی محکم دلیل تھی جو ان کی سمجھ میں بڑی آسانی سے آجاتی تھی۔ آج ہمارے ہاں علم اخلاق کے بلند ترین ماہرین کی سمجھ میں بھی بات آجاتی ہے جب ان سے یہ کہا جائے کہ ان ستاروں اور سیاروں کی دنیا پہ غور کرو کہ یہ کس طرح عظیم الشان قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہی دلیل ہے جو تیرہ سو سال پہلے کے بادیہ نشین عرب کو بھی مطمئن کر دیتی ہے اور آج کے Sir Jeams کو بھی مطمئن کر سکتی ہے۔ تو یہ ہے قرآن کریم کا وہ انداز بیان' وہ دلائل وشواہد لانے کا طریق' کہ جس سے وہ ایک اونٹ چرانے والے کو اور ایک آسمان پر اڑنے والے کو' ایک ہی دلیل سے مطمئن کر دیتا ہے اور اسی سے اس نے اس سورۃ کا آغاز کیا کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (85:1)۔ ''فضا کی بلندیاں۔'' یہ تو ہوا سماء۔ اور یہاں ''وَ'' ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ ''شاہد ہے'' السماء کے جو ذات البروج ہیں اس میں لفظ بروج ہے جو برج کی جمع ہے۔ اس آیت کا مفہوم ہوا کہ

''بلندیوں میں ظاہر ہونے والے ستاروں کے مواقع اور منازل اس حقیقت پر شاہد ہیں۔'' اس آیت میں یہ بلندیاں تو ہوا سماء۔ دوسرا لفظ ہے بروج جو کہ برج کی جمع ہے اور تیسرا ہے ذاتِ البروج۔ لفظ بروج قابل غور ہے۔

لفظِ برج کی حقیقت

آپ نے یہ سنا ہوگا کہ آسمان میں بارہ برج ہوتے ہیں۔ اب تو وہ جنتریاں ہمارے ہاں بہت کم ہوگئی ہیں' اس سے پہلے وہ عام ہوا کرتی تھیں' شاید اب بھی زیادہ ہوں' عوام میں چلتی ہوں۔ ان میں آسمانوں کے برج دیئے ہوتے تھے اور وہ ہوتا تھا کہ سورج اب فلاں برج میں داخل ہوگیا۔ مثلاً برج زحل میں یا برج عطارد میں۔ اس سے پھر عجیب قسم کی فالیں لیتے تھے۔ قدیم علم الافلاک میں بارہ برج گنے جاتے تھے لیکن عرب ان سے واقف نہیں تھے۔ یہ تو قوم ہی عجیب تھی۔ تہذیب وتمدن کی کوئی کرن یہاں آئی ہی نہیں تھی۔ یہ بالکل فطرت کے خطوط پر زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اس لیے یہاں یہ جو بروج کہا ہے تو یہ وہ بارہ برج نہیں ہو سکتے جو یونانیوں کے ہاں علم الافلاک میں تھے۔ یہاں تو بروج و برج کی یہ بات بڑے سادہ معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

ضمنی طور پہ یہاں عربی زبان اور عربوں کے ہاں اس زبان میں انہوں نے جو کمال حاصل کیا تھا وہ بات پھر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عرب ہزار ہا سال تک ایک ہی کام میں لگے رہے اور وہ تھا: اس عربی زبان کو اس طرح شائستہ' اس طرح آراستہ و پیراستہ' عمیق اور بلند بناتے چلے جانا کہ یہ قرآن جیسے حقائق کی متحمل ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فطرت کا بڑا عظیم پروگرام تھا۔ کوئی اور زبان اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی' آج بھی نہیں ہو سکتی۔ آج بھی یہ کیفیت ہے کہ دنیا کی زبانیں بہت آگے پہنچ چکی ہیں لیکن مجھ سے نہیں' خود یورپ کے جو بڑے بڑے زبان دان ہیں' ان سے سنیے۔ (H.A.R Gibb) اپنی کتاب "The Modern Trends in Islam"

(اسلام میں جدید رجحانات) میں لکھتا ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بہت بڑی چیز تھی۔اس نے اپنے ہاں کے ترجمہ کرنے والوں سے یہ کہا ہے حالانکہ ان کی انگریزی زبان' پھر اس انگریزی زبان میں اتنے اتنے بڑے ماہرین تھے' عربی بھی جانتے تھے' انگریزی میں بھی اساتذہ تھے' راڈن جیسے' فیل جیسے' لوگوں کو اس نے جھٹک کے رکھ دیا ہے۔اس نے کہا ہے کہ یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ قرآن ہے کیا جو یہ ترجمہ کرنے کے لیے بیٹھ گئے ہیں۔کوئی دوسری زبان ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ زبان کے اعتبار سے کہتا ہے۔

میں برج کی بات کر رہا تھا۔آپ کو معلوم ہے کہ ایک تو اس زبان میں ہر لفظ ایک قاعدے کے مطابق ہوتا ہے اور وہ جو ہر لفظ کے اندر بنیادی معنی ہوتے ہیں اس کی جھلک اس سے بننے والے ہر لفظ میں پائی جاتی ہے۔یہ بات اتنی ہی نہیں ہے۔ان کے ہاں تو بات اس سے بھی آگے چلی گئی ہے مثلاً جس مادے کے اندر''ج ب'' اور ''ر'' کے حروف آ جائیں اس میں شدت اور قوت کے معنی ہونگے یعنی وہ''ب رج'' ہو یا''رب ج'' ہو یا''رج ب'' ہو یعنی یہ جو تین حرف ہیں یہ اگر کسی لفظ کے اندر آ جائیں تو اس میں شدت اور قوت کا مفہوم ہوگا اور اگر ان میں''ب'' اور ''ر'' اکٹھے آ جائیں تو اس میں اظہار کا مفہوم ہوگا' کسی چیز کی نمود کا مفہوم ہوگا۔اگر''ج ب'' اور''ر'' یہ تینوں اکٹھے آئیں تو اس لفظ میں شدت اور قوت اور اظہار کے معنی آئیں گے۔عربی زبان کا کوئی لفظ جس میں یہ چیزیں آ جائے گی تو اس میں یہ مفہوم پایا جائے گا۔

قرآن حکیم کا اعجاز

یہ تھی وہ زبان جس کے اندر قرآن نازل ہوا تھا۔ یہ تو ہو ہی اسی میں سکتا تھا۔ میں یہ بات بروج کے سلسلے میں کہہ رہا تھا۔ برج کے معنی شدت' قوت' ابھار' نمود' اظہار کے ہیں۔اس میں یہ ساری چیزیں پائی جاتی ہیں۔ان ستاروں کے لیے چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ یہ زیادہ سے زیادہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آتے تھے' اس سے زیادہ کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ کیا ہیں' ان کے متعلق یہ کہنا کہ ان میں ابھار پیدا ہوا' یہ ابھری ہوئی چیزیں ہیں' جن میں شدت ہے' قوت ہے' نمود ہے' ابھار ہے بڑی بات تھی۔Planet (اجسامِ فلکی) کا تصور ہی اس زمانے میں آ نہیں سکتا تھا۔قرآن نے پہلی دفعہ یہ تصور دیا ہے۔اپنے ہاں ان Planets (اجسامِ فلکی) کے متعلق یہ کہنا بہت ہی انوکھی اور نئی بات تھی کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ ابھری ہوئی کچھ چیزیں ہیں' دوسری چیز یہ ہے کہ یہ فضا کی پہنائیوں کے اندر تیر رہے ہیں' تیسری چیز یہ ہے کہ یہ اپنے اپنے دائروں کے اندر گردش کر رہے ہیں' چوتھی چیز یہ ہے کہ ان کی یہ گردشیں دوہری ہیں یعنی یہ اپنے محور کے اوپر بھی گردش کرتے ہیں کہ پہلو بدل بدل کر تمہارے سامنے آتے ہیں اور اپنے مدار پر بھی جس سے لیل ونہار بھی پیدا ہوتے تھے۔چھٹی صدی عیسوی میں زمین کی باتیں تو ایک طرف رہیں آسمان کی باتیں کرنے والا' یقیناً اس ماحول کا انسان تو نہیں ہو سکتا اور یہی چیز ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ اس

علم کا سرچشمہ انسانی علم، انسانی ماحول اور اس کے تاثرات نہیں تھے۔ یہاں کہا ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (85:2) یہ بلندیاں جن کے اندر یہ ابھرے ہوئے ظاہر ہونے والے قوت اور شدت کے حامل اتنے اتنے بڑے یہ سیارگان تیرتے پھر رہے ہیں یہ ایک حقیقت پر شاہد ہیں۔ وہاں کی دلیل لائی جارہی ہے۔ وہ حقیقت کون سی ہے جس کے اوپر یہ شاہد ہیں؟ لیکن ٹھہریئے ایک شہادت اور بھی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (85:2) اور وہ انقلاب جو انسانی دنیا کے اندر جس کے متعلق وعدہ کیا جارہا ہے کہ انسانی دنیا کے اندر وہ انقلاب آ کر رہے گا اس کی شہادت دے رہا ہے۔ اب دونوں میں Common Factor (قدر مشترک) کیا ہے؟ آسمان کی فضاؤں کے اندر ان ستاروں میں اور انسانوں کی دنیا کے اندر آنے والے اس انقلاب میں قدر مشترک ''قانون'' ہے۔ وہ ستارے بھی ایک لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہیں اور انسانی زندگی کے اندر بھی ایک قانون کی کارفرمائی ہے اور قانون وہی ہے کہ جب کبھی کوئی قوم یوں کرے گی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اسی کو قانون کہتے ہیں۔ یہی قرآن کے ہاں ''یوم موعود'' ہے کہ انسانی زندگی کے اندر آنے والا انقلاب ہے۔ اس انقلاب کی شہادت کے متعلق کہا کہ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (85:3) تمہارے سامنے یہ رسول ﷺ ہے جو خود اس انقلاب کی شہادت دے رہا ہے اور یہ تمام چیزیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ o النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (85:4-5) یہ لوگ جو اس نظام کی اس قدر مخالفت کرتے ہیں کہ اسے مٹانے کے لیے جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ اپنی تدبیروں کی خندقیں کھودتے ہیں اور ان میں فتنوں کی آگ بھڑکاتے ہیں اور اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (85:6) اپنے اس پروگرام پر جم کر بیٹھے ہیں۔

ہمارے ہاں کے مروجہ تراجم اور تفاسیر کا بیان

ان (85:4-5) آیات کا جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے اس کے بعد ہمارے ہاں جو عام تفسیریں آئیں وہ یہ کہتی ہیں کہ یہ جو خندقوں والے ہیں وہ اس میں آگ جلاتے تھے وہ ہلاک ہو گئے۔ پھر اس کے متعلق ہماری تفاسیر میں مختلف چیزیں آئیں۔ کہیں یہ کہا گیا کہ یمن میں یہودیوں کا ایک بادشاہ ذونواس تھا۔ اس نے عیسائیوں کو قتل کیا پھر ان کو خندقوں میں جلا دیا۔ یہ ان کا واقعہ ہے جس نے یہودیوں کو اس طرح جلایا تھا۔ بہرحال یہ ان کے خیالات تھے جو ان مروجہ تراجم و تفاسیر میں آئے ہیں۔

اصل حقائق

عزیزانِ من! آپ قرآن کی یہ ساری آیات آگے چل کر دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کی بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ تو ایک حقیقت ہے جو ہر دور میں سامنے آئے گی۔ بات ہو رہی ہے حق اور باطل کی کشمکش کی۔ بات ہو رہی ہے اس تصادم کی اس انقلاب عظیم کی جو نبی اکرمؐ اور ان کے رفقاء کی جماعت رضی اللہ تعالیٰ عنھم لا رہے تھے۔ اس کی مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ مفاد پرستوں کی

طرف سے ٹکراؤ ہے یہ تصادم ہے اور اس تصادم نے آخر میں جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے اور جنگ کی مہیب ترین شکل یہ ہے کہ خندقیں کھودی جائیں' اس میں آگ جلائی جائے۔ اس زمانے میں حفاظت کے لیے جو بہترین چیز ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ خندقیں کھودی جائیں' اُن کے اندر آگ جلا دی جائے' ان سے اپنی حفاظت کا سامان پیدا کر دیا جائے۔ یہ جنگ کی مہیب ترین شکل تھی۔ کہا گیا کہ یہ لوگ جو اس طرح سوچ رہے ہیں کہ اب اس آنے والے انقلاب کو' ان داعیانِ حق کو' اس طرح جنگ کے میدان میں جا کر' ان کا مقابلہ کرکے' انہیں ختم کر دیا جائے۔ کہا کہ اس نظام کائنات کا قانون یہ ہے کہ یہاں کوئی تخریبی قوت' کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی' ہمیشہ تعمیری قوتیں کامیاب ہونگی۔ حق کہتے ہی تعمیری قوت کو ہیں۔ باطل کہتے ہیں تخریبی قوت کو۔ کہا کہ یہاں جو تصادم ہو رہا ہے' اس تصادم میں بھی یہ قانون کارفرما ہے کہ تعمیری قوتیں (Constructive Forces) ہمیشہ Destructive Forces (تخریبی قوتوں) کے اوپر غالب آ کر رہیں گی لہٰذا یہ لوگ جو ذاتی مفاد پرستیوں کے اپنے نظام سرمایہ داری کی حفاظت میں اٹھ کھڑے ہونگے' وہ خدا کے نظامِ ربوبیت کو جو پوری نوع انسانی کی نشو و نما کی ذمہ داری لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے یہ اسے کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ اتنی بڑی جنگی تیاریاں کیوں نہ کر لیں' خندقیں کیوں نہ کھود لیں' ان کے اندر آگ کیوں نہ بھڑکا دیں لیکن آخر کار یہی تباہ ہونگے۔ داعیانِ حق کا یہ نظام تباہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ❶ (85:6) کرتے ہیں اور پھر اس پر بیٹھ کر اپنی تدبیروں کو دیکھتے رہتے ہیں کہ کس طرح یہ کارفرما ہوتی ہیں' یہ کس طرح سے کامیاب ہوتی ہیں۔ یہ خود کرتے ہیں۔ وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ❷ (85:7)۔ میں نے کہا تھا کہ اگلی ہی آیت میں بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ کس کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہا کہ "یہ جو کچھ خود کرتے ہیں اور جو دوسرے لوگ اسکے خلاف کچھ کرتے ہیں تو اس کو بھی تماش بین کی حیثیت سے یہ بیٹھے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں' دل میں خوش ہوتے ہیں کہ ان کی وہی مخالفت ہو رہی ہے۔ اب دیکھیے ان کے اوپر تباہی آئی' اب یہ ہلاک ہوئے۔" کہا کہ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ❸ (85:8) یہ ان سے کس بات کا انتقام لے رہے ہیں؟ کہ اتنی بڑی جنگی تیاریاں کرتے ہیں' ان کی تباہیوں کے اوپر اتنی خوشیاں مناتے ہیں۔ کہا کہ ان سے یہ انتقام کس بات کا لیا جا رہا ہے؟ صرف اس بات کا کہ یہ خدا پر کیوں ایمان رکھتے ہیں؟ یہ ہے وہ بہت بڑا جرم جس کی بنا پر یہ ساری تباہیاں اور بربادیاں ان کے لیے لائی جا رہی ہیں۔ اس کی تمنائیں کی جا رہی ہیں کہ یہ خدا پر ایمان نہ رکھیں۔

---

❶ اپنے اس پروگرام پر جم کر بیٹھے رہتے ہیں۔

❷ اور جو کچھ دوسرے لوگ جماعت مومنین کے خلاف کرتے ہیں' یہ اسے بھی تماشا سمجھ کر دیکھتے رہتے ہیں۔

❸ یہ لوگ جماعت مومنین سے محض اس بات کا انتقام لینا چاہتے ہیں کہ وہ خدائے حمید و عزیز پر کیوں ایمان لے آئے ہیں۔ (5:59; 22:40)۔
(1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

خدا کی دو صفات میں پورا نظامِ حیات ہے

قرآنِ کریم نے بات تو اتنی ہی کہی تھی کہ خدا پر ایمان کیوں رکھتے ہیں؟ لیکن یہ تو قرآن ہے۔ یہاں خدا کی دو صفات بیان کیں اور ان میں جو پورا نظام تھا، جس کے لیے یہ لوگ لڑ رہے تھے، بیان کر دیا۔ وہ صفات ہیں: عزیز اور حمید۔ عزیز یعنی غلبے اور قوت کا مالک۔ غلبے اور قوت کا مالک تو ہلاکو اور چنگیز [1] بھی ہوتا ہے۔ وہ تو دنیا کا ہر مستبد، ہر بادشاہ بھی ہو سکتا ہے لیکن خدا صرف عزیز نہیں ہے، وہ عزیز کے ساتھ ساتھ حمید بھی ہے۔ اس کے ساتھ غلبہ اور قوت اس لیے ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مستبد قوتیں ہوں وہ ان پر غالب آ جائے تا کہ ساری دنیا کی زبان سے اس کی حمد و ثنا کے زمزمے بلند ہونے لگیں۔

دنیا میں مستبد، صاحبِ قوت کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں پڑھتا لیکن ایک قوت ایسی بھی ہوتی ہے کہ جب اس کا اظہار ہوتا ہے تو اس کے بعد دنیا کا ہر مظلوم اور مقہور اس کے حق میں دعائیں دے رہا ہوتا ہے۔ وہ ہے خدا کا غلبہ یعنی حمید کا غلبہ ہے۔ اس سے نظر آیا کہ وہ مظلوم کو ستانے کے لیے نہیں ہے، ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے ہے، تا کہ ہر مظلوم کی زبان سے اس کے لیے تحسین و آفرین کے کلمات بلند ہوں اور جب بھی خدا کا نظام دنیا کے اندر قائم ہو گا اس کی خصوصیت یہ ہو گی کہ وہ ان غلبوں کا مالک ہو گا کہ جن غلبوں کے نتائج میں مظلوم انسانوں کی دعائیں ان کی زبانوں سے نکلیں۔ اسے عزیز اور حمید ہونا چاہیے۔

آپ نے دیکھا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ خدا کی جو صفات آئیں اُن آیات سے یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہاں خاص طور پر یہی صفات کیوں بیان ہوئی ہیں۔ صفات تو اس ذات کی بہت سی ہیں۔ یہ اسماء الحسنٰی ہیں لیکن موضوع اور عنوان کے اعتبار سے وہاں جو خاص صفات آئیں گی جن کا وہاں ذکر کیا جانا مقصود ہوتا ہے وہ بڑی ہی قابلِ غور ہوتی ہیں۔ یہاں العزیز الحمید آئی ہیں کیونکہ کائنات میں اسی کے قانون کی کارفرمائی ہے اس لیے کہا کہ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ [2] (85:9)۔ کبریائی، اقتدار Sovereignty یہی ہے جو اقتدارِ اعلیٰ کہلاتا ہے، اسی کا نام قانون کی کارفرمائی ہے کہ جس سے بلند کوئی اور قانون نہ ہو۔ کائنات میں اسی کا قانون کارفرما ہے۔ اب آپ نے یہ دیکھا کہ جو بات ذَاتِ الْبُرُوْجِ (85:1) سے شروع ہوئی تھی، اس کے متعلق کہا کہ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (85:9)۔ وہ ہر شے کو اپنی نگاہ میں رکھنے والا ہے۔ کوئی شے اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور ساری کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کارفرمائی اور اقتدارِ اعلیٰ اسی کے قانون کا ہے۔ وہ خدا جس کی

---

[1] ہلاکو اور چنگیز کے لیے ملاحظہ کیجیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص۔ 310 (فٹ نوٹ نمبر 2)

[2] اس خدا پر ایمان کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب اقتدار اور اختیار اُسی کا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کارفرمائی کا یہ عالم ہے' کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ جو حق کے اس نظام کی مخالفت پر اس طرح کمر بستہ ہیں بالآخر ہلاک ہو کر رہیں گے۔اس لیے ان سے کہہ دو کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ** ❶ (85:10)۔

غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے فطری نتیجہ کا نام عذاب ہے

عزیزانِ من! دیکھیے یہاں بات صاف ہوگئی۔ یہ لوگ جو مومن مردوں اور عورتوں کو اذیت پہنچاتے ہیں اور جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو پھر اس پر بھی اپنی روش سے باز نہیں آتے' انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی یہ بے محابہ قوتیں انہیں تباہی سے بچا نہیں سکتیں' اس کے بعد تباہی اور بربادی آئے گی اور وہ اس قسم کی تباہی اور بربادی ہوگی کہ ان کے سارے ساز و سامان حیات کو جلا کر جھلسا کر' راکھ بنا کر' رکھ دے گی۔

عذاب کے لفظ سے ہمارا ذہن پھر مذہب کے تصور کی طرف چلا جاتا ہے کہ یہ کوئی Abstract (غیر محسوس) سی چیز ہے' مبہم سی چیز ہے اور کس طرح سے یہ آتی ہے۔کہا کہ یہ چیز نہیں ہے۔ جسے آپ تباہی اور بربادی کہتے ہیں اسے غلط نظام کے نقصان رساں' تباہ کن نتائج' کہتے ہیں۔عذاب کا یہ لفظ اسی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ان کی اس روش کا فطری نتیجہ ان کے حق میں تباہی اور بربادی ہوتا ہے اور یہاں کہا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ یہ تو ایک Negative پہلو ہے یعنی یہ تو منفی پہلو ہے کہ ان کے ساتھ یہ کچھ ہوگا۔دوسری طرف یہ جماعت ہے جو تعمیری کام کر رہی ہے۔

یاد رکھیے! ایک تباہی وہ ہے جو فطرت کے قانون کے مطابق ان پر آتی ہے۔اگر مقابلے میں دوسری قوم ایسی نہیں ہے جو تعمیری قوتوں کی حامل ہے اور تعمیری نظام قائم کرنا چاہتی ہے تو ان کی تباہی سے انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن اگر ان کے مقابلے میں ایسی قوم ہے جو مثبت اور تعمیری نظام کے لیے اٹھ کر کھڑی ہوئی ہے تو ان کی تباہی ان کی کامرانی کا باعث بن جاتی ہے اسی لیے جہاں یہ کہا کہ ان کے لیے یہ تباہی اور بربادی ہوگی' اس کے مقابلے میں جو لوگ ہیں ان کے لیے کہا کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ** (85:11) یہ لوگ جو ان صداقتوں کی حقیقت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر ایسے کام کرتے ہیں جس سے اپنی ذات بھی سنور جائے اور یہ حسن کائنات بھی نکھرتا سنورتا چلا جائے' ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ انہیں اس دنیا کے اندر بھی اس قسم کا

---

❶ جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو اس طرح ایذا دیتے ہیں اور اپنی اس روش سے باز نہیں آتے' ان کے لیے سوزناک عذاب ہوگا۔یعنی وہ عذاب جو ان کا سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

معاشرہ ملے گا کہ جس کی شادابیوں اور شگفتگیوں پر کبھی خزاں نہیں آئے گی اور یہ چیز ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ [1] (85:11) ہے۔

نجات کا تصور اور الفوز الکبیر کا مفہوم

آپ کو یہ معلوم ہے' میں نے دو ہی دروس پہلے عرض کیا تھا کہ دنیا کے مذاہب میں منتہائے مقصود Salvation (نجات) ہوتا ہے اور اس کے اندر کوئی Achievement (تکمیل) نہیں ہوتی۔ انسان کی نجات یا Salvation کے معنی یہ ہیں کہ جس مصیبت میں انسان پھنسا ہوا تھا اس مصیبت سے اسے رہائی مل جائے۔ نجات کے تصور میں یہ چیز Pre-requisite (پیشگی شرط) ہے یعنی پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان جو اس دنیا کے اندر بھیجا گیا ہے ایک مصیبت میں مبتلا ہے۔ پہلے اسے اس جیل خانے کے اندر پھینک دیا گیا۔ اب اس کے بعد اس کی ساری کدوکاوش یہ ہے کہ کسی طرح سے اس مصیبت سے وہ نجات حاصل کرلے۔ قرآن کا تصور یہ نہیں ہے۔ قرآن تعمیری چیزیں دیکھتا ہے۔ وہ اسے انسان کی Positive Achievement (مثبت حصول) کہتا ہے۔ انسان نے کچھ حاصل کرنا ہے' کچھ بننا ہے' آگے بڑھنا ہے اسی لیے قرآن کریم ایمان اور اعمال صالحہ کا جو حاصل کل (Sum-Total) بیان کرتا ہے اسے Achievement (حصول) سے تعبیر کرتا ہے کہ ایک تعمیری سامانِ حیات حاصل ہوتا ہے۔ اس سے وہ نجات نہیں پاتا' کسی عذاب سے چھٹکارا نہیں پاتا' اسے آگے بڑھنے کے لیے سامان حیات مل جاتا ہے اور فوز بھی وہ ہے جو فوز کبیر ہے جو اس کے اندر کبریائی کی صفت خداوندی حد بشریت کے اندر پیدا کرتی چلی جائے اور پھر کبیر عربی زبان میں جس وزن کے اوپر ہے وہ یہ ہے کہ ہنگامی طور پہ ایسا نہ ہو' بلکہ یہ چیز ہوتی چلی جائے' متواتر ہوتی چلی جائے' التزاماً ایسی ہوتی چلی جائے۔ یاد رکھیے! مذہب کی دنیا کے اندر تکبر تو شیطان کا کام ہے' کسی کے لیے کبریائی' بڑائی کی یہ چیز تو بہت بری اور معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن دین کی دنیا میں یہ چیز نہیں ہے۔ وہاں پستی اور ذلت بڑی معیوب سمجھی جاتی ہے' رفعت اور بلندی اور کبریائی اور بڑائی تو شرفِ انسانیت ہے۔ خدا کی خود ایک صفت المتکبر ہے۔ وہ انسان کے اندر اس صفت کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ذلت اور پستی انسان کی ذات کے منافی ہے۔ اس میں شرفِ انسانیت' رفعت اور کبریائی آنی چاہیے' اس میں قوت اور بلندی آنی چاہیے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ اس کا نتیجہ فوز کبیر ہے' ایک ایسی Achievement ہے جس میں بڑا ہونے کی یہ صفت پائی جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ الاکبر تو خدا کی ذات ہی ہے لیکن بشریت کی حد کے اندر تو بلندیوں کی انتہا پر انسان بھی پہنچ سکتا ہے اور پھر یہی صفاتِ خداوندی انسانوں کے اندر بھی جھلکتی ہیں۔ پستیاں اور ذلتیں مومن کا شرف نہیں ہیں۔ مومن وہی ہے جس کی ذات کے اندر کبریائی اور رفعت اور بلندیاں اور عظمتیں جھلک رہی ہوں۔ یہ ہے مومن کی صفت' یہ ہے اس کی کبریائی۔ پھر کہہ دوں کہ یہ کمزوروں اور مظلوموں کو دبانے کے لیے نہیں ہوگی' مستبد اور ظالم کے ظلم کو روکنے کے لیے ہوگی۔ اسی لیے اس کی کبریائی محمود ہے' شیطنت کا تکبر واقعی مذموم ہے۔

---

[1] یہ بہت بڑی کامیابی وکامرانی (Achievement) ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تکبر یا بڑا ہونا بجائے خویش مذموم چیز نہیں' اس کبریائی کا استعمال ہے جس سے یہ چیز متعین ہوگی کہ یہ مذموم ہے یا محمود ہے۔ اگر کسی کی بڑائی' جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے' مظلوم اور ناتواں کو دبانے کے لیے ہوگی' تو وہ واقعی شیطنت ہے' اگر وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے ہوگی تو یہ بڑی محمود ہے۔ یہیں سے دنیا کے اندر یہ بات بتائی کہ انکو بھی یہ بڑائی حاصل ہوگی۔ ان کے مقابلے میں یہ لوگ جو مخالفت کے لیے ابھرے ہیں' ان سے یہ کہہ دینا چاہیے۔ عظیم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ان مخالفین سے کہہ دو کہ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ (85:12) تمہارے خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ وہی خدا جو رحیم اور رحمٰن اور رحمٰن اور رءوف ہے' وہی جو الغفور اور الودود ہے' یہ لفظ ابھی آتا ہے' وہی خدا ہے جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ ❶ (85:12)۔ صفات One sided (یک طرفہ)' ایک ہی طرف کو نکل جانے والی ہونی ہی نہیں چاہئیں۔

الحاد کیا ہے؟

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے خاص طور پہ کہا ہے کہ جو لوگ کسی بھی صفت خداوندی میں ایک طرف نکل جاتے ہیں' جسے **الحاد** (41:40) کہا جاتا ہے' ان سے کنارہ کش ہو جاؤ' انہیں چھوڑ دو۔ یعنی یہ چیز Extreme (انتہا) کی طرف نکل جانا ہے خواہ وہ صفت خداوندی ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن اس کو بھی مذموم قرار دیتا ہے۔ وہ تو اعتدال پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کے ہاں صرف Mercy, Mercy (رحم' رحم اور صرف رحم) رہ جائے تو عدل کا تصور ختم ہو جائے گا۔ خود عیسائیت کے مورخ یہ کہہ رہے ہیں کہ گزشتہ دو ہزار سال میں دنیا میں جس قدر ظلم اور استبداد کو بدلگام کیا ہے' وہ عیسائیت کے رحم کے تصور نے بدلگام کیا ہے۔ اُدھر' اگر دوسری طرف' جلی ہوئی انگلی پر مرہم نہ رکھی جائے تو یہ بھی کچھ زیادتی ہوگی۔ یہ ہے یہودیت کا تصور' یہ ہے ہندوؤں کا تصور کہ ان کے ہاں عدل ہی عدل ہے' جلی ہوئی انگلی پر مرہم رکھنے کا مداوا نہیں ہے' اس لیے توبہ نہیں ہے' اس میں واپس لوٹنا نہیں ہے۔ اِن کے برعکس قرآن کا تصور یہ ہے کہ اگر غلط قدم اٹھ جاتا ہے' اس سے نقصان ہوتا ہے تو اس سے انسان واپس آ سکتا ہے' اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ تلافی کا امکان ہے' یہی وہ اُسے Opportunity (موقع) دینا ہے جسے خدا کی Mercy یا رحم کہا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ ❶ (85:12) تیرے رب کی گرفت بڑی سخت اور بڑی محکم ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو شے ہے اسے ہی نہیں لینا چاہیے کہ گرفت ہی گرفت ہو۔ گرفت اور گرفت میں بھی فرق ہے۔ یہاں اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ ❶ (85:12) کہا ہے۔ یہ تو بڑی قابل تعریف بھی ہے۔ عاد و ثمود کے مطابق دنیا کی جو جبارین قومیں تھیں' جو مستبد قومیں تھیں ان کے متعلق قرآن کریم میں دوسرے مقام' پہ سورۃ الشعرآء

---

❶ یعنی تیرے رب (نشوونما دینے والے) کے قانونِ مکافات کی بڑی سخت و محکم گرفت ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں یہ آیا ہے کہ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ٥ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ❶ (26:129-130)

بطش کا مفہوم

عزیزانِ من! یہی لفظ ہے 'بطش' جسے کہا گیا کہ جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو اس طرح سے پکڑتے ہو کہ ہڈیاں توڑ دیتے ہو یعنی یہ ان کے خلاف جرم قرار دیا گیا۔ ایک تو جابر مستبد کی بطش یا گرفت ہے جو وہ محض ظلم ڈھانے کے لیئے دوسرے کی گرفت کرتا ہے' ہڈیاں توڑتا ہے اور ایک بطش تمہارے خدا کی ہے جو مظلوم کی مدافعت کے لیئے ظالم کی کلائی مروڑتا ہے۔ یہ ہے فرق ان چیزوں کا۔ قوت بجائے خویش نہ محمود ہے نہ مذموم ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ قوت کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ❷ (85:12)۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کہاں سے بات شروع کرتا ہے اور کہاں لے جاتا ہے۔ کہا کہ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ❸ (85:13)۔ اس آیت میں دو لفظوں میں یہ سارا نظام تخلیق کائنات آ گیا۔ لفظی معنی تو وہی ہیں جو ابتدا کرتا ہے۔ یعید کے معنی دو لفظوں میں بیان نہیں کیے جاسکتے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ اس کے معنی کیا ہیں۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ کی وسعت

''یعید'' ابتدا کرنا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی عقل حیرت میں رہ جاتی ہے اور آگے نہیں بڑھ سکتی۔ سوال یہ ہے کہ یہ سلسلۂ کائنات کیسے عدم سے وجود میں آ گیا' Nothingness (عدم) سے یہ شے کیسے وجود میں آ گئی' جب کچھ نہیں تھا تو یہ کیسے بن گیا۔ یہ وہ نقطہ ہے جس میں انسانیت کی پوری تاریخ نے انسان کو ورطہء حیرت میں گم کر رکھا ہے۔ جس طرح پہلے دن کا انسان حیرت کے مقام پہ تھا' اسی طرح آج کا انسان بھی حیرت کے مقام پہ کھڑا ہے اور آخری انسان بھی حیرت ہی کے مقام پہ ہوگا کہ اس کائنات کی ابتدا کہاں سے ہوگئی' یہ سلسلہ کائنات کیسے وجود میں آ گیا۔ جو Literalists (ظاہر پرست) ہیں انہوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ صاحب! کسی نہ کسی طرح سے یہ سلسلہ کائنات وجود میں آ گیا۔ خدا پر ایمان لانے والوں نے یہ کہا کہ خدا اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ یہاں سے تو کچھ فرق ہوتا ہے لیکن آگے چلیے تو یہ فرق وہیں مٹ جاتا ہے' جب وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! پھر یہ خدا کہاں سے آ گیا۔ یہاں انہیں بھی کھڑا ہو جانا پڑتا ہے۔ یہ مقام عقل کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ عقلِ انسانی محدود ہے اور یہ شے لامحدود۔ اس لیئے یہ شئے یہ

---

❶ اور تم طرح طرح کے ساز وسامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو (اس لیے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو' بلکہ) اس لیے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ واقتدار اور جور واستبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے۔

❷ (ان مخالفین سے کہہ دو کہ تم مچلو نہیں) خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

❸ وہ ہر شے کو' اس کے نقطہ آغاز سے پیدا کرتا ہے اور پھر اسے' گردشیں دیتا ہوا' مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر' نقطہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ (3-2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

حقیقت، یہ نقطہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر یہ ازخود وجود میں آ گیا تو کیسے آ گیا۔ کیا کبھی ازخود بھی کوئی شے وجود میں آیا کرتی ہے؟ اس کا تو کوئی خالق ہوگا جو پیدا کرتا ہے اور یہاں جب ان کے مقابلے میں یہ دلیل دیں کہ ہم خالق تک پہنچے تو ان کی طرف سے یہ اعتراض آیا کہ جناب! خالق کیسے وجود میں آ گیا؟ اس کا جواب ہم بھی نہیں دے سکتے، عقل انسانی نہیں دے سکتی۔ یہاں تو کسی ایسے خالق کو ماننا ہی پڑتا ہے جس کا کوئی خالق نہ ہو۔ بات دوسری طرف نکل جائے گی ورنہ میں عرض کرتا کہ یہ جو دونوں نظریئے ہیں کہ مادہ ازخود وجود میں آ گیا یا یہ کہ خدا ازخود موجود تھا، میں کتنا بڑا فرق ہے اور اس فرق سے خود انسان کے اعمال پہ کتنا اثر پڑتا ہے۔ یہ موضوع دوسرا ہو جائے گا۔ اتنے سے وقت میں یہ بات بیان نہیں کر سکتا۔

عزیزانِ من! میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ **اِنَّهٗ هُوَ يُبۡدِئُ** ❶ (85:13) '**فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** ❷ (12:101) اور **بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** ❸ (6:101) آپ جسے Origin کہتے ہیں وہ اس سے ابتدا کرنے والا ہے۔ اب اِس ابتدا کرنے کے بعد اگلا نظریہ یہ تھا کہ کیا ہر شئے، جس طرح سے آج موجود ہے، کیا اسی طرح ابتدا سے وجود میں آ گئی تھی؟ انسان کا ذہن تو یہی مانتا چلا آ رہا تھا۔ کہا کہ ہمارے اس دَور میں آ کر یہ چیز سامنے آئی کہ نہیں، اشیاء کی ابتدا تو بہت ہی پست حالت سے، حقیر سی حالت میں، ابتدائی حالت میں، وجود میں آتی ہے۔ اس کے بعد اب یہ آپ کے ہاں کی Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) ہیں جنہوں نے اس تک پہنچایا کہ ہر شے کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ شے گردشیں کرتے ہوئے، مختلف مراحل اور منازل سے گزرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی، اس ہیئت تک پہنچتی ہے جس میں وہ آج ہمیں نظر آ رہی ہے۔ آپ کے اس نظریئے کی ابتدا 18 ویں صدی میں ہوئی جس میں کہا گیا کہ دنیا میں جو شے وجود میں آتی ہے، ابتداً اس کی ہیئت بالکل مختلف ہوتی ہے اور پھر وہ گردشیں کرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی، چلی آتی ہے تا آنکہ وہ کسی ایک مقام پہ، جسے اس کا نقطہ تکمیل کہیے، پہنچ جاتی ہے۔

آپ حیران ہونگے کہ عربی زبان کے اندر ایک لفظ عود ہے، جسے کہتے ہیں: ع و د ۔ عَـوَدَ کے عام معنی پلٹنا لوٹنا کیے جاتے ہیں مگر اس زبان کے اعتبار سے اس کے صرف اتنے ہی معنی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو گردشیں دینا اور گردشیں دیتے ہوئے اس کو معاد تک پہنچا دینا کہ جس کے بعد اس پہ مزید گردش نہ آئے۔ اسے اس کا مقامِ تکمیل کہیں گے، ہم ایک لفظ میں اس کی Destiny (آخری منزل) کہیں گے۔ میں تو صرف ان عربوں کی زبان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں ورنہ یہ جو لفظ تھا اس کے بنیادی معنی ہی بار بار آنا،

---

❶ وہ ہر شے کو اس کے نقطہ آغاز سے پیدا کرتا ہے۔

❷ وہ ارض وسماء کا پیدا کرنے والا ہے۔

❸ خدا وہ ہے جس نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو Originate کیا ہے۔ یعنی وہ اسے، بغیر کسی ذریعے اور واسطے کے، عدم سے وجود میں لایا ہے۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

لوٹ کر آنا تھا لیکن ان کے ہاں لوٹ کر آنا' بار بار آنا' گردشیں دینا' اور اس کے بعد یہیں سے وہ لفظ معاد ہے کہ جہاں تک پہنچنے کے بعد وہ اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ گیا اور پھر اس میں گردش پیدا نہ ہو۔ اب جو اتنی لامتناہیت ہے' اس کا تصور بھی ختم ہو گیا ورنہ یہ ایک اور مشکل ہو جاتی کہ جہاں آپ کی ابتدا معلوم نہیں تھی کہ یہ کہاں پیچھے کی طرف ازل سے ہوگی اور اس کے بعد اس کو ماننا پڑتا ہے کہ ابد تک اسی طرح سے رہے گی۔ قرآن کی رو سے یہ صفت صرف خدا کی ہے۔ جسے آپ ابتدا و انتہا کہتے ہیں وہ صرف اُس ذات کے لیے ہے۔ اس مخلوق شے کے لیے یہ چیز نہیں ہے' اسے Origin میں آنا ہے اور اس کے بعد اس کی انتہا بھی ہے۔ یہ زبان کا اعجاز ہے کہ ان کے ہاں ایک لفظ موجود ہے جس سے وہ گردشیں دیتے ہوئے' مراحل میں گزارتے ہوئے' چیز کو آگے لے جاتے ہیں اور اس کے بعد اپنے ہاں اس چیز کا ایک تصور دیتے ہیں پھر ایک مقام آجاتا ہے جہاں اس کے بعد گردش نہیں ہوتی وہ مقام اس کی منزل ہوتا ہے۔

لفظ یبدی کا مفہوم

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ❶ (85:13)۔ اس طرح ہر شے کو اس کے نقطہ آغاز سے پیدا کر کے گردش دینے میں' ان کے ہاں شفقت اور مہربانی کا' نرمی اور سہولت کا تصور بھی ہوتا ہے۔ یعید کا لفظ اسی کے لیے آیا ہے۔ مادہ وہی ''ع و د'' ہے۔ اس کے معنی بھی ہیں: بار بار آنے والی لیکن وہ بار بار آنے والی' جس میں شفقت اور سہولت کی چیز بھی ہو' ساتھ ساتھ اس میں گردشیں بھی ہوں۔ شفقت اور سہولت کے ساتھ اس طرح سے وہ اس شے کو تدریجی مراحل طے کراتا ہوا' معاد تک لے آتا ہے جو اس کا نقطہ تکمیل ہے اور یہی کسی شے کا نقطہ تکمیل ہے کہ جو اس کی تخلیق کہلاتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ❶ (85:13)

قرآن ایک نصاب کی کتاب ہے

میں کہا کرتا ہوں کہ کیا عرض کروں کہ قرآن کی یہ آخری آیات ہیں۔ یہ جماعتوں کے نصاب ہونے چاہئیں۔ برادران عزیز! ان دو ہی الفاظ' یبدی و یعید' میں کس طرح چند منٹوں کے اندر اس کا فرق اور وضاحت کر کے بتا دوں کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ اِسے تو ہمارے ہاں کا کورس ہونا چاہیے شاید کبھی قسمت ہماری یاوری کرے اور یہ قرآن آپ کے ہاں کا کہیں نصاب مقرر ہو جائے پھر دیکھیے گا ذہن انسانی کہاں پہنچتا ہے اور اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ❶ (85:13) کس انداز سے وہ یہ کچھ کرتا ہے۔ اس کے بعد اگلی ہی آیت ہے کہ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ❷ (85:13)۔ تباہیوں سے حفاظت کرتے ہوئے اس کائنات کی اشیاء کا وجود میں رہنا' نسل انسانی کا کچھ اس طرح

---

❶ وہ ہر شے کو' اس کے نقطہ آغاز سے پیدا کرتا ہے اور پھر اُسے' گردشیں دیتا ہوا' مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر' نقطہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

❷ اس کے لیے وہ تخریبی عناصر سے اشیائے کائنات کی حفاظت کرتا ہے' کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بننا ہے' بن جائیں۔ (وہ اپنے پروگرام کو نقطہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔) (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

سے آگے بڑھتے چلے جانا بتا رہا ہے کہ یہ کتنا حفاظت کا انتظام ہے۔ایک انسان کی زندگی کے خلاف تباہیوں کے سامان جو اس فضا میں پھر رہے ہیں' اگر انسان کبھی اس پہ غور کرے تو محوِ حیرت رہ جائے کہ میں زندہ کس طرح سے ہوں۔اگر جاننے والے ڈاکٹر صاحبان اور بائیالوجی وغیرہ والوں سے پوچھیے تو نظر آئے گا کہ آپ ایک ایک سانس بھی اس قدر ہلاکت آفریں جراثیم اپنے اندر لے جاتے ہیں کہ اس سے بچنا ہی محال نظر آتا ہے لیکن اس کے سامان مغفرت کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے ساتھ ہی یہ کچھ انتظام کر رکھا ہے کہ حفاظت ہوتی چلی جاتی ہے۔یہ الغفور ہے۔اب دیکھیے کہ وہ مبداء سے معید ہے یعنی وہ Origin (مبداء) سے ہر شے کا آغاز کرتا ہے' گردشیں دیتا ہوا اسے آگے لا رہا ہے اور اس میں الغفور ہے یعنی اس کے لیے حفاظت کے سامان بہم پہنچاتا چلا جاتا ہے۔

سامانِ مغفرت کی کیفیت

عزیزانِ من! ایک حفاظت تو وہ ہوتی ہے جو جیل خانے کا وارڈر قیدیوں کی کرتا ہے۔ایک حفاظت وہ ہوتی ہے جو ماں اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے۔یہاں الغفور کے ساتھ الودود کہا ہے یعنی اس قسم کی حفاظت جیسی ماں اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹائے ہوئے کرتی ہے یعنی محبت سے حفاظت کرنا۔وہ یوں حفاظت کیے چلا آتا ہے۔یہ وہی کر سکتا تھا جس کے ہاتھ میں ساری کائنات کا کنٹرول ہو۔اسی لیے کہا کہ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ [1] (85:15)

لفظ عرش اور مجید کا مفہوم

اس کائنات کا مرکزی کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے اور پھر اس کی کبریائی کا جو عرش یعنی تخت ہے' اس کی صفت المجید ہے۔مجد بنیادی طور پہ کسی شے کو فراوانی اور کثرت سے دیئے چلے جانے کو کہتے ہیں۔لیکن عربوں کے ہاں کہاوت [2] تھی کہ جو سب سے بلند شرف انسانیت' سب سے بڑا اشرف یا کسی کے لیے جو سب سے بڑی عزت یا صفت ہو سکتی تھی وہ انکے ہاں سخاوت' کریمی اور مہمان نوازی ہوتی تھی۔اس لیے ان کی زبان میں یہ جو لفظ مجد تھا وہ کثرت سے' فراوانی سے' کسی شے کا دیئے جانا تھا۔یہی لفظ مجید پھر بلند ترین شرف کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔اس شرف کا مالک کہ جو کسی کو کثرت سے' سخاوت کے بعد حاصل ہو۔میں نے تین چار دفعہ لفظ شرف بولا ہے کہ اس کے لیے ہمارے ہاں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے اس کے لیے عربی میں تو مجد اور شرف دو الگ الفاظ ہیں۔کیا زبان ہے! مجد ان کے ہاں اس شرف کو کہتے ہیں جو کسی کے ذاتی جوہر کی بنا پر ہو اور شرف اس وصف کو کہتے ہیں جس میں آبائی نسبت بھی پائی جائے یعنی وہ

---

[1] اس مقصد کے لیے اس نے اس کائنات کے مرکزی کنٹرول کو جو بڑی قوتوں اور عظمتوں کا حامل ہے' اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔(مفہوم القرآن۔پرویز)

[2] اَمْـجَـدْنَا فَلَانٌ۔ہمیں فلاں آدمی نے مہمانی کے طور پر اتنا دیا جو ہمیں کافی ہو گیا اور بچ بھی رہا۔(تاج العروس) عربوں میں چونکہ سخاوت' یعنی کسی کو دینا' بہت بڑا اشرف تھا اس لیے ان کے ہاں المجد بلند ترین شرف کو کہتے تھے۔(محیط المحیط) (لغات القرآن۔پرویز ص۔1525)

باپ دادا کی وجہ سے شرف ہو۔قرآن میں خدا کے لیے کہیں شریف کا لفظ نہیں آیا' مجید ہی کا لفظ آیا ہے۔کوئی ان الفاظ کا کیا ترجمہ کرے گا۔عربوں کے ہاں تو یہ بڑی چیز تھی جسے آپ آبائی شرف کہتے ہیں۔حسب ونسب کے اوپر ان کے فخر کا کیا کہنا! قرآن نے آ کر اس تصور کو ختم کر دیا۔عزت اور تکریم کے لیے کہا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) تمہارے جو ہر ذاتی تمہارے لیے وجہ تکریم ہیں اور یہ وجہ ہے کہ اس نے مجد اور مجید کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔وہ شرف اور شریف کے الفاظ ہی استعمال نہیں کرتا۔اس میں آباؤ اجداد کی وجہ سے شرافت کا شائبہ پایا جاتا ہے۔شاید زندگی وفا کر دے تو میں آپ کو قرآن کے ان الفاظ کے متعلق تشریح سے بیان کروں تو عجیب چیزیں سامنے آئیں گی۔اسی لیے کہا کہ خدا ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ❶ (85:15) ہے۔اگلی آیت میں کہا کہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ❷ (85:16) ہے۔یہ بہت بڑی چیز نظر آ رہی ہے۔جو چاہتا ہے کرتا ہے لیکن اس سے تو وہی بات آ گئی کہ جو میں ابتدا سے کہہ رہا تھا کہ ساری تعلیم اس محور کے گرد گھومتی ہے کہ یہاں ہر شے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔اب کہا جائے گا کہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (85:16) جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔تو پھر قاعدہ اور قانون کہاں ہوا؟ کہیں وہ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ❸ (3:39; 22:18) ہے' کہیں فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ❷ (85:16)۔یہ کیا ہوا؟ یہ ہماری سمجھنے کی ذرا سی بھول ہے۔اسے سمجھنے کے لیے کائنات کے تین گوشے ذہن میں رکھیے۔

کائنات کے تین گوشے

عزیزانِ من! کائنات کے تین گوشے ہیں۔سب سے پہلا گوشہ یہ ہے جسے قرآن خدا کا عمل یا اس کی مشیت کہتا ہے۔یہ وہ گوشہ ہے جہاں خدا قانون بناتا ہے۔قانون یہ ہے کہ آگ حرارت دیتی ہے' قانون یہ ہے کہ پانی پیاس بجھائے گا' قانون یہ ہے کہ سنکھیا ہلاکت کرے گا' اور قانون یہ ہے کہ شہد شفا بخشے گا۔سوال یہ ہے کہ سنکھیے کے اندر یہ خاصیت کیوں رکھی گئی؟ شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں دی گئی؟ اس ''کیوں'' کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔یہ ہے وہ مقام جہاں خدا قانون بناتا ہے۔یہاں وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ❷ (85:16) ہے یعنی وہ اپنے ارادے سے کچھ کرتا ہے۔اس کی کوئی اسکیم ہے' کوئی پلان (Plan) ہے' جس کے مطابق وہ کچھ کرتا ہے۔جو قانون وہ بناتا ہے یا جو قانون اس نے بنا دئے ہیں وہ اپنی مشیت' اپنے ارادے' اپنے پلان' اپنی سکیم کے مطابق بنائے ہیں۔اس میں ہم میں سے کوئی دخل نہیں دے سکتا۔وہ تو جب ہم وجود میں بھی نہیں آئے تھے' اس زمانے کے بن چکے تھے۔جب کوئی بھی نہیں تھا' اس زمانے کے بن چکے ہوئے ہیں۔وہ قانون اپنے پلان کے مطابق بناتا ہے۔یہ ہے وہ دائرہ جس کے اندر وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ❷ (85:16)

---

❶ اس مقصد کے لیے اس نے کائنات کے مرکزی کنٹرول کو' جو بڑی قوتوں اور عظمتوں کا حامل ہے' اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

❷ جملہ کائنات میں صرف اسی کا اختیار وارادہ کارفرما ہے۔اور اسی کا وہ اختیار وارادہ ہے جس کے مطابق وہ اشیائے کائنات کے لیے ضروری قوانین مرتب کرتا ہے۔اس میں کوئی اور دخل نہیں دے سکتا۔کسی چیز کے لیے کون سا قانون ہونا چاہیے' اس کا فیصلہ وہ خود ہی کرتا ہے۔

❸ خدا کے قوانین اس کی مشیت کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔اس میں کوئی دخیل نہیں ہوسکتا۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔پرویز)

ہے اور وَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (22:18) ہے یعنی جس طرح وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو اس کی منشا ہوتی ہے' وہ کرتا ہے۔ اپنے ارادے کے مطابق کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ کائنات آتی ہے۔ یہاں وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کو نافذ کرتا ہے اور یہاں آ کر وہ کہتا ہے کہ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ❶ (25:2) اب ہر شے ہمارے قانون کے مطابق چلنے کے اوپر مجبور پیدا کر دی گئی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (48:23) اور ہم نے یہ جو قانون بنائے ہیں اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہ اس کائنات کا دوسرا گوشہ ہے۔ اب یہاں قانون کے مطابق ہر بات ہوگی۔ یہ ہے عارضی کائنات کا دائرہ' جہاں اشیائے کائنات خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہاں وہ قانون نافذ کیا جاتا ہے اور یاد رکھیے! زبان چونکہ انسانوں کی ہے' کہنا پڑتا ہے جس خدا نے یہ کہا کہ تم ہمارے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے' اس کے معنی یہ ہو گئے کہ خدا خود یہاں اپنے آپ پہ جبر عائد کر لیتا ہے کہ میں اپنے قانون میں تبدیلی نہیں کرونگا۔ کائنات کی ہر شے مجبور ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے وہ اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔ قانون مجبور ہے کہ اس میں خدا تبدیلی نہیں کرتا۔ اس نے خود کہہ دیا ہے کہ میں اس کے اندر تبدیلی نہیں کرونگا۔ یہ اس کائنات کا دوسرا گوشہ ہے۔

تیسرا گوشہ انسان کا ہے

عزیزانِ من! تیسرا گوشہ انسان کا ہے کہ قانون تو اسی طرح سے غیر متبدل ہے' اسے اختیار دیا گیا ہے کہ جی چاہے تو اس کے مطابق زندگی بسر کرے' جی چاہے اس سے خلاف ورزی کرے۔ جس طرح سے زندگی بسر کرے گا اس کے مطابق نتائج مرتب ہو جائیں گے۔ یہاں انسان خود مختار واقع ہوا ہے۔ قانون مجبور واقع ہوا ہے۔ یہ تین گوشے ہیں۔ اگر آپ ان تین گوشوں کو سامنے رکھ لیں گے تو قرآن کے یہ مقامات جو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں' بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں' ان میں نہ تضاد رہے گا اور نہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے گی۔ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! کہیں کہا گیا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے' اپنے اختیار ارادے سے کرتا ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے ایمان آئے جس کی جی چاہے انکار کر دے۔ دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ خدا فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (85:16) ہے اور وَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (22:18) ہے یعنی وہ اپنے اختیار اور ارادے سے کر رہا ہے۔ یہ چیزیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں۔ وہ اس لیے نظر آتی ہیں کہ قرآن کریم پہ بحیثیت کلی ہماری نگاہ نہیں ہوتی۔ ہم اس کے ایک ٹکڑے کو لے لیتے ہیں۔ قرآن کے ان تین گوشوں کو سامنے رکھیے۔ تو کوئی مقام آپ کو ایسا مشکل نہیں نظر آئے گا جو حل نہ ہو سکے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ❷ (85:16) وہ مقام ہے

---

❶ اس نے ہر شے کو ایک خاص ترتیب دے کر پیدا کیا اور پھر اس کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے (Measures) مقرر کر دیئے۔

❷ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

جس میں خدا اپنی مشیت' ارادے' اختیار کے ساتھ قانون بناتا ہے اور اس کے بعد خود ہی اپنے پر پابندی عائد کر دیتا ہے کہ میں اب اس قانون میں تبدیلی نہیں کرونگا۔

اب قرآن یہ کچھ کہنے کے بعد انسانی دنیا کے انقلابوں کی طرف آ گیا کہا کہ هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ❶ (85:17-18) ان پرانی قوموں کی داستان تمہارے سامنے آئی ہے جیسے قوم فرعون اور قوم ثمود۔ ان کا انجام کیا ہوا؟ انہوں نے قوت اور طاقت تو بڑی جمع کر رکھی تھی۔ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ تَکْذِیْبٍ (85:19) لیکن انہوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا تھا۔ اس قانون کو جھٹلانے کے بعد خوشگوار نتائج تو نہیں نکل سکتے تھے۔ وہ قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے تھے اور اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمارے پاس بڑی قوت ہے۔ کہا کہ وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِیْطٌ (85:20) خدا تو انہیں آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے تھا' وہ کہاں جا سکتے تھے' کہاں نکل سکتے تھے۔ خدا انہیں دائیں بائیں سے گھیرے ہوئے تھا' خدا کا یہ قانون مکافاتِ عمل احاطہ کیے ہوئے تھا۔ قانونِ مکافاتِ عمل کہاں ہے؟ یہ انسانوں کی دنیا میں نافذ ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں جتنے قوانین نافذ ہیں' وہ اس نے کہیں لکھ نہیں دیئے۔ انہیں انسان اپنے تجربے' مشاہدے' عقل و فکر کی رو سے خود دریافت کر سکتا ہے' انہیں تم Discover (بے نقاب) کر سکتے ہو' وہ Laws of Nature (قوانین فطرت) موجود ہیں' اُن پر ہماری جہالت کا Cover (نقاب) ہوتا ہے' اسے اٹھا دیجئے' قانونِ فطرت سامنے آ جاتا ہے لیکن انسانوں کی زندگیوں کے اندر جو قوانین نافذ ہیں وہ کہاں ہیں؟ انہیں خدا نے وحی کے ذریعے انسانوں کو دیا ہے۔ انہیں انسان اپنی عقل و فکر اور مشاہدے کے بعد دریافت کر سکتا تھا لیکن ایک ایک قانون کو دریافت کرنے کے اندر صدیوں لگ جاتی ہیں' ایک ذرا سے قانون کے انکشاف کے بدلے سینکڑوں ہزاروں برس لگ جاتے ہیں۔ خارجی کائنات کے قوانین کو آپ دیکھیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قانون کو دریافت کرنے کے لیے ہزار ہا سال لگ جاتے ہیں اور اس دوران ناکام تجارب سے انسان جو ٹھوکریں کھاتا ہے' جتنے نقصان اس کو پہنچتے ہیں' وہ غفور اور ودود نہیں چاہتا تھا کہ انسان کو اس طرح چھوڑ دیا جائے کہ اس کو معلوم ہی نہ ہو کہ میری زندگی کے لیے صحیح قانون کونسا ہے۔ انسان کو یہ قوانین وحی کے ذریعے دے دیئے گئے اور اس لیے کہا کہ یہ جو بڑے بڑے جنود تھے' ہم ان کو احاطہ کیے ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان سے آگے اور پیچھے کونسی چیز تھی جو انہیں احاطہ کیے ہوئے تھی۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ (85:21) یہ احاطہ کرنے والی شے ہمارا ضابطۂ قوانین قرآن تھا۔ اس ضابطہ حیات کا نام قرآن نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوا لیکن قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہی

---

❶ (اُسی کا قانون انسانی دنیا میں' مکافاتِ عمل کی شکل میں' کارفرما ہے' اس کی شہادت کے لیے قرآن میں) ان لوگوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں' جو بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ' قوانین خداوندی کی مخالفت کے لیے ہجوم کر کے آئے تھے۔ یعنی قوم فرعون اور قوم ثمود کے لوگ...... (ان کا جو انجام ہوا وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآن اِنَّ هٰـذَا لَـفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی [1] (87:18) کے اندر بھی تھا۔اصولی طور پہ قوانین پہلے ہی دن سے اسی طرح دیئے گئے تھے قوانین کی جزئیات اور Details (تفاصیل) بدلا کرتی ہیں' قانون نہیں بدلا کرتے۔اس لیے کہا کہ بَـلْ هُـوَ قُـرْاٰنٌ مَّـجِیْـدٌ (85:21) بہت بڑے شرف اور مجد کا حامل یہ ضابطہ قوانین دیکھیں۔اس کی ایک صفت اور بتائی ہے۔وہ بڑی اہم صفت ہے۔

لوحِ محفوظ کیا ہے؟

برادرانِ عزیز! قانون وہ ہے جو خارجی ماحول سے متاثر نہ ہو۔ یہ ایسا ہونا چاہیے کہ اسے کوئی متاثر نہ کر سکے۔اسی لیے کہا کہ یہ ضابطہء قانون فِـیْ لَـوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (85:22) ہے۔''لوح'' ہر چمکنے والی شے کو کہتے ہیں۔اس کے بعد جب تحریر کی ابتدا ہوئی تھی اس زمانے میں یہ مٹی کی Tablet (تختیاں) بنا لیتے تھے اور ان کے اوپر ابھار ابھار کے نقش بنا دیا کرتے تھے۔یوں تحریر کی ابتدا ہوئی تھی۔اس لیے ان تختیوں یا Tablets کو لوح یا اس کی جمع کو الواح کہا کرتے تھے۔اب اس کے معنی ہر وہ شے ہے جس پہ کچھ تحریر کیا جائے بشرطیکہ تحریر چمکدار رہو۔اس تحریر کا چمکدار رہنا ضروری ہے۔ یہاں فِـیْ لَـوْحٍ مَّـحْفُوْظٍ [2] (85:22) کہا ہے۔دوسری جگہ فِـیْ کِتٰبٍ مَّـکْـنُوْنٍ [3] (56:78) کہا ہے۔یہی ضابطہ علم خداوندی میں تھا اور محفوظ تھا اور اب برادرانِ عزیز! جب یہ اپنی مکمل شکل میں' اس کتاب کے اندر آیا ہے' تو اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود قرآن نے لے رکھا ہے۔لہٰذا یہ پہلے بھی لوحِ محفوظ میں تھا اور اب انسانوں کو ملنے کے بعد بھی لوحِ محفوظ کے اندر محفوظ ہے۔اگر یہ اور اس کے ساتھ ہی اس قرآن کے اندر یہ چیز اپنے جذبات کی آمیزش کر کے پھر اس کا مفہوم لینا شروع کر دے تو الفاظ تو اس کے محفوظ رہ جائیں گے' اس کا قانون محفوظ نہیں نظر آئے گا لیکن ہم نے صدیوں سے اپنی مفاد پرستیوں کے پیش نظر قرآن حکیم کی تعلیم کو اپنے اپنے قالبوں میں ڈھال رکھا ہے جب کہ قرآن کے قانون کے سمجھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے خیالات کو پہلے سے قائم کر کے قرآن کی طرف نہ جائے۔یہ شرک ہے۔عزیزانِ من! قرآن کو خالص قرآن سے سمجھیں اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ کس طرح اپنے غیر متبدل قوانین دیئے چلا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ البروج یہاں ختم ہوئی۔اب ہم سورۃ الطارق زیرِ درس لاتے ہیں۔

---

[1] سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی تھا۔

[2] وہ ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ رہنے والی تختی پر کندہ ہے۔(وہ صحیفہ کائنات میں بھی محفوظ ہے اور قرآن کے اوراق میں بھی۔اس لیے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا (56:78)۔(خدا کے غیر متبدل قوانین' خواہ وہ نظامِ فطرت کے متعلق ہوں اور خواہ انسان کی تمدنی دنیا سے' کبھی مٹ نہیں سکتے۔اول الذکر کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کو قرآن کا ضابطہ حیات۔وہ بھی محفوظ ہیں اور یہ بھی محفوظ (15:9)

[3] (یہ ضابطہ یعنی قرآن) ایک محفوظ کتاب کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ (3-2-1 مفہوم القرآن۔پرویز)

الطارق (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! یہاں وہی قانونِ مکافاتِ عمل کے ذریعے بات ایک نئے انداز سے سمجھائی جارہی ہے۔ Laws of Nature (قوانین فطرت) ہوں، فطرت کی قوتیں (Forces) ہوں، انسان کی Potentialities (صلاحیتیں) ہوں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی تو یہ مضمر ہوتی ہیں، کبھی مشہود جاتی ہیں، کبھی یہ Latent (مخفی) ہوتی ہیں کبھی Actualize (بارز) ہوجاتی ہیں، کبھی یہ Potential form (صلاحیتی اسلوب) کے اندر ہوتی ہیں، اسی کو مضمر کہتے ہیں، کبھی یہ نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہیں، اس کو مشہود کہتے ہیں۔ یہاں قرآن نے بات یہ کہی ہے کہ زندگی میں اعمال کے نتائج کبھی مضمر ہوتے ہیں، چھپے ہوئے ہوتے ہیں، اور کبھی یہ نمودار ہوکر سامنے آجاتے ہیں، مشہود ہوجاتے ہیں۔ یہ نکتہ جو اس سورۃ کے اندر قرآن نے بیان کیا ہے، دیکھیے کہ وہ کس لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (86:1) ❶ شہادت دیتی ہیں فضا کی بلندیاں اور ان میں آنے والا طارق۔

لفظ طارق کا مفہوم

یوں تو طارق بہت بڑے ستارے کو کہتے ہیں لیکن یہ عربی زبان ہے۔ بنیادی طور پر، طارق کوئی نام نہیں ہے۔ اِن عربوں نے اُس ستارے کو طارق نام دیا تھا جو رات ❷ میں آتا تھا کیونکہ طارق کے بنیادی معنی ہیں: رات کے وقت آنے والا مسافر۔ میں کیا کروں، جی نہیں چاہتا آگے بڑھنے کو۔ ان کے ہاں یہ جو طارق کا لفظ ہے اس کا مادہ ''ط ر ق'' ہے۔ اس مادہ (Root) کے بنیادی معنوں کے اندر

---

❶ فضا کی بلندیاں اور ''طارق'' ایک عظیم حقیقت پر شاہد ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ تاج العروس

ہوتا ہے: کسی چیز کو کھٹکھٹانا' اس طرح ٹھک ٹھک کرنا۔ یہ راستے کو بھی اس لیے طریق کہتے ہیں کہ اس کے اوپر پاؤں اس طرح ٹھک ٹھک پڑتے ہیں۔ اِس کے بنیادی معنوں میں یہ جو کھٹکھٹانا ہے وہ اس لیے ہے کہ رات کے وقت جو مسافر آتا ہے وہ آ کر دروازے پہ دستک دیتا ہے۔ اس دستک دینے کی بنا پر ان کے ہاں رات کے وقت آنے والے مہمان یا مسافر کو طارق کہتے تھے۔ پھر خصوصیت سے جو رات کو آنے والا ہے اس کے لیے یہ طارق ستارہ ہوا' یوں تو ستارے رات ہی کو آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کے ہاں خاص طور سے یہ کس اعتبار سے کہا گیا؟ یہی وہ چیز ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔

ستاروں کی طرح انسانی عمل کا مشہود ہو کر سامنے آ جانا

قرآن کہتا ہے کہ یہ رات کو یوں چمکنے والا دن کے وقت کہیں چلا نہیں جاتا۔ ہوتا صرف اتنا ہی ہے کہ دن کے وقت یہ مضمر ہوتا ہے' رات کے وقت مشہود ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بات یہ کہنی ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ تو تمہارے ہاں موجود رہتا ہے' قانون بھی ہر وقت موجود ہوتا ہے' فرق اتنا پڑتا ہے کہ کبھی وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے' کبھی وہ چمک کر تمہاری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جب چمک کر آتا ہے تو تم کہتے ہو کہ وہ ستارہ آیا' جب تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو تم کہتے ہو کہ یہ نہیں ہے۔ وہ تو ہوتا ہے' تم نہیں دیکھ سکتے۔ اسکو کہا کہ طارق کیا ہے؟ وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا الطَّارِقُ ❶ (86:2) ہمارے علاوہ تمہیں کون بتائے کہ یہاں طارق سے کیا مراد ہے؟ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ❷ (86:3) وہی چمکنے والا ستارہ ہے جسے تم یوں اس طرح دیکھتے ہو کہ چمک رہا ہے اور کہتے ہو کہ یہ الطارق ہے جو رات کو کہیں سے آتا ہے۔ یہ رات کو کہیں سے نہیں آتا' یہ یہیں ہوتا ہے مگر اس وقت تمہیں نظر نہیں آتا۔ یہ صرف تمہیں رات کو نظر آ جاتا ہے۔ اس کی یہی کیفیت ہے۔ یونہی ہر انسان کے اعمال کے نتائج کی کیفیت ہے۔ انسان اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے سمجھتا ہے کہ اس کے جو اعمال دوسروں کی نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں ان کا وجود باقی نہیں رہتا اس لیے ان پر گرفت کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ خیالِ خام ہے۔ اعمال خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ' ہمیشہ موجود رہتے ہیں کیونکہ اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ❸ (86:4)

انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ایک دوسری مثال

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کہاں سے بات لے آتا ہے۔ کہا کہ یہ ستارے کہیں چلے نہیں جاتے۔ اگر تیری نگاہوں کے اندر' بصارت کیساتھ' بصیرت بھی پیدا ہو جائے تو جس طرح بعض نگاہیں دن کو بھی ستارے دیکھ لیا کرتی ہیں اس طرح سے تمہاری نگاہوں

---

❶ تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ ''طارق'' کی شہادت سے کیا مقصود ہے۔

❷ یعنی اس نہایت روشن ستارے کی شہادت سے جو رات کی تاریکیوں میں قندیل نورانی بن کر آتا ہے۔

❸ ہم نے ہر فرد کے اعمال کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ (1-2-3 مفہوم القرآن - پرویز)

میں بصیرت پیدا ہو جائے تو جب ابھی یہ اعمال کے نتائج مشہود طور پہ سامنے نہیں آ گئے ہوتے' تم اس وقت بھی ان کو دیکھ لو مگر شرط یہ ہے کہ تمہاری نگاہوں میں بصیرت پیدا ہو۔ اس کے بعد قرآن ایک مثال کی طرف چلا گیا۔ کہا کہ جسے یہ انسان کہتے ہیں' یہ چلتا پھرتا ہوا مشہود پیکر ہے۔ زندگی' حرکت وقوت وتوانائی کا یہ مجسمہ بہت مشہود شکل کے اندر تمہارے سامنے ہے۔ کیا یہ شروع سے اسی طرح تمہارے سامنے چلتا پھرتا ہی تھا۔ زندگی کن حالتوں کے اندر رہتی ہے؟ یہ وہی بات ہے کہ کبھی یہ مضمر Latent یا Potential ہوتی ہے کبھی یہی نمود میں آ جاتی ہے' مشہود ہو جاتی ہے Actualize ہو کے تمہارے سامنے آ جاتی ہے۔ پہلے اس کی طارق کی مثال ہوئی ہے پھر انسان کی اپنی زندگی کی مثال آ رہی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ اگر انسان اس ایک نکتہ پر غور کرے تو اس کے لیے بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ رہے۔ مثلاً ذرا سوچو تو سہی کہ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ❶ (86:5) ذرا اس پہ تو غور کیجیے کہ تم کیسے وجود میں آئے ہو؟ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ❷ (86:6) ابتدا اس کی اس ایک قطرۂ آب سے ہوئی ہے جو تیزی سے مادر رحم میں آتا ہے۔ کیا اس کے اندر تمہیں یہ انسان نظر آ رہا ہوتا ہے؟ کیا اس میں زندگی کی کوئی نمود تمہیں دکھائی دے رہی ہوتی ہے؟

عزیزانِ من! چھٹی صدی عیسوی میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس جرثومے کے اندر' جو مائکروسکوپ کے علاوہ نگاہ کو نظر نہیں آتا' پورے کا پورا یہ انسان اس طرح سے چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کاش کہ تمہیں وہ مائکروسکوپ کہیں سے مل جائے کہ جس میں تم اس چھپے ہوئے انسان کو پا لو۔ وہاں تم کہتے ہو کہ ہمارے جو اعمال ہیں ان کے نتائج کیسے محفوظ ہوتے ہیں۔ جب یہ ہمارے سامنے نہیں ہوتے تو کہاں ہوتے ہیں۔ یہ سارے دھاندلیاں مچانے والے' یہ سب جولوٹ میں مشغول ومصروف ہوتے ہیں' وہ اسی لیے اس بھول میں رہتے ہیں کہ ان کو اپنے اعمال کے نتائج مشہود شکل میں سامنے نہیں آتے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ اے کم بختو! وہ نگاہ پیدا کرو' جو غیر محسوس میں محسوس کو دیکھ لے۔ دیکھو تو سہی' تمہاری زندگی کی ابتدا میں کیا تمہیں کہیں یہ انسان نظر آتا تھا؟ بات چلتے چلتے کہہ گیا کہ يَخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ❸ (86:7) یہ قطرۂ آب' یہ نطفہ' دیکھیے۔ اس کے لیے کتنے الفاظ آتے ہیں۔ یہ اس مقام سے نکلتا ہے جو انسان کی پیٹھ اور پسلیوں میں سے گزرتا ہوا خارج ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تیرہ سو برس میں بھی یہ بات اور ان الفاظ کے معنی' سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے کہ یہ جو انسان کا مادہ تولید ہے' یہ اس کا ایک مقامِ تولید ہے اور وہاں سے' ہمیں معلوم ہے' کہ کس طرح وہاں سے اِس کا اخراج ہوتا ہے۔ قرآن

---

❶ وہ دیکھے کہ اس کی پیدائش کس طرح سے ہوئی ہے؟

❷ اس کی ابتدا اُس مادہ تولید سے ہوئی جو اچھل کر رحم میں گرتا ہے۔

❸ یہ مادہ' اپنے مقامِ تولید سے سیدھا عورت کے رحم میں نہیں جا گرتا۔ وہ مرد کی پیٹھ اور پیڑو کی ہڈیوں (Sacrum and Pelvic Bones) کے درمیان سے گزرتا ہوا خارج ہوتا اور اپنے مستقر میں پہنچتا ہے۔ (اس مادۂ تولید میں زندگی مضمر شکل میں ہوتی ہے اور پھر رحم مادر میں' مختلف منازل سے گزر کر' وہ

مشہود شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔) (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہتا ہے کہ یہ پسلیاں اور پیٹھ کے اندر سے آتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی' ان کی سمجھ میں اب بھی نہیں آ سکتی۔

انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالودود کی تشریح

میں اپنے محسن ڈاکٹر سید عبدالودود ❶ صاحب کا شکرگزار ہوں انہوں نے اس چیز کی تشریح ❷ کی اور برادران عزیز! عجیب چیز ہے آج جو آپ کی یہ تشریح ہے وہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ جو ہم اسے ذہن میں یہ سمجھ رہے ہیں' معاف رکھیے گا' میں انہی الفاظ میں بات کرتا ہوں' کہ مرد کے مادۂ تولید کا یوں براہِ راست اخراج ہوتا ہے' انہوں نے کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ یہ مادۂ تولید وہاں سے Travel (سفر) کرتا ہوا ایک راستے سے آتا ہے اور اس راستے کے اندر یہ پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں ❸ میں سے گزرتا ہوا' یہ آگے چل کر آتا ہے۔ تیرہ سو سال پیشتر یہ چیز کہی جا رہی تھی اور میں آپ کو یہ خوشخبری سناؤں گا کہ ڈاکٹر عبدالودود صاحب (1908-2001) نے اس دفعہ بکمال عنائت ہمارے آنے والی کنونشن ❹ میں اپنا موضوع رکھا ہے: تخلیق انسان: (انسان کس طرح پیدا ہوتا ہے۔) سائنس اور قرآن کی روشنی میں۔ اس وقت تک سائنس کے جو انکشافات ہیں' ان کو سامنے رکھتے ہوئے' قرآن کی آیات کو مقابلے میں لاتے ہوئے' انہوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ Magic Lantren پہ جو سلائیڈ ہوتی ہیں' ان کے ذریعے اس کی تصاویر بنائی ہیں کہ زندگی مختلف مراحل میں سے کس طرح گزری' ان میں کتنے اور کیا تغیرات ہوئے' اور کس طرح یہ مضمر سے مشہود ہوئی۔ یہ اس دفعہ ہماری آنے والی کنونشن میں جو 10,11,12 نومبر 1967ء کو یہاں (25 / بی گلبرگ 2' لاہور میں) ہو رہی ہے' اس میں محترم ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کا موضوع یہ ہے کہ قرآن کی روشنی میں انسانی تخلیق۔ ان سلائیڈز کے ذریعے وہ تخلیق انسان کے بارے میں بتائیں گے۔ اس میں یہ چیز بھی آئے گی جو قرآن نے تیرہ سو برس پہلے کہی تھی۔ اس طرح ثابت ہو جائے گا کہ آج کے انکشافات ان کی تائید کر رہے ہیں کہ زندگی اس طرح Travel کرتی ہے۔

---

❶ ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم (1908-2001)

❷ جو قارئین اس نکتہ کی تشریح سے دل چسپی رکھتے ہیں وہ ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم کی یہ کتاب زیر مطالعہ لائیں:

Wadud, Syed Abdul (1994). Phenomenon of Nature and the Quran, Lahore: Khalid Publishers, PP. 154-174.

❸ (صلب) Sacrum اور (ترائب) Pelvic Bones

❹ یہ طلوعِ اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن تھی جو پرویزؒ کے مکان واقعہ 25 / بی گلبرگ نمبر 2' لاہور میں مؤرخہ 10 تا 12 نومبر 1967ء منعقد ہوئی۔ اس میں مرحوم ڈاکٹر سید عبدالودود کا لیکچر تھا۔ عنوان تھا: تخلیق انسان......سائنس اور قرآن کی روشنی میں۔

قرآنِ حکیم کا ایک اور ضمنی گوشہ

عزیزانِ من! اس کی مزید وضاحت تو وہی فرمائیں گے آپ اُس وقت تک انتظار کیجیے لیکن قرآن نے کیا کہا ہے کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھیے کہ یہ قرآن کوئی Botany (علم حیاتِ نباتی) کی کتاب نہیں ہے' کہ یہ آپ کو Botany (علم حیاتِ نباتیات) پڑھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ تو ایک بات ہے کہ جس میں وہ اپنی دلیل لاتا چلا آ رہا ہے۔ ضمناً یہ بات درمیان میں آ جاتی ہے تو ہو نہیں سکتا کہ ایک خالقِ کائنات ضمناً بھی کوئی بات کہے تو وہ جو مخلوق ہے اس کے کسی گوشہ کے خلاف چلی جائے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ مشین کا بنانے والا' مشین کے متعلق ضمناً ہی جو بات کہے گا تو وہ صداقت پہ مبنی ہوگی۔ یہ باتیں اس طرح سے آ جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم نے کہنا یہ تھا کہ تمہیں یہ شبہ گزر رہا ہے کہ انسان مر گیا' اس کے بعد یہ ختم ہوا' پھر زندگی کیسی؟ اس نے کہا کہ جب یہ انسان اس شکل میں نہیں تھا تو اس وقت زندگی کہاں تھی؟ تمہارے ہر ممکن ذریعہ علم سے' جو اس وقت تھا' تمہیں زندگی کہیں نظر نہیں آتی تھی مگر زندگی موجود تھی۔ تم نے دیکھا کہ پھر وہ کس طرح مضمر سے مشہود ہو کر سامنے آئی۔ کہا کہ جب اِس جسم کی یہ مشینری موت سے Disintegrate (منتشر) ہو جائے گی' اس میں انتشار ہو جائے گا تو ہوگا کیا۔ یہ آج مشہود ہے پھر مضمر ہو جائے گی۔ یہ بس اتنی سی ہی بات چار الفاظ میں ہے۔ طبعی موت سے اتنا ہی فرق پڑتا ہے کہ وہ پھر مضمر ہو جاتی ہے تو کیا وہ خدا جس نے اُسے اِس سے پہلے مضمر سے مشہود بنایا تھا **اِنَّـهٗ عَـلٰـى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ** (86:8) اس پر قادر نہیں کہ ایک بار پھر مضمر کو مشہود کر دے؟ یقیناً وہ اس پر قادر ہے۔ لیکن بات اتنی ہی نہیں ہے۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے۔ زندہ ہو جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ وہ بات کو وہاں لاتا ہے۔ اس کا سارا مرکزی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ وہ انسان کے نتائج کا سامنے آنا لیے چلا آ رہا ہے۔ انسانی زندگی مضمر سے مشہود ہوگی۔ اس نے بات یہ کہنی ہے کہ تمہارے اعمال کے یہ نتائج آئیں گے۔ اس وقت مفاد پرستی کی پٹیاں تمہاری آنکھوں پر بندھی ہوئی ہیں اور تم محسوس نہیں کرتے کہ اعمال کے ان نتائج کے اندر تمہاری تباہی مضمر ہے۔ تم اسے دیکھ نہیں رہے۔ کہا کہ اس کے بعد زندگی دوبارہ مضمر سے مشہود ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ وہ کاہے کے لیے ہوگی؟ کہا کہ **يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ** [1] (86:9)

اعمال نامہ تو گردن پر لٹک رہا ہے

قرآن کہتا ہے کہ اِس وقت تم اتنا کچھ چھپائے بیٹھے ہو۔ یہ تمام بے پردہ سامنے آ جائے گا۔ اسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ **يَـوْمَ تُبْـلَـى السَّـرَآئِرُ** (86:9) یہ آج اسرار و رموز ہیں' آج مستور ہیں' آج تم نے خود یہ چھپا رکھے ہیں۔ تمہاری بھی بھول ہے حالانکہ اس

---

[1] اُس وقت' جس طرح زندگی مضمر سے مشہود ہو جائے گی' اسی طرح انسانی اعمال کے پوشیدہ نتائج بھی بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نے یہ کہا ہے کہ وہ تمہارا اعمال نامہ تو تمہاری گردن میں لٹک رہا ہے۔ وہ نتائج کہیں باہر سے نہیں آئے۔ وہاں بھی بڑی خوبصورتی سے بات کہی ہے۔اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ آج یہ لپٹا ہوا ہے' اُس وقت اسے کھول دیا جائے گا۔ یہاں بھی وہ بات کہی ہے کہ **یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ** (86:9) جس دن یہ تمہارے چھپائے ہوئے بھید وا کر دیئے جائیں گے۔عزیزانِ من! کسی اور کے نزدیک جہنم کا عذاب شاید کچھ اور ہو' میں تو جب اس پر غور کرتا ہوں' یقین مانیے میری ٹیسیں نکل جاتی ہیں۔ دوستوں کی محافل میں' جن لوگوں سے معاملات پڑتے ہیں' ان میں گھر بار والوں کے ہاں بھی جن سے ہم ملتے ہیں' ان کی نظروں میں ہم کتنے معتبر بنے ہوئے ہوتے ہیں' ان پہ ہمارا اعتماد جما ہوا ہوتا ہے' ہمارے تعلقات دیانت خلوص پر مبنی ہیں' صداقت پہ ہماری دوستی ہے' بالکل تمہارے ساتھ مخلصانہ ہے ہم بڑے شریف واقع ہوئے ہیں' جاںنثار واقع ہوئے ہیں' کہیں یہ کچھ نہیں کرتے۔ ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان چیزوں پر پردے پڑے رہیں۔ سوچیے کہ دوستوں کی محافل میں' ایک شخص ان کو بتاتا ہے کہ میں دیانتداری سے' مخلص دوست ہوں' تمہاری بہبود میرے سامنے ہے' تمہارے خلاف کبھی کوئی بات میں نہیں کرتا' میرے دل میں بھی کوئی چیز نہیں گزرتی مگر اندر سے منافق ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا چیزیں اس نے چھپا رکھی ہیں۔ یہ دوست' یہ گھر بار والے سینے میں جھانک نہیں سکتے۔ وہ اس کی باتوں کا اعتماد کرتے ہیں' کرنا پڑتا ہے۔ وہ اُسے مخلص دوست سمجھتے ہیں' اُسے وفادار شوہر سمجھتے ہیں' وفا شعار بیوی سمجھتے ہیں۔ ہم یہ ساری چیزیں عمر بھر نبھا سکتے ہیں لیکن سوچیے کہ یہی دوستوں کا مجمع سامنے بیٹھا ہوا ہو گا اور یہ خیالات' جو اس وقت میرے دل میں ان کے متعلق آ رہے تھے' یہ ابھر کر' نمایاں ہو کر' ان کے سامنے آ جائیں گے۔ ان کی نگاہوں میں میری کیا کیفیت ہو گی۔

دوسروں کی نگاہوں سے چھپنے کے لیے عمر بھر کی کوشش کا عذاب

عزیزانِ من! اُس وقت' جب یہ عمر بھر کا کیا دھرا' یہاں تک کہ دل میں ابھرنے والے خیالات بھی' سب کے سامنے ابھر کر آ جائیں گے تو ان کی نگاہوں میں میری کیا کیفیت ہو گی' اس سے بڑا عذابِ جہنم کوئی نہیں ہو گا۔ ہماری عمر بھر یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو جائے۔ یہاں اس دنیا میں بھی ایسے حساس افراد دیکھے گئے ہیں کہ ان سے کوئی ایک چیز ہو گئی اور اس کے بعد جب انہوں نے یہ دیکھا کہ شاید یہ بات خود آپ کے سامنے آ جائے گی تو خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ عذاب اتنا بڑا ہوتا ہے لیکن سوچیے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ خودکشی بھی نہیں کر سکتے' وہاں سے بھاگ کے بھی کہیں نہیں جا سکتے' وہاں پھر پردہ بھی نہیں پڑتا اور قرآن ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ یہ سب وہاں موجود ہونگے' ان میں تم وہاں بیٹھے ہوئے ہوں گے: یہ اپنے تقدس کا دعویٰ کرنے والے' اپنے آپ کو اتنا مخلص' دیانتدار ثابت کرنے والے اور دوستوں کو محض باتوں کے ذریعے اعتماد میں لانے والے۔تو **یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ** (86:9) وہ وقت آئے گا کہ یہ ساری چیزیں' جتنی چھپائی ہوئی تھیں' بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گی۔ **فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ** (86:10) اس وقت نہ تو اس

کی اپنی کوئی قوت ایسی ہوگی جو اُن مخفی نتائج کے اوپر پردہ ڈال دے' نہ کوئی ایسا ہوگا جو ان مخفی نتائج کو بے نقاب ہونے سے باز رکھ سکے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! وہ مشہود نتائج جنہیں بتانے کے لیے قرآن طارق سے' انسانی زندگی سے' حیات بعد الممات سے' شہادتیں لا رہا ہے اور اس کے بعد کہا کہ یہ بات بڑی Abstract سی ہوگئی تھی' حقیقت غیر محسوس سی ہوگئی تھی۔ ذہن ذرا اس میں الجھ رہا تھا۔ پھر وہ فوراً اسکو محسوس کی طرف لے آیا ہے کہ یہ تو رہا اُخروی زندگی کا ماجرا۔ اس سے پہلے' یہاں بھی ایک عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ** (86:11) اجرام فلکی کے نئے نئے' پہلو ہیں جو ان کی گردش کی وجہ سے سامنے آتے ہیں۔ تم تو کہتے ہو کہ یہ گردش' یہ بدلنا' یہ پھر سے آنا' کیسے ہوا؟ تو پھر فضا کی پہنائیوں میں یہ جو کرے تیر رہے ہیں' یہ ان کی گردشیں ہیں جن سے کبھی رات ہوتی ہے' کبھی دن ہوتا ہے' تو یہ سماء کی گردشیں ہیں جن سے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہے کہ **وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ** [1] (86:12)۔ تم کہتے ہو کہ جب جسم میں انتشار ہو گیا' جسم Disintegrate ہو گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' زندگی ختم ہوگئی' کہا کہ اے کاش! اس مٹی کے ایک انچ سے بھی ذرا نیچے جھانک کر تم دیکھ سکتے تو تمہیں نظر آتا کہ جو انتشار ہے وہ موت کی دلیل نہیں بلکہ حیاتِ نو کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ تم نے دانے کو خاک میں ملایا تھا' دو دن کے بعد ذرا دیکھیے تو سہی' وہ پھوٹ چکا ہوتا ہے۔ تمہاری دلیل کے مطابق وہ ختم نہیں ہو جاتا۔ دو ہی دن کے بعد اس میں سے حیاتِ تازہ کی نمود ہو جاتی ہے۔ اے جسم کے انتشار کے بعد زندگی کو ناممکن سمجھنے والو! قدم قدم کے اوپر زندگی تمہارے سامنے ابھر کر آ رہی ہے۔ **وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ** [2] (86:12) کتنی عظیم بات ہے یہ! سنو **اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ** [2] (86:13) یہ جو ہم کہہ رہے ہیں ایک فیصلہ کن حقیقت ہے' ایک طے شدہ بات ہے۔ **وَّمَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ** (86:14) ہم مذاق نہیں کر رہے۔ یہ کوئی لغو دعویٰ یا دیوانے کی بڑ نہیں۔ عزیزانِ من! ہم کبھی اس کو ایک قولِ فصل نہیں سمجھتے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہر وہ بات' جسے آج ہم چھپا رہے ہیں' یہ سامنے آ کر رہے گی۔ کوئی انسان جو اس کو قولِ فصل سمجھ لے' ایک حسین فیصلہ کن حقیقت اس کے سامنے آ جائے گی۔ جسے یقین ہو جائے کہ یہ جو بند کمرے کے اندر میں کر رہا ہوں' پولیس کا ایسا انتظام موجود ہے کہ وہ اس کو Detect (سراغ لگانا) کر لے گی تو پھر جرم کیوں کرتا۔

---

[1] اور وہ زمین جو بیج کو پھاڑ کر' اس میں سے کونپل نکالتی ہے (اور اس طرح بیج کے اندر مضمر زندگی کو مشہود بنانے کا ذریعہ بنتی ہے۔)

[2] غرضیکہ تمام مظاہر فطرت جن میں تخریب و تعمیر کا یہ عمل' مسلسل جاری و ساری ہے' اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی میں بھی اس انقلاب کا آ جانا (جس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے) ایک طے شدہ بات ہے۔ (اس وقت اس کا پہلا' تخریبی مرحلہ سامنے ہے۔ اس کے بعد یہ دانہ پھوٹ کر ایک نئے پودے کی شکل اختیار کر لے گا اور وہ اپنے وقت پر لہلہاتی کھیتی بن جائے گی۔ 48:29) (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ

یہ ایمان ہے' برادران عزیز! کہا کرتے ہیں کہ ایمان کا ویسے بھی انسان کے اعمال کے ساتھ کیا تعلق پڑتا ہے۔ آپ دیکھیے ایمان کا کتنا تعلق ہے۔ آپ یہ ایمان پیدا کیجیے کہ **اِنَّـهٗ لَقَـوْلٌ فَصْلٌ** (86:13) تمام مظاہر فطرت جن میں تخریب و تعمیر کا عمل' مسلسل جاری وساری ہے اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی میں بھی اس انقلاب کا آ جانا ایک طے شدہ بات ہے اور **يَـوْمَ تُبْـلَـى السَّـرَآئِرُ** (86:9) وہ دن آئے گا جب جس طرح یہ زندگی مضمر کی حالت سے نمود ہوگی' اسی طرح اس کے چھپے ہوئے بھید باہر آ کر رہیں گے۔ ایک دوسرے کا سامنا کرنا ہوگا۔ اگر یہ قولِ فصل ہے' فیصلہ کن حقیقت ہے' اگر اس پہ یہ ایمان ہے تو آپ دیکھیے تو سہی کہ آپ کے اندر کتنی بڑی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ وہ ایمان تھا جس سے وہ تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ پولیس کمیشن بٹھائے جاتے ہیں کہ جرائم میں کمی کیسے واقع ہو' رپورٹیں پیش ہوتی ہیں مگر جرائم بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایمان تھا۔ اس ایمان کے بعد ایک مجسٹریٹ کی Appointment (تعیناتی) تیرہ سو سال پہلے ہمارے ہاں بھی ہوئی تھی۔ خلیفۂ اول [1] نے یہ ایک مجسٹریٹ [2] مقرر کیا تھا۔ وہ سال بھر بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہہ دیا کہ صاحب! میرے سپرد کوئی کام کیجیے' بیکار بیٹھا ہوا ہوں' سال بھر میں کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔ جرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا جب یہ ایمان ہو کہ **يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ** [3] (86:9)۔ اس ایمان پر جرم ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کا ایمان تھا کہ **اِنَّـهٗ لَقَـوْلٌ فَصْلٌ** (86:13) یہ قول فصل ہے' ایک طے شدہ بات ہے۔ اس پر ایمان لانے کے لیے قرآن نے کہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ازحد ضرورت ہے۔ یہ ہمارے لیے تھا **وَّمَـا هُوَ بِالْهَزْلِ** [4] (86:14)۔ ہم اس کو ''ہزل'' سمجھ رہے ہیں۔ ہزل ہوتا ہے جس کو کوئی آدمی Seriously (سنجیدگی سے) نہ لے' اسے ہم بالکل سطحی طور پر (Lightly) لے رہے ہیں۔ کیا اس کے اوپر قرآن کو ماننے والوں کا ایمان ہے؟ میں باقیوں کو تو چھوڑتا ہوں کہ کسی کے متعلق جو دل میں بھی خیال گزرتا ہے وہ محسوس بن کر اس کے سامنے آ جائے گا اور تم اس وقت سامنے دیکھ رہے ہوگے۔ کیا یہ ہمارا ایمان ہے؟ کیا ہم اس کو قولِ فصل سمجھتے ہیں؟ یہاں ہم اس کو ہزل ہی سمجھ رہے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس نے یہ کیوں ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ **وَّمَـا هُوَ بِالْهَزْلِ** [4] (86:14)۔ اسے معلوم تھا کہ قرآن کو ہاتھ میں لینے والوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس قولِ فصل کو وہ ہزل سمجھ رہے ہونگے۔ کہا کہ کم بختو! **وَّمَـا هُـوَ بِالْهَزْلِ ۝ اِنَّهُـمْ يَكِيْدُوْنَ**

---

1. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634ء)
2. اس مجسٹریٹ کا نام تھا حضرت عمر فاروقؓ (581-644/45ء)
3. اُس وقت' جس طرح زندگی مضمر سے مشہود ہو جائے گی' اسی طرح انسانی اعمال کے پوشیدہ نتائج بھی بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے۔
4. یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ کوئی لغو دعویٰ یا دیوانے کی بڑ نہیں ہے۔ (4-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

كَيْدًا o وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ❶ (86:14-15)

مکافاتِ عمل انسان کی گھات میں ہوتا ہے

یہ جرم کرنے والے کیا کرتے ہیں؟ یہ جرم کے بعد خفیہ تدبیریں کرتے ہیں کہ جرم چھپا رہے۔ خدا کہتا ہے کہ وَاَكِيْدُ كَيْدًا (86:16) ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل Detection (سراغ رسانی) کے اندر لگا ہوا ہے۔ وہ ان کی ہر تدبیر کو ناکارہ بناتا چلا جاتا ہے۔ کیا انداز ہے يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا o وَّاَكِيْدُ كَيْدًا کا جتنا جی چاہے اس کو چھپانے کے لیے کوششیں کر لے ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل بھی مقابلے میں کوششیں کر رہا ہے۔ ''کید'' اس تدبیر کو کہتے ہیں جو چھپی ہوئی ہو۔ جرم کا چھپانے والا جو تدبیریں کر رہا ہوتا ہے اس کے اوپر بھی وہ راز ہوتا ہے۔ اسی کے مقابلے میں کہا کہ ہمارا قانونِ مکافات بھی جو کر رہا ہوتا ہے' وہ بھی بظاہر تمہیں نظر نہیں آتا کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ یہ Detecting (سراغ لگانا) ہے۔ وہ جس طرح Detection (سراغ رسانی) کرتا ہے اگر وہ پہلے سے بتادے کہ میں Detective (سراغ رساں) ہوں' سی آئی ڈی والا ہوں' اس کے لیے یہ کہنا کہ وہ سی آئی ڈی والا ہے بات ہی نہیں بنتی۔ کیا انداز ہے سمجھانے کا: وَاَكِيْدُ كَيْدًا (86:16) ٹھیک ہے تم چھپاتے چلے جاؤ' ہم بھی کچھ کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بات یہ ہوئی کہ پھر یہ ابھی کیوں نہیں پکڑے جاتے' اس کے لیے کہا کہ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (86:17) بات صرف مہلت کے وقفہ کی ہے (یعنی وہ وقف جو بیج کے فصل بننے تک کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔) سو تو ان مخالفین کو سردست ان کے حال پر چھوڑ دے۔ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق انہیں تھوڑی سی مہلت مل رہی ہے۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوگی۔ اور وہ انقلاب آجائے گا۔ بس اتنی سی بات ہے کہ جو بیج زمین میں ڈالا ہے' اسے کونپل بننے میں کچھ دن لگنے ہیں۔ وہ کچھ دن لگ رہے ہیں۔ یہ مہلت کا وقفہ ہے اور مہلت کے وقفے میں ہوتا یہ ہے کہ یہ وقفہ اتنا نرمی سے گزرنے والا ہوتا ہے کہ اٹھانے والے یعنی Detective (سراغ رساں) کے پاؤں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی۔ یہ مہلت کا وقفہ بڑا ہی آسانی اور نرمی کا ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو گرفت کی آہٹ بھی نظر نہیں آتی۔ اگر وہ آہٹ پائیں تو پھر بھی یہ اس سے محتاط ہو جائیں لیکن وہ اس طرح سے آہٹ بھی نہیں دینا چاہتا۔ وہ تو اندر کی تبدیلیوں کے محرکات کو روکنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ یہ اِس ایمان سے رک سکیں گے: اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (86:13) یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (86:14) یہ یونہی مذاق کی بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ہم روز بیٹھے ہوئے یہ مرثیہ پڑھتے رہے ہیں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہوگئی۔ وہ ❷ بھی اسی

---

❶ یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ کوئی لغو دعویٰ یا دیوانے کی بڑ نہیں ہے۔ یہ مخالفین اس کو روکنے کی تدبیریں کر رہے ہیں (کہ وہ واقعہ نہ ہونے پائے)۔ لیکن ہمارا قانون بھی اس سے غافل نہیں۔ وہ بھی اپنی تدابیر میں مصروف ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869 AD)

شکایت کو لیے ہوئے کہہ گیا کہ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اور ہم بھی یہی شکایت کرتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ بات کونسی ہے جو وہ کہہ گئے ہیں۔ تو یہ جو ہے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ❶ (86:13)۔ اس بات پر ہمارا ایمان نہیں اور جب تک یہ چیز نہیں آتی اس وقت تک ہماری حالت میں نہ کبھی کوئی تبدیلی ہوسکتی ہے، نہ معاشرے کی حالت میں۔ ہم تو صرف اپنی ذات کے خلاف یہ دلائل کرتے ہیں کہ یہاں یہ بھی کسی پولیس کی گرفت میں نہیں آسکتے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کس طرح اِس سے آنکھ بند کرسکتا ہے مگر اس میں مہلت کا وقفہ بڑا ضروری ہے۔ ممکن ہے کوئی اس وقفے میں اس کا تدارک کرلے۔ یہ ہے اس کی حکمت۔ اس لیے کہا کہ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (86:13) بات صرف مہلت کے وقفے کی ہے یعنی وہ وقفہ جو بیج کے فصل بننے تک کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ سو تو ان مخالفین کو سردست انہی کے حال پر چھوڑ دے۔ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق انہیں تھوڑی سی مہلت مل رہی ہے۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوگی۔ اور وہ انقلاب آجائے گا۔

عزیزانِ من! یہاں سورۃ الطارق ختم ہوتی ہے۔ اگلے درس میں ہم سورۃ الاعلیٰ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

❷ یہ تمام مظاہر فطرت جن میں تخریب وتعمیر کا یہ عمل مسلسل جاری وساری ہے، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی میں بھی اس انقلاب کا آجانا (جس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے) ایک طے شدہ بات ہے۔ (اس وقت اس کا پہلا تخم یہی مرحلہ سامنے ہے۔ اس کے بعد یہ دانہ پھوٹ کر ایک نئے پودے کی شکل اختیار کرے گا اور وہ اپنے وقت پر لہلہاتی کھیتی بن جائے گی۔ 48:29) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تیئسواں باب: سورۃ الاعلی (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ الاعلیٰ سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسواں پارہ اور 87 ویں سورۃ ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی (87:1) اس آیت میں ''اعلیٰ'' کے بعد ''الذی'' ہے لیکن میں اس کی تلاوت بعد میں الگ کرونگا۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی ❶ (87:1)۔ اب آپ کو یہ حقیقت تو معلوم ہو چکی ہے کہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم انسانوں کی دنیا میں خدا کے نظامِ ربوبیت کی تشکیل و قیام ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس کے تحت نہ صرف یہ کہ انسانوں کی طبعی زندگی کی تمام ضروریات پوری ہوتی رہیں' بلکہ انسان کو جو کچھ بنایا جانا مقصودِ فطرت ہے انسان وہ کچھ بھی بن جائے۔ یہ چیز انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ یہ اجتماعی زندگی ہی میں ممکن ہے' یہ معاشرے کے اندر ہی ہوسکتا ہے اور اسی کو ایسا نظام کہا جاتا ہے جو انسان کی طبعی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے بعد اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز سے کرے کہ جو کچھ اس کا بننا مقصود ہو' وہ بن جائے' قطع نظر اس کے کہ وہ زندگی کی کس اسٹیج پر ہے۔ جس نظام میں یہ کچھ بن جائے اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔ سَبَّحَ کے معنی ہوتا ہے: اس مقصد کی تکمیل اور حصول کے لیے پوری پوری جدوجہد کرنا' امکان بھر کوشش کرنا' سرگرمِ عمل رہنا' اس مقصد کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہنا اور رَبِّکَ الْاَعْلٰی میں خدا کی پہلی صفت الْاَعْلٰی بتائی گئی ہے۔

---

❶ (اے رسول!) تو اپنے نشوونما دینے والے کے بلند و بالا نظامِ ربوبیت کو متشکل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل رہ۔ (56:96) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

احترامِ آدمیت کا راز

قانون کی زبان میں ایک لفظ اقتدارِاعلیٰ ہے جسے انگریزی زبان میں Sovereignty کہتے ہیں کہ جس سے بلند کوئی اور اتھارٹی نہ ہو یعنی آخری فیصلہ کرنے والی اتھارٹی۔ دنیا کا کوئی بھی نظام اور آئین ہو' اس میں یہ اتھارٹی ایک فرد کی ہو' افراد کی جماعت کی ہو' وہ بہرحال انسانوں تک جا کر رک جائے گی۔ انسانوں کی دنیا میں انسان ہی ہونگے۔ انہیں یہ Highest Authority یعنی اقتدارِاعلیٰ سونپا جائے گا۔ اس کے بغیر کوئی اور صورت ہے ہی نہیں جو انسان وضع کر سکے۔ انسان کے اپنے سے بالاتر' کوئی اور ہے ہی نہیں' جس کو یہ اقتدار دیا جا سکے اور یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کے نظامِ حکمرانی اور انسانوں کے ذہن کے تراشیدہ نظامِ حکومت میں فرق آتا ہے۔ قرآن کے اس نظام میں اقتدارِاعلیٰ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہتا۔ اس کے برعکس وہ کتنے ہی آپ کے ہاں منتخب کردہ اور برگزیدہ کیوں نہ ہوں اس ذہن انسانی کے تراشیدہ نظامِ حکومت میں بہرحال ایک انسان دوسرے انسان کا محکوم ہو جاتا ہے اور جونہی کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم ہوا' احترامِ انسانیت ختم ہوا اور احترامِ انسان کو جہاں کہیں ٹھیس لگی' انسانی ذات کی نشوونما رک گئی اور چونکہ مقصود ہی یہاں انسانی ذات کی نشوونما ہے' اس لیے اس میں احترامِ انسانیت ایک مقدم فریضہ Pre-requested Condition ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد نہ کسی دوسرے کا محتاج ہو' نہ کسی دوسرے کا محکوم ہو۔ محکومیت اسی صورت میں زائل ہو سکتی ہے کہ جب اقتدارِاعلیٰ انسانوں سے اوپر کسی ہاتھ میں ہو اور انسانوں سے اوپر تو خدا ہی ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں ہو سکتا تو یہ وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے نظام کے اندر اقتدارِاعلیٰ خدا کو دیا ہے انسانوں کو نہیں دیا۔

اقتدارِاعلیٰ کا مفہوم

اب خدا خود آ کر تو President (صدر) کی کرسی پہ نہیں بیٹھ سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اس کے اقتدارِاعلیٰ ہونے کے معنی کیا ہونگے؟ عملاً وہ اقتدارِاعلیٰ کیسے Exercise (نافذ) ہوگا۔ یہ کوئی نظریاتی بات تو ہے نہیں' محض عقیدے کی چیز بھی نہیں ہے کہ ہم نے یہ مان لیا کہ ہاں صاحب! اقتدارِاعلیٰ خدا کا ہے اور اس کے بعد جو کچھ نظام ہمارے ہاں چلتے ہیں وہ چلاتے چلے جائیں۔ یہ تو عملی شکل دیتا ہے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ اس نے اپنے ان قوانین اور آئین کو وحی کے ذریعے نازل کر کے اس کتاب کے اندر محفوظ کر دیا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے اور اس کے بعد یہ کہہ دیا کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44)۔ کافر اور مومن کے اندر حدِ امتیاز یہ ہے کہ جو اس کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں وہ مومن کہلائیں گے' جو اس کے مطابق نہیں کرتے ہیں وہ کافر کہلائیں گے یعنی اقتدارِاعلیٰ اب خدا کا اقتدارِاعلیٰ' اس کے ضابطہ آئین کی ابتدا اور اطاعت میں ہے۔ لہٰذا اب **الاعلیٰ** یعنی Sovereign Authority (اقتدارِمطلق) خدا کی کتاب کو حاصل ہو گیا۔ اب اس کتاب کو نافذ کرنے کے لیے آپ کو

ایک ایجنسی کی ضرورت ہے جسے آپ اسلامی حکومت کہتے ہیں۔ اسلامی حکومت اپنے قوانین' دوسرے انسانوں پر نہیں نافذ کرتی' وہ خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق' آئین خداوندی کے مطابق' ایک نظام متشکل کرتی ہے اور معاشرے میں اس کی عملی جزئیات کا نفاذ کرتی ہے اس طرح یہ اقتدارِ اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں رہتا ہے اور انسانی حکومت اس اقتدارِ اعلیٰ کی تنفیذ کی ایک ایجنسی ہوجاتی ہے۔ پہلی چیز تو یہاں یہ کہہ دوں کہ تمہارا مقصود خدا کے نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل کرنا ہے۔ اس میں پہلی خصوصیت یہ ہوگی کہ **الاعلی**' وہی رہے گا' اقتدارِ مطلق اس کے ہاتھ میں ہوگا اور اس کے بعد اس خدا کی چار صفات کہیے یا اس کے پروگرام کی چار کڑیاں کہیے اور وہ آگے آتی ہیں۔

خدا کے پروگرام کی چار اہم ترین کڑیاں

عزیزانِ من! یقین مانیے یہ چار کڑیاں دو آیات کے تین تین الفاظ کے اندر آئی ہوئی ہیں اور میں پوری ذمہ داری سے یہ عرض کرسکتا ہوں کہ اگر علم کی بارگاہ میں خدا کے متعلق صرف یہ چھ الفاظ قرآن کے آتے اور کچھ بھی نہ ہوتا' یقیناً میں اپنا سر جھکانے پر مجبور ہوجاتا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا اور یہ بھی پوری ذمہ داری سے عرض کردوں کہ انسانوں کی تصنیفات تو ایک طرف رہیں دنیائے مذاہب میں جن کتب کو خدا کی طرف آج منسوب کیا جاتا ہے' کوئی ایک کتاب نہیں ہے جس میں خدا کے متعلق یہ چار چیزیں کہیں کہی گئی ہوں اور یہ وہ چیزیں کہی گئی ہیں کہ چودہ سو سال پیشتر تو ایک طرف' دواڑھائی سو سال پہلے کا انسان بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ پہلی دفعہ انسان کے ذہن میں جو یہ بجلی کی سی چمک ذرا پیدا ہوئی' یہ اٹھارہویں صدی کی بات ہے۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ کیا چیزیں ہیں جو قرآن ان چار الفاظ میں کہہ گیا ہے۔ چار میں نے اس لیے کہے ہیں کہ دوبار اس میں الذی آتا ہے یعنی وہ ذات وہ خدا اور باقی چار الفاظ رہ جاتے ہیں۔ ان میں کہتا ہے کہ **الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی** (87:2-3)

عربی زبان کی وسعت

پہلی چیز ہے تخلیق۔ عربی زبان کی وسعت' پھر قرآن کا انتخاب' ہم ہی نہیں غیر مسلم علماء بھی جب اس پہ غور کرتے ہیں' انہیں بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہی زبان قرآن کے حقائق کی متحمل ہوسکتی تھی۔ پرینگل پٹیسن [1] (Pringle- Pattison, Andrew Seth:

---

[1] علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے چوتھے خطبے میں پرینگل پیٹی سن کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے:

In order to understand the meaning of the Word <u>Amr</u>, we must remember the distinction which the Wuran draws between <u>Amr</u> and <u>Khalq</u>. Pringle - Pattison deplores that the English language possesses only one word -- 'Creation' -- to express the relation of God and the universe of extension of the one hand, and the relation of God and the human ego on the other. [باقی اگلے صفحے پر]

(1856-1931 لکھتا ہے کہ ہماری زبان، حالانکہ انگریزی زبان خاصی منجھی ہوئی زبان ہے، اس میں اچھی خاصی وسعت آ چکی ہے، اس میں تخلیق کے لیے ایک ہی لفظ Creation ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ قوم کس قدر خوش قسمت ہے کہ اِس قوم کی زبان میں اس کے لیے دو لفظ امر اور خلق موجود ہیں اور وہ کہتا یہ ہے کہ اب جب ہمارے ہاں لفظ ہی ایک ہے، Creation تو میں یہ بتاؤں کیا کہ یہ دوسری چیز کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے تخلیق کے سلسلہ میں ایک چیز تو کہی ہے **فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ❶ (12:101) یا **بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ❷ (2:117) وہ جو کسی شے کو عدم سے وجود میں لائے، جو Non xistence (عدم) کو Existence (وجود) کرے، یہ creation نہیں اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں Origin کیا گیا ہے اسے قرآن میں یہ کہا ہے کہ یہ معاملہ عالمِ امر سے متعلق ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی شے عدم (Non-existence) سے وجود (existence) میں کیسے آ جاتی ہے۔ تمہارا ذہن اس لامحدودیت (Infinity) تک نہیں پہنچ سکتا۔

اگلی چیز تخلیق ہے

عزیزانِ من! اگلی چیز جو قرآنِ کریم نے کہی ہے، وہ ہے تخلیق۔ تخلیق میں نہ صرف یہی کہا ہے کہ تم اسے سمجھ سکتے ہو کہ یہ کیسے ہو جاتی ہے؟ بلکہ اس میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کو تسلیم کیا ہے کہ اس میں اور بھی خالق ہو سکتے ہیں۔ فاطر اور بدیع تو خدا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا مگر اس نے اپنے آپ کو **اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ** (23:14) کہا ہے یعنی خالقین میں سے سب سے زیادہ حسن کارانہ انداز سے تخلیق کرنے والا۔ تو اس نے دوسروں کو بھی خالق تسلیم کیا ہے۔ خلق کے معنی ہوتے ہیں: جو چیزیں موجود ہوں، ان میں مختلف Proportion (تناسب) قائم کر کے مختلف تراکیب سے، مختلف چیزیں بناتے چلے جانا۔ پہلی چیز اس نے یہ کہی ہے کہ اسکی بنیادی صفت یہ خلق ہے۔ فاطر تو وہ ان تمام اشیاء کا ہے، جنہیں آپ نیوکلیس (Nucleus) کہتے ہیں، جسے آپ کہتے ہیں کہ وہ ابتدائی مادہ ہے جس سے آگے چیزوں نے بننا ہے۔ وہ اُسے تو اپنی صفتِ فاطریت کے ماتحت لے آیا ہے وہ تو وجود میں آ گئیں۔ اب اس کے بعد وہ جو

[گزشتہ سے پیوستہ]----------------------------------

That Arabic language is, however, fortunate in this respect. It has two words Khalq and Amr to express the two ways in which the creative activity of God reveals itself to us. Khalq is creation; Amr is direction. As the Quran says: "To Him belong creation and direction". Iqbal, Allama Muhammad (1986): The Reconstruction of religious thought in Islam. In M.Saeed Sheikh (ed.) Lahore: Iqbal Academy Pakistan, P. 82.

❶ اے ارض وسما (ساری کائنات) کے پیدا (Oriiginate) کرنے والے

❷ خدا ارض وسما (ساری کائنات) کو پہلی مرتبہ (عدم سے) وجود میں لایا ہے۔

اشیاء وجود میں آئی ہیں' ان سے آگے اب ان مختلف چیزوں میں' نئی نئی تراکیب سے' نئے نئے تناسب اور توازن سے' نئی نئی چیزیں بناتے چلے جانا ہے۔ وہ چیز ہے خلق۔ چلیے' اس نے یہ چیز بنانا شروع کی اسکے بعد' تخلیق کے متعلق' میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ یہ دوسو سال پہلے کی بات ہے۔ اس سے پہلے ذہنِ انسانی میں یہ بات ہی نہیں آئی تھی۔ اٹھارہویں صدی تک' عوام ہی نہیں بلکہ مغرب کے بڑے بڑے Scientists (سائنسدان) Biologists (ماہرین علم الحیات) کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اس صفحۂ ارض پر جو شے' آج جس شکل میں موجود ہے' اسی شکل میں اسی طرح شروع میں خدا نے وہ بنادی۔ مذہبی طبقہ تو یہ کہتا تھا کہ وہ جو چاہے اور اس نے نوح علیہ السلام کی کشتی کے اندر ایک ایک جوڑا رکھ دیا گیا بس اس کے بعد ساری دنیا میں جو کچھ موجود ہے وہ جو جوڑے تھے انہی سے آگے یہ سارا سلسلہ چلا لیکن سائنس کی دنیا اس کو محدود نہیں بھی کرسکی' تو بھی نظریہ یہی تھا کہ جو شے آج جس شکل میں موجود ہے' یہ دائم ہی اسی شکل میں تھی خدا پہلے ہی دن سے' انہیں وجود میں لے آیا تھا۔ یہ تھا خدا کا عملِ تخلیق مثلاً انسان جس طرح آج ہمارے سامنے موجود ہے انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ یہ پہلے دن سے اسی طرح وجود میں لایا گیا تھا اور یہ اثر تھا اسی بائبل کے تصور کا' اس عقیدے کا' جس کی رُو سے اس نے یہ کہا تھا کہ خدا نے کسی طرح ایک پتلا بنا دیا اور اس میں اس کی پسلی سے ایک عورت نکال دی۔ اس کے سوا انسان اور کیا سوچ سکتا تھا؟ وہ یہیں تک پہنچ سکتا تھا۔

ارتقائی منازل کا سلسلہ

اٹھارہویں صدی تک کے Scientists (سائنسدان) بھی یہی مانتے چلے آرہے تھے کہ وہاں پہلی دفعہ اس تصور کے خلاف تحقیق ہوئی اور ڈارون ❶ کی تھیوری سامنے آئی۔ اس کے مکتب فکر کے جتنے بھی اور Scientists (سائنسدان) تھے انہوں نے یہ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ ہمیں ذی حیات کی تاریخ اور ان کا ماضی یہ بتاتا ہے کہ ہر شے اس شکل میں پہلے ہی دن وجود میں نہیں آگئی تھی جس میں وہ آج موجود ہے' بلکہ پہلے کچھ اور شکلیں تھیں جنہیں آپ Crude form کہتے ہیں' یعنی کندۂ ناتراش کہتے ہیں۔ یہ ابھرتی ہوئی چیزیں

---

❶ Darwin, Charles Robert (1809-87). British naturalist who revolutionized bioligical theory by putting forward his theory of evolution based on natural selection. His views, formed after his compehensive observations of fossils and the diverse plant and animal life during his voyage (1831- 1836) round South America and the Pacific as naturalist on H.M.S. Beagle, were published in "On the Origins of species." His Contribution conflicted with received Christian opinion on the creation of the world, and caused much controversy, especially where as in his 'The Descent of Man (1871), revolutionary theories were applied to human origins. Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary, London: the Reader`s Digest Association Limited, P. 397.

تھیں اور جسامت میں بڑی بڑی تھیں۔ آج جو اتنی سی چھپکلی نظر آتی ہے اس زمانے میں وہ مگرمچھ جتنی ہوتی تھی۔ اسی طرح انہوں نے کہا کہ یہ چیزیں ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' آگے آئیں اور ہر اگلی منزل میں ان میں جو حشو وزوائد تھا وہ چھٹتا چلا گیا' کم ہوتا چلا گیا اور ان میں اعتدال اور ہمواری پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس طرح یہ ہزار ہزار' پچاس پچاس ہزار سال رہے کیونکہ یہ تاریخ تو کروڑوں سالوں تک پہنچتی ہے۔ اس طرح ایک ایک ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی' یہ اشیاء آگے بڑھتی چلی گئیں۔ اس آگے بڑھنے میں ان کے ہاں کی مادی باڈیز (Bodies: اجسام) کے اندر تراش خراش ہوتی چلی گئی' ذہنی طور پر ان میں زیادہ ارتقاء پیدا ہوتا چلا گیا' جسے آپ Intellectualy کہیں گے۔ یہ زیادہ بلند ہوتی چلی گئیں اور ان کے ساتھ جو Physical matter تھا جسے آپ طبعی مادہ کہتے ہیں' چھٹتا چلا گیا' یہ حشو و زوائد ان سے الگ ہوتا چلا گیا اور یوں ان میں اعتدال آتا چلا گیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

خلق کے بعد اگلا لفظ ہے: **فَسَوّٰی**۔ اس کے معنی ہوتے ہیں حشو وزوائد کو پاس (Pass) کرتے ہوئے کسی چیز میں اعتدال پیدا کر دینا۔ عزیزانِ من! یہ ایک لفظ خلق ہے اور آپ دیکھیے کہ اس کے اندر علم کی ایک دنیا سمو کر رکھ دی۔ کیا کسی انسان کا ذہن وخیال جو چودہ سو سال پہلے ادھر جا سکتا تھا' کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ یہ عمل تخلیق اس طرح ہوا کہ پہلے تو فاطر تھا۔ وہ رشتہ وتعلق تو عالم امر سے رہا۔ نیوکلیائی اشیاء وجود میں آئیں۔ پھر ان کی مختلف تراکیب سے مختلف چیزیں متشکل ہوئیں۔ ابتداً ہی ان کی تشکیل کی شکل بڑی Crude form (کندۂ ناتراش) کی تھی اور پھر ان کے اندر Refinement شروع ہوئی۔ آہستہ آہستہ انہیں چھلنیوں سے گزارنا شروع کیا' حشو وزوائد گھٹتا چلا گیا' اعتدال بڑھتا چلا گیا اور یوں موجودہ چیزیں' جو ہمیں اس طرح نظر آتی ہیں' متشکل ہوئیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ ہے: **خَلَقَ فَسَوّٰی** ❶ (87:2)

ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے گئے

عزیزانِ من! یہ اتنا کچھ ہی نہیں کیا۔ کہا کہ **اَلَّذِیْ قَدَّرَ** (87:3) پھر اس نے ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے۔ جسے تقدیر کہتے ہیں' وہ کسی شے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جسے آپ اس شے کی تقدیر کہتے ہیں کہ اس نے آخرالامر' ان ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے' کونسی شکل اختیار کرنی ہے' کہاں تک پہنچنا ہے۔ یہ جو اس کے امکانات کی رسد کی آخری حد ہوتی ہے' اسے اس شے کی تقدیر کہا جاتا ہے۔ **قدر** کے معنی ہوتے ہیں: کسی پیمانے اور اندازے کے مطابق کسی شے کو ماپ دینا۔ یہ فسوی کے بعد حشو وزوائد کو زائل کر کے' اس کو ان شکلوں میں دینے کے ساتھ ساتھ' **قـــــدر** ہے۔ جس میں کہتے ہیں کہ ہر شے کا ایک پیمانہ اور Measure مقرر کر دیا کہ اس Measure (پیمانے) کے مطابق وہ یہ کچھ بنتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور آخر میں وہ اپنی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے جس کے لیے

---

❶ ہر شے کو مختلف امتزاجات اور تراکیب سے ایک ہیئت عطا کرتا ہے۔ پھر اس کے حشو وزوائد کو دور کر کے' اس میں خاص تناسب اور اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آپ کے ہاں Destiny کا لفظ کہا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ جسے اس کی آخری تقدیر کہیں گے جیسے اس صفحۂ ارض پر انسان کی یہ موجودہ ارتقائی منزل اس کی Physical life (طبعی زندگی) کی ایک کڑی ہے۔ یہ کڑی انسان کی زندگی کی نہیں یہ تو آگے بڑھنے والی چیز ہے اور یہ سارا کچھ ایک خاص پیمانے کے مطابق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی پیمانے ہیں جنہیں خارجی دنیا کے اندر آپ قوانین فطرت (Laws of Nature) کہتے ہیں۔ یہ قدر ہے یعنی یہ پیمانے مقرر کر دیئے۔

تقدیر کا غلط اور صحیح مفہوم

یاد رکھیے' جسے ہم انسان کی تقدیر کہتے ہیں وہ ایک غیر قرآنی تصور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال اور ارادہ کے اندر بھی مجبور واقع ہوا ہے' یہ سارا کچھ پہلے سے مقرر کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ ہمارے ہاں یہ تصور بھی ہے کہ یہ جنت میں جائے گا' یہ جہنم میں جائے گا' یہ بھی پہلے سے مقرر کی ہوئی بات ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ یہ مقرر کی ہوئی بات انسان کے لیے نہیں ہے۔ تقدیر وہ قوانین ہیں جن کے مطابق انسان وہ کچھ بنتا چلا جاتا ہے جو کچھ اس نے بننا ہے اور اسکی آخری منزل جس تک اس نے اس صفحۂ ارض کے اوپر پہنچنا ہے' اسے اس کی تقدیر کہیں گے۔ یہ اسکے بننے کا امکان ہے۔ جو بھی اس امکان کو حاصل کرنا چاہے وہ کوشش کرے' اسکے مطابق کام کرے' وہ اُس امکان کے مطابق بن جائے گا۔ جو یہ کچھ حاصل نہیں کرے گا' ضائع ہو جائے گا یعنی اسے وہ کچھ خود قدرت نہیں بناتی' اس نے خود بننا ہے لیکن بنے گا ان پیمانوں کے مطابق۔ بیمار کا علاج دوائیوں سے ہوتا ہے۔ دوائیاں بوتلوں میں بند کی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ وہیں کی وہیں پڑی ہوئی اسے شفا نہیں دیتیں۔ ان کا استعمال اس نے خود کرنا ہوتا ہے۔ جو انہیں استعمال کرے گا' اس قانون کے مطابق اس کی تقدیر بدل جائے گی' شفا حاصل ہو جائے گی۔ جو ان دوائیوں کے مطابق علاج نہیں کرے گا' وہ خود مریض رہے گا' اس کے بعد وہ مر جائے گا۔ یہ اس کے اختیار و ارادہ کی بات ہے' از خود فطرت اسکے لیے یہ کچھ نہیں کرے گی۔ یہ چیز اگلے ہی لفظ کے اندر طے کر دی کہ فَهَدٰى (87:3) ہر شے کے اندر یہ چیز رکھ دی کہ اُس نے کون سے راستے پہ چلنا ہے کہ وہ اپنی تقدیر تک پہنچ جائے۔ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات کی ہر شے کے اندر اس نے وحی کر دی ہوئی ہے۔ یہ وحی وہی ھدیٰ ہے یعنی اس کو راستہ دکھا دینا۔

خارجی کائنات کے لیے ہدایت اس کے اندر رکھ دی گئی ہے

فطرت کی طرف سے یہ راستے دکھانے کا عمل ایسا عجیب وغریب ہے کہ جو انسان' یعنی Scientists (سائنسدان) اس میدان میں تحقیق کر رہے ہیں انہوں نے ایک ایک شے کو لیا ہے۔ ان پہ Study (مطالعہ) کرتے ہوئے عمریں صرف کر دی ہیں۔ اس کے بعد نتیجے پہ پہنچ کر وہ محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ کس طرح ہر شے کے اندر وہ سارے قانون داخل کر دیئے گئے ہیں جن کے مطابق انہوں نے وہ کچھ بننا ہے جو کچھ بننا ان کا مقصود ہے۔ خارجی کائنات ہو' نباتات ہوں یا حیوانات ہوں' ان کی طرف رسول نہیں آتے۔ ان میں سے ہر شے' اور ہر

شے کے ہر فرد (Species) کے اندر یہ چیز رکھ دی گئی ہے۔ وہاں ہدایت کا سلسلہ یہ ہے کہ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ مرغی کے نیچے آپ کچھ مخلوط انڈے رکھیے: مرغی کے بھی اور بطخ کے بھی۔ وہ انہیں سینچے گی۔ ان میں سے جس دن بچے نکلیں گے تو آنکھ کھولتے ہی بطخ کے بچے بھاگ کر پانی کی طرف چلے جائیں گے مرغی کے بچوں کو آپ گھیر کر بھی پانی کی طرف لائیں گے تو وہ بھاگ کر خشکی کی طرف چلے جائیں گے۔ کون سے رسول نے ان کو یہ تبلیغ کی کونسے استاد نے ان کو یہ سکھایا' کہاں سے اس ایک حصار کے اندر جہاں باہر کی روشنی تک نہیں پہنچ رہی تھی وہ انڈے کا خول جس کے اندر یہ بند تھے ان دونوں کو کس نے الگ الگ تعلیم دی؟ اور پھر آپ نے دیکھا ہوگا کہ مرغی کے ان دونوں قسم کے بچوں نے چیل تک نہیں دیکھی اگر ان کے اوپر سے چیل کا سایہ گزر جاتا ہے تو وہ بھاگ کر مرغی کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے نہ بلی دیکھی ہے مگر جب بھی بلی کی میاؤں کی آواز ان کے کان میں آئے گی آپ دیکھنا کس طرح وہ بھاگ کر چھپ جاتے ہیں کتے کے آواز سے وہ نہیں چھپتے۔ انہیں یہ کچھ کس نے سکھا دیا؟ یہ چیز ہر شے کے اندر موجود ہے اور یہاں تو پھر بھی آپ کو یہ زندگی مشہود شکل میں نظر آتی ہے قرآن نے جو مثال دی ہے وہ اس سے بھی نازک ہے۔ میں اسے سامنے لاتا ہوں۔ ذرا اتنا ننھا سا بیج تو دیکھیے۔ خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھیے کہ اس بیج کے اندر ہمیں کچھ چھپا ہوا نظر بھی آتا ہے۔ اتنا ننھا سا بیج مٹی کے اندر دبا دیا ہے۔ اب اس بیج میں سے اگر ببول کا بیج ہے تو کانٹے دار کیکر پیدا ہوگا' انگور کا بیج ہے تو وہ نہایت حسین و نازک آویزوں جیسے گوشے لگنے والی بیل پیدا ہو رہی ہے۔ وہ کڑوا ہے' یہ میٹھا ہے۔ وہ نہایت ناپسندیدہ ہے' یہ خوشگوار ہے۔ یہ انگور کا ایک ذرا سا ذرہ' اس کے ساتھ ہی ببول کا بیج' زمین کی ایک ہی جگہ میں آپ دونوں مدفون کرتے ہیں۔ ایک جیسا پانی دیتے ہیں' ایک جیسی ہوا ہے' ایک جیسی سورج کی کرنیں ہیں' اور وہ دونوں نشو و نما پا رہے ہیں۔ ساری جتنی چیزیں نشو و نما کی ہیں ان کے لیے مشترکہ ہیں۔ ایک ان میں سے نہایت بدبودار' کڑوا کانٹوں والا بن رہا ہے' دوسرا ان کے اندر سے اگر چنبیلی ہے تو پوچھیے نہیں اس کی وہ یاسمین کی خوشبو' اگر وہ اس میں سے انگور ہے تو اس کا ذائقہ کیا خوب ہے۔

ہر شے کے لیے پیمانے مقرر ہیں

اس بیج کے اندر یہ چیز کس نے رکھ دی؟ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ انگور کے بیج سے ببول پیدا ہو جائیں اور ببول کے بیج سے آپ انار پیدا کر لیں۔ ان کے اندر یہ ہدایت رکھ دی گئی ہے۔ ہر شے کے اندر یہ ہدایت رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد انہیں کسی اور چیز کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ خَلَقَ [1] (87:2) ابتدا دی' پھر فَسَوّٰی [2] (87:2)، حشو و زوائد سے پاک کیا' اعتدال کی ایک شکل دی۔ قَدَّرَ [3] (87:3) پیمانہ

---

[1] ہر شے کو مختلف امتزاجات اور تراکیب سے ایک ہیئت عطا کرتا ہے۔

[2] پھر اس کے حشو و زواید کو دور کر کے' اس میں خاص تناسب اور اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔

[3] پھر اس میں ایک خاص اندازے اور پیمانے (Measure) کے مطابق' ایک حد تک بڑھنے' پھولنے' پھلنے کی صلاحیت رکھ دیتا ہے۔ (اسے اس شے کی تقدیر کہتے ہیں۔) (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

مقرر کیا' قوانین دے دیئے' فَهَدٰى (87:3) ❶ اس کے مطابق چلنے کے لیے ہدایت دے دی۔ ان چار الفاظ میں' عزیزانِ من! بتا دیا کہ اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی کارفرمائی کس طرح ہو رہی ہے۔ یہ ان چار الفاظ کے اندر اس ''اعلیٰ'' کی تفسیر ہو رہی ہے اور قرآن مثال وہ لایا ہے۔ ویسے حجریات کی دنیا میں' پتھروں کی دنیا کے اندر' In-organic matter (غیر نامیاتی مادہ) میں بھی یہ چیز آ سکتی تھی لیکن چونکہ وہ غیر معروف سی تھی اس لیے قرآن وہاں نہیں گیا۔

گھاس کی مثال

اَلَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى (87:4-5) ❶ ۔ یہاں کہا ہے کہ بڑی بڑی چیزوں کو چھوڑ دیجیے۔ عرب بادیہ نشین تھے' نخلستان میں چشموں کے گرد' جہاں وہ اپنے خیمے گاڑ لیتے تھے' وہاں گھاس تو کم از کم ہوتی ہی تھی۔ کہا کہ ممکن ہے کہ اور زیادہ چیزیں تو تم نے نہ دیکھی ہوں' اس گھاس کو ذرا دیکھ ہی لیجیے کہ یہ کس طرح پیدا ہوتی ہے' کیسے نشوونما پا رہی ہے۔ نشوونما پانے کے بعد اب یہ قدر یعنی اس کی Destiny (منزلِ مقصود) مقرر ہے۔ اس لیے کہا کہ **فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى** (87:5) وہ ایک سمت تک پہنچتی ہے' نشوونما پاتی ہوئی۔ اسکے بعد وہ سوکھتی ہے' سوکھنے کے بعد کوڑا کرکٹ سی بنتی ہے۔ وہ اپنا رشتۂ حیات اس سرچشمہ حیات سے جو اس کو نشوونما دے رہا ہوتا ہے منقطع کر دیتی ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ ہر فصل' ہر پودا' ایک خاص حد تک پہنچ کر' نشوونما پاتا ہے۔ پھر وہ سبز سے خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اگر اس کو وہاں سے کاٹا نہ جائے تو اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ دیکھو تو سہی' وہ کیسے خود بخود کیا ہو گیا؟ کوڑا کرکٹ ہو گیا۔ تو یہ ہے ان چیزوں کی تقدیر: **الَّذِیْ خَلَقَ' فَسَوّٰى' وَالَّذِیْ قَدَّرَ' فَهَدٰى** ۔

انسان کے لیے ہدایت کا ضابطہ

عزیزانِ من! یہ چیزیں اس طرح سے ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن انسان کے بچے میں یہ چیز نہیں رکھی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی

---

❶ اس کے بعد اُسے وہ راستہ دکھا دیتا ہے جس پر چلنے سے وہ شے اپنی تکمیل تک پہنچ سکتی ہے۔ (یہ راہنمائی کائنات کی ہر شے کے اندر رکھ دی جاتی ہے۔ اسے اس شے کی فطرت یا جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے۔

❶ (مثلاً) زمین میں تخم ریزی کی جاتی ہے' تو وہ دانہ' خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق' ہرے بھرے چارہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے مویشیوں کی پرورش ہوتی ہے۔ لیکن یہی چارہ' جب حیات بخش عناصر سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے' یا اُس پیمانے (Measure) کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا' تو وہ خشک ہو کر خس و خاشاک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ (اس کی یہ زندگی' نمود اور پھر موت' سب خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے جسے ہر شے کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کا تعلق ہے' اسے تو چھوڑ دیجیے لیکن اس نے تو انسانی سطح پر زندگی بسر کرنی ہے۔ انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کی ہدایت انسان کے اندر نہیں رکھی گئی۔ جو نہیں رکھی گئی تو یہ بہت بڑی حکمتِ خداوندی ہے۔ یہ بڑے غور سے سننے کی چیزیں ہیں۔ عزیزانِ من! پتہ نہیں' زندگی میں دوبارہ یہ وقت آئے یا نہیں۔ کائنات میں جس شے کے اندر ہدایت رکھ دی گئی ہے' جس کے اندر وحی کر دی گئی ہے' وہ اس ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کائنات کی کسی شے کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کر سکے جو اس کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی' وہ مجبور ہے' صاحبِ ارادہ نہیں ہے۔ کائنات کی کسی شے کے متعلق یہ نہیں کیا گیا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [1] (18:29) ان میں سے جس کا جی چاہے اس کے مطابق چلے' جس کا جی چاہے اس راستے کو چھوڑ کر اس کے خلاف چلے۔ اس ارتقاء کی منزل میں انسان وہ سرسبد ہے جہاں پہنچ کر یہ چیز اس کو حاصل ہو گئی ہے کہ یہ ہے قانون۔ اب جس کا جی چاہے اس کے مطابق چلے اور جس کا جی چاہے اس کے خلاف چلے۔

انسان کے لیے اختیار و ارادہ کی نعمت

اگر انسانوں کے اندر بھی یہ قانون رکھ دیا جاتا تو انسان بھی خارجی کائنات کی اشیاء کی طرح مجبور ہو جاتے' شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتے۔ یہ ان کا اختیار و ارادہ ہی تو ہے جس نے انہیں اس کائنات میں سب سے زیادہ اعلیٰ مقام پر کھڑا کر دیا ہے' ساری کائنات پر اختیار و ارادہ کا مالک خدا' اور اس کے نیچے اس صفحۂ ارض پر انسان اور یہ اسی لیے ہے کہ اس کے اندر یہ چیز نہیں رکھ دی گئی۔ پھر سوال یہ ہے کہ خدا کی طرف سے یہ کیسے ملے گی۔

انسان کے لیے ہدایت کا طریق کار

وحی کے لیے وہ ایک فرد کا انتخاب کرتا ہے' اس کی طرف یہ وحی بھیجتا تھا۔ یہ وحی اس فرد کی پیدا کردہ تخلیق نہیں تھی۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی تھی۔ وہ فرد' جسے آپ رسول یا نبی کہتے ہیں' اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا۔ یہ جتنے قوانین اشیاء کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے وہ ایسے محفوظ ہیں کہ کوئی خارجی اثر ان کے اوپر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ انسانوں کو یہ جو وحی دی گئی تھی اسے بھی اس قسم کا ہونا چاہیے تھا کہ اس کے اندر سے نہ تو کوئی چیز بھلائی جا سکے' نہ اس میں سے کوئی چیز ترک کی جا سکے' نہ اس میں کسی چیز کی آمیزش ہو سکے۔ جبھی اس کو حق حاصل تھا قانون بنانے کا۔ قانون میں اگر کوئی غیر چیز کی آمیزش ہو جائے تو وہ قانون رہتا ہی نہیں ہے۔ اس قانون کو' اس ہدایت کو اس قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ کہا کہ یہ جو ہدایت کا سلسلہ تھا: فھدی زندگی' نشوونما اور موت کا' یہی قانون انسانوں کی

---

[1] جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

طرف بھی کارفرما ہے لیکن اس قانون کا علم (اشیائے فطرت کی طرح) انسان کے اندر نہیں رکھ دیا گیا۔ یہ راہنمائی اسے اس وحی کے ذریعے ملتی ہے جو انبیاء کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتی ہے۔ یہ وحی اے رسول! ہم نے اس اہتمام سے تجھے دی ہے کہ سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ❶ (87:6) یہ چیز، اے رسول! ہم نے تمہیں دی ہے۔ اب یہ جو لفظ قرأت ہے، جسے ہم قَرۡءٌ کہتے ہیں، یہیں سے یہ لفظِ قرآن بنا ہے۔ اس کے عام معنی پڑھنا کیا جاتا ہے مگر اس کے بنیادی معنی پڑھنے کے نہیں ہوتے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی شے کو جمع کر کے محفوظ کر دینا۔'' یہ قرآن اس لیے قرآن ہے کہ اس میں یہ سارے قوانین خداوندی جمع کر کے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں دو شرطیں ہوتی ہیں تو پھر قرآت ہوتی ہے: سَنُقۡرِئُکَ (87:6) یہ وحی، یہ ہدایت، جو انسانوں کے لیے ہے، یہ اے رسول! ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ ہم اس چیز کو جمع کریں گے۔

قرآنِ حکیم کے متعلق تاریخی روایات

ہمارے ہاں یہ تاریخی روایات آ رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی ساری وحی کو اسی طرح سے دے کر گئے کہ یہ کھجوروں کے پتوں پہ، ہڈیوں پر، ٹھیکریوں پر بکھری ہوئی تھی پھر رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کی ڈھونڈنا پڑی، تلاش ہونی شروع ہوگئی۔ یہ لمبا قصہ ہے، آپ کو سب معلوم ہے کب تک دہرائے چلے جاؤں۔ کچھ ملا، کچھ نہ ملا، بعض آیات ایسی تھیں جو کھجور کے پتوں پہ لپٹی ہوئی تھیں انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بکری کھا گئی (معاذ اللہ)۔

قرآنِ حکیم کے لغوی معنی

عزیزانِ من! لفظ قرآت میں ساری چیز موجود ہے۔ قرآن تو اس طرح سے جامع واقع ہوا ہے، ان الفاظ قرآن کے اندر یہ چیز موجود ہے۔ ''جمع کرنا اور محفوظ کرنا'' دونوں اس لفظِ قرآن کے لغوی معنی ہیں۔ جو جمع اور محفوظ نہ ہوا، اسے قرآن کہا ہی نہیں جا سکتا، اس کی قرآت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں کہا ہے: سَنُقۡرِئُکَ (87:6) ہم جمع کریں گے، ہم اسے محفوظ کریں گے۔ اس کا نتیجہ ہوگا: فَلَا تَنۡسٰۤی (87:6)۔ تَنۡسٰۤی، نسیہ کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو ترک کر دینا'' اور بعد میں یہ لفظ بھلا دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ جسے آپ لفظ نسیان کہتے ہیں بنیادی طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو ترک کر دینا''، لیکن اس میں دونوں معنی آ جاتے ہیں: ہم اس کو جمع کریں گے، ہم اس کو تیرے پاس محفوظ کریں گے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ تو نہ اس میں سے کوئی چیز بھلا سکے گا، نہ تُو اسے ترک کر سکے گا۔ قرآن بتا رہا ہے کہ یہ نہ بھلایا گیا، نہ ترک کیا گیا۔ خدا جمع کر رہا ہے اور خدا نے جمع کرنے کے بعد اتنی بڑی شہادت دی۔ کہا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) ہم اس کو نازل کر رہے ہیں ہم اس کے محافظ ہیں۔ یہاں حافظون کہہ دیا

---

❶ تو اس میں سے نہ کچھ بھول سکتا ہے، نہ ترک کر سکتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں صیغہ فاعلون کا استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''ہم اس وقت بھی یہ کر رہے ہیں اور کرتے چلے جائیں گے۔'' اس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا لیکن گنجائشیں نکالنے والے بھی ہم خود ہیں۔ وہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ادھر سے ہمارے ہاں انسانوں کا قانون بنتا ہے اور اسی وقت قانون شکن سوچ لیتے ہیں کہ اس سے نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔ یہ قانون شکنی کی وارداتیں تو بہت کم ہوتی ہیں، یہ جسے law off کہتے ہیں، یہ ہوتا ہے۔ معاشرے میں جو کچھ عام ہوتا ہے، اس میں سے راستہ نکلتا ہے۔ اسی ذہنیت نے قرآن جیسے جامع ضابطہ قانون میں، اس قسم کے راستے تلاش کر لیے۔ اس کے آگے لفظ ہے **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** (87:7)۔ اس کا ترجمہ کر دیا کہ ہاں، مگر جو خدا کو منظور ہو۔ خدا جمع کرے گا، خدا محفوظ کرے گا، تُو بھلا نہیں سکے گا، تو ترک نہیں کر سکے گا اور اس کے بعد ''مگر جو خدا کو منظور ہو۔'' اب سب کچھ یہیں آ گیا۔ ترک بھی ہے، بھلایا بھی جا رہا ہے، گم بھی ہو سکتا ہے، غیر محفوظ بھی ہے، چوتھائی حصہ کہیں چلا گیا پتہ ہی نہیں چلا کہ صاحب! یہ کیسے ہوا۔ اس بارے میں **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** بھی کہہ دیا۔ **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ**!!

قرآنِ حکیم کے مطابق خدا کی حیثیت

سنیے کہ یہ الا ماشاءاللہ چیز کیا ہے۔ اگر پہلی چیز یہی لی جائے کہ ''بجز اس کے کہ خدا کی حیثیت یوں ہے۔'' اس کا جو ترجمہ کیا جائے گا اس کی پہلی شے تو یہ ہوگی کہ ''قرآن نے کہیں یہ بات بتائی ہے کہ خدا کی مشیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس میں سے کچھ بھلا دیا جاتا، کچھ ترک ہو جاتا۔ اگر وہ خود ہی یہ کہہ دے کہ ہماری مشیت یہ تھی ہی نہیں، ہماری مشیت یہ ہے ہی نہیں، تو پھر بھی اس کے معنی صاف ہو گئے کہ ہاں! اگر خدا کی مشیت یہ ہوتی تو پھر تو یہ ہو سکتا تھا کہ تو بھول جاتا، ترک کر جاتا لیکن اگر اس نے یہ کہا کہ ہماری مشیت یہ ہے ہی نہیں یا تھی ہی نہیں، تو پہلے تو یہ سورۃ بنی اسرائیل کے اندر لے لیجیے کہ **وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ** (17:86) اگر ہماری مشیت میں یہ بات ہوتی تو ہم یقیناً جو کچھ تیری طرف وحی کیا گیا ہے اس میں سے کچھ لے جاتے۔ **اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ** (17:87) لیکن نہیں، یہ تو ہم نے بطورِ رحمت تمہیں دیا ہے تو اس میں سے لے جانے کے کیا معنی؟ خود ہی اس نے بات صاف کر دی۔ یعنی خود ہی یہ کہہ دیا کہ ٹھیک ہے اگر ہماری مشیت میں یہ بات ہوتی کہ ہم نے جو دیا ہے تو وہ ہم لیجاتے یعنی ہماری مشیت میں، ہمارے قانون میں، اگر یہ بھی ہوتا کہ جو دیا ہے، اسمیں سے کچھ لے جانا ہے، تو اس میں کونسی بات مانع تھی لیکن ایسی صورت نہیں ہے، یہ ہماری مشیت ہی نہیں تھی۔ مشیت یہ تھی کہ اس کو محفوظ کریں، اس کو جمع کریں، اس لیے **فَلَا تَنْسٰٓی** (87:6) تُو نہ خود بھول سکے، نہ ترک کر سکے۔ اب یہ رہا **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** (87:7)۔ میں کہا کرتا ہوں کہ عربی زبان کی دشواری یہ پیش آ جاتی ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ کا مفہوم یہ اپنے ہاں اردو پنجابی میں لیتے ہیں، دوسری زبانوں میں لیتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** کے تو معنی وہ ہوتے ہیں جیسے انشاءاللہ کے ہوتے ہیں: وعدہ کیا ہے، اس کے بعد آؤ گے ناں چار بجے؟ کہا: انشاءاللہ۔ انشاءاللہ کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ سچ ہی نہ مان لینا بھئی! ہمارے

ہاں اسی وقت بے تکلف دوست کہہ دیتا ہے کہ بھائی! یہ انشاءاللہ کی بات تم چھوڑو۔ ایمان سے کہو: آؤ گے یا نہیں؟ یعنی اسی وقت پتہ ہوتا ہے کہ اس نے جو یہ بات کہہ دی ہے' انشاءاللہ' تو ابھی سے اس کے دل میں چور ہے۔ ہم اللہ کو لاتے ہی اس وقت ہیں جب کہیں سے ہم نے پھر جانا ہو' جب کوئی اور چیز کام نہ دے' تو اس وقت اسے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان میں سے لوگوں کو دیکھو۔ یہ خدا پہ جو ایمان لاتے ہیں تو انہوں نے خدا کو "ظهريه" بنا رکھا ہے۔ "ظهريه" ہوتا ہے جو آپ کے ہاں فلموں کی کاسٹ کے اندر ایکسٹرا (Extra) ہوتے ہیں' کرکٹ کی ٹیم کے اندر' ایک کھلاڑی فالتو (Extra) رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اصل کام تو اس الیون نے دینا ہوتا ہے اور اگر کہیں ایسی ڈھیل پڑ گئی کہ ان میں سے کوئی بیمار ہو گیا' کوئی آفت زدہ ہو گیا اور کوئی کام نہ چلے تو پھر اس کو لے آئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے خدا کو بھی کچھ اسی قسم کا سمجھ رکھا ہے۔ کم تے چلاوندے ہے گے نیں اپنی تدبیراں نال۔ جتھے او ویکھدے نیں او پئی او کوئی کم نی ہون دیندے ہیگے پھس چکے ہیگے آں۔ او تھے اسی اللہ نوں اگاں کر دیندے آں۔ ❶ سمجھ میں بات نہیں آتی' کوئی ہمارے اندر کا وہ چور رہنے ہی نہیں دیتا۔ دیکھیے تو سہی کہ آج خدا کو نہ ماننے والوں کو تو چھوڑیئے' وہ جو مانتا ہی نہیں ہے وہ اس کی حیثیت سے بھی واقف نہیں' اور ہم جو قدم قدم پر خدا اور اسلام کا نام لے کر آتے ہیں' کیا یہ وہی بات نہیں ہے کہ جہاں بے ایمانی مقصود ہوتی ہے' ہمارے ذہن کے اندر جہاں کوئی اور دلیل نہیں آتی' جہاں ہم نے فریق مقابل کو کسی نہ کسی طرح سے خاموش کرنا ہوتا ہے' وہاں ہم خدا اور رسول لے آتے ہیں' وہاں ہم اسلام کا نام لے آتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جیسے وہاں انشاءاللہ' اسی طرح سے الا ماشاءاللہ ہے۔

استثناء بالمشیت کا استعمال اور اس کا مفہوم

عزیزانِ من! عربی زبان میں بھی اور سارے قرآن کے اندر بھی ایک چیز ہوتی ہے جسے اصطلاح میں "استثناء بالمشیت" کہتے ہیں۔ اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی کسی چیز کے متعلق یہ آئے جو خدا نے کہا ہے کہ ہم ایسا کرتے ہیں اور اس کے بعد استثناء کا' Exception کا "الا" آئے اور اس "الا" کے بعد مشیت کی بات ہو' یعنی یہ ہو کہ ہمارے قانونِ مشیت میں یہ ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اس استثناء بالمشیت کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ خدا کہنا یہ چاہتا ہے کہ یہ چیز از خود ایسے نہیں تھی کہ یہ یوں نہ ہو جاتا' ہماری مشیت تھی کہ یہ اس طرح سے ہو' اس لیے ہو کر رہے گا' اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ **الا ماشاء الله** وہاں بولتے ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ آیا ہے' وہ مقامات نکال کر دیکھیے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اس میں Exception (استثنا) دی ہوئی ہے کہ یہ تو نہیں کر سکتا' **الا ماشاء الله**' مگر جیسا ہم چاہیں یعنی پھر اس کے بعد ہم جو جی چاہیں وہ کر دیں۔" یاد رکھیے اس کے یہ معنی

---

❶ کام تو اپنی تدابیر سے چلاتے ہیں' مگر جہاں وہ دیکھتے ہیں کہ وہ کوئی کام ہی نہیں ہونے دیتے' اور سمجھتے ہیں کہ پھنس چکے ہیں تو وہاں وہ خدا کو آگے لے آتے ہیں۔

نہیں ہوتے۔ **الا ماشاء اللہ** استثناء بالمشیت ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اگر یہ ایسا ہو سکنے والا ہوتا تو ہم اس کو ایسا بناتے ہی نہیں' یہ ہماری مشیت میں ہی نہیں تھا کہ ایسا ہو' اس لیے التزاماً استمراراً ایسا ہی ہوگا جو کہا جا چکا ہے۔اس میں استثناء ہی نہیں ہے۔یعنی جو الفاظ ایک شے کو اتنا پختہ کرنے کے کے استعمال ہوئے تھے' انہی الفاظ کے معنی ہم یہ لیتے ہیں کہ اس میں اللہ کی مرضی ہے' اس میں اس کی مرضی تھی' اتنا قرآن دیا' اس میں سے اتنا نکال کے لے گیا۔اوہدا قرآن' اوآپے لے گیا۔اے اوہدے تے رپٹ لکھاو گے ہن تسی ؟ ❶ **الا ماشاء اللہ** اگر وہ ہونا ہوتا تو ہم ایسا کرتے ہی نہیں۔تم جانتے ہی نہیں ہو کہ ہماری مشیت کیا ہوتی ہے۔مگر ہمارے ہاں کی مشیت (معاذ اللہ) مہاراجہ رنجیت سنگھ (1839-1780) کی سی ہے کہ "اس کے حکم نئیں ہوندے: کدی ایوں کر دتا کدی ایوں کردتا۔ ❷

عزیزانِ من! مشیت تو خدا کے اُس قانون کا نام ہے جو عالم امر کے اندر بنتا ہے۔کوئی قانون جو عالم امر میں آ جاتا ہے اسے وہ اپنی سنت کہتا ہے: "ہم اس کو جمع کریں' ہم اس کو محفوظ کریں' کوئی اس میں نہ کچھ ملا سکے گا' نہ ترک کر سکے گا۔اس لیے کہ ہماری مشیت کا یہ فیصلہ ہے۔" یہ ترجمہ ہے' برادرانِ عزیز! ان آیات کا۔قرآن کا ایک ایک حرف' اپنی اصلی شکل کے اندر' ان دفتین کے اندر' محفوظ چلا آتا ہے۔ جو آج ہمارے ہاں موجود ہے یہ اسی ترتیب کے ساتھ اسی طرح کتاب کی شکل میں مدون' مرتب' محفوظ' جمع کیا ہوا' نبی اکرم ﷺ نے امت کو دیا اور اُس وقت سے آج تک اسی طرح چلا آ رہا ہے اور چلتا چلا جائے گا۔جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا لے۔دنیا کا کوئی حادثہ اسکے اندر کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔اگر کسی کو اس چیز کے اوپر بھی شک ہے اور یہ ایمان نہیں ہے تو پھر سارے قرآن کے اوپر ہی ایمان اٹھ جاتا ہے پھر یہ سوال ہی نہیں کہ کیا آیا تھا' کیا باقی رہ گیا۔باقی مذاہب کی کتابوں کے اوپر ہمارا سارا اعتراض ہی یہ ہے ورنہ ان کے منجانب اللہ ہونے پہ تو ہمارا ایمان ہے۔قرآن کی رُو سے' وہ ایمان یہ ہے کہ وہ اپنے نبی کے اوپر تو صحیح' اپنی اصلی شکل میں اتری تھیں' اس کے بعد وہ اس شکل میں محفوظ نہیں رہیں جبھی تو یہ دوسری کتاب کی ضرورت پڑی اور اگر اس کے متعلق بھی ہمارا ایمان یہ ہو تو یہ بھی وہ جو Original تھی وہ نہیں رہی تو ان کے ہاں تو پھر بھی گنجائش تھی کہ وہ اپنے نبی کے بعد ایک دوسرے نبی کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ نہیں رہی' تو خیر' چند دن کی بات ہے' ایک اور نبی آنے والا ہے' وہ آ کر اس کو پورا کر دے گا۔اب اگر یہی کچھ ہمارے ساتھ ہے تو ختم نبوت کا تصور تو غتر بود ہوا۔ایسا نہیں ہے۔

ختم نبوت کے معنی

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ آپ کہاں کے رہے۔عقیدہ یہ ہے کہ وہ کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں رہی۔دوسرا عقیدہ یہ

---

❶ اسی کا قرآن تھا وہ خود ہی لے کر چلتا بنا۔کیا تم اب اس پر تھانے میں ایف آئی آر (FIR) درج کراؤ گے؟

❷ اس کے حکم تو بس یہ ہیں کہ کبھی یوں کر دیا اور کبھی اسی پہ ووں کر دیا: نہ قاعدہ نہ قانون۔

ہے کہ اب کوئی نبی آنا نہیں ہے۔ آپ لوگ تو ان سے بھی گئے گزرے ہوگئے۔ ختم نبوت کے معنی یہ تھے کہ خدا نے جو کچھ انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجنا تھا ایک تو یہ ہے کہ وہ مکمل ہوتا: **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** ❶ (6:116) وہ ہدایت مکمل ہوتی اس کے لیے کسی سپلمنٹری کی ضرورت نہ پڑتی' نہ کسی آنے والے کی کہ وہ آ کر اس میں اضافہ کرے گا' پھر یہ ایسی اصولی ہوتی کہ زمانوں کے تبدیلی احوال سے اس کے اندر کسی تبدیلی کی ضرورت نہ پیش آتی۔ اس کے لیے کہا کہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ** (6:116) اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا' یہ مکمل ہوگئی اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ تیسری چیز یہ ہوسکتی تھی کہ تھی تو یہ ویسی' لیکن یہ اپنی اصلی شکل میں رہی نہیں۔ اس کے لیے کہا کہ **وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس طرح یہ قرآن مکمل ہے' غیر متبدل ہے' خود خدا اس کا محافظ ہے۔ جب یہ چیز ہو جائے تو اس کے بعد آپ سوچیے کہ اس کا Logical Consequence یعنی منطقی نتیجہ یہ ہے کہ نبوت ختم ہو جائے۔ نبی تو آتا ہی وحی لے کر ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ صاحب! نبی کی Definition ہی بدل گئی کہ جی! وہ نبی تو آتا ہے مگر وحی نہیں لاتا۔ برادرانِ عزیز! وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ چیٹھی رسان تو آتا ہے مگر چیٹھی نہیں لاتا۔ تے تہانوں پتہ اے ناں اس طرح چیٹھی رسان کدوں آوندے ہوندے نیں؟ عیدوالے دن آوندے ہوندے نیں۔ او عیدیاں لین ای اوندے نیں فیر ایہوں جئے۔❷ **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** (87:7) خدا کی مشیت میں یہ ہے کہ ہم جمع کریں گے' ہم محفوظ کریں گے' تو نہیں بھلا سکے گا' تو نہیں ترک کر سکے گا۔ کیا بات کس انداز سے ہے! اگر ایسا ہوسکنا ہوتا تو ہماری مشیت کچھ اور کرتی۔ **اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ** ❸ (87:7) ہماری مشیت یہ تھی کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ دیا کا ہے کے لیے **اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى** ❹ (87:7)۔ ایک تو انسان کی طبعی زندگی کی وہ خصوصیات اور صلاحیتیں ہیں وہ ساری سامنے ہوتی ہیں۔ کہا کہ اس کے کچھ ایسے بھی امکانی جوہر Realizable Potentialities ہیں جو چھپے ہوئے (Dormant) ہیں' مضمر ہیں' مشہود ہو کر سامنے نہیں آئے' پیدائش کے ساتھ ہی یہ نہیں ہوا' وہ Un-developed (غیر نشوونما یافتہ) ہیں' ان کی Development (نشوونما) کی ضرورت ہے۔ یہ انسان کی وہ صلاحیتیں ہیں جو مخفی ہیں' جو مضمر ہیں' جو

---

❶ اس قرآن میں' خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ آپ کو معلوم ہے کہ اس طرح چھٹی رسان (ڈاکیا) کب آتے ہیں؟ وہ عید والے دن ہی آتے ہیں۔ تو پھر وہ عیدی ہی لینے آتے ہیں صرف۔

❸ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (87:6-7) اگر خدا کی مشیت ہوتی' تو' تو اس میں سے کچھ بھول سکتا (اور ترک کر سکتا) تھا۔ لیکن اس کی مشیت ایسی نہیں تھی اس لیے تو اس میں سے کچھ بھی ترک یا فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ حتمی بات ہے۔ (ایضاً)

❹ یہ وحی اس خدا کی طرف سے دی گئی ہے جو جانتا ہے کہ انسان میں کیا کیا ممکناتِ زندگی (Possibilities of Life) مضمر ہیں' اور ان میں سے کس کس جوہر (Potentiality) کی نمود (Actualization) کس انداز سے ہوسکتی ہے۔ (اس لیے ہماری یہ وحی' ہر لحاظ سے مکمل' اور اس مقصد کے لیے کافی ہے جس کے لیے دی گئی ہے' یعنی انسانی ذات (Human Personality) کی نشوونما کے لیے۔ (ایضاً)

Un-developed (غیر نشوونمایافتہ) ہیں' چھپی ہوئی ہیں' Potent form (مخفی صورت) کے اندر ہیں' latent (مخفی) ہیں' ان کو Actualize (بارز) کرنا بھی ہمارے پروگرام میں تھا۔

قانونِ خداوندی کا مقصد

ان صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے جو قانون دینا تھا وہ ہم نے قرآن کے اندر دے دیا تھا۔ یہ ہے پروگرام جس کے لیے ہم نے کہا تھا کہ تمہیں قرآن دیا ہے۔ نظر آیا کہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ اگر کسی نے **الاعلیٰ** کی ایک ہی صفتِ خداوندی کو نافذ کرنا ہو تو سوچیے کہ یہ کتنا بڑا پروگرام ہے کہ دنیا کے ہر ضابطۂ قانون سے انکار ہو اور اس کی جگہ ایک خدا کے اقتدار کو نافذ کرنا ہو۔ اس کے لیے کہا کہ نہیں' گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ **وَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْریٰ** (87:8) اگر کوئی اس ہدایت کے مطابق چلتا چلا جائے گا تو راستے آسان ہوتے چلے جائیں گے۔ قانون کے مطابق آپ جو بھی Process (طریقہ کار) استعمال کرتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ اس میں آسانیاں ہوتی ہیں' انسان ٹھوکریں تو وہاں کھاتا ہے جہاں قانون کی خلاف ورزی کرنی ہوتی ہے۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ کشتی لے کر چلیے' آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کیسے تیر کی طرح چلے جاتے ہیں۔ وہ تو چڑھتے پانی کو جاتے وقت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس لیے اس ہدایت کے مطابق تُو چلتا جائے تو بڑی آسانیاں ہوتی جائیں گی اور اس میں کرنے کا ایک کام ہے۔ وہ ہے کہ **فذکر** (87:9) تو وحی کے قانون کو عام کرتا چلا جا۔ اسے لوگوں کے سامنے پیش کیے جا۔

قرآن کی ایک اہم راہنمائی

عزیزانِ من! آگے ایک بات کہی ہے۔ کیا بتایا جائے' خدا کہنے والا ہے' ہم لوگوں کے لیے کتنی بڑی راہنمائی ہے! تم سے کہا جا رہا ہے **فَذَکِّرْ** (87:9) تو کوشش کرتا چلا جا' عام اسے کرتا چلا جا۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ ریت ہے' زمین بنجر ہے' نشوونما کی صلاحیت نہیں ہے' تو ہل چلائے جا' پانی دیئے جا' یہ کچھ کیے جا: **فذکر** تو یہی کہہ رہا تھا کہ کیے جا لیکن اگر تو دیکھ لے کہ **اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْریٰ** (87:9) اس طرح کوئی تبلیغ اور تفسیر اس شخص یا گروہ کے لیے نفع مند نہیں ثابت ہو رہی ہے' جب تو کسی مقام پہ کسی گروہ میں یہ دیکھے کہ وہاں کیفیت یہ ہو رہی ہے کہ وہ اپنے خرد سے کام ہی نہیں لینا چاہتے اور جو بات بھی تو کہتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! **اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا** (43:23) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک روش پہ پایا تھا' ہم تو اسی کے اوپر چلتے جائیں گے۔ اس مقام پہ قرآن رسول سے یہ کہتا ہے کہ اب تم ان کو حسنِ کارانہ انداز سے چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ اس لیے کہ یہ تو صرف اس کے لیے نفع بخش ہو سکتا ہے جو **سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی** (87:10) اس سے خوف کھاتا ہے کہ اگر میں نے قانون کی خلاف ورزی کی تو اس سے کتنی تباہیاں آ جائیں گی۔ جو ان تباہیوں سے خوف کھاتا ہے' وہ تو اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ عزیزانِ من! جو شخص خودکشی کرنے کا ارادہ کر کے چلا ہو اور ڈوبنے کے لیے

جارہا ہوا گر آپ اسے کہیں کہ آگے نہ جانا' پانی ہے' ڈوب جاؤ گے تو وہ کہے گا: میں تے لبھدا ای پھرنا ڈوبو پانی نوں۔ [1] تم پھر اس کے لیے دہائی دیتے رہنا کہ بچ جا بچ جا بیکار ہے۔ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى [2] (87:10) تباہی سے وہی ڈرتا ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) تو اسی کو خطرات سے آگاہ کر سکتا ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے۔ خودکشی کرنے والے کو یہ کہنا کہ سنکھیا مضر ہوتا ہے' بے کار ہے اب تو سنکھیا بھی خالص نہیں ملتا۔ کہتے ہیں کہ وہ تو وہاں چیخ اٹھا تھا کہ ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے لیکن نظر تو آ جاتا تھا کہ یہاں نہیں ڈوب سکتا' کتنی دشواری اس کی تھی۔ آج یہاں ہوتا تو ٹکر مار کے مر جاتا کہ سنکھیا کھاؤں تو پتہ چلے کہ مصری کی ڈلی تھی' سنکھیا تھا ہی نہیں۔

میں چلا اپنے رب کی طرف کا مفہوم

جو خودکشی کرنے کے لیے جائے' اس کو ڈرانے سے کیا فائدہ! کتنی عظیم چیز ہے جو یہ کہا ہے کہ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى [3] (87:9) جب تو دیکھے کہ ہاں' یہ چیز' فائدہ دے رہی ہے' اثر پیدا کر رہی ہے' تو اسے لوگوں کے سامنے پیش کیے جا اور جب یہ دیکھے کہ اب یہ ماحول اتنا خشک ہو چکا ہے کہ اس کے اندر اب کوئی انسان باقی نہیں رہا تو پھر یہ کہہ کر وہاں سے چلا جا کہ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ (37:99) ''میں چلا' اپنے رب کی طرف۔'' وہ یہ کہتا ہوا وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے کیونکہ اگر دیکھا جائے تو رب تو وہاں بھی تھا جہاں یہ بیٹھے ہوئے تھے لیکن اِس کے باوجود کہا کہ چلا میں اپنے رب کی طرف۔ پھر وہ اس طرف چلا جاتا ہے جہاں قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ داعی ساری عمر پاؤں توڑ کے وہیں نہیں بیٹھا رہتا کہ صاحب! میرا کام تو بس اس کو کہے چلے جانا ہے' اب ان کا کام ہے کہ مانے یا نہ مانے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى [4] (87:9-12)۔ یہاں کہا ہے کہ جو اس سے اعراض برتے گا' منہ موڑے

---

1. میں تو ڈوبو پانی ہی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔
2. اس لیے کہ اس سے وہی شخص فائدہ اٹھائے گا جو عاقبت اندیش ہوگا' جسے اپنے نفع نقصان کا خیال ہوگا' جو غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہے گا (2:2)
3. سو تو اس وحی کو لوگوں کے سامنے پیش کیے جا لیکن جب تو دیکھے کہ جس شخص یا گروہ کو تو نصیحت کر رہا ہے وہ اس سے مستفید ہونا ہی نہیں چاہتا' تو اُسے چھوڑ دے (اور یہی وقت اور توانائی ایسی جگہ صرف کر جہاں تیری تعلیم نتیجہ خیز ہو)۔ (15:75; 73:10)
4. سو تو اس وحی کو لوگوں کے سامنے پیش کیے جا لیکن جب تو دیکھے کہ جس شخص یا گروہ کو تو نصیحت کر رہا ہے وہ اس سے مستفید ہونا ہی نہیں چاہتا' تو اُسے چھوڑ دے (اور یہی وقت اور توانائی ایسی جگہ صرف کر جہاں تیری تعلیم نتیجہ خیز ہو)۔ (15:75; 73:10)۔ اس لیے کہ اس سے وہی شخص فائدہ اٹھائے گا جو عاقبت اندیش ہوگا' جسے اپنے نفع نقصان کا خیال ہوگا' جو غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہے گا (2:2)۔ جو شخص اس سے کنارہ کش رہے گا وہ تیرا یا کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ وہ خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہے گا' اور یوں بڑا بدقسمت ہوگا۔ وہ تباہیوں کے اس جہنم میں داخل ہوگا جو سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ (2-3-4 مفہوم القرآن۔ پرویز)

گا' اُس کے لیے لفظ **اَلۡاَشۡقَی** (87:11) کہا ہے یعنی وہ جو خود اپنے آپ کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رکھنا چاہتا ہے' وہ اس سے منہ موڑ لے گا اور جو تیرے سامنے سے منہ موڑ کے چلدے اسے تمہاری یہ نصیحت کیا فائدہ دے گی۔ وہ جائے گا۔ دیکھو' جہاں سے منہ موڑ کر وہ چلا' یہیں سے آواز دی کہ دیکھو' یہ چلا ہے۔ کہاں جائے گا؟ جواب دیا کہ جائے گا' جہنم کے گڑھے کے اندر: **اَلنَّارَ الۡکُبۡرٰی** (87:12) جو سب کچھ **یَصۡلٰی** (87:12) یعنی جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔

جہنم کی آگ سے مراد کون سی آگ ہے؟

عزیزانِ من! یہاں نظر آتا ہے کہ ایک نارِ الصغریٰ ہے اور ایک **النار الکبریٰ** ہے۔ اس دنیا کی زندگی کے اندر کا جو جہنم ہے وہ بھی جہنم ہے' لیکن یہ **النارِ الصغریٰ** ہے اور یہی شعلے زیادہ بھڑکتے ہوئے آگے پہنچے ہیں' تو مرنے کے بعد کی زندگی کے اندر یہ النارِ الکبریٰ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اس النار کے اندر کیا ہوگا؟ اتنی زیادہ بھڑکنے والی آگ کے اندر کسی کو بھی ڈال دیا جائے تو وہ دو تین منٹ میں ختم ہو جاتا ہے تو کیا وہ ختم ہو جائے گا؟ قرآن نے کہا کہ نہیں' یہ النار وہ نہیں ہے: **نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ ۙ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ** [1] (104:6-7) اللہ کی یہ النار وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں' اور جس آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں' اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی** (87:13) اس میں انسان نہ زندہ ہوتا ہے' نہ مرتا ہی ہے (کہ یوں اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔)

آپ نے یہ سنا ہوگا کہ جیل خانے کے اندر قیدی نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو اس طرح عذاب مل رہا ہوتا ہے' اس سے چھوٹ جانے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی خودکشی کر لے۔ دنیا کے ہر عذاب سے انسان چھوٹ سکتا ہے مگر وہ عذاب جس میں انسان مرنا چاہے اور مر بھی نہ سکے' عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ وہ عذاب کیا ہوگا! ہمارے ہاں تو دو ہی اصطلاحات تھیں: مردہ ہوتا ہے یا زندہ ہوتا ہے۔ ذہنِ انسانی میں تیسری اصطلاح آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ تو خدا ہی کہہ سکتا تھا کہ ایک تیسری اسٹیج بھی ہوتی ہے جس میں انسان نہ مردہ ہوتا ہے' نہ زندہ ہوتا ہے۔

عشق ہے مرگِ با شرف مرگ حیاتِ بے شرف

بے عزتی کی زندگی موت ہے۔ تب بھی زندگی تو اس میں باقی رہتی ہے' وہ سانس تو لے رہا ہوتا ہے آپ اسے زندہ انسان کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے' جو زندہ انسان تھے یعنی سانس لینے والے انسان تھے' ان سے یہ کہا ہے کہ **یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ** (8:24) اے دعویٰ ایمان رکھنے والو! خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جب وہ

---

[1] یہ خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کردے۔

زندگی کے لیے زندگی کی نعمت

زندہ انسانوں سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو تمہیں زندگی عطا کردے۔ اس سے نظر آیا کہ قرآن کی رو سے یہ جسے ہم Physical Life (طبعی زندگی) کہتے ہیں' یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے' انسانی زندگی یہ نہیں ہے کیونکہ یہ تو زندوں سے کہا گیا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو تمہیں زندگی عطا کردے۔ انسانی سطح کی زندگی کچھ اور زندگی ہے۔ یہاں (87:13) میں کہا گیا ہے کہ پھر اس میں نہ موت ہوگی' نہ زندگی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر Physical Death تو ہوگی نہیں اور جسے انسانی سطح کی زندگی کہا جاتا ہے' وہ زندگی بھی وہاں نہیں ہوگی۔ یہ ہے' عزیزانِ من! وہ جہنم جو اس دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ ابھی اگلی آیت میں یہ بات آتی ہے کہ یہ جہنم کیا ہوتا ہے۔ اس اگلی زندگی میں جو ہوتا ہے وہ تو ہمارے سامنے ہے لیکن اس آیت کے فوراً بعد اس کے برعکس یہ کہا کہ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ❶ (87:14)۔ وہاں (87:17) میں کہا تھا: یَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا یَخۡفٰی ❷ (87:7) پوشیدہ اور صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں' Undeveloped (غیر نشو ونما یافتہ) ہوتی ہیں' انہیں Develop کرنے کے لیے قرآن کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ کہا کہ قَدۡ اَفۡلَحَ (87:14) کھیتی اس کی پروان چڑھتی ہے۔ قرآن الفاظ ہی وہ استعمال کرتا ہے جن سے بات محسوس طور پر سمجھ میں آسکے۔ فلاحت کھیتی کو کہتے ہیں اور فلاح کسان کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ کھیتی اسی کی پروان چڑھتی ہے مَنۡ تَزَکّٰی (87:14) جو اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کرلیتا ہے۔ تزکیہ کے معنی ہوتا ہے ''Develop (نشو ونما) کرلینا'' لیکن ایک تزکیہ نفس تو ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے۔ آپ کو اس کا پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟ یعنی وہ کہتے ہیں کہ نفس کو ماردو۔ بہرحال' یہ بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ میں کس کس غیر قرآنی تصور کو سامنے لاؤں۔

تزکی کا مفہوم

برادرانِ عزیز! مَنۡ تَزَکّٰی. زَکّٰی (87:14) کے معنی ہوتے ہیں ''نشو ونما دینا۔'' یہیں سے آپ کے ہاں کا زکوٰۃ یہ کا لفظ ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41) اگر مومن کی حکومت قائم ہوگی تو اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوةَ (22:41) یہ صلوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے یعنی حکومت قائم ہوگی تو یہ زکوٰۃ لیں گے نہیں لکھا' بلکہ دیں گے لکھا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچائیں' ان کی حکومت کا مقصود یہ ہوگا: چھینیں گے نہیں' بلکہ دیں گے۔ و زکیٰ کے معنی ہیں جس

---

❶ (یاد رکھو!) کھیتی اسی کی پروان چڑھتی ہے جو (اپنے جسم کی پرورش ہی کو نصب العین حیات قرار نہ دے لے بلکہ اس کے ساتھ) اپنی ذات کی نشو ونما بھی کرے۔

❷ وہ (خدا) جانتا ہے کہ انسان میں کیا کیا ممکناتِ زندگی مضمر ہیں' اور ان میں سے کس کس جوہر کی نمود کس انداز سے ہوسکتی ہے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

نے اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے دی۔ تو یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ ❶ (87:15) خدا پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ عزیزانِ من! خدا کی ذات کے متعلق تو ہم ادراک بھی نہیں کر سکتے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ یہ ہم قطعاً نہیں جان سکتے۔

انسانی ذات کی نشوونما کا پیمانہ خدا کی صفات ہیں

خدا نے ہمیں جو اپنی صفات بتائی ہیں، وہ اس کی ذات کے مختلف گوشے (Facets) ہیں، مختلف پہلو (Aspects) ہیں، وہ ایک Personality (ذات) کے مختلف Basic Characteristic (بنیادی خصوصیات) ہیں، یہ اس Personality (ذات) کے ہیں جو The Most Perfect Personality ہے یعنی مکمل ترین ذات کی مختلف خصوصیات ہیں۔ انہیں صفات خداوندی یا الاسماء الحسنیٰ کہتے ہیں۔ اس پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم نے یہ معلوم کرنا ہو کہ ہماری اپنی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں، تو اس کے لیے کوئی Standard (معیار، کسوٹی) ہونا چاہیے۔ کہیں یونہی نہ ہم اپنے ذہن میں فرض کر لیں کہ ہاں صاحب! ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اس کے لیے متفقہ Standard (میعار) ہونا چاہیے اور وہ Standard (معیار، کسوٹی) کسی صورت بھی Subjective (موضوعی، داخلی، اندرونی) نہیں ہونا چاہیے، ذہنی نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے تو ہم ہر وقت فریب کھا سکتے ہیں۔ وہ Objective (معروضی) ہونا چاہیے، خارج میں کوئی ہونا چاہیے۔ صفات خداوندی وہ Standard، وہ معیار ہے جس کے مطابق ہم پرکھ سکتے ہیں کہ ہماری ذات ویسی ہوتی چلی جاتی ہے کہ نہیں۔ یہ حدِ بشریت کے اندر ویسی ہوتی چلی جائے گی۔ اسے قربِ خداوندی کہتے ہیں۔ صفاتِ خداوندی بطور خارجی معیار سامنے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہا کہ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ (87:15) خدا کی صفات کو نمایاں طور پہ اپنے سامنے رکھ۔

ذکر اور صلوٰۃ کا مفہوم

''ذکر'' کے معنی ہوتے ہیں ''ابھار کر کسی چیز کو اپنے سامنے رکھنا''۔ یہاں کہا کہ ایک تو یہ رکھ اور اس کے بعد کہا: فَصَلّٰى ❷ (87:15)۔ اس کا ترجمہ ہمارے ہاں صرف یہ کر دیا جاتا ہے کہ نماز پڑھ۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ صلوٰۃ کے یہ اجتماعات نہایت ضروری ہیں لیکن یہ یہیں تک محدود نہیں ہیں۔ یہاں لفظ صلیٰ آیا ہے۔ یہاں تو آپ دیکھیے کہ قرآن کتنی بڑی چیز کہہ گیا ہے: صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار کے رکھ۔ فصلیٰ کے لغوی معنی ہیں ''پھر اس کے پیچھے پیچھے چلتا جا''۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن اپنے مفہوم کو کتنا صاف کر جاتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن ''تولیٰ'' ❸ کے مقابل میں یہ لفظ لایا ہے۔ ''تولیٰ'' کے معنی ہوتے ہیں ''گریز کی راہیں

---

❶ اور ذات کی نشوونما اس کی ہوتی ہے جو خدا کی صفت ربوبیت کو عملاً متشکل کرتا ہے۔

❷ اور زندگی کے ہر گوشے میں خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتا جا۔

❸ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى o وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (75:31-32) (3-2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

نکالنا۔'' ادھر ادھر نہ پھر' بھا گتا نہ پھر بلکہ صلیٰ (87:15) اس کے پیچھے پیچھے چلتا جا۔لیکن اس میں ایک ہی خطرناک گھاٹی آتی ہے: **بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا o وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى** ❶ (87:16-17)۔ہوتا یہ ہے کہ بنیادی زندگی کے کچھ مفاد سامنے آتے ہیں' دوسری طرف ایک مستقل قدر آتی ہے جسے آپ صفت خداوندی کہتے ہیں۔اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ مستقل قدر کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ یہاں آکر دونوں میں Clash تصادم ہوتا ہے' دونوں میں Tie (گرہ) پڑتی ہے تو کہتا ہے کہ یہاں ایک گروہ ایسا سامنے آتا ہے جو **تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا** (87:16) ترجیح دیتا ہے اس مفادِ عاجلہ کو مستقبل کے مفاد پر۔آپ دیکھیے یہاں کے یہ مفاد قابل نفرت نہیں ہیں' ترک کر دینے کے قابل نہیں ہیں۔جب ایسا وقت آجائے کہ ان دونوں' مفاد عاجلہ اور مستقبل کے مفاد' میں آپ کو تقابل کا وقت آجائے' اس وقت اِس مفادِ عاجلہ کو ترجیح نہیں دینی چاہیے۔یہاں کہا ہے کہ یؤثرون وہ مستقبل کے مفادِ عاجلہ پر ترجیح دیتے ہیں۔

مستقبل کی زندگی کے مقابلے میں مفاد عاجلہ

قرآن نے کہا ہے کہ **وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى** ❷ (87:17) انسان کی جو زندگی مستقبل سے ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے اور بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ ابقیٰ بھی ہے' وہ ایسی ہے کہ جس کو بقا بھی نصیب ہوتا ہے۔اِسے یعنی مفادِ عاجلہ (الحیوۃ الدنیا) کو بقا نہیں ہوتا اور یہی یہاں معیار قائم کیا ہے۔جسے آپ نیک عملی کہتے ہیں' اس کے لیے قرآن نے ایک ہی معیار قرار دیا ہے اور وہ ہے **وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ** (13:17)۔یاد رکھو! نیک عمل کا تمہیں معیار بتائیں ''جو شے نوعِ انسانی کو نفع پہنچانے والی ہوگی وہی باقی رہ سکتی ہے۔'' اب یہاں ابقیٰ کہا ہے۔وہ یہ ہے کہ انسان کے وہ اعمال اِسے بقا بخش سکتے ہیں جو نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش ثابت ہوں۔کہا کہ یہ جو بات ہم نے تمہیں کہی ہے وہ کوئی پہلی بار نہیں کہی۔

تمام آسمانی صحیفوں میں ایک ہی تعلیم تھی

یہ تو جس دن یہ سلسلہء کائنات وجود میں آیا تھا' فطرت کے قوانین بھی ساتھ ہی وجود میں آ گئے تھے بلکہ اس سے پہلے ہی آ گئے تھے۔اسی طرح جب انسان اس صفحہء ارضی پہ آیا' اس نے تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی' ہم نے یہ قوانین اسی زمانے میں دے دیئے تھے۔یہ نہیں ہوا کہ اتنا عرصہ تک انسان کو یونہی چھوڑ دیا اور آج یہ نئی نئی باتیں دیتے ہیں۔ **اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ**

---

❶ تم طبعی زندگی کے مفاد کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ مستقبل کے مفاد ان سے کہیں بہتر بھی ہیں اور غیر متبدل بھی (یعنی جب جسم کے تقاضوں اور مستقل اقدار میں تصادم ہو تو صحیح روش یہ ہے کہ مستقل اقدار کے تحفظ کے لیے جسم کے تقاضوں کو قربان کر دیا جائے۔اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے' اور اُخروی زندگی کامیاب۔)

❷ مستقبل کے مفاد کہیں بہتر بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ (2-1 مفہوم القرآن۔پرویز)

الْاُوْلٰى (87:18) یہی کچھ جو ہم آج کہہ رہے ہیں' یہی کچھ پہلے صحیفوں کے اندر بھی کہا تھا' یہاں تک کہ **صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى** (87:19) صحف ابراہیم ہوں یا صحف موسیٰ ہوں' ان تمام صحفِ اولیٰ میں بھی یہی کچھ کہا تھا جو ہم آج کہہ رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ صحیفے اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس موجود نہیں رہے جبکہ اِسے ہم تمہارے پاس محفوظ رکھیں گے۔ آج بائبل کے اندر پہلے سارے صحیفے اور صحفِ ابراہیم تو سرے سے ہیں ہی نہیں۔

آج قرآن کے علاوہ کوئی صحیفہ اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے

دراصل بائبل بھی صحفِ موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کے صحیفے تو ہیں ہی نہیں' اور جو صحیفے ہیں اُن کی ایک مثال دے دوں' تفصیل میں جاؤں گا تو مجھے تاریخ بتانی پڑے گی۔ اس کے لیے میری کتاب [1] موجود ہے۔ یہ جو صحفِ موسیٰ علیہ السلام سے بات شروع ہوتی ہے' وہ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بتائی جاتی ہے' جو ان کی طرف نازل ہوئی مگر اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد کے واقعات بھی درج ہوئے ہیں یعنی یہ اتنی سی چیز ہی بتا دیتی ہے کہ یہ بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ بہر حال یہی صحفِ ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام میں بھی تھا' جو آج اپنی اصل شکل میں کہیں بھی نہیں رہے اور یہی' ساری بنیادی طور پہ ہدایت' اس قرآن کے اندر آ گئی ہے' جو اب ابدی طور پہ محفوظ کر دی گئی ہے۔ برادرانِ عزیز! سورۃ الاعلیٰ یہاں ختم ہوئی' اب ہم اگلی سورۃ الغاشیہ لیتے ہیں۔

---

[1] وہ کتاب ہے: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوعِ اسلام (ٹرسٹ) رجسٹرڈ' لاہور۔ اس کا پہلا نسخہ 1966ء میں طبع ہوا تھا' دوسرا 1977' تیسرا 1989 (بلا ترمیم)' چوتھا 1994 (بلا ترمیم)' اور پانچواں 1996 (بلا ترمیم) زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

سورۃ الغاشیة (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! سورۃ الغاشیہ تیسویں پارے کی 88 ویں سورۃ ہے۔ یہ اس آیت سے شروع ہوتی ہے: **هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ** [1] (88:1)۔ کیا تیرے پاس اس آنے والے انقلاب کی خبر بھی آ پہنچی ہے؟ کونسا انقلاب؟ وہ جو تمام چیزوں کو ڈھانپ لے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے اندر چھوٹے چھوٹے انقلاب تو آتے ہی رہتے ہیں مگر یہ انقلابِ عظیم ہوتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ انقلاب جو قرآن لانا چاہتا ہے۔ قرآن کی خصوصیتِ کبریٰ برادران عزیز! یہ ہے کہ وہ Man as a whole لیتا ہے یعنی وہ انسان کی پوری زندگی کے ہر گوشے میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔

انقلاب کی خصوصیت

سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کے وقت ہوگا کیا؟ یہاں انسانوں کے دو گروہ بتائے۔ کیسے عجیب گروہ بتائے ہیں! کہا کہ **وُجُوْهٌ**

---

[1] ہم تمہیں اس عالمگیر انقلاب کے متعلق کچھ بتانا چاہتے ہیں جو'ان تمام لوگوں پر چھا جائے گا' (جو اسے ناکام بنانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ o عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ [1] (88:2-3)۔ دیکھیے، برادران عزیز! غلط نظام کا نقشہ کس طرح دو الفاظ میں کھینچ دیا ہے۔ ایک گروہ اپنے آپ کو بڑا ہی ذلیل محسوس کرتا ہے: ذلیل، پستیوں کے عالم میں۔ یہ گروہ کونسا ہوگا؟ وہ ہوگا عــــامــلة (88:3) محنت کشوں کا گروہ۔ بظاہر تو نظر آتا ہے کہ یہ عامل یعنی عمل کرنے والے، کام کرنے والے، محنت کش ہیں۔ بھئی! یہ کیوں اس طرح سے محسوس کریں گے؟ کہا کہ نظام یہ ہوگا جس میں عَـامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (88:3) وہ محنت کش جو دن بھر محنت کریں گے، اور شام کو تکان کے سوا ان کو کچھ نہیں ملے گا۔ یہ آخری پاروں کا ارتکاز ہے، میں تفصیل میں نہیں جاتا۔ قرآن ایک لفظ بیان کر جاتا ہے، ورنہ جہاں ''عاملة'' آیا تھا وہاں ذہن میں یہ آ سکتا تھا کہ یہی گروہ تو ہونا چاہیے جو نہایت سرسبز و شاداب ہو، قرآن اسے کام کرنے والا کہتا مگر یہاں یہ بتایا ہے کہ ان کام کرنے والوں کی کیفیت یہ ہوگی: نـاصبة: عاجز و درماندہ، افسردہ و پژمردہ، مجوب و شرمسار، مشقت، تھکن اور کوفت کا مجسمہ۔ یہ گروہ یہ نظام کونسا ہے جس میں یہ کیفیت ہو جاتی ہے؟ کہا کہ تَـصْـلٰـى نَارًا حَامِيَةً o تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ [2] (88:4-5) پورے کا پورا معاشرہ جہنم کی آگ کے اندر جھلس رہا ہوگا۔ اپنے ہاں نشو و نما کا سامان نہیں ہوگا۔

عزیزان من! بڑے غور سے سننے کی دو آیات ہیں۔ ارے یہ تو اپنی ہی داستان معلوم ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انقلاب بہت قریب آنے والا ہے اس لیے کہ اس کی جو نشانیاں قرآنِ کریم نے بیان کی ہیں، وہ ہمارے سامنے ایک ایک کر کے نظر آ رہی ہیں۔ ان آیات میں کہا ہے کہ اس جہنم میں جلنے والے معاشرے کی کیفیت یہ ہوگی کہ اگرچہ زندگی کا مدار پانی پر ہوتا ہے مگر ان کے ہاں پانی ملتا ہے تو کھولتا ہوا جو ہلاکت آمیز ہوتا ہے، کھیتیوں کو جلا دیتا ہے، انسانی زندگی کو بھی تلف کر دیتا ہے۔ کہیں سے پانی لیتے ہیں تو وہ بھی کھولتا ہوا ملتا ہے جس سے پیاس بجھنے کے بجائے اور بھڑک اٹھے۔ اب اگلا سوال یہ ہے کہ انہیں کھانے کو کیا ملتا ہے؟

دوسری قوموں کی طرف سے بخشش میں ملنے والے سامان کی حالت

برادران عزیز! اس کھانے کے لیے قرآن کا ایک لفظ آیا ہے: لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ [3] (88:6)۔ سمندر میں

---

[1] ایک گروہ اُن کا جن پر افسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی ہوگی: ذلیل و خوار، مجوب و شرمسار۔ ان کی محنت و مشقت کا ماحصل سوائے تکان اور اضمحلال کے کچھ نہ ہوگا۔ (اس لیے کہ انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا تھا، اور غلط راستے پر چلنے والے کے حصے میں تکان اور اضمحلال کے سوا کچھ نہیں آ سکتا۔ وہ تھکتا ہے، لیکن منزل تک نہیں پہنچتا۔)

[2] ان کی غلط روش انہیں تباہیوں کے جہنم میں لے جائے گی، جس کے شعلے تیزی سے بھڑک رہے ہوں گے۔ اس جہنمی معاشرے میں انہیں پینے کو کھولتے ہوئے چشمے کا پانی ملے گا جس سے پیاس بجھنے کے بجائے اور بھڑک اُٹھے۔

[3] کھانے کو وہ بدبودار جھاڑیاں جنہیں سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔ (یعنی بڑی بڑی قوتوں کا پس خوردہ جنہیں وہ بھیک کے ٹکڑوں کی طرح پس ماندہ اقوام کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ ایسی ذلت کی روٹی؟) (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

خس و خاشاک بدبودار جھاڑیاں' کانٹے دار کچھ ٹہنیاں' کہیں سے ٹوٹ پھوٹ کر وہاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ سمندر کو ان کی ضرورت نہیں ہوتی' اس کی لہریں انہیں اچھالتی ہیں اور ساحل کے اوپر پھینک دیتی ہیں' پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے' یہ وہاں باقی رہ جاتی ہیں۔ کہا کہ یہ ان اقوام کا جہنم ہے۔ دوسری قوموں کی طرف سے' جو کچھ انہیں ملے گا' وہ اس انداز سے ملے گا جیسے یہ سمندر کی بڑی بڑی تلاطم خیز لہریں اچھال کر ان چیزوں کو تمہاری طرف ڈال دیتی ہیں۔ وہ چیزیں جو دنیا میں کسی کے کام کی نہیں ہوتیں: لَّا يُسۡمِنُ وَلَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ ❶ (88:7)۔ تازگی دینا تو ایک طرف رہا وہ چیزیں کمبخت بھوک بھی تو نہیں مٹا سکتیں۔ ساحل کے اوپر ان چیزوں کو چننے والو' دوسروں کی بخشش پہ اس طرح سے نگاہ رکھنے والو' جھولیاں پھیلا کر' مانگ کر' یہ چیزیں کھانے والو! تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اس کے اندر تمہیں مل کیا رہا ہے۔ سنو! یہ ضریع ہے یعنی اس بدبودار کانٹے دار جھاڑی جسے انسان تو ایک طرف حیوان بھی نہ کھائے۔ یہ ضریع ہے پھر اس کے کسی کام کی چیز نہیں۔ سمندر کی لہریں بیکار سمجھ کر' اسے اچھال کر' پھینک دیتی ہیں' تم لپک کر اس کے اوپر جاتے ہو۔ اس کے بعد کیفیت یہ ہوتی ہے کہ Development (نشوونما) کرنا تو ایک طرف رہا' وہ تمہاری بھوک بھی نہیں مٹا سکتا۔ پینے کو تم پانی مانگتے ہو' تو کھولتا ہوا ملتا ہے' کھانے کو کچھ مانگتے ہو' تو یہ کچھ ملتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے وہ دور جہاں عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (88:3) جہاں محنت کش کی' مزدور کی' جہاں محنت کرنے والے کی' کیفیت یہ ہوتی ہے کہ شام کو تکان کے سوا اس کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔ اس معاشرے میں یہ کیفیت ہوتی ہے۔

دوسرے گروہ کی حالت

اب آ دوسری طرف۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے: وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ❷ (88:7)۔ یہاں قرآن نَاصِبَةٌ (88:3) کے مقابل نَـاعِمَةٌ (88:8) لایا ہے۔ ناعمۃ کا لفظ نعم سے ہے۔ میں وقت کا کیا عرض کروں بھاگا جا رہا ہے۔ وقت تو یوں چاہیے تھا کہ ایک سورۃ ہوتی اور ہفتہ بھر کا وقت ہوتا' مگر ایسا نہیں ہے۔ بہر حال ناعمۃ' نعم' انعام' انعمت کے الفاظ ایک ہی مادہ (Root) کے اشتقاق ہیں۔ عربی زبان میں نعم کا لفظ' عزیزان من! تر و تازگی' نرمی اور آسائش' روانی' اور بلندی' یا جس چیز کے اندر یہ ساری چیزیں ہوں' اس کے لیے بولا جاتا ہے اور پھر ان کے ہاں نعم اس کو کہتے ہیں جو کنویں کے منڈیر پہ کھڑا ہوا' پانی نکالے اور پیاسوں کو آواز دے کہ ''آؤ! تمہیں میں پلاؤں۔'' یہاں کہا کہ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّـاعِمَةٌ (88:8)۔ ایک گروہ وہ ہے جو ان تمام خصوصیات کا حامل ہوگا۔

عزیزان من! آپ نے پہلے سن لیا تھا کہ وہاں محنت کش کی کیفیت کیا ہوگی۔ اب اس گروہ کے لیے کہا کہ یہ وہ گروہ ہے: لِّسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ (88:9) جس کی محنت بھرپور نتائج لے کر واپس آئے گی۔ محنت تو دونوں کر رہے ہیں' مگر یہ دوسرا گروہ فِىۡ جَنَّةٍ

---

❶ جس سے' جسم کا نشوونما حاصل کرنا تو ایک طرف' بھوک بھی نہ مٹے۔

❷ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہیں زندگی کی آسائشیں حاصل ہوں گی۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

عَالِیَةٍ [1] (88:10) ہے۔قرآن دیتا ہی مثال وہ ہے جہاں اس میں آسائشوں، سامان زیست کی فراوانیوں، روانیوں، راحتوں کا مجموعی طور پہ ذکر کرنا ہوتا ہے۔خود عربوں کے ہاں یہ ایک لفظ باغ ہوتا ہے۔ہم بھی تو اپنے ہاں باغ و بہار کیفیت کہتے ہیں لیکن قرآن تو ایک لفظ میں بات کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔باغ جو ہوتا ہے اس کی سطح ہموار ہوتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ جَـنَّةٍ عَـالِیَةٍ (88:11) وہ باغات جن کے ثمرات تمہیں بلندیوں کی طرف لے جانے والے ہونگے۔ لَا تَسْمَعُ فِیْهَا لَاغِیَةً (88:11) اس میں کوئی بات بیکار اور "اَللَّغَا" یعنی لغو نہیں ہوگی۔"اَلْـلّٰـغو" پرندوں کی آواز ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ شور بہت مچایا جائے، مطلب کی بات کچھ نہ ہو۔آپ دیکھتے ہیں کہ سولہ سولہ صفحہ کے اخبار روز آپ کے سامنے آتے ہیں۔ بتایئے ہوتی ہے چیں چیں ساری یا نہیں؟ کوئی مطلب کی بات اس میں سے نکلتی ہی نہیں۔ بڑے بڑے بیان، تقریریں کی تقریریں، صفحوں کے صفحے، کتابوں کی کتابیں چلی جارہی ہیں۔ لاغیة ہیں مگر اس جنتی زندگی میں یہ بات نہیں ہوگی۔کیا ہوگا؟ کہا کہ فِیْهَـا عَیْـنٌ (88:12) اس میں زندگی کا آبِ حیات دینے والا چشمہ ہوگا۔ٹھیک ہے، بڑی بات تھی لیکن قرآن ہے چشمہ وہی نہیں جو کہ تمہارے اپنے ہی باغ کے اندر بہئے اور وہیں تک رہے۔ یہاں کہا کہ عَیْـنٌ جَارِیَةٌ [2] (88:12)۔ وہ اپنے پانی کو لے کر آگے بہنے والا چشمہ ہے۔ یہ تو بات ہی یہ ہے۔ میرے کھیت کا چشمہ، تمہارے کھیت کا چشمہ، یہ تو ہر ایک کے ہاں ہوتا ہے۔ یہ وہ چشمہ ہے جو میرے کھیت سے آگے پانی لے جائے۔ یہ اس معاشرے کی بات ہے جہاں فِیْهَـا سُـرُرٌ مَّـرْفُوْعَةٌ o وَّاَکْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ o وَّنَـمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ o وَّزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ [3] (88:13-16) ہے۔اس طرح سے کیا لاتا ہے قرآن! ادب سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ جب اس طرح سے چیزیں آتی ہیں تو پھر کتنا زور بڑھتا چلا جاتا ہے: ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔اونچے اونچے بلند تخت، صوفے، یہاں ایک خوبصورت بڑے عجیب و غریب گاؤ تکیے لگے ہوئے، فرشوں کے اوپر قالین بچھے ہوئے۔ یہاں اگر مولوی صاحب کے سامنے یہ چیزیں کہیں کہہ دی جائیں کہ حریر کے پردے، سونے کے کنگن، موتیوں کے زیورات، اس قسم کے قالین ہوں گے تو وہ کہیں کہ یہ شرعاً حرام ہے اور قرآن یہ ساری چیزیں بتا رہا ہے کہ اس معاشرے کے اندر انعاماتِ خداوندی میں تو یہ چیزیں ملیں گی۔کس نظام میں یہ ملیں گی؟ جس میں ہر ایک محنت کش بھرپور نتائج لے کر سامنے آئے گا۔

---

[1] وہ ایک ایسے جنتی معاشرہ میں ہوں گے جو ان کے مقام بلند کا آئینہ دار ہوگا۔اس میں انہیں آسائشوں کے ساتھ، ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں بھی حاصل ہوں گی۔

[2] انہیں زندگی کی جوئے رواں سے، آبِ حیات پینے کو ملے گا۔ (67:16-17)

[3] وہ اختیارات واقتدارات کے بلند و بالا تختوں پر متمکن ہوں گے۔ پینے کے لیے نہایت عمدہ گلاس، قرینے سے رکھے ہوئے۔ بیٹھنے کے لیے اعلیٰ درجہ کے قالین اور ان پر قطار در قطار تکیے۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

بادلوں کی مثال

اتنا کچھ کہنے کے بعد پھر قرآن وہ شہادتیں پیش کرتا ہے جو خارجی کائنات کی ہیں۔ کہا کہ تمہیں اس پہ تعجب آ رہا ہے کہ معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہو گا۔ وہ کس حسن وخوبی سے اپنے زندگی بخش نتائج پیدا کرتا جائے گا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے جو یہ دیکھے کہ نظامِ کائنات، جو قوانین خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے، کس عمدگی سے چل رہا ہے اور کیسے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کر رہا ہے۔ تمہیں اس پہ تعجب نہیں آنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے کہا کہ کیا وہ اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ○ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ○ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ○ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ [1] (88:17-20)۔ بادلوں کی طرف نہیں دیکھتے، سمندر سے کھاری تلخ پانی، کشید کرنے کے بعد، سورج کی یہ کرنیں، اِسے اپنے کندھوں پہ اٹھا کے اوپر لے جاتی ہیں۔ پانی سے بھرے ہوئے مشکیزے ہوا کے دوش پر اڑتے پھر رہے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے ان سے پانی برس جاتا ہے، جہاں فالتو ہوتا ہے پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر جمع ہو جاتا ہے۔ کبھی اتنی سی چیز پہ بھی تم نے غور کیا کہ جو قانون یہ کچھ کرتا ہے، اسی قانون کو ہم تمہاری زندگی میں اپنانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔

کروں کی، پہاڑوں کی اور زمین کی مثالیں

دیکھتے نہیں ہو کہ اجرامِ فلکی، یہ اتنے عظیم الجثہ بڑے بڑے کرے، فضا کی پہنائیوں میں ہمارے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کس طرح محوِ گردش ہیں۔ بڑے بڑے عظیم پہاڑوں کو دیکھ رہے ہو، کہ زمین اس تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہے اور یہ اس طرح، اس کے اوپر، کس طرح مستحکم بیٹھے ہوئے ہیں اور اس زمین کو دیکھتے ہو کہ گول ہونے کے باوجود، تمہارے سامنے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ اِن مظاہر فطرت کی طرف توجہ دلانے کے بعد کہا کہ جو ہمارا قانون، خارجی کائنات میں یہ کچھ کر سکتا ہے تو تمہاری داخلی زندگی میں، یہ آسائشیں بہم پہنچانا اس کے لیے مشکل کیا ہے! بات اتنی ہے کہ وہاں کسی کی محنت کی یہ بات نہیں ہے کہ کوئی محنت کرے اور رات کو نکال لے کر واپس آ جائے۔ وہاں تو ہر ایک کی محنت نتائج پیدا کرتی ہے۔ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل تمہارے معاشرے میں محنت نتائج پیدا کرنا شروع کر دے گی۔ یہی کچھ تمہارے معاشرے میں ہو جائے گا اس لیے رسول سے کہا کہ فَذَکِّرۡ (88:21) یہ قوانین خداوندی

---

[1] انہیں چاہیے کہ دیکھیں کہ: (i) یہ پانی سے بھرے ہوئے بادل کس طرح ترکیب پاتے ہیں؟ سمندر کا تلخ پانی کس طرح صاف شفاف، میٹھے پانی کے مشکیزوں میں تبدیل ہو جاتا ہے جو دوشِ ہوا پر سوار، اِدھر اُدھر، تیرتے پھرتے ہیں، اور وجہ سیرابی عالم بنتے ہیں۔ (ii) یہ عظیم الجثہ اجرامِ فلکی، کس طرح فضا کی بلندیوں میں معلق اور مصروفِ گردش ہیں۔ (iii) یہ اتنے بڑے بڑے پہاڑ کیسے محکم کھڑے ہیں (حالانکہ زمین اس تیزی سے گردش کر رہی ہے۔) (iv) اور خود یہ زمین کس حسن وخوبی سے بچھا دی گئی ہے (کہ تمہیں اس کے گول اور متحرک ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پیش کرتا چلا جا' تو ان کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کرتا چلا جا کیونکہ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ (88:21) تیرا تو فریضہ ہی یہ ہے کہ اس تعلیم کو پیش کرتا چلا جا۔

اجارہ داری کا نظام

اس کے بعد اگلی چیز اب آئی۔ ہمارے ہاں ان چیزوں کے یعنی شریعت کے' یہ جو اجارہ دار بن جاتے ہیں' وہ ہر وقت ہاتھ میں لٹھ لیے پھر رہے ہیں۔ یہ تو اب کچھ غنیمت ہے' ورنہ میں اُس زمانے میں لاہور میں ہوتا تھا۔ یہاں ایک صاحب ہوتے تھے' قینچی ہاتھ میں لیے انارکلی میں پھر رہے ہوتے تھے۔ اِدھر اُدھر پھر کر چٹیا کاٹ رہے ہیں۔ اس زمانے میں کوئی عورت بہت کم ہی باہر جاتی تھی لیکن وہ باہر گئی ہے وہ صاحب اس کی چٹیا کاٹ رہے ہیں۔ ہمارے ایک بھائی' ہمارے ساتھ دلی کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے گئے۔ وہ بیان کیا کرتے ہیں کہ میری یہ شامت آئی کہ میں نماز پڑھنے گیا' پتلون پہنے ہوئے کھڑے تھے' کھڑے کھڑے تو خیریت گزری' جونہی رکوع میں گئے تو جو ساتھ والے تھے' انہوں نے اس طرف نگاہ دوڑائی۔ اب ان کی پتلون تک دیکھا۔ کیسے برداشت ہوسکتا ہے! وہیں اس نے اپنی نماز توڑ دی' بیٹھ گیا۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ قینچی ہاتھ میں نہیں تھی لیکن بہرحال وہ کہا کرتے ہیں کہ میرے پتلون کی نیکر بنا کر چلے گئے۔ دیکھتے ہیں آپ! سنیے یہاں کہا کہ فَذَكِّرۡ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ (88:21) تیرا کام یہ ہے کہ تو ان کے سامنے قرآن کی تعلیم پہنچائے چلا جا لیکن اسے ان سے زبردستی نہیں منوانا کیونکہ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ (88:22) تو ان پر داروغہ نہیں مقرر ہوا۔ ان کے اوپر لٹھ کے ذریعے نہ منواتا چلا جا' اس میں Regimentation (فوج آرائی) نہیں ہے۔

کمیونزم کا نظام

برادران عزیز! یہ پھر سوچ لیجیے کہ آپ کے ہاں یہ جتنا پرورش کا نظام' اشتراکیت کا' کمیونزم کا' یہ جتنے نظام قائم ہوئے ہیں' روٹی تو دیتے ہیں مگر Regimentation (فوج آرائی) سے دیتے ہیں' داروغہ بن کر دیتے ہیں' وہاں ہنٹر کے زور پر نظام چلتا ہے' قلب کی گہرائیوں سے چشمے نہیں پھوٹتے' اس لیے کہ وہ قلب سے ہی منکر ہیں کیونکہ یہ اس نظام میں ہوتا ہی نہیں۔ جو چشمہ وہاں یعنی قلب سے نہیں پھوٹے گا اسے تو ہنٹر کے زور پر ہی منوانا پڑے گا مگر یہاں کہا ہے کہ اس میں Regimentation (فوج آرائی) نہیں ہے کیونکہ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ o اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ (88:22-23) تو ان پر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجا گیا۔ تو اس قرآن کو ان کے سامنے پیش کر۔ اس کے بعد جو شخص اس سے منہ پھیرتا ہے' انکار کرتا ہے تو فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الۡعَذَابَ الۡاَكۡبَرَ (88:24) خدا کا قانونِ مکافات اس کو خود تباہی کا عذاب دے دیگا۔ یہ اس قانون سے انکار کر دینے سے' اس کی زد سے نہیں بچ سکتے کیونکہ اِنَّ اِلَيۡنَآ اِيَابَهُمۡ (88:25) اُن کا ہر قدم اُسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ یہ کسی دوسری طرف جا ہی نہیں سکتے۔

انسان کو آخر کار اسی نظام کی طرف آنا پڑے گا

برادرانِ عزیز! یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَہُمۡ** (88:25)۔ ایاب کہتے ہیں ''وہ مقام جہاں پلٹ کر کسی نے ضرور آنا ہوتا ہے۔'' جدھر جی چاہے' یہ چلے جائیں۔ اس کے لیے تو لی کہا تھا کہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ کہاں بھاگ کر جائیں گے! وہ کہا کرتے ہیں کہ ساری رات چلتے رہے' چلتے رہے' صبح جب اٹھ کر دیکھا تو وہیں کہیں تھے۔ کہا: ان کو چلنے دو' یہ جدھر بھی جا رہے ہیں' یہ جدھر بھی جائیں' ان کا قدم ہماری ہی طرف اٹھ کر آئے گا۔ ہر طرف ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل گھیرا ڈالے ہوئے ہوگا۔ یہ **مُحِیۡطٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ** (2:19) ہم تو چاروں طرف سے جال بچھائے ہوئے ہیں۔ جانے دو ان کو' جدھر جو جاتا ہے۔ اب یہاں ''ایاب'' کا لفظ آیا ہے۔ ایاب کے معنی ہوتا ہے'' پھر لوٹ کے یہیں ضرور آنا۔''

عزیزانِ من! دو منٹ کی اجازت دیں تو ایک لفظ سامنے آ گیا ہے اس کی وضاحت کر دوں۔

جنت آخری منزل نہیں' ایک پڑاؤ ہے

قرآن کی کیا بات ہے! ایاب سے ہی لفظ مآب ہے۔ ان عربوں کے ہاں جب سفر کرتے تھے' ہمارے ہاں بھی پہلے سڑکوں کے اوپر پڑاؤ ہوتے تھے' تو سفر دس بارہ پندرہ روز کا ہوتا تھا' پھر شام ہو جاتی تھی' وہاں پھر پھیل جاتے تھے' وہ راستے میں رکنے کا مقام ہوتا تھا۔ دوسری صبح پھر آگے چلتے تھے۔ یہ جو راستے میں رکنے کا' کچھ ستانے کا' مقام ہوتا تھا اسے مآب کہتے ہیں۔ وہاں آنا اور وہاں آ کر ٹھہر جانا' ستانا اور پھر آگے جانا۔ آخری منزل کو نہیں کہتے تھے۔ ماب کہتے تھے ''اس راستے میں' جو اس کو پڑاؤ آتا ہے۔'' آپ حیران ہونگے' عزیزانِ من! قرآن نے جنت کو ''مآب'' (38:49-50) کہا ہے۔ قرآن ہے' پتہ ہی نہیں کہ اس کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ جسے جنت کہا جاتا ہے' وہ تو ''مآب'' ہے۔ یعنی ذرا سا رک کے' پھر آگے جانا۔ یہ ہے **اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَہُمۡ** (88:25) ان کا ہر قدم ہماری طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ ہماری طرف چلے آ رہے ہیں۔ ❶ کاہے کے لیے جا رہے ہیں؟ اس لیے کہ **ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَہُمۡ** ❷ (88:26) ہم خود اس کا حساب کر لیں گے۔ تجھے کیوں خواہ مخواہ کے لیے ہنٹر لے کے ان کے پیچھے پھرنا پڑے۔ اس لیے کے ہنٹر کے ذریعے تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ منوانے سے کوئی ایمان نہیں لا سکتا' یہ قلب اور دماغ کی کامل رضامندی کا نام ہے۔ باقی نظام Regimentation (فوج کشی) سے چل سکتے ہیں' خدا کا یہ نظامِ ربوبیت دل اور نگاہ کے انقلاب کے بغیر وجود میں ہی نہیں آ سکتا اور یہ

---

❶ اُن کا ہر قدم اُس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو ہم نے ان کے اعمال کے نتائج کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اُن کا کوئی قدم ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ یہ کشاں کشاں اُسی کی طرف جا رہے ہیں۔

❷ اُن کے ہر عمل کا حساب ہمارے قانونِ مکافات کے ذمے ہے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

وجہ ہے، برادرانِ عزیز! کہ رسول کا فریضہ بھی یہ تھا: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ [1] (5:67)۔ قرآن کریم نے مظاہر فطرت کی طرف توجہ دلانے کے بعد بھی کہا کہ فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ (88:21) تو قرآن کی تعلیم ان کے سامنے پیش کرتا چلا جا اور پھر جو ان میں سے اس طرح ایمان لائیں ان کو لے کر الگ ہو جا۔ یہ وہ جماعت ہوگی جو اتنے بڑے پروگرام کو لے کر چلے گی اور یہی کام حضور کے بعد بھی ہے۔ جو قرآن کو پہنچانے والا ہو اس کا کام یہ ہے کہ وہ قرآن کے اس پیغام کو پہنچائے چلا جائے۔ ان میں سے پھر جو سعادت مند روحیں نکل کر آئیں گی یہ وہ ہونگی جو اس نظام کو متشکل کریں گی۔

سورۃ الغاشیۃ ختم ہوئی، برادرانِ عزیز! اب ہم آئندہ درس میں سورۃ الفجر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] تم اس ضابطہ ہدایت کو، جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چوبیسواں باب: سورة الفجر (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ الفجر سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسواں پارہ ہے اور 89 ویں سورۃ ہے۔ یوں تو قرآن کریم کے اس آخری پارہ میں جیسا کہ آپ اب سابقہ درسوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں' قرآن کریم کی ساری تعلیم کو سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں اس کا ارتکاز آ گیا ہے۔ Concentrated Form (ارتکازی صورت) میں وہ سب کچھ دے دیا گیا ہے لیکن ان سورتوں میں بعض سورتیں ایسی آ جاتی ہیں کہ ان میں ساری تعلیم چند آیات کے اندر مزید Concentration (ارتکاز) میں آ جاتی ہے یعنی اور بھی زیادہ ارتکاز سے اور بھی زیادہ مرکوز ہو جاتی ہے۔ سورۃ الفجر انہی سورتوں میں سے ایک سورۃ ہے۔ اس سورۃ میں قرآن کی ساری تعلیم کا پورا پیغام آ گیا ہے لیکن اس کی ابتدائی آیات کے سمجھنے کے لیے ذرا آگے بڑھنا ہوگا۔ یہیں ذرا آگے چل کر ایک سورۃ القریش آتی ہے۔ اس تمہید سے اس سورۃ الفجر کا پیغام زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آتا ہے۔ سورۃ قریش 106 ویں سورۃ ہے۔ یہ اس طرح شروع ہوتی ہے: **لِاِیۡلٰفِ**

قُرَيْشٍ o اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ o فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ o الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (106:1-4)۔

مذہبی پیشوائیت کا نظام' چار آیتوں میں

میں سمجھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائیت کے سارے نظام کی ان چار آیات میں پوری نقاب کشائی کر دی گئی ہے۔ خدا کے نام پہ دنیا میں جہاں جہاں بھی اڈے بنے ہوئے ہیں' ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ ان لوگوں کو' خدا کی طرف اپنی نسبت کرنے سے' قوت اور تعظیم کے بلند مقامات حاصل ہوتے ہیں' نہایت خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں' نہایت امن میں رہتے ہیں۔ یہ انہیں صرف اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسبت خدا کی طرف کرتے ہیں۔ اس میں کسی خاص مذہب کی تخصیص نہیں۔ ہندوؤں کے مندر ہوں' عیسائیوں کے گرجے ہوں' یہودیوں کے ہیکل ہوں' سکھوں کے گردوارے ہوں' آپ کے ہاں کے اللہ کے گھر ہوں' جہاں کہیں بھی مراکز ہوں گے' آپ دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ نسبت رکھنے والوں کو معاشرے میں عزت کا مقام بھی حاصل ہوگا' ان کی اور ان کے گھروں کی حفاظت ہوگی' ان کی زندگی' بڑی خوشحالی میں گزرے گی لیکن ان کے کرتوت کیا ہوں گے؟ یہ نکتہ غور طلب بھی ہے اور نازک بھی۔

کعبہ کے متولیوں کا معاشرتی مقام

قرآن نے زمانۂ قبل از اسلام کے قریش کے متعلق کہا کہ یہ کعبہ کے متولی تھے۔ کعبے کو خدا کا گھر ہونے کے اعتبار سے اس تمام علاقے میں ایک خاص مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے کعبہ کے متولی کا معاشرے میں کیا مقام ہوگا' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی کیفیت کیا ہوگی اسے جاننے سے پہلے یہ سن لیجیے کہ اس زمانے میں قانون کی کارفرمائی نہیں تھی۔ دن دیہاڑے قافلے لٹ جایا کرتے تھے۔ راہزنیاں اور قزاقیاں عام تھیں لیکن قریش کے قافلوں کی یہ کیفیت تھی لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ o اِلٰفِهِمْ [1] (106:1-2) سردی اور گرمی' سال بھر' ان کے قافلے یہاں سے وہاں تک آتے جاتے تھے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کی طرف انگلی اٹھا کر بھی دیکھ لے کیونکہ ان کے پاس ایک تقدس کا سرچشمہ ہوتا تھا: یہ قریش کا قافلہ ہے' یہ کعبے کے متولیوں کا قافلہ ہے' یہ خدا کے گھر کے رکھوالے ہیں جن کا قافلہ ہے' انہیں بڑی سہولت حاصل تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی' انہیں اپنے کرتوتوں پر شرم نہیں آتی حالانکہ خدا کے ساتھ نسبت کی وجہ سے انہیں یہ مقام حاصل ہے۔ قرآنِ کریم نے پہلے تو کہا کہ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ [2] (106:2)۔ ان کی یہ کیفیت ہے کہ سال

---

[1] قریش کعبہ کے متولی ہیں' اس لیے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و عظمت ہے۔ اسی عظمت و احترام کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ قبائل اور ممالک نے ان سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں۔

[2] یہ سردی اور گرمی' سال بھر' اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے ہیں' اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

پھر تمہارے قافلے یہاں سے وہاں تک چلتے رہتے ہیں اور تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوتا اور الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ❶ (106:4)۔ان کے ہاں خوف کے مقابلے میں امن تھا اور پھر وہی بات آئی جو آپ کہا کرتے ہیں کہ ہمیشہ روٹی کا مسئلہ آ جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے' اب ہم اس قرآن کو بدل کر کوئی دوسرا تو لا نہیں سکتے۔ کہا ہے کہ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ (106:4) تمہاری بھوک کا انتظام کیا ہے' کتنی سہولت سے تمہیں روٹی مل رہی ہے۔ جتنی سہولت سے انہیں روٹی ملتی ہے دنیا میں کسی اور کو اتنی سہولت سے نہیں ملتی۔ انہیں محنت بھی نہیں کرنا پڑتی' یہ تو خیر ان کے ہاں حرام ہے۔ انہیں کسی قسم کی ذہنی پریشانی بھی نہیں ہوتی۔ قرآن نے کہا کہ ذرا سوچو تو سہی' کعبے کے ساتھ نسبت کی بنا پر تمہیں اتنی آسائشیں حاصل ہیں کہ امن و سلامتی ہے' ہر طرح سے Secure (محفوظ) ہو' رزق کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ یہ کچھ خدا سے نسبت کرنے کی بنا پہ تمہیں ملتا ہے اور کیفیت یہ ہے کہ اسی خدا کے قوانین کی خلاورزیاں کرتے چلے جاتے ہو۔ انسان کو کم از کم کچھ تو احساسِ شرافت ہونا چاہیے یا تو اپنی نسبت اس کی طرف سے ہٹائے اور اگر اپنی نسبت اس خدا کی طرف رکھنی ہے تو کم از کم اس کی نسبت کا اتنا تو پاسِ وفا کرو' اتنا تو لحاظ کرو کہ اس کے قوانین کے خلاف سرکشیاں تو نہ برتو۔ آپ دیکھیے' عزیزانِ من! ایک چھوٹے سے واقعہ سے' چار چھوٹی سی آیات میں' قرآن مذہبی پیشوائیت کے پورے نظام کی کس طرح نقاب کشائی کر گیا ہے۔ محض خدا کی نسبت کی وجہ سے یہ مقام حاصل ہے اور دنیا میں اسی خدا کے قوانین کی خلاف ورزی انہی اڈوں کے اندر ہوتی ہے۔ آپ اس چیز کو سامنے رکھیے۔ یہ ہیں کعبے کے متولی۔

مقامِ کعبہ اور اس کا پیغام

کعبے کے متعلق' جیسا کہ میں نے گزشتہ کنونشن میں اپنے مقالہ میں عرض کیا تھا کہ کعبے کو نوعِ انسانی کے اجتماع کا مرکز بنایا گیا تھا' عالم گیر انسانیت کے نظام کا ایک Symbol (علامت) قرار دیا گیا تھا' اسے بنایا اس لیے گیا تھا کہ جو بھی اس نظام کے اندر داخل ہوا اسے امن مل جائے اور لوگوں کو دعوت اس لیے دی جاتی تھی لِّیَشۡہَدُوۡا مَنَافِعَ لَہُمۡ (22:28) تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے آ کر دیکھیں کہ یہ نظامِ خداوندی انسانوں کے فائدے کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ یہ تھا کعبے کا مقام اور اس کعبے میں عظیم اجتماع ہوتا تھا۔ یاد رکھیے! اس میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات بھی ہوتے تھے اور ایک اجتماع عظیم ہوتا تھا۔ یہ جسے آپ عمرہ کہتے ہیں یہ چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں تھی اور ایک سالانہ کانفرنس ہوتی تھی جسے حج کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس اجتماع کو خاص عظمت حاصل تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کے نام پہ جو گھر بنا تم اس گھر کے رکھوالے بنے' اس سے مقصود یہ تھا کہ تم نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کچھ کیا کرو۔ اس کے لیے لوگوں کو بلاؤ اور انہیں دکھاؤ

---

❶ انہیں خدا نے بھوک اور خوف سے نجات دلائی تھی' تاکہ یہ اس طرح مامون اور مطمئن ہو کر' کعبے کو نظامِ خداوندی کا مرکز بنائیں۔ (لیکن انہوں نے اسے یاترا کا تیرتھ بنا کر رکھ دیا اور خود اس کی مہنت بن گئے)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہ دیکھو! یہ نظام تمہارے لیے کیا کر رہا ہے جس کے رکھوالے ہم ہیں' جس کا Symbol (علامت) یہ کعبہ ہے۔ حج کا اجتماع اس کے لیے تھا اور کہا کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اس اجتماع میں جونہی تمہیں عید کا چاند نظر آیا اور تمہاری یہ کیفیت ہوئی۔ اس کے لیے اب دیکھیے کہ قرآن یہ کہتا ہے: ❶ وَالْفَجْرِ ❷ o وَلَيَالٍ عَشْرٍ o وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ❸ (89:1-3)۔ ان آیات میں شفا اور وتر کے الفاظ آئے ہیں۔ عرب شفع تو جفت (Even) کو کہتے ہیں مثلاً دو چار چھ آٹھ' اور وتر طاق ہوتا ہے (Odd) مثلاً ایک تین پانچ۔ یہ جو جوئے کے پانسے ❹ ہوتے ہیں' ان میں یہی چیز ہوتی ہے۔ پانسے کھیلے ہی اسی طرح جاتے ہیں کہ ایک سائیڈ پر ان کے ایک تین پانچ اور دوسری سائیڈ پر دو چار چھ ہوتے ہیں اور اسی اعتبار سے اس جوئے کو کھیلا جاتا ہے۔ یہاں قرآن نے ایک چیز کہی کہ یہ دس راتیں جو اس اہتمام اور انتظام میں گزرتی تھیں' اس مقصد کے لیے اتنا عظیم اجتماع تھا' تم اس کے منتظم تھے' تم اس کعبے کے رکھوالے تھے اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم ان دسوں راتوں میں کس طرح رنگ رلیاں مچاتے ہو۔ یوں تو سارا سال ہی تمہاری فحاشی اور بدمعاشی کچھ کم نہیں ہوتی لیکن ان دنوں میں خاص طور پہ یہ بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ تمہیں کم از کم اس کا ہی لحاظ رکھنا چاہیے تھا کہ باہر کی دنیا آ رہی ہے یہ کچھ نہ کریں لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم دس راتیں تو شراب میں' جوئے میں' فحاشی میں غرق ہوتے ہو اور ظاہر ہے کہ جہاں بھی دولت بغیر محنت کے آئے گی' یہ چیزیں تو لازمی طور پر آئیں گی اور پھر جب ان کا اجتماع ہوگا تو اِس اجتماع کی کیفیت اِس میلے کی سی ہوگی جس میں زیادہ بدمعاشیاں ہوں گی اور میلہ پھر اس قسم کا ہوگا۔ اب جہاں دولت اس طرح اکٹھی ہو رہی ہو' وہاں وہ کعبہ کے برہمن تو ہوں گے۔ اسلام نے کہا ہے کہ کعبہ ہی کے برہمن نہیں' مہنت اور برہمن جہاں کہیں بھی ہوں' جہاں بھی یاترا ❺ ہوتی ہوگی' وہاں مہنت ہوں گے اور جہاں مہنت ہوں گے آپ ذرا جھانک کر ان کے اندر دیکھیے' ہر جگہ آپ کو یہی چیز نظر آئے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ ان دنوں میں اور زیادہ بدمعاشیاں شروع

---

❶ وقسم کے لیے' یعنی زمانہ کی قسم یا زمانہ اس پر شاہد ہے کہ...... جیسے وَالْعَصْرِ (103:1) جیسے زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ

❷ تاج العروس اور محیط المحیط کے مطابق اَلْفَجْرُ صبح کی روشنی ہے جو تاریکی کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ روشنی کے اعتبار سے طَرِيْقُ الْفَجْرِ واضح راستے کو کہتے ہیں پھٹنے کے مفہوم سے اَلْفِجَارُ خود راستوں کو کہتے ہیں۔ نیز اَلْفَجْرُ کے معنی مال و دولت کی فراوانی اور جود و سخا اور عطیہ کے بھی ہیں۔ اَلْفَاجِرُ مالدار آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ فَجَرَ الرَّجُلُ آدمی سخی ہو گیا' کو کہتے ہیں۔ (لغات القرآن۔ پرویز، ص: 64-1263)

❸ (حج کا اجتماع نوعِ انسانی کے الجھے ہوئے معاملات کو سنوارنے کے لیے ایک عظیم تقریب کے طور پر تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں (عرب جاہلیہ) کو دیکھو کہ انہوں نے اس تقریب کو کیا سے کیا بنا دیا ہے)۔ انہوں نے اس اجتماع کی ابتدائی دس راتوں کو رنگ رلیاں منانے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان میں ہر قسم کی بدمستیاں کرتے ہیں' ہر طرف جوئے کا بازار گرم ہوتا ہے' جو طاق اور جفت (پانسوں) سے کھیلا جاتا ہے۔ آخری رات ان کی عیش پرستیاں انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ (یہ دولت کو اس طرح لٹاتے ہیں' اور ان کے اردگرد غریب روٹی کے ٹکڑے تک کو ترستے ہیں)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❹ ایک (مثلاً چوسر کی) بازی میں وہ شش پہلو ٹکڑ جسے کھلاڑی پھینکتے ہیں۔

❺ مقدس مقامات کی زیارت

کر دیتے ہو۔ اس میں یہ دس راتیں، اس انتظام کے لیے اہم راتیں تھیں اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ رنگ رلیاں مناتے ہو، عام جواء کھیلتے ہو۔ معاشرے کا یہ چلن عام ہو گیا تھا۔ یہ چیزیں تمہارے ہاں تھیں۔ یہ تھیں وہ راتیں! ان راتوں کے بعد پھر وہ اسی قسم کی صبح آتی تھی۔ اس صبح کے بعد وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ (89:4) اور پھر وہ آخری رات آتی ہے اس میں تم اس معاملے کے اندر انتہا کر دیتے ہو۔ سوچیے تو سہی۔ یہ چیز بتائی ہے کہ یہ ہے رب کعبہ کے ساتھ نسبت، یہ ہے تمہاری روش کہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس کے بعد کہا ہے کہ یہ جو ہم نے شہادت پیش کی ہے وہ بتاتی ہے کہ هَلۡ فِىۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِىۡ حِجۡرٍ [1] (89:4)۔ یہ بڑی عظیم شہادت ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں اور وہ شہادت ہے قومِ عاد اور قومِ ثمود کی، جو آگے آ رہی ہے۔ اس کے لیے بطور شہادت اس چیز کو پیش کیا جا رہا ہے اور کہا کہ وہ شہادت بڑی عظیم ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ عرب زبان کے اعتبار سے عجیب قوم تھی۔ ان درسوں میں، کہیں عقل کا لفظ کسی جگہ ہمارے سامنے آیا تھا اور میں نے یہ کہا تھا کہ اُس زمانے میں جب کہ ابھی انسان محسوسات Perceptions کے علم کے اندر تھا Concepts (تصورات) بڑے کم ہوا کرتے تھے، اس قوم کی کیفیت یہ تھی کہ ان محسوس چیزوں سے، اس قسم کے نتائج اخذ کرتے تھے، جنہیں آج ہم Conception Images (تصوری تصاویر) کہہ سکتے ہیں، اسے تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) کہہ سکتے ہیں۔ میں نے عقل کا لفظ کہا تھا۔ عقل کے معنی ہیں "روکنا، منع کرنا۔" اس سے عقال کا لفظ بنتا ہے۔ عقال وہ رسی تھی جس سے یہ عرب اونٹ کا گھٹنا باندھا کرتے تھے کہ وہ رک جائے۔ روک دینے کے اعتبار سے انہوں نے اس رسی سے "عقل" کا لفظ تجویز کیا اور "عقل" تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا Function (عمل۔ فعل) یہ روکنا ہے، وہ یہ سکھا دے کہ انسان کو کہاں رک جانا چاہیے اور یہیں دوسرا لفظ بھی آیا ہے: ذی حجر۔ اس "حجر" کے معنی ہوتے ہیں "کسی مقام کے اوپر رک جانا، منع کرنا، رک جانا" اور یہاں خاص طور پہ یہ کہا کہ وہ لوگ جو، یہ جانتے ہیں کہ کہاں رک جانا چاہیے، ان کے لیے شہادت میں بہت بڑی دلیل ملے گی، جو ہم آگے کہنے والے ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ عربی زبان عجیب خصوصیات کی حامل ہے مثلاً یہاں "ح ج ر" آیا ہے جو حجر کا مادہ ہے۔ عربی زبان میں قاعدہ [2] یہ ہے کہ جس لفظ کے اندر بھی "ج اور ح" اکٹھے آ جائیں اس کے معنی "روک دینے" کے ہو جائیں گے جیسے جحیم اور جہنم کے لیے جو روکنے

---

[1] جو شخص ذرا بھی عقل و فکر سے کام لے گا، وہ بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ ان لوگوں کا انجام ویسا ہی ہونے والا ہے، جیسا انجام، انہی جیسی اقوامِ سابقہ کا ہوا تھا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یہ قاعدہ نواب صدیق حسن خان نے اپنے مختصر سے رسالہ "العلم الخفاق فی علم الاشتقاق" میں دیا ہے۔ اس رسالہ میں مادوں (Roots) کے حروف کی بنیادی خصوصیات بڑی عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ اس کی توثیق تاج العروس اور محیط المحیط میں بھی موجود ہے کہ جن الفاظ میں "حاء" اور "جیم" اکٹھے آئیں ان کے معنوں میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائے گا۔ (لغات القرآن پیش لفظ جلد اول ص 24، وجلد چہارم ص 476)

کا آیا ہے یعنی وہ جو جن کی نشو ونما رک جائے' وہ مقام جہاں ارتقا کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکے۔ اسی طرح سے یہ ''حجر'' ہے۔ حُجرَۃٌ ان کے ہاں اونٹوں کے باڑہ یا کمرہ کو کہتے تھے۔ اس کی جمع حُجرَات ہے یعنی کمرے یا باڑے۔ یہاں کہا کہ وہ جس کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ وہ سمجھ لے کہ مجھے کس حد تک جا کر رک جانا چاہیے' اس کے لیے ان شہادات کے اندر اس بات کی جو ہم آگے کہہ رہے ہیں' بڑی واضح دلیلیں ہیں۔

تاریخی شہادتیں

عزیزانِ من! اپنے اسلوب و انداز کے مطابق قرآن Abstract (غیر محسوس) چیزیں لانے کے فوراً بعد تاریخی شہادات پیش کیا کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ ذرا سوچو اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ o اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ❶ (89:6-7)۔ ان سے کہو کہ یہ جوان کے لچھن ہیں' یہ جوان کے چلن ہیں' ان کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے لیے ذرا تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھیں۔ انہیں یہ کہا گیا تھا کہ تاریخ کے رقم شدہ ریکارڈ تو تمہارے پاس نہیں ہیں' ان اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات تو تمہارے سامنے ہیں۔ تم دن رات ان سے گزرتے ہو' ان کی اینٹوں پر لکھے ہوئے نقوش بھی اگر تم پڑھو' تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! میں تفصیل سے اس پورے قرآن کے دروس میں بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآنِ کریم تاریخ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

ہر واقعہ کے پیچھے ایک علت ہوتی ہے

قرآن نے History of Philosphy (فلسفۂ تاریخ) دی تھی۔ یہ نہایت Scientific (سائنسی) انداز سے بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں دنیا میں چیزیں یونہی By chance (اتفاقیہ) نہیں ہو جاتیں۔ ہر واقعہ جو ہوتا ہے' اس کے پیچھے اس کی علت ہوتی ہے' اس کا ایک Cause (سبب) ہوتا ہے۔ اور تاریخ صرف یہ بتانے کے لیے ہے کہ اگر معاشرے میں اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں' اگر انسان اس قسم کی روش اختیار کر لے' اگر کوئی قوم اس قسم کا نظام اختیار کر لے' تو اس کا انجام یہ ہوگا۔ جب اور جہاں بھی یہ صورتیں پیدا ہو جائیں گی' یہ Conditions (شرائط) اس قسم کے نتائج مرتب ہو کر رہیں گے۔ تاریخ سے مراد ہی قرآن کی یہ ہے۔ اور وہ اسی لیے اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد کو بار بار پیش کرتا ہے کہ تمہیں بتاتا جائے کہ اس قوم نے یہ روش اختیار کی تھی' تو اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا اور اگر تم بھی یہی روش اختیار کرو گے تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا۔ یہ ہے تاریخ کی وہ اہمیت جس کے لیے قرآن ایک دعویٰ کرتا ہے اور اس دعوے کے بعد پھر تاریخ کے شواہد پیش کر دیتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ تم نے اپنی یہ کیفیت اختیار کر رکھی ہے' بغیر محنت اور مشقت کے تمہیں اتنی دولت مل رہی

---

❶ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ''عاد'' کے ساتھ کیا کیا؟ (قومِ عاد ارم کی اولاد میں سے تھے)۔ انہیں قابل اعتماد سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل تھا (26:132-134)۔ وہ بڑی بڑی عمارات بناتے اور اپنی بلند یادگاریں تعمیر کرتے تھے۔ (26:128) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے' تم فکرِ معاش سے فارغ ہو گئے ہو' تمہیں امن مل رہا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ تم نوعِ انسان کی منفعت بخشی کے لیے کچھ کام کرو گے تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم نے دنیا بھر کی بدمعاشیوں کے اڈے بنا لیے ہیں' خدا کے گھر کو دولت کا یہ مصرف بنا لیا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب اس کے لیے دیکھنا چاہتے ہو کہ اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے تو قومِ عاد کو اور قومِ ثمود کو دیکھو۔

قومِ عاد کی مثال

پہلے قومِ عاد [1] کو لو۔ اب قرآن نے یہاں ان کا ذکر کیا ہے۔ مرکزی اعتبار سے ان کے جرم کی نوعیت ایک ہی تھی لیکن ان کے پیکر ذرا مختلف تھے۔ قومِ عاد کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم جب کسی مظلوم کے گلے کو گھونٹا کرتے تھے تو بڑی سختی سے ہاتھ ڈالا کرتے تھے قومِ عاد کے لیے **اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ** (89:7) کے الفاظ آئے ہیں۔ کیا الفاظ ہیں **ذات العماد**! کہنا تو یہ تھا کہ ان کے پاس بڑی فراوانی سے دولت آتی تھی لیکن یہاں لفظ ''عماد'' آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنی Confidence (بھروسہ' اعتماد) کے ہوتے ہیں' بھروسے کے ہوتے ہیں' اعتماد کے ہوتے ہیں۔ ویسے تو اس کے معنی ستون کے ہوتے ہیں یعنی وہ Pillar (ستون) جس کے اوپر کوئی عمارت کھڑی ہو۔ یہاں یہ کہا کہ ان کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ چھت گر نہیں سکتی' ہمارے ستون بڑے مضبوط ہیں اور **الَّتِىۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِى الۡبِلَادِ** (89:8) ان کے ہم عصر اقوام میں ان کی مثال نہیں ملتی تھی۔ ان کی کیفیت یہ تھی۔

---

[1] محققین علم الاقوام نے دنیا کی قوموں کو تین بڑی بڑی شاخوں میں تقسیم کیا ہے: (i) آریائی' (ii) منگولی اور (iii) سامی۔ سامی اقوام میں عرب' آرامی' عبرانی' سریانی' کلدانی وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن نے جن اقوام اور انبیائے کرام کا ذکر کیا ہے وہ سامی اقوام سے متعلق ہے۔ تاریخ کے ابتدائی ایام میں عرب کے گرد و پیش کے علاقہ شام' عراق وغیرہ میں ان امم سامیہ میں سب سے اہم اور مقتدر قوم' عاد کی تھی جو ایک طرف حضر موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار (ق۔م) تک ان علاقوں پر اس قوم کا تسلط نظر آتا ہے۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے انہیں قومِ نوح کا جانشین بتایا ہے (2:69) جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ابتدا بہت قدیم زمانہ میں ہوئی تھی۔ اس قومِ عاد کی طرف حضرت ہود مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف ریتلے بل کھاتے ہوئے ٹیلوں اور ریگستانی صحرا کو کہتے ہیں۔ عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے' احقاف کہلاتا تھا۔ قرآنِ کریم کا بیان ہے کہ اس قوم کو (اُس زمانے کے لحاظ سے) سامانِ زیست افراط سے حاصل تھا۔ آب پاشی کے لحاظ سے قدم قدم پر چشمے' پھلوں سے لدے ہوئے باغات اور اولاد اور مویشی کی کثرت (26:132-134) تھی۔ وہ ہر بلند مقام یا شاہ راہ عام پر بڑی بڑی عمارات بناتے تھے (46:26)۔ لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے انہیں ایسی غلط روش پر ڈال رکھا تھا کہ ان کا علم و بصیرت صحیح کاموں میں صرف نہیں ہوتا تھا (29:38)۔ حضرت ہود نے انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مانی اور ان پر ایسی مسلسل آندھی چلی کہ وہ تباہ و برباد ہو گئے (69:6-8)۔ انہیں قرآنِ کریم نے عاد اولیٰ کہا ہے (53:50)۔ ان میں سے جو حضرت ہود پر ایمان لا کر بچ گئے تھے ان کی نسل آگے چلی۔ انہیں عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم) ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961ص۔ 1118)

وہ بڑی بڑی عمارات بناتے اور بڑے بڑے میموریل (یادگاریں) تعمیر کرتے تھے (26:128)' جن کے متعلق ان کا وہم یہ تھا کہ یہ کبھی گر نہیں سکتے۔ قرآن تو اپنی بات سمجھانے کے لیے' پھر محسوسات سامنے لے آتا ہے۔

اجڑی ہوئی بستیوں کی مثال

قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جاؤ' ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کو دیکھو کہ ان کی چھتیں کس طرح اوندھی پڑی ہیں۔ یعنی انہی کا یہ لفظ ''ذات العماد'' لے کر انہی کی چھتوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ جا کر دیکھو' جن کو اپنے ستونوں پہ اعتماد تھا' ان کی چھتوں کی کیفیت کیا ہوئی۔ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ❶ (89:9)۔ یہاں قومِ ثمود ❷ کا بتایا کہ وہ پہاڑوں میں مضبوط قلعے بناتے تھے۔ قرآن نے اس کا جرم یہ بتایا ہے کہ اس کے بڑے بڑے سردار چراگاہوں اور چشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتے تھے اور غریبوں کے مویشیوں کو پانی تک نہیں پینے دیا کرتے تھے۔ یہی تھا واقعہ حضرت صالح علیہ السلام کا جو قرآن میں آیا ہوا ہے۔ آپ احباب کو اب پتہ ہے' تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کہا کہ ثمود کو دیکھو۔ ان کا نظام یہ تھا کہ خدا کی دی ہوئی زمین' اس پر خدا کا دیا ہوا رزق' اور صاحبِ اقتدار لوگ زمین پر لکیریں مار کر ان کو اپنی ملکیت میں لے لیتے تھے۔ غریب اور غریبوں کے مویشی پانی اور چارے تک سے محتاج ہو جاتے تھے۔ کہا کہ یہ تھا ثمود۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس ناقہ کے متعلق قرآنِ کریم نے کیا کہا ہے جسے افسانہ طرازیوں نے یہ بنا دیا کہ ایک چٹان میں سے اونٹنی نکل آئی تھی۔ بات تو قرآن نے اتنی کہی تھی کہ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے کہا یہ تھا کہ میں کچھ نہیں کہتا سوائے اس کے کہ یہ ارض اللہ ہے' خدا کی زمین ہے' یہ ایک مویشی (ناقہ) جو نہ میرا ہے نہ تیرا ہے' یہ سمجھو کہ یہ جاندار مخلوق خدا کی پیدا کردہ ہے۔ خدا کی مخلوق خدا کی زمین کے اوپر کھلی رہنی چاہیے۔ بات اتنی ہی کہی تھی۔ یہی ثمود کہ جن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ پہاڑوں میں' پتھروں کو تراش

---

❶ اور قومِ ثمود کا' جو پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتی تھی۔ (7:74; 15:82) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ تورات کے بیان کے مطابق سام' حضرت نوح کے ایک بیٹے کا نام تھا۔ ان کی اولاد سامی کہلاتی تھی۔ دورِ حاضرہ کی تحقیق کے مطابق امم سامیہ کا اولین وطن عرب تھا جہاں سے نکل کر وہ بابل' شام' مصر وغیرہ تک پھیل گئیں۔ ان میں سے جنہوں نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ ثمود کا تھا۔ ثَمَدٌ کے لغوی معنی کے پیش نظر' بعض کا خیال ہے کہ ان کا نام ثمود اس لیے تھا کہ ان کے علاقہ میں پانی کی قلت تھی اور یہ بارش کے پانی پر گزارہ کیا کرتے تھے۔ یہ قوم' عرب کے شمال مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ ''حجر'' ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم راستے پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ وادیٔ قریٰ کے گرد و پیش کا علاقہ بڑا سرسبز تھا لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز تھا۔ یہ قوم میدانوں میں وسیع و رفیع محلات تعمیر کرتی اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتی تھی جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے۔ (7:74; 15:83)۔ ان میں حضرت صالح مبعوث ہوئے تھے (7:73)۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد اول)' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' 1960' ص ص۔ 402-401)

تراش کر قلعے بنایا کرتے تھے۔ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ (89:10) اور فرعون،❶ جو بڑی محکم قوتوں کا مالک تھا وہ دورِ ملوکیت کا نمائندہ تھا۔ دور دور تک اس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ ان سب کے متعلق کہا کہ اَلَّذِیْنَ (89:11) ان سب لوگوں نے طَغَوْا فِی الْبِلَادِ (89:11) ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ ان کا جرم یہ تھا۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن ''ذی حجر'' (89:5) کا لفظ لایا ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ معلوم ہو کہ اس حد سے آگے نہیں بڑھنا۔ یہاں لفظ آیا ہے کہ وہ حدود فراموش ہو چکے تھے' انہوں نے حدود ہی توڑ دی تھیں' کہیں رکے ہی نہیں تھے۔ قوت' دولت' سرمایہ' حشمت یہ کوئی بری چیزیں نہیں ہیں۔ اسلام رہبانیت سکھانے کے لیے نہیں آیا۔ وہ حدود مقرر کرتا ہے۔ جونہی آپ نے حدود سے تجاوز کیا' یہ سب کچھ حرام ہو گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ (89:11) وہ ممالک کے اندر حدود شکنی کرتے تھے۔ یہ قوم تھی جو فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ (39:12) فساد انگیزی میں حدود فراموش ہو چکی تھی۔ فساد و ناہمواریاں پیدا کرتے چلے جانا ان کی کیفیت تھی۔ وہ معاشرے میں بڑی کثرت سے ناہمواریاں پیدا کرتے تھے اور کرتے چلے جاتے تھے۔

فساد اور خرابی اپنے زورِ دروں سے تیز تر ہو جاتی ہے

ناہمواری تو اپنے Momentum (معیارِ حرکت) سے بڑھتی ہے۔ ایک پیدا کیجیے' تو اپنے زورِ دروں سے وہ دس اور پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے یہاں فَاَكْثَرُوْا (89:12) کہا ہے یعنی فساد کی بنیاد ڈالی تو وہ خرابی زورِ دروں کی بنا پر تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ معاشرے کو انہوں نے یہ کچھ بنا دیا۔ پھر اس کا انجام کیا ہوا؟ اس کے لیے کہا کہ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ❷ (89:13)۔ ان کے ان اعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے تباہیاں آئیں اور مختلف انداز سے آئیں۔ تباہی تو ایک ہی شے ہوتی ہے۔ اس کے آنے کے اسالیب اور انداز مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی انداز سے کوئی قوم تباہ ہو۔ قوموں کی تباہی کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کو سَوْطَ عَذَابٍ (89:13) کہا۔ ویسے ''سوط'' کوڑے کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان عربوں کے ہاں کا وہ کوڑا چمڑے کے مختلف تسموں یا ٹکڑوں سے لپیٹ کر بنایا جاتا ❸ تھا' اس اعتبار سے ان کے ہاں مختلف نوعیتوں کی

---

❶ اس ماہیت اور تاریخ کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔119 نیز فٹ نوٹ نمبر 1

❷ تیرے نشوونما دینے والے کا قانونِ مکافات' ان پر طرح طرح کے عذاب لایا اور وہ سب تباہ و برباد ہو گئے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ یہ ابن فارس (المتوفی 395ھ) کی تصنیف مقاییس اللغۃ میں دیا گیا ہے۔ یہ لغت چھ جلدوں میں مصر میں 1952 میں طبع ہوتی تھی جو اس مؤلف کے پیش نظر ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تباہیوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا۔ یہ تباہیاں ہیں [1] یعنی خدا کا ہنٹر آیا۔ لیکن اسی لفظ کے اندر میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کے الفاظ سے یونہی نہ آگے گزر جایا کیجیے گا۔ یہ جو کہا ہے کہ مختلف نوعیّتوں سے تباہیاں آئیں تو اس کے لیے لفظ سَوْطَ عَذَابٍ استعمال کیا۔ اگر وہاں لٹھ کا استعمال ہوتا تو اس کی ایک ہی حیثیت ہوتی ہے لیکن وہ جو چمڑے کے ٹکڑوں کا بنا ہوا کوڑا ہوتا ہے وہ استعمال ہوا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں مختلف تسموں اور ٹکڑوں کی مختلف قسم کی چیزیں ایک بن گئی ہوتی ہیں تو تباہی ایک ہے اور نوعیت اس کی مختلف ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے لیے کہا کہ اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ [2] (89:14)

خدا کا قانونِ مکافات ہر آن گھات میں رہتا ہے

یہ (89:14) بڑی عجیب چیز ہے جو کہی ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم یہ کچھ کر کے نہایت حفاظت سے دبے پاؤں اس راستے سے گزر کر اپنے گھر چلے جائیں گے لیکن اگر پولیس کو خبر ہو جائے کہ یہ جو مجرم ہیں انہوں نے فلاں راستے سے گزرنا ہے تو وہ ابتدا ہی میں ان کو گرفتار نہیں کرتی، وہ چھپ کے اس راستے میں بیٹھ جاتی ہے کہ جب وہ یہاں سے گزریں گے تو چھاپہ مار کر انہیں پکڑ لیں گے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ ''جرم کیا دیکھنے والا کوئی ہے نہیں اب نہایت امن وحفاظت سے ہم اس راستے سے گزر کر گھر پہنچ جائیں گے۔'' انہیں پتہ نہیں تھا کہ خدا کا قانونِ مکافات اُس راستے میں گھات لگا کر بیٹھا ہوتا ہے جس راستے سے ان کے عمل نے گزرنا ہوتا ہے۔ کیا چیز ہے! عمل ہمیشہ پہلے ہوتا ہے نتیجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یہ جو اس عمل کا نتیجہ ہے اس کے متعلق کہا کہ جیسے ہی عمل نے اس راستے سے گزرنا ہے وہاں راستے میں یہ گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ جونہی یہ آیا اور اس کو دبوچا۔ کہا کہ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ خدا کا قانونِ مکافات ان راہوں میں گھات لگا کر بیٹھا ہوتا ہے جن راہوں سے انسان کے عمل نے گزرنا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! اب آگے بڑی عجیب بات آئی ہے۔ کہا کہ ''یہ سارا اس لیے ہے کہ انسان سمجھتا یہ ہے کہ اس دنیا کے اندر یہ سارا کچھ جو چل رہا ہے، محض اتفاقات (Chances) کے ذریعے ہے یا دھاندلی سے ہے یعنی یا تو جو کوئی دھاندلی مچا دے تو وہ جس طرح جی چاہے کر لے یا محض Chance سے اتفاقات سے ایسا ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی خاص قانون نہیں کسی Effect (معلول) کے لیے کوئی Cause (علت) نہیں۔ کوئی چیز انسانوں کے ذہن میں ہوتی ہے اس لیے وہ جرائم پر آتے ہیں قانون شکنی کرتے ہیں قرآن کہتا ہے

---

[1] عربوں کے ہاں ہر شدید اور دردانگیز سزا کو سَوْطَ عَذَابٍ کہہ دیتے تھے۔ لیکن پطرس بستانی کی محیط المحیط محبّ الدین (متوفی 1205ھ/1791ء) کی ''تاج العروس'' اور امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) کی ''المفردات فی غریب القرآن'' کے مطابق سَوْطَ عَذَابٍ سے مفہوم انواع واقسام کے عذاب ہیں۔ (لغات القرآن۔ پرویز)

[2] اس لیے کہ اس کا قانونِ مکافات ہر ایک کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ کسی کا کوئی عمل اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ (لہٰذا جو انجام اُن لوگوں کا ہوا تھا وہی ان سردارانِ عرب کا ہوگا جو اپنی بدمستیوں میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں رہتا کہ یہاں ہر شے ایک قاعدے اور قانون کے مطابق ہو رہی ہے اور خدا کا قانونِ مکافات گھات میں رہتا ہے۔

مذہب کی تراشیدہ ذہنیتوں کی ایک خوبصورت مثال

اب دیکھیے کہ قرآن اس کی کیا مثال دیتا ہے۔ یہ تو ہر روز ہم نے سنا ہی ہوگا کہ اگر کسی کو Promotion (ترقی) مل جائے اور آپ اسے مبارکباد دینے کے لیے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کہیں گے کہ صاحب! یہ کچھ تو اللہ کا فضل ہوا ہے ورنہ میں تو بڑا نالائق سا آدمی ہوں مجھ میں تو کوئی ایسی قابلیت نہیں میں تو اس کا مستحق نہیں تھا مجھ سے کئی بڑے بڑے اچھے بہتر پڑے ہوئے ہیں یہ جو مجھے چن کر Promote (ترقی) دیا گیا ہے یہ اس کا فضل ہے اس کا خاص کرم ہے: هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (27:40)۔ ایسا کہنے والے کے متعلق ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا خدا ترس آدمی ہے اللہ کو ماننے والا آدمی ہے اسی لیے یہ کچھ کہتا ہے۔ اسے ایسا کہنے والے کی بڑی خوبی قرار دیا جاتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر یہاں کے کسی دفتر کے افسر کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ ایسے لوگوں کو Promotion (ترقی) دے دیتا ہے جو بڑے نالائق ہوتے ہیں اس سے بڑے اچھے اچھے رہ جاتے ہیں۔ تو اس اقربا نوازی کو آپ کیا کہیں گے۔ اُسے ہر شخص گالی دے گا اس نظام کو بدترین نظام کہے گا اور کیا کہیں ان کی عقلوں کو کہ اپنے ہاں جس چیز کو بدترین نظام کہتے ہیں ایسا کرنے والے کے متعلق روز شکایتیں کرتے ہیں گالیاں دیتے ہیں مگر خدا کے متعلق بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ صاحب! میں بڑا ہی نالائق تھا اس کا میرے حال پر بڑا کرم ہے۔ کیا بات ہے! ہم نے کیسا خدا بنا رکھا ہے: مہاراجہ رنجیت [1] سنگھ (1780-1839) کے پیکر جیسا۔ جی ہاں یہ خدا کی کرم نوازیاں ہیں میرا اس میں کچھ نہیں ہے یعنی وہی ہذا من فضل ربی۔ آپ دیکھیے کہ مذہب کی دنیا کے اندر کبھی اس چیز کو قابل گرفت نہیں سمجھا جاتا اسے معیوب قرار ہی نہیں دیا جاتا۔ کسی کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ یہ کہنا بھی کوئی بری بات ہے کہ یہ تو خدا کی عنایت اور اس کے کرم سے ہوا ہے۔ آپ نے غور فرمایا۔ میں نے یہ بات عرض کی تو غالباً آپ کے ذہنوں میں بات آئی کہ ہاں صاحب! ہوتا تو روز ایسا ہے لیکن شاید اس سے پہلے آپ کے ذہن میں بھی بات نہ آئی ہو کہ اس میں کوئی برائی کی چیز ہے اور مذہب کی دنیا کے اندر تو کبھی کسی کے حیطہ خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ ایسا کہنا بھی کوئی جرم ہے کہ انسان کو کوئی اچھی چیز ملتی ہے کہ اس کے متعلق کہے کہ نہیں صاحب! اس میں میری کاریگری تو نہیں ہے۔

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ (1780-1839) پنجاب کا سکھ شہزادہ جس نے 1799 میں لاہور کو اپنے زیر اقتدار لانے کے بعد اپنے آپ کو مہاراجہ کہلوانا شروع کر دیا۔ جب افغانوں اور پٹھانوں سے پنجاب کی زمامِ اقتدار چھین لی تو ''شیر پنجاب'' کا لقب اختیار کر لیا۔

Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited, P.127)

مذہب کی دنیا کے اندر خواہ وہ عیسائیت کی Grace ہو یا آپ کے ہاں فضلِ ربی ہو' اس چیز کو ہمیشہ مستحسن قرار دیا جائے گا لیکن یہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں آ کر پتہ چلتا ہے کہ قرآن ان مذہب زدہ ذہنیتوں کا تراشیدہ نہیں ہے۔ یہ اس سے اونچے مقام سے آیا ہوا ہے۔

لفظ بلا کا مفہوم

وہ چیز پھر دہرادوں جسے تاریخ انسانیت نے' مذہب کی دنیا میں' کسی بھی دور میں' کبھی بھی' معیوب قرار نہیں دیا کہ انسان کو جو کچھ ملے اسے وہ کہے کہ خدا کا کرم ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب انسان وحی کی روشنی سے منہ موڑ لیتا ہے اور عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے' تو قانون کا تصور ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قانون کے تصور سے مراد یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے کسی نہ کسی انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کے سامنے یہ حقیقت نہ ہو' وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے یونہی اتفاقی طور پر واقع ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی اس غلط نگہی کا نتیجہ ہے۔ سن لیں کہ اس سلسلے میں قرآن کیا کہتا ہے: فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَابْتَلٰـهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ o فَيَـقُـوْلُ رَبِّیْٓ اَكْـرَمَنِ [1] (89:15)۔ یہاں بلا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی مصیبت کے نہیں ہوتے' اس کے معنی ہوتے ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کے اندر بدل دینا' کسی کا پہلو بدل دینا' برائی ہے اس کو اچھائی کے ساتھ بدل دیا جائے۔ اس کے لیے بھی یہ بلا کا لفظ آتا ہے۔ ہمارے ہاں تو بلا مصیبت ہی کے لیے آتا ہے لیکن عربوں کے ہاں اس لفظ کے معنی ہیں کہ ''جو حالت ہے' اس حالت کو تبدیل کر کے دوسری حالت پہ لے آنا' بدل دینا پہلو بدلنا' جسے آپ گردش کہتے ہیں۔'' قرآن نے اسی لیے ''بَـلَاءً حَسَـنًا'' [2] (8:17) کہا ہے یہ وہی ہے جو آغا حشر [3] (1879-1935) نے ایک دفعہ ''خوبصورت بلا'' لکھا تھا۔ ہمارے ہاں تو کوئی اور بات تھی جو اس نے کہی ہے۔ عربی کے اندر بلا کے معنی پہلو بدلنا ہوتا ہے۔

سنیے پھر اسی بات کو جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ مذہب کی دنیا میں کبھی کسی کا خیال بھی اس طرف نہیں آتا ہوگا۔ تو یہ کہنا کہ صاحب! میں تو Deserve (مستحق) نہیں کرتا تھا' خدا کا کرم ہے جو کچھ ہوا۔ کہا کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جب مثلاً ان کو ایسی

---

[1] جب کسی کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ' یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عزت اور آسائش عطا کر دیتا ہے۔'' (یعنی اس کے ہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] لِيُبْـلِـىَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا (8:17) تا کہ وہ زندگی کی کامرانیوں سے انہیں یہ مواقع بہم پہنچادیں کہ وہ دنیا کو بتادیں کہ حکومت ملنے پر وہ کس قسم کے کام کرتے ہیں۔ (ایضاً)

[3] آغا محمد شاہ نام' حشر تخلص' والد کا نام ناصر آغا سید غنی شاہ کاشمیری۔ آغا حشر بنارس میں 1879ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک بلند پایہ اردو ڈرامہ نگار تھے۔ خطیبانہ آہنگ' روانی' شوخی' شگفتگی' شعریت اور فقرہ بازی ان کی تماثیل کے خاص اوصاف ہیں۔

گردش آتی ہے، جس میں انہیں بہت کچھ ملتا ہے' آسائشیں نعمتیں ملتی ہیں' جسے قرآن نے اکرمہ (98:15) یعنی وہ اسے خدا کا کرم کہتے ہیں۔اس سب کچھ کے لیے وہ کہتا ہے: فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (89:15) وہ کہتا یہ ہے کہ صاحب! میں تو کچھ نہیں تھا' خاص خدا کا کرم ہوا میرے حال پہ۔اللہ اکبر۔اس چیز کو یہ معیوب قرار دے رہا ہے۔بھئی! تم نے خدا کو کیا سمجھا ہے۔سارا نظام زمین پہ گر جاتا ہے جو یہ سمجھ لیا جائے کہ خدا تو یونہی سا ہے جسے چاہتا ہے بیٹھے بٹھائے بخش دیتا ہے۔او مالک' لکھوں لکھ کر دے' لکھوں لکھ کر دے' جو مرضی کرے۔بے نیاز جو ہے' بے پرواجو ہے صاحب۔کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے۔برادرانِ عزیز! قرآن عجیب چیز کہہ گیا ہے۔یہ چیز کبھی کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتی۔میں نے کہا تھا کہ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑا ہو کر قرآن مذہب کو چیلنج دیتا ہے۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے متعلق یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی جب کسی کو چاہتا ہے تو نواز دیتا ہے اور یہ کچھ دے دیتا ہے۔

اگلی بات

عزیزانِ من! پہلی بات تو یہ تھی۔اب یہاں اگلی بات یہ آئی کہ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ (89:16) اور جب پھر دوسری گردش آتی ہے' پہلو بدلا جاتا ہے' اس پہلو بدلنے کے بعد ہوتا کیا ہے؟ آپ دیکھیے کسی اور چیز کا ذکر نہیں کیا کہ پھر ہوتا کیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ پھر رزق کی تنگی آ جاتی ہے۔اس پر دنیا کی مصیبتوں' گردشوں اور تباہیوں کی بنیاد ہے۔قرآن اس بنیاد پہ جاتا ہے۔اِدھر یہ کہا تھا کہ اس کے اکرام' نوازشات ساری چیزیں ہیں۔دوسری طرف صرف ایک بات کہی ہے کہ اس بات کے بعد تو باقی سب کچھ آ جائے گا کہ جب پھر دوسری گردش آتی ہے' پہلو بدلا جاتا ہے' اور اس کے رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (89:16) اس وقت بھی پھر چلاتا ہے کہ ''میرے رب نے مجھے خواہ مخواہ کے لیے تباہ کر دیا' برباد کر دیا ہے۔'' صاحب! یہ دیکھیے کہ یہاں پہنچ کر بھی پھر وہ آپ کے سامنے تقدیر کا مسئلہ آ جاتا ہے۔کہ صاحب! وہ تو مالک ہے جس حالت میں چاہے رکھے' بندے کو راضی برضا رہنا چاہیے' صبر وشکر کرنا چاہیے' زبان پہ تو ایک طرف رہا' دل میں بھی شکوہ نہیں ہونا چاہیے۔بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی' ہم نے تو کچھ کیا نہیں تھا یعنی آپ تو بالکل معصوم بن رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نے خواہ مخواہ کے لیے ہمیں یہ سزا دی۔کسی حاکم کے متعلق یہ کہیے کہ صاحب! ہم نے کیا تو کچھ نہیں تھا' خواہ مخواہ کے لیے یہ سزا مل گئی لیکن بہر حال اب حکم حاکم مرگِ مفاجات۔کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے بھائی! اسے برداشت کرو۔قرآن کہتا ہے کہ جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو اس وقت یہ کہنے لگ جاتا ہے کہ یونہی میرے خدا نے مجھے ذلیل کر دیا۔میں نے بھی یہ لفظ ذلیل کر دیا کہہ دیا ہے۔کیا کہوں' برادرانِ عزیز! قرآن کے الفاظ آتے ہیں تو آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔سارا اعجاز تو ان الفاظ کے اندر ہی ہے۔یہاں لفظ ہے: اھانن۔میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان کے اندر مترادفات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی' یہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص لفظ چنتا ہے۔یہ قرآن ہوا۔اہانت کے معنی ہمارے ہاں بھی ذلت کے

ہی ہوتے ہیں، توہین کے ہوتے ہیں، بے عزتی کے ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ عرب اسے کہاں استعمال کرتے تھے؟ وہ اسے استعمال کرتے تھے جسے آپ کے ہاں قناعت کہتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں قناعت کا تو پوچھو نہیں صاحب! ہمارے ہاں قناعت کے معنی ہوتے ہیں اپنی کسی حالت پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا، یہ ہے قناعت۔ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہی انسان میں انکساری پیدا ہوتی ہے۔ سنتے جایئے یہ الفاظ۔ دیکھیے یہ زبان کیا ہے۔

یہ انکساری گردنِ فروزاں کی انکساری نہیں ہوتی بلکہ اہانت ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس ''قناعت'' کی وجہ سے پھر ایک انکساری پیدا ہوتی ہے۔ وہ جو انکساری ہے وہ گردنِ فروزاں کی انکساری نہیں ہوتی جسے تواضع کہتے ہیں۔ یہ گدا کی انکساری ہوتی ہے۔ یہ اس کی پیدا کردہ ایک کمزوری ہوتی ہے۔ عربوں کے ہاں ایسی قناعت جو انسان کو ساکن کر دے اور اس بنا پر اس کے اندر انکساری آ جائے انہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ ذلت ہے جو انسان کو دنیا میں کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ اس کے لیے ان کے ہاں لفظ اہانت ہے۔ یہاں قرآن یہ لفظ لایا ہے کہ جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اپنے اندر قناعت پیدا کرتا ہے۔ ٹھیک ہے راضی برضا کہ اس سے طبیعت کے اندر انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ہر محکوم محتاج کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا دوسرا نام ذلت ہوتا ہے۔ قناعت کی یہ جو کیفیت ہے اسے اہانت کہتے ہیں۔ قرآن یہاں یہ لفظ لایا ہے۔ کہتا ہے کہ اس وقت پھر یہ چلانا شروع کر دیتا ہے کہ صاحب! مجھے خدا نے یونہی تباہ کر دیا، مجھے یونہی ذلیل کر دیا۔ اب سنیے برادرانِ عزیز! کیا مقام آ رہا ہے۔ کہا کہ ان سے کہو کہ خدا اس طرح دھاندلیاں نہیں کرتا۔ اس کے ہاں کوئی چیز بھی بلا وجہ نہیں ہوتی۔ اگر کچھ ملا تھا تو وہ بھی یونہی نہیں تھا، وہ بھی ایسے نہیں ہو گیا تھا اور اگر یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے تو یہ بھی ایسے ہی نہیں۔ کہا کہ اس کے متعلق بتا دیئے کہ یہ چیز کیوں ہوئی ہے۔

تمہارے ذلیل ہونے کا سبب کیا ہے؟

اگلی چار پانچ آیات، عزیزانِ من! اسی کے متعلق ہیں اور عظیم آیات آ رہی ہیں۔ کہا کہ تم کہتے ہو کہ خدا نے ہمیں اس طرح ذلیل کر دیا ہے، ضعیف کر دیا ہے، کمزور کر دیا ہے، ناتواں کر دیا ہے، ایسے ہی کر دیا ہے۔ کہا کہ **کلا** (89:17) کیا کہتے ہو تم، یہ قطعاً نہیں، اس طرح ہو نہیں سکتا۔ اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ سن رکھو کہ تم کیوں ذلیل ہوئے ہو، تمہاری یہ حالت کیوں ہوئی ہے؟ اس لیے کہ **بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ** (89:17) معاشرے میں جو تنہا رہ جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم ساری پوزیشن دکھاتے ہیں، اس کے بعد دفتروں کی فائلیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ اس میں پتہ چلے کہ یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ کہا کہ ان کاغذوں میں کچھ نہیں ملے گا۔ بات یہ تھی کہ **كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ** (89:17) تمہاری یہ کیفیت اس لیے ہوئی ہے کہ معاشرے میں جس کے ساتھ جتھہ نہیں ہوتا تھا، جس کے ساتھ پارٹی زیادہ نہیں ہوتی تھی، جس کے پیچھے کچھ ووٹرز اتنے نہیں ہوتے تھے، تم اس کو خاطر میں نہیں لاتے تھے: **لَا**

تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ۔تم اس کی حفاظت نہیں کرتے تھے' اس کی عزت بھی نہیں کرتے تھے۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں معیارِ عزت کیا آ گیا۔خدا نے کہا تھا کہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (49:13) عزت تو شرافت نفس کی بنا پر ہونی چاہیے' حسن کردار کی بنا پر ہونی چاہیے' اس کے کیریکٹر کی بلندی کی بنا پر ہونی چاہیے۔تم نے یہ معیار قائم کیا تھا کہ جس کا جتھہ زیادہ' جس کے ووٹرز زیادہ' جس کے پیچھے پارٹی زیادہ' اس کی عزت زیادہ۔معاشرے میں جو تنہا رہ جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کیا کرتے تھے۔وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (89:18) اور جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جایا کرتا تھا' تم ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے تھے کہ ہمیں اس کی روٹی کا انتظام کرنا چاہیے۔یہی بات نہیں کہ تم خود نہیں دیتے تھے یہاں قرآن نے دو چیزیں بیان کی ہیں۔خود تو وہ بہرحال اپنی اپنی Contribute کرے گا ہی' اتنی سی بات نہیں ہے۔معاشرہ ایسا ہے جس کے اندر انسان ایک دوسرے کو اس کی تاکید نہ کرے کہ دیکھو کسی ایسے شخص کو روٹی سے محرومی نہ نصیب ہو جائے کہ کسی وجہ سے اس کی حرکت رک جائے۔یہی ہوتا ہے کہ جس کی چلتی ہوئی گاڑی رک جائے قرآن کہتا ہے کہ تمہاری کیفیت یہ تھی کہ معاشرے میں جو اکیلا رہ جاتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔جس کا کاروبار کسی وجہ سے رک جاتا تھا اس کے رزق کے سامان کے لیے تم ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیا کرتے تھے۔

عزیزانِ من! پہلے میں چاروں جرائم گنا لوں تو پھر ایک اور بات کہوں گا۔یہ بڑی اہم بات ہے۔قرآن بتاتا یہ ہے کہ تم کیوں ذلیل ہوئے ہو۔

ذلت کا مدار چار چیزوں پر ہے

پہلی چیز یہ ہے کہ جس کے ساتھ پارٹی اور جتھہ نہیں ہوتا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔دوسری چیز یہ ہے کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جاتا تھا تم اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے تیسری چیز یہ تھی کہ وَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا [1] (89:19)۔ تمہاری کیفیت یہ ہوتی تھی کہ تمہارے ماں باپ نے جو کچھ کمایا' اور پھر کمانے کے بعد جو اتنی کروڑوں لاکھوں کی جائیداد مرنے کے بعد تمہیں دے گئے تو تم اسے اکیلے ہی سمیٹ کر کھا جایا کرتے تھے۔عزیزانِ من! سمجھ آیا کہ ذلت کی اصل بنیاد کیا ہے۔یہاں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر اسلام میں سرمایہ داری اور ذاتی ملکیت نہیں ہے تو وراثت کے احکام کیوں آ گئے ہیں؟ اسے فرض قرار دے دیا گیا کہ ہر ایک اتنا چھوڑ کر مرے تاکہ اس کے بعد جو آنے والے ہیں آپ اُن کے لیے احکامِ وراثت نافذ کر سکیں۔آپ کے ہاں تو ان کے نزدیک یہ ہے اور یہ کچھ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ وہ ذاتِ اقدس واعظم جو اس قرآن اور دین پر عمل کرنے میں بلند ترین مقام پہ تھی' جس کا اسوہ باقیوں کے لیے نمونہ بنتا ہے' اس نے یعنی حضور ﷺ نے ایک پائی بھی وراثت میں نہیں چھوڑی تھی اور یہی نہیں کہ چھوڑی نہیں تھی بلکہ یہ

---

[1] تم کرتے یہ تھے کہ جو کچھ تمہارے ماں باپ سے تمہارے قبضے میں آ جاتا تھا' اسے بھی سمیٹ کر کھا جاتے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

وراثت تو ایک طرف رہی' یہ زکوٰۃ جو کہتے ہیں کہ باون تولہ چاندی ہو' تو اس کے اوپر پڑ جاتی ہے' رسول اللہ ﷺ نے ساری عمر زکوٰۃ ہی نہیں دی کیونکہ انہوں نے اثنا رکھا ہی نہیں تھا جس پہ زکوٰۃ واجب ہو اور وراثت کے متعلق تو یہ کہہ دیا تھا کہ ہم لوگ کوئی چیز وراثت میں نہیں چھوڑا کرتے اور اگر یہ جو مستعملاً میری چیزیں ہیں' یہ بھی اگر وراثت میں آ جائیں گی تو انہیں بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ یہ ہے نظام۔ یہ جو آپ کے ہاں وراثت' خیرات وغیرہ کے' احکام ہیں' یہ تو برادرانِ عزیز! Interim Period (عبوری دور) کے ہیں۔ یعنی جب وہ نظام ابھی شروع ہی ہوا ہو جس میں آپ نے آہستہ آہستہ آخری نظام تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ آپ کو احکام دیتا ہے اور دیتا اس طرح ہے کہ اس میں قدم بقدم انسان اس منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ جس معاشرے کا عام چلن یہ ہو جائے کہ جو کچھ وراثت میں آ گیا ہے' وہ اُسے سمیٹ کر اکیلا ہی کھا جائے تو اس لیے تباہی آتی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے کوئی ایک سمیٹ لیتا ہے۔ اس نے تو پھر بھی سمیٹنے کے لیے کچھ کوشش اور محنت کی تھی' یہ جو اس کے گھر میں پیدا ہو جاتا ہے' یہ پیدائش کے ساتھ ہی سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا جرائم قرار دے رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم کہتے ہو کہ خدا نے یونہی ذلیل کر دیا ہے۔ نہیں' یہ ایسا نہیں ہے خدا یونہی کسی کو ذلیل نہیں کیا کرتا۔ اس ذلیل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تم معاشرے میں تنہا رہ جانے والوں کی عزت نہیں کیا کرتے تھے۔ جس کا کاروبار رک جایا کرتا تھا تم اس کی روٹی کے لیے ایک دوسرے کو تاکید نہیں کیا کرتے تھے۔ اوپر سے جو کچھ تمہیں وراثت میں لاکھوں کی تعداد کے اندر ملتا تھا تم اُسے شیر مادر کی طرح حلال وطیب سمجھ کر' سمیٹ کر' کھا جایا کرتے تھے۔ چوتھی چیز یہ تھی کہ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا [1] (89:20)۔ مال کی محبت کوئی بری چیز نہیں ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تو زینت ہے لیکن آپ دیکھیے کہ یہاں مال کی ایک محبت ہے جسے جرم قرار دیا ہے جس کا نتیجہ قومی تباہی اور ذلت ہوا کرتا ہے۔ پہلے تو یہ ہے کہ حُب یعنی محبت کے معنی ''کشش'' کے ہوتے ہیں یعنی مال کی کشش۔ یہاں لفظ آیا ہے: حُبًّا اور اس کے ساتھ دوسرا لفظ ہے: جَمًّا (89:20)۔

---

[1] اور اس کے ساتھ ایسی تدابیر کرتے رہتے کہ دوسروں کا مال بھی' اِدھر اُدھر سے سمٹ کر' اس طرح تمہاری طرف کھنچ کر چلا آئے' جس طرح وادی کا تمام پانی نشیب زمین کی طرف بہہ کر آ جاتا ہے۔ (یعنی ایسا نظامِ سرمایہ داری جس میں چھوٹے چھوٹے سرمائے' بڑے بڑے سرمائے کے اندر جذب ہوتے چلے جائیں اور اس طرح دولت چند افراد کے پاس مرتکز ہو کر رہ جائے۔ اس قسم کا نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ تم اس قدر ذلیل ہو گئے ہو۔ ہمارے ہاں سے عزت وتکریم یونہی اندھا دھند ملتی ہے نہ اندھا دھند چھنتی ہے۔ وہ بھی انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے' اور یہ بھی اس کی اپنی کرتوتوں کا انجام)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

گڑھا کھودنا کہ سب کچھ اس میں جمع ہو جائے

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کیسے عمدہ برمحل الفاظ لایا ہے۔ آج کے دور کے نظام کو دیکھیے تو ان الفاظ میں سمٹا ہوا پورا نظام آ جاتا ہے۔ یہاں ''جما'' کا لفظ ہے۔''جما'' ہوتا ہے کسی جگہ نشیب میں گڑھا کھود دینا تاکہ اِدھر اُدھر جتنی بارش ہو اس کا پانی وہیں آ جائے۔ سارے نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے۔ برادرانِ عزیز! سارے چھوٹے سرمائے سمٹ سمٹا کر نظام سرمایہ داری کے اس گڑھے میں آ جاتے ہیں۔ بارش تو برسے گی، ہر جگہ برسے گی، لیکن انتظام یہ کرنا کہ وہ سارا پانی بہہ کر اس کے گڑھے کے اندر آ جائے۔ یہاں کہا ہے کہ حُبًّا جَمًّا (89:20) مال میں کشش ہے، محنت کرو اسے حاصل کرو لیکن یہ کیفیت تو وہی چیز ہے جو کہا ہے کہ

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ   تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات ❶

انسان اپنے بنائے ہوئے نظام کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے

عزیزانِ من! سرمایہ داری نظام میں ایک روپیہ سو روپے کے اندر جا ملتا ہے، ہر چھوٹا سرمایہ بڑے سرمائے کے اندر جذب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں جہاں بارش برستی ہے اس کے لیے یاد رکھیے کہ یہ بارش تو بے مزد و معاوضہ مل گئی تھی لیکن یہ دیکھیے کہ اگلا نظام تمہارا اپنا پیدا کردہ ہے کہ نشیب پیدا کرو اور اس طرح اپنا گڑھا ایسا کھودلو کہ ہر طرف کا پانی سمٹ کر اس کے اندر آ جائے اور تمہاری محنت کے بغیر آ جائے۔ آپ نے تو گڑھا ہی کھودنا ہے۔ بس ایک دفعہ یہ Setup کر دیجیے، ایک دفعہ ایک بڑا سا گڑھا کھود دیا جائے پھر وہ تو باپ نے کھدائی کی تھی، تمہیں تو وہ بھی اس طرح وراثت میں مل گئی، ان کی گڑھے کی ملکیت ہے۔ اس میں ہو کیا رہا ہے؟ بس یہی کہ جہاں بارش کا قطرہ برستا ہے اس میں آ پڑتا ہے۔ یہ ساری زمینیں خشک رہ جاتی ہیں، یہاں یہ گڑھا بھر جاتا ہے۔ یہاں سے پھر یہ پانی بیچتا ہے۔ سن رہے ہیں، برادرانِ عزیز! کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

یہاں یہ کہا ہے کہ وہ چیخ اٹھے کہ صاحب! ہمیں خدا نے تباہ کر دیا، ایسے ہی ساری قوموں میں ذلیل کر دیا۔ ہم ایسے نہیں ہیں۔ کیا کرتے؟ کہا کہ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ تم کیا کرتے تھے۔ یہاں قرآن نے اجتماعی نظام کی بات کہی ہے کہ یہ تھا تمہارا نظام! آپ نے برادرانِ عزیز! چار ٹکڑے دیکھ لیے: (i) جو تنہا رہتا تھا اس کی عزت نہیں کرتے تھے، (ii) جس کا کاروبار رک جاتا تھا اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے، (iii) جو وراثت میں آتا تھا اسے شیر مادر سمجھ کر پہلے ہی سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور (iv) نظام ایسا تھا کہ جہاں کہیں بارش برسے، تمہارے گڑھے کے اندر سارا پانی آ جائے۔ یہ وجہ تھی کہ تم اس طرح ذلیل ہوئے تھے۔

---

❶ (یہ مثل ہے کہ) دولت مند ہی کو اور دولت ملتی ہے۔

میں نے پہلے بھی غالباً ایک آدھ مرتبہ یاد دلایا تھا اور آج تو وہ آیت سامنے آ گئی' اس لیے جی نہیں چاہتا کہ آیت سامنے آئے اور یوں اس سے آگے گزر جاؤں۔ یہ آیت تیرہ سو برس سے ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے ہاں کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ یہ بات بتاتا کہ یہ جو سرمایہ داری کا نظام ہے' جس میں تباہیاں آتی ہیں' یہ آیات اس کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اُن آیات کی یہ تفسیر سمجھ میں آئی ہے تو پھر یہ ایک غیر مسلم کی سمجھ میں آئی ہے' ایک امریکی جرنلسٹ کی سمجھ میں آئی ہے۔

چین کی کامیابی پر امریکی جرنلسٹ کا تجزیہ

جب موجودہ چین کو کامیابی حاصل ہوئی ہے تو وہ امریکا کی بہت بڑی شکست تھی۔ دراصل امریکا کی ٹیم کا اشتراک تو بساطِ سیاست پر صرف ایک مہرہ تھا۔ موجودہ چین کی کامیابی اس کے لیے بہت بڑی شکست تھی۔ اس شکست سے سارے امریکا میں کہرام مچ گیا۔ بڑی بڑی ایجنسیاں قائم ہوئیں کہ اس شکست کے اسباب جاننے کے لیے وہ چین جا کر تحقیقات کریں کہ یہ کچھ کیوں ہوا: اتنی قوت' اتنی دولت' اتنا سرمایہ' اتنا اسلحہ' پھر ہمیں یہ شکست کیوں ہوگئی؟ ایک صحافی ❶ چین میں گیا۔ وہاں جا کر اس نے حالات کا جائزہ لیا۔ اس کا نام جیک بالجن تھا۔ اس نے ❷ "China Shakes the World" کتاب لکھی۔ اس نے سارا تجزیہ کر کے بتایا کہ ہمیں شکست کیوں ہوئی لیکن سارے تجزیے کا جو ماحصل تھا' اس نے' عزیزانِ من! دو فقروں کے اندر سمیٹ کر رکھ دیا۔ اس کی یہ کتاب "China Shakes the World" میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی اس کتاب کے شروع میں' اپنے تجزیہ کو Foreword (پیش لفظ) میں بیان کرتے ہوئے جو لمبی بات کہتا ہے' اُسے تو چھوڑ دیجیے کہ کیا کیا چیزیں تھیں۔ وہ اس پیش لفظ کے آخر میں آ کر کہتا ہے۔ عزیزانِ من! غور سے سننے کی بات ہے' پھر سوچیے کہ یہ قرآن کن کن کی سمجھ میں آتا ہے۔ یہ اُن کی سمجھ میں آتا ہے جو عقل و بصیرت سے اس پر غور کرتے ہیں' ان کے دل و دماغ پر تقلید اور قدامت پرستی کی پٹیاں نہیں بندھی ہوئی ہوتیں۔ قرآن خود بولتا ہے۔ پھر سوچ لیجیے کہ یہ امریکی جرنلسٹ ہے' کوئی مذہبی انسان بھی نہیں ہے۔ وہاں جا کر China (چین) میں تحقیق کرتا ہے۔ وہ اس شکست کا Root cause (بنیادی وجہ) بتانا چاہتا ہے کہ ہمیں یہ شکست کیوں ہوئی ہے اور Chinese people (چینی لوگ) کیوں اس طرح کامیاب ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ وہ کہاں پہنچتا ہے۔ سب کچھ لکھ کر' وہ کہتا ہے کہ

Neither the American government the American press nor the American people, nor many of their representatives in the Far East, in the embassies, nor

---

❶ جیک بالجن (Jack Baljon)

❷ چین نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

the military establishments and the business offices sought to look beyond their own narrow national or personal interests toward the heart of the admittedly ignorant but terribly emotional, bitter men and women of China

اور آگے ہے وہ بات جو میں کہنا چاہتا ہوں

To all such people one could justly address the world Mohammad (PBUH) used to denounce the mecean merchants:

But ye honor not the orplans Nor urge ye one another to feed the poor. (89:17-18) No such wrold could be addressed to the Chinese Communists, And such are the world that are transforming the world today.

اس نے کہا کہ اس شکست کا Root cause (بنیادی سبب) یہ تھا کہ یہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو ان چینی کمیونسٹوں کو وہ کچھ کہتا جو محمد ﷺ قریش کے تاجروں سے کہا کرتا تھا کہ **بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ o وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** ❶ (89:17-18)۔ وہ یہ آیت لکھ رہا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تم اس شکست کا Root cause (بنیادی سبب) ڈھونڈ رہے ہو' ساحلوں کے اندر تجزیے کر رہے ہو۔ سنو! وہاں کوئی ایسا نہ نکلا جوان کم بختوں سے' وہ بات کہتا جو محمد ﷺ مکے کے تاجروں سے کہا کرتا تھا کہ تم اس لیے ڈوبے ہو کہ **بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ o وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** ❶ (89:17-18)۔ تمہاری شکست کی یہ وجہ ہوئی۔

دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! جو قرآن پر خالی الذہن غور کرنے والی قومیں ہیں یا افراد ہیں وہ کہاں پہنچتے ہیں۔ ہمارے ہاں سے کسی کو توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ اب بھی اس آیت کو کوٹ (Quote: حوالہ) کر کے یہ کچھ کہہ دیتا۔ وہ امریکی صحافی یہ چیز لکھتا ہے کہ ساری بات یہ تھی کہ ان میں کوئی ایسا نہ پیدا ہوا جوان کو وہ کچھ کہتا جو محمد ﷺ عرب کے تاجروں کو کہا کرتا تھا۔ سن لیا آپ نے کہ تم یہ کچھ کرتے تھے' یہ نظام تم نے بنا رکھا تھا' لیکن تم اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے تھے کہ ہم نے جو اتنے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں' ہمیں کون ہلا سکتا

---

❶ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی عزت و توقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جائیں۔ وہی قابل عزت سمجھا جاتا تھا جس کی پارٹی زیادہ مضبوط ہو' جس کا جتھہ زیادہ طاقتور ہو۔ اور اس معاشرے میں یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ جس کی چلتی گاڑی' کسی حادثے کی وجہ سے رک جائے' وہ سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائے۔ صاحب استطاعت لوگ' نہ خود اس کی مدد کرتے تھے' نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے۔ کہا کہ کَلَّا (89:21) یہ بالکل غلط ہے' بکتے ہو تم' یہ یوں نہیں جیسا تم سمجھے بیٹھے تھے۔ لہٰذا ان سردارانِ قوم سے کہہ دو کہ تمہارا یہ نظام بھی ہمیشہ ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ دَور آئے گا کہ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا ❷ (89:21)۔ یہ جو معاشی نظام ہے' اس کے لیے یاد رکھیے کہ جب ارض آتا ہے تو قرآن کے اندر معاشی نظام کے متعلق آتا ہے' جب سماء آئے گا تو وہ جو مستقل اقدار ہیں ان کے متعلق آئے گا۔ یہاں کہا کہ نہیں' یہ جو تم نے ناہمواریاں پیدا کی ہوئی ہیں یا یہ جو بھی ناہمواری پیدا کرتا ہے یہ تمہارا نظام ہے۔ ان کو ہم Road Roller چلا کر ہموار کر دیں گے۔ یہ ہمواریاں پیدا ہوں گی' اس کے بعد پھر یہ نظام بدلے گا۔ ہمواریاں کیسے پیدا ہوں گی؟ اس کے لیے قرآن دو الفاظ میں سارا پروگرام دے گیا۔ کہا کہ اب تمہارے ہاں مذہب کی دنیا ہے اس میں خدا ہی خدا ہے' فطرت کی قوتیں نہیں ہیں' اس میں دنیا کا کوئی کمال نہیں ہے۔ جہاں پر فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کیا ہے وہاں خدا نہیں ہے۔ یہ Dualism (ثنویت) جو تمہارے ہاں چلی آ رہی ہے' یہ جو تم نے الگ الگ Department (شعبے) بنا رکھے ہیں' یہ سارا جہنم اس کی وجہ سے ہے۔ یہ ہمواریاں اس وقت پیدا ہوں گی کیونکہ مذہب کی دنیا میں صرف خدا ہے اور جہاں فطرت کی قوتوں کو Harness (مسخر) کیا ہے وہاں خدا نہیں ہے۔

خدا اور ملائکہ صف در صف انسانوں کی طرف آئیں گے

عزیزانِ من! سنیے اور جھوم جائیے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ❷ (89:22)۔ پہلے تو اس آیت کے لفظی معنی ہی دیکھیے اور پھر دیکھیے کہ کیا کوئی کسی بھی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ذرا اس پر سوچیے۔ آج اس کا حل نہیں ملتا۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہ بات ہے کہ ہم مرنے کے بعد خدا کے پاس جائیں گے۔ وہ ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ❸ (2:156)۔ اس آیت سے تصور ہی ذہن میں یہ ہے کہ ہم نے کسی جگہ جانا ہے' وہاں یہ سب کچھ ہونا ہے۔ لفظی معنوں میں اس کو یہی کہا ہے مگر اس آیت (89:22) کے پہلے ہی الفاظ یہ ہیں کہ وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ یعنی تمہارا رب اور اس کے ملائکہ صَفًّا صَفًّا (89:22) صف در صف آئیں گے۔ ہم نہیں جائیں گے وہ آئیں گے۔ یہ کیا بات ہے؟ یہ خدا کا آنا کیا معنی؟ آنا' اور جانا تو وہ ہوتا ہے جو

---

❶ جب اس اونچ نیچ کو مٹا کر' معاشی ہمواریاں پیدا کر دی جائیں گی۔

❷ اور تیرے خدا کا نظامِ ربوبیت' کائناتی قوتوں کو' صف در صف' اپنے جلو میں لیے' زمین پر متمکن ہو جائے گا۔ (یعنی اس نظام میں فطرت کی قوتوں کا ماحصل' کسی خاص گروہ یا خاص قوم کی قوت اور دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے' عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے وقف ہوگا)۔

❸ ہمارا مقصد زندگی نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر رکھا ہے (6:163)۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں' ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا (5:59)۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کسی مکان کے اندر مقید ہو' یہاں سے وہاں یا وہاں سے یہاں۔ خدا تو اس سے ماورا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ قرآن بڑی عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ یاد رکھیے! قرآن میں جہاں یہ چیزیں آتی ہیں اس سے مراد خدا کے قوانین ہوتے ہیں' اس کی مقرر کردہ اقدارِ سماوی ہوتی ہیں۔ اور ملک یعنی ملائکہ کا آپ کو معلوم ہے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا یعنی ساری فطرت کی قوتیں (Forces of Nature) جن کو انسان مسخر کرسکتا ہے۔

دین کیا ہے؟ فطرت کی قوتوں کا مستقل اقدار کے تابع ہونا

قرآن کریم نے کہا کہ یہ اس وقت ہوگا جب خدا کی یہ مستقل اقدار' ربوبیت کے متعلق یہ احکام و قوانین' اور فطرت کی یہ ساری قوتیں' ایک صف میں آکر کھڑی ہوجائیں گی۔ اس وقت ناہمواریوں کی بجائے ہمواریاں پیدا ہوجائیں گی۔ یہ دونوں مستقل اقدار اور فطرت کی قوتیں' دوش بدوش چلیں' پھر دیکھیے کہ کس طرح ناہمواری پیدا ہوسکتی۔ آپ فطرت کی قوتوں کو مستقل اقدار کے تابع چلایئے ہمواریاں پیدا ہوجائیں گی فساد باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ اس میں پھر یہ کیفیت ہی نہیں ہوگی کہ یتیم کو دھکا ملے' مسکین کو تباہی آجائے' سب کچھ تم اکیلے ہی کھا جاؤ اور گڑھے کھود کر پانی سمیٹ لو۔ یہ کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے ساتھ اقدارِ سماوی تمہارے آئی ہوئی ہیں۔ یہ سب چیزیں دوش بدوش چلیں گی۔ پھر آگے کہا کہ وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ [1] (89:23)۔ یہ ہے وہ دور جس میں پھر جہنم کو لایا جائے گا۔ یہاں بھی یہ بات نہیں ہے کہ تمہیں اس میں ڈالا جائے گا۔ یہ انسان تو خود جاتا ہی نہیں ہے' یہ چیزیں آتی ہیں' اس کے اوپر وارد ہوتی ہیں۔ اس کے بس میں جانا ہو تو جائے۔ وہ تو اس کی گنجائش ہی نہیں دیتا کہ جناب کے مزاجِ شریف میں آئے تو چل کر جہنم میں داخل ہو اور نہ آئے تو وہیں رہے۔ یہ جہنم اس کے پاس آجاتی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (89:23) اس دور میں جہنم آتا ہے۔

جہنم کیا ہے؟

عزیزانِ من! یہاں وہ لفظ جہنم آیا ہے۔ جہنم اس وادی [2] کا نام تھا جس میں انسانیت کی قربانی دی جاتی تھی۔ یہ ہے جہنم' جہاں

---

[1] اور وہ جہنم جو غلط معاشی نظام کا فطری نتیجہ ہے اور جسے انہوں نے اس وقت اپنی فریب کاریوں اور مہرہ بازیوں سے عوام کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے' ابھر کر سامنے آجائے گا۔ (یعنی اس وقت صورت یہ ہے کہ عوام ان کی سلگائی ہوئی آگ میں تو جل رہے ہیں لیکن یہ لوگ انہیں معلوم نہیں ہونے دیتے کہ یہ آگ لگائی ہوئی کس کی ہے۔ اس وقت ان کا یہ فریب بے نقاب ہوجائے گا)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] جہنم کا لفظ عبرانی الاصل ہے۔ اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' ص۔ 275' فٹ نوٹ نمبر 2۔

انسانیت ذبح کی جائے۔ وہ جہنم ہوتا ہے اسی دور کے اندر۔ آج آپ کے سامنے جہنم بن چکا ہے۔ آگے کہا کہ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ (89:23) ہاں اب جو یہ سب کچھ ہوگا' سامنے آجائے گا۔ اُس وقت یہ چاہے گا کہ اپنی روش میں تبدیلی کر کے اس عذاب سے بچ جائے۔ وہ یہاں جہنم میں پکار اٹھے گا کہ یا اللہ! میری توبہ' میری ناک کٹ جائے گی' رحم کرو مہاراج' میں بھول گیا' جی میری توبہ۔ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (89:23) لیکن اس کی یہ آرزو کچھ فائدہ نہ دے گی۔ اسے کہا جائے گا کہ اب کہاں کی توبہ' اب کہاں کی نصیحت' یہ تو تباہی آنے سے پہلے کی بات ہے۔ اس لیے کہ اس میں ابھی وقت ہوتا ہے کہ آپ اپنے نظام کو بدل لیں' اس کی اصلاح کر لیں۔ بات تو ساری' جو کچھ آپ کریں گے' اس کے نتیجے میں ہے۔ اس وقت آپ یہی کہیں گے کہ یا اللہ! میری توبہ۔ یہ کہنے سے تو بات نہیں چلتی۔ وہ تو غلط نظام کو بدل کر صحیح نظام قائم کرو گے' تو اس کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوگی اس سے ان نقصانات کا ازالہ ہوگا جو غلط نظام کی وجہ سے پیدا ہوا اور اگر اس کا وقت ہی نہیں رہا تو اس کے ازالے کا سوال ہی نہیں ہے۔ جب یہ انقلاب آیا کرتا ہے تو اس وقت یہ پشیمانیاں اور ندامتیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ اس وقت تو یہ سارے کہا کرتے ہیں کہ سارے کا سارا لے لو اور کہیں جان چھوٹ جائے۔ یہ ہے اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (89:23) اس وقت یہ نہیں ہوسکتا۔ پھر کیفیت یہ ہوتی ہے: يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ [1] (89:24)۔

نفس شماری کوئی زندگی نہیں ہوتی' عمر ہوتی ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ جسے ہم زندگی کہتے ہیں یہ تو نفس شماری ہے' یہ سانس لینا ہے۔ یہ زندگی حیوان کی بھی ہوتی ہے۔ یہ طبعی زندگی انسان کی بھی ہوتی ہے۔ قرآن انسان کے لیے اس زندگی کو زندگی نہیں کہتا۔ وہ اس کے لیے حیات باشرف کو حیات کہتا ہے' اسی کو زندگی کہتا ہے' یہ زندہ ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ ظہور نتائج کے وقت انسان یہ کہتا ہے کہ اے کاش! میں نے بھی اپنی زندگی کے لیے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا' سانس لینا زندگی نہیں۔ اسی لیے تو قرآن نے کہا تھا کہ اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ [2] (8:24)۔ وہ جیتے جاگتے انسانوں سے کہہ رہا ہے کہ آؤ! اے زندہ انسانو! اس دعوت کی طرف لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کرے گی۔ اب آپ نے دیکھا کہ زندگی اور زندگی میں کیا فرق ہے۔ اسی طرح موت اور موت میں فرق ہے۔ مرگ' حیاتِ بےشرف' موت ہوتی ہے اور مرگِ باشرف' حیات ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان نے یہاں پہنچ کر سیکھا کیا ہے؟ یہ کہ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ (89:24) اے کاش! میں نے بھی اپنی زندگی کے لیے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا (قدمت)' نتیجے کے لیے

---

[1] اُس وقت انسان' بصد حسرت ویاس پکار اٹھے گا کہ اے کاش! میں نے بھی اس سے پہلے' وہ کچھ کیا ہوتا' جو مجھے آج حقیقی زندگی عطا کر دیتا۔

[2] تم ہمیشہ ''اللہ اور رسول'' (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو' جب وہ تمہیں اس بات کی دعوت دیا ہے کہ جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے۔ (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

پہلے سے کچھ بھیجنا ہوتا ہے۔

پہلے عمل پھر نتیجہ

عزیزانِ من! پہلے سے کچھ کرنا ہوتا ہے' بعد میں اس کا نتیجہ آتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ **قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي** (89:24)۔ اب اس پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مہلت کا وقفہ بیت گیا' تباہی سر پہ آ گئی۔ **فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ o وَّلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ** [1] (89:25-26) ہاں اب جو تباہی آئے گی' آرہی ہے' اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی' اب جو جکڑ بندی ہونے والی ہے اس کی بھی نظیر کہیں نہیں ملے گی۔ تباہی' جسے آپ وثاق یعنی جکڑ بندی کہتے ہیں' ان کا انجام ہوگا۔

بات شروع کی تھی کہ اے وہ' کہ جو خدا کے نام پہ اپنے آپ کو منسوب کر کے' خدا کی طرف محنت کشوں کی کمائی کو اس طرح نچوڑتے ہو اور پھر اس پہ رنگ رلیاں مناتے ہو' اے قوم عاد کی روش پہ چلنے والو! اے ثمود کی چلن کو اپنانے والو! اے فرعونیت کو اپنی مملکت کا نظام بنانے والو! سوچو تو سہی' تمہارا انجام کیا ہونے والا ہے کیونکہ تم نے یہ چیزیں اختیار کر رکھی ہیں۔ وہ کارگہہ حیات میں اکیلا رہ گیا' اس کی عزت نہ کی۔ وہ بھوکا تھا' اس کی روٹی کا انتظام نہیں کیا۔ ساری وراثت شیر مادر کی طرح کھا گئے' تم نے گڑھے کھود کھود کر روپیہ جمع کیا۔ یاد رکھو! پھر جب یہ انقلاب آتا ہے تو **دَكًّا** (89:21) آتا ہے' یوں جیسے روڈ رولر پھیر کر ہمواریاں آ جایا کرتی ہیں اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اس جیسی تباہی کہیں نہیں ہوتی' پھر اس جیسی وثاق یعنی جکڑ بندی کہیں نہیں ہوتی' یہ تو رہا ایک گروہ۔

ایک اہم سوال کہ نفس مطمئنہ کیا ہے

عزیزانِ من! اس گروہ کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ ہے اور وہ ہے جسے قرآن یوں مخاطب کرتا ہے: **يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً** [2] (89:27-28)۔ اے نفسِ مطمئنہ! تم خدا کی طرف آ ؤ۔ یہاں بڑی اہم بات آ گئی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں آئندہ سورتوں میں یہ بات آئے گی' اس لیے کہ میں اس سے یوں نہیں گزرنا چاہتا۔ میں معذرت چاہوں گا اگر اس میں پانچ سات منٹ زیادہ بھی لگ جائیں۔ بات سمجھ ہی لینی چاہیے۔ کیا پتہ' زندگی میں پھر یہ وقت آئے یا نہ آئے۔

---

[1] اس دن اسے خدا کی طرف سے ایسی سزا ملے گی جس کی مثل کوئی سزا نہیں اور اس کی طرف سے ایسی گرفت ہوگی جس کی نظیر کی کوئی گرفت نہیں۔

[2] وہ شخص جس نے قانونِ خداوندی کے اتباع سے سکونِ گہر کی طرح دل کا صحیح اطمینان حاصل کر لیا ہوگا۔ (13:28) یعنی جس کی ذات میں صحیح نشو و نما سے پورا پورا توازن پیدا ہو چکا ہوگا (91:9) اس سے کہا جائے گا کہ تیرا طریق زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا' اس لیے تیری زندگی پسندیدہ خوشگواریوں کی حامل ہوگی۔ تجھے تیرے نشو و نما دینے والے کی طرف سے حسبِ منشا آسائشیں حاصل ہوگی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نفسِ مطمئنہ کیا ہے؟ سب سے بڑی چیز، ہمارے ہاں شریعت کی دنیا میں ہی نہیں بلکہ اس سے آگے چل کر ہماری طریقت کی دنیا میں اور روحانیت کی دنیا میں بھی 'نفسِ مطمئنہ اطمینان کا دوسرا نام ہے۔ اب نفس مطمئنہ کے متعلق تصور کچھ ایسا دیا جاتا ہے کہ ترکِ آرزو و ہوٗ دلِ بے مدعا ہوٗ یعنی دل ودماغ میں کوئی خواہش ہی نہ پیدا ہو۔ آپ اِسے ایک قسم کا اطمینان سوچتے ہیں۔ یہ اطمینان کیا ہے جس کے لیے یہ لفظ مطمئنہ آیا ہے۔ آپ کے ہاں کے یہ سارے روحانیت والے نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔ قرآن تو زندگی کو زندگی عطا کر رہا ہے مگر یہ ترک آرزو و ہونا اور دل بے مدعا ہونا مرنے سے پہلے مرنا ہے۔ یہ خالص بدھ مت کا نروان ہے' بردرانِ عزیز! یعنی ترکِ آرزو، ترک دنیا، ترکِ عقبیٰ اور آپ کو پتہ ہے آگے ہمیں کیا پڑھایا جاتا تھا۔ ترک ترک' لے بھئی! قصہ ہی ختم ہوا جو یہ کچھ کرے' یہ اسے کہتے ہیں نفسِ مطمئنہ۔

آخری منزل

عزیزانِ من! طریقت میں یہ بڑی آخری منزل ہوتی تھی۔ ہم نے پوچھا کہ صاحب! یہ کیا ہوگا؟ کہنے لگے کہ ''یہ جو تمہارے دل میں خیال آتا ہے کہ میں اس کو ترک کردوں' یہ بھی ایک خواہش ہے' اس کو بھی ترک کردوں۔ یا اللہ! یہ کیا؟ یعنی اس سے کام نہیں چلا تو کہا کہ اس کو مارفیا دو' اس کو کلوفارم سنگھاؤ' یعنی یہ خیال بھی دل میں نہ آنے پائے کہ میں نے یہ چیز چھوڑ دینی ہے۔ اوہ میرے اللہ! کہتا ہے یہ ہے وہ مقام جو نفسِ مطمئنہ کا ہے۔ ❶ وہ اسے نروان کہتا ہے۔

بدھ مت کا مسلک: تصوف کا چربہ

یہی بدھ مت کا سارا مسلک ہے: شوپن ہار ❷ کے انداز میں کہ ہر آرزو تکلیف کا پیش خیمہ ہے اور تکلیف اور مصائب سے بچنے کی صورت ہی یہ ہے کہ آرزو (Longing) پیدا ہی نہ ہو۔ اس کا نام ہے نفسِ مطمئنہ۔ ہمارے ہاں کے تصوف میں آکر دیکھیے کہ اسی کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ یاد رکھیے! آپ کا سارا تصوف چربہ ہے اُن تمام غیر قرآنی' غیر اسلامی تصورات کا' جو آپ نے مستعار لی ہوئی ہیں۔ یہ

---

❶ گوتم بدھ

❷ Cehopenhauer`s pessimistic philosophy calls upon to say "Nay to Life." Schopenhauers, Arthur (1788-1860), a German Philosopher, who held that primordial reality, the will is live, is irretional, and that attempts to understand the world rationally are doomed to failure. His major work was the "The World as Will and Idea (1818)"

(Readrs Digest (1990). Universal Dictionary. London: the Readers Digest Association Limited, P.1368)

تصور یہاں بدھ مت سے چلا' یہودیوں کے مذہب میں پہنچا' عیسائیت کی خانقاہوں میں آیا' ایران کے مغبچوں [1] کے ہاں ہوا وہاں سے آریوں کے اس ویدانت میں آیا' وہاں سے یہ سمٹتا ہوا حریم کعبہ کے اندر سے گزرا اور اس کے بعد آپ کے ہاں کا تصوف بن کر آپ کے سر پر سوار ہوا۔ یہ ہے اطمینان جو انہوں نے کہا ہے۔

اطمینان کی تعریف

اطمینان اسے نہیں کہتے' برادرانِ عزیز! سنیے اطمینان کسے کہتے ہیں۔ ایک چیز ہے ہر وقت کا اضطراب' جس میں حرکت نہیں' محض اضطراب ہے۔ اس اضطراب کے مقابلے میں ایک شے ہوتی ہے جسے وقار کہتے ہیں۔ وقار کسے کہتے ہیں: اپنی Existance (ہستی) کا اس طرح کا ہوجانا کہ اسے فنا کا خطرہ نہ رہے۔ اسے اطمینان کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھایا کرتا ہوں کہ دُہنیت ہوتی ہے۔ کریم' دودھ کے اندر' کریم کی شکل میں ملی ہوتی ہے' اس کی الگ Existance (ہستی) نہیں ہوتی۔ اس کو بلونے کے بعد جب اُسے مکھن بنا لیا جاتا ہے تو اس مکھن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو باقی ماندہ لسی ہوتی ہے' اس کے اندر سارا دن اس مکھن کو ڈالے رکھیے وہ کبھی اس میں جذب نہیں ہوتا۔

---

[1] مغ بچہ، آتش پرست۔ مغ بمعنی پجاری۔

یہ کہا جاتا ہے کہ جناب زرتشت کے مذہب کا اوّلین گہوارہ باختر (Bactaria) تھا۔ وہ خود بھی باختر کے رہنے والے تھے اور ان کا زمانہ 2200 ق م سے 2400 ق م کے درمیان ہے۔ رین گوئنان (Rene gyenon) کا خیال ہے کہ لفظ زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے مذہب کا نام ہے جس میں ''نبوت اور قانون سازی'' کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے زرتشت بہت سے گزرے ہیں جن میں آخری زرتشت کا زمانہ 600 ق م ہے۔ (The Crisis the Modern world. P.16) بہرحال یہ کہا جاتا ہے کہ جناب زرتشت کے مذہب کا اولیں گہوارہ باختر تھا۔ وہاں سے یہ مذہب ایران میں آیا اور دارا (شاہِ ایران) کے زمانہ میں فارس اور اس کے 117 صوبوں کا حکومتی مذہب (State Religion) قرار پا گیا۔ وہاں سے یہ گردونواح میں پھیلا۔ بابل کے راستے اس نے قدیم یہودی مذہب کو متاثر کیا اور اسکندریہ کی لائبریری کے راستے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد) مذہب عیسائیت کا خمیر بنا (500 ق) کے قریب یہ مذہب ہندوستان میں داخل ہوا اور برہمنیت کی شکل میں ہندوؤں کا دھرم قرار پایا۔ (پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں (1996ء): لاہور: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ص 61)۔ ثنویت (Dualism) کا عقیدہ مذہب زرتشت کا نقطۂ فاسکہ اور مابہ الامتیاز ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اہرمزو، خیر کا مظہر اور نور کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اہرمن شر کا پیکر اور تاریکی کا مالک ہے۔ یہ دو ہستیاں ہیں جن میں باہمی کشمکش جاری ہے۔ خیر اور شر کے متعلق دو مستقل سرچشموں کا تصور اس تخیل کی بنیاد ہے جس پر عیسائیت کی روح اور مادہ کے باہمی تضاد و تخالف کی عمارت قائم ہے۔ وہی عمارت جس نے ہندوستان میں آ کر (روح) آتما کو (برہما) (اہرمزو) کا جزو اور مادہ (پراکرتی) کو مایا (سراب) یعنی فریب نگاہ بنا کر دکھا دیا۔ وہی جو پھر عجمی تصوف کے نقاب میں دین اور دنیا کی تفریق کا موجب بنا اور انہیں جداگانہ دوائر زندگی میں تقسیم کرنے کا باعث ہوا...... غور کیجیے ''مادہ کی کثافت'' سے ''روح کی لطافت'' کی طرف کسی قدر باریک اشارے ہیں۔ یہ وہی ہے جو عیسائیت میں رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوئی' جو ہندوؤں کے یوگ اور سنیاس کے روپ میں آئی اور پھر جب عجمی تصوف ایران کے آتش کدوں سے مسلمانوں کی خانقاہوں اور زاویوں میں پہنچا' تو وہاں ترکِ دنیا اور ترکِ علائق کی صورت میں جلوہ بار ہوا۔ (پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں (196) لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' ص ص 66-65)

کسی کا اس قسم کی حیثیت اختیار کر لینا کہ وہ اپنی ذات کو' کبھی کسی میں مدغم اور ضم نہ ہونے دے۔ اسے اطمینان کہتے ہیں۔ اس میں پہلا اطمینان ذہنی ہوتا ہے یعنی اپنے مقام پر کھڑا رہنا:

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی

مزی چوں خش کہ ہوا تیز وشعلہ بے باک است

یہ پہلا ذہنی اطمینان ہوتا ہے ہمارے ہاں کے یہ جو اطمینان حاصل کرنے والے ہیں' ان کے ہاں پہلی چیز تو عقل' دانش' دلیل کو طلاق دینا ہوتا ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود

پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

دلیل کے ذریعے کوئی چیز ماننا بڑی ہی بودی ہوتی ہے۔

یہ بھیڑ کا طریق ہے

کہا جاتا ہے کہ تمہیں راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جو چلا جا رہا ہے آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلے جاؤ۔ دنیا کی ہر بھیڑ یہی کرتی ہے۔ دلیل و برہان کی رُو سے اطمیان نہیں ہے۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن کس کو اطمینان کہتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کو کہا جاتا ہے کہ جاؤ' یہ مُردوں کی بستیاں ہیں' یہ قوم جو اس وقت موت کے کنارے پہ پہنچ چکی ہوئی ہے' جاؤ اور اس کو زندہ کرنے کا انتظام کرو۔ وہ کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے بتا کہ یہ کس طرح ہوگا۔ یہ نہیں کہا کہ آیا یہ ممکن بھی ہے کہ نہیں۔ طریق پوچھ رہے ہیں کہ یہ بات کس طرح ہوگی۔ اسے کہا جاتا ہے کہ اَوَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ (2.260) کیا تو اس پہ ایمان نہیں رکھتا؟ قَالَ بَلٰی (2.260) کہا کہ بات یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ (2.260) میں اپنے قلب کا اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کس طریق سے ہوگا۔ مومن اپنے ایمان کے لیے خدا سے بھی دلیل مانگتا ہے۔ برادرانِ عزیز! اور وہ اس کے بعد حضرت صاحب کی طرح ڈانٹ نہیں دیتا۔ دلیل و برہان دیتا ہے۔

مومن کے اطمینان کی پہچان

ابراہیم علیہ السلام کو' امام للناس کو' وہ کہتا ہے کہ انسانیت کی لیڈر شپ اس کے حصے میں آئے گی۔ وہ خدا سے بھی دلیل مانگ کر ایمان لانا چاہتا ہے اور لفظ آیا ہے: لِیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ (2:260) تا کہ مجھے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ آپ نے سوچ لیا کہ اطمینانِ قلب کسے کہتے ہیں: کسی شے کو (Conviction) ایمان) کے ذریعے مان لینا۔ یہ ہے اطمینان اور یہی چیز ہے جو قرآن نے دوسرے مقام پہ

کہی ہے۔مومن کی Definition (تعریف) یہ دی ہے کہ مومن وہ ہے کہ اور تو اور اس کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ آنکھیں بند کر کے انہیں قبول نہ کرے۔اسی لیے قرآن نے اکراہ کے مقابلے میں اطمینان کا لفظ استعمال کیا ہے۔سورۃ النحل میں ہے کہ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَ قَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ [1] (16:186) اکراہ وہ ہے کہ جس کو زبردستی منوایا جائے اور زبردستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہنٹر سے یا شمشیر گردن پہ رکھ کر کوئی بات منوائی جائے۔وہ جو آپ کے ہاں Mental Compulsion (ذہنی مجبوری وزبردستی) ہوتی ہے' آپ کے ذہنوں کو ماؤف کیا جاتا ہے' ڈرایا جاتا ہے' دھمکایا جاتا ہے' اس قسم کے عذابوں سے' حضرت صاحب کی ناراضگی سے' ڈرانے کے بعد یہ جو کچھ منوانا ہے وہ بھی اکراہ ہے۔برادرانِ عزیز! وہ ایمان نہیں ہے۔قرآن نے اکراہ کے مقابلے میں اطمینان کا لفظ استعمال کیا ہے۔یہ تو ہوگیا ذہنی اور قلبی اطمینان۔

اطمینانِ قلب کیسے حاصل ہوتا ہے؟

اب آگے پھر وہی بات آگئی۔اب میں کیا کروں؟ کیا قرآن کے ان مقامات کو چھپا دوں؟ نہیں' سنیے قرآن کیا کہتا ہے' اطمینان کہاں آتا ہے؟ کہا کہ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرۡيَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً (16:112) خدا مثال بیان کرتا ہے' مثال کے ذریعے سے تمہیں ایک بات سمجھانا چاہتا ہے۔ایک تھی بستی۔عزیزانِ من! بڑے غور سے سننے کی بات ہے' ایک بستی تھی' اس میں امن تھا۔سمجھ لیا کہ کسی ملک کے اندر امن Peace ہونا بڑی بات ہے۔یہاں مطمئنہ کہا ہے کہ وہاں اطمینان بھی تھا۔اب اس سے یہ پتہ چل گیا کہ قرآن کی رُو سے خالی امن کا ہونا ہی کافی نہیں ہے' اس کے ساتھ اطمینان کا ہونا بھی بڑا ضروری ہے۔قرآن نے ان دونوں کو اپنی نعمت گنایا ہے۔وہ امن اور اطمینان کی بستی تھی: اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً (16:112)۔صاحب! یہ امن کیا ہو؟ امن کا تو ہمیں پتہ لگ گیا کہ باہر کا نہ کوئی خدشہ ہے' نہ خوف ہے۔آپ اس کا Defense (دفاع) کر لیجیے' امن ہے۔یہ مطمئنہ کیا ہے؟ قرآن ہے' عزیزانِ من! یہ میرے یا آپ کے ذہن پہ نہیں چھوڑتا کہ جو جی میں آئے اس کے معنی کر لیں۔فوراً ہی کہا کہ: يَّاۡتِيۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا مِّنۡ كُلِّ مَكَانٍ (16:112) ہر طرف سے روٹی کا سامان' سامانِ رزق کھنچا چلا آتا تھا۔وہاں بڑی فراوانیاں تھیں' یہ ہوا اطمینان' یہ ہوئی مطمئن بستی۔یہیں بات نہیں چھوڑ دی۔آگے کہا کہ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ (16:112)۔انہوں نے ان دی ہوئی آسائشوں کو اپنے لیے سمیٹا اور ڈھانپ کر' چھپا چھپا کر رکھ دیا۔کفر کے معنی ڈھانپ کر رکھ لینا ہوتے ہیں۔پھر کیا ہوا؟ یہاں بات یہ تھی کہ پھر وہی فراوانیِ رزق تھم گئی' اوے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَ الۡخَوۡفِ [2] (16:112)۔

---

[1] (اب رہا وہ شخص جو ایمان لانے کے بعد قانونِ خداوندی کا منکر ہو جائے)' بایں نمط کہ وہ کفر و انکار کے لیے اپنا دل کھول دے۔(مفہوم القرآن۔پرویز)

[2] ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہوگیا۔(ایضاً)

امن کے مقابلے میں خوف

عزیزانِ من! امن کے مقابلے میں خوف آیا ہے۔ ان کا امن خوف میں بدل دیا اور اطمینان کو بھوک میں تبدیل کر دیا۔ دیکھیے اطمینان کیسے چھنتا ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اس نے کہا کہ **بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ** ❶ (16:112)۔ یہ ان صنعتوں کی وجہ سے ہوا تھا جو انہوں نے لگا رکھی تھیں۔ یہاں **يَصْنَعُوْنَ** ہے یعنی وہ جو کاریگریاں کرتے تھے یہ اس کی وجہ سے تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن امن کے مقابلے میں خوف لایا ہے۔ اطمینان کے مقابلے میں جوع لایا ہے یعنی بھوک۔ کہا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ** ❷ (13:28) دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔

ذکر کیا ہوتا ہے؟

اب پھر سوال یہ ہے کہ یہ ذکر کیا ہوتا ہے؟ یہ جو ساری رات ھوحق ہوتی ہے، یہ جو قلب پہ ضربیں لگتی ہیں، پھر قلب چلتا ہے جسے ڈاکٹر Heart Fail (دل کا فیل ہونا) ہوگیا کہتے ہیں مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ اسی سے چلتا ہے۔ کیا اس کا نام ذکر رکھا جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا تھا، عزیزانِ من! اور اسے پھر دہرا دوں کہ ساری تباہیاں جو مذہب لاتا ہے وہ اس طرح سے لاتا ہے کہ وہ اصطلاحات تو وہی دین کی لاتا ہے لیکن اصطلاحات کو معنی اپنے پہنا دیتا ہے۔ اسی لیے مذہب ممی شدہ لاشیں ہوتا ہے۔ اصطلاحات دین کی رکھتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مذہب نے ذکر کا لفظ تو وہی رکھا ہوا ہے لیکن معنی اپنے دیئے ہیں۔ یہ قرآن ہے برادرانِ عزیز! یہ تو کسی بات کو واضح کیے بغیر چھوڑتا ہی نہیں۔ وہ آپ کو مذہب کے اس فریب میں آنے ہی نہیں دیتا۔ اس نے کہا تھا کہ خدا کے ذکر سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ذکر چھوڑ دیا جائے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ** (20:124)۔ جو ہمارے ذکر سے اعراض برتتا ہے تو **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اس کی روٹی تنگ ہو جاتی ہے۔ اس ذکر اللہ سے نظر آ گیا کہ **تَطْمَئِنُّ** القلوب کے معنی کیا ہوئے۔ اطمینان کی پہلی شرط یہ ہے، برادرانِ عزیز! کہ پیٹ بھرا ہوا ہو کیونکہ ہمارے ذکر سے اعراض برتتا ہے۔ **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124)۔ اس کی روٹی تنگ ہو جاتی ہے۔ حضرت صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی بات نہیں صاحب! یہاں یہ ساری تباہیاں، بربادیاں، بھوک، ننگ آتی ہے۔ قیامت میں تو جنت ان کے لیے ہوگی۔ چند دن کی بات ہے، بھگت لیجیے، یہ سارے جنت

---

❶ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔

❷ پھر سن لو کہ صحیح اطمینانِ قلب، خدا کے اس قانون کی رُو سے حاصل ہوتا ہے جس کا اوپر کیا گیا ہے یعنی انسان کے اختیار و ارادہ پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو اور وہ بطیبِ خاطر اعترافِ حقیقت کرے۔ (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے وارث ہوں گے۔ وہ کہتا ہے ذرا ٹھہریئے' حضرت صاحب! میری بات سن لیجیے' حضور! ذرا ٹھہر جایئے **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124)۔ اس کی روٹی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ **نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ** (20:124) یہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! یہ عصائے موسوی ہے' ساحرین کی رسیاں نہیں' جو فریب نگاہ سے چلتی ہوئی نظر آئیں۔ دیکھتے ہیں کہ قرآن کس طرح سے اس طرف باندھ کر لے آتا ہے۔ اب یہاں کہا ہے کہ **يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً** (89:27-28)۔ اب سمجھ میں آیا کہ نفسِ مطمئنہ کسے کہتے ہیں۔ اب آؤ خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف' آؤ خدا کے نظام ربوبیت کی طرف۔

راضیۃ اور مرضیہ

اب اس آیت میں اگلے الفاظ یہ آئے ہیں: **رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً** (89:28)۔ **راضیة** فاعل کا صیغہ ہے اور مرضیہ مفعول کا صیغہ۔ تمہاری طرف سے کیا ہوا' **راضیة** ہے۔ یعنی تم نے اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا تھا۔ اب اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ **مرضیة** یعنی اس قانون نے اپنے آپ کو تمہارے ساتھ ہم آہنگ کر لیا۔ یہیں سے یہ ہے کہ **رضی الله تعالٰی عنه راضیة سے مـرضیة** ہوتا ہے لیکن ٹھہریئے ابھی ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ یہ جو رضائے خداوندی حاصل ہوتی ہے' یہ کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ اس سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ یہ خلوت گاہوں میں ہوتا ہے' تجرد کی زندگی میں ہوتا ہے' خانقاہیت میں ہوتا ہے' لوگوں سے الگ ہٹنے میں ہوتا ہے۔ یہ ایک انفرادی تجربہ یعنی Individual Experience ہے۔ یہ ایک فرد کی چیز ہے' اس کا تعلق معاشرے سے نہیں ہے۔ یہی بات آئی تھی لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس خدا کا کیا کریں' کہیں جانے ہی نہیں دیتا۔ کسی راستے سے چھپ کر نکلنے ہی نہیں دیتا۔ یہ کہا کہ ذہن کے اندر نہ سمجھ لینا کہ یہ جو اطمینانِ قلب کا جنت ہے' یہ خلوت گاہوں کے اندر آتا ہے' اسے تم تجرد گاہوں کے اندر بیٹھ کر انفرادی طور پر' ایک Personal Experience حاصل کرو گے اور اس کا نام اطمینانِ قلب رکھ لو گے۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو **فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ** (89:29)۔ میرے بندوں کے ساتھ شامل ہونا ہے۔ یہ اجتماعی زندگی ہے۔

جنت میں اجتماعی طور پر جانا ہوگا

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ یہ تو اجتماعی زندگی ہے۔ ایک فرد انفرادی حیثیت کے اندر' یہ کیفیت نہیں حاصل کر سکتا اس لیے کہا کہ **فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ** (89:29)۔ میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ **وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ** (89:30) پھر تو جنت کے اندر جا سکتا ہے۔ جنت میں فرد نہیں جایا کرتا' قوم جایا کرتی ہے' امت جایا کرتی ہے۔ یہ اجتماعی نظام ہے اور اس کا تسلسل یہ ہے کہ **فَادْخُلِيْ فِيْ**

عِبٰدِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (89:29-30)۔ پہلے میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ اور پھر جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اے نفس مطمئنہ! جس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے ذہنی اطمینان یہ ہے کہ جو مانتا ہے' اس کے لیے دلیل و برہان اور سند اور حجت رکھتا ہے' اطمینان کی یہ کیفیت ہے کہ اسے رزقِ فراواں حاصل ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ کیے ہوئے ہے اور پھر یہ کہ انفرادی چیز نہیں ہے' اپنے آپ کو اس کے بندوں کی جماعت کے اندر شامل کیا ہوا ہے۔ پھر وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ جنت میں داخل ہونا ہے۔

صاحب! بات یہ ساری ہو گئی اور سورۃ الفجر ختم ہوئی۔ برادرانِ عزیز! آئندہ درس میں سوۃ البلد لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

پچیسواں باب: سورة البلد (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ البلد سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسواں پارہ ہے۔ سورۃ کا نمبر 90 ہے۔

پس منظر

پچھلی سورۃ میں قریش سے یہ کہا گیا تھا کہ تم اپنی نسبت خدا کے گھر کی طرف کر کے اس سے فائدے تو اتنے حاصل کرتے ہو مگر اس گھر میں خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہو' ان سے سرکشی برتتے ہو۔ کچھ شرافت کا تقاضا بھی سمجھنا چاہیے یا تو اس نسبت کو چھوڑ دو اور اگر اپنی نسبت اس کے ساتھ رکھنی ہو تو پھر اس نسبت کے تقاضوں کو تو پورا کرو۔ اسی ضمن میں ان سے کہا گیا تھا کہ تم مکہ میں رہتے ہوئے اس شہر کی حرمت کا بھی پاس نہیں رکھتے حالانکہ مکہ کی نسبت سے لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ تمہارے قافلوں کی طرف بھی کوئی بُری نظر سے نہیں دیکھتا۔ تم اس کے احترام کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھتے۔ اسی سلسلے میں اب یہ سورۃ ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کی پہلی ہی دو آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ o وَاَنْتَ حِلٌّ ۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ [1] (90:1-2)۔ پہلی ہی آیت میں یہ پہلا لا ایسا نظر

---

[1] اے رسولؐ! تو ان مخالفین سے' جو تجھے اس شہر مکہ میں اس قدر تکالیف پہنچا رہے ہیں' اور اس کی حرمت کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے' کہہ دے کہ (تم جو میرے اور اس نظام کے متعلق خیال کیے بیٹھے ہو کہ یہ ناکام رہے گا) ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں خود اس شہر مکہ کی حرمت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

آ تا ہے جیسا کہ اس کے معنی نہیں کے ہوتے ہیں۔ لا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ یہ بات ہی نہیں ہے۔ جن احباب کو ادب سے شغف ہے، وہ اسے Appreciate کریں گے یعنی اسے بنظرِ تحسین دیکھیں گے کہ یہ انداز کیا ہی خوب ہوتا ہے۔

عربوں کا اندازِ گفتگو

عزیزانِ من! عربوں کے ہاں تو یہ انداز بڑا ہی خاص ہوا کرتا تھا کہ جو بات چلی آ رہی ہے وہ اسے دہراتے نہیں تھے۔ اس کی تردید کرنا مقصود ہوتا تھا تو دہرائے بغیر اس کے متعلق ایک "لا" کہہ دیا کرتے تھے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ "نہیں، بات یوں نہیں جیسے تم سمجھے ہوئے ہو، بات یوں ہے۔" اس "لا" میں یہ سارا انداز آ جاتا تھا۔ ان کے ہاں مخاطب کی اس ساری چیز کی تردید کرنے کے لیے وہ کلام کی ابتدا ہی لا سے کیا کرتے تھے۔ عربوں کی اسی ادبی روش کی ابتدا کی طرز پر ہمارے ہاں کے بعض شعراء نے بھی یہی انداز اختیار کیا۔ مجھے ضمناً یاد آتا ہے کہ غالب [1] نے کہا ہے:

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

آپ دیکھیے کہ اس مصرعے میں پہلی "نہیں" بظاہر زائد نظر آتی ہے لیکن یہ بڑی دقیق چیز ہے۔ اس کے معنی و انداز یہ ہے کہ کوئی بات یا گفتگو ہو رہی تھی، اس پر مخاطب نے اعتراض کیا تھا کہ تم تو یہ بھی نہیں مانتے، تم تو اسے بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ یہ عربی انداز ہے کہ اس کا ذکر کیے بغیر ہی بات "نہیں" سے شروع کی ہے۔ تو یہ جو انداز ہے بڑا ہی بلیغ ہوتا ہے۔ قرآن بھی "لا" کے حرف سے یہی انداز اختیار کرتا ہے۔ بات یوں نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ مٹھی بھر بے سروسامان سی جماعت کتنا بڑا دعویٰ لے کر اٹھی ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیے:

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانِ نگر

یہ کیا کر لیں گے۔ دعوے یہ ہیں کہ اس کعبہ کو، اس بلدِ عظیم کو، ایک نظامِ نو کا مرکز بننا ہے اور نظام سرے سے ہی نہیں ہے جس کا یہ مرکز بنا رہے ہیں۔ کہا کہ یہ وہی **اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ** (68:15)۔ فرسودہ باتیں ہیں، کہنہ روایات ہیں، آزاد خیالات ہیں، اتنے بڑے انقلاب کے داعی بنے بیٹھے ہیں، اس میں اپنے ہی جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسے اپنے نظام کا مرکز بنائیں گے اور نظام وہ ہوگا جس میں ہماری برہمنیت ختم ہو جائے گی، ہماری سرمایہ داری کا نظام ختم ہو جائے گا۔ ارے ان کا یہ کہنا دیکھو تو سہی۔ اس کے جواب میں قرآنِ کریم نے یوں کہا کہ "لا" یعنی بات یوں نہیں جیسا تم سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ مٹھی بھر جماعت کیا کر لے گی۔ میں اسی بلدِ امین (مکہ) کو اس چیز کے

---

[1] مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869)

شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ آگے بات ہے کہ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ❶ (90:3)۔

قرآنِ حکیم میں سطح بین نگاہوں کو ربط نظر ہی نہیں آ سکتا

آپ دیکھیں گے کہ بظاہر اس کے اندر کوئی ربط نظر نہیں آئے گا کہیں بلدِ امین کی شہادت پیش کی جا رہی ہے' کہیں باپ اور بیٹے کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سطح بین نگاہوں کو ربط نہیں نظر آیا کرتا اور ان کے نزدیک تو قرآن کی خوبی یہ ہے کہ یہ بڑا ہی غیر مربوط ہے' مگر:

واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ❷

یہ تو الحمد سے الناس تک ایک مربوط سلسلہ چلا آ رہا ہے' یہ تو ان آیات میں وہی ربط ہے جو ایک ستارے کا دوسرے ستارے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں اس میں کوئی ربط نہیں پاتیں۔ Scientist (سائنسدان) سے پوچھیے وہ کیا بتاتا ہے:

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں ❸

کائنات کا سلسلہ اس طرح مربوط ہے۔ قرآن کا ربط بھی اسی طرح سے ہے۔ بات انہوں نے یہ کہی تھی کہ تم ذرا غور کرو کہ زندگی کس طرح' ہر آن نئی ہیئت میں تبدیل ہو کر' نئے پیکر میں ڈھل کر' آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ باپ بوڑھا ہو جاتا ہے' تو پھر نئی زندگی ایک حیاتِ نو کی تعمیر میں' بچے کی شکل میں' دنیا کے سامنے آ جاتی ہے تو یہ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ زندگی بیکار نہیں ہوا کرتی۔ یہ تو پرانا لباس ہوتا ہے' اسے اتارا جاتا ہے کہ نیا لباس پہنا جائے۔ اس طرح زندگی کا تسلسل قائم ہے اور تسلسل بھی اس انداز سے قائم ہے کہ جب ایک فرد کی زندگی فرسودہ اور کہنہ اور مضمحل ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں سے حیاتِ تازہ کی کونپل پھوٹتی ہے۔ وہ زندگی کی ساری ممکنات لیے ہوئے اپنے ساتھ پھر دنیا کے اندر وجود میں آ جاتی ہے۔ یہ کعبہ کا نظام' جو تم نے اس طرح بگاڑ دیا تھا' اسی فرسودہ بظاہر مضمحل صورت میں جس میں اب کوئی نشان حیاتِ حرارت کا باقی نہیں ہے' اسی نوع سے ایک حیاتِ نو مسکراتی ہوئی ابھرے گی اور تم دیکھو گے کہ شباب کو پہنچے گی اور یہ نظام یہاں قائم ہو کر رہے گا۔ اسی لیے کہا کہ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ❶ (90:3)۔ قرآن کتنی عظیم حقیقتیں بیان کر جاتا ہے۔ برادرانِ عزیز! اگلی

---

❶ اور قانونِ تولید کو (شہادت میں پیش کرتا ہوں) جس کی رو سے' پرانی زندگی (باپ) سے ایک نئی زندگی (بیٹے) کی نمود ہوتی رہتی ہے' کہ یہی شہر (مکہ) آخر الامر' تمہارے باطل نظام کی جگہ صحیح نظامِ خداوندی کا مرکز بن کر رہے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (غالب)

❸ حقیقت ایک ہے ہر شے کی' خاکی ہو کہ نوری ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں (اقبال: بانگِ درا)

ہی آیت میں کہا کہ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ❶ (90:4)۔دوسری جگہ کہا کہ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ❷ (95:4)۔ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے۔اس کے اندر یہ صلاحیتیں رکھیں کہ نہایت اعتدال کے ساتھ اس کی Balanced Personality (متوازن شخصیت) ہوجائے' تمام صلاحیتوں میں صحیح تناسب پیدا ہوجائے' اور یوں اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے لیکن یہ راستہ ذرا دقت طلب ہے۔اس میں مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور یہی اس کی دقت طلبی ہے کہ جس سے انسان اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ❸ (95:4) میں جا پہنچتا ہے یعنی اپنے آپ کو پست ترین درجے میں لے جاتا ہے' اس لیے کہ بڑا سہولت پسند واقع ہوا ہے' ذرا سی بھی محنت اور مشقت نہیں کرنا چاہتا۔ہم نے انسان کو بہترین ہیئت طبعی میں توازن دیئے ہوئے' تناسب دیئے ہوئے پیدا کیا ہے۔یہاں (90:4) میں ''کبد'' کا عجیب لفظ آیا ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''توازن اور تناسب' جو قائم کیے ہو' اس میں کچھ مشقت درکار ہو''ہم نے تو اسے ایک صحیح توازن اور تناسب قائم کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔یہ صرف خدا کے قوانین کے اتباع سے ہوسکتا تھا لیکن اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ (90:5)۔یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نہیں' میرے اوپر کسی کا کوئی قانون ہے ہی نہیں۔میں خودمختار ہوں' جو جی میں آئے کروں۔ایسا کہنے والا' اس نظامِ نو کی تشکیل کی مخالفت کے اندر' اس وقت اپنا مال و دولت تک صرف کر رہا ہے۔تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ وقت آجائے گا جب اسے کہنا پڑے گا کہ یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا (90:6)۔اوہ ہو' میں نے خوامخواہ اتنی محنت سے جمع کردہ مال ضائع کردیا۔

غلط نظام کا نتیجہ جلد ہی معلوم ہوجائے گا

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ کس انداز سے کہا جارہا ہے کہ یہ ساری مخالفتیں نامراد رہیں گی اور یہ نظام کامیاب ہوکر رہے گا۔اور یہ جو اس وقت اس کے ناکام بنانے میں اتنی دولت صرف کررہے ہو' تھوڑے ہی دنوں کے بعد تمہیں کفِ حسرت ملنا پڑے گا اور تم یہ کہو گے کہ افسوس! میں نے اپنا مال یونہی ضائع کردیا۔بات یہ ہے کہ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ (90:7)۔یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی دیکھنے والا ہی نہیں ہے۔بڑے بڑے جرائم' جیسا کہ اس سے پیشتر میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ انسان اس اطمینان کے ساتھ کرتا ہے کہ اسے کوئی Detect (سراغ) نہیں کررہا یعنی اسے کوئی دیکھ نہیں رہا' کوئی اس کے جرائم سے واقف نہیں۔قرآن کہتا ہے کہ یہ ساری بدعنوانیاں'

---

❶ بات یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا اس لیے کیا تھا کہ وہ (وحی کے تابع رہ کر) ایک متوازن زندگی بسر کرے اور اس طرح اپنی ذات میں توازن و تناسب پیدا کرے۔

❷ ہم نے انسان کی تخلیق میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کرکے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے۔

❸ اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔(1-2-3 مفہوم القرآن۔پرویز)

خلاف ورزیاں' سرکشیاں اور بے باکیاں اس لیے ہو رہی ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔

اختیار و ارادہ کے ساتھ دو آنکھیں اور دو ہونٹ بھی دیئے ہیں

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو ہم نے صاحب اختیار و ارادہ بنایا۔ اس کو یہ قوتیں دیں کہ وہ مشاہدہ کرے' مطالعہ کرے لیکن اس کے بعد ایک اور چیز بھی دی ہے۔ اگلی ہی آیات میں چیز آئی ہے کہ **اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ** (90:8) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے اسے دو آنکھیں دیں کہ دنیا میں دیکھ بھال کر چلے' راستے کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سے' اپنی نگاہوں میں رکھے' دنیا کے اندر آنکھیں کھول کر چلے اور جس بات کے متعلق علم نہ ہو تو خود مشاہدہ کرے۔ **وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ** (90:9) اور ہم نے اسے زبان دی' دو ہونٹ دیئے کہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے' دوسرے سے بات کر سکے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے جو قرآن نے صاف کہی ہے۔ حیوانی زندگی سے جب زندگی (Life) آگے بڑھ کر انسانی پیکر میں آئی ہے تو یہاں دو بنیادی خصوصیات اسے ملی ہیں۔ ان میں ایک قوتِ گویائی ہے یعنی Communication (ابلاغ) کی قوت' اظہارِ خیال کی قوت' جسے آپ بولنے کی قوت کہتے ہیں۔ یہ بڑی چیز ہے۔ بولنے کے لیے یوں تو زبان ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے لیکن یہ جو ہونٹ اسی وقت ساتھ دیتے ہیں۔ ہونٹوں کو کھلا رکھ کر اور خالی زبان کو چلا کر بول کر دیکھیے۔ اس کے ساتھ یہ دو ہونٹ کتنے عظیم آلے ہیں کہ زبان خالی اظہار مقصد نہیں کر سکتی۔ بولنے کے لیے زبان اور دو ہونٹوں کو ہونا بڑا ضروری ہے۔ Perfect (مکمل) آلہ دیا' اس کو بولنے کا آنکھوں سے دیکھنے کا اور اس کے بعد دوسروں سے پوچھنے کا اور پھر قوت گویائی دی۔ اب ان کے ساتھ یہ سارا کچھ تو خود کرے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے بھی ایک اور چیز دی گئی۔ وہ ہے راہنمائی۔

زندگی کا سفر کرنے کے لیے راہنمائی

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ** (90:10) ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیئے۔ وہی ہے جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ جہاں دو راستے پھٹتے ہیں' وہاں ہر دوراہے پر' ہر موڑ پر' راستہ دکھانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ ہر وقت تو وہاں چوکیدار بیٹھا نہیں ہوتا' ہر وقت تو وہاں ایک گائیڈ یا راہنما نہیں ہوتا کہ وہ آپ کو بتا دے کہ یہ راستہ شہر کو جاتا ہے' اور یہ راستہ گلبرگ کی طرف جاتا ہے۔ وہاں کیا کیا جاتا ہے؟ ایک Sign Post (نشانِ راہ) لگا دیا جاتا ہے' بس وہ Sign Post (نشانِ راہ) کافی ہوتا ہے۔ اب یہ کہا کہ تمہیں آنکھیں دے دیں کہ اس کو پڑھ لو' خود نہیں پڑھ سکتے تو تمہیں قوتِ گویائی دے دی کہ کسی سے پوچھ لو اور یہ چیز ہے کہ اگر وہاں Sign Post (نشانِ راہ) نہ لگا ہوا ہو تو تمہاری آنکھیں بھی بیکار' تمہاری گویائی کی قوت بھی بیکار۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں صحیح راستے کا اختیار کرنا کس قدر دشوار ہوتا ہے تو کہا کہ انہی چیزوں کی ضرورت تھی کہ دوراہا آئے' وہاں Sign Post (نشانِ راہ) نصب کر دیا جائے۔ یہ ہم نے وحی کے ذریعے کر دیا۔ یہ اتنا محکم' مضبوط لگایا کہ زمانے کے حوادث آپ کو کسی طرح سے کوئی زک

نہیں پہنچا سکتے۔ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ایسا محفوظ Sign Post (نشانِ راہ) ہے۔ پھر وہ لسانِ مبین کے اندر لکھا ہوا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ پاکستان والوں کے لیے ہے مگر وہ چینی زبان کے اندر لکھ کر ایسا دے دیا کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے۔ زبان ایسی زندہ زبان ہے۔

برادرانِ عزیز! جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ یہ اس زبان کا اعجاز ہے۔ اس نے قرآنی حقائق کا متحمل ہونا تھا۔ جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کے ہاں بنی اسرائیل میں نبوت، حکومت، حکمت، شوکت، سطوت آ رہی تھی، انہی کے دوسرے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسے کعبہ میں لا کر بسایا۔ اس کے بعد ان کی شاخ کی کوئی اور تاریخ ہی نہیں ملتی سوائے اس کے کہ یہ زبان بناتے رہے۔ یہ قبیلہ اس قرآن کی آمد کے لیے پیش رفت تھا۔ یہ قبیلہ ایسی زبان کی تیاریاں کر رہا تھا جب دنیا بھر کی زبانیں، پرانی ہو چکی تھیں بلکہ ان میں سے بیشتر مردہ (Dead) ہو چکی تھیں لیکن یہ آج بھی اسی طرح سے تر و تازہ ہے۔

عربی ایک زندہ زبان ہے

آپ حیران ہوں گے کہ جتنے بھی عربی بولنے والے ممالک ہیں، ان میں بولنے کی زبان میں تو فرق آ گیا ہے لیکن ان کی تحریری زبان آج بھی وہی ہے۔ یہ فرق ہمارے ہاں بھی ایک ضلع سے دوسرے ضلع کی پنجابی زبان میں ہوتا ہے۔ یہی فرق علاقے اور علاقے کی پنجابی زبان میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ اس عربی زبان میں بھی فرق ہو گیا ہے لیکن ان کے ہاں کی جو Written Language (تحریری زبان) ہے، وہ آج بھی وہی زبان ہے جو قرآن کی زبان ہے اور یہی وجہ ہے کہ مراکش سے لے کر نجد یا انڈونیشیا تک، جہاں بھی عربی پڑھنے والے لوگ ہیں، انہیں کوئی دقت ہی نہیں ہوتی جب کہ اس کے برعکس کسی ملک کی کوئی کتاب کسی علاقے میں پڑھی جائے تو زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے ہاں یہ جو نجدی بولتے ہیں، جو عربی کو جانتے ہیں، ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن انہی کی جو لکھی ہوئی کتاب ہے، وہ ہم اسی طرح پڑھ لیتے ہیں جیسا کہ عربی جاننے والا ہر جگہ کی کتاب پڑھ سکتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کی قرآن محفوظ کی زبان زندہ زبان ہے۔ قرآن کی جو زبان زندہ ہے، Sign Post (نشانِ راہ) جو لگا دیا ہے، تمہیں آنکھیں دیں کہ خود پڑھو۔ پڑھ نہیں سکتے ہو تو کسی دوسرے سے پوچھو کتنی بڑی چیز کہی۔ پھر وہی الفاظ کی بات آ جاتی ہے کہ هَدَيْنٰهُ (90:10) خود ہدایت کے اندر کسی چیز کو ابھار کر پیش کرنا، خود ابھری ہوئی چیز کو بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف راستہ دکھانا ہی نہیں ہوتا بلکہ ابھار کے کسی چیز کو سامنے لانا ہوتا ہے اور یہاں نجدین (90:10) کہہ کر پھر یہ کہا کہ یہ راستہ ابھرا ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ عربی زبان میں تو مرادفات سینکڑوں ہزاروں ہوتے ہیں، راستے کے لیے بیسیوں الفاظ تھے۔ نجد کہتے ہی اس جگہ کو ہیں جس میں ابھار ہوتا ہے، ابھری ہوئی چیز ہوتی ہے۔ راستہ دکھایا تو وہ ایسا نہیں کہ جس میں کسی قسم کا ابہام ہو، شک و شبہ رہ جائے۔ ابھرا ہوا راستہ تو آپ دیکھتے ہیں، کتنا نمایاں ہوتا ہے۔ یہ راستہ

دکھایا تو اس طرح سے دکھایا کہ ابھرا ہوا ہے اور یہاں کہا ہے کہ نجدین یعنی دونوں راستے ہم نے دکھا دیئے۔

دونوں راستوں کا فرق

اب آگے ان دونوں راستوں میں دیکھیے کہ فرق کیا ہے؟ کہا کہ ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ ذاتی مفاد پرستی کا ہے یعنی جس طریق سے بھی ہو سکے' دوسروں کی محنت کا ماحصل غصب کر لینا اور یوں تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کرنا۔''انسان کی عقلِ حیلہ جو' جو اس سے کہتی ہے کہ یہ راستہ بڑا آسان ہے' اسے اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔اس کے مقابلے میں دوسرا راستہ بڑا محنت طلب اور صبر آزما ہے۔یوں سمجھو گویا فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ❶ (90:11) یہاں (90:4)۔کہا تھا کہ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (90:4) انسان کے اندر جتنی صلاحیتیں ہیں انہیں Develop (نشوونما) کرنے کے لیے کچھ تھوڑی سی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ صلاحیتیں Developed Form (نشوونما یافتہ شکل) کے اندر نہیں ملتیں۔ اس کے برعکس ہر حیوان کو اس کی جو صلاحیت ہے' وہ Developed (نشوونما یافتہ) ملتی ہے' اسے اس کو Develop (نشوونما) کرنے کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔چیل کے بچے کو سیکھنا ہی نہیں پڑتا کہ اڑنا کس طرح ہوتا ہے۔Duck (بطخ) کے بچے کو کہیں سیکھنا ہی نہیں پڑتا کہ تیرنا کس طرح ہوتا ہے۔انسان کے اندر کی صلاحیتیں اسے خود Develop (نشوونما) کرنا ہوتی ہیں۔اسی کا نام ہے جسے تھوڑا سا دشوار گزار راستہ کہا ہے۔کہا کہ اس کی مشکل یہ ہے کہ یہ اتنا سہولت پسند واقع ہوا ہے کہ ذرا سا بھی جو وقت طلب معاملہ ہوتا ہے یہ اسی وقت اس کے لیے تیاری نہیں کرتا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یہ دونوں راستے ہم نے دکھا دیئے۔ایک راستہ وہ ہے جس میں ذرا دشواری' ذرا سی محنت کرنا پڑتی ہے۔اب یہ دیکھیے کہ کیسے دو راستے دکھائے ہیں۔ان میں سے ایک راستہ میں کچھ محنت کرنا پڑتی ہے۔پھر راستے پہ چلنے والا مسافر تو یکساں ہوتا ہے' جو بھی چلے گا اس کو یکساں قسم کا راستہ ملے گا۔یعنی دونوں کو اسی میں چھوڑ دیا جائے تو دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا بات کہی کہ ایک راستہ ذرا دشوار گزار ہوتا ہے۔یہ کونسا راستہ ہوتا ہے؟

یہ راستہ گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے

یہ وہ راستہ ہے جو پہاڑی کے اوپر چڑھ کر جاتا ہے۔راستہ کی تشریح میں ساری بات کہہ دی کہ یہ کیوں دشوار گزار ہے۔اس میں دشواری ہی نہیں ہوتی بلکہ گھاٹی یا پہاڑی کے اوپر جو چڑھا جاتا ہے' اس میں بڑے صبر اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے' آدمی تیز جا ہی نہیں سکتا۔قدم قدم جانا پڑتا ہے' رکنا پڑتا ہے' ٹھہرنا پڑتا ہے اور پھر یہ تو عرب تھے' انہوں نے چڑھنے والے راستے کے لیے عقبہ کا لفظ استعمال

---

❶ یہ پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ہے۔جس میں قدم قدم پر انسان کی سانس پھول جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں ہر قدم' انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔(مفہوم القرآن۔پرویز)

کیا ہے۔ عقبہ کے معنی ہوتا ہے "وہ راستہ کہ جہاں دو قدم چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑے کہ کتنا آگے آ گیا ہوں۔" پہاڑی اور گھاٹی کے اوپر چڑھنے کا یہ راستہ دشوار گزار ہی نہیں ہوتا، ہمت طلب اور صبر آزما بھی ہوتا ہے اور یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے کہی کہ اِنَّ الَّـذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے کہ رب ہمارا خدا ہی ہے، پھر اس پر استقامت سے جم کر کھڑے ہوتے ہیں، اس پر بڑے ہی استقامت و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہاں پھر دوسرا فرق آ گیا۔ انسان جلد باز واقع ہوا ہے اور یہ جو منزل ہے یہ صبر اور استقامت چاہتی ہے، ایسی استقامت جیسے پہاڑی کے اوپر چڑھنے کا جو راستہ ہے وہ ہمت طلب اور صبر آزما ہوتا ہے، قدم قدم چڑھ سکتا ہے، بھاگ کر تو چڑھ ہی نہیں سکتا۔ اس پر ہمت ہی نہیں پڑ سکتی کہ وہ بھاگ کر چڑھے۔ کہا کہ یہ ہے وہ راستہ جس پر چلنا ہے۔

میں کئی بار یہ کہہ چکا ہوں کہ آپ دیکھیے کہ قرآن ایک ایک تشبیہ میں کتنی باتیں کر جاتا ہے: جو سیدھا راستہ ہے وہ آپ کو یہاں لے جائے گا، یہاں سے وہاں تک ایک لائن میں لے جائے گا۔ پہاڑی کا راستہ منزل تک بھی لے جائے گا، ہر قدم بلندیوں کی طرف بھی اٹھے گا، اس لیے کہ اس کا خدا ذِی الْمَعَارِجِ ❶ (70:3) ہے۔ اس کا بتایا ہوا راستہ صرف منزلِ مقصود تک ہی سیدھا نہیں پہنچاتا بلکہ بلندیوں کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ❷ (84:19) جس طرح ہم تمہیں طبقاً طبقاً یہاں سے بلندیوں کی طرف لیتے چلے جائیں گے۔ انسانی ممکنات اور اس کا مستقبل پستیوں کا نہیں ہے، بلندیوں کا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، یہ وہی ہے جو سورۃ اعراف میں کہا ہے کہ وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (7:176) ہم تو اسے چاہتے تھے کہ آسمان کی بلندیوں پہ لے جائیں لیکن یہ کمبخت زمین کے ساتھ چپکا ہوا رہ جاتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ ہم نے راستہ دکھایا۔ اس راستے پہ چڑھنے میں صبر اور استقامت کی ضرورت تھی لیکن جو اس پہ چڑھ جائے گا پھر پوچھیے نہیں کن بلندیوں کے اوپر پہنچ جائے گا۔ اب آگے وہ بات آنی تھی کہ جس کی ذرا تشریح کی جائے۔ اس لیے خود ہی کہا کہ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ ❸ (90:12)۔ قرآن میں کسی اور سے، برادرانِ عزیز! پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ روشنی خارج کی محتاج ہی نہیں ہوتی کہ

---

❶ سیڑھی والا ہے یعنی خدا اپنی ہر اسکیم کو ارتقائی مدارج (کی سیڑھی) چڑھا کر تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ وہ اسے اس کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک یک لخت نہیں لے جاتا، بتدریج (Gradually) ایسا کرتا ہے۔

❷ (یہ کائناتی مظاہر (Cosmic Phemomena) اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ) تم بھی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے یوں بلندیوں کی طرف اٹھتے چلے جاؤ گے کہ جب اس کی ایک منزل کے ساتھ مطابقت حاصل کر لو گے تو اس سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تم منزل بمنزل آگے بڑھتے اور اوپر اٹھتے چلے جاؤ گے (اور یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا)۔

❸ یہ پہاڑی کی گھاٹی کا راستہ کیا ہے؟ اسے تمہیں خدا سے بہتر کون سمجھا سکتا ہے۔ سنو! (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

کوئی آ کر دکھائے کہ یہ دیا روشن ہے۔ وہ دیا اپنی دلیل آپ ہوتا ہے۔ کیا کبھی آپ جلتے ہوئے دیئے کو ڈھونڈنے کے لیے باہر سے کوئی موم بتی جلا کر لائے ہیں؟ نہیں یہ تو اپنی روشنی آپ دلیل ہوتی ہے۔ کہا کہ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ (90:12)۔ ہم یہ تمہارے ذہنوں کے اوپر نہیں چھوڑ رہے کہ تم خود فیصلہ کر لو کہ عقبہ کیا ہوتا ہے۔ آؤ ہم بتائیں کہ عقبہ کیا ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد وہ چیزیں آنی ہیں جنہیں دین کی بنیاد اور اس سارے محل کی ستون قرار دیا گیا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ اس کے بعد قرآن اس قسم کی چیزیں کہے گا کہ جو روز ہمارے ہاں مسجد کے وعظوں میں کہی جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے وہ چیزیں بھی اپنے مقام پہ ضروری ہیں لیکن ہم تو بات قرآن کی کر رہے ہیں۔ یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے اور یہیں سے یہ نظر آتا ہے کہ دین کی وہ بنیادی چیزیں کیا ہیں جو قرآن کہتا ہے۔

انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرانا ہے

سنیئے' عزیزانِ من! قرآنِ کریم کن چیزوں کو بنیادی قرار دیتا ہے' جنہیں انسان اختیار نہیں کرنا چاہتا' جنہیں وہ بڑا دشوار گزار سمجھتا ہے؟ ان کے لیے کہا کہ فَکُّ رَقَبَةٍ ❶ (90:13)۔ وہ کام جو امت کرے گی وہ یہ ہے کہ وہ اس قرآن کے نظام کو لے کر اٹھے گی' اسے قائم کرے گی۔ دیکھیے' یہ دشوار گزار گھاٹیاں قدم بقدم چڑھنی پڑیں گی۔ زندگی میں ان کا فریضہ کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ پہلی چیز یہ ہوگی کہ دنیا میں جو گردن بھی کسی دوسرے کی غلامی اور محکومی کے اندر جکڑی ہوتی ہے' اس کو آزاد کرانا ہوگا۔ زندگی میں رقبہ یعنی کوئی کسی انسان کی ایک گردن بھی کسی دوسرے انسان کی محکومی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی رہ گئی ہے' تو اس امت نے اپنا فریضہ پوری طرح سے ادا نہیں کیا اور عزیزانِ من! دوسروں کی گردن سے زنجیر تو وہی نکالے گا جو خود آزاد ہوگا۔ جس کے اپنے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں' وہ دوسرے کو آزاد کیا کرائے گا۔ دنیا میں صرف وہی پرانے زمانے کی Slavery (غلامی) نہیں ہے۔ وہ تو اس کی صرف ایک شق ہوتی تھی۔ آج تو اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

غلامی کی مختلف شکلیں

غلامی تو آج بھی موجود ہے' عہد کہن سے کہیں زیادہ شدید تر اور وسیع تر پیمانے پر موجود ہے' قسمیں بدلی ہوئی ہیں۔ اب لوگوں کو زنجیریں نہیں پہنائی جاتیں۔ اب ان زنجیروں کا انداز اور ہو گیا ہے۔ عہد کہن کا وہ غلام تو ہر وقت ذہن میں یہ سوچتا تھا کہ کسی طرح سے زنجیریں توڑ دوں' یہ کسی طرح سے ٹوٹ جائیں تو میں نکل بھاگوں۔ اب وہ زنجیریں پہنائی جاتی ہیں کہ اگر کہیں ذرا خطرہ ہوتا ہے کہ میں

---

❶ یہ راستہ ہے کہ انسان صرف اپنی فکر ہی نہ کرے بلکہ جہاں دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے' اسے اس سے یہ آزاد کرا لے۔ یعنی سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم' مطیع اور زیردست نہ رہے۔ ہر ایک گردن اٹھا کر چلے' ہر ایک کو جسمانی' ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو۔ (اس پر قوانین خداوندی کے سوا کسی کی پابندی نہ ہو)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یہاں سے آزاد ہو جاؤں گا تو وہ وہاں روتا ہے' چلاتا ہے' گڑگڑاتا ہے۔ کوئی مزدور جسے معاشی زنجیروں میں جکڑ کر آپ کارخانے میں رکھتے ہیں' جس مصیبت میں وہ دن گزارتا ہے وہ اسے معلوم ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی دن یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں چھانٹی ہونے والی ہے اور مجھے نکال دیا جائے گا تو پوچھیے نہیں کہ اس پہ کیا گزرتی ہے' اور کوئی عقیدت مند جو کسی پیر کے آستانے کے اوپر بلا زنجیر بیٹھا ہوا ہے' غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا' کسی دن اگر ان پیر کی آنکھوں میں تھوڑی سی کوئی شے بھی آ جائے تو پوچھیے نہیں کہ کس طرح گڑگڑاتا ہے: یا حضرت! تباہ ہو جاؤں گا مجھے یہاں سے نہ اٹھایئے۔ غلامی کی زنجیریں کن کن گوشوں سے پہنائی جاتی ہیں۔ آج دنیا کے اندر معلوم نہیں کہ کوئی ایسا خوش نصیب انسان نظر آئے کہ جس کی گردن میں کسی نہ کسی قسم کی غلامی کی زنجیر نہ پڑی ہوئی ہو لیکن یہ امت جو دنیا میں بھیجی گئی' قرآن کا یہ نظام جس کا مرکز اس بلدِ امین (مکہ) نے بننا تھا۔ اس کا پیغام تو ہر نوعِ غلامی کے لیے موت تھا۔

قرآن کا پیغام: موت ہے ہر نوعِ غلامی کے لیے

قرآن کے اس نظام کی پہلی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ یہ نظام آئے گا تو دنیا میں ہر گردن سے (رقبۃ) غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دے گا۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن نے سورۃ اعراف میں یہ بتایا تھا کہ یہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی ہے' ان سلوں کو اٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی چلی آ رہی ہے اور یہی اس امت کا مقصد بتایا' یہی مقصود بتایا اس نظام کا: فَكُّ رَقَبَةٍ [1] (90:13)۔ دنیا میں ہر نوعِ غلامی کے لیے پیغام تو اور اس کے بعد آپ اپنے ہاں دیکھتے ہیں کہ آپ کے مذہب پرست طبقہ نے کیا کیا۔ آج اس وقت بھی بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ''اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام بنایا جائے گا اور ان کی عورتوں کو بلا تعداد لونڈیاں بنایا جائے گا' اور ان سے تمتع کی اجازت ہے۔'' میں کہتا ہوں کہ قرآن نے اس کی تردید کے لیے کہیں لمبی چوڑی بات کی ہی نہیں۔ دو لفظ کہے ہیں کہ فَكُّ رَقَبَةٍ [1] (90:13)۔ یہ اس نظام کی بنیادی چیز بتائی ہے۔ جو نظام اور جو قوم' دنیا کے ہر غلام کو آزاد کرنے کے لیے اٹھی تھی اب بقول ان کے وہ دنیا کے آزاد انسانوں کو غلام بنانے کے لیے آئے گا۔ کیا یہی اسلام ہے جسے آج دنیا کے اندر آپ پیش کر رہے ہیں حالانکہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ فَكُّ رَقَبَةٍ [1] (90:13)۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ پہلی چیز ہی یہ ہے کہ دنیا میں ہر نوعِ غلامی کے لیے یہ نظام پیامِ مرگ ہوگا۔

---

[1] کوئی انسانی گردن جو کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے' اسے اس سے آزاد کراؤ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد

اب برادرانِ عزیز! اگلی چیز سنیے۔ یہ وہ نظام ہے جس کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اسے قائم کرنے کے لیے اٹھا ہوں' اس بلدِ امین ❶ نے اس کا مرکز بننا ہے۔ یہ اس دَور میں آئے گا جس میں اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ (90:14) سرمایہ داری کا نظام بھوک کو اتنا عام کردے کہ ہر شخص اس سے لرز رہا ہو۔ اس زمانے کے اندران بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرنے کے لیے میں اٹھا ہوں۔ یہاں ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ (90:14) کے الفاظ آئے ہیں۔ مَسۡغبة اس بھوک کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تکان بھی شامل ہو۔ یہ نہیں' کہ ایک شخص دن بھر کام نہیں کرتا اور اس کے بعد اس کو کچھ نہیں ملتا' وہ بھوکا رہتا ہے۔ یہ عربی زبان ہے۔ عزیزانِ من! کیا عرض کروں اور یہی زبان قرآن کا انتخاب ہے۔ یہ اعجاز ان الفاظ کا انتخاب ہے۔ یہاں صرف بھوک ہی نہیں کہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ دن بھر محنتِ شاقہ کرنے کے بعد شام کو بے حد تکان ہو لیکن اس کے باوجود اتنا نہ مل سکے کہ اس کی بھوک مٹ جائے۔ آپ نے کہا کہ میں وہ نظام قائم کرنے کے لیے اٹھا ہوں تم کہتے ہو کہ اس نظام کو شکست دے دی جائے گی۔ برادرانِ عزیز! وجد میں آتے چلے جایئے کہ اس دین کے کیا کیا عناصر ہیں۔ جو قرآن فَکُّ رَقَبَۃٍ ❷ (90:13) نافذ کرنے کے لیے آیا تھا اور پھر اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ (90:14) اس دَور میں جہاں بھوک اور تکان کو عام کردیا جائے' میں ہر فرد کی روٹی کا انتظام کروں گا۔ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ❸ (90:15)۔ یہ وہ چیز ہے جو میں کئی بار دہرا چکا ہوں۔ آج وہ آیت ہی سامنے آ گئی ہے۔ یہاں کہا کہ یہ نظامِ باطل جس میں ایک فرد' لاکھوں افراد کے اندر رہتا ہوا بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے' میں اس نظام کو مٹانے کے لیے آیا ہوں۔

عزیزانِ من! پوچھا کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ اس کے لیے کسی پانچ سو صفحات کی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ چار آیات پیش کردیجئے' اسلام کا نظام پورا آجاتا ہے۔ فَکُّ رَقَبَۃٍ o اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ (90:13-14) غلامی سے آزادی اور اس دور میں رزق کا انتظام ہو جس دور میں تکان تو بے حد ہوگی ہے مگر اس تکان کے نتیجہ میں پیٹ بھر کر بھی کھانے کو نہ ملے۔ یَتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ (90:15) اور نظامِ باطل کہ جس میں ہر فرد اپنے آپ کو لاکھوں کے اندر رہتا ہوا بھی تنہا محسوس کرے۔ میں اسے مٹا دوں گا۔ تفصیل میں جاؤں گا تو شاید اس ایک ٹکڑے کے لیے بھی مجھے مہینہ بھر کم ہوگا۔ لیکن مجھے تو آگے بڑھنا ہے۔

---

❶ مراد ہے مکہ معظّمہ

❷ کوئی انسانی گردن جو کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے' اُسے اس سے آزاد کراؤ۔

❸ وہ نظام ان لوگوں کے رزق کا انتظام کرے جو معاشرہ میں' ہزارہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی' اپنے آپ کو تنہا اور بے یارومددگار پائیں۔ (3-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

مسکین کا مفہوم

اب اسلامی نظام کی تیسری چیز آ گئی: اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ❶ (90:16)۔ دو دو الفاظ ہیں' برادرانِ عزیز! یہاں کہا کہ جسے تم دن بھر مٹی میں گاڑے رکھو اور اس کے بعد وہ بیچارہ دو قدم بھی نہ چل سکے۔ تم انسان کو مٹی میں رول دو۔ اس لیے کہ وہ کہیں خود نہ چل پڑے۔ قرآن کی تشبیہیں دیکھیے۔ تسی انساناں نوں اس کھوبے اچ پھساسٹدے او' تا کہ او اپنے قدماں نال چل ناں سکن۔ ❷ مسکین سکنہ اور سکونت کے معنی ''ساکن ہو جانا' حرکت کا رک جانا'' ہے۔ یہاں کہا ہے کہ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ (90:16)۔ تم انہیں مٹی کے گارے میں اس لیے گاڑ دیتے ہو کہ کہیں وہ چل نہ پڑیں۔ کہا کہ میں وہ نظام قائم کروں گا جو اس نظامِ باطل کو مٹا دے۔

قرآن کے اس نظام سے ایک جہانِ نو پیدا ہو گا

برادرانِ عزیز! قرآن کی رُو سے دین کے بنیادی ارکان' اس کے ستون' اس کے عناصرِ ترتیبی کیا ہیں؟ اس کا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ اس کا مقصودِ حیات کیا ہے؟ یہ کاہے کے لیے آیا؟ اس کا جواب یوں دیا کہ اسلام کا یہ نظام اس نظامِ باطل کو توڑنے کے لیے آیا' اس حتمی یقین کے ساتھ آیا ہے۔ تم پوچھتے ہو کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ یہ نظام آ جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ کیوں نہیں آئے گا۔ وہی کچھ کہنہ اور فرسودہ نظام ہے جس میں غلامی' محکومی' محتاجی کو یہی فطرت کا نظام کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اسے آج بھی عرفِ عام میں فطرت کا نظام کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نظامِ کہن فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس جانے والی زندگی میں سے ایک نئی زندگی' یعنی حیاتِ نو اس کے اندر سے پیدا ہو گی جیسا کہ ہر طفلِ نو اس چیز کی بشارت دیتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔ کہا کہ یہ ہے دلیل میرے نظامِ نو کی کہ یہ آ کر رہے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی جگہ وہ کون لوگ ہیں جو یہ نظام لا کر رہیں گے؟ کیوں یہ راستہ بڑا دشوار گزار ہے اور یہ منزل بڑی کٹھن؟

نظام کو قائم کرنے والے لوگ کون ہوں گے؟

وہ کون لوگ ہوں گے جو اس نظام کو قائم کریں گے؟ اس کے لیے کہا کہ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ❶ (90:17)۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو مستقل اقدارِ خداوندی پر یقین رکھیں گے اور پھر اس کے لیے اگلی بات

---

❶ یا وہ نظام ان لوگوں کے رزق کی فکر کرے' جنہیں اس حالت تک پہنچا دیا گیا ہو کہ وہ محض روٹی کی خاطر مٹی میں رلتے ہیں۔ (یعنی سرمایہ داروں کے محتاج رہ کر ان کے لیے محنت و مشقت کے کام کرتے ہیں)۔

❷ تم انسان کو اس دلدل میں پھنسا دیتے ہو تا کہ وہ اپنے قدموں نہ چل سکیں۔

❸ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ وہ اس باب میں ثابت قدم رہیں اور خدا کے عطا کردہ سامانِ نشو و نما میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔ (3-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

آئی۔ یہ قرآن ہے۔ یہ ایسا صیغہ استعمال کرتا ہے جس کے اندر ساری حقیقت بیان کر جاتا ہے کہ یہ بات انفرادی نہیں ہوگی۔ خانقاہوں اور حجروں میں بیٹھ کر یہ کچھ نہیں ہوگا اس کے لیے تَوَاصَوْا (90:17)۔ وہ ایک دوسرے کو اس چیز کی تلقین کریں گے۔ یہ کاہے کی تلقین کریں گے؟ اس بات کی کہ تَوَاصَوْا (90:17)۔ استقامت سے کام لینا ہوگا۔ صاحب! یہ ساری دنیا کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔ یہ نظام، جس کے یہ چار عناصرِ ترکیبی بتائے ہیں، آپ دیکھیے تو سہی کہ یہ سارے عالم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا (3:199)۔ استقامت کے ساتھ خود اپنے پاؤں جما کر رکھو اور دوسرے کا بازو پکڑو کہ اس کے پاؤں میں بھی لغزش نہ آ جائے۔ خود جم کر رہیں گے اور دوسروں کے ساتھ یہ صورت ہوگی کہ وہ بھی استقامت کے ساتھ رہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کاہے کے لیے؟ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ [1] (90:17) تاکہ دوسروں کے دکھوں کا علاج کیا جائے۔ جس محتاج کو ضرورت ہے، اسے دیا جائے۔ ہمارے ہاں بھی لفظ استعمال ہوتا ہے "مرحمت فرما دیجیے گا۔" اسی کو تو رحمت کہتے ہیں۔ رحمت ہوتا ہے "کسی کو اس انداز سے دینا کہ اس میں نرمی کا پہلو ہو، درستگی کا پہلو ہو۔ یہ کچھ اس انداز سے دینا ہے:

یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو

اسے مرحمت کہتے ہیں برادرانِ عزیز! یہ صرف دینا ہی نہیں بلکہ اس انداز کا دینا ہے کہ اس میں نرمی کا پہلو ہو اور درستگی کا پہلو ہو۔ وہ آپس میں یہ کچھ کریں گے۔ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ (90:18)۔ یہ لوگ ہیں جو صاحب یمن و سعادت ہیں، جن میں دنیا کے اندر سعادت ہے جنہیں خوش بخت کہا جا سکتا ہے۔ انہیں ہر قسم کی برکات حاصل ہوں گی۔ ان کے برعکس وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ [2] الْمَشْئَمَةِ (90:19)۔

اس نظام سے انکار کرنے والوں کی حالتِ زار

اور آؤ تمہیں بتائیں کہ دنیا کے اندر بد بخت کون رہ جاتے ہیں؟ یہ وہ ہیں جو قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں، جو ان مستقل اقدار سے انکار کرتے ہیں، وہ بڑے بد قسمت رہ جاتے ہیں۔ وہ خود بد قسمت ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو بدبختی اور بد قسمتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہتے ہیں اور اس طرح عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ (90:20)۔ یہ اس جہنمی معاشرے میں رہتے ہیں، جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ یہ اپنے آپ کو کیا سمجھے بیٹھے تھے! کہا کہ یہ تو اپنے ہی اس نظامِ باطل کے جیل خانہ کے اندر ہیں۔ یہ عجیب مثال ہے۔ اس طرح یہ اس بھاپ کے اندر پکیں گے جیسے ہنڈیا کے نیچے آگ جلا کر اوپر سے ڈھکن دے دیا جائے اور یہ اس کے اندر رہو۔ وَ مَا هُمْ

---

[1] خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔

[2] جو لوگ ہمارے قوانین سے انکار کر کے، تن آسانی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، ان کے حصے میں ناکامیاں اور محرومیاں آتی ہیں۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّار ❶ (2:167)۔یہی نظام انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔بظاہر یہ سمجھے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہے پانی ہے' حیات بخش ہے بس اتنی سی چیز ہے کہ اس ہنڈیا کے نیچے آگ جلا دی جاتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ پھر اس ہنڈیا کے اندر جو چیز ہوتی ہے اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ان کا انجام تو یہ ہونے والا ہے۔کس قدر حسرت ناک ہونے والا ہے ان کا یہ انجام! یہ نظام خود اپنے اندر اِس قسم کی تخریب کی نشانیاں رکھتا ہے' خود تخریب کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔یہ تو خود اپنی بھاپ کے اندر کچلے جائیں گے۔یہ ان کی کیفیت ہوگی۔اس کی جگہ قرآن کریم کا یہ نظام قائم ہو کر رہے گا اور میں اس بلدِ امین کو شہادت میں پیش کرتا ہوں کہ جس کو بنایا ہی اس لیے گیا تھا کہ یہ اس نظامِ نو کا مرکز بنے اور میں شہادت میں پیش کرتا ہوں' نظام فطرت کو کہ وہ کہنہ اور فرسودہ زندگی کے بعد ایک حیاتِ نو کو دنیا کے اندر لاتا ہے۔یہ نظام آ کر رہے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ البلد ختم ہوئی۔اب ہم سورۃ الشّمس لیتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ ان میں اب اس تباہی و واماندگی سے نکلنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی۔وہ اسی میں رہیں گے۔(مفہوم القرآن۔پرویز)

الشمس (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرانِ عزیز! اب سورۃ الشّمس شروع ہوتی ہے۔ یہ 30ویں پارے کی 91ویں سورۃ ہے۔

نظامِ کائنات کی شہادت

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا o وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (91:1-2) میں شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ اس سورج کو اس آفتاب جہاں تاب کو اور اس کی جلوہ فروزیوں کی ضیا باریوں کو اور چاند کو اور اس کے روشنی مستعار لینے کے لیے سورج کے پیچھے پیچھے پھرنے کو۔ دیکھیے! کیا شہادتیں پیش ہو رہی ہیں! نظامِ کائنات کے ایک ایک عنصر کو دیکھیے۔ کہا کہ شہادت میں پیش کرتا ہوں اس جہاں تاب کو اور اس کی جلوہ فروزیوں کو وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (91:2) اور چاند کو اور روشنی ادھار لینے کے لیے سورج کے پیچھے پیچھے پھرنے کو۔ عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ آئیے اور پھر کہیے کہ اس کے بعد کسی دلیل وشہادت کی ضرورت رہے گی کہ یہ انسان کا کلام نہیں' یہ خدا کا کلام ہے۔ چودہ سو سال پیشتر عرب کی سرزمین میں ایک اُمی شخص ہے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ بات تو یونہی چلی آ رہی تھی لیکن وہ نظامِ فطرت کو شہادت میں پیش کرتا ہے۔ شمس یعنی سورج کی بات ہے اس کے بعد قمر کی بات ہے۔

چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے

چاند کے متعلق 200 سو سال پہلے تک تو کسی سائنس دان کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ چاند خود روشن نہیں ہوتا بلکہ یہ تو اپنی روشنی سورج سے ہی مستعار لیتا ہے' شہادت میں تو یونہی قمر کو پیش کیا ہے۔ یہاں قمر کے ساتھ عربی زبان میں ایک لفظ آیا ہے: تـلٰهـا ۔ عرب کہتے ہیں کہ تـلو وہ شخص ہے جو کسی کو اپنے قرض کا کچھ بقیہ لینے کے لیے اس کے پیچھے لگا دے' اور وہ اس کے پیچھے پھرتا رہے کہ دے جاؤ اور مجھے' دے

باہا دے۔ اسی سے یہ تلٰھا کا لفظ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ قمر جو سورج کے پیچھے یوں پھر رہا ہے جیسے قرض لینے والا اس کے پیچھے پھر رہا ہو۔ یہ ایک بات کہنی تھی کہ میں قمر اور شمس کی شہادتیں پیش کرتا ہوں۔ میں ساری دنیا کے Scientists (سائنسدانوں) اور علم الافلاک کے ماہرین سے پوچھتا ہوں کہ چھٹی صدی عیسوی میں وہ یہ شہادت پیش کر کے بتادیں کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہوتی' یہ سورج کے پیچھے پھرتا ہے اور اس سے اپنی روشنی کو مستعار لیتا ہے۔ جو شخص اس زمانے میں ضمناً کہہ جاتا ہے کہ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰـهَا (91:2) اور چاند کہ جب وہ بھیک منگوں کی طرح سورج کے پیچھے پیچھے روشنی ادھار لینے کے لیے پھرتا رہتا ہے کوئی انسانی ذہن یہ چیز اس دور کے اندر کہہ سکتا تھا؟ برادرانِ عزیز! وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰـهَا (91:2) روشنی ادھار لینے کے لیے چاند کے سورج کے پیچھے پیچھے پھرنے کے بعد کہا کہ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (91:3) اور دن کو جب اس کی آب وتاب چمک دمک سامنے آتی ہے' شہادت میں پیش کرتا ہوں وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (91:4) رات کو' اور اس کی تاریکیوں کو' جو ہر شے کو اپنی چادر میں لپیٹ لیتی ہیں' شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰـهَا (91:5) فضا کی بلندیوں میں اجرامِ فلکی کو' اور جس انداز سے انہیں بنایا گیا ہے کو' شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ دراصل یہ اجرام فلکی جو تمہیں نظر آتے ہیں' انہیں اس طرح سے بنایا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس بـنٰها میں کسی شے کو بلندیوں کی طرف لے جا کر بنانے کے معنی ہوتے ہیں۔ اس ایک لفظ کے اندر یہ چیز موجود ہے اور پھر کہا کہ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰـهَا (91:6) اس زمین کو جو گول ہونے کے باوجود' تمہیں یوں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گول بھی ہے' کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ اس شہادت میں یہ تو نظام کائنات ہی ہے اور اس کے بعد قرآنِ کریم انسان کی اپنی دنیا کی طرف گیا اور کہا کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا [1] (91:7)۔ اس کے بعد اگلی چھ آیات بڑی عظیم آ رہی ہیں۔

عزیزانِ من! تمام مظاہر فطرت شہادت میں پیش کرنے کے بعد' قرآن خارجی کائنات سے نیچے اتر کر خود انسانی ذات پر آ گیا۔ کہا کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا [1] (91:7) انسانی ذات کو اور اس کی اس خصوصیت کو کہ جس سے یہ ایک Balanced Personality (متوازن شخصیت) بن سکتی ہے' شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ سارا نظامِ کائنات تناسب اور توازن پہ چل رہا ہے اس لیے ان تمام کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

باہمی کشش کے فرق سے سلسلہ کائنات پاش پاش ہو جائے

برادرانِ عزیز! اگر ان اجرام فلکی میں سے کسی ایک کی رفتار میں' کسی ایک کی بھی Radiation (اشعاعی توانائی) میں' کسی ایک کی بھی Gravitation (کشش ثقل) میں' کسی کی بھی باہمی کشش میں' ان کے توازن میں' کروڑویں حصے کا بھی فرق آ جائے' تو یہ

---

[1] خود انسانی ذات کو' اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے' کو شہادت میں پیش کرتا ہوں کہ...... (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سارا سلسلہ کائنات ٹکرا کر ایک ہی لمحے میں پاش پاش ہو جائے گا۔ اس لیے قرآن نے کہا تھا کہ ہم نے کائنات کو بنایا اور وَضَعَ الْمِيزَانَ (55:7)۔ اس میں ترازو کھڑا کر کے رکھ دیا۔ یہ سارا سلسلہ کائنات توازن پہ چلتا ہے اور یہاں کہا کہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا❶ (91:7)۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بنیادی غلطی

یہاں کہا ہے کہ انسانی ذات ہے اور اس ذات میں متوازن ہونے کی خصوصیت رکھ دی ہے۔ اس آیت کے بعد اگلا فقرہ تین الفاظ کا ہے جس کے غلط مقصود و مفہوم نے اتنی گمراہیاں پھیلا رکھی ہیں کہ پہلے تو یہ دوسری دنیا کے اندر ہی تھیں مگر اس کے بعد تو آپ کی اپنی مسلمانوں کی دنیا کے اندر بھی جو چیز آئی ہے' اس نے تباہی مچا رکھی ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا ❶ (91:8)۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ انسان کے اندر خدا نے نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اتنی بنیادی غلطی ہے جس نے انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور آپ کے ہاں جو اس دنیا کو اس گمراہی سے نکالنے کے لیے قرآن آیا تھا' آپ وہاں قرآن والے قرآن کی اسی آیت سے اس گمراہی کی یہ دلیل لاتے ہیں کہ جس میں دنیا پھنسی چلی آ رہی تھی۔ عقیدہ اور نظریہ یہ تھا کہ انسان کے اندر ہی ایک چیز موجود ہے' جو اسے غلط اور صحیح میں امتیاز کر دیتی ہے۔ اسے اس کی ''ضمیر کی آواز'' کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ کہیں گے کہ وہ تو ہم بھی روز کہتے ہیں کہ ''صاحب! اپنے دل سے پوچھیے کہ تیرے ضمیر نے بھی تجھے یہ کچھ نہ کہا۔ ضمیر انسان کو بتا دیتی ہے' ضمیر مردہ ہو چکی ہے۔'' ہم یہ روز کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا شے تھی۔ یہ وہ نظریہ تھا کہ انسان کے اندر وہ چیز موجود ہے جو خود غلط اور صحیح میں امتیاز کر سکتی ہے اور اگر اس کے اندر یہ پہلے سے موجود ہے تو عزیزانِ من! یہ سارا سلسلہ رشد و ہدایت' یہ آسمان سے وحی کا آنا' یہ انبیائے کرام کا ان کتابوں کو لانا' لوگوں کو اس کی تبلیغ کرنا' یہ بتانا کہ یہ ہے سیدھا راستہ' وہ سیدھا راستہ نہیں ہے' اگر یہ سارا کچھ اس کے اندر تھا تو پھر باہر سے یہ سارا چکر کاہے کے لیے ہوا۔ جسے آپ یہ غلط اور صحیح کہتے ہیں' یہ باہر کی کائنات کی ہر چیز کے اندر موجود ہے۔ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ آپ مرغی کے نیچے انڈے رکھیں: کچھ Duck (بطخ) کے انڈے' کچھ مرغی کے انڈے، اکیسویں دن کے بعد جب اِن سے بچے نکلتے ہیں' پھر اگر آپ ان مرغی کے بچوں کو دھکیل کر بھی پانی کی طرف لے جائیں تو وہ بھاگ کر' اڑ کر' پیچھے کی طرف آتے ہیں اور Duck (بطخ) کے بچے اڑ کر' پانی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ ان کی طرف کون سا رسول آیا تھا جس نے کہا تھا کہ پانی کی طرف نہ جانا' ڈوب جاؤ گے؟ کون سے نبی نے یہ چیز کہی تھی کہ تمہارے لیے خشکی ہے اور تمہارے لیے یہی پانی کا راستہ

---

❶ پھر' اس ذات کے اندر' جس انداز سے اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ یہ چاہے تو (غلط روش پر چل کر) اپنے اندر انتشار (Disintegration of Human Personality) پیدا کر اور چاہے اس انتشار سے محفوظ رہ کر مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

صحیح ہے۔ یہ مرغی اور Duck (بطخ) کے بچے کی بات نہیں ہے۔ جن کو آپ Migratory Bird (مہاجر پرندے) کہتے ہیں، یہ بحرالکاہل کے اندر ایک جزیرہ ہے، جس میں یہ پرندے رہتے ہیں۔ یہ وہاں سے اڑ کر تین ہزار میل سمندر کے اوپر، جس کے اوپر راستہ ہی نہیں ہے، نشانِ راہ ہی نہیں ہے، وہاں سے اڑ کر ہوائی Havii کے جزیرے کے ایک مقام پہ آتے ہیں، وہاں آ کر وہ انڈے دے دیتے ہیں اور اس کے بعد وہ وہاں سے اڑ جاتے ہیں۔ ان کے اڑنے کے بعد ان انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ جب بچے نکلتے ہیں تو وہ پرندے پہلے بچے ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی وہاں ہوتا ہی نہیں اور جونہی ان میں اڑنے کی قوت ہوتی ہے، وہ وہاں سے اڑتے ہیں، تین ہزار میل اسی سمندر کے اوپر سے اڑ کر وہاں چلے جاتے ہیں، جہاں ان کے باپ ہوتے ہیں۔ یہ ہے اندر رکھی ہوئی چیز۔ اس کے لیے خارج سے ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی اور اندر رکھی ہوئی چیز کی خلاف ورزی کوئی نہیں کر سکتا۔ بکری کے اندر یہ چیز رکھی ہوئی ہے کہ گوشت تم پہ حرام ہے، گھاس حلال ہے، تو وہ کبھی حرام کھا ہی نہیں سکتی۔ وہ اسی چیز کو کھانے کے لیے مجبور ہے جو اس پر حلال ہے۔ شیر کے لیے گوشت حلال ہے۔ انگور کی بیلیں اس کے گرد پڑی ہوں، وہ بھوکا مر جائے گا، اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ وہ حرام کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے اندر کا فیصلہ ہے۔ کیا انسان کے اندر یہ چیز ہے جو پہلے تو اسے یہ بتا دے کہ یہ تیرے لیے حلال ہے اور یہ حرام ہے اور بتانے کے بعد اس کی کیفیت یہ ہو کہ مرتا مر جائے، حرام کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے؟ ہے انسان کے اندر یہ چیز؟ اس کے اندر یہ چیز ہوتی تو Good&Evil (نیکی اور بدی) کے اس سارے سلسلے کا سوال ہی نہیں ہوتا یہ جتنی بھی کائنات کی چیزیں ہیں، ان کے اندر یہ چیز رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس کے اوپر چلنے پہ مجبور ہیں۔ وہاں تو گناہ اور جرم کا تصور ہی غلط ہے۔ کوئی بکری جھوٹ نہیں بولتی۔ اس کے لیے اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ اندر رکھی ہوئی چیز کی تو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یعنی ہندو بچے کو تو بچپن سے پرورش ہوتی ہے تو جونہی اس کے سامنے گوشت آیا، ماس آیا تو ہوا ہائے ہائے رام۔ اس کے خلاف نفرت ہوتی ہے۔ زندگی میں، عمر بھر، جہاں اس کے سامنے گوشت آتا ہے، اس کی ضمیر اسے پکار اٹھتی ہے کہ یہ بڑی ناپاک چیز ہے اور مسلمان کا بچہ دودھ چھڑانے سے پہلے ہڈی چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی گوشت اس کے سامنے آتا ہے اور اس کی ضمیر اسے کہتی ہے کہ لپک کے کھا۔

ضمیر ہوتا کیا ہے؟

یہ ضمیر ہے کیا چیز؟ جس ماحول میں آپ کا بچپن گزرتا ہے، آپ کی تربیت ہوتی ہے، جو خیالات آپ کے Environment (ماحول) سے آپ کے اندر آتے ہیں، وہ آپ کے نفسِ تحت الشعور کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ ساری عمر وہی چیز آپ کے ہاں اندر سے پکارتی چلی جاتی ہے۔ اس کو آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ یہ انگریزی کے ایک فقرے میں، جو میں کہا کرتا ہوں کہ ضمیر (Conscience) کچھ نہیں ہے، Society Internalized ہے۔ معاشرے کو ہم نے اپنے اندر داخل کر لیا ہوتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ، اس قسم کی ضمیر۔

ٹھگوں کا بچہ جب پہلے دن ٹھگ کر آتا تھا تو آ کر وہ سب سے پہلے دیوی کے ہاں اپنا پانچواں حصہ چڑھاتا تھا اور اس دن گاؤں میں جشن ہوتا تھا۔ اس کی ضمیر کبھی یہ نہیں کہتی تھی کہ دوسرے کو ٹھگنا' قتل کر دینا' مار دینا' وغیرہ یہ سب برائی کی بات ہے۔ کیا انسان کے اندر یہ چیز ہے؟ اگر انسان کے اندر یہ حق اور باطل کی تمیز و امتیاز کی چیز ہوتی تو باہر سے خارجی وحی کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

یہ نیکی نیکی نہیں ہے

اگر انسان کے اندر یہ چیز ہوتی تو پھر سوال ہی نہیں تھا کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا اور اگر کوئی اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تو اسے آپ نیک نہیں کہہ سکتے۔ آپ کبھی یہ کہتے ہیں کہ بکریاں تو بڑی متقی' پرہیز گار واقع ہوئی ہیں۔ صاحب! دیکھیے گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ یہ نیکی نیکی نہیں۔ نیکی تو اس کی نیکی ہے جو بدی کی قوت ہونے کے باوجود نیکی کرے۔ دوراہے پہ پہنچنے کے بعد خود یہ اپنی مرضی سے صحیح راستہ اختیار کرے۔ اسے صحیح راستے پہ چلنے والا کہتے ہیں۔ لہٰذا **فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا** (91:8) میں یہ چیز کہ خدا نے نفسِ انسان کو' انسانی ذات کو' پیدا کیا ہے اور اس کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی ہے' کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے' یہ مطالعۂ فطرت انسانیت کے خلاف اور مطالعۂ کائنات کے خلاف ہے۔ یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ ابھی پچھلی سورۃ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ** (90:10) ہم نے اس کو دوراستے دکھائے۔ اس کے اندر حق و باطل کی تمیز کی یہ کوئی چیز نہیں تھی۔ یہاں ہے کہ **فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا** (91:8) یہ نفسِ انسانی کی ہی دو خصوصیتیں ہیں۔ اس کا ''فجور'' اور اس کا ''تقویٰ'' اس کے اندر ہی رکھا ہوا ہے۔ **فَاَلْهَمَهَا** [1] (91:8) کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو کسی چیز کے اندر داخل کر دینا' جسے نگل لینا کہتے ہیں۔ انسانی ذات کے اندر یہ کیا چیز رکھی ہوئی ہے: اس کا فجو اور اس کا تقویٰ۔ یہ اس کے اندر صلاحیت رکھی ہوئی ہے۔ فجور فجر' ف ج ر' کے معنی ہوتے ہیں Disintegration (انتشار) پھٹ جانا' انتشار۔ کہا کہ یہ چیز ہم نے اس کو دی ہے۔ یہ Developed Form (نشوونما یافتہ حالت) میں' بنی بنائی ہوئی' نہیں دی۔ اس کے اندر ہم نے دونوں ممکنات (Possibilities) رکھ دیئے ہیں' تو یہ اس کو Disintegrate (منتشر) بھی کر سکتا ہے اور Disintigration (انتشار) سے بچ بھی سکتا ہے۔ اب یہ جس طرح جی چاہے' اپنی اس ذات کو بنا لے۔ یہ ہے **فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا** (91:8) اس کا انتشار کی نظر ہو جانا اور اس کا اس سے بچ جانا۔ اس ذات کے اندر کیا ہے؟ یہ دو امکانات (Possibilities) ہیں جو اس کے اندر موجود ہیں۔ یہ نیکی اور بدی نہیں ہے۔ نفس انسانی بھی یہ دونوں امکانات اپنے اندر رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے خدا نے کہا ہے کہ دونوں امکانات اس کے اندر رکھ دیئے ہیں۔

---

[1] اس کا مادہ (Root) ''ل ہ م'' ہے۔ لھمہ یلھمہ لھما۔ اس کے معنی ہیں ''کسی چیز کو یکبارگی نگل لینا۔ رجل لھم کے معنی ہیں ''بہت کھانے والا آدمی (لغات القرآن۔ پرویز ص۔ 1506

وحی کا دوسرا نام ہم نے الہام رکھ لیا

ضمناً میں عرض کروں کہ یہ جسے آپ کے ہاں الہام کہا جاتا ہے' قرآن میں یہ ایک لفظ فالھمھا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو نگل لینا' کسی چیز کو کسی دوسری چیز میں داخل کر دینا۔ اب یہاں سے آپ کے ہاں ایک لفظ الہام آیا اور پھر ان تنکوں کے پل کے اوپر سے ہاتھ گزارنے شروع کیے۔ صاحب! الہام ہوتا ہے۔ وحی تو نہیں ہوتی' الہام ہوتا ہے۔ یعنی اس کا ایک دوسرا نام رکھ لیا اور یہ کہہ دیا کہ ٹھیک ہے صاحب! بابِ نبوت تو بند ہے' یہ الہام ہوتا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ دونوں میں فرق کیا ہوتا ہے؟ خدا کی طرف سے براہِ راست کسی کو کوئی علم مل جانا، اسی کو وحی کہتے ہیں اور اسی کا نام آپ کے ہاں الہام ہوتا ہے' اسی کو آپ یہاں کشف کہتے ہیں۔ یہ نبوت کے دروازے کو توڑنا ہے۔ ہمارا تو ختمِ نبوت پہ بنیادی ایمان ہے لیکن قدم قدم کے اوپر وہ آپ کے مدعی موجود ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے۔ یہی دعویٰ نبوت نہیں تو کیا ہے۔ یہ وحی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ فریبِ نفس ہے' ہم نے اس کے لیے ایک دوسرا لفظ چن لیا ہوا ہے۔

نبوت کے بعد براہ راست کسی کو علم نہیں ملتا

ختمِ نبوت کے بعد' برادرانِ عزیز! خدا کی طرف سے کسی کو براہ راست علم ملنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسی کو ختمِ نبوت کہتے ہیں۔ اب خدا نے جو علم دینا تھا وہ قرآن کے اندر موجود ہے اور دوسری چیز عقلِ انسانی ہے۔ دنیا کے اندر تیسرا ذریعہ علم کوئی نہیں۔ نفسِ انسانی کے اندر یہ ممکنات ہم نے رکھ دیں' جی چاہے تو انہیں Develop (نشوونما) کر لے' نشوونما دے کر Disntegration (انتشار) سے بچ جائے اور اگر اس کا جی چاہے تو اس میں انتشار پیدا کر لے۔ جو میں کہہ رہا ہوں' اس کے لیے ہمیں دور جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگلی ہی دو آیات اس کی تشریح کر رہی ہیں: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (91:9-10) اب یہ ہر فرد کے اوپر ہے کہ یہ اس کو نشوونما دینا چاہتا ہے یا یہ اس کو اس طرح سے دبا دینا چاہتا ہے اور مار دینا چاہتا ہے۔

انسانی ذات ایک بیج کی مانند ہے

عزیزانِ من! لفظ سنیے! قَدْ اَفْلَحَ (91:9) وہ کامیاب ہوا۔ پھر کامیابی کے لیے لفظ ''فلاح'' ہے۔ فلاحت تو کھیتی باڑی کو کہتے ہیں۔ افلح کے معنی ہوتے ہیں جس کی کھیتی پروان چڑھ جائے۔ سوال یہ ہے کہ کس کی کھیتی پروان چڑھی؟ جواب دیا کہ مَنْ زَكّٰهَا (91:9) جس نے اسے نشوونما دے دی۔ بات ظاہر ہو گئی کہ انسانی ذات غیر نشوونما شکل کے اندر' ممکنات Possibilities اور Potentialities (صلاحیتوں) کے اندر انسان کو دی اور یہ انسان کے اوپر ہے کہ اس کو وہ جی چاہے تو نشوونما دے لے' جی چاہے تو اس کو بالکل پژمردہ کر دے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (91:9) جس نے اس کو نشوونما دے دی اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ وَقَدْ خَابَ

مَنۡ دَسّٰهَا [1] (91:10)۔کیا عرض کروں' عزیزانِ من! ایک ایک لفظ کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ یہ جو کھیتی کی مثال دی جاتی ہے اس میں بیج کو مٹی کے نیچے دبایا جاتا ہے۔سیدھی سی بات ہے کہ اس کے بغیر وہ اگ ہی نہیں سکتا لیکن مٹی کا جتنا بوجھ اس کے اوپر ہوتا ہے اس کا ایک خاص توازن ہوتا ہے' ایک خاص وزن ہوتا ہے۔اس وزن کے ساتھ مٹی بیج کے اوپر ہو' تو بیج اوپر کو پھوٹتا ہے اور اگر وہ وزن زیادہ بھاری ہو جائے تو وہ کونپل پھوٹنا تو ایک طرف رہا' اس بیج کا بھی ستیاناس ہو جاتا ہے' دب جاتا ہے۔ یہ جو زمین کو ہل چلا کر قابلِ کاشت بناتے ہیں' اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بیج کے اوپر جو مٹی آئے وہ اتنی نرم اور اتنی ہلکی ہو کہ اس میں سے زندگی آسانی سے اپنی نمود کر دے اور اگر اس کی جگہ کسی بیج کے اوپر مٹی کا ڈھیلہ آجائے تو وہ بیج اگ نہیں سکتا۔ کہا کہ **زَكّٰهَا** (91:9) نشوونما اس کی ہوگی جو اس طرح اسے ممکنات کے اس مادے کی مٹی کے نیچے رکھتا ہے۔ یہ تو Material World (مادی دنیا) ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشوونما ہوتی ہے لیکن اس مٹی کو اس کی نشوونما کا ذریعہ بننا چاہیے مگر شرط یہ ہے کہ اس طرح یہ اس کو دبا نہ دے۔ **قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا** (91:10)۔ **دَسَّ** کہتے ہیں مٹی کا وہ ڈھیر جو کسی کو اپنے نیچے دبا دے۔ یہاں کہا کہ دیکھنا' کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ مادی دنیا کی یہ جاذبیتیں' یہ کششیں ایک بہت بڑے وزنی ڈھیلے کی طرح ہوں اور اس کے نیچے تمہاری ذات دب ہی جائے اور اس کی کونپل اوپر آنے کے لیے پھوٹے ہی نہیں۔

ذات کے لیے تباہ کن نظریہ

فلاحت کے لیے مٹی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کھیتی ہو نہیں سکتی۔ ترکِ دنیا' ترکِ لذات کی یہ ساری چیزیں حدیثِ بے خبراں ہیں۔ اول تو یہ کہ آپ ترک کر ہی نہیں سکتے' اسی لیے انہوں نے آخر میں ترکِ ترک کہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ ترکِ ترک ہے۔ کہنے لگا کہ یہ جو دنیا ترک کرنے کی خواہش ہے' یہ بھی تو تمہارے اندر ایک خواہش ہے' اس کو بھی ترک دو۔ لو جی' انہوں نے اسے بھی بند کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ اسے کیسے بند کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ مٹی بڑی خطرناک چیز ہے' اس مٹی کو مادی دنیا کے اندر کی آلائشیں کہا گیا۔ قرآن اس کے لیے افلح کا لفظ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مٹی کے بغیر اگ ہی نہیں سکتا۔ جب تمہاری زندگی اس ارض یعنی زمین کی سطح کے اوپر ہے تو یہاں کے یہ جتنے مادی ذرائع ہیں' انہیں استعمال کرنا ہوگا لیکن یوں استعمال کرو جس طرح کسان اس مٹی کو بیج کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور جس کے اوپر یہ مٹی اتنے وزن سے آ گئی کہ اس کے نیچے یہ دب گیا تو اس کے لیے قرآنِ کریم نے لفظ **قدخاب** استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی تو ہوتے ہیں کہ ناکام رہا لیکن یہ تو قرآن ہے صاحب! ناکامی کے دو ہزار الفاظ ہوں گے مگر اس

---

[1] اور جس نے اپنی ذات کو مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا' اس کی کشت حیات ویران ہوگئی' اس کا شعلہ زندگی افسردہ ہوگیا' اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ (dormant) رہ گئیں۔ وہ اس چقماق کی طرح ہوگیا جس میں آتش افروزی کی صلاحیت تو ہو لیکن اس کی چنگاری کی نمود نہ ہو سکے' اور اس طرح وہ پتھر کا پتھر رہ جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نے یہاں **خاب** کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شکل تو چقماق کی ہوگی لیکن حرارت نہیں رہتی

چقماق کی کیا بات ہے! چقماق پتھر ہوتا ہے۔اس کے اندر حرارت پنہاں اور مضمر ہوتی ہے۔اگر کبھی اس چقماق کی یہ کیفیت ہو جائے کہ اس کے اندر چنگاری اور شعلہ باقی نہ رہے تو اس چقماق کی شکل تو رہتی ہے لیکن پتھر ہوتا ہے۔اس کے اندر حرارت ختم ہو جاتی ہے۔وہ چقماق جو پتھر تو رہے مگر اس کے اندر زندگی اور حرارت باقی نہ رہے تو اسے خاب کہا جاتا ہے اگر یہ بات نہ ہو کہ مٹی کے نیچے دبا دو تو یہ ٹھیک ہے کہ شکل وصورت تو تمہاری انسان جیسی رہے گی مگر تم ایسے چقماق بن جاؤ گے جس کے اندر چنگاری باقی نہیں رہتی۔ چقماق تو سمجھ میں آ سکتا۔ یہ بیٹری کے سیل ہوتے ہیں۔ جب آپ نیا سیل لاتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر حرارت اور نور دونوں چیزیں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد آپ دیکھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! وہ سیل اب ختم ہو گیا ہے۔تو اس سیل کو نکالیے۔ یہ اسی طرح سے ہوتا ہے' اِس کی شکل وصورت میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔اب سوال یہ ہے کہ اس میں کیا چیز نہیں رہی۔ وہ جو حرارت دینے کی ممکنات تھیں' وہ اس میں باقی نہیں رہیں۔ اسے خاب کہتے ہیں۔ انسان تو اس طرح سے چلتا پھرتا ہے۔ **وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا** (91:10) جس نے اسے مٹی میں دبا دیا' اس کی زندگی کی کھیتی ویران ہوگئی۔اب آگے بات یہ ہوئی کہ یہ انسانی نفس کس طرح تباہ ہوتا ہے۔قرآن فوراً تاریخ کی طرف آ گیا۔اب یہ حقیقت مجرد بات نہیں ہے۔Abstract (غیر محسوس) طریقے پہ بات سمجھانے کی نہیں۔ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ کیسے تباہ ہوتا ہے۔ **كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ** (91:11) ذرا لاؤ' قومِ ثمود کو سامنے! کیا کیا تھا؟ چراہ گاہوں اور چشموں میں جو خدا نے تمام انسانوں اور تمام انسانوں کے مویشیوں کے لیے سامانِ رزق پیدا کیا تھا' ان کے بڑے بڑے سرداروں نے اس کی ذاتی ملکیت بنالی تھی۔ **طغوھا** یہ ان کی حدود فراموشیاں تھیں۔اس لیے کہا کہ قومِ ثمود کو سامنے لاؤ اور ان کی حدود فراموشیوں کو سامنے لاؤ۔

خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی

عزیزانِ من! اب یہاں قرآن کریم نے تاریخی واقعات کی شہادت پیش کی ہے۔کہا کہ **اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا o فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا** (91:12-13) مخالفت کے لیے وہ شخص' ان کے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ان میں وہ بہت بڑا سرکش شقی القلب اور بدبخت تھا حالانکہ ''خدا کے رسول'' نے ان سے کہا تھا کہ وہ زمین اللہ کی ہے' یہ اونٹنی بھی اللہ کی ہے' اللہ کی زمین پہ اللہ کی اونٹنی چلے۔ **وَسُقْيٰهَا** (91:13) پانی کی باریاں مقرر کرلو' یہ اونٹنی اپنی باری پہ پانی پئے گی۔ آپ دیکھیے کہ **نَاقَةَ اللّٰهِ** (91:13) کہاں آیا

ہے۔تم اس اونٹنی کو یہ کہہ کر پیا سا مارتے ہو' کہ اے تے فتو دی ہے ناں۔ ❶ کہا کہ جب تم نے اس غریب کی یہ نسبت قائم کی' تم نے اس کے تمام راستے بند کر دیئے حالانکہ اس بیچاری اونٹنی نے تو کچھ کہا ہی نہیں تھا کہ میں غریب کی اونٹنی ہوں یا امیر کی اونٹنی ہوں۔ ارے کم بختو! خدا کی زمین پہ خدا کی اونٹنی ہے۔دیکھا' یہ خدا کی اونٹنی کہا گیا ہے۔

حسب نسب کی بنیادوں پر قائم ہونے والا معاشرہ

یہ ساری تباہیاں حسب نسب کی تفریق و امتیاز سے آتی ہیں' محل کے سرونٹ (ملازم) کوارٹر میں پیدا ہونے والا بچہ' ملازم کا لڑکا' نتھو دا پتر ❷ ہے۔حسب نسب کی نسبتیں آپ دیکھتے ہیں: یہ خان صاحب کے صاحب زادے' وہ نتھو کا بیٹا' ان دونوں بچوں کے اندر کتنا امتیاز روا ہے حالانکہ ان دونوں بچوں نے تو دنیا میں ابھی کچھ کیا ہی نہیں۔نہ ان کے ذاتی جوہر کھلے' نہ انہوں نے اپنی محنت مشقت سے اپنے لیے کچھ پیدا کیا مگر یہ دونوں بچے اس زمرے میں آ گئے۔دنیا میں اس طرح سے آئے کہ ایک اس جھونپڑے کے اندر پیدا ہو گیا' ایک اس محل کے اندر پیدا ہو گیا۔تم نے ان کو نسبتیں دے دی ہیں۔اب ساری عمر ان دونوں کا تعین بھی ان نسبتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔تو کہو کہ خدا کی مخلوق وہ بھی ہے اور یہ بھی: ناقة الله ہیں بس! یہاں کہا کہ اتنی سی چیز اُڑا دیجیے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔عزیزانِ من! حسب و نسب کی یہ نسبتیں مار رہی ہیں۔اس نے کہا کہ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا o فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا (91:13-14) ناقة الله ہے' اسے اس کی باری پہ پانی پینے دو۔انہوں نے کہا: نہیں' جناب! اے انہاں کنگلیاں دیاں اونٹنیاں نیں' اے پانی نئیں پی سکدیاں۔ ❸ انہوں نے تکذیب کی' اپنے قول اقرار سے پھر گئے' اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

آخر کار قانون مکافات نے روڈ رولر پھیر کر رکھ دیا

انہوں نے ناقد الله کو ناقة الله نہیں مانا۔دیکھا! انہوں نے کس بات کو جھٹلایا! اور اس کے بعد وہ شخص جو' ان کے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا تھا' جو سب سے زیادہ شقی القلب اور بدبخت تھا' اٹھا اور اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد برادرانِ عزیز! لفظ آتا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا ❹ (91:15)۔" دمدمہ' روڈ رولر کو کہتے ہیں۔کہا کہ تمہارے خدا نے ان کے Crime (جرم) کی وجہ سے اس قوم کے اوپر اپنے قانونِ مکافات کا روڈ رولر پھیر کے رکھ دیا' انہیں ہموار کر کے

---

❶ یہ تو ایک غریب کی کمین' کامی فتو نام کے شخص کی ہے۔

❷ کا بیٹا

❸ یہ ان غریب و قلاش اور مفلس و بدحال لوگوں کی اونٹنیاں ہیں' یہ پانی نہیں پی سکتیں۔

❹ تو ان کی اس روش کے نتیجہ میں' خدا کے قانونِ مکافات کا دمدمہ آیا اور انہیں تہس نہس کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔(انہیں پیس کر خاک راہ گزر بنا دیا) (4۔مفہوم القرآن۔پرویز)

رکھ دیا۔ بڑے اونچے بنے پھرتے تھے: **فَسَوّٰهَا** ❶ (91:15)۔ آپ کے لیے یہ جو نئے ٹینک نکلے ہیں' اس دور میں ان کے لیے بھی انہوں نے عربی کا لفظ دمدمہ ہی استعمال کیا ہے۔ روڈ رولر کو بھی دمدمہ کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ ہمارے قانونِ مکافات نے ان کے اوپر روڈ رولر پھیر دیا' ان کی بستیوں کو زمین کے ساتھ ملا کر رکھ دیا۔ اس لیے کہ وہ **ناقة الله** کو نہیں کہتے تھے۔ زمین کی نسبتیں رکھتے تھے اور اگلا لفظ ہے' برادرانِ عزیز! یہ کچھ کرنے کے بعد کرنے والے کو کچھ خیال آنا چاہیے' اتنی مخلوق' اتنی بڑی قوم' اس کے اوپر روڈ رولر پھرا دیا جاتا ہے' تباہ کر دیا جاتا ہے۔ خیال ہونا چاہیے کہ میں نے یہ کیا کیا۔ کہا کہ **وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا** (91:16) اور اس کو اس کا قطعاً خیال نہیں پیدا ہوتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ بات ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھی جو ان کے سامنے آ گیا۔

قانونِ خداوندی کے لیے اس میں تذبذب اور اضطراب یا تاسف کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جب کسی کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے تو اس کے بعد اس کو اس کی ندامت یا احساس نہیں ہوتا کہ میں نے یہ کیا کر دیا ہے۔ اس کو تو اس چیز کی خوشی ہوتی ہے کہ میرا آپریشن بڑا کامیاب رہا۔ اس کے برعکس جب ظالم کسی کا ہاتھ کاٹتا ہے تو اس ہاتھ کاٹنے کے بعد جب اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تو نے یہ کیا کیا' تو اس کے انجام کا واقعی افسوس ہوتا ہے' باقی دنیا بھی افسوس کرتی ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر کاٹتا ہے تو ڈاکٹر بھی خوش ہوتا ہے' مریض بھی خوش ہوتا ہے' اس کے لواحقین بھی مبارکباد دے دیتے ہیں۔ ہاتھ تو اس ظالم نے بھی کاٹا تھا۔ ہاتھ تو اس ڈاکٹر نے بھی کاٹا تھا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک دمدمہ مظلوموں کی بستیوں کو ہموار کرنے کے لیے فرعون چلاتا ہے۔ ایک دمدمہ ان ظالموں کے اوپر خدا کا قانونِ مکافات چلاتا ہے' جنہوں نے دوسروں کی کھوپڑیوں کے اوپر اپنے محلات استوار کیے ہوئے ہیں۔ تاکہ ان کے محلات کو تہ وتیغ کر کے' زمین کے ساتھ ہموار کر دے۔

عزیزانِ من! اس قسم کے دمدمہ کے بعد کہا کہ **وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا** (91:16) ہمیں اس کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہو رہی ہے۔ یہ خوف اسے پیدا ہوگا جس کی ضمیر مجرم ہوگی۔ میں نے پھر ضمیر کا لفظ کہا ہے۔ یہ اس احساس کا نام ہے۔ اس وقت جج اس کو یہ کہتا ہے کہ اس کو پھانسی پر لٹکا دو۔ تین دن کے بعد بھی اس جج کی ضمیر کبھی ملامت نہیں کرتی کہ میں نے یہ کیا کیا بلکہ وہ مطمئن ہوتا ہے کہ میں نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کیا۔ یہ فرق ہے ان دونوں میں۔

عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی حضور ﷺ کی ایک بے نظیر مثال

عزیزانِ من! حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ایک واقعہ سامنے آتا ہے۔ ایک قاتل کو سزائے موت دی گئی۔ حضور ﷺ تو جج تھے'

---

❶ انہیں پیس کر خاکِ راہ گزر بنا دیا' زمین کے ساتھ ہموار کر دیا' تہس نہس کر دیا۔ مٹی میں ملا دیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

مجسٹریٹ تھے۔ان کے حکم سے یہ ہوا تھا۔اسے سامنے لایا گیا۔کہ اس کے سر پہ جلاد آ کھڑا ہوا' اس زمانے میں اسی طرح سے سزا وارد کیا کرتے تھے۔اس کی ایک چھوٹی سی آٹھ سالہ بچی روتی ہوئی آئی اور حضور ﷺ کی ٹانگوں کے ساتھ آ کر لپٹ گئی' چلائی اور کہا کہ میرے ابا! میں یتیم ہو جاؤں گی اگر یہ مر گیا' یہ میرا باپ ہے' اس کو چھوڑ دو۔حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا کہ شاید اب معاف کیا جائے گا۔آپ نے جلاد کی طرف اشارہ کیا کہ تلوار چلا دو۔اسے قتل کر دیا گیا۔پوچھا گیا کہ حضور ﷺ! یہ کیا بات تھی' آنکھوں میں آپ کے آنسو بھی تھے اور اس کے باوجود آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔کہا کہ ایک بچی کے چلچلانے پہ وہ ''محمد ابن عبداللہ'' کی آنکھ رو رہی تھی۔قانون کے نافذ کرنے والے ''محمد'' کا ہاتھ اس کو قتل کرنے کے لیے اشارہ کر رہا تھا: وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (91:16) اور اگر اس سے قانون ڈرنے لگ جائے کہ یہ کیا ہو گا تو ظلم پھیل جائے گا۔

برادرانِ عزیز! بات اتنی جذب و کیف کی ہے لیکن سمجھانے کے لیے دوسری طرف بات ایک مزاح کی بھی آ گئی کہ جو اس سے ڈرتا ہے پھر وہ کرتا کیا ہے؟ سنیے! ''جولاہے دے گھر چور آ پیا۔سی بڑا تگڑا۔چور نے اُٹھ کے بیٹھا ہو یا دیکھیا۔گوانڈیاں نے رونڈیاں نوں پُچھیا: کی ہویا۔کہن لگا: چور آیا سی۔'' کہن لگے: او توں سُتا ای ریا ایں ساری رات؟ پنجابی نہ جاننے والے حضرات معاف رکھیں' اتنی سی بات ان کی سمجھ میں آ ہی جائے گی۔انہاں دیاں گلاں' انہاں دی زبان اچ سمجھ اوندیاں نیں۔جیویں قرآن عرب دی زبان اچ سمجھ آیا سی ناں اونہاں نوں۔ کہن لگا: اونئیں' میں جاگ پیا ساں۔کہن لگے: اور پھیر؟ او جولاہا کہن لگا: میرے سامنے نٹھا ہیگا۔کہن لگے: او پھیر؟ تو تے اپنیاں بڑاں ماردا ہوندا ہیگا ساں اپنے متعلق' توں کتا کی؟ کہن لگا: میں اوہدے پیچھے گیا۔فیر کی ہویا؟ کہندا: میں انہوں جا بدھیا او تھے' دو چاڑیاں دی واڑ دے باہر۔گوانڈی کہن لگے: او فیر ہویا کی؟ کہن لگا: میں اونہوں پھڑ تے ای ہتھ پالیا۔کہن لگے: فیر؟ کہن لگا: میں جس ویلے اوہدی کلائی نوں ہتھ پایا' تے او چور کہن لگا: اوئے چھڈ دے۔ایتھے پھوڑا اے' ایدے تے۔تے میں چھڈ دتا۔فیر او نٹھ گیا۔''[1]

---

[1] کسی جولاہے کے گھر چور آ دھمکا۔وہ تھا بڑا طاقتور۔چور نے اسے بیٹھا ہوا دیکھا۔ہمسایوں نے روتی پیٹتی عورتوں سے پوچھا: کیا ہوا؟ وہ جولاہا کہنے لگا: چور گھس آیا تھا۔ہمسائے کہنے لگے: ابے! کیا تم تمام رات سوئے ہی رہے؟ پنجابی نہ جاننے والے حضرات معاف رکھیں اتنی سی بات ان کی سمجھ میں آ ہی جائے گی۔ان کی باتیں انہی کی زبان میں سمجھ آتی ہیں' جس طرح قرآن انہیں عربی زبان میں ہی سمجھ آیا تھا۔ہاں تو جولاہا کہنے لگا: ارے نہیں' میں بیدار ہو گیا تھا۔ہمسائے کہنے لگے: پھر کیا ہوا؟ کہا: وہ میرے سامنے بھاگ نکلا۔کہنے لگے: پھر کیا ہوا؟ تم تو اپنے متعلق اتنی بڑی شیخیاں مارا کرتے تھے۔تو پھر تو نے کیا کیا؟ کہا: میں اس کے پیچھے بھاگا۔پھر کیا ہوا؟ کہا: میں نے اسے جا لیا اور لیا باندھ باہر دو جھاڑیوں کی باڑھ سے۔کہنے لگے: ارے بھئی! پھر کیا ہوا؟ کہا: میں نے اسے اٹھتے ہی جا پکڑا۔کہنے لگے: پھر کیا ہوا؟ کہا: میں نے جس وقت اسے کلائی سے پکڑا وہ کہنے لگا: ارے چھوڑ دو۔یہاں اس پہ تو پھوڑا ہے تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔پھر وہ بھاگ گیا۔

ظلم کو ختم کیے بغیر امن قائم نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! جو ظالم کی کلائی پکڑتا ہے اور اس کے بعد اس چیز سے اس کا دل دہل جاتا ہے کہ ''اس کی کلائی پر پھوڑا ہے'' اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ دنیا کے اندر نظام امن قائم نہیں رکھ سکتا۔ نظامِ امن وہی قائم رکھ سکتا ہے جو **وَلَا یَخَافُ عُقْبٰـهَا** [1] (91:16) ہے۔

عزیزانِ من! قرآن دو الفاظ میں قانون کی حکمرانی کے لیے کہتا ہے کہ جو اس توقع پر سختیاں جھیلتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں' انہیں معلوم ہے کہ **مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ**(29:05) انہیں قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہے' اور یہ بھی کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے حضور جوابدہ ہیں انہیں کہہ دو کہ جس انقلاب کے لیے وہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں' وہ انقلاب آ کر رہے گا۔ یہ وہ نہیں ہیں جو بے انصافی کے لیے آنکھ تک نہ اٹھائیں۔ جہاں انصاف کے قانون کا تقاضا ہوتا ہے وہاں وہ **وَلَا یَخَافُ عُقْبٰـهَا** [1] (91:16) بن جاتے ہیں۔ پھر انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ''ایہدا پھوڑا دکھ جاوے گا۔'' [2] قانون کی حکمرانی کے لیے ظالم کی کلائی کو مروڑنا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! آج سورہ الشّمس ختم ہوئی۔ آئندہ درس سورۃ الیل سے شروع ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اور ایسا کرتے وقت وہ اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے کہ یہ بات ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا۔ جو ان کے سامنے آ گیا۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کے لیے اس میں تذبذب' اضطراب یا تاسف کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] اس کے پھوڑے میں درد ہوگا۔

چھبیسواں باب: **سورۃ الیل** (آیات 1 تا 21)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ الیل سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 92ویں سورۃ ہے۔

کائنات کے اندر قدم قدم پر تنوع ہے

آپ اس کائنات پہ غور کیجیے۔ اس کے مظاہر، کائنات کی تخلیق، خدا کی اس مخلوقات، میں بڑا تنوع ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا کا تنوع تو آپ چھوڑ دیجیے خود انسانوں کو لیجیے۔ نوعِ انسانی ایک ہی نوع ہے، ایک ہی جنس ہے لیکن اس میں کتنا بڑا کمال ہے کہ بیک وقت دنیا میں اربوں انسان موجود ہوتے ہیں، چہروں کے خدوخال کی حیثیت ہی کیا ہے: دو آنکھیں، ایک ناک، دو ہونٹ، پیشانی۔ یہ اتنا سا ہی تو کچھ ہے لیکن تنوع کا یہ عالم ہے کہ کسی ایک کا چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا کیونکہ اگر انسانوں کے چہرے میں یہ تنوع نہ ہوتا تو اس دنیا میں ہم ایک دن کے لیے بھی نہ رہ سکتے۔ ایک گھر میں کبھی جڑواں بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو ان کے چہرے میں تنوع نہیں ہوتا۔ ان کے ماں باپ کو انہیں پہچاننے کے لیے ان کے گلے میں رنگدار رومال ڈالنا پڑتا ہے کہ یہ شمیمہ ہے یا نسیمہ ہے اور اگر ان اربوں انسانوں کے چہروں میں تنوع نہ ہو تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں کیا نقشہ بنے گا لیکن اس تنوع کے پیچھے ذرا جا کر دیکھیے کہ انسان کی اصل ایک ہی ہے اور اس کے آگے جب Scientist (سائنسدان) سے پوچھیے تو وہ کہتا ہے کہ دو ہی تو بنیادی قوانین ہیں۔ ایک ہے: Law of Cause& Effect (قانونِ علت و معلول) اور دوسرا ہے: Uniformity of Nature (قانون یکسانیت فطرت۔ قانون وحدتِ فطرت)۔

اس قدر تنوع کے ساتھ ساتھ وحدت بھی

ہر واقعہ جو ہوتا ہے اس کے پیچھے اس کا ایک سبب ہوتا ہے۔ ایک Cause (سبب) ہوتا ہے اور دوسرا اس کا Effect (معلول۔ مسبب)۔ دوسرا Law ہے (قانون): Uniformity of Nature (قانون وحدتِ فطرت) کہ فطرت کے اندر وحدت (Uniformity) ہے۔ اس قدر تنوع کے باوجود اس قدر ورائٹی کے باوجود جو اصلِ کائنات ہے اس میں وحدت ہے۔ دیکھنے کی چیز یہی ہے کہ یہ سارا تنوع کاروباری سہولتوں کے لیے ہے۔ ابھی ابھی ہم نے انسان کے چہرے کا تنوع دیکھا ہے۔ یہ کاروباری سہولتوں کے لیے ہے۔ اگر انسان نے غار میں تنہا رہنا ہو تو اس کے چہرہ کا کلر (رنگ) اس کے چہرے کی ساخت اس کی شباہت کسی بھی قسم کی ہو اس کا کسی دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں لیکن جونہی وہ تمدنی دنیا کے اندر آتا ہے سوسائٹی کے اندر آتا ہے کاروباری دنیا کے اندر آتا ہے وہاں اس کو تنوع کی ضرورت پڑتی ہے۔ کائنات میں یہ تنوع معاملات کے لیے ہے کاروبار کے لیے ہے لیکن اس کی اصل ایک ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ آپ اس سارے تنوع کے پیچھے دیکھیے کہ اصل ایک ہے اور انسانیت کی دنیا کے اندر جتنے بھی بڑے تنوع ہمیں نظر آتے ہیں ان کے پیچھے دیکھا جائے تو انسانیت ایک ہی برادری ہے ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس تنوع میں اگر انسانی زندگی میں تقسیم کی جاسکتی ہے تو قرآن کہتا ہے کہ پھر انسان دو Categories میں دو شقوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یوں تو علم کے اعتبار سے آپ دیکھیے تو نسلیں الگ ہیں قومیں الگ ہیں رنگ الگ ہیں زبانیں الگ ہیں جاہ و سکونت الگ ہے کتنا کچھ الگ ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس تمام اختلاف کے باوجود انسانوں کو تقسیم کیا جائے تو دو ہی بڑی بڑی شقیں ہیں جن میں وہ تقسیم ہو سکتا ہے۔

قرآن نے انسانوں کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے

آیئے دیکھیں کہ قرآن تنوع کی اس حقیقت کو کس انداز سے بیان کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم سلسلۂ کائنات پر غور کرو۔ بادی النظر میں یہ تمہیں متضاد عناصر کا مجموعہ نظر آئے گا۔ مثلاً **وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی o وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی o وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی** ❶ (92:1-3)۔ رات اور دن کا اختلاف دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں بالکل Opposite چیز ہے ان میں باہمی تضاد ہے۔ تنوع ہے تفاوت ہے لیکن کسی Scientist (سائنسدان) کی نگاہ سے پوچھیے وہ کہے گا کہ دن اور رات سوائے اس کے کچھ نہیں کہ زمین کی ایک گردش ہے اس کا جو پہلو سورج کے سامنے ہوتا ہے دن کہلاتا ہے اور جب وہی پہلو سورج سے اوجھل ہو جاتا ہے رات کہلاتی ہے۔ وہی زمین دن ہوتی ہے وہی زمین رات ہوتی ہے۔ اس تضاد کے پیچھے پھر وہی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ آگے ضمناً بات تو قرآن نے یہی

---

❶ ایک طرف رات ہے کہ اس کی تاریکی ہر شے پر پردہ ڈال دیتی ہے تو دوسری طرف دن ہے جس کا اُجالا ہر شے کو اُبھار کر سامنے لے آتا ہے۔ جانداروں میں ایک طرف نر Male ہیں تو دوسری طرف مادہ (Female) جن کے طبعی وظائفِ زندگی مختلف ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہنی تھی کہ رات ہے جب وہ تاریکیاں لے کر آ جاتی ہے اور دن ہے جب وہ جلوہ فروشیاں لے کر آ جاتا ہے۔لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے قرآن کے الفاظ سے یوں نہیں گزر جانا چاہیے۔عجیب زبان تھی۔

تاریکی کرتی کیا ہے؟ یہ جتنے امتیازی خطوط ہوتے ہیں' جو نہیں الگ الگ نظر آتے ہیں' وہ ان سب کو مٹا دیتی ہے۔تاریکی کی چادر سے تمیز کے خطوط باقی نہیں رہتے۔امتیازِ شے ہی باقی نہیں رہتی۔نشیب و فرازِ حیات باقی نہیں رہتا رنگوں کا استعمال باقی نہیں رہتا' ایک شے دوسری شے سے متغیر نظر نہیں آتی۔تاریکی کی چادر امتیاز کو مٹا کر ایک کر دیتی ہے۔اس کے لیے تو قرآن نے لفظ **یَغْشٰی** (92:1) کہا ہے۔جیسا کسی کے اوپر پردہ ڈال دیا جائے تو معلوم نہیں ہوتا کہ پیچھے ہے کیا۔اس لفظ کے مقابلے لفظ **تَجَلّٰی** (92:2) ہے۔**اَلْجَلَاءُ** کے لفظی معنی ہی ہوتے ہیں الگ الگ کر دینے والی چیز۔رات کی تاریکی کی چادر یہ تمام امتیازات مٹا دینے والی ہے' دن کی روشنی پھر ہر شے کو ایک دوسرے سے الگ کر دینے والی ہے۔کہا کہ یوں دیکھو تو ہر شے الگ ہے لیکن اگر صرف ایک روشنی ہی معدوم ہو جائے تو یہ علیحدگی' یہ تمیز' یہ تفریق' یہ تقسیم' یہ اختلاف و تضاد باقی ہی نہیں رہتا۔پھر روشنی آتی ہے' پھر یہ امتیازات شروع ہو جاتے ہیں۔اس کے بعد اس نے کہا کہ دیکھو یہ نر اور مادہ کی تمیز ایک خاص مقصد کے لیے ہے' ورنہ اصل کے اعتبار سے تو ایک ہی ماں ہوتی ہے' ایک ہی جنس ہوتی ہے۔انسان انسان ہی ہے۔خواہ وہ عورت کے روپ میں ہو یا مرد کے پیکر کے اندر۔**اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی** (92:4) [1] یہی جو تنوع ہے اس کا تقاضا ہے کہ تمہاری کوششیں مختلف سمتوں کے اندر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔کاروبارِ حیات میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔کام الگ الگ' پیشے الگ الگ' مقاصد الگ الگ۔تمہاری سوچ سے یہ کوششیں مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں لیکن اگر آپ انسانوں کی تقسیم دیکھیں تو کہا کہ وہ دو ہی بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔آگے بات تو یوں ہونی چاہیے تھی کہ وہ کفر اور ایمان کا امتیاز ہے۔بات تو وہی ہے لیکن قرآن تدریسی گفتگو نہیں کرتا' وہ محسوس طور پر بات سمجھاتا ہے کہ دو شقیں کیا ہیں۔

انسانوں کی ایک شق: متقی

عزیزانِ من! آپ دیکھتے چلے آ رہے ہیں اور اس تیسویں پارے میں یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آ گئی ہے کہ قرآن کی رُو سے انسان کی اس زندگی میں بنیادی نظام اور ستون معاشی مسئلہ کا ہے اور اس کی روح انسان کی ذات کی نشو ونما ہے' جس سے انسان کا مستقبل سنورتا ہے۔بات اتنی سی ہے۔اس لیے آپ دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ اس معاشی سوال کو بہت زیادہ اہم قرار دیتا ہے۔انسانوں کے

---

[1] یہ سب تضاد تقسیمِ عمل کے لیے ہے۔اسی تقسیم عمل کا نتیجہ ہے کہ تمہاری تمدنی زندگی میں تمہاری سعی و عمل کا رُخ بھی مختلف سمتوں کی طرف ہوتا ہے۔اسی سے یہ مشینری بایں حسن و خوبی سرگرمِ کار رہتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

لیے اس کی گرانقدر اہمیت بتاتا ہے یہاں انسانوں کو دو شقوں میں بانٹا ہے۔ اب سن لیں کہ وہ دو شقیں کیا ہیں۔ پہلی شق میں ایک گروہ ہے۔ ایک شق وہ ہے کہ جو فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ❶ (92:5) دوسروں کو دے اور زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر چلتا رہے اور معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے محتاط رہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مَنۡ اَعۡطٰی (92:5) جو دیتا ہے۔ دینے کے لیے دو الفاظ ہیں: ایتاء اور اعطیٰ۔ معنی تو ان دونوں الفاظ کے دینے ہی کے ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے ایتائے زکوٰۃ میں یہی لفظ ''ایتاء'' استعمال کیا ہے لیکن ان میں ایک بڑا باریک سا فرق ہوتا ہے۔ ''ایتاء'' دینے کے دونوں موقعوں پہ بولا جاتا ہے خواہ کسی کے معاوضہ میں کوئی چیز دی جائے یا بلا معاوضہ دی جائے۔ ان دونوں موقعوں کے لیے ''ایتاء'' کا لفظ آتا ہے لیکن ''اعطیٰ'' وہاں آتا ہے جہاں معاوضے کے بغیر کوئی چیز دی جاتی ہے۔ معاوضے میں کسی کو کچھ دینا' انسانوں میں اس کی Category الگ نہیں بنتی۔ کاروبارِ حیات کے اندر تو آپ ہر خدمت کا معاوضہ' ہر کام کا معاوضہ' ہر چیز کا معاوضہ' آپ دیتے ہیں لیکن یہاں اس بنیادی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ''ایتاء'' نہیں آیا۔ ''اعطیٰ'' آیا ہے۔ اس گروہ کی ایک صفت یہ ہے کہ اس شق کے افراد پوری محنت سے کماتے ہیں اور پھر بغیر کسی مزد و معاوضہ کے بغیر کسی صلہ اور تمنا کے' وہ دوسروں کو دیتے ہیں۔ اسی آیت (92:5) میں دوسرا لفظ ''اتقی'' آیا ہے۔ اس کا مادہ (Root) وق ی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا' نگہبانی و نگہداشت کرنا' مضر اور تکلیف دہ چیز سے بچنا اور بچانا' زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر چلنا۔ اسی سے تقویٰ اور متقی کے الفاظ بنتے ہیں۔ مذہب کی دنیا میں اور خود ہمارے ہاں اسلام میں بھی متقی کا لفظ بڑا بنیادی ہے' بلکہ یوں کہیے کہ سب سے بڑا امتیازی نشان' سب سے بڑی خصوصیت' جو کسی کو مومن کے بعد بھی کہنا ہو تو اس کا اگلا درجہ متقی کا درجہ ہوتا ہے۔ یہ وہی تقویٰ کا درجہ ہوتا ہے۔ متقی کون ہوتا ہے؟ اس کے متعلق آپ مذہب کی دنیا کے لحاظ سے اپنے ذہنوں میں تصور کیجیے کہ متقی کسے کہتے ہیں' یہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارا اس وقت کا اسلام تو مذہب بن چکا ہے' دین تو رہا ہی نہیں۔ مذہب کی دنیا میں ایمان سے بھی اگلا درجہ تقویٰ کا ہے۔ اس میں مومن سے بھی بلند مقام متقی کا ہوتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ آخری مقام ہے' اس کے آگے کوئی دوسرا مقام ہوتا ہی نہیں ہے۔

متقی' جو کسی کو بلا مزد و معاوضہ دے

آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی (92:5) جو بلا مزد و معاوضہ دیتا ہے اور اس طرح سے متقی بن جاتا ہے۔ اب اور آگے چلیے۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی (92:6) اور حسنِ عمل کے جو دعوے کرتا ہے' وہ ان

---

❶ لہٰذا یاد رکھو' جو شخص تمام نوعِ انسانی کو ایک وحدت سمجھ کر یہ روش اختیار کرتا ہے کہ اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے دے' اور اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے محتاط رہے۔ (92:18-19) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دعوؤں کو سچ کر دکھاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک لفظ اعطیٰ کے اندر یہ سارا کچھ چلا آ رہا ہے۔ دین کی ساری حقیقت سمٹ کر یہاں آ جاتی ہے کہ پوری محنت سے کماتا ہے اور اس کے بعد اپنی اس محنت کے ماحصل کو بلا مزدو معاوضہ، بغیر ستائش و صلہ کی تمنا کے، ہر دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، وہ یوں دے دیتا ہے جو میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ:

یوں بھیک دے کہ دست گدا کو خبر نہ ہو

وہ یوں دے دیتا ہے اور اس طرح **اِتَّقٰی** (92:5) معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے محتاط رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ **وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی** (92:5-6) وہ جو حسنِ عمل کی باتیں کرتا ہے، وہ ان کی تصدیق کر دیتا ہے، ان کو ثبت کر دیتا ہے۔ وہ جو ایسا کرتے ہیں **فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی** (92:7) ان کے لیے زندگی کی مشکل راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ یہاں راہیں آسان کرنے کے لیے بتایا گیا تھا کہ جو سب سے زیادہ دے دیتا ہے، اس کے راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے اپنے حسن عمل کی تصدیق کر دی، خود بھی ''حسین'' ہوا اور نظامِ کائنات کو بھی اس نے ''حسن'' عطا کیا ہو۔ ''حسن'' کے دعویٰ کو سچ کر کے دکھا دیا ہو۔ کس چیز سے سچ کر دکھایا ہو؟ **اَعْطٰی** (92:5) سے، یعنی اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے دینے سے لیکن یوں لگتا ہے کہ بات ابھی صاف نہیں ہوئی۔

انسانوں کی دوسری شق: بخل

قرآن کہتا ہے کہ متضاد چیز سے بات صاف ہوتی ہے۔ روشنی کی خوبی اس وقت نظر آتی ہے جب رات کو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہاں اعطیٰ کہا تو اس کے مقابلے میں کہا کہ اب ہمارے سامنے دوسری Category (شق) بھی ہوتی ہے۔ اس میں وہ آتا ہے کہ **وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ** (92:8) وہ جو کچھ کماتا ہے، اپنی ذات کے لیے رکھ لیتا ہے۔ **وَاسْتَغْنٰی** (92:8) سمجھتا یہ ہے کہ میں باقی انسانوں سے مستغنی ہو گیا، مجھے اب کسی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو سمیٹ لیتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی ذہنیت کیا ہو جاتی ہے: مستغنیٰ کہ اب مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن یہ عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ مادی ضروریات کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دوسروں سے مستغنی ہو جائے۔ آخر میں یہی کہا کرتے ہیں کہ ٹھیک ہے میاں، زندگی بھر تو تم مستغنی رہو گے، تمہیں کسی کی محتاجی نہیں رہے گی، ضرورت نہیں رہے گی، روپے کے زور پہ سب کچھ کر لو گے لیکن مر جانے کے بعد تو پھر چار کندھوں کی ضرورت پڑے گی۔ تو اس پہ وہ کہتا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جن کے لیے میں اتنا کچھ چھوڑ جاؤں گا، وہ خود اس کا انتظام کر دیں گے اور ایسا نہ بھی ہو گا تو مردہ تو صاحب! کہیں پانچ چھ گھنٹے تک رکھا رہے تو تعفن سے محلے والوں کی جان عذاب میں آ جاتی ہے۔ وہ اٹھا کر اسے قبر میں ڈال آتے ہیں۔ وہاں اپنے آپ کو مستغنی سمجھ سکتا ہے مگر جہاں تک مادی ضروریات کا تعلق ہے وہ ان میں مستغنی ہی ہوتا ہے۔

ذات کی نشوونما سوسائٹی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی

قرآن اگلی بات کہتا ہے کہ مقصدِ حیات تو ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کی ذات (Self) کی نشوونما کس طرح ہوسکتی ہے۔ وہ تو سوسائٹی سے الگ رہ کر ہو ہی نہیں سکتی۔ ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی دوسرے آدمی سے آپ کا معاملہ پڑے تو اس وقت آپ کے اندر کس قسم کا Reaction (ردِعمل) پیدا ہوتا ہے' آپ کس قسم کا معاملہ کرتے ہیں۔ معاملہ کرنے سے' Dealing سے' ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ غاروں میں بیٹھ کر' حجروں کے اندر تسبیحاں پھیرنے سے' ذات کی نشوونما نہیں ہوتی۔ اس لیے جو سمجھتا ہے کہ باقی انسانوں سے مستغنی ہوگیا' ہوسکتا ہے کہ اس کی مادی ضروریات پوری ہوتی چلی جائیں لیکن وہ جو انسان کی ذات کی نشوونما کا' اس کی Personality (شخصیت) کی Development (نشوونما) کا بنیادی Source (ذریعہ' منبع' مخرج) ہے' وہ تو انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے سے ہوتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے مستغنی ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ جس نے اتنا کچھ اکٹھا کرلیا ہے کہ مجھے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں ہے تو اس نے کیا کیا؟ اس کے لیے کہا کہ **كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى** (92:9) وہ اپنے حسنِ عمل کے دعویٰ کو جھوٹا ثابت کررہا ہے۔ اب آپ کے سامنے خواہ وہ جتنا جی چاہے اپنے حسنِ عمل کی تعریف پیش کر دے۔ بخل ایسی کیفیت ہے کہ اس میں وہ سب کچھ اپنے لیے ہی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دعویٰ حسنِ عمل کی تکذیب کررہا ہے۔ اگر اعطیٰ کی کیفیت ہے تو اپنے ان دعویٰ کی تصدیق کررہا ہے' اپنی ذات کے لیے حسین بنارہا ہے' معاشرے کے لیے حسین بنارہا ہے' حسنِ کائنات میں بھی اضافہ کررہا ہے اور اگر بخل کی کیفیت ہے کہ سب کچھ اپنی ذات اور اپنی ہی ذات کے لیے سمیٹتا ہوا رکھتا چلا جاتا ہے تو ان تمام دعویٰ کو جھٹلاتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى** (92:10) زندگی کی آسان راہیں بھی اس کے لیے دشوار ہوجاتی ہیں۔ وہاں (92:7) میں کہا تھا کہ زندگی کی یہ دشوار راہیں آسان ہوجاتی ہیں۔ یہاں آسان راہیں بھی دشوار ہوجاتی ہیں۔ یہ بظاہر تو نظر نہیں آتا کہ ایسا ہوتا کیسے ہے۔ تھوڑا سا انتظار کرو' استغنیٰ کا لفظ آیا تھا' عزیزانِ من! اب الفاظ آتے ہیں کہ **وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى** ❶ (92:11)۔ یہاں ''تردیٰ'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے عام معنی تو ہوتے ہیں ''ہلاک ہوجانا' اپنے آپ کو ہلاکت کے سامنے خود پیش کردینا۔'' اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سمجھتا یہ تھا کہ میں مستغنی ہوں لیکن اس کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو خود جا کر ہلاکت کے سامنے پیش کردیتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ جب ہلاکت کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس کا یہ مال و دولت اس کو اس سے نہیں بچا سکتا۔

---

❶ اور جب وہ تباہیوں کے گڑھے میں گر جاتا ہے تو وہ مال و دولت' جس کے بل بوتے پر' اس نے اپنے آپ کو دوسروں سے مستغنی سمجھ رکھا تھا' اس کے کسی کام نہیں آتا۔ (69:28:111:2) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دولت تباہی سے نہیں بچاسکتی

دولت کے زور پر وہ اس تباہی سے بچ نہیں سکتا۔اس نے وہ روش کیوں اختیار کی؟اس نے اپنے متعلق خود فیصلہ کیا تھا۔کہا تھا کہ میں کماتا ہوں' میری ملکیت ہے' اس پہ میرا اپنا حق ہے' دوسروں کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔وہ اگر کسی کو دیتا بھی ہے تو بھیک کے طور پہ' خیرات کے طور پہ دیتا ہے' پھر یہ سمجھتا ہے کہ میں ان لوگوں سے مستغنی ہوں۔یہ جو میرے ساتھ ہیں' یہ نہ بھی رہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے۔اس معاملے میں سب میرے محتاج ہیں' میں تو کسی کا محتاج نہیں ہوں۔کہا کہ وہ جو فیصلہ تھا وہ تنہا اپنی عقل کی رُو سے کیا تھا اور عقل کا فیصلہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔برادرانِ عزیز!ارے میاں اپنی حفاظت کرو' اپنے آپ کو بچاؤ' اس وقت کا رکھا ہوا کل کام آئے گا' کل کو تم پہ کوئی وقت پڑ گیا تو کل کون تمہیں پوچھے گا۔کسی کو کیا حق حاصل ہے' جان تم مارتے ہو' جو دوسرے ہیں' جائیں وہ اپنے جہنم کے اندر۔مجھے کیا پڑی ہے۔عقل ہمیشہ یہ سکھائے گی۔کہا کہ جب تنہا اپنی عقل سے پوچھتے چلے جاؤ گے' تو وہ تمہارے اپنے ذاتی مفاد کا تحفظ سکھائے گی' اس لیے کہ فرد کی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کا تحفظ کرے' اس کو Preservation of Self (تحفظِ خویش) سکھائے۔اس سے زیادہ اس کا میدان نہیں ہے۔یہ عقل کی تنقیص نہیں ہے جیسے ہم یہاں سے چار فرلانگ کے فاصلے پہ باہر کی چیز نہیں دیکھتے تو یہ نہیں ہے کہ ہم آنکھ کو اور اپنی بینائی کو کوسنے لگ جاتے ہیں کہ صاحب!یہ تو واہیات چیز ہے' اس کا فائدہ کیا ہے' یہ کان ہمارا ہے یہ وہاں سے آگے کی آواز نہیں سن سکتا تو یہ کیا کام دیتا ہے۔یہ اس کی تنقیص نہیں ہے۔اس کا میدان ہی اتنا ہے۔عقلِ تنہا کا میدان اتنا ہے کہ وہ ایک فرد کو اس کے مفاد کی ترکیبیں سکھاتی ہے' اس سے آگے اس کا میدان نہیں ہے تو کہا کہ یہ شخص میلوں کی چیز کو اکیلی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے' غلطی کرتا ہے۔اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ وہ ایک دُوربین لے۔وہ اس کو بہت دور کی چیز دکھادے گی۔یہ کہا کہ جب اس نے تنہا اپنی ہی عقل سے' اپنے ہی جذبات سے' فیصلے لینے شروع کیے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ روش اختیار کر گیا۔

صحیح راہنمائی دینا خدا کے ذمہ ہے

سنیے!عزیزانِ من!اس نے یہ راستہ تنہا عقل کی رو سے اختیار کیا تھا لیکن عقل انسانی اسے پیش پا افتادہ انفرادی مفاد کا حصول اور تحفظ سکھاتی ہے۔اس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتی۔اس لیے قرآن کریم نے کہا کہ **اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى** (92:12) صحیح راہنمائی دینا ہمارے ذمہ ہے۔یہاں آ کر وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔عقل کتنا ہی بلند مقام پہ کیوں نہ چلی جائے' اس کا ایک محدود دائرہ ہوتا ہے۔وہ اس سے آگے کی سوچ ہی نہیں سکتی۔اس سے کہو کہ ہم سے پوچھے کہ میں کیا کروں۔وحی کی راہنمائی میں اور اس تنہا عقل کی راہنمائی میں فرق کیا ہے؟یہ بڑے غور طلب الفاظ ہیں۔دو دو الفاظ ہیں' برادرانِ عزیز!مگر کتنے بڑے حقائق اِن کے اندر آ گئے ہیں۔اس لیے کہا کہ یہ اپنے ہی متعلق سوچتا ہے۔یہ مفادِ عاجلہ کو سوچتا ہے' پیش پا افتادہ مفاد کو سوچتا ہے' انفرادی چیز اس کے سامنے ہے' اس سے آگے نگاہ نہیں جاتی۔ہم

جو کہتے ہیں کہ ہم سے پوچھے تو اسی لیے ہے کہ وَاِنَّ لَنَا لَـلۡاٰخِـرَۃَ وَالۡاُوۡلٰی (92:13) وحی کے سامنے انسان کے پیش پا افتادہ مفاد عاجلہ بھی ہوتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریاں بھی (93:4)۔ ہماری نگاہ اسے بھی دیکھتی ہے' دوسروں کو بھی دیکھتی ہے' یہ اپنے ہی آپ کو دیکھتا ہے:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحی حق بینندۂ سود ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

خدا کا قانون انسان کی مستقبل کی زندگی کے متعلق سوچتا ہے

یہاں کہا ہے کہ وَاِنَّ لَـنَا لَـلۡاٰخِـرَۃَ وَالۡاُوۡلٰی (92:13) اس کی نگاہ یہاں تک جاتی ہے ہم اونچے بیٹھے ہوئے ہیں' ہماری نگاہ دور تک جاتی ہے۔ ارے سیدھی سی بات ہے' دور کی چیز دیکھنا چاہتے ہو تو وہ جو اونچائی پہ بیٹھا ہے' اس سے پوچھو۔ یہ کتنی منطقی چیز ہے صاحب! یہ اپنی اس زندگی کے متعلق سوچتا ہے' ہم اس کی مستقبل کی زندگی کے متعلق بھی سوچتے ہیں۔ یہ موجودہ نسل کا ہی خیال رکھتا ہے' ہم آنے والی نسلوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ یہ اسی دنیا کی زندگی کی سوچ میں ہے' ہم اس کی آخرت کی زندگی کا بھی خیال رکھ رہے ہیں: وَاِنَّ لَـنَا لَـلۡاٰخِـرَۃَ وَالۡاُوۡلٰی (92:13) اس کی نگاہ اولیٰ پر رہتی ہے یعنی مفادِ خویش پر رہتی ہے' پیش پا افتادہ مفاد پر رہتی ہے۔ ہم سے پوچھے' وحی سے پوچھے' وحی کی نگاہ سے پوچھے' وہ یہاں کی دنیا بھی اس کی حسین بنانا چاہتا ہے' آنے والی زندگی بھی حسین بنانا چاہتا ہے۔ موجودہ نسل کو بھی دیتا ہے' آنے والی نسلوں کو بھی سرفرازیاں عطا کرتا ہے۔ یہ ہے وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَۃَ وَالۡاُوۡلٰی (92:13)۔ عزیزانِ من! انسانیت دو ہی چیزوں کے اندر بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ ایک صرف مفادِ خویش دیکھتا ہے' ایک مفادِ کل دیکھتا ہے۔ پہلے دن سے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیشہ سے انسانیت ان دو شقوں کے اندر رہی ہے۔ کبھی کبھی جو دنیا میں انقلابی آوازیں اٹھتی ہیں' انہوں نے آ کر ان چیخوں کو مٹانے کی کوشش کی' ورنہ تنہا انسان نے جب بھی اپنے آپ پہ' اپنے مفاد پہ' غور کیا اس کی یہی صورت رہی لیکن یہاں کہا کہ پھر جو ایسی روش نہیں چھوڑتا تو اے رسول! فَاَنۡـذَرۡتُـکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی o لَا یَـصۡلٰهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡـقَـی (92:14-15) ان سے کہو کہ اے انفرادی مفاد کے تحفظ کی روش اختیار کرنے والو! اے انسانیت کی بہبودِ کلی کے اوپر نگاہ نہ رکھنے والو! میں تمہیں ایک ایسے انجام سے ڈرانا چاہتا ہوں جو تمہارا سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے گا۔ یہ ایک انقلاب ہے کہ جس کی شعلہ فشانیاں تمہاری تمام متاعِ حیات کو خاکستر بنا کر رکھ دیں گے۔ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والا اور دوسری طرف زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جانے والا' یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ بات یہ ہے کہ تم اس آگ میں داخل ہو گئے ہو کیونکہ جو قوانینِ خداوندی

سے سرکشی برتتا ہے وہ اپنے آپ کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ بات ذرا فلسفیانہ سی رہی۔ مگر قرآن تو اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ کہا کہ **الَّذِیْ کَذَّبَ** ❶ (92:16) اور اس طرح **کَذَّبَ بِالْحُسْنٰی** ❷ (92:9) یہ جو اس نے مفادِ خویش ہی کی سوچی' وہ دراصل اپنے حسنِ عمل کے دعویٰ کی تکذیب کرتا رہا ہے اور **کَذَّبَ وَتَوَلّٰی** (92:16) یوں گریز کی راہیں نکالتا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ حسنِ عمل کے دعویٰ کی تکذیب کر رہا تھا یعنی اس سے انکار نہیں کر رہا تھا' اقرار تو کر رہا تھا' لیکن اپنے عمل سے اس کی تکذیب کر رہا تھا۔ وہ کر کیا رہا تھا؟ گریز کی راہیں نکال رہا تھا۔ اپنے ذہن میں اس نے کچھ نیک کاموں کی فہرست بنا رکھی تھی' وہ اس چیز سے بخل برتتا تھا اور اپنے ذہن میں خوش ہوتا تھا کہ میں بڑے نیک کام کر رہا ہوں۔ اسے کہتے ہیں تولّی یعنی بیچ میں سے گریز کی راہیں نکالنا۔ وہ تکذیب کرتا تھا اور گریز کی راہیں نکالتا تھا۔ یہ ہے جو اس آگ کے اندر بھسم ہونے والا ہے اور اس کے بعد کہا کہ **وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی** (92:17) اور جو اس سے بچایا جائے گا یعنی' جس نے ہمارے قوانین کی نگہداشت کی ہوگی وہ اس تباہی سے دُور رکھا جائے گا۔ متقی کی تو پھر یہی بات آ گئی۔ منتہا یہی ہے۔

مذہب کی دنیا میں متقی کا تصور

ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں یہ ہے کہ جہنم سے بچ جاؤ۔ اربابِ طریقت کے ہاں اور روحانیت کی دنیا والوں کے ہاں ایک لفظ تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے غاروں میں چلو اور چلّے کاٹو۔ مصلوں پہ بیٹھو' حجروں میں جاؤ اور ورد وظائف کرو۔ اس طرح تزکیہ نفس فرمایا جا رہا ہے۔ یہ تقویٰ بھی پرہیزگاری کے معنوں میں ہے اور یہ تزکیہ نفس بھی۔ آپ کے ہاں یہ دو ہی طریقے ہیں جہنم سے بچنے کے۔ یہ مذہب کی دنیا میں تصور ہے۔

متقی اور تزکیہ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کی جامعیت ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے ان الفاظ کو اپنے ہاں پہلے سے لے لیا ہوا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **الْاَتْقَی o الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی** ❸ (92:17-18)۔ مالہ کے عام معنی تو یہ ہیں کہ جو اپنا مال دیتا ہے' لیکن اصل میں متقی تو وہ ہوا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے' وہ اسے دوسروں کے لیے کھلا رکھتا ہے' اسے دوسروں کو دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس طرح کاہے کے لیے دیتا ہے؟ اس کے لیے کہا **یَتَزَکّٰی** (92:18) تا کہ اس کا تزکیہ نفس ہو جائے۔ یہی تقویٰ ہے۔ یہی تزکیہ نفس ہے: **یَتَزَکّٰی** اور اس

---

❶ جو تکذیب کرتا ہے۔

❷ معاشرے کے توازن کی عملاً تکذیب کر کے اسے بگاڑتا ہے۔

❸ اسے تباہی سے دُور رکھا جاتا ہے جو عند الضرورت اپنا سب کچھ (ما۔ لہ) نوعِ انسان کی نشو و نما کے لیے دے دیتا ہے۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

دینے کے اندر اگلی بات یہ کہی۔ یہ کتنی بڑی عظیم بات کہی ہے کہ **وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰٓى** [1] (92:19) اس کے سر پر کسی کا احسان نہیں تھا' جسے اتارنے کے لیے اس نے یہ کچھ دینا تھا۔ یہ ہے وہ قلب کا انقلاب! آپ کے ہاں دینے والے بڑے ہوتے ہیں' بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں' ہزاروں روپے دیئے ہوئے ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کی نقاب کشائی Cabinet (کابینہ) کے کسی بہت بڑے افسر نے کی ہو۔ اس کے برعکس' اس قرآنی تصور کے لحاظ سے متقی کا کسی کے اوپر کوئی احسان نہیں۔ اس نے کسی کا کچھ قرض نہیں دینا تھا۔ دینے کے لیے اس قسم کا کوئی جذبہ اس کے دل و دماغ میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ دیئے چلا گیا۔ تو یہ ہے کہ جس سے اس کا تزکیہ نفس ہوا۔ یہ ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔ اسے متقی کہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم ان اصطلاحات کو کیسے Define (متعین) کرتا چلا جاتا ہے۔

ان اصطلاحات کا مفہوم ہی بدل دیا گیا

یہی آپ کے ہاں Terms (اصطلاحات) ہیں جن کے غلط مفہوم نے آپ کے ہاں تصورات بدل دیئے ہیں تو آپ قرآن سے ان Term (اصطلاحات) اور ان کے Concepts (تصورات) متعین کیجیے کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں' تزکیہ کیسے ہوتا ہے؟ **وَسَيُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَى ۝ الَّذِىۡ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰٓى** [2] (92:17-19)۔ یہ سب اس لیے نہیں ہے کہ اس نے کسی کا کچھ دینا تھا بلکہ **اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰى** (92:20) وہ دنیا میں ربوبیتِ عامہ کے لیے یہ سارا کچھ کرتا چلا جا رہا ہے۔ خدا کی صفتِ ربوبیت کو محسوس پیکروں کے اندر دنیا میں نافذ کرنے کے لیے وہ یہ کچھ کر رہا تھا۔ اس نے کسی کا دینا نہیں تھا جس کے لیے یہ کر رہا تھا۔ یہ ہے وہ کہ **وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰى** (92:21) جس کے بعد بہت جلد وہ دیکھ لے گا کہ کس طرح اس کے نتائج اس کی آرزوؤں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں' اس کی محنت اور کوشش صحیح نتائج سے ہم آغوش ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی اس کا بہترین صلہ ہے جس سے اسے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

عزیز برادران! یہاں سورہ الّیل ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الضحیٰ شروع کرتے ہیں۔

---

[1] وہ جو کچھ دوسروں کے لیے دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس پر کسی کا احسان تھا اور وہ اب اس احسان کا بدلہ اتار رہا ہے۔ بالکل نہیں۔ (76:9)

[2] اور جو ہمارے قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ اس تباہی سے دُور رکھا جاتا ہے۔ یہ وہ ہے جو عندالضرورت اپنا سب کچھ (مال) نوعِ انسان کی نشو ونما کے لیے دے دیتا ہے' اور اس طرح خود اس کی اپنی ذات کی بھی نشو ونما ہو جاتی ہے۔ (9:11)۔ وہ جو کچھ دوسروں کے لیے دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس پر کسی کا احسان تھا اور اب وہ اس احسان کا بدلہ اتار رہا ہے۔ بالکل نہیں۔ (76:9) (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

سورۃ الضحی (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ الضحیٰ شروع ہوتی ہے۔ یہ 30 ویں پارے کی 93 ویں سورۃ ہے۔

داعیٔ انقلاب کی زندگی

ایک داعی انقلاب کی زندگی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ اس کے لیے میں کسان کی مثال دیا کرتا ہوں' کہ وہ صبح کے وقت کسّی اور درانتی لیے ہوئے جاتا ہے۔ سارا دن کھیت میں محنت کرتا ہے' شام کے وقت خالی ہاتھوں' وہی کسّی اور درانتی لیے' واپس آ جاتا ہے۔ یہ ایک دن کی بات نہیں' دو دن کی بات نہیں' وہ ہر روز یہی کرتا ہے' صبح و شام یہی کرتا ہے۔ اس نے تو اس سے پیشتر دیکھا ہوتا ہے کہ چند دنوں کے بعد کس طرح میرا گھر دانوں سے بھر جائے گا' فصل سے بھر جائے گا یعنی وہ یقین کے ماتحت یہ کچھ کرتا ہے۔ سوچیے کہ پہلا کسان جس نے اس سے پیشتر کبھی یہ کچھ دیکھا ہی نہ ہو اور اسے یہ چیز روزانہ کرنی پڑے' تو وہ تھک جاتا ہے' تنگ آ جاتا ہے' کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے ''دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت''[1] کہ میں ایک یقین کے ماتحت یہ کچھ کرتا جا رہا ہوں' شاید سحر نہ ہو۔ کسی نے کہا تھا کہ ایسا کرو تو یہ ہو جائے گا۔ کبھی کبھی یہ خیال آ جاتا ہے کہ کہیں اس کہنے والے نے یہ کچھ دینا چھوڑ ہی نہ دیا ہو' میں یہ کچھ یونہی کرتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ جگر سوزیاں' یہ فلک بوسیاں' یونہی رائیگاں چلی جائیں گی۔

نبی اکرم ﷺ جس انقلابِ عظیم کی دعوت کو لے کر اٹھے' عزیزانِ من! جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ نبوت کی کل 23 سالہ زندگی میں آپ نے 13 سال مکی زندگی میں مصائب پہ مصائب' مشکلات' اذیتیں' تکالیف' جگر سوزیاں اور مشقتیں برداشت کرتے ہوئے گزار دیئے

---

[1] دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت' درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟ (غالب)

لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا جب کہ پروگرام دینے والے خدا نے یہ کچھ کہا تھا کہ اس کے بعد یہ زمین بدل جائے گی' یہ آسمان بدل جائے گا لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ زمین بھی اس پہ تنگ ہو رہی ہے اور آسمان بھی اس کے سر پہ ٹوٹ رہا ہے' کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا اور پھر مدینہ کی ابتدائی زندگی میں چھ سات سال کے مختصر عرصہ میں تقریباً 82 لڑائیاں لڑی گئیں۔ اس اتنی زندگی میں اتنے بڑے جو دعاوی ان کو دیئے گئے تھے امیدیں باندھی گئی تھیں' وہ تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پیہم مشقتیں تھیں' پیہم مصیبتیں تھیں۔ کبھی کبھار خیال آ جاتا ہے کہ امیدیں دلانے والا کیا کہتا ہے: کیا تم رات کی تاریکی سے اکتا گئے ہو کہ شاید سحر نہ ہو؟ اس انقلاب کی آخری کامیابی میں جو تاخیر ہو رہی ہے تو اس سے اے رسولؐ! تیرے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں کہ مجھ سے شاید کوئی ایسی بات سرزد ہو گئی ہے جس کی وجہ سے میرے نشوونما دینے والے نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ یہ بات بالکل نہیں ہے بلکہ یہ کہا کہ **وَالضُّحٰی o وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی** [1] (93:1-2) رات کی تاریکی سے نہ گھبرانے والو! صبح کی روشنی پہ نگاہ رکھو۔ ہماری فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ تاریکی اپنے وقت سے آگے بڑھ جائے' یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کے بعد نمودِ سحر نہ ہو' تم گھبراؤ نہیں۔ یہ حقائق اس پر شاہد ہیں کہ **مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی** [2] (93:3) تیرے رب نے تجھے چھوڑا نہیں ہے۔ وہ تجھے جگرسوز مشقتوں میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ بات یہ ہے کہ **وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی** [3] (93:4)۔

ابتدائی ہمت طلب مراحل اور خدا کی طرف سے ثابت قدمی کی تاکید

انقلابی دعوت کی ابتدا میں یہی ہوا کرتا ہے کیونکہ یہ مراحل مشکل اور ہمت طلب ہوتے ہیں لیکن مستقبل درخشندہ ہوا کرتا ہے اس لیے اس منزلِ اول کی دشوار گزاریوں سے گھبراؤ نہیں۔ تم دیکھو تو سہی کہ آخری منزل تمہارے لیے کس قدر درخشندہ اور تابندہ ہو گی۔ **وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی** (93:5) دیر کی بات نہیں ہو گی' عنقریب تیرے نشوونما دینے والے کا قانونِ ربوبیت تجھے اتنا کچھ دے دے گا جس سے تیری تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔ اس عنقریب سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ کچھ قریب کی زندگی میں ہو جائے گا۔

---

1. کیا تو نہیں دیکھتا کہ دن کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے رات کی تاریکی کس طرح ہر شے کو اپنے دامن میں لپیٹ کر فضا کو ساکت و صامت کر دیتی ہے اور سکوت و ظلمت کا یہ عرصہ کتنا طویل ہوتا ہے؟ یہ حقائق شہادت دیتے ہیں کہ............
2. تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ تجھ سے ناراض ہے۔
3. تیرے پروگرام کے ابتدائی مراحل دشوار گزار اور ہمت طلب ہوں گے لیکن آخرالامر یہ تیرے لیے ہر قسم کے خیر و برکت کا موجب ثابت ہو گا۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

حضور کے دل کی آواز

سورہ احزاب میں ہے کہ ایک مقام پہ حضور کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ اتنا لمبا پروگرام ہوا چلا جا رہا ہے۔ یا اللہ: کیا میں اپنی آنکھوں سے بھی اس کے نتائج دیکھ سکوں گا۔ بڑی ہی معصوم تمنا تھی۔ ہونی بھی چاہیے۔ ہر دل میں یہ پیدا ہوتی ہے لیکن وہ تو خدا قانون والا ہے؛ وہ تو کسی کے جذبات کی رعایت ہی نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ تم نے یہ کیا کہا۔ تمہارے ذمہ اس بات کو پہنچائے چلے جانا ہے۔ اس کے نتائج نکلیں گے؛ اس کا حساب ہم کرنے والے ہیں؛ تم چلے جاؤ اپنے کام کے اندر۔ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہمارے پروگرام نہیں سمٹتے۔ قانون اپنا وقت لیتا ہے خواہ ہزار آرزوئیں ہی کیوں نہ ہوں۔ خود مریض کی بھی اور اس کے ساتھ منسلک ڈاکٹر کی بھی یہی تمنا ہوتی ہے کہ کسی طرح تپ دق (TB) کا یہ مریض کل اچھا ہو جائے مگر وہ مرض تو چھ مہینے لے کر رہے گا۔ یہاں کہا کہ **وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى** (93:5) عنقریب دیکھے گا کہ اتنا کچھ ملے گا۔ یہاں پھر وہی ترضیٰ آیا ہے کہ تیری آرزوئیں خوشگوار نتائج سے ہمکنار ہو جائیں گی؛ جو تو چاہتا ہے؛ دیکھنا! وہ سامنے آ جائے گا۔

حضرت ابراہیم ﷺ کی تمنائے بے تاب

آپ دیکھیے گا کہ پہلے بھی میں نے غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ جب انہیں کہا گیا کہ جاؤ؛ اس مُردہ قوم کو جا کر زندہ کرو تو انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ایک ناممکن سی بات ہے جس کا مجھے حکم دیا جا رہا ہے۔ آپ نے وہی بات کہی تھی کہ اے اللہ! ذرا دکھا تو سہی کہ کس طرح ان مردوں کو زندہ کیا جائے گا۔ جواب ملا تھا کہ کیا تمہارا اس کے اوپر ایمان نہیں ہے؟ آپؑ نے کہا تھا کہ ایمان کی بات اور ہے۔ میں دلیل مانگتا ہوں تاکہ مجھے اطمینان حاصل ہو جائے۔ کیا بات ہے مقام ابراہیمی علیہ السلام کی! خدا سے بھی اطمینان کے لیے دلیل مانگتے ہیں اور اطمینان کی تو Definition (تعریف) یہ ہے کہ آپ کو کسی چیز کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت یقین حاصل ہو جائے۔ یہاں بھی جب یہ بات کہی کہ عنقریب یہ بات ہو گی تو ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ بات کیسے ہو گی؟ عزیزانِ من! خدا یہاں کوئی خارجی شہادت نہیں لایا بلکہ رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سوچو تو سہی؛ اپنی زندگی پہ غور تو کرو؛ ارے بھول گئے کہ **اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى** (93:6) تم تنہا تھے جس وقت یہ آواز بلند کی تھی۔ اس لفظ یتیم کے معنی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جس کے ماں باپ بچپن میں ہی مر جائیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں قرآن یہ لفظ ان معنوں میں نہیں لایا بلکہ اپنے بنیادی لغوی معنوں کے اعتبار سے لایا ہے۔ یتیم کے معنی ہیں ''وہ جو تنہا ہو۔'' یہاں کہا کہ کیا یہ بات نہیں تھی کہ جب تم نے یہ آواز بلند کی تھی؛ تم بالکل تنہا تھے۔ حضور ﷺ نے **انا اوّل المسلمين** [1]

---

[1] انا اول المسلمين (6:164) سب سے پہلے میں نے خود اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

خود کہا تھا۔ ''میں پہلا مسلمان ہوں۔'' کوئی دوسری آواز نہیں تھی' آپؐ اس قدر تنہا اور بے یارومددگار تھے۔ یہاں (93:6) میں کہا گیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس کے بعد فَـاٰوٰی (93:6) خدا نے تیرے لیے حفاظت اور پناہ کا سامان پیدا کر دیا' تمہیں پناہ دی گئی؟ اے رسول! تم اس پر غور کرو۔ پھر اس کے بعد کہا کہ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی [1] (93:9) کیا یہ نہیں کہا تھا؟ تم اس سے بھی پیچھے کی طرف جاؤ اور دیکھو کہ کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہوا تھا کہ تم تلاش حقیقت میں سرگرداں پھر رہے تھے؟

نبوت سے پہلے کی زندگی

برادرانِ عزیز! نبی ﷺ کی زندگی نبوت سے پہلے اور پھر صحیح راہنمائی ملنے کے بعد کی زندگی کے لیے یہ آیت بڑے ہی جلیل القدر معنوں کی حامل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ملتی کیسے ہے۔ نبی بھی اپنے ہی ماحول میں پیدا ہوتا ہے' اسی ماحول میں تربیت پاتا ہے' وہیں سے اسے تعلیم ملتی ہے لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ معاشرے میں جو کچھ غلط ہو رہا ہوتا ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ صحیح کیا ہے؟ اس کا اسے علم نہیں ہوتا۔ یہ بات تو وحی نے بتانی ہے کہ صحیح کیا ہے مگر وحی ابھی آ نہیں رہی۔ جو ہو رہا ہے اسے وہ غلط سمجھتا ہے۔ ہونا کیا چاہیے؟ اس کا اسے علم نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ کیا کیفیت ہوگی مگر ہمارے ہاں کے غلط تراجم نے اصل حقیقت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم

یہ جو وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی ہے۔ اس کے ایک غلط ترجمے نے بات کہیں سے کہیں پہنچا دی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے تمہیں گمراہ پایا' پھر ہدایت کی۔ نبی کی پہلی زندگی کے اندر گمراہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گمراہ تو وہ ہوتا ہے جس کے سامنے راستہ ہو اور وہ اس راستے سے رہ جائے۔ یہ راستہ تو ابھی اس کے سامنے ہی نہیں آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ باقیوں سے الگ ہو کر' منفرد ہو کر' کیسے رہ گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس لیے رہ گیا کہ باقی سارے اپنی اپنی اس روش کے حاضر و موجودات سے مطمئن ہو کر بیٹھے ہوئے تھے مگر یہ اس سے مطمئن نہیں تھا۔

صحیح راہنمائی کے لیے پہلی شرط تجسس ہے

عزیزانِ من! قرآن نے اس کے فوراً ہی بعد کہا ہے کہ فَهَـدٰی (93:7) تو بات ہی وہی ہے کہ صحیح راہنمائی اسے ملتی ہے جو اس پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائے جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح صحیح راہنمائی ملنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے تجسس ہے' خلش ہے' تڑپ

---

[1] پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تو تلاشِ حقیقت میں حیران و سرگرداں پھر رہا تھا' تو اس نے بذریعہ وحی زندگی کے صحیح راستے کی طرف تیری راہ نمائی کر دی؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے' سوز ہے' گداز ہے' حاضر وموجودات سے بیزاری ہے۔ اسی کو لا الہ کہتے ہیں۔ اسے ابھی معلوم نہیں ہے کہ خدا کیا ہے؟ تو کیفیت یہ ہے کہ جب انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کہا کہ دیکھو یہ ستارہ معبود ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَ (6:77) جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ نہیں جواب ہوا اور کل کو غروب ہو جائے' وہ میرا خدا نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کیا ہے؟ یہ ابھی نہیں بتا سکتا۔ وہ لوگ اس سے مطمئن تھے کہ ستارہ بھی الہ ہو سکتا ہے' چاند بھی الہ ہو سکتا ہے' سورج بھی الہ ہو سکتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اس سے مطمئن نہیں تھا۔ یہ کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (6:77) جو آج ہوا اور پھر غروب ہو جائے' میرا خدا ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کیسا ہو سکتا ہے؟ یہ تو پھر وحی نے ہی آ کر بتایا کہ خدا کیسا ہوتا ہے۔ ان ڈوبنے والے معبودوں سے جب تک انسان بیزار نہیں ہوتا' معبودِ حقیقی سامنے آ نہیں سکتا۔

کامیابی شدتِ آرزو کی رہینِ منت ہوتی ہے

برادرانِ عزیز! یہ بات فلسفیانہ انداز میں چلی جائے گی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ انسان کی اپنی شدتِ آرزو ہی ہے جو عروسِ حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ جب تک آپ کے ہاں پیاس کی شدت پیدا نہیں ہوتی آپ پانی کے لیے نہیں نکلتے۔ تلاشِ حقیقت کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے مطمئن نہ ہو جائے۔ یہ بڑا غلط تصور ہے جو کہا گیا ہے کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ یاد رکھیے کوئی بچہ نہ ہندو پیدا ہوتا ہے' نہ مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ پیدائشی مسلمان کوئی نہیں ہوتا۔ برادرانِ عزیز! ہر شخص کو خود ایمان لانا پڑتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسے As It Is (جیسا ہے) تسلیم نہ کر لے۔ یہ نہ مانے کہ جو ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔ جو ہو رہا ہے اس پہ تنقیدی نگاہ ڈالے' اس پہ فکر کی نگاہ ڈالے' غور و تدبر سے اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد یہ دیکھے کہ جو ہو رہا ہے اگر ٹھیک ہو رہا ہے تو ٹھیک ہے اگر غلط ہو رہا ہے تو اس کی جگہ تلاش کرے کہ کیا چیز صحیح ہے جو اس کی جگہ ہونی چاہیے اور یوں جب وہ وحی کی روشنی میں اپنے لیے صحیح راستہ متعین کر لے اسے مومن کہا جائے گا' اسے مسلم کہا جائے گا۔

نبی بھی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (93:7) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھر رہا تھا' ہم صحیح راستے کو ابھار کر تمہارے سامنے لے آئے۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى [1] (93:8)۔ یہاں پھر وہی بات آئی کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تو ضرورت مند تھا۔ عائل کے معنی ہوتا ہے ''جو بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہو''۔ یہ اہل وعیال اس لیے کہتے تھے کہ آدمی بوجھ کے نیچے

---

[1] اور خدا نے تجھے ضرورت مند پایا تو اتنا کچھ دیا کہ جس سے تو کسی کی مدد کا محتاج نہ رہا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دب جاتا تھا۔ کہا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تو بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ فَاَغْنٰی (93:8) تو تجھے ہم نے ضروریات سے مستغنی کر دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ خدا کیا کیا نعمتیں گنا رہا ہے۔ ضروریات سے مستغنی کر دینا فاغنیٰ ہے۔ یہ جو آج کہا جا رہا ہے کہ صاحب! اسلام غریبی ہی میں پیدا ہوا' غریبوں کے ہی ہاں رہے گا' غریبوں میں ہی مر جائے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نعمت گنا رہا ہے کہ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (93:8) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے تجھے ضرورت مند پایا تو اتنا کچھ دیا جس سے تو کسی کا محتاج نہ رہا۔ حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے گوشے دیکھیے قرآن کس طرح خود بے نقاب کر کے سامنے لیے چلا جا رہا ہے۔ یوں زندگی مرتب ہوتی ہے حضور ﷺ کی۔ یوں حضور ﷺ کی سیرت قرآن سے مرتب ہوتی ہے۔

حضور کی سیرت قرآن سے مرتب ہوگی

جی! واقعہ تو یہ ہے۔ پھر اس کے بعد تو جو کہتا ہے کہ موجودہ مصائب کا زمانہ ختم ہونے کے بعد خوشگواریاں کیسے آئیں گی۔ اس کے لیے کہا کہ اسی طرح ختم ہوگا جس طرح ہم تمہاری حالت کو بدلتے چلے گئے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کی' عزیزانِ من! سنیے' کہا تھا کہ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰی (93:6) [1] کیا یہ واقعہ نہیں تھا؟ جواب دیا کہ ہاں' تھا۔ کہا کہ تم نے دیکھا کہ تمہاری زندگی میں ہر مشکل مرحلہ کے بعد کس طرح کشادگی کا پہلو سامنے آ جاتا رہا۔ یہی کچھ تمہاری اپنی دعوتِ انقلاب کے ساتھ بھی ہوگا۔ اب تم چاہتے ہو کہ یہ دَور ختم ہو۔ لہٰذا تم ثبات و استقلال کے ساتھ اس پروگرام پر چلتے رہو تا کہ اس معاشرہ میں وہ (مرحلہ) آئے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (93:9) جو فرد بے یار و مددگار' تنہا رہ جائے' اسے کوئی دبا اور دھتکار نہ سکے۔ تو بھی یہ کر' ہم نے تمہارے ساتھ یہی کیا تھا تو بھی یہ کر۔ جو بھی معاشرہ کے اندر تمہیں بے یار و مددگار نظر آتا ہے' اسے کوئی دبا اور دھتکار نہ سکے۔ یہاں یہی نہیں کہا کہ اس کی مدد کر۔ یہ کہا ہے کہ اسے ذلت کی نگاہوں سے نہ دیکھ۔ قرآن نے سورۃ الفجر کی آیت 17 میں کہا تھا کہ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89:17) تم جو تباہ ہوئے ہو وہ اس لیے ہوئے کہ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی عزت و توقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جائیں۔ وہی قابل عزت سمجھا جاتا تھا جس کی پارٹی زیادہ مضبوط ہو' جس کا جتھہ طاقتور ہو۔

یتیم خانے کھولنے کی بجائے نظام بدلنا ہوگا

یتیموں کی پرورش کے لیے یتیم خانہ کھول دینا ہمارے ہاں آج کل معراج سمجھا جاتا ہے۔ دیکھیے کہ قرآن کہاں جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جو روٹی کے ٹکڑے ہیں وہ تو تم کتے کو بھی دے دیتے ہو۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تم روٹی کا ٹکڑا ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہو۔ تباہی کی

---

[1] کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تو بے یار و مددگار اور تنہا رہ گیا تھا تو خدا نے تیرے لیے حفاظت اور پناہ کا سامان پیدا کر دیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

وجہ یہ ہے کہ تم ان کی عزت نہیں کرتے۔

قہر اور تَنۡھَرۡ کے معنی

برادرانِ عزیز! یہاں بھی کہا کہ فَـاَمَّـا الۡيَتِيۡـمَ فَلَا تَقۡهَـرۡ ❶ (93:9) قہر کا معنی ہوتا ہے ''ذلیل کر دینے والا'' کہا کہ تو بھی یتیموں کو ذلیل نہ کر۔ ہم نے تمہیں کہا ہے کہ تم جس وقت ضرورت مند تھے تو ہم نے تمہاری ضروریات پوری کیں۔ لہٰذا وَاَمَّـا السَّآئِلَ فَلَا تَـنۡهَرۡ (93:10) اور جو صاحبِ ضرورت تمہاری طرف آئے یا جو معاشرے کے اندر ہو تو اسے قابلِ نفرت مقام تک نہ پہنچا دو۔ اس کے لیے یہاں لفظ ہے تنھر. تنھر عجیب لفظ ہے۔ یہ جو گھر کا بچا کھچا ہے' آپ اسے سارا اکٹھا کر کے جو جگہ کوڑا کرکٹ کی ہوتی ہے وہاں ڈال دیتے ہیں' کوڑے کے ڈھیر پہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ جو اس طرح کی چیزوں کو' ردی چیزوں کو' ڈالنے کی جگہ ہوتی ہے' اسے عربی زبان میں ''اَلۡـمَنۡهَرَةُ'' کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو صاحبِ ضرورت آئے تو اسے منھر کی طرف نشان نہ دیا کر' کہ جا جو ردی کی چیزیں میں نے پھینکی ہوئی ہیں وہاں سے لے لے۔ ہمارے ہاں خیرات کرنے والا یہی سمجھ کر دیتا ہے۔ زبانوں کے الفاظ اور محاورے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ انہی میں ایک یہ ہے کہ جو پیسہ دیا جاتا ہے وہ ''پیسہ کی ہے؟ ہتھ دی میل ہوندا ہیگا جے۔ ہتھ دی میل! ❷ اب دیکھیے کہ خیرات میں بھی دیتا ہے کم بخت' تو میل دیتا ہے۔

کشاد کی راہ حاصل کرنے کا طریق

قرآن کہتا ہے: لَـنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (3:92) کشاد کی راہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتی تاوقتیکہ تم وہ کچھ نہ دو جو تم سب سے زیادہ' اپنے سے بھی زیادہ' عزیز رکھتے ہو۔ بچے کھچے ہوئے ٹکڑے نہیں' کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے اوپر پھینکی ہوئی چیزیں نہیں' بلکہ وہ کچھ دو جسے تم اپنے لیے سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہو۔ اس محبوب چیز کو دو گے تو اسے کہا جائے گا کشاد کی راہ۔ اس سے وسعت پیدا ہوگی۔ نیکی کا تو اس نے لفظ ہی استعمال نہیں کیا۔ ''بِرّ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ہے وسعتِ قلب' کشادہ نگاہ' راستوں کا وسیع ہوتے چلے جانا' زندگی کا فراغ ہوتے چلے جانا۔ یوں ہوتا چلا جائے گا تو جو چیز تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے' اسے ضرورت مندوں کو دے دو۔ یہ ہے وَاَمَّـا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ (93:10) اور مختصراً یہ کہ وَاَمَّـا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ❸ (93:11) یہ جو سامانِ

---

❶ جو فرد بے یار و مددگار' تنہا رہ جائے اسے کوئی دبا اور دھتکار نہ سکے۔

❷ پیسہ کیا ہوتا ہے؟ ہاتھ کی میل ہوتا ہے۔ ہاتھ کی میل!

❸ اس مقصد کے لیے کہ معاشرہ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جائے' تم اس بات کا عام چرچا کرتے چلے جاؤ کہ خدا نے زندگی کی جو آسائشیں اور نعمتیں پیدا کی ہیں' وہ اس لیے نہیں کہ ان پر ایک گروہ قابض ہو کر بیٹھ جائے اور عام انسانیت ان سے محروم رہ جائے۔ ان کے دروازے ضرورت مند کے لیے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ (41:10) (3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

زندگی، سامانِ حیات، متاعِ حیات، یہ جتنا کچھ ہے، اسے دیتا چلا جا، اس کا عام چرچا کرتا چلا جا۔ یہ نہ ہو کہ پتہ ہی نہ چلے کہ تیرا بینک بیلنس کتنا ہے اور تو کسی کو بتائے ہی نہیں۔ یہاں **فحدث** آیا ہے کہ اسے عام کرتا چلا جا کہ یہ بھی تمہارے لیے ہے، یہ بھی تمہارے لیے ہے اور یہ بھی تمہارے لیے ہے۔ بس تو یہ کرتا چلا جا۔ اس کے بعد گھبرانے کی بات نہیں ہے کیونکہ **وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى** (93:5) تُو دیکھے گا کہ کس طرح وہ کچھ ملتا ہے جس سے تمہاری آرزوئیں ہمکنار ہو جائیں گی۔

برادرانِ عزیز! سورۃ الضحیٰ یہاں ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الم نشرح شروع کرتے ہیں۔

سورۃ الم نشرح (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرانِ عزیز! اب سورۃ الم نشرح شروع ہوتی ہے۔ یہ 30ویں پارے کی 94ویں سورۃ ہے۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم

ٹکراؤ اور تصادم میں Crisis (فیصلہ کن مرحلہ) چلا آ رہا ہے۔ یہ قرآن کریم کا آخری پارہ ہے۔ اس میں پھر وہی بات آئی ہے' کہ حضور ﷺ کے دل میں ذرا سا تردد پیدا ہوا کہ پتہ نہیں اس پروگرام کی تکمیل و قیام میں کتنا وقت لگ جائے' معلوم نہیں کہ اس کے نتائج کب نکلیں اور یہ بھی کہ میں نہ دیکھو سکوں۔ اس مقام پر کہا جا رہا ہے: اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ❶ (94:1)۔ اس کا عام ترجمہ ہوگا۔ کیا ''ہم نے تیرے سینے کو پھاڑا نہیں'' یہ بھی کہا اور پھر آپ کو معلوم ہے کہ وہ روایات آئیں کہ وہ جبریل امین نے آ کر رسول اللہ ﷺ کے سینے کو چاک کیا' پھر اس کے اندر سے دل کو نکالا' پھر اس کو چاک کیا' پھر اس کو جنت کے پانی سے یا زم زم کے پانی سے دھویا' پھر دھونے کے بعد اندر رکھا' پھر سی دیا' پھر یہ ہے کہ پڑھو وہ سبق جسے کہا جاتا ہے ''کیا ہم نے شرح صدر نہیں کیا؟'' لیکن قرآن سے پوچھیے کہ اس آیت کے معنی کیا ہیں۔ میں پھر وہی عرض کروں گا' برادرانِ عزیز! کہ قرآن سے پوچھنے سے پہلے خود عربوں کے ہاں سے پوچھیے کہ وہ شرح صدر کسے کہتے ہیں' اس کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ قرآن دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ❷ (15:97) ہم جانتے ہیں کہ تیرے خلاف جو باتیں کرتے ہیں' اس سے تمہارے قلب حساس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس یَضِیْقُ صَدْرُکَ کا جوالٹ ہے' اس کا نام شرحِ صدر کھل جانا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہوگا

---

❶ ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہوگئیں۔ تمہارے سینے میں اس قدر کشاد پیدا ہوگئی کہ جو مہم پہلے ناقابل تسخیر نظر آتی تھی اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا۔ تمہاری ہمت اور حوصلے وسیع ہوگئے۔ (20:25)

❷ ہمیں اس کا علم ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کا تمہارے قلبِ حساس پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس سے تم کبیدہ خاطر ہو جاتے ہو۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

کس طرح؟ قرآن کریم نے کہا کہ وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ (15:97) ہم جانتے ہیں۔ قرآن نے کیا عجیب چیز کہی ہے کہ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ (15:97) لوگ جو کچھ تجھے کہتے ہیں اس کا اثر تمہارے قلبِ حساس پر ہوتا ہے، اس سے تمہارا سر جھک جاتا ہے۔ ان کے کہنے سے تیری یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سنیے! عزیزانِ من! کہ ضیق کا یہ لفظ شرحِ صدر میں کیسے تبدیل ہوگا؟ کہا کہ تم اے رسول! ان کی باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ یہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہیں ان باتوں میں الجھا کر، تمہاری قوتوں کو منفیانہ طور پر ضائع کریں۔ اس لیے فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ (15:98) تم خدا کے اس نظام کو، جو سرتاپا حمد و ستائش کا پیکر ہے، قائم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل رہو۔ وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ (15:98) اور اس کے قانون کے سامنے جھکتے چلے جاؤ، تم قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرتے چلے جاؤ۔ تمہاری شرحِ صدر ہو جائے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو پہلی دفعہ حکم دیا گیا کہ فرعون کی طرف جاؤ، بڑا سرکش ہو گیا ہے (20:24)۔ اس کے ساتھ جا کر ٹکراؤ۔ بکریاں چرانے والا (حضرت موسیٰ علیہ السلام) وہاں سے اکیلا بھاگا ہوا ہے۔ وہ اس کی محکوم قوم کا ایک فرد ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ تم جاؤ اور فرعون جیسے مستبد سے ٹکراؤ۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ ذمہ داری کے بوجھ سے ذرا سی گھبراہٹ پیدا ہوئی، بے ساختہ زبان پہ آیا: قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ [1] (20:25) میں تجھ سے صرف یہ مانگتا ہوں کہ میرے سینے میں کشاد پیدا کر دے۔ آپ نے دیکھا کہ شرحِ صدر کے معنی کیا ہیں؟ اتنا ظرف وسیع کر دے کہ کتنی بڑی مشکلات بھی کیوں نہ سامنے آئیں مجھ میں گھبراہٹ نہ پیدا ہو اور جب میں غالب آ جاؤں، ان پہ قابو پا لوں تو پھر میرے اندر انتقام کا جذبہ نہ پیدا ہو، وہاں بھی مجھے وسعتِ قلب دے۔ یہ ہے شرحِ صدر۔ اور یہی ہے جو یہاں کہا گیا ہے کہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ [2] (94:1)

---

[1] اس نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! (یہ مہم بڑی سخت ہے۔ اس کے لیے تو) میرے سینے میں وسعت اور کشاد عطا کر دے (کہ بڑی سے بڑی مشکل بھی مجھے پریشان نہ کر سکے)۔ (94:1)

[2] (اے رسول! اس نظام کے قیام میں جن مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے اور اس کی آخری کامیابی میں جو تاخیر واقع ہو رہی ہے، اس سے اثر پذیر اور ملولِ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم ذرا سوچو کہ نبوت ملنے سے پہلے اور اس کے بعد کے ابتدائی مراحل میں تمہاری پریشانیوں اور تفکرات کا کیا عالم تھا۔ پہلے تم تلاشِ حقیقت میں سرگردان و پریشان پھرتے تھے۔ تمہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی اور کشاد کی کوئی راہ تمہارے سامنے نہیں کھلتی تھی) اس مقام پر ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہو گئیں۔ تمہارے سینے میں اس قدر کشاد پیدا ہو گئی کہ جو مہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی، اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا۔ تمہاری ہمت اور حوصلے وسیع ہو گئے۔ (20:25) (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

آپ ﷺ کی مکی زندگی مصائب والام کی زندگی تھی

زندگی کس قدر کٹھن تھی، کس قدر دم گھٹتا تھا اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں، سختیٔ منزل اور تنہائیِ سفر کے شدید احساس کو دیکھتے ہوئے قرآنِ کریم نے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ o الَّذِيٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (94:2-3) مصائب اوران ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ مصائب اور ان ذمہ داریوں کے تو دیکھتا نہیں کہ ہم نے اس بوجھ کو کس طرح سے اٹھا دیا۔ کس طرح ہم نے تمہارے سینے کو کشادہ عطا کر دی۔ شروع شروع میں کیفیت یہ تھی کہ کوئی شخص سنجیدگی سے تمہاری بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا اور ہر طرح سے طعن وتشنیع کی دل خراش آوازیں سوہانِ روح ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (94:4) تیرا نام بڑی عزت وتکریم سے لیا جانے لگا۔ تیرا چرچا دُور دُور تک پھیل گیا۔ تو شرف ومجد انسانیہ کی معراج کبریٰ تک پہنچ گیا۔ قرآن کا پیغام بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ تو تنہا رہ گیا تھا اور چاروں طرف سے طعن وتشنیع اور گالی گلوچ ہوتی تھی۔ آج یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس لیے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا o اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5-6) زندگی کی آسانیاں چاہتا ہے تو مصیبتیں بھگتنا سیکھ۔ ندی کی روانیاں، پتھر کا جگر شق کیے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔ کوئی آسانی مشکلات سے گزرے بغیر نہیں آسکتی۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5) مکہ کی پوری زندگی عسر کے اندر گزری، مشکلات اور پیہم مشقتوں کے اندر گزری، اور اس کے بعد پھر زندگی میں یسر قائم ہوا۔ ہجرت کے بعد یہاں مدینہ منورہ آکر نئی قسم کی مشکلات آئیں، پھر یسر پیدا ہوا۔ کہا کہ اس کے بعد پھر یسر پیدا ہوگا، آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ زندگی کا اصول یہ ہے کہ جو شخص مشکلات کو ہمت اور استقامت سے برداشت کر لیتا ہے اس کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پروگرام کے آخر میں بھی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی تو پھر تو باقی دن چین سے گزریں گے۔

جنت بھی آخری منزل نہیں

برادرانِ عزیز! یہ زندگی تو ایسا سفر ہے ہی نہیں، جس میں یہیں منزل آخرت آجائے۔ منزلِ آخرت تو ایک طرف، آپ تو یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے تو جنت کو بھی راستے میں ستانے کا مقام کہا ہے، اسے منزلِ آخر نہیں کہا۔ انسانی زندگی میں جہدِ مسلسل ہے۔ ارتقا کے اندر کوئی مقام بھی ایسا نہیں آتا جہاں یہ کہہ دیا جائے کہ نہ صاحب! اب منزل ختم ہوگئی۔ کہا کہ جب یہ اس موجودہ مدینہ کے یسر کے بعد بھی یسر آئے گا تو ایک بات ابھی سے سن لو، یہ نہ سمجھ لو کہ جب تمہارا نظام یہاں قائم ہو جائے گا اور اس طرح موجودہ مشکلات کا دور ختم ہو جائے گا تو فَاِذَا فَرَغْتَ (94:7) تم اپنے فرائض سے فارغ ہو جاؤ گے، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا اس کے بعد ایک نئی مہم شروع ہوگی۔ اس انقلاب کو بین الاقوامی بننا ہے اس لیے اس میں ساری دنیا کے ساتھ مقابلہ ہوگا۔ اس لیے جب تجھے کشادنصیب ہو جائے، بظاہر سمجھو کہ منزل مل چکی ہوئی ہے تو فَانْصَبْ (94:7) اس میں بین الاقوامی انقلاب کے لیے بھی تمہیں جم کر کھڑا ہونا پڑے گا۔

نبوت اور فراغت دو متضاد چیزیں ہیں

اس لیے اگلی منزل پر پھر نگاہ جما لے لہٰذا وَاِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ❶ (94:8) اور اس کے نظامِ ربوبیت کو قومی سے بین الاقوامی بننے کے لیے پھر مصروفِ جدوجہد ہو جاؤ۔ آگے ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ o وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا o (110:1-2) جب تو دیکھے کہ خدا کی مدد آ گئی اور لوگ اس دین کے اندر جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں، تو پھر کیا تم باجے بجاؤ گے، ڈھول بجاؤ گے، آتش بازیاں چھوڑو گے؟ کہا کہ نہیں، پھر یہ نہ سمجھ لینا اب کام ختم ہو گیا۔ مقصد حاصل ہو گیا۔ بالکل نہیں۔ اس سے تمہاری ذمہ داریاں اور بھی بڑھ جائیں گی۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ (110:3) تم اپنے نشو و نما دینے والے کے نظامِ ربوبیت کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرو، زیادہ شدت سے، زیادہ سرگرمی سے، سرگرمِ عمل رہو۔ یہ جو حلقہ اسلام میں آ گئے ہیں، ان کی تعلیم و تربیت کرو، ان کے سارے انتظامات کرو۔ یہ سارا کچھ کرنا ہے۔ فراغت نہیں ہے، برادرانِ عزیز! دیکھا کیا کہہ گیا ہے وہ:

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

یہاں تو سبق یاد کرنے والے کو چھٹی ہی نہیں ہے۔ یہاں تو جنہاں نوں کجھ نئیں اوندا، اونہاں نوں کنّوں پھڑ کے باہر کڈ دیندے نے۔ ❷ جو آج یاد کر کے کل کا سبق سناتا ہے، اسے آج پھر دے دیا جاتا ہے۔ اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔ اس مکتب کا یہ ایک نرالا انداز ہے اور یہ ہے۔ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ (94:8) جب تم پچھلی مہم سے فارغ ہو جاؤ، تو پھر خدا کے نظامِ ربوبیت کو مزید وسعت و استحکام دینے کے لیے ایک تازہ مہم کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ حق و باطل کی کشمکش ہے۔ شروع سے یہی ہوتا رہا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

برادرانِ عزیز! یہاں سورۃ الم نشرح ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ التین لیتے ہیں۔

---

❶ جب تم پچھلی مہم سے فارغ ہو جاؤ تو پھر خدا کے نظامِ ربوبیت کو مزید وسعت دینے کے لیے ایک تازہ مہم کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن اس سارے پروگرام میں ایک بلند حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو۔ اور وہ یہ کہ ایسا نہ ہو کہ کامیابیوں کے بعد تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف ہو جائے۔ (عام ریفارمر Refarmer یہی کیا کرتے ہیں۔ جب وہ اپنی دعوت کو لے کر اٹھتے ہیں تو بڑے بلند آہنگ اصول پیش کرتے ہیں لیکن جب انہیں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر کسی اور ہی طرف چل نکلتے ہیں۔ یہ بہت بڑی فریب دہی ہے) مشکلات ہوں یا کامیابیاں تمہارا ہر قدم خدا کے متعین کردہ پروگرام کی طرف اٹھنا چاہیے، اس راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹنا چاہیے۔ (110:1-3) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہاں تو جنہیں کچھ نہیں آتا انہیں کان پکڑ کر باہر نکال دیتے ہیں۔

سورة التین (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ التین شروع ہوتی ہے۔ یہ 30 ویں پارے کی 95 ویں سورۃ ہے۔ سورۃ الم نشرح میں بات ہو رہی تھی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ حق و باطل کی کشمکش ہے۔ شروع سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔ انقلاب خداوندی کی آواز جہاں اور جب بھی اٹھی' مفاد پرست قوتوں یعنی مستبد حکمرانوں' سرمایہ داروں اور مذہبی پیشواؤں نے اس کی مخالف کی۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ❶ (95:1-2)۔ داستانِ جہد للبقا پر نگاہ ڈالو' ان کی سرگزشتوں کو سامنے لاؤ۔ تم دیکھو کہ وہاں کیا ہوا تھا اور سب سے پہلے تم دیکھو تو سہی کہ حضرت نوح علیہ السلام سے التین کی پہاڑیوں پہ کیا ہوا تھا۔ جب انہوں نے اپنی دعوت بلند کی تھی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ Peace (امن) کے لیے آج بھی جو Symbol (علامت) ہوتا ہے' وہ ایک فاختہ کے منہ میں انجیر کا پتہ ہوتا ہے۔ تو پہلے پہل امن کا جو Symbol (علامت) تھا' وہ انجیر کے پتے کو گنا گیا ہے۔ تو یہ وہ انجیر والی پہاڑی تھی جس پر حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا آغاز ہوا تھا۔ یوں نہیں کہا کہ دیکھو! نوح علیہ السلام کے ساتھ کیا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا ہوا۔ قرآن کا کیا خوبصورت انداز ہوتا ہے! بلکہ کہا یہ کہ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ (95:1) التین اور الزیتون کی پہاڑیوں سے پوچھو کہ یہ کیا ہوا تھا؟

خدا قسمیں نہیں کھاتا بلکہ شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو آپ کے ہاں اس ''وَ'' کا ترجمہ ہوتا ہے کہ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طورِ سینا کی' یہ انجیر کی اور زیتون کی قسمیں نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ یہ جو تو دیکھ رہا ہے کہ اس قدر مشکلیں' اس قدر مشقتیں' اس قدر انقلاب آفرینیاں اور سرگرمیاں ہیں' یہ کوئی نئی

---

❶ جب یہی آواز' نوح علیہ السلام کی زبان سے' کوہِ تین سے بلند ہوئی تو اس کے ساتھ یہی کچھ ہوا اور جب اسی آواز کو' کوہِ زیتون سے مسیح علیہ السلام نے پیش کیا تو وہاں بھی یہی کچھ پیش آیا۔ جب اس انقلاب کو طور کی وادیوں میں موسیٰ علیہ السلام لے کر اٹھا تو اس کے ساتھ بھی یہی گزری۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بات نہیں ہے۔ تو پوچھ ذرا التین ❶ کی پہاڑی سے کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ اور پوچھ ذرا Mount of Olive (کوہِ زیتون) سے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعوت کا آغاز کیا تو وہ زیتون پہاڑی Mount of Olive تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انجیل میں وہی گنا جاتا ہے جو Surman of the Mount (وعظِ کوہ) ہے یعنی جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے اور تین وہی ہے جو دعوتِ نوح علیہ السلام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے Immediately Before (قریب ترین) دعوت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ کہا کہ التین اور زیتون کی دعوت پوچھو تو سہی! التین اور زیتون کی پہاڑیوں سے کیا ہوا تھا؟ کہا کہ اتنا ہی نہیں آگے بڑھو اور وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ (95:2) اور طور کی چوٹیوں سے جا کر پوچھو کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ یہ دعوتِ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہے۔ کہا کہ حق و باطل کی کشمکش کا یہ ٹکراؤ پہلے دن سے چلا آ رہا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

(اقبالؒ)

التین زیتون اور طور سینن کی پہاڑیوں کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد اب پھر وہی داستان دہرائی جا رہی ہے کہ یہی دعوت اس بلدِ امین سے ہے۔ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ❷ (94:1) اور اس مکہ کے شہر میں بھی یہی کچھ ہے کہ جس کو دنیا بھر کے انسانوں کے لیے امن اور امان کی آماجگاہ بننا ہے۔ اس لیے گھبرانے کی بات نہیں۔ مشکلات پہ ہی نگاہ نہ رکھو۔ دیکھو تو سہی کہ ان دعوتوں اور ابتدائی مشکلات سے گزرنے کے بعد کس قدر کامرانیوں اور کامیابیوں نے ان کے قدم چومے ہیں، آخرالامر میدان انہی کے ہاتھ رہا تھا۔ وہی آگے پھیلے تھے۔

تاریخِ انسانیت کی شہادت

عزیزانِ من! زمانے کی کیا بات ہے! انسانیت کی ساری تاریخ پہ نگاہ ڈالیے۔ اربوں کی تعداد میں، ہر دور میں، ہر زمانہ میں، انسان کیڑوں مکوڑوں کی طرح، برساتی مینڈکوں کی طرح، پیدا ہوتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، کسی کو یاد تک بھی نہیں رہتا لیکن تاریخِ انسانیت میں صرف یہ چند ہستیاں ہیں جو ہاتھوں میں مشعلِ آزادیٔ انسانیت لیے ہوئے ہیں، جنہوں نے یہ انقلاب برپا کیے۔ انہی کا نام تاریخِ

---

❶ قرآنِ کریم کا نزول 610 عیسوی میں شروع ہوا۔ نزولِ قرآن کے اس وقت، حسنِ اتفاق یہ ہے کہ شام اور فلسطین ہی وہ دو ممالک تھے جو انجیر اور زیتون سب سے زیادہ پیدا کرنے والے ملک تھے۔

Shabbir Ahmed: The Quran as it explains itself. Galaxy Pnblications. Landerhild, PL.2003.P.511

❷ اور اب جب یہی دعوت اس بلدِ امین (یعنی امن و سلامتی کا مرکز بننے والے مکہ (2:126) سے اٹھی ہے، تو اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ (2- مفہوم القرآن - پرویز)

انسانیت ہے۔ کبھی وہ شمعیں التین کی پہاڑیوں پہ جلیں، کبھی طور کی چوٹیوں پہ جلوہ افروز ہوئیں، کبھی کوہ زیتون کے اوپر سے وہ سرمن Surman (وعظ) حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے انداز میں روشن ہوئیں، کبھی وہ بلدِ امین مکہ کی گلیوں سے ابھریں۔ یہ ساری داستان کیا بتا رہی ہے؟ سنیے، عزیزانِ من! یہ بتا رہی ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ❶ (95:4-5)۔ ہم نے انسان کو پیدا تو احسن تقویم کیا تھا۔ عزیزانِ من! یہ عظیم آیت ہے۔ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (95:4) کہا ہے یعنی اس کے اندر اس امر کی ممکنات (Possibilities) صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ کہ یہ کائنات میں حسین ترین پیکر بن جائے۔ تقویم کا تو میں ترجمہ ہی نہیں کرسکتا۔

تقویم ❷ کا مفہوم اور باطل عقائدِ مذہب

''قوام'' کا تو آپ کو پتہ ہے کہ یہ وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ کسی شے کا قوام ٹھیک ہوگیا ہے۔ ''قوام'' کا یہ لفظ ''قام'' سے ہے یعنی جس سے کوئی شے اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوجائے اور ''قوام'' اس وقت ہوتا ہے جب اس میں بالکل صحیح تناسب پیدا ہوجاتا ہے۔ یہاں اسی کو تقویم کہا ہے۔ تقویم کے ''وزن'' ❸ کے اوپر تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کسی کے اندر کوئی کیفیت، کوئی بات ہنگامی طور پر پیدا نہ ہو بلکہ مستقل طور پر ہو اور دوسری بات یہ کہ وہ کیفیت یا بات صرف حسین ہی نہیں بلکہ کائنات میں وہ حسین ترین ہوجائے۔ دو الفاظ میں کتنے باطل تصوراتِ مذاہب کی تردید کردی۔ ان باطل تصورات میں عیسائیت کا تصور ہے کہ ہر انسانی بچہ گناہ کا پشتارہ اپنی کمر پہ لیے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں پیدائش کے اعتبار سے Original Sin (اولین گناہ) کا تصور ہے کہ ہر بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے اور پھر گناہوں کی یہ گٹھڑی ایسی ہے، جسے انسان اپنے حسنِ عمل سے اتار ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کفارہ پہ ایمان لائے۔ اس تصور میں

---

❶ یہ کشمکش اس لیے ہوتی ہے کہ ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کرکے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے لیکن اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ (آسمانی انقلاب اسے اس پستی سے اٹھا کر، انسانیت کی بلند سطح پر لانا چاہتا ہے لیکن یہ بات مفاد پرستیوں کی مصلحتوں کے خلاف جاتی ہے۔ اس لیے ان دونوں میں تصادم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس انقلاب کی رو سے، انسانوں کی ایک جماعت، شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہے، لیکن ان کے بعد ان کی نسلیں، آہستہ آہستہ، دین میں آمیزش کرنے لگ جاتی ہیں اور اس طرح پھر سے حیوانیت کی اسی پست ترین سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔ یہی کیفیت اس وقت ان مخاطبین عرب کی ہے)۔ (مفہوم)

❷ ''تقویم'' کا مادہ ''ق و م'' ہے۔ اسی سے لفظ ''قوام'' ہے۔

❸ اوزان کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ انبیاء، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص 21 اور فٹ نوٹ نمبر 4۔

انسان کے لیے کس قدر ناامیدی، کس قدر Frustration (مایوسی) اور Disappointment (محرومی) ہے کہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہونے سے پیشتر اس سے پوچھا نہیں جاتا کہ کیوں بھئی! کیا مرضی ہے وہاں بھیجوں اور جھلک دکھا دی جائے کہ پیدا ہو تو اتنا بوجھ لیے ہوئے کہ ساری عمر اسے اتار نہ سکے کہ اس بچے کی مت ماری ہوئی ہے جی! یہ عیسائیت کا تصور ہے۔ ہندو مت کا تصور یہ ہے کہ پچھلے جنم کے کوئی جرائم ہیں۔ ان کے بھگتنے کے لیے اس کو یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ کہے کہ میرا جرم کیا تھا۔ تمہیں یہ پتہ ہے کہ تم نے جرم کیا کیا ہے، سزا ہم تمہیں دیں گے۔ اندازہ لگائیے اور ہزار ہا سال سے انسان اس عقیدے کو مانتے چلے آ رہے ہیں۔

بدھ مت دنیا کا دوسرے نمبر پر سب سے بڑا مذہب ہے۔ اس میں عقیدہ ہے کہ انسان کو صاحب آرزو پیدا کیا اور ہر آرزو تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ آرزوں کے فنا کر دینے میں نجات کا راز ہے۔ سنیے صاحب! انسان کو پیدا کیا اسے ایک ایسا قلب حساس دیا کہ جس میں آرزوئیں ہیں جو تکالیف کا پیش خیمہ بنتی ہیں اس لیے انہیں فنا ہی کر دو۔

تصوف کی پستیاں جنہیں بلندیاں سمجھا جاتا ہے

آپ کو یہ بھی معلوم ہیں کہ ان چیزوں سے تاثر لے کر آپ کے ہاں جنہیں تصوف کی بلندیاں کہا جاتا ہے، اس میں کتنی پستیاں ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں انتہائے آرزو کیا ہے؟ دل بے مدعا۔ بدھ مت کا آخری تصور، دلِ بے مدعا ہے۔ آرزو کا نام ہی تو زندگی ہے، برادرانِ عزیز! جہاں ترکِ آرزو کو منتہا کہا جا رہا ہے۔ سارا تصور یہ ہے کہ انسان کو یہاں چکی پیسنے کے لیے، جیل خانے کے اندر، زبردستی جھونک دیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** (95:4) کیا پوچھتے ہو اس کی بلندیوں کا! اس کو تو ہم نے حسین ہی نہیں پیدا کیا، احسن پیدا کیا ہے۔ اس سے زیادہ حسین تو ہماری اس کائنات کی پیدائش گاہ میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ انسان کا تو مرتبہ یہ ہے کہ اس کی ممکنات ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ خود پھر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں سے **رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ** (95:5) جب گرتا ہے تو ہر گراوٹ کا کہتے ہیں کہ کوئی مقام ہوتا ہے لیکن اس کی گراوٹ وہ ہے جس کا نیچے کوئی مقام ہی نہیں ہے۔

انسان کی بلندیوں کی بھی انتہا نہیں اور پستیوں کی بھی

انسان کی بلندیاں ہیں تو وہ بھی یوں کہ اس کے منتہاء کے اوپر بھی کوئی ایسا مقام نہیں کہ جہاں انہیں اس کی منزلِ اخروی کہہ دیا جائے اور جب یہ اپنے آپ کو گراتا ہے تو اس کی کیفیت کے لیے کہا تھا کہ یہ **اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ** (7:179) انسانوں میں سے نہیں ہے۔ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) بلکہ تمام مخلوقات میں سے بدترین ہے کیونکہ **اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ** (7:179) یہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے ہیں۔ اس طرح **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ** (95:5) جب یہ اپنی انفرادی مفاد پرستیوں پر آتا ہے تو پھر یہ اسفل سافلین یعنی گراوٹ کی اس سطح تک جا گرتا ہے جس کی انتہا ہی نہ ہو۔ یہ اسفل سافلین عجیب بات ہے جی۔ یہ سافل یعنی نیچے گرنے والے ہیں اور یہ

اعلیٰ کے نقیض ہیں تو ان سے مزید نیچے اسفل ہے۔ یہ سافل کی Superlative Degree ہے۔ یعنی گرنے والوں میں اسفل نیست سے نیست تر، ذلیل ترین۔

انسان ہمیشہ نقصان میں رہا ہے

عزیزانِ من! ذرا سوچو تو سہی کہ انسان کہاں تک جا پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی انفرادی مفاد پرستیاں، اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ انسان کی بناوٹ حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن لیے ہوئے ہے اور اس کی گراوٹ حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر ہے۔ اس میں دیکھو واقعی کائنات میں یہ اس مقام پہ نظر نہیں آتا، جس مقام پہ یہ بدبخت پہنچ جاتا ہے۔ انسان تصور ہی نہیں کر سکتا۔ تو یہاں کہا کہ کیا پھر انسان یہی ہے؟ بنایا گیا تھا اتنی بلندیوں کے لیے، گر گیا یہاں پستیوں میں۔ یہ تو مایوسی کی انتہا ہے۔ یہ تو ابلیسیت ہے۔ ابلیس کے تو معنی پستی اور ناامیدی ہوتا ہے مگر اس پست ترین سطح زندگی سے بچنے کے لیے کہا کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (95:6) ❶۔ گو کہ اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین انتہا تک لے جاتی ہیں، اس کی گراوٹ پست ترین ہے اور اسفل ہے۔ ہاں، وہ لوگ اس ذلیل ترین سطح زندگی تک نہیں آتے جو قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام پر عمل کرتے ہیں۔ جو یہ نہیں کرتے ان کے لیے ابھی آگے ایک سورۃ العصر آئے گی جس کی پہلی ہی دو آیات ہیں کہ وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ (103:1-2) زمانہ تمہیں اس کی شہادت دے گا تاریخ انسانیت اس کی شہادت دے گی کہ انسان ہمیشہ نقصان میں رہا ہے۔ تاریخ انسانیت تو یہ ہوئی کہ انسان نقصان کے اندر ہے لیکن قرآن اس کے فوراً بعد استثناء کرتا ہے اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (103:3) کہ نہیں بجز ان لوگوں کے جو خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول حیات کی محکمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔

ہم نے اس سے پیشتر کہا ہے کہ تقویٰ کیا ہے، تزکیہ کیا ہے، اس حسنیٰ کی تصدیق کیسے ہوتی ہے؟ ان اقدار کے اوپر یقین رکھنے والے پھر وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (103:3) ایسے کام کرنے والے ہیں جن سے ان صلاحیتوں کی برومندی ہو جائے۔ دیکھا، آپ نے ''صالح'' کے معنی کیا ہیں۔ اس کے اندر احسن تقویم ہو جانے کی صلاحیت رکھی گئی تھی۔ یہ لوگ اس قسم کے کام کرنے والے ہیں جو ان صلاحیتوں کو نشوونما دے کر برومند کر دیں۔ یہ جو لوگ ہیں ان کے لیے فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ (95:6) ان کے ان کاموں کا بدلہ غیر ممنون ہے۔ یہ لفظ غیر ممنون پہلے بھی آ چکا ہے۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہوتا ہے: غیر منقطع، مسلسل۔ زندگی بھی جوئے

---

❶ حیوانی زندگی کے اس پست مقام سے، انسانیت کی بلند سطح پر آنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

رواں ہے' اس نے آگے جانا ہے' ان کے لیے اعمالِ صالح کا جو اجر ہے' وہ بھی مسلسل ان کے آگے ساتھ ساتھ چلتا چلا جائے گا۔ اور دوسرے معنی وہ ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ غیر ممنون کے حقیقتاً وہی معنی ہونے چاہئیں کہ ان کو جو یہ کچھ دیا جاتا ہے' وہ ان کو احسان کے طور پہ نہیں دیا جاتا۔ یہ اسے اپنی محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ جب یہ اپنی محنت سے حاصل کرتے ہیں تو پھر اس کے بعد احسان کیا ہے؟

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
(اقبالؒ)

کیا کبھی آپ کو بخشش ملی ہے؟ برادرانِ عزیز! کیا کبھی آپ کو کسی بڑے سے بڑے پہلوان سے' اچھے سے اچھے طبیب اور ڈاکٹر سے' نہایت عمدہ اور صحت مند سے' صحت ملی ہے؟ اگر کوئی صحت والا چلا جا رہا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ اے! اللہ دے ناں تے' تھوڑی جی مینوں وی دے جا۔ ❶ کیا بات سمجھ میں آ گئی کہ کبھی مانگی ہوئی عزتیں بھی ملی ہیں؟ یہ مانگے سے نہیں ملتا' یہ کرنے سے ملتا ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ ہم بھی جو ان کو دیتے ہیں' بخشش کے طور پہ نہیں دیتے' خیرات کے طور پہ نہیں دیتے۔ بہشت بھی اگر انسان کو خیرات میں دے دیا جائے تو وجہ تذلیل انسانیت ہے اور جو شے تذلیل انسانیت ہے' وہ خدا کے لیے بھی وجہ تذلیل ہے' برادرانِ عزیز! جب کوئی ذلت کے خیال سے دیتا ہے' تو اس میں دینے والے کی بھی تذلیل ہے۔ دینے والے کا بھی کوئی شرف نہیں ہوتا جو کسی کو ذلیل کرنے کے لیے دے۔ یہاں کہا ہے کہ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (95:6) یہ کچھ انہیں بطور ان کے حق کے ملے گا۔ خیرات کے طور پر نہیں ملے گا اور پھر فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ❷ (95:6-7)

جنت بطورِ بخشیش نہیں بلکہ بطورِ استحقاق ہے

اِس آیت (95:7) میں کہا گیا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ اس قسم کا قانونِ مکافات ہے جس کے ذریعے انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ کرتا ہے' جو وہ نہیں کرتا اس کا اس کو کچھ نہیں ملتا' یعنی جو کرتا ہے اس کو بخشش کے طور پہ نہیں ملتا' وہ بطور استحقاق کے اسے دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان ابدی حقائق اور تاریخی شواہد کے بعد' وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر کوئی ہمارے قانونِ مکافات کے بارے میں تجھے جھٹلا سکتا ہے؟ ان سے کہو کہ ذرا اٹھ کر مجھے بتاؤ تو سہی' اس قانونِ مکافاتِ عمل کی تکذیب کرنے والا میرے سامنے آئے۔ قرآن کریم نے یہاں مایکذب کہا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ دو معنوں کے لیے آ جاتا ہے۔ مایکذب کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں'' وہ کون سی دلیل ہے جس

---

❶ اے جانے والے! اللہ کے نام پر تھوڑی سی (صحت) مجھے بھی دے جاؤ۔

❷ ان ابدی حقائق اور تاریخی شواہد کے بعد' وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر کوئی ہمارے قانونِ مکافات کے بارے میں' تجھے جھٹلا سکتا ہے؟ (2- مفہوم القرآن۔ پرویز)

کی بنا پہ تم تکذیب کرسکتے ہو‘ فما یکذب ۔دوسرے معنی یہ ہیں کہ ان سے پوچھو’’کون ہے جو اس قانونِ مکافاتِ عمل کو جھٹلاتا ہے‘ کیسے جھٹلاتا ہے‘‘ کیونکہ یہ قانونِ مکافاتِ عمل اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ [1] (95:8)۔

سپریم اتھارٹی صرف خدا ہے

یہاں اس آیت (95:8) میں کہا یہ گیا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سب سے بلند صاحب اقتدار یعنی Sovereignty (مطلق اقتدار) کا مالک خدا ہے اور کیا یہ واقع نہیں ہے کہ یہاں خدا کے سوا کسی اور کا قانون نہیں ہے؟ اس کائنات میں‘ کیا اس کے اوپر بھی کوئی قانون ہے؟ یہاں اسے اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ کہا ہے یعنی خدا مانتا ہے کہ نیچے تو یہ ہیں جیسے آپ کے ہاں کے یہ نچلے آفیسرز ہوتے ہیں‘ افسرانِ ماتحت اور اوپر وہ اقتدارِ مطلق کا مالک۔ نظام چلتا ہی اس طرح سے ہے کہ ایک سپریم اتھارٹی ہے‘ جس کے پاس Sovereignty ہو‘ جس کے اوپر کوئی اور نہیں ہوگا اور اس کے نیچے اولی الامر ہوتے ہیں۔قرآن نے اپنے اس قرآنی نظام میں اقتدار مطلق کے ماتحت کام کرنے والے ماتحت عملے کو اُوۡلِى الۡاَمۡرِ (4:59) کہا ہے۔انہیں خدا کے احکام کی پیروی کرنے والے حکام کہا جاتا ہے۔خدا‘ انسان کو ان حکامِ زیریں میں شمار کرتا ہے۔حاکم بالا‘ اقتدارِ اعلیٰ حاکم مطلق وہ خود ہے جس کے قانون کے اوپر کسی اور کا قانون نہیں۔قانون خدا کا ہے‘ انسان اِن قوانین خداوندی کو نافذ کرنے والے ہیں‘ ان کے مطابق فیصلے کرنے والے ہیں۔حکم کے معنی فیصلے کرنا بھی ہوتا ہے۔یہاں کہا ہے کہ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ (95:8) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خدا ہی ہے جس سے بلند کسی کا اقتدار نہیں‘ اقتدارِ اعلیٰ خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں آخری فیصلہ اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔اقتدارِ مطلق قوانین خداوندی‘ جو قرآنِ کریم میں ہیں‘ کو حاصل ہے۔اسی سے شرفِ انسانیت قائم رہتا ہے اور انسان اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کی وجہ سے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر آنے سے بچ سکتا ہے۔

عزیز برادران! آج کا درس ختم ہوا۔آئندہ ہم سورۃ العلق سے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اقتدارِ اعلیٰ خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔آخری فیصلہ اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔(اس لیے قرآنی نظام سے مراد ایسا مملکتی نظام ہے جس میں اقتدارِ مطلق (Sovereignty) قوانین خداوندی‘ یعنی قرآنِ کریم‘ کو حاصل ہوتا ہے۔اسی سے شرف انسانیت قائم رہتا ہے اور انسان‘ حیوانیت کی پست سطح پر گرنے سے بچ سکتا ہے۔)(مفہوم)

ستائیسواں باب: سورة العلق (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ العلق سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسواں پارہ ہے اور 96ویں سورۃ ہے۔

یہ پہلی وحی نہیں ہوسکتی

اس سورۃ کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (96:1)۔مروّجہ روایات کے مطابق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلی سورۃ تھی جو نازل ہوئی تھی' یعنی وحی کی ابتدا ہی اس سے ہوئی تھی لیکن خود اسی سورۃ میں چار ہی آیات آگے چل کر ایک ایسی داخلی شہادت ملتی ہے جو اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ پہلی وحی نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی o عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (96:9-10) کیا تم نے اسے دیکھا جو خدا کے اس بندے کو' جب وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف ہوتا ہے' یا عام ترجمے کے مطابق' جب وہ نماز ادا کرتا ہے تو وہ اس سے روکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلی وحی تھی تو حضور ﷺ کا اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی یا صلوٰۃ میں قیام سے ان لوگوں کا آپؐ کو روکنا تو اس سے پہلے کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ان قریش کی مخالفت تو وحی ملنے کے بعد کی چیزیں ہیں۔ان دو آیات (96:9-10) میں حضور ﷺ کی مصروفیت بتائی گئی ہے۔یہ تو نبوت ملنے کے بعد جب احکام آئے ہیں تو اس وقت کی باتیں ہیں۔ان احکام کی مزاحمت اور تصادم تو بعد کی چیزیں ہیں۔پہلی ہی وحی میں یہ چیز کہنا کہ کیا تو نے دیکھا اس آدمی کو یا ان لوگوں کو' اس جماعت کو' یا اس گروہ کو' جو اس بندے کو اپنے فرائض منصبی کی ادئیگی نہیں کرنے دیتا' اس کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے' مخالفت کرتا ہے' مزاحمت کرتا ہے' متصادم ہوتا ہے؟ پہلی وحی میں تو یہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔اس داخلی شہادت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی وحی نہیں ہے۔میں اس کا بھی ذکر نہ چھیڑتا اس لیے کہ یہ زیادہ سے زیادہ

تاریخی سی بات ہوجاتی لیکن اس پہلی وحی کی تفصیل میں ہمارے ہاں روایات میں جو کچھ آیا ہے' اسے بیان کیے بغیر گزارا نہیں ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ اِن روایات میں اتنی بڑی سازش کی گئی ہے کہ اس کے تصور سے بھی روح کانپ اٹھتی ہے اور حیرت یہ ہے کہ یہ روایات ان میں سے ہیں جنہیں سب صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ خود بخاری کے اندر بھی یہ روایت موجود ہے۔

باہمی طور پر کافر گری کے فتوے

ہمارے ہاں عجیب اتفاق ہے کہ جن چیزوں پر ہمارے ہاں اتفاق چلا آتا ہے وہ عام طور پہ باطل ہی ہوتا ہے۔ جب یہ کسی شخص کو مسلمان کرتے ہیں تو سیدھی سی بات ہے کہ اہلحدیث' اسے اہلحدیث بناتے ہیں۔ فقہ والے اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ وہ ان اہلحدیث کو بھی کافر کہتے ہیں۔ اس فرقے میں شامل ہونے والے کو بھی کافر کہتے ہیں۔ دیو بندی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو شیعہ بنا لیتے ہیں تو سارے سنی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب یہ کسی مسلمان پہ کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں تو سب اس کے اوپر دستخط کر دیتے ہیں۔ کافر کو مسلمان کرنے میں ان کا باہمی اختلاف ہے لیکن مسلمان کو کافر بنانے میں اتحاد ہے۔

نزولِ وحی کے سلسلہ میں روایت

ہمارے ہاں کی جن روایات پہ ان کا اتفاق ہوتا ہے' وہ اکثر کچھ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ دیکھیے ذرا' اس روایت میں کیا لکھا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اکثر گھر سے کچھ تھوڑے سے ستو' ذرا سا پانی' لے کر مکہ کی ایک پہاڑی کے غار میں چلے جایا کرتے تھے اور وہاں چلہ اور مراقبہ کی قسم کی چیز کیا کرتے تھے' گیان دھیان میں بیٹھے رہتے تھے' ریاضت کرتے تھے۔ اس طرح ان کی جزئیات کے اوپر غور کیجیے یہ بڑی گہری چیزیں ہیں۔ اس طرح جب یہ چلے کرتے رہے تو آخر الامر ایک دن آپ کو وحی مل گئی تو گویا اس سے ساری صورت بدل گئی۔

تصوف کی دنیا کی غیر قرآنی سیڑھی

آپ کے ہاں کے تصوف کے لحاظ سے چلہ بازیوں' مراقبوں اور پھر نبوت کو بھی از قسم تصوف قرار دے دیا گیا ہے۔ ان چلوں اور مراقبوں کے لیے انسان غاروں میں جا کر بیٹھتا ہے۔ وہاں گیان دھیان کی باتیں ہوتی ہیں اور پھر وہاں کشف ہو جاتا ہے۔ بقول ان کے نبوت بھی ایک کشف کے قسم کی چیز تھی۔ اب اس کے بعد ذرا تعظیماً کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلند پایہ چیز تھی اور یہ جو باقی حضرات کو ملتی ہے یہ ذرا کم تر درجہ کی تھی یعنی اس میں فرق صرف مراتب کا ہوتا ہے۔ چیز وہ ایک ہی ہوتی ہے۔ سوچیے برادرانِ عزیز! نبوت اگر یہی چیز ہے تو پھر تو اسے ہر شخص اپنے کسب و ہنر' محنت' مراقبے' ریاضتوں اور چلوں سے حاصل کر سکتا ہے۔ کم تر درجے کی ہی سہی' شے تو وہی ہوئی اور جسے پھر آپ ختم نبوت کہیں وہ کیا ہوا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بلند درجے کی چیز تو آ کر ختم ہو گئی لیکن اس سے کم تر درجے کی چیزیں قیامت تک کے لیے جاری ہیں اور یہی وہ کم تر درجے کی سیڑھی ہے جس پہ پاؤں رکھتے ہیں۔ پھر ایک دن ان میں سے کوئی ایک کہہ دیتا ہے کہ

صاحب! میں بلند درجے پہ بھی پہنچ گیا ہوں۔

غیر اسلامی تصورات

عزیزانِ من! تصوف کی دنیا کی یہ غیر قرآنی سیڑھی اسلام کے خلاف پہلی سازش ہے۔ یہ سارا تصور، یہ گیان دھیان، یہ مراقبے، چلے ریاضتیں اور اس طرح سے یہ کشف اور الہام، الغرض یہ ساری چیزیں اسلام کے اندر، غیروں سے مستعار ہیں، مانگ کر لی ہوئی ہیں اور پھر ان کے ہاں یہ چیز بھی ہے کہ حضور ﷺ بھی اسی طرح غاروں میں چلے کرنے سے اس مقامِ بلند پر پہنچے تھے۔ عرب اس اندازِ زیست سے نا آشنا تھے۔ ان کے ہاں کوئی بھی واقعہ ایسا ہی نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ یہ کچھ کیا کرتے تھے۔

قیامت در قیامت

قیامت در قیامت تو یہ ہے کہ یہ بھی روایات میں ملتا ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا۔ وہ اس قسم کی کچھ باتیں کیا کرتا تھا۔ اسے الہام ہوا کرتا تھا۔ اس پہ ایک کیفیت طاری ہوا کرتی تھی اور پھر انہی روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ چپکے چپکے اسے دیکھنے جایا کرتے تھے۔ سوچیے، عزیزانِ من! خاموشی ہی خاموشی سے بات کہاں پہنچائی جاتی ہے۔ عربوں کے ہاں تصوف کا یہ دستور نہ سہی مگر ان روایات میں یہ تو ہے کہ وہاں ایک یہودی یہ کچھ کیا کرتا تھا، عیسائیوں کے راہب یہ کچھ کیا کرتے تھے اور پھر یہ کہ حضور ﷺ جب تجارت کے سلسلے میں شام (Syria) گئے ہیں تو وہاں عیسائیوں کے راہبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اگر یورپ کے یہ عیسائی، پادری اور مستشرق، ان روایات کی بنا پہ اس نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ یہ سارا کچھ وہی تھا جو عیسائی راہبوں کے ہاں، یہودیوں کے ہاں، دوسری قوموں کے ان فقیروں کے ہاں تھا اور تصوف میں یہ سب کچھ ہوتا چلا آ رہا تھا، اسی راستے سے اس رسول نے بھی یہ کچھ کیا، انہیں ہم کس طرح گردن زدنی قرار دے سکتے ہیں؟ بقول ان روایات کے پہلی چیز تو یہ ہے کہ آپ ﷺ حرا کے اندر جاتے تھے۔ یہ تھا وہ طریقہ جس سے پھر ایک دن کشفِ حقیقت ہوا۔ یہاں سے تصوف نے سند لے لی۔ اس کے بعد یہ ہے کہ جبریل امین نمودار ہوئے اور آپ کے سامنے ایک لکھا ہوا کاغذ رکھا اور کہا کہ اقراء (پڑھ)۔ آپ نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ گویا خدا نے کاغذ تو لکھ کر بھیجا، جبریل نے پیش کیا۔ دونوں کو پتہ نہیں تھا کہ یہ پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وقت یہ حقیقت کھلی، تو جبریل امین نے آپ کو اپنے گلے سے لگایا اور اس طرح وہ اس قابل ہو گئے کہ انہوں نے یہ کچھ پڑھا۔ پھر اس سے وہ کاغذ نہیں لیا۔ اس کے بعد آگے دیکھیے کہ اسے انگریزی میں اور تصوف کی زبان میں، ایک ذاتی تجربہ Personal Experience کہا جاتا ہے، یعنی The first experience of it۔ تو یہ تصوف کی تجردگاہ سے پہلا Experience لیے ہوئے آتا ہے۔ اب اس کے بعد یہ ہے کہ اس سے حضور پہ بے حد خوف کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ڈرتے ہوئے آپ وہاں سے جلدی جلدی سے، دوڑتے ہوئے، ہانپتے کانپتے، گھر پہنچے، بیوی سے کہا: مجھ پہ کمبل اڑھا دو، مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ پھر اس کے بعد یہ واقعہ

سنایا کہ غار میں میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے تو بیوی نے یہ کہا کہ آپ ڈریئے نہیں۔ آپ کی زندگی تو بڑی پاکبازانہ زندگی ہے۔ خدا آپ پہ اس قسم کی کوئی آفت نہیں ڈالے گا۔ گویا رسول کو تو خود اس کا احساس نہیں ہوا' بیوی نے بات کہی۔ تو بات سے کچھ تھوڑا سا حوصلہ بندھا کہ خیر کوئی خطرے کی چیز نہیں ہے۔ عزیزانِ من! میں یہ کہنا چاہتا ہوں' آپ دیکھیے:

چہ بےخبر زِ مقام محمدِ عربی ست

لیکن میں نے کہا ہے کہ یہ تو سازشیں ہیں۔ ابھی بات معلوم ہو جاتی ہے کہ سازش کہاں سے چلی۔

وحی کے متعلق ورقہ بن نوفل کا بیان

عزیزانِ من! ابھی بات چل رہی تھی کہ بیوی نے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس سے تھوڑا سا حوصلہ بندھا۔ اس کے بعد بیوی نے کہا کہ یہاں میرا ایک رشتہ دار ہے۔ اس کا نام ورقہ بن نوفل ہے۔ وہ بہت بڑا عیسائی عالم ہے' عبرانی کا بھی عالم ہے۔ یہودیت اور عیسائیت کے علومِ صحائف پر اسے بڑا عبور ہے' چلو اس کے پاس چلیں اور اس سے پوچھیں کہ یہ کیا ہوا۔ یہ نبی ان کے پاس چلے جا رہے ہیں۔ ورقہ بن نوفل نے جب یہ کہانی سنی تو ان کی بیوی سے کہا کہ تمہیں مبارک ہو' یہ تو وہی جبریل ناموسِ اکبر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا' جو عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا' اب یہی ان کے پاس آیا ہے۔ یہ تو نبوت ہے' جو انہیں ملی ہے۔ بڑی مبارکباد ہے۔ یہ جبریل تھے اور یہاں یہ نبوت ملی ہے۔ گویا ایک عیسائی عالم کی شہادت سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں نبی بن رہا ہوں (معاذ اللہ)۔ اس ذاتِ اقدس واعظم کو نبوت کے مقامِ کبریٰ پر فائز کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ میں عام طور پہ کہا کرتا ہوں کہ جسے نبوت دی جاتی ہے اس میں اس کہانی کی طرح نہیں ہوتا کہ ایک راجہ مر گیا' اس کے ہاں آگے کوئی جانشین ہونے والا نہیں تھا تو درباریوں نے فیصلہ کیا کہ تاج لے کر باہر کھڑے ہو جاتے ہیں' صبح کو جو شخص سب سے پہلے شہر میں داخل ہوگا' اس کے سر پہ رکھ دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا نبوت بھی یونہی ایک ایسی ہی چیز ہے کہ خدا نے کسی کو دینی ہوتی ہے پھر وہ جو اتفاق سے سامنے آ گیا اس کے سر پہ نبوت کا تاج رکھ دیا اور جس کے سر پہ رکھا ہے وہ سٹپٹا رہا ہے (معاذ اللہ)' اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ جسے نبی بنایا جا رہا ہوتا ہے' اسے پہلے سے اُس کا علم نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ تلاشِ حقیقت میں' سرگرداں رہتا ہے۔

نبوت کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بات یوں ہوئی ہے کہ جب ان سے یہ بات پہلی دفعہ کہی گئی ہے تو انہوں نے کہا کہ اللہ میاں! یہ تو بڑا

احسان ہے جو مجھے نبی بنایا جا رہا ہے۔ کہنے لگے کہ موسیٰ! تمہیں پتہ نہیں ہے، ہم تو تمہیں اس دن سے دیکھ رہے تھے جس دن تو پیدا ہوا ہے اور اس کے بعد قرآن میں ہے کہ انہوں نے ساری منازل گنائیں کہ یوں فرعون کے محلوں میں پہنچے پھر اس کے بعد شبانی کی۔ پھر اس کے بعد، قرآن کہتا ہے کہ تجھے مختلف کٹھالیوں میں تپایا کہ تو کندن بن جائے۔ جب تو اے موسیٰ! ہمارے پیمانے پہ پورا اترا تو ہم نے تمہیں نبوت سے سرفراز کیا ہے۔ یہ ہونے والا نبی تو ان تمام کٹھالیوں سے نکل رہا ہوتا ہے۔ جب اسے دیکھا جاتا ہے کہ یہ اتنی عظیم ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہے، پھر اسے نبوت سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت ان روایات کے مطابق یہ ہے کہ اسے خود کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک عیسائی راہب یا عالم کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ آپ نبی ہیں اور آپ سمجھ لیتے ہیں کہ میں نبی ہو گیا اور اس کے بعد دعویٰ نبوت کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ عالم جو اس کی شہادت دیتا ہے کہ آپ نبی ہیں وہ آپؐ کو نبی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ عیسائی مر گیا۔ اس نے یہ کہا: میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد یہ مکہ والے تمہاری بڑی مخالفت کریں گے۔ اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو اس وقت تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ یعنی وہ نبوت کی شہادت دے رہا ہے، ایمان نہیں لا رہا، کہہ رہا ہے کہ مخالفت ہو گی گویا اس چیز کی پیش گوئی کر رہا ہے کہ ایسا ہونے والا ہے، اس وقت میں تمہاری مدد کروں گا۔ خود عیسائی رہا، عیسائیت پہ مر گیا اور رسول اللہ ﷺ کے کان میں یہ بات ڈال گیا کہ آپ نبی ہیں۔

اگر کوئی پادری ورقہ بن نوفل کی بات کو چال کہہ دے تو پھر آپ کا کیا جواب ہو گا

عزیزانِ من! سوچیے کہ اگر آج یورپ کے یہ پادری آپ سے یہ کہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ورقہ بن نوفل نے یونہی ایک چال کی ہے۔ اگر وہ واقعی نبی سمجھتا تو خود ایمان نہ لے آتا اور آپ کے رسول کی کیفیت یہ ہے کہ ایک عیسائی عالم کی شہادت پر اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ گیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں ورقہ بن نوفل کا مقام کیا ہو جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا مقام کیا رہ جاتا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ روایت وضعی ہے، بنائی ہوئی ہے، اس روایت کی تہہ کے اندر بیٹھی ہوئی یہودیت اور عیسائیت اور ان کی راہبیت ساری کھنک رہی ہے۔ ان پہ افسوس نہیں، ان کا تو کام ہی یہ تھا کہ بڑے عجیب طریقے سے، بڑے ہی لطیف طریقے سے، حضور کے اِس دعویٰ اسلام میں طرح طرح کے شکوک پیدا کیے جائیں۔ ان سے تو گلہ نہیں وہ تو دشمن تھے، ان کی تو یہ Strategy (حکمت عملی) تھی۔ گلہ ان سے ہے کہ ہزار برس سے ان روایات کو اپنے سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔

ان روایات سے انکار کرنے والا کافر

اگر کسی کی بصیرت، جو مقامِ نبوت کو قرآنِ کریم سے سمجھ رہا ہے، یہ کہہ دے کہ یہ روایات صحیح نہیں ہوسکتیں، یہ وضعی ہیں، ہم ان کی صداقت سے انکار کرتے ہیں، تو اسے دائرہ اسلام سے خارج کرتے ہیں کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔

عزیزانِ من! یہ آپ کی پہلی وحی کی پہلی روایت ہے، بڑی تفصیل سے موجود ہے، صحاح کے اندر موجود ہے، بخاری کے اندر موجود ہے، متفق علیہ ہے، تمام اسے صحیح مانتے چلے آ رہے ہیں کہ اس طرح نبی اکرم ﷺ اپنے آپ کو نبی محسوس کرنے لگ گئے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس سے گلہ نہیں کہ یہ پہلی وحی ہے یا بعد کی ہے، یہ جو اس کے ساتھ ہمیں روایت وضع کی ہوئی ملتی ہے، یہ ہے وہ چیز کہ آپ کی ساری عمارت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ بڑی گہری سازش تھی۔

لفظ قرآن کے معنی

عزیز برادران! قرآن ان سازشوں سے بہت بلند ہے۔ کہا گیا ہے کہ **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** (96:1)۔ یہ ٹھیک ہے کہ قراء کا یہ لفظ ''پڑھنے'' کے معنوں میں بھی آتا ہے لیکن بنیادی معنی کے اعتبار سے اس کے معنی ہوتے ہیں ''اعلان کر''۔ یہ وہی ہے جسے انگریزی میں Proclamation (اعلامیہ) کہتے ہیں۔ یہ لفظ ان معنوں میں آتا ہے۔ لفظِ قرآن کے معنی بھی ''اعلان'' کے ہیں۔ یہ ایک اعلانِ عام ہے۔ اس آیت میں کہا: اقراء یعنی اٹھ کر اعلان کر دے، کتنا بڑا انقلاب آفریں یہ لفظ ہے کہ اعلان کر دے۔ سوال یہ ہے کہ کس چیز کا اعلان کر دے؟ کہا کہ **اسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** (96:1)۔ قرآن دو دو الفاظ میں کتنے حقائق بیان کرتا چلا جاتا ہے! اعلان کر دے کہ **رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** (96:1) جس نے پیدا کیا ہے اس نے سامانِ ربوبیت بھی دیا ہے۔ بڑی عجیب چیز ہے: زمین پر مخلوق کو پیدا کر دینا جن کی زندگی کا انحصار سامانِ زیست پر ہو اور سامانِ زیست کا عطا نہ کرنا۔ خدا ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہا کہ اس چیز کا اعلان کر دے کہ جس نے پیدا کیا ہے، اس نے سامانِ زیست بھی دیا ہے۔ لہٰذا جسے پیدا کیا گیا ہے اسے سامانِ زیست سے محروم رکھنے کی کوشش خدا کی اس صفت ربوبیت کے خلاف جاتی ہے۔

برادرانِ عزیز! اعلان یہ ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے، سامانِ ربوبیت بھی عطا کیا ہے۔ یہ نظامِ ربوبیت کا پہلا اعلان ہے جو قرآن نے پہلے ہی لفظ سے کیا کہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ** (1:1)۔ قرآنِ کریم نے بات ہی اسی سے شروع کی تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے رگ و پے کے اندر، کس طرح ربوبیت، خون کی طرح، رواں دواں چلی جا رہی ہے۔ کہا کہ **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ** ❶ (96:1)۔ اور اس کے بعد ہے کہ **خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ** (96:2)۔ عربی زبان کی جامعیت اور قرآن کے حسن انتخاب

---

❶ اے رسولؐ! تو اُس خدا کی صفت ربوبیت کا عام اعلان کر دے، جو تمام اشیائے کائنات کا خالق ہے۔ یہ اعلان کر دے کہ جس خدا نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اسی نے سامانِ نشوونما کی بھی تخلیق کر دی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کی دادا ایسے ہی مقام پہ ملتی ہے۔Physical Level یعنی طبعی سطح پر دیکھیے کہ جنین کی پیدائش کے مختلف مراحل ہوتے ہیں۔ یہ وہ مراحل تھے جنہیں ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے ہماری اس کونشن میں نہایت تفصیلی طور پر' بڑے دلچسپ عالمانہ انداز سے' بیان کیا تھا۔ اس میں ''علق'' بھی آیا تھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں اس جنین نے ہنوز کوئی شکل اختیار نہیں کی ہوئی ہوتی لیکن رحم مادر کی دیوار کے ساتھ چپکا' لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ طبعی زندگی کے لیول (سطح) پر دیکھیے تو آپ کو علق یہ بات بتا رہی ہے لیکن انسانیت کے لیول پر آ کر دیکھیے تو یہ علق انسان کی ایک حیوانی فطرت بتاتی ہے۔ علق کے معنی ہیں ''چپک جانے والا۔'' عربی زبان میں یہ قاعدہ اور انداز ہوتا ہے کہ جس خصوصیت کو نمایاں طور پہ بیان کرنا ہو اس کے لیے یہ ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ (96:2)۔ انسان کو علق سے پیدا کیا۔ اِس علق کا لفظی ترجمہ ہوتا ہے چمٹنا' چپکنا قرآن میں بھی انسان کے متعلق ہے کہ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ (21:37) انسان کو عجل سے پیدا کیا۔ یہ لفظ ع ج ل سے ہے۔ اس کے معنی ''تیزی ہے' جلد بازی ہے۔'' آپ کے ہاں کا لفظ ''جلد بازی سے'' عجلت ہے۔ اس طرح اس آیت کے لفظی معنی کیے جاتے ہیں کہ جلد بازی سے پیدا کیا۔ اس کے معنی ''جلد بازی سے'' کے نہیں ہوتے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''جلد باز پیدا کیا'' یا دوسری جگہ یہ ہے: خَلَقَكُم مِّن ضُعْفٍ (30:54)۔ اس کے لفظی معنی ہوتے ہیں ''تمہیں کمزوری سے پیدا کیا'' مگر اس کے معنی یہ ہوتا ہے ''کمزور پیدا کیا۔'' کمزوری سے پیدا کیا صحیح نہیں ہے۔ گویا یہ اس کی ایک صفت ہے جس کا بیان ہوتا ہے۔ من علق بھی یہی بات ہے۔ یہ اس کی ایک خصوصیت ہے جسے نمایاں طور پر بیان کیا ہے کہ ''انسان کو جلد باز پیدا کیا۔''

حیوانی سطح پر انسانی زندگی کی جبلتیں

حیوانی سطح پر انسان کی زندگی وہی جبلتیں (Instincts) اپنے اندر رکھتی ہے جو عام طور پہ حیوانات کی ہیں۔ ان میں Preservation of life (زندگی کا تحفظ) ایک بڑا بنیادی جبلی تقاضا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان ہر اس شے کے ساتھ چپک جاتا ہے جس سے متعلق اس کی زندگی ہوتی ہے۔ انسان کو اس طرح سے انفرادی طور پر یوں چپکنے والا بنایا کہ ہر شے جس سے اس کی زندگی کا تحفظ وابستہ ہوتا ہے یہ اس کے ساتھ چپک جاتا ہے لیکن اس کا اگلا ایک اور درجہ بھی ہے۔ حیوانوں کی زندگی میں یہ بھی ہے کہ وہ Herd Instincts Zone میں رہتے ہیں یعنی ایک گروپ (Herd) کے اندر رہتے ہیں' حفاظت کے لیے ان کی زندگی انفرادی ہوتی ہے۔ انسان مدنی الطبع (Social Animal) واقع ہوا ہے' سوسائٹی کے اندر رہتا ہے ایک دوسرے کے ساتھ اس کے تعلقات ہوتے ہیں اور ''من علق'' کے معنی ہیں: ''صاحب تعلقات''۔ آپ دیکھتے ہیں ایک ایک لفظ کیا کیا چیزیں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ جس لیول (سطح) کا' جس Branch of knowledge (علم کی شاخ) کا' کوئی انسان ہے' اس کو یہ معنی دیا جائے گا۔ زمین کے متعلق اگر آپ بائیالوجی کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں گے تو علق کے وہ معنی ہوتے ہیں۔ اگر آپ Anthropology (علم بشریات) یا Behariourism

(کرداریت) کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں گے تو اس میں ''علق'' انسان کے اس حیوانی جذبے یعنی جبلت کا نام ہوگا جس میں وہ سامانِ زیست کے ساتھ چپک جاتا ہے اور اگر آپ سوشیالوجی (عمرانیات) کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو ''علق'' کے معنی وہ تعلقات ہیں جس میں افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر ایک سوسائٹی بنا لیتے ہیں۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا' اسے سامانِ زیست دیا لیکن انسان کے اندر گہری قسم کی کششیں اور جاذبیتیں ہیں۔ حیوانی سطح کی زندگی پر اس کی کیفیت یہ ہے کہ جو شے سامانِ زیست دیتی ہے یہ اس کے ساتھ چپک جاتا ہے' چھوڑنا ہی نہیں چاہتا' سوسائٹی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اس کے تعلقات کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اپنے ہی آپ کی فکر نہ کرے بلکہ دوسروں کی بھی فکر کرے۔ یہ دونوں قسم کی کششیں اور جاذبیتیں انسان کے اندر رکھ دی گئیں۔ ❶

لفظ اکرم کے معنی ومفہوم

اگلی ہی آیت میں قرآن نے کہا کہ ان سے کہو کہ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ❷ (96:3)۔ ایک قدم اور آگے بڑھو اور اعلان کر دو کہ یہ جو تمہارے اندر ایک جبلت ہے کہ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ میں ہی زیادہ سے زیادہ سمیٹ لوں' کہیں یہ سامانِ زیست ختم ہی نہ ہو جائے۔ اَكْرَمَ کے معنی ہیں ''بڑی فراوانیوں سے سامانِ زیست دینے والا''۔ یہاں کہا ہے کہ کیوں گھبراتے ہو؟ زمین کے اندر تو لاانتہا خزانے دفن ہیں' محنت کرتے چلے جاؤ' سامانِ زیست ملتا چلا جائے گا' یہ ختم نہیں ہوگا' اس قسم کا معاشرہ قائم کرتے ہو' جس میں ہر فرد اپنی ذات کے لیے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے' اس خیال سے کہ یہ ختم ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔ تمہارا رب اَكْرَمَ ہے یعنی وہ تو بڑی فراوانیوں سے دینے والا ہے۔ یہ Bumber Crop ہے۔ آپ انگریزی میں یہی کہتے ہیں کہ اس دفعہ تو فصل بڑی زور کی ہوئی ہے۔ اسے عربی زبان میں ''کریم'' کہتے ہیں اور اکرم تفضیل کا صیغہ ہے۔ وہ بڑی فراوانیوں سے دینے والا ہے۔ کیوں گھبرا کر اپنی ذات تک ساری چیزیں محدود کرتے چلے جاتے ہو۔ انسان کی یہ کیفیت مدنی الطبع (Social Animal) ہونے کی وجہ سے ہے۔

بیان کرنے کی قوت' سننے کی قوت اور لکھنے کی قوت

عزیز برادران! قرآنِ کریم میں ایک جگہ انسان کے لیے کہا گیا ہے کہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (55:4) اسے بولنے کی قوت دی گئی۔ یہ بہت بڑی چیز ہے جو اسے طبعی زندگی میں ملتی ہے۔ یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو حیوان سے نمایاں طور پہ انسان میں آتی ہے۔ طبعی زندگی

---

❶ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (96:2) اشیائے کائنات میں سے' انسان کی کیفیت سب سے الگ ہے۔ ایک طرف اس کی حالت یہ ہے کہ یہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے یعنی اس نے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے۔ دوسری طرف اس کا یہ عالم ہے کہ (اگر یہ وحی کی راہنمائی اختیار نہ کرے تو ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ) وہ سامانِ رزق کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ جائے اور دوسروں کا خون چوستا رہے (17:100;70:19)۔

❷ اس کشمکش کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام انسانوں کو اس نقطہ پر جمع کیا جائے کہ خدا نے اس قدر فراوانی سے سامانِ زیست پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ اس سے تمام افراد کی نشوونما ہو سکے۔ اس لیے تمہارا تمدنی اور معاشی نظام ایسا ہونا چاہیے جو اس مقصد کو پورا کر سکے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں یہ قوتِ گویائی ہے، نطق ہے، بیان کی قوت ہے لیکن بیان کی قوت تو پھر بھی محدود رہتی ہے، زبان سے آپ اسی کو سنا سکتے ہیں جس کے کان تک آپ کی آواز پہنچتی ہے۔ ایک عالمگیر سوسائٹی اس کے ذریعے نہیں بنتی۔ اس کے لیے ایک اور ذریعے کی بھی ضرورت ہے۔ اس ذریعے کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4) اس نے تحریر کے ذریعے آپس کے تعلقات وابستہ رکھنے کا بھی طریقہ تمہیں سمجھایا۔ **عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ** (96:5) اور اس کے بعد وحی کے ذریعے ان حقائق اور اقدار کا بھی علم دیا جنہیں اس کے بغیر انسان نہیں جانتا تھا۔ اس طرح ان حقائق کا علم دیا، قوتِ گویائی دی، تحریر کا ملکہ دیا۔ اس لیے کہ اس نے مدنی الطبع بننا ہے، اس نے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے ہیں، نوعِ انسان کو ایک برادری بن کر رہنا ہے اور جب ایک برادری بن کر رہنا ہے تو پھر اس میں اگر "علق" کی یہ کیفیت ہو کہ ہر فرد اپنے ہی مفادات سے چپک کر رہ جائے، ہر سامانِ زیست زیادہ سے زیادہ اپنے لیے ہی سنبھالنا شروع کر دے تو اس پر خدا کہتا ہے کہ اس سے ہماری تخلیق کا Purpose (مقصد)، Object of Creation (مدعائے تخلیق) فیل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ "**کَلَّا**" (96:6) نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

انسان کو نظامِ ربوبیت کی طرف آنا ہے

عزیزانِ من! اب انسان کی کیفیت یہ ہے کہ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی o اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی** (96:6-7) یہ زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر سمجھتا ہے کہ میں باقیوں سے مستغنی ہو گیا، مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ پھر وہ ہمارے وحی کے ذریعے عطا کردہ ان قوانین اور اقدار کو پامال کرتا ہوا، اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کا نظام وضع کر کے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، جس میں، ہر وہ فرد جو کسی طرح زیادہ سمیٹ لیتا ہے، اپنے آپ کو دوسروں سے مستغنی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ پھر وہ ان عطا کردہ قوانین و اقدار کی پرواہ نہیں کرتا، ان سے سرکشی اختیار کرتا ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کو اس طرح نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ خدا کے ذمہ ربوبیت عالمینی ہے اس لیے اس قسم کی سرکشی اختیار کرنے والوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ **اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی** (96:8)۔ یہ کتنی ہی حدود شکنیاں، کتنی ہی قیود ناآشنائیاں کیوں نہ کرے انسانیت کو بالآخر خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ یہ جتنے جی چاہے اور نظام بنا کر دیکھ لے، انسان ناکام رہے گا۔ Trial & Error (سعی و خطا) کے ذریعے ہی سہی، بالآخر اس نے ربوبیت عالمینی کے نظام کی طرف آنا ہے۔ کہا تو یہ ہے جو بالآخر ہونا ہے لیکن انسان کرتا کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْہٰی o عَبْدًا اِذَا صَلّٰی** [1] (96:9-10)۔ یہاں کہا ہے کہ اس نظام کی مخالفت کرنے والوں کی کیفیت دیکھو۔ **عَبْدًا** بلند ترین مقام ہے جو خدا انسان کو دیتا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ سے زیادہ بلند کس کا مقام ہو

---

[1] کیا تو نے اس پر بھی غور کیا کہ جو انسان وحی سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے، اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ نہ صرف خود قوانین خداوندی سے بے راہ روی اختیار کرتا ہے بلکہ جو شخص، ان قوانین کے پیچھے چلتا ہے، اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

گا؟ وہ مقامِ عبدیت ہے۔ اس مقام میں وہ قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرنے والا بنتا ہے۔ وہ صرف اس کی غلامی اختیار کرنے والا ہے' کسی اور کی غلامی اختیار کرنے والا نہیں۔ یہ عبد کی کیفیت ہے اور یہی چیز ہے جس کا اقرار و اعلان ہر عبدِ مومن قرآن کی پہلی ہی سورۃ میں کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** (1:4) ہم تیرے سوا کسی اور کی حکمرانی قبول نہیں کرتے۔

صلوٰۃ کا مفہوم

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ اس شخص کو دیکھا کہ جب اس کا **عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی** (96:10) خدا کے دیئے گئے فرائض زندگی کی سرانجام دہی میں مصروف رہتا ہے تو یہ **یَنۡھٰی** (96:9) اسے روکتا ہے۔ **اِذَا صَلّٰی** کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ قرآن کے مفہوم کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ہے: جب وہ اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دیتا ہے' جو خدا کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ جتنے بھی فرائض منصبی عائد ہوتے ہیں ان سب کا نام صلوٰۃ ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ صلوٰۃ مسجد کی چاردیواری کے اندر محدود نہیں ہے' زندگی کے ہر گوشے کے اندر قوانین خداوندی کے اتباع اور پیچھے چلنے کا نام ہے۔ یہاں (96:9-10) میں کہا کہ تم نے دیکھا کہ جب اس کا عبد اپنے ان فرائض کی سرانجام دہی میں مشغول و مصروف ہوتا ہے تو یہ اسے روکتا ہے۔ آگے کہا کہ **اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡھُدٰۤیO اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی** (96:11-12) کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ یہ عبد تو وہ ہے جو زندگی کے صحیح راستے پر چل رہا ہے' خود بھی صحیح راستے پر چل رہا ہے اور باقی کاروانِ انسانیت کو بھی آگاہ کیے چلا جا رہا ہے کہ یہاں گڑھا ہے' یہاں خندق ہے' یہاں کھائی ہے' یہاں خطرہ ہے' بچ کے اس سیدھے راستے پر چلتے جاؤ۔ اور اس کے مقابلے میں **اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی** (96:13) تم انہیں دیکھو جو اس سیدھے راستے کی تکذیب کرتے ہیں' جو اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں خطرہ ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ بولتا ہے خطرہ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں کھڈ ہے' بچ کے چلنا۔ یہ ہدایت دیتے ہیں کہ نہیں' یہ بالکل غلط کہہ رہا ہے۔ یہ زندگی کے صحیح راستے پہ چلتا ہے مگر یہ **وَتَوَلّٰی** (96:13) وہاں سے اعراض کی راہیں اختیار کر کے چلے جاتے ہیں' کوئی اِدھر مڑ جاتا ہے' کوئی اُدھر مڑ جاتا ہے۔ یہ اس لیے کرتا ہے کہ **اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی** (96:14) اسے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کوئی دیکھنے والا بھی ہے۔ انہیں کہہ دو کہ جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا تو خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اس وقت بھی دیکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت دیکھتا ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل ہر آن دیکھ رہا ہوتا ہے

ان سے کہہ دو کہ **کَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ** [1] (96:15)۔ اگر وہ اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو ہمارا یہ

---

[1] (کیا وہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ اسی طرح کرتا چلا جائے گا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ اگر وہ اپنی اس روش سے باز نہ آیا تو خواہ وہ کیسا ہی صاحب قوت کیوں نہ ہو' ہم اسے اس کی پیشانی کے بالوں سے اس طرح پکڑیں گے کہ وہ ہل نہیں سکے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

قانونِ مکافات یوں پکڑ لیتا ہے جیسے سرکش گھوڑے کو بالوں سے پکڑا جاتا ہے۔ یہ نَسْفَعًا ۢ بِالنَّاصِيَةِ (96:15) عربی زبان کا محاورہ ہے۔ اگر گھوڑے کو پیشانی کے بالوں سے جکڑ دیا جائے تو وہ ہل نہیں سکتا۔ اس کام کے لیے پیشانی کے بال کہے جاتے ہیں۔ جب کوئی سرداری اور سروری کے نشے کے اندر مغرور ہو اور اسے گرفت میں لیا جائے تو اس وقت یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ بہت بڑے سرکش ہیں' یہ اپنے آپ کو بڑا لیڈر سمجھنے والے ہیں۔ یہ بہت بڑے سرمایہ دار بنے بیٹھے ہیں' ان سے کہیے کہ اگر اس روش سے باز نہ آئے تو ہمارا قانونِ مکافات یوں پکڑ لے گا جیسے سرکش گھوڑے کو پیشانی کے بالوں سے پکڑا جاتا ہے۔ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ [1] (96:16) وہ پیشانی' یہی نہیں ہے کہ ہم نے یونہی ہاتھ ڈال کے پکڑ لیا۔ اس لیے پکڑا ہے کہ یہ کاذبة ہے ہر صداقت کو جھٹلانے والا ہے' خاطئة ہے انتہائی جرم کی زندگیاں بسر کرنے والا ہے۔ یہ تھی وہ پیشانی کہ جس کو قانونِ مکافات نے اپنے دست شدید میں' اپنی سخت گرفت کے اندر' لے لیا۔ اب اس سے کہو کہ ہم نے اسے پکڑا ہے۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (96:17) اب اپنے حمایتوں کو آواز دے' اپنی مدد کے لیے بلائے۔ کیا بات ہے! یہ نہیں ہے کہ یہ اکیلا ہے' ہم نے پکڑ لیا ہے۔ یہ تو کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ مقابلہ یہ ہے کہ اس سے کہا گیا ہے کہ بلا لو اپنے حمایتوں کو بھی' ان کو بھی جو باطل نظام قائم کرنے والے ہیں' باطل نظام کی حمایت کرنے والے ہیں' اور پھر ان سے کہو کہ اس نظام ربوبیت کے خلاف متحدہ نظام بنالو' تم یہ کچھ کرو۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (96:18) اور دوسری طرف ہم بھی انہیں آواز دیں گے' بلالیں گے جو حق وصداقت کی مدافعت کے لیے ہر مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں تاکہ وہ ان مخالفین کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیں۔

انسانوں کی دنیا میں انسانوں کا انتظام

دیکھیے' عزیزانِ من! یہ نہیں کہا گیا کہ تم تو سب کچھ بلالو اور خدا تنہا اس کے لیے اب کافی ہو جائے گا۔ سورۃ الحج میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر خدا انسانوں کی سرکش جماعت کو دوسرے انسانوں کے ہاتھوں سے نہ روکتا تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔ انسانوں کی دنیا میں خدا انسانوں کی سرکشی کو انسانوں ہی کے ہاتھوں روکتا ہے۔ یہ وہ جماعت ہوتی ہے جو حق کی علمبردار ہوتی ہے' صحیح نظام کو لے کر اٹھنے والی ہوتی ہے۔ ان دو جماعتوں کا ہی آپس میں مقابلہ وتصادم ہوتا ہے۔ [2] یہاں ان سے کہا ہے کہ تم اپنے اہلِ مجلس یعنی حمایتوں کو بلاؤ: سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (96:18) ہم بھی اپنے ''زبانیہ'' کو بلائیں گے۔ کیا لفظ ہے یہ! یعنی مجاہدین کہا جاسکتا ہے' اپنے جنود کہا جاسکتا تھا' لشکر' سپاہی کہا جاسکتا ہے' مگر نہیں' انہیں الزبانیہ کہا ہے۔

---

[1] یہ جھوٹ بولنے والا' نظامِ ربوبیت کے تصور کو جھٹلانے والا' ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کرنے والا' خطا کار مجرم' یہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہا ہے۔

[2] ان نکات کی مفصل تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء۔ (1- مفہوم القرآن۔ پرویز)

لفظ زبانیہ کا قرآنی مفہوم

یہ الزبانیۃ ایک لفظ ہے' عزیزانِ من! یہ اسلام میں جنگ کی ساری کیفیت کو واضح کر کے آگے چلا جاتا ہے۔ ''زبانیہ'' کہتے ہی ان کو ہیں ''جو دوسروں کی سرکشی کو روکنے کے لیے اور حق کی مدافعت کرنے کے لیے اٹھیں۔'' اسلام کا سپاہی کبھی Aggression (جارحیت) کے لیے نہیں اٹھے گا' وہ سرکشی اور زیادتی کو دبانے کے لیے اٹھے گا۔ وہ دوسروں کو کچلنے کے لیے آگے نہیں بڑھے گا' وہ حق کی مدافعت میں ہمیشہ کھڑا ہوگا۔ یہاں لفظ وہ استعمال کیا ہے جس کے بنیادی معنی ہی ''کسی روک تھام کے لیے کھڑے ہونے کے ہوتے ہیں۔'' تم تو اپنے سارے حمایتیوں کو بلا لو اور ہم انہیں بلائیں گے جو سرکشی کی روک تھام کے لیے اٹھا کرتے ہیں۔ یہ کچھ ہوگا۔ وقت وہ ہے کہ ابھی حق کے علمبرداروں کی یہ جماعت بڑی کمزور' ناتواں اور بے سروسامان سی ہے۔ ایسے وقت میں عام طور پہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح سے مخالفین کے ساتھ Compromise (مصالحت ومفاہمت) کر لیا جائے اس لیے کہ ان کے مقابلے کی تو ابھی تاب نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا کہ اے رسول! **كلا** (96:19) قطعاً نہیں' تجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ تو ان لوگوں سے کسی قسم کی مفاہمت کرے۔

غیروں کے ساتھ مفاہمت نہیں

یہاں کہا کہ آپ اس کے لیے Compromise (مصالحت ومفاہمت) نہیں کر سکتے' مفاہمت نہیں کر سکتے۔ **لا تُطِعْهُ** (96:19) ان کی اطاعت قبول نہیں کرنی' ان کی بات نہیں ماننی۔ کرنا کیا ہے؟ پروگرام میں ایک لفظ ہے' برادرانِ عزیز! وہ ہے **وَاسْجُدْ** (96:19) قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے چلے جاؤ' اور ان کی اطاعت کرتے چلے جاؤ' تمہارے لیے صرف یہ Positive Programme (مثبت پروگرام) ہے۔ اس نظام کی' ان قوانین کی' زیادہ سے زیادہ اطاعت کرتے چلے جاؤ۔ **واقترب** (96:19) تم منزل سے قریب تر ہوتے چلے جاؤ گے۔

عزیزانِ من! یہ ہے سجدہ اور یہ ہیں اس کے نتائج۔ آپ کو یاد ہے میں نے پہلے بھی کہیں کہا تھا کہ سجدہ قوانین خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینے کا نام ہے' خود سپردگی کا نام ہے۔ یہ حق کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دینے کا نام ہے اور یہ وہ کیفیت ہے کہ اگر انسان کی سجدے سے پہلے یا سجدے کے بعد کی کیفیت میں فرق پیدا نہیں ہوتا تو یاد رکھیے وہ سجدہ سجدہ نہیں' محض ایک Mechanical Action (میکانکی عمل) ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

اس کے، صرف اس کے، سامنے جھکنا ہے۔ یہ کرتے چلے جاؤ تو واقتــرب (96:19) منزل سے قریب تر ہوتے چلے جاؤ گے۔ تمہارا ہر جھکاؤ، تمہارا ہر قدم، منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لیے قوانین خداوندی کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کیے جاؤ یہ ہے لَا تُطِعْهُ اور یہ ہے وَاسْجُدْ۔ اس طرح تمہارا ہر قدم تمہیں منزلِ مقصود سے قریب تر کرتا چلا جائے گا یہ وَاقْتَرِبْ ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ العلق ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ القدر لیتے ہیں۔

سورة القدر (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! القدر۔ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ یہ سورۃ القدر 97 ویں سورۃ ہے، رمضان کا مہینہ ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) یہ وہ مہینہ ہے جس میں وحی کا آغاز ہوا تھا۔ ''لیل'' سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ الدخان میں بھی یہ چیز کہی تھی کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (44:3) ہم نے اسے ایک مبارک لیل میں نازل کیا۔ ''مبارک لیل'' کے معنی میں ابھی رات ہی کرتا ہوں۔ ایک مبارک رات میں اس کا آغاز کیا۔ فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (44:4) جس میں تمام امور پہ امتیازی خطوط کھینچے جاتے ہیں، جس سے باطل ایک دوسرے سے ہٹ کر الگ ہو جاتا ہے، ان چیزوں میں امتیاز ہو جاتا ہے اور یہ امر حکیم وہ امتیاز خاص ہوتا ہے جو خالص Reason (عقل ودلیل) کی بنا، پر حکمت کی بنا پر، Wisdom (دانائی ودانش) کی رو سے ہوتا ہے، Rationally (استدلالی طور پر) یہ کچھ ہوتا ہے۔ تمام امور کے اندر امتیاز ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہاں یہ امر حکیم کہا تھا۔

شب برأت کے مہینے میں نزول قرآن کا تصور

ضمناً عرض کر دوں کہ یہ جو ابھی شب رات کا مہینہ گزر رہا ہے وہ رات غالباً اس میں گزری ہے۔ آپ نے سنا ہوگا، ہم نے تو اکثر سنا ہے کہ قرآن کا نزول اس رات میں ہوا۔ اس رات کی سند میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے کہ یہ ہے وہ لیلۃ مبارکہ جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اور آپ کے ہاں یہ روایت چلی آ رہی ہے اور کوئی نہیں دیکھتا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہ رات رمضان کے مہینے میں آنی چاہیے لیکن ہمارے ہاں اسے شب برأت کی چودہ کیسے کہا جاتا ہے۔ شب برات کی چودہ کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن اس میں نازل ہوا۔ اور جب اس کے بعد کسی نے ٹوکا کہ صاحب! قرآن میں لکھا ہے کہ رمضان میں نازل ہوا اور یہ شب برأت کی رات میں ہی آپ کہتے ہیں کہ نازل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کہنے لگے کہ تم بات نہیں سمجھتے ہو یہ بڑی گہری بات ہے۔ یہ شب برأت کے مہینے میں عرشِ اعظم سے پہلے آسمان پہ نازل ہوا اور پھر پہلے آسمان سے زمین تک آنے میں اس کو مہینہ لگ گیا، یہ دو دفعہ نازل ہوا۔ وہی لیلۃ مبارکہ ہے جسے کہا کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (97:1)۔

قرآن نے انسان کو اقدار دیں

عزیزانِ من! مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ کوئی ایک فقرے میں یہ بتاؤ کہ قرآن نے انسانیت کو کیا دیا تو وہ فقرہ میرا نہیں ہوگا' وہ قرآن کا یہ فقرہ ہوگا: اِنَّـآ اَنْـزَلْنٰـهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (97:1)۔اس نے اقدار دیں'اس نے Values دیں'اس نے انسانیت کو نئے پیمانے دیئے اور پیمانے یعنی Values ہی تو انسان کو انسان بناتی ہے۔عزیزانِ من! حیوانی سطح زندگی پر Values (اقدار) کا تصور نہیں ہوتا۔ یہ بات بڑے غور سے سننے کی ہے۔

حیوان کے سامنے پیمانے نہیں ہوتے

حیوان کے سامنے Values (اقدار) نہیں ہوتیں۔اس کے سامنے صرف طبعی زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں' Values (اقدار) صرف انسانیت کی سطح پر آتی ہیں۔حیوان کے سامنے جو کھیت آئے گا اسے چر کر اپنا پیٹ بھر لینا ہوتا ہے۔وہ اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا کھیت ہے یا کسی اور کا۔بیل جا رہا ہے وہ کبھی ادھر منہ مارے گا کبھی اُدھر منہ مارے گا اس لیے کہ اس کے سامنے صرف اپنے پیٹ کا بھرنا ہے۔یہ جو امتیاز ہے کہ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے' یہ حرام ہے یہ حلال ہے' یہ میرا ہے یہ دوسرے کا ہے' یہاں نہیں چاہیے وہاں چاہیے۔ یہ انگریزی زبان میں Aught' یہ Value کہلاتی ہے۔یہ صرف انسان کی زندگی پر ہے۔Value کو عربی زبان میں قدر کہتے ہیں۔ اسی کی جمع اقدار آتی ہے۔Value ہی ایک چیز ہے۔

عصمت کا تحفظ' قدر یا پیمانہ یا Value کہلاتی ہے

جنسی تقاضے کی تسکین طبعی تقاضا ہے۔یہ حیوان میں بھی ہوتا ہے۔عصمت کا تحفظ Value (قدر' پیمانہ) کہلاتی ہے۔یہ انسان کی خصوصیت ہے۔یہاں کہا ہے کہ قرآنِ کریم ہم نے نازل کیا۔عزیزانِ من! قرآن ایک لفظ کے اندر انسانی اور حیوانی سطح زندگی کا یہ سارا تصور سمجھا گیا۔کہا کہ اِنَّـآ اَنْـزَلْنٰـهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ [1] (97:1)۔یہاں لیل تو اس لیے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ وحی کا آغاز ٹھیک رات کے وقت ہوا ہو لیکن یہ تو اس سے بھی زیادہ وسیع تر ایک مفہوم لیے ہوئے ہے۔وحی سے پہلے کا زمانہ تاریکیوں کا زمانہ ہوتا ہے۔قرآنِ کریم نے متعدد بار یہ کہا ہے کہ لِتُـخْـرِجَ الـنَّـاسَ مِـنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14:1)۔ہم نے یہ قرآن اس لیے دیا تا کہ تو انسانوں کو تاریکیوں سے روشنی میں لے آئے۔

---

[1] ہم نے اس قرآن کو اُس وقت' جب کہ ساری دنیا وحی کی روشنی سے محروم ہو کر' تیرہ و تار ہو چکی تھی' نئی اقدار اور نئے پیمانے دے کر' نازل کیا۔لہٰذا جس رات میں اس کے نزول کا آغاز ہوا' وہ ایک جہانِ نو کے نمود کی رات تھی (81:17-19; 44:1-4; 2:185;14:1)۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

نزولِ قرآن کے لیے لیل کے لفظ کا استعمال کیوں

عزیزانِ من! لیل تاریکیوں کی نمائندہ ہوتی ہے اور دن روشنی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لیل اس لیے کہا ہے کہ وحی سے پیشتر تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں۔ وہاں تاریکیوں کا یہ ایک ایسا دور تھا کہ جس نے اس وحی کے ذریعے انسانیت کو نئی اقدار سے روشناس کرایا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ قدر یا Value کا تصور ہے جس سے انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ Value (قدر، پیمانہ) نہ ہو تو پھر سارے ہی انسان حیوان کی سطح پر ہوتے ہیں۔ تمام حیوانات کا زاویہ نگاہ ایک ہی ہوتا ہے۔ انسانوں کی زندگی کے اندر Value (قدر، پیمانہ) کو جاننے والے اور نہ جاننے والے کی نگاہوں کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔

قدر کا تقاضا

ہر شے کی باہر کی قیمت تمہارے اندازِ نگاہ (Angle of Vision) پر ہے۔ دفتر کے اندر بیٹھے ہوئے آپ ایک چیز جانتے ہیں کہ اگر ذرا سا میں نے اس فائل کے اندر دو الفاظ یوں لکھ دیئے تو بڑی آسانی سے دس ہزار روپیہ میری جیب میں آجائے گا۔ Value (قدر، پیمانہ) کا تقاضا یہ ہے کہ نہیں، اس سے حق دار کا حق مارا جائے گا، بے انصافی ہوگی، یہ نہیں کرنا چاہیے۔ Value (قدر، پیمانہ) نگاہ میں نہیں ہے، آپ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ دس ہزار روپیہ بڑی چیز ہے۔ اگر Value (قدر، پیمانہ) نگاہ کے اندر ہے تو آپ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ دس ہزار کیا، دس کروڑ روپیہ بھی اس کے مقابلے میں کوئی شے نہیں ہے، مجھے حق پر، انصاف پر رہنا چاہیے، بد دیانتی کا پیسہ جہنم ہے۔ اس پیسے کی Value (قیمت) تو وہی بازار میں ہے۔ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ آپ چوری کا 10 روپے کا نوٹ لے جائیں اور دوکاندار آپ کو پانچ روپے دے۔ اس کی طبعی Value (قیمت، قدر، پیمانہ) تو وہی ہوتی ہے، آپ کی نگاہ کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

اس سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب نگاہ کا زاویہ بدل جائے تو خارجی کائنات خود بخود بدل جاتی ہے اس لیے کہ

قیمت ہر شے ز اندازِ نگہ

جب اندر تبدیلی آتی ہے تو باہر کی ساری دنیا بدل جایا کرتی ہے۔ ساری دنیا من کی دنیا ہے:

میں اب سمجھا یہ دنیا کیا ہے، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر ایک چیز کا بدلا

یہ تبدیلی اندر پیدا ہوتی ہے۔

کائنات میں سب سے زیادہ قیمتی انسانی ذات ہے

انسان اپنی قیمت نہیں جانتا اسی لیے تو جواہرات کو کہتا ہے کہ بڑی قیمتی چیزیں ہیں حالانکہ وہ تو پتھر کے پتھر ہیں انہیں انسان قیمتی کہہ رہا ہے۔ یہاں اقدار کے حوالے سے بات یہ ہو رہی ہے کہ اے ان جواہرات کی قیمت ادا کرنے والے! تو اپنی قیمت پہچان۔ اِنَّـآ اَنۡزَلۡنٰـهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (96:19)۔ یہ قرآن نئی اقدار کا حامل آ گیا' نئی Values لے کر آ گیا' اس نے انسانیت کو نئے پیمانے دے دیئے۔ حیوانی سطح زندگی کو انسانی سطح سے آشنا کرا دیا۔ جب تک وہ سطح زندگی' برادرانِ عزیز! نہ ہو' انسانی سطح زندگی نہیں آتی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے انسان مارا مارا پھرتا ہے۔ وہ جو میں مثال میں کہا کرتا ہوں کہ سڑک پہ بچہ کھڑا ہوا رو رہا ہے' چیخ رہا ہے۔ کیا ہوا؟ میرا گھوڑا مر گیا' اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ دو پیسے کا کھلونا ہوتا ہے۔ وہ رو رہا ہوتا ہے۔ آپ پاس سے جاتے ہوئے اس کی اس بات پہ ہنس رہے ہوتے ہیں۔ اس گھوڑے کے ٹوٹ جانے سے کیا ہوا؟ وہ کیوں رو رہا ہے؟ اس بچے کے نزدیک اس کھلونے کی بڑی قیمت ہے۔ آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ آپ کے نزدیک اس کی قیمت دو پیسے کی ہے۔ نگاہ کے زاویئے سے اس شے کی قیمت بدل گئی۔ برادرانِ عزیز! یہی چیز ہے جسے اقبالؒ (1938-1877) نے کہا ہے کہ

تیری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے

اسی کا وہ شعر بھی ہے کہ

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور جب تُو بدل جائے تو یہ ساری دنیا بدل جاتی ہے۔

اقدار کے بغیر یہ ''تُو'' بدل نہیں سکتی

عزیزانِ من! صرف اقدار' (Values) سے آپ کسی چیز کو زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔ قرآن نے آ کر انسان کی حیوانی سطح زندگی کو انسانیت سے روشناس کرایا' اس کو Values (اقدار) دیں اور کہا کہ اِنَّـآ اَنۡزَلۡنٰـهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (97:1) ہم نے اس قرآن کے نزول کا آغاز اس تاریکی کے دور میں کیا جب ساری دنیا وحی کی روشنی سے محروم ہو کر تیرہ و تار ہو چکی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ تاریکی دو چیزوں میں امتیاز نہیں کیا کرتی۔ اس میں گدھا گھوڑا برابر ہوتا ہے' نشیب و فراز برابر ہوتے ہیں۔ یہاں قرآن نے Values (اقدار)

کے مل جانے والی لیل کے لیے کہا ہے کہ وہ ایک جہانِ نو کے نمود کی رات تھی۔ تاریکیوں کی چادروں میں Value (قدر) اور Value (قدر) کے درمیان امتیاز ہی نہیں ہوسکتا۔ ایسے زمانے میں جہاں انسانوں کی نگاہ کے اندر یہ امتیازات مٹ گئے ہوئے تھے اس نے ایک ایسا ضابطہ قدر دیا' Values (اقدار) کا ایک ضابطہ دیا اور برملا کہا کہ **وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ** (97:2) تجھے خدا کے سوا کون بتائے کہ یہ رات کتنی بڑی قیمتی رات ہے کہ جس میں انسانیت کو یہ Values (اقدار) ملی ہیں۔ کہا کہ **خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ** (97:3) اس ایک رات پہ اُس زمانے کے سینکڑوں ہزاروں مہینے قربان کیے جاسکتے ہیں' جس میں دنیا وحی کی روشنی سے محروم تھی۔ دورِ جاہلیت کے سینکڑوں مہینے اس ایک رات پہ نچھاور کیے جاسکتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اس رات کی ایک ساعت کے اوپر قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جو ہم رمضان کے آخری عشروں میں جاگ کر اُس ایک لمحے کا انتظام کیا کرتے ہیں کہ جس میں بقول ان کے درخت جھکتے ہیں' پانی دودھ ہوتا ہے اور جو دعا مانگی قبول ہوا کرتی ہے' وہ بات کچھ اور تھی مگر بن گئی کچھ اور۔ اس لیلۃ القدر کی ہر ساعت' آپ کے نزدیک' برادرانِ عزیز! وہ ہے جس میں کائنات کی ساری قوتیں خداوندی قوانین کے سامنے جھکی ہوتی ہیں۔ واقعی اس کے اندر یہ صورت ہے کہ انسان کی ہر آرزو پوری ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ان اقدار کا اتباع کرے جو اس لیل نے دی تھیں۔ اس کی ایک ایک ساعت ہزاروں مہینوں پہ بھاری ہوتی ہے' اب سوال یہ ہے کہ **خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ** (97:3) کیا ہوگا؟ یہ جو اقدار مل گئیں تو اس کے بعد اس کائنات میں کیا انقلاب آئے گا؟ کہا کہ عظیم انقلاب آئے گا۔ یہ رات' ایک آنے والی بہارِ نو کے دور کی نمود کا طائرِ پیش رس ہے۔ ایک دور آ رہا ہے۔ اس دور میں کیا ہوگا؟ قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں بات کہہ دی مگر اس تک پہنچنے سے پہلے تصورِ حیات پر نگاہ ڈالیے۔

اقدار کے بغیر قوتوں کا حصول قتل گاہ کو جنم دیتا ہے

ایک Concept of life (تصورِ حیات) تو یہ ہے کہ فطرت کی قوتیں (Forces of Nature) سب کچھ ہیں۔ اگر سائنس ان کو مسخر کر لیتی ہے تو انسان کو اس کا موادل جاتا ہے۔ آپ جتنا زیادہ ان قوتوں کو مسخر کرتے چلے جائیں گے' اتنا ہی زیادہ آپ طاقتور ہوتے چلے جائیں گے۔ وہی قوم دنیا پہ Domination (غلبہ) کرتی چلی جائے گی' اسے ہی شوکت وحشمت نصیب ہوتی چلی جائے گی۔ فطرت کی یہ قوتیں خالص قوتیں ہیں۔ خالص قوتوں کی بنا پر انسان نے اس دنیا کو جس طرح کا جہنم بنا دیا ہے' ہمارا دور اس کی زندہ شہادت ہے۔ آج اس ساری زمین پر کسی سینے میں کوئی دل ایسا نہیں ہے جو اطمینان کی زندگی بسر کرسکتا ہو اس لیے کہ صرف Nature (فطرت) کی قوتیں ہیں جو یہاں Rule (حکمرانی) کر رہی ہیں۔ انسان نے ان خالص قوتوں کو مسخر کر لیا ہے۔ اس تصورِ حیات کے دوسرے Extreme End (دور والے کنارے) پر' دوسرے افراد کا یہ تصور ہے کہ یہ دنیا قابلِ نفرت ہے' یہ مادہ ہے' قید خانہ ہے' بھاگ جانے کی جگہ ہے' اس لیے غاروں میں چلے جاؤ۔ کیا ہوگا؟ کہا کہ روحانیت کی ترقی ہوگی۔

قرآن میں روحانیت کا لفظ تک نہیں

عزیزانِ من! آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ قرآنِ کریم میں روحانیت کا تو کہیں لفظ تک نہیں آیا۔ جسے ہم انسانی روح کہتے ہیں اس کا بھی لفظ نہیں آیا۔ خداوندی روح کا لفظ قرآن میں ضرور آیا ہے۔ عزیزانِ من! روح کا لفظ قرآنِ کریم میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ روح کے معنی تو توانائی کے ہوتے ہیں' قوت کے ہوتے ہیں۔ اِن معنوں کی تفصیل وضاحت' میں ابھی بیان کرتا ہوں۔

انسانی ذات توانائی کا ایک شمہ ہے

قوت کی ایک وہ فارم ہے جسے Energy کہا جاتا ہے جس کے اندر ابھی کسی مادی پیکر کی نمود نہیں ہوئی ہوتی۔ بات ذرا سی گہری ہے اس لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ہاں تو ایک تو توانائی کی وہ شکل ہے جس کے اندر ابھی کوئی مادی پیکر نہیں آیا ہوتا۔ وہ ہے جسے Pure Energy (خالص توانائی) کہا جاتا ہے یعنی خدا کی توانائی۔ اس کے متعلق یہ ہے کہ انسان کو اس کا ایک شمہ دیا' اور اس سے یہ سمجھنے سوچنے والا صاحب اختیار وارادہ بن گیا۔ یہ وہ شے ہے جسے انسانی ذات یا Human Personality (انسانی شخصیت) Self' (ذات) یا Ego (ایغو) کہا جاتا ہے۔ اسے یہ چیز دی۔ اس کے لیے خدا نے روحِ خداوندی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی اعتبار سے خدا نے وحی کو بھی الروح کہا ہے تو یہ وہ قانون ہے جس سے یہ سارا نظامِ کائنات چلتا ہے۔ قانون اپنے اندر بڑی قوت رکھتا ہے۔ قانونِ خداوندی اتنی بڑی قوت رکھتا ہے کہ جس سے یہ سارا نظامِ کائنات چلتا ہے۔ قرآن نے وحی کو بھی الروح کہا ہے اور وحی کو لانے والی' وحی کی حامل ایجنسی کو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا ایجنسی ہے۔ اسے بھی قرآنِ کریم نے روح الامین کہا ہے۔ یہاں اس انقلابِ عظیم کے لیے قرآن نے ملائکہ اور الروح کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس سے مراد وحی خداوندی ہے نہ کہ وہ تصور حیات جسے پہلے زمانے میں Spirtualism (روحانیت) کہا کرتے تھے۔

مادی قوت اور وحی دونوں لازم وملزوم ہیں اور انہیں ملانا زندگی کا منتہیٰ

ایک تصور حیات خالص مادی ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیجیے۔ اس میں منتہائے زندگی یہی ہے۔ دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ ان قوتوں سے' فطرت سے' کائنات سے' مادے سے' نفرت کیجیے' ان سے دُور رہیے' ان سے Abnegation (ترک) کیجیے' تو روحانی قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں کا دوسرا Extreme (دور کا) کنارا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ رکھنے سے ان دونوں کی زندگی باطل ہو جاتی ہے۔ ایک کا نتیجہ اگر سرسام ہوتا ہے تو دوسرے کا نتیجہ جذام ہو جاتا ہے' فالج ہوتا ہے۔ انسانیت سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ یہ جو اقدار آتی ہیں یہ نیا دور ہے جس میں زندگی کے نئے پیمانے (Measures) ملے ہیں۔ اس میں کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (97:4)۔ ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے' ایک طرف

سے فطرت کی قوتیں اور دوسری طرف سے وحی خداوندی، ضابطہ قوانین خداوندی یعنی یہ دونوں طرف سے یکساں طور پہ یک لخت، ایک دوسرے کے ساتھ نازل ہوں گے یعنی کائناتی قوتیں اور وحی خداوندی ہم آہنگ ہوتی چلی جائیں گی۔ یہاں فطرت کی قوتوں کا وحی خداوندی کے ساتھ امتزاج ہوگا اور جونہی ان کا یہ امتزاج ہوگا، دونوں Blend ہوں گے، دونوں ملیں گے، تو ان کا نتیجہ ہوگا: مِنْ كُلِّ اَمْرٍ o سَلٰمٌ (97:4-5) زندگی کے ہر گوشے میں سلامتی ہوجائے گی۔ اِس طرح سلامتی ہوگی۔ فطرت کی قوتیں وحی خداوندی کے تابع یا ان کے امتزاج کے ساتھ چلیں گی۔ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ o سَلٰمٌ (97:4-5) زندگی کے ہر گوشے کے اندر سلامتی ہی سلامتی ہوجائے گی۔ اس کا حل تنزل ہے، تنزیل ہے، تدریج ہے۔ لفظ کے اندر تدریج ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ عربی زبان کے اعجاز ہیں۔ تدریجاً Gradually ایسا ہوتا چلا جائے گا: هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (97:5) تا آنکہ رات کی ساری تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور مشرق سے سورج نمودار ہو جائے گا۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) اور زمین تیرے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہ پوری کائنات فطرت کی قوتوں اور روحِ خداوندی کے امتزاج سے مطلعِ انوار بن جائے گی۔ یہ منتہی ہے اس نظام کا جو قرآن کی رو سے آئے گا۔ اور یہ ہے لیلۃ القدر یعنی وہ رات جو ایک آنے والے بہارِ نو کے دور (Period) کا طائر پیش رس ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القدر یہاں ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ البینۃ لیتے ہیں۔

سورۃ البینۃ (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیز برادران! سورۃ البینۃ شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 98ویں سورۃ ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد

سوال یہ ہے کہ انسان چاہتا کیا ہے؟ جواب تھا کہ آزادی چاہتا ہے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا تھا کہ **وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ** (7:157) یہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت، جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، یہ ان زنجیروں کو توڑ دے اور یہ جن بوجھل سلوں کے نیچے دبی ہوئی ہے یہ ان سلوں کو سروں سے اتار دے۔ یہ انسانیت کو صحیح آزادی عطا کرنے کے لیے آیا تھا۔

اہل کتاب میں اور ہم میں فرق کیا ہے؟

اس سورۃ کی ابتدا ان آیات سے ہوتی ہے کہ **لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ**

حَتّٰـی تَـاْتِیَهُـمُ الْبَیِّـنَةُ ❶ (98:1)۔ یہ جو اہل کتاب ہیں ہم نے کسی زمانے میں انہیں بھی کتاب دی تھی لیکن انہوں نے اس سے کفر اختیار کرلیا' یہ بھی ایمان پہ نہیں رہے اس لیے کہ ان کی کتاب ہی اصلی شکل میں نہیں رہی تھی۔ جہاں رہی تھی اسے بھی انہوں نے اپنے ہاں کی فقہ کے اندر تبدیل کر کے کتاب سے انکار کر دیا ہوا تھا۔ اس لیے قرآن نے اہل کتاب کو کہیں مشرکین کہا ہے' کہیں کفار کہا ہے۔ یہ مدعی ہیں کہ ان کے پاس کتاب ہے مگر عملاً کتاب کا انکار ہے اس لیے قرآن نے اہل کتاب کو کافر کہا۔ یہ قرآن کی عجیب ترکیب ہے: کتاب رکھنے کی مدعی مگر عملاً اس کتاب کے منکر۔ یہ کن کا ذکر ہے' برادرانِ عزیز! یہ کہنے کے لیے بہت تذبذب اور تردد ہوگا کہ یہ ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ ہم تو اہل کتاب کی سطح پر تھے' فرق اتنا یہ ہے کہ ان کی کتاب صحیح معنی میں باقی نہیں رہی تھی' ہماری کتاب تو باقی رہی ہے لیکن کتاب محرف ہو یا کتاب اپنی اصل شکل میں ہو' اگر اس کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو دونوں یکساں ہو جاتی ہیں یہی ہم نے کیا۔ ایمان تو اس کتاب پہ عمل کرنے کا نام ہے اور انکار اس کے خلاف چلنے کا نام' خواہ ہر روز صبح اس کی تلاوت ہی کیوں نہ ہو' خواہ ہر مہینے کروڑوں مسجدوں میں اس کی تلاوت کیوں نہ ہو۔ اہل کتاب میں سے کافر ہوئے' اور یہ جو مشرکین مکہ ہیں کہ جو اس کے داعی نہیں ہیں کہ ان کے پاس ہدایت آئی تھی' ان میں سے کوئی بھی آزادی حاصل نہیں کر سکتا تھا تاوقتیکہ ان کی طرف یہ بصیرت پر مبنی کھلی ہوئی تعلیم نہ آتی۔ اس لیے کہا کہ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰـهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (98:2)۔ خدا کی طرف سے ایک پیغامبر آیا' جو ان کے سامنے صحائف پیش کرتا ہے۔ یہ صحائف بڑے ہی پاکیزہ ہیں اور تحریف سے دور ہیں' کذب سے دور ہیں' مغالطوں سے دور ہیں۔ اِن صحائف (قرآنی آیات وسور) میں پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے۔ وہ یہ صحائف یعنی قرآنی آیات وسور ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہاں اور دو لفظوں میں اس صحیفہ قرآنی کی جامع تعریف کی ہے۔ کہا ہے کہ فِیْهَـا كُتُبٌ قَیِّـمَةٌ ❷ (98:3)۔ اس کے اندر مستقل اقدار وقوانین زندگی درج ہیں۔ عربی میں كُتُبٌ Laws کو کہتے ہیں اور قَیِّـمَةٌ غیر متبدل کو' جو اپنے مقام پر قائم ہوں' جن کو کوئی اکھیڑ نہ سکے یعنی وہ Established ہوں' ثبت ومحکم' قائم ودائم ہوں۔

---

❶ یہ لوگ جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں' لیکن درحقیقت خدا کے دین کے منکر (اور اپنے خود ساختہ مذہب کے پیرو) ہیں۔ اور یہ مشرکین عرب جو کسی آسمانی کتاب کے داعی ہی نہیں' ان زنجیروں سے کبھی آزادی حاصل نہیں کر سکتے تھے جن میں یہ جکڑے ہوئے چلے آرہے تھے' جب تک ان کی طرف واضح طور پر وحی خداوندی نہ آجاتی۔ (یہ وحی اب قرآن کی شکل میں آگئی ہے اور اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ انہیں ان زنجیروں سے آزاد کرا دے جن میں انہوں نے اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔) (7:157)۔

❷ اس قرآن کو جس میں خدا کے غیر متبدل قوانین اور محکم اور مستقل اقدارِ زندگی درج ہیں۔ (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

لاریب کتاب کو ماننے والے فرقوں میں نہیں بٹ سکتے

اس کتاب یعنی اس قرآن کے اندر اس قسم کے قوانین ہیں کہ ان کے ذریعے انہیں آزادی حاصل ہو جائے' ان کی خودساختہ زنجیریں ٹوٹ جائیں' ان کے سلاطین' ان کے تمام بڑے بڑے مستبد قوتوں والے' ان تمام کی حکمرانیوں کے جال ٹوٹ جائیں اور یہ اس سے آزاد ہو جائیں۔ یہ اس مقصد کے لیے آیا۔ اس کے ماننے والوں نے کیا کیا؟ قرآنِ کریم نے ان اہل کتاب کی حالت یہ بتائی کہ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآئَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (98:4) ایسی واضح تعلیم آ جانے کے بعد ان اہل کتاب نے تفرقہ شروع کر دیا۔ بجائے اس کے کہ یہ ایسے واضح حقائق کے آ جانے کے بعد قرآنِ کریم پر ایمان لا کر وحدت انسانیہ کی راہیں ہموار کرتے' انہوں نے اس کے الٹ تفرقہ کی راہ اختیار کر لی حالانکہ ایک کتاب کے ماننے والے' ایک کتاب پر عمل کرنے والے کبھی فرقوں میں بٹ ہی نہیں سکتے۔ قرآن نے اسی لیے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے کہ جو دین میں فرقہ پیدا کر لیں تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اہل کتاب کے خلاف جرمِ عظیم

یہاں اہل کتاب کے خلاف جرمِ عظیم یہ عائد کیا گیا کہ اس قدر واضح تعلیم آ جانے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ فرقوں کے اندر بٹ گئے۔ انہوں نے اس جماعت کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ یعنی قرآن کی طرف دعوت دینے والوں کی مخالفت شروع کر دی۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا انہیں کسی نے کوئی گالی دی تھی' کوئی ناجائز بات کہی تھی' کسی غلط طرف آنے کے لیے کہا تھا؟ ان سے کہا تھا کہ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (98:5) اتنی سی بات کہی تھی کہ بھئی! اطاعت و حکمرانی اور محکومت صرف ایک خدا کے قانون کی ہونی چاہیے' ان انسانوں کی نہیں ہونی چاہیے۔ اتنا ہی کہا تھا صاحب! ان سے کون سی بری بات کہہ دی تھی کہ ان کی طبع نازک پہ اتنا ناگوار گزرا' کہ اختلاف پہ اتر آئے' تفرقے پہ اتر آئے' الگ ہو کے بیٹھ گئے' مخالفتیں شروع کر دیں۔ کس بات کی مخالفت شروع کر دی؟ یہ کہا تھا کہ انسانوں کے چوکھٹوں پر سجدہ ریزیاں نہ کیا کرو۔ اگر انسان کا سر کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکتا ہے تو یہ وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے۔

کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے

کسی انسان کے سامنے جھکتا ہے تو اپنے ہم عصر کے سامنے جھکتا ہے۔ جھکنا صرف قانونِ خداوندی کے سامنے چاہیے۔ کہا کہ ان سے یہ بات کہی گئی تھی اور ان کی طرف سے ردِعمل یہ ہو رہا ہے۔ کہا یہ تھا کہ یہ چیز یقین کی حیثیت سے مانو اور حنفاء بنو یعنی زندگی میں یکسو ہو کر چلو' ایک نصب العین کو سامنے رکھ کر چلو۔

فرقوں کا نصب العین مختلف ہوتا ہے

مختلف فرقوں کے تو نصب العین ہی مختلف ہو جاتے ہیں' عزیزانِ من! فٹ بال کی ٹیم میں ہر کھلاڑی اپنے سامنے الگ الگ گول رکھ لے تو آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس ٹیم کی کیفیت کیا ہوگی۔ حنفاء کہتے ہیں کہ ساری ٹیم کے سامنے ایک گول ہو اور ہر ایک کا قدم اس کی طرف اٹھے۔ یہ حنفاء کیسے ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ بات بڑی آسان ہے: وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ (98:5) ایسا نظام قائم کرو جس میں ہر فرد قوانین خداوندی کے پیچھے چلے اور ان کا مجموعی حیثیت سے فریضہ یہ ہو کہ انسانیت کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچاتے چلے جائیں۔ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (98:5) بس یہی وہ محکم دین ہے۔ یہی وہ محکم نظام زندگی ہے جو انسانیت کے قیام کا ضامن ہو سکتا ہے' جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ بس بات اتنی چھوٹی سی ہے۔

تفصیل معنی ٔ غمِ الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

تفصیل میں جائیے تو تفسیروں پہ تفسیریں لکھ دیجیے' اجمال میں جائیے تو دو الفاظ میں بات ختم ہو جاتی ہے۔

قرآنی تعلیم کا ماحصل

ایسا معاشرہ جس میں ہر فرد قوانین خداوندی کا اتباع کرے اور جس کا مجموعی نصب العین انسانیت کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا ہو بس یہی وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (98:5) ہے' محکم نظام زندگی ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ [1] (98:6)۔

خدا کی ساری خدائی میں بدترین مخلوق

عزیزانِ من! یہاں (98:6) میں کہا ہے کہ اور وہ لوگ جو کتاب کے مدعی ہونے کے باوجود' اس سے انکار کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ کہ جو سرے سے کسی کتاب کو مانتے ہی نہیں ہیں' یہ سب کے سب جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا سارا کیا کرایا غارت ہو جاتا ہے اور یہ شر البریۃ ہیں یعنی ساری خدا کی مخلوق میں سے بدترین ہیں۔ اگر تم نے دیکھنے ہوں تو وہ یہ لوگ ہوتے ہیں۔ ایک جگہ تو قرآن

---

[1] اہل کتاب نے اس باب میں مختلف راستے اختیار کر لیے۔ بعض نے اس دین کو قبول کر لیا' اور دوسروں نے اس سے انکار کر دیا۔ یہی صورت مشرکین نے بھی اختیار کی۔ سو ان میں سے جنہوں نے اس نظام کی صداقت سے انکار کیا' ان کا انجام ایسی تباہی ہوگا جس میں سب کچھ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا۔ یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (یعنی اس تباہی کا سلسلہ' مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا)۔ یہ زندگی بدترین خلائق کی زندگی ہوگی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نے شــر الدواب (8:55) کہا تھا یہاں شَـرُّ الْبَرِيَّةِ (98:6) کہا ہے: مخلوقات میں سے بدترین۔ یہ تو قرآن نے وہاں (8:55) ان سے کہا تھا کہ وہ دل ودماغ رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے۔ وہاں بھی انہیں کہا ہے کہ یہ اہل جہنم ہوتے ہیں' یہاں بھی انہیں اہل جہنم کہا گیا۔

اس کے مقابلے میں بہترین مخلوق

اِنَّ الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ [1] (98:7)۔ یہاں خیر البریۃ آیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے برعکس زندگی کی ان صداقتوں پر یقین رکھنے والوں' اس پروگرام پہ عمل کرنے والوں' جو ان کی صلاحیتوں کو بھی نشوونما دیں اور عالم انسانیت میں بھی اصلاح کرتے چلے جائیں' کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خیر البریۃ ہیں یعنی یہی ہیں وہ جو تمام مخلوق سے بہترین چنے ہوئے لوگ ہیں۔ جَـزَآؤُهُـمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (98:8) یہ وہ لوگ ہیں جن کے اس یقین محکم اور عمل پیہم کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں نشوونما دینے والے کی طرف سے' زندگی کی شادابیاں سرسبزیاں اس دنیا کے اندر بھی اور آنے والی زندگی کے اندر بھی ملتی ہیں۔ یہ ہمیشہ رہنے والی شادابیاں ہیں یعنی جب تک یہ اس پروگرام پہ عمل کیے چلے جائیں گے اس گلستان کی بہار پہ کبھی خزاں نہ آئے گی۔ اس سے ہوگا کیا؟ کہا کہ رَضِـيَ الـلّٰـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (98:8) بات اتنی سی ہوئی کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ کرلیا اور ان قوانین نے انہیں اپنے ساتھ ہم آہنگ کرلیا یعنی ان قوانین کے نتائج نے ان کے اعمال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلیا۔ یہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتنا جامع ٹکڑا ہے یعنی انہوں نے قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرلی تو ان کے اعمال کے نتائج ان وعدوں کے مطابق مرتب ہوگئے جو ان کے خدا نے ان سے کیے تھے۔ اور یہ سب اس لیے ہوا کہ ذٰلِكَ لِـمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ (98:8) اس کے لیے ایک ہی شرط تھی جو انہوں نے پوری کی تھی کہ انہیں اس بات کا خطرہ' خوف رہتا تھا کہ اگر ان قوانین کے خلاف چلے تو اس کا نتیجہ کتنی بڑی تباہی ہوگا۔ یہ احساس بنیاد ہے' عزیزانِ من! تعمیری کاموں کے لیے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان تخریبی امور کا نتیجہ کس قدر تباہی والا ہوگا اور یہ ہے وہ حصہ جسے آپ لا الٰہ کہتے ہیں یعنی پہلا حصہ ہے: تخریب کا' ہر باطل کا' ہر تخریبی قوت سے انکار اور اس کے بعد یہ ہے خَشِیَ رَبَّهٗ (98:8)

---

[1] جو لوگ اسلام کے نظام پر یقین رکھتے ہیں اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں' ان کی زندگی بہترین خلائق کی زندگی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سب سے بڑا نفسیاتی کمپلیکس

عزیزانِ من! نفسیاتی کمپلیکس وہ ہے جسے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ڈرتے ہیں۔ ڈر کا یہ تصور نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا کمپلیکس ہوتا ہے۔ آپ ڈر کے زور پر کوئی چیز کرتے ہیں تو وہ انسان کے قلب ونگاہ میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرتا۔ اس میں تعمیری چیز نہیں ہوسکتی۔ اس لفظ خشی کے معنی ہوتے ہیں ''زندگی کے پودے کا مرجھا جانا۔'' اب یہاں یہ کہا ہے کہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا کہ اگر ہم نے ان قوانین کا اتباع نہ کیا تو ہماری حیات کی کھیتی پژمردہ ہوجائے گی مرجھا جائے گی۔ اس وجہ سے وہ اِن قوانین خداوندی کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ (98:8)۔ اور جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب اس لیے ہوا کہ یہ لوگ بڑے عاقبت اندیش تھے۔ انہیں قوی احساس تھا کہ اگر انہوں نے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر نہ کی تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

عزیزانِ من! سورۃ البینۃ یہاں ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الزلزال لیتے ہیں۔

سورة الزلزال (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ الزلزال شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی ۹۹ ویں سورۃ ہے۔ آج بارش کی بوندیں بھی شروع ہو گئی ہیں اور اس سورۃ میں اب آنے والے انقلاب کی بات شروع ہو رہی ہے کہ جب وہ آنے والا انقلاب' بہت ہی بڑا انقلاب' آئے گا تو انسان کا موجودہ غلط تمدنی نظام تہہ وبالا ہو جائے گا۔ اُس آنے والے انقلاب عظیم کے پاؤں کی آہٹ تو گویا ہمارے کانوں میں آ رہی ہے' قرآنِ کریم نے کہا کہ اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا o وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا o وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ❶ (99:1-3)۔ کیا انداز ہے کہنے کا! اس غلط تمدن کا' اس غلط معاشرے کا' نظام تہ وبالا ہو کر رہے' تہ وبالا ہونے ہی والا ہے بلکہ یہ تہ وبالا ہو رہا ہے۔ یہ انقلاب کیا ہوگا؟ اس کے لیے ایک لفظ آیا ہے کہ یہ اتنی اتنی مستبد قوتیں' دھرتی کے سینے پہ کوہ گراں بن کر بیٹھی ہوئی ہیں' یہ نکال دی جائیں گی۔ سامعین! اس سے جامع انداز اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ زمین کی چھاتی پر سنگ گراں بن کر بیٹھنے والی مستبد قوتیں اتار دی جائیں گی نکال دی جائیں گی۔ یہ ہے وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ (99:2) اور اس وقت کا انسان' جو تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا کہ یہ اتنے بڑے بڑے گرانڈیل' کوہ گراں بار' یہ بھی ہٹا دیئے جائیں گے' یہ بھی نکال دیے جائیں: وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا (99:3) اور وہ انسان جس کے سامنے وحی کی یہ روشنیاں نہیں تھیں' وہ دانتوں میں انگلیاں دبائے یہ کہے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ جی ہاں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بلکہ یوں کہیے کہ وہ کہے گا کہ اس زمین کو کیا ہو گیا؟ یہ ہو کیا گیا اس کو؟ اچھے بھلے ہم اس کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے' ہمیں Support

---

❶ جب وہ انقلابِ عظیم آئے گا جس میں انسان کا موجودہ غلط تمدنی نظام تہ وبالا ہو جائے گا۔ وہ مستبد قوتیں جو اس وقت زمین کی چھاتی پر سنگ گراں بن کر بیٹھی ہیں' نکال باہر کی جائیں گی اور وہ انسان' جس کے تصور میں اس قسم کا انقلاب نہیں آ سکتا وہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ ایسے صاحب قوت وثروت مستبد لوگوں اور قوموں کا ایسا حشر ہو سکتا ہے' حیران وششدر رہ جائے گا کہ ایسا تغیر کس طرح واقع ہو گیا! (مفہوم القرآن۔ پرویز)

(مدد) کر رہی تھی۔اب یہ کیا ہوا ہے۔

ارض کا لفظ معاشی نظام کے لیے ہے

برادرانِ عزیز! قرآن کی اصطلاح میں الارض تو معاشی نظامِ انسانی کو کہتے ہیں یہ انسان کا معاشی نظام ہے جسے یہ ظاہر کرتی ہے اور اس کے مدمقابل السماء کا لفظ آتا ہے۔یہ السماء اقدارِ خداوندی ہیں۔یہ الارض اپنے سینے پر بیٹھنے والے ان بوجھل پتھروں کو اٹھا کر پھینک دے گی اور اس وقت یہ انسان جو نشے میں اس قدر بدمست ہے کہ اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا' محوِ حیرت ہوگا' دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے کہے گا کہ اس زمین کو کیا ہوگیا ہے؟ اور یہ ہو کیا رہا ہے؟ اس وقت کہا جائے گا کہ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا [1] (99:4)۔

آج تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اقوامِ ماضی کی سرگزشتیں زندہ حقیقت بن کر سامنے آجائیں گی۔آدمی کی جنت کا وہ ایک دور (Period) ہے جس کے اندر کیفیت یہ تھی کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) جہاں جسے بھوک لگتی تھی' جس مقام پہ ہوتا تھا' جہاں ہوتا تھا' وہاں سے اس کو پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔اب زمین اس دور کو دہرائے گی' تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے' اپنی ان خبروں کو پیش کر رہی ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا یہ محض ایک Chance (اتفاق) ہے؟ کیا ہیگل (Hegal: 1770-1831) یا مارکس (Marx: 1818-1883) کا تصور ایک Cyclic Order (دوری گردش) ہے؟ گردش دولابی ہے کہ پہلے ایک نظام تھا' پھر ایک دوسرا آتا ہے' اس کے بعد پھر اس کا الٹ آجاتا ہے یعنی پہلے مثلاً تیس ہوتا ہے پھر انتیس ہوتا ہے۔کیا ایک چکر کی طرح' یہ کچھ ہو رہا ہے؟ اس طرح تو نہیں ہو رہا۔یہ تو ایک خاص نظام کے تابع ایسا ہوتا ہے کیونکہ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (99:5) یہ اس لیے ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔یوں ان کا نظامِ باطل الٹ رہا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس کے اندر ہوگا کیا؟ اس نئے نظام کی خصوصیت کبریٰ کیا ہے؟

باطل نظام میں معاشرے کی کیفیت

سورۃ یٰسٓ کے اندر ایک جگہ کہا کہ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ [2] (36:59)۔ہوتا یہ ہے کہ باطل کے نظام کے اندر

---

[1] اُس وقت تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں' زندہ حقیقت بن کر سامنے آجائیں گی۔

[2] اس زندگی میں معاشرہ مخلوط نہیں رہے گا۔مجرم اور شریف الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔کوئی مجرم شریف بن کر دوسروں کو دھوکا نہیں دے سکے گا نہ ہی اہل جہنم جنت کی آسائشوں میں شریک ہوسکیں گے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز 2-1)

شریف انسان، جرائم کی ذہنیت اور پیشہ رکھنے والے انسان، ملے جلے رہتے ہیں۔ کسی کی پیشانی پہ لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کی نیت کیا ہے اس لیے تو انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ اگر کہیں یہ گروہ الگ الگ ہوں تو آدمی دھوکا نہیں کھاتا۔ ایک دفعہ جب کوئی قیدی قید خانے سے باہر آ جاتا ہے، میں ذرا کچھ پچھلے زمانے کی بات کر رہا ہوں، آج کی نہیں، تو اس کے بعد، ساری عمر کے لیے اس کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا تھا کہ یہ قید کاٹ کر آیا ہے، کوئی اس کا اعتماد نہیں کرتا تھا، اس پہ بھروسہ نہیں ہوتا تھا، کوئی اس سے دھوکا نہیں کھاتا تھا۔ آج تو بات ہی کچھ اور ہوگئی۔ لیکن حق کے دور کے اندر یہ ہوگا کہ **یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا** [1] (99:6)۔ انسان گروہوں کے اندر بٹ جائیں گے، شریف اور بدمعاش کے اندر، دیانت دار اور بددیانت کے اندر، مجرم اور معصوم کے اندر، امتیاز ہو جائے گا۔ آج کی تو کیفیت یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرتا ہے وہ اس کے سامنے نہیں آتا، وہ اس کو چھپا سکتا ہے۔ انفرادی طور پر اگر کسی اور نے نہیں دیکھا تو اپنے سینے کے اندر چھپا لیتا ہے۔ اجتماعی طور پر ہزار حربے اختیار کر لیتا ہے کہ اس کا جرم چھپا رہے یا کسی اور کو پتہ نہ لگ سکے لیکن یہ وہ دور آئے گا جب **لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ** (99:6) ہر انسان، ہر گروہ، کے اعمال اس کے سامنے آ جائیں گے۔ اس طرح سے سامنے آئیں گے کہ **فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ** (99:7-8) ایک ذرہ کے برابر، ایٹم کے برابر، بھی حسن عمل ہے تو وہ بھی نمایاں طور پہ سامنے آ جائے گا اور ایک ذرہ کے برابر، اگر شر کا امر ہے، تو وہ بھی سامنے آ جائے گا۔ قرآن یہاں "خیر" اور "شر" لایا ہے۔ ایک ذرہ کے برابر بھی اگر شر کا عمل ہے تو وہ بھی نمایاں ہو کر سامنے آ جائے گا۔ یہ وہ نظام تمدن ہوگا جس کے اندر عمل کا ذرہ ذرہ سامنے، میزانوں میں، تل جائے گا۔ کوئی کسی دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ جی نہیں، انسان اپنے آپ کو بھی دھوکا نہیں دے سکے گا۔ کہا کہ یہ وہ زلزالِ ارضی ہے، وہ کپکپا دینے والا، زلزلہ انگیز، تحیر انگیز انقلاب ہے، جو اس دور میں آنے والا ہے۔

عزیزانِ من! یہ سب کچھ اس دنیا میں بھی ہوگا جب قرآنی نظام قائم ہوگا جیسا کہ نبی اکرم کے زمانے میں ہوا تھا اور اس کے بعد پھر ویسا ہی ہوگا۔ اور آخرت میں بھی، جب انسان کا ہر عمل، نتیجہ بن کر سامنے آ جائے گا۔

برادرانِ عزیز! سورۃ الزلزال یہاں ختم ہوئی۔ اب ہم اگلی سورۃ العٰدیٰت لیتے ہیں۔

---

[1] اُس وقت ایک نئے نظامِ عدل کی بساط بچھے گی۔ مجرم اور شریف انسان الگ الگ ہو جائیں گے۔ (36:59) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سورۃ العٰدیٰت (آیات 1 تا اختتام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! اب سورۃ العٰدیٰت شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی ۱۰۰ اویں سورۃ ہے۔ مجھے احساس ہے کہ گو وقت تو تھوڑا ہے مگر قدرت میری مدد کر رہی ہے۔ ''نٹھ کے کتھے جاؤ گے' باہر تے مینہ وسدا پیا اے۔''[1] آج یہ کیفیت ہے۔

سورۃ العٰدیٰت کی ابتدائی آیات کا مروجہ ترجمہ

سورۃ العٰدیٰت کی پہلی پانچ آیات یوں ہیں: **وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا o فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا o فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا o فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا o فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا** (100:1-5) سب کچھ کیوں ہے؟ اس لیے کہ **اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ** (100:6) عزیزانِ من! یہ سورۃ العٰدیٰت کی ابتدائی آیات ہیں۔ ان کے متعلق ہمارے ہاں عام طور پہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ مجاہدین کے متعلق ہیں۔ اس زمانے میں رسالے تھے اور گھڑ سوار پر مشتمل بہت بڑا لشکر ہوا کرتا تھا۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: گواہ ہیں' اس بات کے اوپر' جو آگے کہی گئی ہے کہ وہ سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے جن کے نتھنوں سے بڑی تیز ہوا نکل رہی ہے' تیزی سے دوڑنے والے وہ گھوڑے کہ جن کے سم جب کنکریوں اور پتھروں پہ پڑتے ہیں تو چنگاریاں ابھرتی ہیں۔ وہ کہ جب لوگ ابھی علی الصبح نیند میں سو رہے ہوتے ہیں اس وقت یہ آ کر حملہ کرتے ہیں' گرد و غبار اڑاتے ہیں' وحشت انگیز سماں پیدا کرتے ہیں اور پھر ان کے اندر گھس جاتے ہیں۔''

---

[1] آپ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ باہر تو بارش ہو رہی ہے۔

اقدار کے تحت جتنی بڑی قربانی' اتنا ہی بڑا انسان کا درجہ

عام طور پہ یہ کہا گیا ہے کہ یہاں خدا نے مجاہدین کے گھوڑوں کو شہادت میں پیش کیا ہے۔قرآنِ کریم کا جو انداز ہے اس کے تحت یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ یہ بڑی چیز ہے۔قرآن نے مجاہد کے تو ہر قدم کی قسم کھائی ہے۔ برادرانِ عزیز! انسانیت کے اندر بلند ترین درجہ یہ ہے اور وہ اس لیے ہے کہ قدر یعنی Value کے لیے انسان جتنی بڑی قربانی دیتا ہے اتنا ہی بڑا اس کا درجہ ہوتا ہے۔ جان انسان کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ جب کسی Value (قدر) کے تحفظ کے لیے انسان جان دے دیتا ہے تو اس سے بڑا مقام کسی کا نہیں ہوسکتا ہے۔

ان آیات کے بعد جو اگلی آیت ہے' جس کے لیے قرآن نے ان چیزوں کو شہادت قرار دیا ہے' اس سے ذہن دوسری طرف جاتا ہے اور میں نے اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ ❶ یہ اس زمانے کی لوٹ مار کا ذکر ہے۔عربوں کے ہاں تو یہ چیز عام تھی۔ کہا یہ ہے کہ ان لوٹ مار کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ رات پڑتی ہے' لوگ اپنے اپنے خیموں میں' اپنے اپنے مکانوں میں' آرام سے سو رہے ہوتے ہیں' قافلے اطمینان سے محوِ خواب ہوتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ڈاکا ڈالنے کے لیے' راہزنیاں کرنے کے لیے' قزاقوں کی طرح سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے' راتوں کے اندھیروں میں' تاریکیوں کے اندر' گرد و غبار اڑاتے ہوئے' آجاتے ہیں اور یہاں آ کر لوٹ مار

---

❶ اس لحاظ سے ان (1 تا 5) آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ "ذرا اِن لوٹ مار کرنے والے ڈاکوؤں اور قزاقوں کو دیکھو۔لوگ اطمینان سے گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں کہ یہ اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے' ان پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ (100:1)۔ یہ گھوڑوں کو اس تیزی سے دوڑاتے ہیں کہ ان کے سموں سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ (100:2) معلوم نہیں یہ کتنی دور سے آتے ہیں لیکن عین صبح کے وقت' جب سونے والوں پر نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے' یہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے لیے آپہنچتے ہیں (100:3)۔ اور ایسا گرد و غبار اڑاتے ہیں کہ اس سے وحشت طاری ہو جائے اور کوئی چیز صاف دکھائی نہ دے (100:4)۔ اور اس طرح ان سونے والوں کی جمعیت کے اندر گھس کر طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نوٹ: اس سورۃ کی پہلی پانچ آیات میں' قرآنِ کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ ان میں کن جماعتوں کا ذکر ہے۔ ہم نے آیت نمبر 6 اور اس کے بعد کی آیات کے مضمون کی نسبت سے' اِن سے مراد وہ جماعتیں لی ہیں جو لوٹ مار کرنے کے لیے یورش کیا کرتی تھیں۔ اور یہ جاہلیت عرب کے معاشرے کا عام معمول تھا۔ لیکن اگر ان سے مراد مجاہدین کی جماعتیں ہوں جو مخالفین کی سرکوبی کے لیے یورشیں کرتی تھیں تو یہ آیات ان کی تگ و تاز کی تحسین کے لیے ہوں گی۔ اور آیاتِ مابعد سے ان کا ربط یوں ہوگا کہ انہیں یہ اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ انسان کو اگر علیٰ حالہ بے باک چھوڑ دیا جائے تو وہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے جس سے کمزور لوگ نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس غلط روش سے روکنے کے لیے آخری صورت یہی ہے کہ جہاد (قتال) کے ذریعے ان کی قوت کو توڑا جائے۔ مجاہدین کی جماعتیں' اور ان کے وفا کیش گھوڑے اسی مقصد کے لیے یورشیں کرتے اور اپنی جان تک لڑا دیتے تھے۔ گھوڑے "اپنے رزق دینے والے آقا" کے اس قدر وفا شعار اور انسان اس قدر ناشکر گزار! یا للعجب!! (حوالہ پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' (سال اشاعت درج نہیں ہے' ص ص۔ 1475-1474)۔

کرتے ہیں۔ یہ سب کس لیے کرتے ہیں؟ اس بات کی' انسانوں کی لوٹ مار کی یہ عادت کس بات کی شہادت دیتی ہے؟ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ ❶ (100:6)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب قرآن میں صرف الانسان کا لفظ آتا ہے تو اس کے معنی وہ انسان ہوتا ہے جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے' وحی کی روشنی میں نہیں چلتا مگر جب وہ وحی کی روشنی میں چلتا ہے تو انسانیت کی زندگی ہوتی ہے اور جب اس روشنی کے خلاف اپنے ہی جذبات کو اپنا الٰہ اور معبود بنالیتا ہے تو وہ حیوانی سطح زندگی کہلاتی ہے۔ یہاں وہی حیوانی سطح زندگی ہے۔ کہا ہے کہ انسان کو وحی کی راہنمائی نہ ملے' وہ اس کے تابع نہ چلے تو پھر اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے نشو ونما دینے والے کے خلاف زندگی گزارتا ہے۔ اب یہاں ''کنود'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ بڑا جامع لفظ ہے۔ دنیا میں ڈاکے کیوں ڈالے جاتے ہیں؟ دوسروں کو کیوں لوٹا جاتا ہے؟ یہ صاحب قوت سب کچھ دوسروں کا چھین کر کیوں لے جاتے ہیں؟ آج یہ بڑے ہی اہم سوال ہیں۔

یہاں بات تو صرف ان ڈاکوؤں کی' ان گھوڑے والوں کی کہی گئی ہے لیکن یہ تو صرف پیکر ہیں' روح اور ذہنیت تو ہر حال میں وہی کام کرتی ہے' خواہ وہ کسی دفتر کی میز پہ بیٹھا ہوا بظاہر بڑا ہی ناتواں سا نظر آئے' اس کے ہاتھ میں ایک قلم ہو اور اس کے سامنے کاغذ کا ٹکڑا ہو' وہ ہزار ڈاکوؤں سے بڑا ڈاکا ڈال سکتا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ انسان دوسروں کا کیوں چھین کر لے جاتا ہے؟ اس لیے کہ یہ خدا کے سامانِ ربوبیت کے خلاف ''کنود'' واقع ہوا ہے۔ ''کنود'' کہتے ہیں ''تنہا خور کو' جو سب کچھ اکیلا ہی کھا جائے۔'' کنود کہتے ہیں ''اسے جو اپنے غلاموں سے دن بھر کام لے اور شام کو ان کو کچھ دینے کی بجائے الٹا ان کو پیٹے۔'' کنود کہتے ہیں ''اسے جو کسی دوسرے محتاج کی مدد نہ کرے۔'' کنود کہتے ہیں ''اس سنگلاخ زمین کو' اس بدبخت کو' جس سے کچھ بھی پیدا نہ ہو۔'' یہ اس لیے ہے کہ انسان کو اگر اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے اور وحی کی راہنمائی نہ ملے تو پھر اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ زمین' خدا کے ابر باراں کے ایک ایک قطرے کو تو جذب کرتی ہے' لیکن انسانیت کی نشو ونما کے لیے ایک کونپل بھی اس میں سے نہیں اگتی۔ انسان تنہا خور ہے۔ سب کچھ سمیٹ کر لے جانا چاہتا ہے۔ اپنی لیبر سے' اپنے مزدور سے کام لیتا ہے اس کو معاوضہ نہیں دیتا۔ الٹا مارتا پیٹتا ہے اور یہ وہ ذہنیت ہے جو پھر جب آگے بڑھتی ہے تو انسان قزاقی پر' لوٹ مار پر' بھی آجاتا ہے۔ پھر قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کے متعلق بتایا کہ وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیْدٌ ❶ (100:7) جو کچھ یہ کر رہا ہوتا ہے وہ اتنا برہنہ ہوتا ہے کہ

---

❶ انسان مال ودولت کی ہوس میں دیوانہ ہو کر' انسانیت کے تمام آئین وضوابط کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ یہ بجائے اس کے کہ اپنی قوتِ تخلیق سے سامانِ رزق میں اضافہ کرے' دوسروں کی محنت کی کمائی لوٹ کر' سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لینا چاہتا ہے اور اس طرح خدا کے نظامِ ربوبیت کی ناقدر شناسی کرتا ہے۔

❷ انسان اپنی اس ذہنیت کا کبھی اعتراف نہیں کرتا بلکہ اس لوٹ مار اور سلب ونہب کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے گویا یہ کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہا ہے حالانکہ اس کی زندگی خود اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

صاف نظر آ جاتا ہے کہ یہ کیوں کر رہا ہے لیکن جب اس سے کہیے تو اس کے لیے وہ اتنے اتنے وجۂ جواز تراشتا ہے' ایسی Justificatory Reason (وجہ جواز) دیتا ہے' اس کے لیے اتنے پردے ڈالتا ہے کہ ان سے وہ اس کی تمام برائیاں حسن بن کر دکھائی دیں۔ مثلاً یہ تو صاحب! بزنس ہے ٹھیک ہے تجارت ہے' جس کو خدا نے حلالِ طیب قرار دیا ہے۔ اللہ اکبر! یہ محنت ہے' یہ تھوڑی محنت ہے۔ وہ آدمی اپنی محنت سے کماتا ہے' دوسروں کو کیوں دے صاحب؟ ٹھیک ہے انسان یہ چیزیں تراشتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیزیں **عَلٰی ذٰلِکَ لَشَھِیۡدٌ** (100:7) اس کی زندگی کی تو شہادت دیتی ہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا جو نگا ہوں پہ اس قسم کے رنگدار آئینے نہیں رکھتا' اس کو صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ یہ کیا کر رہا ہے' بات کیا ہے۔ عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ نگاہِ بصیرت رکھنے والا اصل حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ **وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ** (100:8) مال کی محبت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ وہ ہوسِ زر کے لیے ایسا کرتا ہے اور یہ وہ ہوس ہے جس کی کوئی حد اور کنارہ ہی نہیں۔ (102:2)

دولت مند کی حالت کا تجزیہ

برادرانِ عزیز! بات ساری یہ ہے کہ مال کی محبت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ اس کو اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ یہ جتنا لوٹ کر لے جاتا ہے اس میں سے اس کو ملتی تو دو ہی روٹیاں ہیں بلکہ تجربے نے تو یہ بتایا ہے کہ یہ جتنا مال زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے' اتنی ہی اس کم بخت کو روٹی کم ہضم ہوتی ہے۔ وہ اس لیے کہ ذہن تو ہر وقت ان چیزوں کے اندر مصروف رہتا ہے پھر ان الجھنوں سے دور ہونے کے لیے اسپرین (Asprin) کھاتا ہے۔ تباہی تو ہونی ہی ہوتی ہے۔ باقی سارا کہاں ہوتا ہے؟ دبایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سمجھتا کیا ہے؟ **اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ** ❶ (100:9) اسے اس کا علم نہیں ہے کہ جو کچھ دبا کر رکھا ہوا ہے' اسے کرید کرید کر نکال لیا جائے گا۔ یاد رکھیے **زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا** ❷ (99:1) کرید کرید کر اس میں سے نکال لیا جائے گا' جو کچھ اس میں دبایا ہے۔ یہاں ''قبور'' کا لفظ آیا ہے۔ تو یہ نظر آتا ہے کہ جو سچ مچ کے دفینے زمین میں دبے ہوئے ہیں' انہیں ہی نکالا جائے گا' اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ یہ جو Secrets (راز) ہوتے ہیں جن کا نکالنا ضروری ہے انہیں بھی بے نقاب کر دیا جائے گا۔ اس لیے کہا کہ **وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ** (100:10) وہ انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کو پوست کندہ شکل میں سامنے لے آتا ہے۔ انسان لاکھ کہے کہ وہ' یہ کچھ' مال کی محبت کی وجہ سے نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا لیکن ہمارا قانونِ مکافات اس کے ہر مخفی ارادے کو بے نقاب کر دے گا۔

---

❶ کیا اسے اس کا علم نہیں کہ ہمارا قانونِ مکافات ہر چھپی ہوئی بات کو کرید کر نکالتا ہے۔

❷ وہ انقلاب عظیم آ رہا ہے جس میں انسان کا موجود غلط تمدنی نظام تہ و بالا ہو جائے گا۔ (2-1 مفہوم القرآن ۔ پرویز)

سینوں کے اندر چھپا یا ہوا بھی ظاہر ہو جائے گا

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ انہوں نے جو کچھ سینوں میں چھپایا ہوا ہے' اسے یوں الگ کیا جائے گا جیسے چلغوزے میں سے چھلکا الگ کر کے' اندر سے گری نکال لی جاتی ہے۔ کیا سمجھتے ہیں یہ! یہ ہے وہ جو نیا نظامِ تمدن آنے والا ہے۔ یہ تو اس وقت ہو گا جب اس دنیا کے اندر یہ نظام قائم ہو گا' ورنہ اِنَّ رَبَّهُمۡ بِهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ (100:11) [1] ان کا خدا تو آج بھی واقف ہے کہ انہوں نے کہاں کیا دبایا ہوا ہے اور سینے میں کیا چھپایا ہوا ہے۔ اس نظام کے وقت یہ خود انسانوں کے ہاتھوں سے نکل کر باہر آ جائے گا۔ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! فرق! خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تو ہر وقت جانتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب انسانوں کے ہاتھوں سے یہ نظام متشکل ہوتا ہے اس وقت پھر یہ دبے ہوئے خزینے کرید کرید کر باہر نکلتے ہیں' سینوں میں چھپائے ہوئے رازیوں باہر آ جاتے ہیں جیسے چھلکا اتار کر اندر سے گری نکال لی ہو۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل! عزیزانِ من! درس کا وقت ختم ہوا۔ آئندہ ہم سورۃ القارعۃ سے درس کا آغاز کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] یہ مخفی ارادے' بے نقاب تو ہوں گے نتائج اعمال کے ظہور کے وقت' لیکن خدا کو ان کا آج بھی علم ہے۔ وہ اس وقت بھی جانتا تھا کہ انسان کے دل میں کیا ہوتا ہے اور وہ ظاہر کیا کرتا ہے۔ (کوئی زر پرست اس کا اعتراف نہیں کرے گا کہ وہ ہوس وحرص کی وجہ سے دولت اکٹھی کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے ہزار خوش آئند وجوہ جواز پیش کرے گا لیکن یہ سب فریب نفس ہے۔ وہ وقت آئے گا جب یہ لوگ اپنے عزائم کو چھپا نہیں سکیں گے۔ دنیا اس سے اچھی طرح واقف ہو جائے گی۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اٹھائیسواں باب: سورۃ القارعۃ (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ القارعۃ سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تیسواں پارہ ہے اور 101 ویں سورۃ ہے۔

قرآنِ کریم کی ان آخری سورتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ حق و باطل میں وہ ٹکراؤ، وہ تصادم و تزاحم، جو پہلے اس خفیف سے انداز سے چلا آ رہا تھا، اب انتہائی شدت اختیار کر گیا ہے۔ ان سورتوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حق و باطل کی یہ کشمکش اب اس انتہا تک پہنچ رہی ہے جہاں باہمی ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا ہے اور یہی وہ ٹکراؤ ہے جس کے بعد حق اس طرح غالب آئے گا کہ اس کے بعد وہ انقلابی معاشرہ قائم ہو جائے گا جس کی اقامت کے لیے یہ ساری جدوجہد جاری تھی۔ اسی سلسلے میں اس سورۃ کی ابتدا ہوئی ہے کہ **اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ** (101:1-3)۔

القارعۃ کا مفہوم

القارعۃ کا یہ لفظ دو چیزوں کے ٹکرانے کے لیے بولا جاتا ہے، کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر مارنے کے لیے بولا جاتا ہے اور وہ مارنا اس انداز سے ہوتا ہے جیسے چقماک [1] پر پتھر مارا جائے اور اس سے شعلہ نکلے۔ پھر اس ٹکراؤ سے جو تباہی آتی ہے، اس کے لیے عرب اس لفظ کو بولتے تھے۔ اس وقت جب کسی کھیت کو جانور اس طرح چر جائے کہ اس کا ستیاناس ہو جائے اس کے لیے عرب اس لفظ کا استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک دوسرے کے اوپر، کسی شے کو مار کر اس سے ایک ٹکراؤ کی صورت پیدا کرنا تھی۔ یہ حق و باطل کے اس تصادم کی آخری شکل تھی۔

---

[1] چق ماک، چک مک یا چق ماق یا چق مق بمعنی ایک پتھر جس سے آگ نکلتی ہے۔

جوا، حرام لیکن قرعے ڈالنا، لاٹریاں نکالنا اور استخارے کرنا، حلال

ضمناً یہیں سے لفظ قرعہ ہے اس کا مادہ ''ق ر ع'' ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اسی سے یہ قرعہ اندازی کی اصطلاح آتی ہے۔ یہ قرعہ اندازی آپ کے ہاں بھی ہوتی ہے۔ آئے دن لاٹری نکالی جاتی ہے، قرعہ ڈال لیتے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے۔ اصل میں یہ جو پانسے [1] ہوتے تھے جب انہیں پھینکتے تھے تو وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اس کی وجہ سے اسے قرعہ کہتے تھے۔ یہیں سے یہ قرعہ اندازی ہے۔ ان معنوں میں تو قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا۔ اس کے لیے ''ازلام'' کا لفظ آیا ہے اس لیے کہ عرب عام طور پر پانسوں کی بجائے تیروں سے فال لیا کرتے تھے، استخارے نکالا کرتے تھے، قرعہ ڈالا کرتے تھے۔ ضمناً بات یاد آ گئی کہ ہمارے ہاں جوئے کے متعلق تو بڑے زور شور سے کہا جاتا ہے کہ یہ حرام ہے لیکن یہ جتنی دوسری چیزیں ہیں مثلاً فال لینا، قرعے ڈالنا، لاٹریاں نکالنا، استخارے کرنا انہیں نہ صرف یہ کہ ناجائز نہیں کہا جاتا بلکہ انہیں تو بعض مقامات پر دین داری کی علامت قرار دیا جاتا ہے کہ ''وہ'' از خود فیصلے نہیں کرتا بلکہ استخارے سے فیصلہ کرتا ہے۔

عقل و فکر سے فیصلے کرنے کی بجائے استخارے کرنا

یہ کیا چیز ہے؟ کوئی معاملہ آپ کے سامنے پیش ہو، قرآن کہتا ہے کہ عقل و فکر سے اس پر غور کیجیے۔ فیصلہ کرنے کے لیے ضروری معلومات بہم پہنچائیے۔ اس کے دونوں پلڑوں کو دیکھیے کہ کون سا جھکتا ہے۔ پھر اس غور و فکر اور فکر و تدبر کے بعد، تمام حالات کو سامنے رکھنے کے بعد، ایک فیصلہ لیجیے، اس فیصلہ پر عمل کیجیے۔ اگر اس میں کمی یا نقصان کا پہلو سامنے آتا ہے تو کھڑے ہو کر سوچیے کہ آپ کے فیصلے میں کہاں غلطی ہوئی، پھر اس غلطی کی اصلاح کیجیے، پھر ایک اور فیصلہ لیجیے۔ یہ ہے وہ اندازِ تفکر اور فیصلہ کرنے کا انداز جو قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اِس کے برعکس عقل و فکر کے تمام دیئے گل کر کے، تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی یہ چیز تو قرآن کی رو سے کہیں جائز نہیں ہو سکتی۔

عربوں کے ہاں تیروں سے فالیں نکالنے کا رواج تھا

قرآنِ کریم نے اَزْلَام [2] کے متعلق بتایا ہے کہ عربوں کے ہاں قاعدہ ہی یہ تھا کہ وہ تیروں سے فالیں لیا کرتے تھے، استخارے نکالا

---

[1] پانسا یا پاسا بمعنی قرعہ، پہلو، طرف اور چوسر کی بازی میں وہ شش پہلو ٹکڑا جسے کھلاڑی پھینکتے ہیں۔

[2] ازلام سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانۂ جاہلیت میں فال نکالتے تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ تین تیر تھیلے میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک تیر پر اِفْعَلْ (کر)، دوسرے پر لَا تَفْعَلْ (نہ کر) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے۔ جب کوئی شخص کسی معاملے کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لیے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فال نکالو۔ چنانچہ وہ اپنے قاعدے کے مطابق [باقی اگلے صفحے پر]

کرتے تھے لیکن اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو بات تو یہ ہے کہ آپ انسان ہونے کے بعد Chances (اتفاقات) پر اپنے فیصلے لیتے ہیں، جس میں عقل وفکر کا کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ کتنی گری ہوئی بات ہے۔ یعنی اس کا ترجمہ Game of Chance (اتفاق کی بازی) کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں تو گویا اس میں جو موجود چیز ہے وہ اتنی ہی ہے کہ تم اپنی تقدیریں Chances (اتفاقات) کے حوالے کر دیتے ہو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیریں کیوں نہیں بناتے۔ خود فیصلے کیوں نہیں کرتے لیکن وہ Game of Chance (بازیٔ اتفاق) جوئے کی صرف ایک شکل کے لیے تو ہمارے ہاں متعین ہو گئی اور شریعت میں اسے ناجائز قرار دے دیا لیکن Chances (اتفاقات) کی باقی جتنی شکلیں ہیں انہیں کوئی ناجائز قرار نہیں دیتا۔ یہی نہیں کہ ناجائز قرار نہیں دیا جاتا بلکہ یہیں سے ہماری بدبختی، یہیں سے ہماری بدقسمتی شروع ہوتی ہے کہ ان چیزوں کی تائید میں کوئی نہ کوئی روایت آ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی سفر میں ازواجِ مطہرات میں سے جنہیں ساتھ لے جانا ہوتا تھا قرعہ ڈال کر اس کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ وہ ذاتِ اقدس واعظم جو دنیا کو فکر وتدبر کی تعلیم دینے آئی تھی، وہ اپنے فیصلے اس طرح قرعوں سے کبھی نہیں کیا کرتی۔ یہ جو طریق بھی اس قسم کا ہو اس میں یہ ساری چیزیں آ جاتی ہیں جسے آپ ازلام کہتے ہیں، جسے آپ اقلام [1] کہتے ہیں، جسے آپ جوا کہتے ہیں، جسے آپ خود فیصلہ کرنے کے بجائے چانس (اتفاق) پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد تو فال لینے کے لیے بڑے بڑے مقدس طریقے ہیں مثلاً وہ حافظ صاحب سے جو فال لی جاتی ہے۔ ''سکھاں دے گھر منڈا جم پیا' تے او جاندے نہیں گرو جی دے کول۔ جی' ناں کی رکھیے؟ اوگرنتھ نوں کھولدا اے' تے اوتھے۔

[گزشتہ سے پیوستہ]---------------------------------------

تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے۔ اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے۔ بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے۔ (تاج العروس ومحیط المحیط)۔ اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا (5:3)۔ قرآنِ کریم نے ان سب باتوں سے منع کر دیا۔ اس لیے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی فہم وفراست سے کسی بات کا فیصلہ کرے، اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے وہ مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ قرآنِ کریم انسان کی عقل وبصیرت کی تربیت کرتا اور اُسے حریت وآزادی کی تعلیم دیتا ہے اس لیے اس نے ان تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جس سے اس کی عقل وخرد دب جائے اور حریت فکر ونظر سلب ہو جائے۔ وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ (قوانین خداوندی، قرآنِ کریم کے ضوابط) کے اندر رہتے ہوئے اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کے فیصلے اپنی عقل وفکر سے کرے۔ یہ تھی قرآنِ کریم کی تعلیم۔ (حوالہ پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، 1960، ص۔ 813)

[1] القلم۔ قلم جس سے لکھا جاتا ہے۔ قینچی۔ بے پھل اور بے پر کا تیر۔ تیروں میں وہ بھی شامل ہیں جن سے جوا کھیلا جاتا تھا۔ اس کی جمع اَقْلَامٌ ہے (تاج العروس)۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ ہیکل کے پجاری حضرت مریم کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی کرتے تھے۔ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (3:43)۔ اس میں اقلام کے یہی معنی ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف وسورۃ مریم، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء حصہ سورۃ مریم)

پہلی سطر دے پہلے لفظ دا پہلا حرف جیہڑا ہوندا ہے' او کیہندا اے: جی' اے ناں رکھوتسی۔ یعنی اس حرف دے نال اوناں شروع ہووے۔ فیر اولبھدے رہندے نہیں: کی ہوئے ''دہ'' دا لفظ آیا ہوندا۔ فیر او دھرتی ڈھکیل سنگھ ناں رکھ دیندے نے اوہدا۔''❶ رکھنا ہی جو پڑتا ہے اس لیے کہ وہاں سے تو فال لی ہے۔ اب آپ کے ہاں بھی جب اہم معاملات سامنے آتے ہیں تو پھر فالیں لی جاتی ہیں۔ لفظ قرع سے' یہ بات ضمناً آ گئی تھی۔

عزیزانِ من! پہلی تین آیات یوں ہیں: **اَلْقَارِعَةُ o مَا الْقَارِعَةُ o وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ** ❷ (101:1-3)۔ یہ آنے والا ٹکراؤ' کتنی عجیب چیز ہوگی یہ آنے والا ٹکراؤ! آپ جانتے ہیں کہ دوسری دفعہ القارعة کہہ کر کیا بات کہہ دی! تمہیں خدا کے سوا کون بتائے گا کہ یہ القارعة کیا ہے' اس کا انجام کیا ہوگا' یہ کیا ہے؟ **یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ o وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ** ❸ (101:4-5)۔ اس مخالفت کرنے والی جماعت میں کچھ تو عوام ہیں اور کچھ ان کے خواص' ان کے سردار' ہیں۔ قرآنِ کریم عام طور پر ماخذ کے لیے لفظ الناس استعمال کرتا ہے یعنی محکوم' رعایا اور ان کے ہاں کے جو بڑے بڑے لیڈر ہیں جو پہاڑوں کی طرح اپنے آپ کو حاکم سمجھتے ہیں' ان کے لیے جبال کا لفظ آتا ہے۔ اس سے پیشتر یہ لفظ کئی ایک سورتوں میں' کئی ایک آیات میں آ چکا ہے اور میں اس کی تشریح متعدد مقامات پر کر چکا ہوں۔ یہاں کہا ہے کہ پھر اس ٹکراؤ کے بعد کیفیت کچھ یوں ہوگی۔

الفراش المبثوث کا مفہوم

برسات کی رات اگر باہر رات بھر بجلی کا لیمپ جلا رہے تو اس کے گرد پروانوں کا جھرمٹ ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان میں اتنی تیز حرکت ہوتی ہے' ایک دائرہ بندھا ہوا ہوتا ہے' حرکتِ مسلسل اور ایک رقصِ پیہم کا۔ لیکن صبح اٹھ کے دیکھیے تو اس لیمپ کے نیچے ان بکھرے ہوئے پروانوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔ وہ ساری حرکت مبدل بہ سکون ہوتی ہے' زندگی کا نشان تک موجود نہیں ہوتا۔ یہ جو پروانے' اس طرح بکھر جاتے ہیں' یہ اس تیزی سے جھرمٹ کر کے آنے والے اور اس پژمردگی اور افسردگی سے گر جانے والے' انہیں الفراش المبثوث کہا

---

❶ سکھوں کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام رکھنے کے لیے وہ گروجی کے پاس گئے کہ اس کا کیا نام رکھا جائے۔ وہ گرنتھ کھولتا ہے پھر وہ پہلی سطر کے پہلے لفظ کے پہلے حرف سے شروع ہونے والے نام رکھنے کے لیے کہہ دیتا ہے۔ یعنی وہ نام اس حرف سے شروع ہو۔ پھر وہ اس حرف سے شروع ہونے والے نام کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ''دہ'' کا حرف آیا۔ انہیں اس لفظ کی تلاش ہے جو ''دہ'' سے شروع ہو۔ پھر وہ دھرتی ڈھکیل سنگھ نام رکھ لیتے ہیں۔

❷ ہاں! وہ کھڑ کھڑا دینے والا انقلاب' وہ ہنگامہ خیز تصادم (جو عنقریب رونما ہونے والا ہے۔) (101:1) کس قسم کا لرزہ انگیز ہوگا وہ انقلاب؟ (69:4; 101:2)۔ اس کے متعلق تمہیں خدا سے بہتر اور کون بتا سکے گا کہ اس انقلاب میں کیا ہوگا۔

❸ اُس وقت عوام کی تو یہ حالت ہوگی جیسے منتشر پروانے (101:4)۔ اور ان کے بڑے بڑے لیڈروں کا یہ عالم گویا وہ دھنی ہوئی اون یا روئی کے گالے ہیں جو فضا میں اڑ رہے ہیں (101:5)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز 3-2)

جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ عوام اس میں فراش مبثوث کی طرح ہوں گے اور یہ جوان کے بڑے بڑے سردار پہاڑوں کی طرح اپنے آپ کو محکم اور مستحکم سمجھ رہے ہیں ان کی کیفیت کے لیے **الْعِهْنِ الْمَنفُوشِ** (101:5) کہا گیا ہے۔ عھن بنیادی طور پر درخت کی اس شاخ کو کہتے ہیں جو خم کھا کر ٹیڑھی ہو کر ٹوٹ تو جائے لیکن درخت سے ابھی الگ نہ ہوئی ہو یعنی اس طرح یہ درخت سے ٹوٹ جائے مگر یونہی دیکھنے پہ نظر آئے کہ اس کا تعلق اس کے ساتھ باقی ہے لیکن درحقیقت اس کا تعلق درخت سے ٹوٹ چکا ہو۔ اس کے بعد یہ لفظ ان لوگوں نے ہر اس شے کے لیے استعمال کیا ہے جو دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑ رہی ہو رنگی ہوئی اون کی طرح بکھر رہی ہو۔ اس میں ٹوٹنے اور بکھرنے کا مفہوم ہوتا تھا اور یہ دوسرا لفظ ہے منفوش۔ یہ اس طرح کا بکھرنا ہے کہ رات کے وقت باڑے سے بھیڑیں اور بکریاں اس طرح نکل کر بکھر جائیں کہ چرواہے کو خبر نہ ہو۔ یہ اس طرح کا بکھرنا' یہ آوارگی' یہ انتشار' یہ منفوش ہیں۔ اس کے معنی یہاں یہ کہا ہے کہ یہ بڑے بڑے خواص' جو اس وقت اپنے اپنے مقام پہ' اس طرح جم کر بیٹھے نظر آتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ چونکہ جبال کہا تھا' اس لیے دوسری طرف ان کو دھنی ہوئی روئی یا اون کے ساتھ تشبیہ دی۔ ادھر ان کی سختی بھی پہاڑ کی طرح اتنی شدت کی تھی اور دوسری طرف ان کی یہ نرمی' ان کے ہاں کی شکستگی' ایسی ہے جیسے دھنی ہوئی روئی یا اون ہو۔ یہاں کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہو جائے گی لیکن یہاں تک تو ہمیں تخریب ہی تخریب نظر آئی کہ ان کی یہ کیفیت ہو جائے گی تو کیا یہ سارا انقلاب' یہ تصادم' اس تخریب کے لیے آئے گا؟ کہا کہ نہیں' یہ تخریب نہیں ہے' یہ تو قانونِ مکافاتِ عمل کا فطری نتیجہ ہے۔

قرآنِ حکیم کا ایک عظیم اصول

فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ٥ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ٥ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ٥ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (101:6-9)۔

ان آیات کا عام ترجمہ یہ ہے کہ جس کا پلڑا جھکا ہوا ہوگا' وہ خوشگواری کی زندگی بسر کرے گا۔ جس کا پلڑا ہلکا ہوگا' وہ ہاویہ میں ہوگا۔ برادرانِ عزیز! یہ قرآنِ مجید کا بڑا عظیم اصول ہے۔ یہ پلڑوں کا جھکنا اور اٹھنا' موت اور حیات کا دارومدار اس پر ہے۔ یہ تخریب اور تعمیر کی کشمکش' ہر آن جاری ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں یہ کشمکش جاری ہے۔ یہ جو ہم ہر وقت زندہ نظر آتے ہیں' ہمارے اندر بھی یہ کشمکش ہر آن جاری ہے۔ ہر ساعت میں' ہر سانس میں' سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہمارے سیلز (خلیے: Cells) درحقیقت Destroy (تباہ) ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے سیلز (خلیے) بنتے چلے جاتے ہیں' تخریب کی قوتیں ہجوم کر کر آتی ہیں لیکن اندر Resistance (مزاحمت) کی ایک قوت ہوتی ہے' مدافعت کی قوت ہوتی ہے' وہ ان کا مقابلہ کرتی چلی جاتی ہے۔ جب قوتِ مدافعت کا یہ پلڑا ہلکا ہو جاتا ہے' اوپر اٹھ جاتا ہے اور تخریبی قوت کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو اُسے بیماری کہتے ہیں۔ اس کے برعکس علاج اسے کہتے ہیں جب قوتِ مدافعت کو زیادہ کر دیا جاتا ہے تا کہ یہ پلڑا بھاری ہو جائے اور دوسرا ہلکا ہو جائے۔ اور موت اس وقت آتی ہے یا اسے کہتے ہیں کہ جب تخریبی قوتوں کا یہ پلڑا اتنا

جھک جائے کہ پھر تعمیری قوت یا Resistance (مدافعت) کی Power (قوت) اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اتنی سی قوت تو مردے میں بھی ابھی باقی ہوتی ہے لیکن وہ تخریب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ عظیم اصول' قرآن کی تعلیم میں ہی' برادرانِ عزیز! آپ کو ملے گا۔ اور کہیں نظر نہیں آئے گا۔

قرآنی جنت کا غلط تصور

قرآن شاعری نہیں کرتا' طلسماتی اصول نہیں دیتا' زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ اب طبعی دنیا سے ہٹ کر' انسانوں کی دنیا کی طرف آیئے۔ انسانوں کی دنیا کے اندر ان لوگوں کو بلند مرتبہ مقربین بارگاہِ الٰہی سمجھا گیا جن کی میزان میں کسی قسم کی کوئی غلطی' کوئی گناہ نہ ہو۔ ان کی اصطلاح میں جسے گناہ کہا جاتا ہے وہ نہ ہو۔ چنانچہ معصومیت کے متعلق بڑے زور شور سے تصور دیا جاتا ہے۔ جنت میں جانے کے متعلق یہ تصور دیا جاتا ہے کہ وہ لوگ کہ جن کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوگا' وہ تو سیدھے چلے جائیں گے اور جن کے نامہ اعمال میں کچھ گناہ ہوں گے ان کو ان گناہوں کی پاداش بھگتنے کے لیے جہنم میں بھیجا جائے گا اور اگر کوئی ذرا ماڈرن بنتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! جیسے دھوبی بھٹی پہ کپڑے کو رکھ دیتا ہے تاکہ اس کی میل کچیل کٹ جائے اس طرح وہاں بھٹی پہ چڑھائے جائیں لیکن تشبیہ کوئی بھی ہو بنیادی تصور یہی ہوتا ہے کہ جنت میں وہی جائیں گے کہ جن کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ کی آلائش باقی نہیں رہے۔ یہ فطری طور پہ ناممکن سی چیز ہے۔

جنت میں داخل ہونے کا صحیح تصور کیا ہے؟

شاعری کی دنیا کے اندر تو آپ ایسا کہہ سکتے ہیں لیکن جب آپ انسان کو سامنے رکھیں گے تو اس میں تو لغزش کا امکان ہے۔ قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پہ مومن کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ جو زندگی کی اس Race (دوڑ) میں پیچھے رکھنے والی' افسردہ کرنے والی' اضمحلال پیدا کرنے والی' Weakness (کمزوری) پیدا کرنے والی' بڑی بڑی تباہ کن قوتیں ہیں وہ ان سے بچتے ہیں۔ لیکن یہ جو زندگی کی چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہیں' ان کا امکان ہوتا ہے' یہ ہو جاتی ہیں۔ [1] آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح Facts (حقائق) کو Face (مقابلہ) کر رہا ہے۔ وہ انسان کو یہ تصور نہیں دیتا کہ اب ذرا سی تم سے کوئی لغزش ہوئی اور اس لغزش کے لیے تم جہنم میں تو ضرور جاؤ گے۔

---

[1] اَلَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (53:32) یہ وہ لوگ ہیں جو تمام ایسے بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں جن سے انسانی ذات میں اضمحلال پیدا ہو جائے یا جن سے فواحش پھیلیں۔ ہاں البتہ اگر کبھی کسی کے دل میں یونہی کوئی غلط خیال گزرے لیکن وہ اس کی فوری اصلاح کر لے (7:201) یا اس سے نادانستہ کوئی معمولی سی لغزش ہو جائے (اور اس کے بعد وہ اس کی اصلاح کر لے) تو ایسی باتیں قابل گرفت نہیں ہوتیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ایک غلط تصور کے مضمرات

ایک طرف لغزش کا یہ تصور دیا۔ جب دیکھا کہ اس تصور کے تحت تو انسان پہ بڑی مایوسی اور قنوط آ جاتا ہے تو کہا کہ نہیں' نہ گھبرایئے' صبح اٹھ کر اگر ایک تسبیح استغفر اللہ کی پھیر دیا کیجیے تو لغزش والا معاملہ صاف ہو جاتا ہے' ڈھل جاتا ہے۔ یعنی خود ہی ایک غلط تصور Creat (پیدا) کیا۔ جب اس تصور کے ماتحت دیکھا کہ اس کا نتیجہ تو بڑا خطرناک نکل رہا ہے' تب اس کے ازالے کی بھی یہ صورت ہوئی۔ دوکاندار سے پوچھا کہ اس کی قیمت کیا ہے۔ اس نے کہا: سو روپیہ۔ اس نے کہا: او! اتنی زیادہ!! کہنے لگا کہ ہماری چھوٹ بھی تو دیکھو کتنی ہوتی ہے۔

قرآن حقائق پیش کرتا ہے

برادرانِ عزیز! قرآن Facts (حقائق) پیش کرتا ہے۔ یہ عجیب کتاب ہے۔ حقائق کو سامنے رکھتی ہے' انسانوں کے متعلق گفتگو کرتی ہے' فرشتوں کے متعلق گفتگو نہیں کرتی۔ وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ ڈھونڈتے پھرتے اس قسم کے خیالات اس کے دل میں بھی آ سکتے ہیں لیکن اس کی مدافعت کی قوت اتنی بھاری ہوتی ہے کہ وہ اس پر غالب آ جاتی ہے اور اس کو تخریب میں نہیں جانے دیتی اور یہی چیز آگے جاتی ہے۔ جسے آپ جنت کی زندگی کہتے ہیں وہاں کے متعلق بھی اس نے یہ نہیں کہا کہ وہاں وہ جائیں گے جن کے دوسرے پلڑے کے اندر، تخریب کے پلڑے کے اندر یعنی بالکل کوئی گناہ والی بات نہیں ہوگی۔ جھکتا ہوا پلڑا ہونا چاہیے۔ جب روزمرہ ہماری زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک مدافعت کا پلڑا جھکا رہتا ہے اس وقت تک ہم زندہ ہیں۔ صحت بھی اسے ہی کہتے ہیں۔ جس کا پلڑا جھک رہا ہوتا ہے تو اسی کا نام تو آگے بڑھنے کی بات ہے۔ تصادماتِ حیات کے اندر قائم وہ رہتا ہے' آگے وہ بڑھتا ہے' جس میں قائم رہنے کی قوت' آگے بڑھنے کی صلاحیت' کا پلڑا جھکتا ہے۔ دیکھنا یہی چاہیے کہ جھکا ہوا پلڑا کون سا ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ آپ کی زندگی کتنی ہی پاکبازی کی کیوں نہ گزر رہی ہو' نماز میں کھڑے ہونے سے اگر ٹخنے کے اوپر آپ کا پاجامہ آ گیا تو آپ گئے جہنم کے اندر۔ ایک طرف یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف میں نے عرض کیا کہ ساری عمر آپ گناہوں اور جرائم کے اندر گزار دیں اور وہاں جا کے صرف ایک حج کر آئیں' وہ کہتے ہیں کہ ایسے ہو کے آ جاتا ہے کہ جیسا آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک طرف افراط ہے اور دوسری طرف تفریط۔ یہ دونوں غلط ہیں۔

مذہب میں افراط بھی ہے اور تفریط بھی۔ مذہب حقائق کو سامنے نہیں رکھتا' اس کے اندر شاعری ہوتی ہے۔ قرآن دین ہے' حقائق کو سامنے رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان ہے' لغزشوں کا امکان ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پلڑا کون سا جھکتا ہے: افراط کا یعنی تعمیر و مدافعت کا یا تفریط کا یعنی تخریب کا' افسردہ کرنے والی' اضمحلال پیدا کرنے والی قوتوں کا۔

معاشرتی زندگی کا اہم اصول: ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ اور خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ

عزیزانِ من! اگر آپ اپنی معاشرتی زندگی میں اِس اصول کو لے آئے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کی زندگی کتنی سکھ کی زندگی ہوتی ہے۔ اور وہ اصول ہے کہ آپ کا پلڑا کونسا جھکتا ہے: تعمیر و مدافعت کا یا تخریب و اضمحلال کا۔ گھر کی زندگی کے اندر آپ دیکھیے گا کہ نہایت عمدگی سے سب کچھ چل رہا ہے۔ اگر یہ اصول نہیں ہے تو جونہی کوئی ایک بات آپ کی طبع نازک پہ ناگوار گزری' آپ گھر کے اندر ایک طوفان مچا دیتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کیفیت یہ ہے کہ ان کے اندر اچھے جوہر' اچھی خصوصیتیں ہیں' نہایت عمدگی سے چل رہے ہیں۔ جونہی کوئی ایک بات آپ کی مرضی کے خلاف ہوئی' یکدم آپ دوسری سمت میں چلے گئے۔ اس طرح آپ زندگی بسر ہی نہیں کر سکتے۔ زندگی کے ہر پہلو میں دیکھیے کہ دوسرے کا کونسا پلڑا جھکتا ہے؟ جب تک اس کی خوبیوں کا پلڑا جھکتا چلا جاتا ہے کوشش کیجیے کہ اس کا دوسرا پلڑا صاف ہوتا چلا جائے۔ اس صورت میں اس دوسرے پلڑے کو تعلقات کا معیار نہ بنایئے۔ آپ فرشتوں سے تعلقات قائم نہیں کر رہے کہ ان میں کوئی عیب ہی نہ ہو' اضمحلال پیدا کرنے والی کوئی قوت ہی نہ ہو۔ آپ کی اپنی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ میں سو قسم کے جرائم ہوں' تو بھی آپ اپنی ایک ہی خوبی کو اچھالتے پھرتے ہیں لیکن مخالف کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی سو خوبیاں جو ہیں وہ اس کی ایک غلطی کے نیچے آ کر دب کے رہ جاتی ہیں۔ اگر آپ زندگی میں ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ اور خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ کا اصول رکھیں گے تو' عزیزانِ من! زندگی بڑی اطمینان سے گزرے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ تخریب کے پلڑے کو بھاری کرتے چلے جائیں وہ تو ایک دن بھی اگر ذرا جھک جائے گا تو اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

انسان کو انسان تصور کیجیے' فرشتہ نہیں

مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو انسان تصور کیجیے' معصوم فرشتے تصور نہ کیجیے۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا یہ چیز آپ کو قرآن ہی کے ہاں ملے گی کہ وہ صرف ثقل موازین کی بنیاد پر کہتا ہے کہ جنت کے اندر چلے جاؤ اور یہ وہ اصول ہے جو ہم نے زندگی میں اختیار کر رکھا ہے: آپ کے ہاں 50% نمبر پاس ہونے کے لیے ہوتے ہیں۔ 60% نمبر حاصل کرنے والا طالب علم اگلی جماعت میں جانے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی 40 فی صد نمبر کی غلطیاں اِس کے 60% نمبر کے وزن سے Cancel (ساقط) ہو جاتی ہیں یعنی اس کا 60% نمبروں والا پلڑا بھاری ہوتا ہے اور وہ 40% غلطیوں والا پلڑا ہلکا۔ اس کے برعکس اگر 60% اس کی غلطیاں ہوں تو 40% اس کے نمبر' اس کو کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ وہ آگے بڑھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ہے اصولِ حیات۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مذہب کی دنیا کے اندر تو فرشتوں کو جنت کے اندر داخل کیا جاتا ہے۔ دین کے اندر تو حقائق سامنے ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتا یہ ہے کہ پلڑا کون سا جھکتا ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس نظام کے بعد' اس تصادم کے بعد' جو نظام قائم ہوگا' اس نظام

میں کیفیت یہ ہوگی کہ جو جھکتے ہوئے پلڑے ہیں وہ خوشگواریوں کی زندگی بسر کریں گے۔ جن کے یہ تعمیری پلڑے جھکے ہوئے نہیں ہوں گے، وہ ہوں گے جن پر گرفت ہوگی۔ غلط نظام میں معاملہ اس سے الٹ ہوتا ہے۔ وہاں ''اور'' پلڑے دیکھے جاتے ہیں کہ کون سے جھک رہے ہیں۔ صحیح نظام کے اندر یہ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ❶ دیکھا جائے گا۔ اس کا نتیجہ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ❷ (101:7) ہوگا۔

جنتی زندگی کی کیفیت صرف ایک لفظ میں

اگر ہمارے جیسے کو کوئی کہتا کہ صاحب! جس کا پلڑا جھکتا ہے، اس کو کیا ملے گا؟ معلوم نہیں کہ اگر ہزار صفحہ کی کتاب بھی لکھ دیتے پھر بھی بات نہ بنتی مگر قرآن نے اس کے لیے ایک لفظ عیشۃ کہا ہے۔ اگرچہ یہ عیش کا لفظ تو یہیں سے ہے اور آپ کو پتہ ہے عربوں کے ہاں عیش کسے کہتے ہیں: روٹی کو۔ بڑی عیاشی یہ ہے کہ روٹی مل جائے۔ عیشۃ راضیۃ۔ زندگی کے لیے ایک لفظ کہہ دیا: راضیۃ۔ دیکھیے، عزیزانِ من! اور جھوم جایئے گا کہ ان کی زندگی ان کی آرزوؤں کے مطابق ہوگی۔ بات ختم ہوگئی۔ انسان اس سے زیادہ کیا چاہتا ہے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحب! لوگوں کو یہ آرزوئیں تو، جو ہم دیکھتے ہیں، اس باطل نظام کے اندر اتنی واہیات ہوتی ہیں۔ ان کے مطابق زندگی ہونا تو جہنم کی زندگی ہے لیکن وہ بات مومن کی کر رہا ہے۔ وہ ان کی بات کر رہا ہے جن کے یہ پلڑے جھک رہے ہیں۔ ان کی آرزوئیں بھی یہ نہیں ہوں گی۔ ان کی آرزوئیں ہی وہ ہوں گی کہ جو ان کے ان پلڑوں کو جھکاتی ہوئی چلی جائیں گی لیکن زندگی ان کی آرزوؤں سے ہم آہنگ ہوجائے گی۔ جتنی شکایتیں ہمیں زندگی کے متعلق پیدا ہوتی ہیں اتنا ہی ہے جو تنگ آکر اس نے کہہ دیا تھا کہ

بے نیازی سے تری ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا نہ ہوا
مبداءِ فیض سے صرف اتنا گلہ ہے مجھ کو
جو نہ مانگا وہ ملا، اور جو مانگا نہ ملا

یہ ہے تلخ ترین زندگی۔

تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے

لیکن خدا کے ہاں یہ تلخ ترین زندگی نہیں ہوگی۔ وہاں عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (101:7) ہے یعنی وہاں زندگی انسان کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی۔ وہاں تو جو چاہو وہ ہو اور جو مانگو وہ ملے لیکن تمہارا چاہنا تمہیں یاد ہے کہ کیا ہے؟ اس کے لیے کتنی آیات گزر چکی

---

❶ اچھے اعمال کا بھاری پلڑا

❷ اس کی زندگی، اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی۔

ہیں۔ وہاں ❶ کہا تھا کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ❷ (81:29) تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ مومن کا چاہنا قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور اس کی زندگی اس کے چاہنے کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی منشاء کو خدا کی مشیت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ کیا انداز ہے بات کہنے کا!

اس طرح تمہیں اس سے کہیں زیادہ ملے گا جو تم چاہو گے

آپ کو یاد ہے ایک جگہ یہ کہا ہوا ہے کہ ہمارے پاس اس سے بھی ❸ زیادہ ہے۔ بات یوں ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ صاحب! جو کچھ میں مانگوں، وہ مجھے ملے، اس سے بھی زیادہ اور کیا ملے گا۔ قرآن نے کہا کہ تمہاری مانگ، اس مقام پر، زندگی کی اس سطح پر، ایسی ہے جیسی بچے کی مانگ ہوا کرتی ہے۔ کل کو جب تم وہاں ہمارے ہاں جنت میں پہنچو گے تو جوان ہو جاؤ گے۔ اس وقت تمہاری مانگ آج سے بڑھ جائے گی۔ تم آج نہیں سمجھ سکتے، ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ ہے جتنا آج تم چاہتے ہو۔ کیا بات ہے! اس دینے والے کا کیا پوچھتے ہو کہ تمہاری آج کی مانگ کے مطابق ہم دیں گے لیکن ہم اس سے بھی زیادہ دیں گے اس لیے کہ آج تمہیں خود پتہ نہیں ہے کہ جوان ہونے کے بعد تمہاری مانگ کیا ہو جانی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ o فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ o وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ o فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (101:6-9) یہ انقلاب محض ایک ہنگامہ یا فساد نہیں ہوگا۔ یہ موجودہ باطل نظام کی جگہ عدل و انصاف کا نظام قائم کرے گا جس میں ہر شخص کا مقام اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوگا۔ جس شخص کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا اس کی زندگی اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی لیکن جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا جہاں اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا دل و دماغ کچھ کام نہیں دے گا اور وہ پریشان حال مارا مارا پھرے گا۔

---

❶ اس کے لیے دیکھیے اسی جلد میں سورۃ التکویر۔

❷ تم اپنے ذاتی رجحانات اور انفرادی مفادات کو ایک طرف رکھ کر، وہی چاہو جو اس خدا کے قانون کا تقاضا ہے جس نے تمام عالم کی نشوونما کا ذمہ لے رکھا ہے (رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ 81:29)۔ لہٰذا اس سے وہی قوم مستفید ہو سکتی ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے عالمگیر نظامِ ربوبیت قائم کرنے کا تہیہ کرے اور اس طرح اپنی منشاء کو خدا کی مشیت کے ساتھ ہم آہنگ کر دے۔ (76:30; 74:56)۔

❸ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ (50:35) ان کے لیے اس جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ آرزو کریں گے۔ بلکہ ان کی آرزوؤں سے بھی کہیں زیادہ۔ (انسانی آرزوئیں اس کے موجودہ شعور کے مطابق ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل کا شعور نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کے متعلق کوئی متعین آرزو اس کے سینے میں بیدار نہیں ہو سکتی۔ خدا کا علم لامحدود ہے اس لیے وہ جانتا ہے کہ زندگی کے ارتقائی سفر کی ہر منزل میں انسان کی ضروریات کیا ہوں گی۔) (2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

اس کے برعکس دوسرا رخ

عزیزانِ من! یہاں اس آیت میں بھی دو الفاظ ہیں۔ایک لفظ **اُمٌّ** کہا ہے یعنی آغوشِ مادر، ماں کی آغوش۔آپ کو معلوم ہے کہ آغوش مادر میں کس قدر سامانِ پرورش، اسبابِ راحت و تسکین، مل سکتا ہے۔اس کے لیے ماں کی گود انتہا ہوتی ہے لیکن وہ کہا ہے کہ یہ وہ گود ہوگی جس میں سامانِ نشو ونما اور ارتقاء ملنے کی بجائے وہ پستیوں اور ذلتوں کے گڑھے ہوں گے، جن کے اندر وہ گرے ہوئے ہوں گے اور یہ دوسرا لفظ ہے **ھاویۃ** اس لفظ کے معنی ہوتے ہیں ''عقل اور فکر کا اتنا پریشان ہو جانا کہ کوئی سوجھ بوجھ میں ہی نہ آئے کہ میں کیا کروں۔'' یہاں کہا ہے کہ جس کا تخریب کا پلڑا جھکے گا وہ آغوشِ مادر کی بجائے پستیوں اور ذلتوں کے ان گڑھوں میں جائے گا جہاں ان کی عقل وفکر کو کچھ سجھائی نہ دے سکے کہ میں کیا کروں۔پھر خود ہی کہا کہ **وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ** (101:10) یہ ہاویہ کیا ہے جو ہم نے کہا ہے؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ یہ ھاویہ درحقیقت **نَارٌ حَامِيَةٌ** (101:11) ایسی آگ ہے جو متاعِ حیات کو جھلس کر رکھ دے۔عرب اس کے دو معنی لیتے ہیں: عرب شعلہ خیز آگ کو جو متاعِ انسانیت کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دے، کو بھی حامیہ کہتے ہیں اور سختی سے کسی کو روک دینے کو بھی کہتے ہیں۔

جہنم کی اصل حقیقت

آپ کو یاد ہوگا کہ جہنم کے لیے قرآن نے ''جحیم'' کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔لفظِ جہنم کے تو معنی ہیں: جہاں انسانیت قربان کر دی جاتی ہو۔اس سے زیادہ جامع لفظ اور کون سا ہو سکتا ہے، جہاں انسانیت ذبح ہو رہی ہو۔جحیم وہ ہوتا ہے جہاں کسی کی ترقی روک دی جائے، آگے نہ بڑھ سکے۔اسی لیے کہا کہ ارتقا کی منازل میں جہاں کوئی شے رک جاتی ہے وہ اس کے لیے جہنم ہوتا ہے۔کہا کہ جس کے یہ تخریبی پلڑے جھک جائیں گے، اس کا ٹھکانہ ایسے ذلت آمیز گڑھے ہوں گے جہاں اس کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔وہ وہاں رک جائے گا اور اس لیے شرفِ انسانیت کے تمام اسباب وذرائع مسدود ہو جائیں گے اور وہ وہاں رک کر رہ جائے گا۔

عزیزانِ من! انسان کے سرکش اور بے باک جذبات جو وحی کے تابع نہ رہیں وہ ایسا ہی نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔بس اس شعلہ خیز آگ سے متاعِ انسانیت راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔

عزیزانِ من! یہاں سورۃ القارعۃ ختم ہوئی۔اب ہم سورۃ التکاثر لیتے ہیں۔

سورة التكاثر (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ التکاثر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 102 ویں سورۃ ہے۔ یہ کیا سورۃ سامنے آ رہی ہے!

انسانی مصائب و آلام

آج انسان مصائب و آلام میں گرفتار ہے۔ ان کے حل کے لیے ہم کمیشن بٹھاتے ہیں' انکوائیریاں کرنے کے لیے کمیٹیاں بٹھاتے ہیں کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود' جسے دیکھیے' وہ مصیبت میں مبتلا ہے' بری طرح الجھا ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ناہموار معاشرے میں ایک مصیبت تو ان کو آتی ہے جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہ مصیبت آسانی سے رفع ہو جاتی ہے۔ ان کی ضروریات کے پیمانے بڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ انہیں بنیادی ضروریات دے دیجیے' ان کی مصیبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس میں ایک ایسا گروہ ہوتا ہے کہ انہیں جوں جوں ملتا چلا جاتا ہے ان کی مصیبتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اوپر کے طبقے کا گروہ ہے اور آج آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ قرآن نے اسے 'ربو' والے کہا ہے۔ 'ربو' کا ترجمہ ہمارے ہاں سود یا بیاج لے لیا۔ 'ربو' کے معنی ہوتے ہیں ''سرمایہ کے اوپر' صرف سرمایہ کے اوپر' بڑھوتی۔'' قرآن کی رو سے محنت کا معاوضہ حلال وطیب ہے۔ صرف Capital یا سرمایہ کے اوپر معاوضہ 'ربـــــو' ہے۔ قرآن نے اس کی تشبیہ یہ دی ہے کہ بغیر محنت کے جس کو اس طرح سے آتا چلا جاتا ہے اس کے اضطراب کی کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اپنے معاشرے میں' عزیزانِ من! ذرا ان پہ نگاہ ڈالیے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سمٹتے چلے جا رہے ہیں۔

تکاثر کا قرآنی مفہوم

اس کے برعکس عوام میں سے غریب آدمی کو جب پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے' بچوں کو ایک چھت مل جائے' کچھ کپڑا ہو' تو وہ ایسی اطمینان کی نیند سوتا ہے کہ پوچھیے نہیں اور یہ جنہیں اتنا ملتا چلا جاتا ہے' نہ ان کے نصیب میں کبھی روٹی ہوتی ہے' نہ سونا ہوتا ہے' نہ آرام ہوتا

ہے۔ ہر وقت یہ کیفیت ہوتی ہے گویا سانپ نے ڈس رکھا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ضروریاتِ زندگی کی کمی نہیں ہے' یہ تکاثر ہے' یہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی ریس (دوڑ) ہے جس نے انہیں تباہ کیا ہوا ہے۔ ضروریات کی کمی نہیں' دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا ایک جذبہ ہے' ایک ہوس ہے جس نے ان کا سکون و آرام ان پر حرام کر رکھا ہے۔ قرآنِ کریم نے پستی ذہن و فکر' پستی رجحانات و ذہنیت اور گمراہی قلب و نگاہ کے لیے کیا کیا لفظ استعمال کیے ہیں' انہی میں ایک لفظ ہے اَلْھٰی۔

اَلْھٰی ایسی جاذبیت جو مقصدِ حیات سے غافل کر دے

یوں سمجھئے کہ ایک شخص بڑے ضروری کام کے لیے چلا جا رہا ہے۔ کالج کی عمر کے طلبہ میں تو یہ کم ہوتا ہے' بچوں میں عام طور پہ یہ زیادہ ہوتا ہے۔ بڑے ہی ضروری کام کے لیے آپ بچے کو بھیج دیتے ہیں۔ راستے میں بندر کا تماشا ہو رہا ہے۔ وہ وہیں کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ بھول ہی جاتا ہے۔ کٹورا ہاتھ میں ہے' پیسہ ہاتھ میں ہے۔ اسے کہا تھا کہ جلدی سے دہی لے آؤ۔ وہ بھول جاتا ہے کہ میں کاہے کے لیے نکلا تھا۔ پیچھے سے ایک پڑتی ہے آکے۔ اسے کہتے ہیں عربوں کے ہاں اَلْھٰی یعنی ہر وہ جاذبیت جو انسان کو اس مقصد سے غافل کر دے جس کے لیے وہ نکلا تھا۔ یہ کیا زبان ہے! سوال ہی نہیں کہ آپ اس کو Define (متعین) کرتے پھریں' اس کی تشریحات کرتے پھریں کہ یہ کیا ہے۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو' ہر وہ جاذبیت جو آپ کو مقصدِ حیات سے غافل کر دے الھٰی کے اندر داخل ہے۔ یہاں اس سورۃ کا آغاز ہی اس سے ہوتا ہے: اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ [1] (102:1)۔ تکاثر انسان کو مقصدِ زندگی سے غافل کر دیتا ہے۔ اس کا مقصدِ حیات ہی تکاثر رہ جاتا ہے یعنی دوسرے سے آگے بڑھتے چلے جانا۔ اسی آگے بڑھنے کے لیے سورۃ الحدید میں ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ [2] (57:20)۔

دنیا کی یہ نعمتیں ہم نے حرام نہیں کی ہیں لیکن اگر یہ چیزیں ضروریات کی چیزیں ہونے کے بجائے تمہارے لیے تکاثر کا موجب بن جائیں' تفاخر کا موجب بن جائیں' یعنی جذبہ یہ ہو جائے کہ اس کے پاس دو موٹریں ہیں' میرے پاس چار ہونی چاہئیں' اور تم اس میں

---

[1] تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں انسانیت کی صحیح منزلِ مقصود کی طرف سے یکسر غافل کر دیتی ہے؟ وہ چیز ہے مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس (57:20; 83:26)۔

[2] سمجھ لو کہ (ان کی نگاہیں صرف طبعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد پر ہوتی ہیں' حالانکہ قرآن کے دیئے ہوئے بلند تصور کے مقابلہ میں' طبعی مفاد کی حیثیت محض) کھیل تماشے کی سی ہوتی ہے جس سے کچھ وقت کے لیے دل بہلا لیا جائے یا زیبائش و آرائش کر لی جائے یا اس پر فخر کیا جائے کہ میرے پاس دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ساز و سامان ہے یا مال اور اولاد میں' ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ لگائی جائے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

بڑھتے چلے جاؤ' بڑھتے چلے جاؤ۔ یہاں کہا یہ ہے کہ اس کے اندر وہ چیز ہے کہ جب انسان اس میں الجھ جاتا ہے تو پھر اصلی مقاصد حیات سے وہ غافل ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب ہوس ہی یہ ہو کہ میں اس سے آگے بڑھتا چلا جاؤں تو زندگی کے صحیح مقاصد اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کا جذبہ تو انسان کی Instinct (جبلت) میں رکھا ہے۔ انسان ہی کی نہیں' Life (زندگی) کی Instinct (جبلت) میں بھی۔

انسان کی تین جبلتیں ہوتی ہیں

زندگی کی جو جبلتیں ہیں ان میں تین ہی تو جذبے ہوتے ہیں: Preservation of Self یعنی اپنا تحفظ۔ ❶ دوسرا جذبہ ہوتا ہے: Self Aggression (تغلب خویش) جسے Psychologists (ماہرین علم نفسیات) دوسرے پر غالب آ جانے کا جذبہ کہتے ہیں اور تیسرا جذبہ یہ ہوتا ہے: Self Reproduction (تولید خویش) یعنی اپنے جیسا اور پیدا کرنے کا جذبہ۔ یہ تین Basic Characteristics (بنیادی خصوصیات) یعنی Instincts (جبلتیں) ہیں۔

تکاثر کے جذبے کا استعمال

یہ جو دوسرا جذبہ ہے جسے Self Aggression (غلبہ خویش) کہتے ہیں یہی تو دوسروں کے اوپر غالب آ جانے والی بات ہے۔ آگے بڑھ جانے والی بات تو زندگی کے کے اندر موجود ہے اور یہی تو وہ جذبہ ہے جو تکاثر پیدا کرتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا قرآن اس جذبہ کو فنا کرنا چاہتا ہے۔ اسی جذبے کو خدا نے انسان کے اندر پیدا کیا ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ قرآن اس جذبے کو فنا کر دینے کی تعلیم دیتا ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ جذبہ شر یعنی Evil تھا اور اگر وہ Evil (شر) تھا تو خدا نے یہ پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ خدا تو Evil (شر) پیدا نہیں کرتا۔ پھر یہ کیا چیز ہے؟ جذبہ موجود ہے لیکن اس جذبے کی تسکین کے لیے آپ نے جو میدان تجویز کیا ہے' وہ غلط ہے۔ اسے شر کہتے ہیں یعنی فطری جذبے کی تسکین کے لیے' غلط ذرائع استعمال کرنا' غلط میدان تجویز کرنا' یہ ہے جسے شر کہتے ہیں۔ دوسرے سے آگے بڑھنے کا یہ جذبہ موجود ہے قرآن کہتا ہے کہ **فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ** (2:148) آگے بڑھنا ہے تو نوعِ انسانی کے لیے بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ ٹھیک ہے' یہ جذبہ' برا نہیں تھا۔ سورۃ المطففین میں دوسرے الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے کہا ہے کہ **کَلَّاۤ اِنَّ**

---

❶ تحفظ خویش (Preservation self) زندگی کا تقاضا ہے جو ہر جاندار شے کے اندر جبلی طور پر (By instinct) موجود ہے: "دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ" اسی تقاضے کا پیدا کردہ ہے۔ اگر انسان اس جذبہ کی تسکین اس طرح کرے کہ اس کی ذات (Self) کی نشوونما دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے تو یہ چیز حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح کا تقاضا بن جائے گی۔

کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ❶ (83:18)۔ یہ سب (83:19-26) ❷ میں آ چکی ہوئی ہیں۔ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ (83:19) تجھے خدا سے بہتر کون بتا سکتا ہے کہ علیون کون ہیں۔ اسی طرح علیین کون ہیں یعنی جو بلندیوں میں جانے والے ہیں وہ کون ہیں۔ اس کے بعد ان کی ساری چیزیں گنائی ہیں کہ ان کو یہ ملے گا' ان کو یہ حاصل ہوگا' ان کی یہ کیفیت ہوگی۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ❸ (83:26)۔ آگے بڑھنے کا جذبہ پورا کرنا چاہتے ہو' تو ان چیزوں کے اندر اسے پورا کرو اور پھر دیکھو کہ کس طرح تمہارا ہر قدم آگے بڑھتا ہے۔ وہ مارگزیدگی کے اضطراب پیدا نہیں کرے گا۔ اس طرح سے جنت کے ستون میں اضافہ کرتا چلا جائے۔ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ اس جذبے کے پورے کرنے کا میدان کونسا ہے: نوعِ انسانی کے منفعت بخش کاموں کے لیے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو اور پھر اس کی کوئی حد نہیں۔ وہاں یہ کہا ہے کہ یہ وہ جنت ہے جس کی وسعت ارض وسما میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس تکاثر کی تو پھر بھی کہیں جا کے حد ہو جائے گی کیونکہ یہاں کہا ہے حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ❹ (102:2)۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جو جذبہ ہے وہ دولت' حشمت' روپیہ' موٹریں جاہ و منصب' یہ سارا کچھ اس میدان کے اندر ہے' یہ جذبہ اس میں بڑھنے کا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قبر میں پہنچ جاتے ہیں۔

گدھا اور گاجر کی ایک انمول مثال

انسان کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنے سائے کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ ذرا کوئی اسے پکڑ کر تو بتائے' یہ اس سائے کے پیچھے بھاگتا چلا جائے گا' ایک دن ہانپ کر گر جائے گا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ایک کارٹون بنایا کرتے ہیں جس میں گدھے کے سر کے ساتھ' ایک لکڑی باندھتے ہیں۔ لکڑی کے آگے ایک گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اب اس گاجر کو کھانے کے لیے گدھا آگے بڑھتا ہے' گاجر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسے اس طرح سے اس گاجر کے لالچ میں چلاتے ہیں۔ جس کے حاصل کرنے کے لیے وہ عمر بھر چلتا رہتا ہے مگر وہ گاجر منہ میں نہیں آتی۔ تکاثر تو یہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2)۔ اس طرح یہ گدھا اس گاجر کے پیچھے چلتا چلتا قبر کے

---

❶ ان لوگوں کا مقام' جو زندگی میں وسعت اور کشاد پیدا کرتے ہیں' بلندیوں پر ہوگا۔ وہ زندگی کے ارتقا کی اگلی منزل میں ہوں گے۔

❷ ان کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے سورۃ المطففین۔

❸ یہ ہیں زندگی اور توانائی کو بڑھانے والے اسباب و عناصر جن کے حصول کے لیے تمہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

❹ اگر تم اپنی طلب کو' اپنی ضروریات پورا کرنے تک محدود رکھو تو اس کی ایک حد ہوگی۔ لیکن جب جذبۂ محرکہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا ہو تو اس کی کوئی حد ہی نہیں ہو سکتی۔ اس جذبہ کے ماتحت کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرنے جاؤ اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔ (1-3-4 مفہوم القرآن۔ پرویز)

گڑھے میں جا گرتا ہے۔ کہتا ہے کہ جو بات ہم نے کہی ہے وہ بڑی صاف تھی کَلَّا (102:3) یوں ذہنوں میں نہ سمجھو کہ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ سکتی کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ o ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ❶ (102:3-4)۔ یہ تین چیزیں ان آیتوں میں آتی ہیں۔ بڑی سمجھنے کے قابل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات اتنی صاف سی ہے کہ تھوڑا سا بھی جذبات سے الگ ہو کر اگر تم صرف علم سے کام لو تو بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اس تکاثر کی کوئی حد نہیں ہے۔ موت تک یہ جو جذبہ ہے اس کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ کہا کہ اس کے سمجھنے کے لیے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ جذبہ جس کی تسکین موت سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی اور موت کے بعد تمہیں پتہ نہیں کہ یہ تسکین ہوئی بھی ہے کہ نہیں۔ تو کہو تو سہی کہ اس گاجر کے پیچھے چلے جانا چہ معنی دارد۔ یہ تو صرف گدھا ہی جا سکتا ہے۔ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ (102:4) تم بہت جلد جان لوگے کہ یہ روش کس قدر تباہ کن ہے۔

جذبات سے ہٹ کر سوچو

اگر کوئی جذبات سے ہٹ کر علمی طور پر اس بات کو سمجھنا چاہے تو بڑی جلدی یہ بات سمجھ میں آ جائے گی لیکن تم ایسا نہیں کرو گے: کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ o لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ❷ (102:5-6)۔ ذرا اور گہرائی میں ڈوب جاؤ' اس کو سطحی علم کی بجائے ذرا سوچ اور گہرائی میں لے جاؤ' تھوڑا سا نیچے اترو گے تو اس جہنم کی نشانیاں تمہیں خود تیرتی ہوئی نظر آ جائیں گی۔ یہ علم یقین کا دوسرا درجہ ہے لیکن کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تکاثر کا نشہ ایسا ہے کہ ذرا سا بھی تم جب ہوش میں آتے ہو تو دوبارہ پھر اسی کی طرف لوٹ جاتے ہو' اسی لیے تمہیں فرصت ہی نہیں ملے گی کہ یہ کچھ کرو۔ لہٰذا ہو گا یہ کہ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ (102:7) تم اس جہنم کے اندر گر جاؤ گے تو پھر آنکھوں سے اس کو دیکھ لو گے۔ لیکن پھر تو اس سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔

قرآنی حقائق کو تسلیم کرنے کے تین درجے

برادرانِ عزیز! قرآنی حقائق کے سمجھنے کے تین منازل کتنی عجیب ہیں! کہتا ہے کہ ذرا علم کی بارگاہ سے جا کر پوچھو تو تمہیں بات صاف طور پہ سمجھ میں آ جائے گی۔ جذبات زیادہ غالب آتے ہیں تو کچھ اور اس کی گہرائی میں چلے جاؤ۔ لیکن اگر اس سے بھی تم بات نہیں سمجھتے تو پھر اس کے بعد کوئی طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ جہنم کے اندر گر جاؤ' وہاں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ یہ عین الیقین ہے:

---

❶ اگر جذبات سے ہٹ کر ذرا عقل و فہم سے کام لو تو بہت جلد جان لو گے کہ یہ روش کس قدر تباہ کن ہے۔ ہاں! تم اس طرح بہت جلد جان سکتے ہو کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

❷ اگر تم ذرا اور گہرائی میں اتر کر غور کرو تو تم' اُس جہنم کو جس کی طرف انسان کی یہ روش لے جاتی ہے' اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہو۔ (29:54; 79:36; 82:16) ......(2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

آنکھوں دیکھا یقین آ جائے گا تمہیں۔ پہلا درجہ خالی تعلمون ہے' علم ہے۔ دوسرا درجہ علم الیقین ہے یعنی ایسا علم جس سے یقین حاصل ہو جائے اور تیسرا درجہ عین الیقین ہے یعنی آنکھوں سے دیکھ کر کسی چیز کے اوپر یقین آنا۔ لیکن وہاں سے تو پھر بازیابی نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ وہاں کیا صورت ہوگی؟ قرآن نے کہا کہ **ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ** ❶ (102:8)۔

یہ پوچھا جائے گا کہ یہ سب کچھ کہاں سے آیا تھا

دیکھیے' عزیزانِ من! یہ جہنم جسے یہ آنکھوں سے دیکھ لے' اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے کہ وہاں کیا ہوگا؟ اس کے جواب میں کہا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے آسائشوں کے یہ سامان کہاں سے اکٹھے کیے تھے' اپنے ہاں آنے والے "نعیم" تم نے کیسے حاصل کیے تھے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45ء) سے پوچھا گیا تھا کہ خلافت کی Definition (تعریف) کیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں تو بس اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ یہ اس چیز کی ذمہ داری اور جواب دہی ہے کہ یہ سب کچھ کہاں سے آیا اور کیسے خرچ کیا۔ کیا بات تھی ان لوگوں کی! قرآن یونہی بات سمجھاتا ہے برادرانِ عزیز! یہی وہ بات کیا کرتے ہیں۔ یہ جو پوچھنے کی چیز ہے' یہ ایک دفعہ پہلے بھی آ چکی ہے۔ اسے کیوں نہ دہراتا چلا جاؤں۔ سورۃ الانبیاء میں آیا تھا کہ **وَ كَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡیَةٍ كَانَتۡ ظَالِمَةً وَّ اَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ** (21:11)۔ تم سے پہلے کتنی قومیں ایسی تھیں جنہوں نے سلب ونہب (Exploitation) اور ظلم واستبداد کا نظام اختیار کیا تھا تو وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسروں قوموں نے لے لی۔ بات یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ کہا کہ کیفیت یہ تھی کہ جس دن انہوں نے اس سلب ونہب (Exploitation) اور ظلم واستبداد کی روش اختیار کی تھی' اس کے تباہ کن نتائج تو اسی دن سے مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے لیکن وہ نتائج محسوس شکل میں ان کے سامنے ابھی نہیں آئے تھے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ دیکھو' اس ظلم واستبداد کی روش سے پرہیز کرو' سلب ونہب سے بچو' یہ تمہیں تباہ کر دیں گے۔ وہ بات مانتے نہیں تھے' یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

برادرانِ عزیز! یہ تو ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ بدپرہیزی کرنے والوں کو روز ڈاکٹر متنبہ کرتے ہیں کہ یہ نہ کرو بھئی! صحت بگڑ رہی ہے' ایک دن بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔ مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تو یہ کچھ کرتے ہوئے کتنے ہی مہینے ہو گئے' کچھ بھی نہیں بگڑا۔ یونہی وہم ہے

---

❶ اس وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ خدا کی ان نعمتوں کو' جنہیں اس نے تمام نوع انسان کی پرورش کے لیے عطا کیا تھا' تم محض اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر' سمیٹتے کوئی چلے جاتے تھے؟ تم سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے قصرِ تعیش کی رنگینیوں میں کس کس کے خون کی سرخی شامل تھی۔ جو تم نے سمیٹا تھا وہ کس کی محنت کا ماحصل تھا اور تمہیں اسے غصب کر لینے کا کیا حق حاصل تھا (21:13)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جی! تہاڈا گل ای کچھ نئیں ہے۔ ہوندا ہی کچھ نئیں ہیگا۔ [1] اور پھر ایک دن جب وہ آدھی رات کے وقت تڑپ کر اٹھتا ہے اور صبح ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ جی! رات کو اچھا بھلا سویا تھا اچانک آدھی رات گردے میں درد اٹھا۔ ''اچھا بھلا سویا تھا اچانک درد اٹھا ہے!'' عزیزانِ من! درد کبھی اچانک نہیں اٹھا کرتے۔ یہ سونے والا اچھا بھلا نہیں سویا تھا۔ جب اس کے ایکسرے لیتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ سرکار! سال بھر سے یہ پتھری گردے میں بن رہی تھی۔ آدھی رات کے وقت یہ درد کیا چیز ہے؟ یہ ہے کہ جب اس کو احساس ہوا۔ وہ نتائج جو غیر محسوس شکل کے اندر مرتب ہوتے چلے آ رہے تھے' اب محسوس شکل میں سامنے آ گئے۔

قرآن کی بلاغت

برادرانِ عزیز! قرآن کی بلاغت دیکھیے' واضح طور پہ کہا ہے کہ یہ ظلم واستبداد کر رہے تھے۔ وارننگ دینے والے ہمارے متبعین اور انبیاء کرام کہہ رہے تھے کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ وہ بالکل نہیں مانتے تھے۔ ان کی غلط روش کے نتائج' غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں' لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے' حتی کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12) جب یہ درد محسوس بن کر ان کے سامنے آ گیا' یعنی جب یہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) تو وہ لگے بھاگنے۔ دوڑ رہے ہیں کہ کسی طرح سے بچ جائیں۔ کوہِ آتش فشاں کا لاوا پھٹ گیا۔ اس کی دھار چلی آ رہی ہے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ یہاں سے اپنی بستیاں اٹھالو' ایک دن یہ پھٹ جائے گا' تباہ ہو جاؤ گے' یہ مانتے ہی نہیں تھے۔ اب جو یوں آیا ہے تو بھاگ رہے ہیں۔ قرآن کا اندازِ بیان کتنا Graphic (صحت اور وضاحت کے ساتھ بیان) ہے' برادرانِ عزیز! کہا کہ وہ بھاگ رہے ہیں اور ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل انہیں پیچھے سے آوازیں دے رہا ہے کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو' تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ ان کو روک دیا وہ کھڑے ہو گئے۔ کہا کہ کھڑے ہونے کی بات نہیں ہے۔ اب وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) اب الٹے پاؤں انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو۔ وہیں واپس چلو انہی محلات کے اندر واپس چلو جن کی رنگینیاں' ان غریبوں کی محنت کے سرمائے' ان کی محنت کے خون سے پیدا ہوئی تھیں' چلو وہاں جاؤ لوٹو وہاں۔ کیا انداز ہے! چلو وہیں واپس۔ کاہے کے لیے وہاں چلو؟ تاکہ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13) تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کہاں سے آیا تھا' کسی کی محنت سے بنا تھا' اور تمہارا اس پر کیا حق تھا (102:8)۔ پھر قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) وہاں کہیں گے کہ ہاں' ہم نے واقعی سلب ونہب کیا تھا۔ یہ ساری Exploitation تھی جو ہم نے کی۔ ذہن میں آ سکتا ہے کہ اچھا صاحب! اعتراف کیا تو ختم ہوا قصہ لیکن اب تو پلڑا جھک گیا تھا۔ اس وقت اس تاسف سے کیا ہو سکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا

---

[1] جی' یہ یونہی آپ کا وہم ہے۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ایسا کچھ تو ہوتا ہی نہیں ہے۔

نہیں کرتے۔ چنانچہ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوٰهُمْ (21:15) وہ یہ کہتے چلے گئے' کہتے چلے جارہے ہیں' کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں' ان پر وہ بے حد متاسف ہیں لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسا کر دیا حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) جیسے کٹا ہوا کھیت جس میں نشو ونما کی صلاحیت باقی نہ رہے یا بجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے (36:28)۔

سلب ونہب کا نتیجہ

قرآن کہتا ہے کہ ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے اس کے بعد ایک نہ سنی۔ اب جاؤ' جا کے دیکھو' ان کی بستیاں نظر آئیں گی جیسے کٹے ہوئے کھیت ہوں' جیسے بجھا ہوا شعلہ ہو۔ اجڑے ہوئے کھیت' بجھا ہوا شعلہ میں ان چیزوں کی تفصیل میں کیا جاؤں یہ تو سمجھنے کی باتیں ہیں۔ ہاں! تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہاں سے ان کو واپس بلایا جائے گا: چلو وہاں مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ (21:13) انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو۔ وہ جو دوسروں کی کمائی کے اوپر تم نے اپنے محلات بنائے تھے' ان کی طرف چلو۔ کہا کہ تم سے پوچھا جائے گا اور یہاں (102:8) میں اسی جہنم کے متعلق کہا ہے کہ جسے تم اپنی آنکھوں سے وہاں دیکھو گے تو پھر تمہیں یقین آئے گا۔ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (102:8) تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ رنگینیاں کہاں سے آئی تھیں' تمہارے ان قصرِ تعیش کی رنگینیوں میں کس کس کے خون کی سرخی شامل تھی۔ جو کچھ تم نے سمیٹا تھا وہ کس کی محنت کا ماحصل تھا اور انہیں اسے غصب کر لینے کا کیا حق حاصل تھا؟

عزیزانِ من! سورۃ التکاثر ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ العصر لیتے ہیں۔

سورة العصر (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب ہم سورۃ العصر لیتے ہیں۔ یہ تیسویں پارے کی 103 ویں سورۃ ہے۔

قرآن پوری انسانیت کی تاریخ ہے

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بات کسی ایک قوم کی نہیں، کسی ایک بستی کی نہیں، کسی ایک دور کی نہیں بلکہ **وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ** (103:1-2) انسانیت کی ساری تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ انسان نے جب بھی وحی کی راہنمائی کو چھوڑا، ہمیشہ تباہی کے اندر گیا۔ کیا بات ہے! آپ دیکھ رہے ہیں کہ پیچھے سے ساری تفاصیل چلی آ رہی ہیں: قومِ نوحؑ، قومِ عادؑ، قومِ ثمودؑ، قومِ مدینؑ، قومِ لوطؑ، قوم بنی اسرائیل، فرعون یہ تمام داستانیں قرآن میں بھری پڑی ہیں۔ قرآن تفصیل پہ تفصیل دیئے چلا جا رہا ہے۔ اور یہاں آنے کے بعد وہ ساری تفاصیل سمٹا کر ایک فقرے میں رکھ دیں کہ **وَالْعَصْرِ** (103:1) زمانہ یعنی تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن تفصیل کو کیسا ارتکاز میں لایا ہے۔ پوری انسانیت کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان نے جب بھی مستقل اقدارِ سماوی کو چھوڑا ہے، ہمیشہ تباہی میں گیا ہے۔ یہ کام تھا ہمارے ہاں کے محققین کا، ریسرچ کرنے والوں کا کہ وہ تاریخ کو اس نگاہ سے پڑھیں اور اس پہ تحقیق کریں۔ یاد رکھیے جب بھی قرآن صرف الانسان کہتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: وہ انسان جو اپنی حیوانی زندگی کے جذبات پر چلتا ہے۔ جب بھی انسان نے اپنے حیوانی جذبات کو اپنا راہنما بنایا ہے، وہ **لَفِیْ خُسْرٍ** (103:2) تباہ ہو گیا ہے۔ یہ بات کسی ایک زمانے کی نہیں، کسی ایک قوم کی داستان نہیں بلکہ انسانیت کی تاریخ ہے۔ اسی لیے کہا کہ **وَالْعَصْرِ** (103:1) زمانہ یعنی انسانیت کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ............

ہر دور اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے

عزیزانِ من! پھر وہی بات آ گئی۔ عصر یا اعصار نچوڑنے کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل نچڑی ہوئی بات ہوتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک زمانے کو، ایک دور کو، کیا کہہ رہا ہے؟ یہ قوم ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کھجوریں کھانے والی قوم، پتہ نہیں ان کے ذہن کی بلندیاں کہاں

پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ ہر دور اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اللہ اکبر! اس لیے وہ جسے آپ ہسٹری میں Age یا Period کہتے ہیں' وہ اسے عصر کہتے ہیں یعنی پچھلے ادوار کا نچوڑ اور یہ تاریخ ہے' برادرانِ عزیز! یہ جتنے پچھلے ادوار ہوتے ہیں' ان کا جو Accumulative experiment یا Experience ہوتا ہے' وہ ایک دور ہوتا ہے۔ ہمارا جو دور ہے' وہ اسی طرح پچھلے ادوار کا نچوڑ ہے اور یہ نچوڑ اسی طرح سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ لفظ قوم' زمانے یا Age یا تاریخی زمانے کے لیے آتا ہے۔ یاد رکھیے یہ لفظ آتا ہے جسے ہم Particular age in history کہتے ہیں۔ یہ لفظ حقیقت میں ماضی کے تمام تجربات کا نچوڑ سامنے لاتا ہے۔ یہ لفظ پوری انسانیت کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ اس کے معنی ہیں تت کڈیا ہوا ہیگا سارا[1] کہ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ (103:2) جب بھی انسان کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو پھر جو The Animal in Man (انسان میں حیوانی پہلو) ہے' وہ غالب ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ پھر سوچو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ پھر خود ہی بتا رہا ہے کہ وہ انجام تباہی ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تباہی سے کون بچتے ہیں؟ اس کا جواب دیتا ہے کہ اس میں جو استثنا (Exception) ہے' جو تم تمام ہسٹری میں پاؤ گے وہ ہے اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (103:3) صرف ان لوگوں کی ہے جو مستقل اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

یقین عمل کی بنیاد بنتا تو ہے مگر کچھ اور بھی چاہتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف یقین رکھنا ہی کافی ہوتا ہے؟ کہا کہ صرف یقین رکھنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ یقین تو عمل کے لیے بنیاد ہوتی ہے۔ آپ کسی ایسے مکان میں نہیں رہ سکتے جس کی صرف بنیادیں بھری ہوئی ہوں اور آپ مکان بنا بھی نہیں سکتے تاوقتیکہ بنیاد نہ ہو۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا تعلق یہ ہے' برادرانِ عزیز! بات بڑی صاف سی ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ایمان کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوا کہ اگر آپ صبح کو بیمار ہو جائیں اور آپ کو ڈاکٹر کی طرف جانے کے لیے کہا جائے تو آپ ہمیشہ اس ڈاکٹر کی طرف جاتے ہیں جس کے اچھے ڈاکٹر ہونے پر آپ کو یقین ہوتا ہے۔ آپ نسخہ (Prescription) وہ استعمال کرتے ہیں جس کے متعلق آپ کو اطمینان ہوتا ہے کہ یہ اچھا ہے۔ Scientist (سائنسدان) اس فارمولے کو لیتا ہے جس کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ نتائج پیدا کر دے گا۔ یہ جو فارمولے یا قانون کی صداقت کے متعلق دل میں ایک اطمینان ہوتا ہے' یہ ہوتا ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ اس سے انسان Further Proceed (مزید آگے بڑھتا) کرتا ہے۔ اگر پہلے ہی معلوم ہو کہ یہ فارمولا صحیح نہیں ہے تو کوئی باہوش اس پر آگے چلتا ہی نہیں ہے۔ ایمان کا اتنا کام ہے۔ اسی لیے کہا کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (103:3) وہ ایسے لوگ ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہیں اور پھر وہ ایسے کام کرتے ہیں جو الصلحت ہوتے ہیں۔ یہ الصالحہ قرآنِ کریم کی بڑی جامع Term (اصطلاح)

---

[1] سارا نچوڑ' ملخص نکالا ہوا۔

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اپنی صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں' کائنات کی صلاحیتیں ارتقا یافتہ ہوتی ہیں' معاشرے کے اندران سے اصلاح کے پہلو نکلتے ہیں۔ اصلاح ہمواریوں کو کہتے ہیں۔ فساد کے مقابلے میں یہ سارا کچھ اس لفظ میں آ جاتا ہے۔ فرد کے لیے' معاشرے کے لیے' پوری انسانیت کے لیے' کائنات کے لیے' نہ ایسے کام ہیں جو ہر گوشے کے اندر' اس طرح سے صلاحیتوں کی نشو ونما کرتے چلے جائیں۔ وہ اس یقین کامل کے بعد اس قسم کے کام کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک اور شرط بتائی۔ عمل صالح کا تصور' مذہب کی دنیا کے اندر' انفرادی ہوتا ہے۔ اس میں نیک کام ایک فرد اپنے طور پر کرتا ہے لیکن یہ جن انسانوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ تباہ نہیں ہوئے' اور یہ تباہ نہیں ہوں گے' ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ کام Individualistic (اکیلے فرد کا) نہیں ہے' یہ انفرادیت کی زندگی نہیں ہے' ان کی زندگی اجتماعیت کی زندگی ہوتی ہے۔ اسی لیے فوراً کہا کہ **وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ** (103:3)۔

لفظ ''تواصوا'' کا مفہوم

''تواصوا'' کے معنی ہوتا ہے ایک دوسرے کو کچھ کہنا۔ یہ معنی تو گرامر کے اعتبار سے ہوئے۔ عزیزانِ من! میں اس کے معنی ابھی عرض کرتا ہوں۔ تواصوا کے عام معنی ہوتے ہیں ''تلقین کرنا' تاکید کرنا' کسی سے کچھ کہنا۔'' پہلے تو یہی معنی لیجیے۔ ایک اجتماعی نظام ہوتا ہے۔ اس میں وہ ایک دوسرے سے یہ کچھ کہتے ہیں۔ اس میں دوسرا لفظ ''حق'' ہے۔ حق کا یہ لفظ Truth (سچائی) کے لیے بھی آتا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی Wrong کے مقابلے میں Right آتا ہے یعنی As of right جسے آپ بطور استحقاق کہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ عربی زبان میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں آتا ہے۔ Right تو وہ حق ہے جو باطل کے مقابلے میں ٹھیک ہو اور Right وہ بھی ہے جو کسی کا حق ہو۔ یہی کسی کا آپ نے حق دیا' وہی حق ہے۔ وہی حق وناحق بھی ہے۔ یہ تو اس ایک لفظ کے اندر پہلے معنی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **تواصوا بالحق** (103:3) وہ ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ تمہارا حق کیا ہے' تمہارا فریضہ کیا ہے۔ اس ایک لفظ میں یہ دونوں باتیں آ جاتی ہیں۔ یہ جو معاشرہ قائم ہوتا ہے' برادرانِ عزیز! یہ Rights & Obligations (حقوق وفرائض) دونوں کا نام ہوتا ہے یعنی حقوق اور ذمہ داریوں پر مبنی معاشرہ۔

معاشرتی فرائض اور حقوق لازم وملزوم ہیں

معاشرے میں ہر فرد پہ ذمہ داریاں (Obligations) عائد ہوتی ہیں۔ وہ انہیں پورا کرتا ہے تو اس طرح اس معاشرے میں معاشرتی فرائض اور حقوق لازم وملزوم ہیں۔ پہلے فرائض کی ادائیگی ہے اور پھر حقوق کا حق ہے اور دوسری صورت یہ ہے اس کے کچھ حقوق (Right) معاشرے میں متعین ہوتے ہیں۔ معاشرہ یہ حقوق ان ذمہ داریوں (Obligations) کو پورا کرنے والے افراد کو دیتا ہے۔ فرد اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتا تو اس کو معاشرے سے کچھ لینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر معاشرہ اس کا ''حق'' Right نہیں دیتا تو اسے

اس پہ ذمہ داری عائد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ Obligations & Rights کا اصول ہے۔ معاشرہ بنتا ہی اس طرح سے ہے۔ آپ کے ہاں مزدور جو کام کرنے کے لیے آتا ہے، وہ صبح آتے ہی آپ سے اجرت نہیں مانگ لیتا۔ اس لیے کہ اس نے ابھی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ وہ دن بھر ذمہ داری کو پورا کرتا ہے تو شام کو اس کا حق ہو جاتا ہے۔ وہ اب خیرات نہیں مانگ رہا، یہ اس کا حق ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اسے نہیں دیتے تو آپ نے اس کا حق نہیں دیا۔ اگر وہ دن بھر کام نہیں کرتا تو اس نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی ہے۔ یہ ہے Rights & Obligations کی قرآن کی بات۔ عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں۔ ان چیزوں کے لیے تو ایک عمر چاہیے۔ قرآن کا ایک ایک لفظ نصاب کے طور پہ، کلاس کا ایک درس بنتا ہے۔ اگر میں قرآنِ حکیم کی روشنی میں یہ بتانا چاہوں کہ حق اور الحق کیا ہوتا ہے تو اس کے لیے مہینے لگ جائیں۔ یہ تمدنی زندگی کے اندر ایک دوسرے سے کہتے یہ ہیں کہ تمہارے ذمہ حق کیا ہے۔ پھر وہ حق جو تم اس طرح Accrue (حاصل) کرو گے، وہ کیا ہے اور الحق کیا ہے؟ باطل کسے کہتے ہیں؟ وہ ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں۔ اور یہ بات نہیں کہ کسی ایک دن یہ بات ہوئی تماشا ختم ہو گیا۔ وہ تو **وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ** (103:3) ہے۔ اور اس کے بعد کہتے یہ ہیں کہ جب تم نے یہ بات سمجھ لی ہے تو اب استقاماً، التزاماً، دواماً، استمراراً، مستقلاً اس روش پر قائم رہنا ہوگا۔ یہ یاد رکھو۔ یہ وہ افراد ہیں جن کی قرآن نے تباہی سے Exception (استثنا) بتائی ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جو تباہی سے بچتے ہیں، ورنہ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ** (103:2) انسان کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ اس کی محنت اکارت گئی ہے۔ وہ ہر مقام پر خاسر و نامراد رہا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو کبھی نہیں پا سکا۔ یہ حقیقت ہے۔ ''الانسان'' کی پوری جامعیت اس کے اندر آ گئی ہے۔ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے اُسے اقدارِ خداوندی نہ ملیں، یہ چیزیں اس کی زندگی میں نہ ہوں تو تباہی ہی تباہی ہوتی ہے۔ یہ ہے زمانے کی شہادت، یہ ہے تاریخ انسانیت کی شہادت۔ اسے قرآنِ کریم نے **وَالْعَصْرِ** (103:1) کہا ہے۔

انسانی تاریخ میں چند چمکتے ہوئے لمحات

انسانیت کی پوری تاریخ میں صرف چند لمحے ہی ایسے ہیں جنہیں میں چمکتے ہوئے لمحات کہوں گا، جن میں کبھی ایسا معاشرہ قائم ہوا تھا جس میں ہر فرد ایمان پر قائم اور اس کے اعمال صلاحیت بخش تھے۔ اب جو معاشرہ قرآن متشکل کرنا چاہتا ہے، اس میں ضروری ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کو اس کی Obligations (فرائض) اور حقوق (Rights) کی یاد دہانی کرائے اور اس پہ قائم رہنے کی تاکید کرتا چلا جائے۔

الفاظ کے انتخاب میں قرآن کا اعجاز

اب لیجیے قرآن کے انتخابِ الفاظ کا اعجاز۔ تاکید، تلقین اور امر کے لیے سینکڑوں الفاظ تھے لیکن یہاں قرآن نے اپنے ہاں ''تواصوا'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''ایک دوسرے کو اس انداز سے صحیح باتیں کہنا کہ وہ اور تم اس بات سے ایک

ہوجاؤ۔'' یہ جو جماعت بنتی ہے' اس میں تــــواصـــوا ہوگا۔ یہ ایک دوسرے سے یہ کچھ کہیں گے۔ اس جماعت کی وجہ جامعیت یہ Cementing Force (رشتۂ اتحاد کی قوت) ہوگی۔ ان کے ایک ہونے کی' امت بننے کی' اس Cementing force میں یہ ''تواصوا'' ان کے ہاں ایک Common Factor (مشترک عنصر) ہوگا جس میں انہیں افراد سے جماعت بنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ اقدار پہ ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے اعمال صالح ہیں' ایک دوسرے کو حق کی تاکید کرتے ہیں' استقامًا اس پر قائم رہتے ہیں۔ اس سے امت محمدیہ ﷺ یا ملت اسلامیہ بنتی ہے۔ یہ ہے وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103:3)۔ یہ ہیں انسانی زندگی کی تاریخ میں چند چمکتے ہوئے لمحات۔

بھیڑ اور قوم میں بنیادی فرق ہوتا ہے

عزیزانِ من! میں نے یہ گزارش کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کا اعجاز اور انتخاب، یہاں پوچھیے نہیں کہ یہ کیا ہیں! سوچنے کی یہ باتیں ہوتی ہیں کہ ان سینکڑوں ہزاروں الفاظ کو چھوڑ کر قرآن نے یہی لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ کہا ہے کہ یوں معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں معاشرے میں نہیں ہوتیں تو بھیڑ (Crowd) تو ہوتی ہے' وہ قوم نہیں ہوتی' امت نہیں بنتی' ملت نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ گروہ کی صورت میں اکٹھے بھی رہیں' اس طرح سے حیوان بھی رہتے ہیں مگر وہ امت نہیں بنتے اور اب یہ نظر آ گیا کہ یہ جو روز ہمارے ہاں قصہ چلا کرتا ہے کہ صاحب! اسلام میں بنیادِ قومیت کیا ہے' وجہ جامعیت کیا ہے' اس کے اندر نیشن کیسے ہے اور وہ لے آئے کہ صاحب! ایک جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے گدھے گھوڑے سب برابر ہوتے ہیں' وہ ایک قوم بن جاتی ہے۔ قرآن تو' عزیزانِ من! مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کی جہت سے بھی' ایک قوم نہیں بناتا۔ وہ تو اس جہت ایمان سے ایک قوم بناتا ہے' اعمال صالحہ سے بناتا ہے۔ اسی لیے کہتا ہے کہ وَتَـوَاصَـوْا بِـالْـحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103:3) یہ کام انفرادی طور پر کیا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اجتماعی طور پر ہی سرانجام پاسکتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ جماعتی زندگی بسر کرتے ہیں جس میں ہر فرد اپنا فریضہ اتنا ہی نہیں سمجھتا کہ جو کام اس کے ذمہ لگا دیا گیا تھا اس نے اسے پورا کر دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتا ہے کہ وہ بھی اپنا حق ادا کریں اور جس قدر مشکلات ان کے راستے میں آئیں ان کا مقابلہ ثبات اور استقامت کے ساتھ کریں۔ ان کی ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین' خود ان میں باہمی ربط وضبط کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وہ مسلسل ومتواتر اس روش پر گامزن رہتے ہیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لیے زمانے کی ریگ رواں پر اپنے نقوشِ قدم ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تواصوا کے اندر ہے کہ وہ یوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہی وہ جماعت ہے جو کامیاب وکامران زندگی بسر کرتی ہے۔ دوسرے انسانوں کی زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں کی حسرت انگیز داستانوں کے سوا کچھ نہیں۔ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ العصر ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الـھمزۃ لیتے ہیں۔

سورۃ الھمزۃ (آیات 1 تا اختتام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! اب سورۃ الھمزۃ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 104 ویں سورۃ ہے۔ سابقہ سورۃ العصر میں کہا تھا کہ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ (103:2) اگر انسان کو علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو تباہی ہی تباہی ہوتی اور اس سورۃ کی پہلی ہی دو آیات میں کہا ہے کہ وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ن o الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ (104:1-2)۔ ذرا تشریح کر کے تمہیں بتاؤں کہ تباہ کون ہوتے ہیں۔ وہاں سورۃ العصر میں تو کہا تھا کہ یہ تاریخ انسانیت کا نچوڑ ہے۔ وہ ایک Abstract (غیر محسوس) چیز بتائی تھی۔ اب قرآن اس کی Concrete (محسوس) چیزیں سامنے لاتا ہے۔ کون تباہ ہوتا ہے؟ کون برباد ہوتا ہے؟ سورۃ التکاثر میں بتایا تھا کہ یونہی مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ ایسی چیز ہے جو تمہیں انسانیت کی صحیح منزلِ مقصود کی طرف سے یکسر غافل کر دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اندر ایک ذکر فتنے کا چلا آ رہا ہے۔ یہ تکاثر تھا۔ پھر بتایا ہے کہ تباہی یوں آتی ہے۔ اب کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ تباہی کیسے آتی ہے۔ اس کے لیے ویل یعنی تباہی ہے۔ سوال یہ تھا کہ تباہی کس کے لیے؟ جواب تھا الَّذِیۡ (104:2) اس کے لیے جو جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ (104:2) دولت کو سمیٹتا رہتا ہے، جمع کرتا رہتا ہے اور گنتا رہتا ہے۔

اس سے ایک ذہنیت جنم لیتی ہے

یہ قرآن ہے۔ کہتا ہے کہ وَعَدَّدَہٗ (104:2) اور پھر ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ گنتا ہے، اور گنتا ہی رہتا ہے۔ واہ! ساری تباہیوں کا موجب Surplus Money (فاضلہ دولت) ہے۔ گنتا اسی کو ہی ہے جو فاضلہ ہوتا ہے۔ ضرورت کی چیزیں تو جب آپ Barter System (تبادلۂ اجناس کا نظام) میں لیتے تھے تو گنتی کرتے رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہاں تو ضروریات یوں پوری ہوتی ہیں۔ انسان گنتا اسی کو ہے جو باقی بچتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ ہاں، اس میں کمی ہے صاحب! کہتا ہے کہ جَمَعَ مَالًا

وَّعَدَّدَهٗ (104:2) دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہوگیا اور اب کتنا۔ یعنی وہ ننانوے کے چکر میں پڑ جائے۔ یہ ایک Mechanical Action (میکانی فعل) نہیں ہوتا کہ یونہی بچوں کی طرح ٹھیکریاں اکٹھی کرتا ہے۔ کھیل لیا' پھر توڑ کر چلے آئے۔ بچے کو اس کے بعد اس کا خیال بھی نہیں رہتا۔ وہ کھیل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ اس سے ایک ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔

کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتے: ایک ذہنیت ہے

عزیزانِ من! اس ذہنیت کو دو الفاظ میں قرآن نے بیان کیا ہے۔ میں کیا عرض کروں! جوں جوں میں اس پر غور کرتا ہوں' وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہوں۔ کہا ہے کہ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (104:1)۔ اس میں ''لکل'' کا لفظ آیا ہے یعنی ان کی اس کے بعد یہ ذہنیت (Mentality) پیدا ہوتی ہے۔ سن لیں یہ ھمزہ کیا ہوتا ہے؟ جن کے پاس اتنی دولت جمع ہوجاتی ہے' ان کی یہ ذہنیت ہوجاتی ہے کہ ان کو کسی دوسرے کے اندر کوئی خوبی ہی نظر نہیں آنے دیتی' انہیں کہیں کوئی خیر ہی نظر نہیں آتی' وہ کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ ھمزۃ وہ ہے کہ جسے اپنے سوا کسی میں کہیں کوئی خوبی ہی نظر نہ آئے۔ اوئے ستیاناس تمہارا! یہ اتنی بڑی انسانیت ہے یہ تمام مخلوق ہے ہر بچہ جو تمہاری ہی طرح پیدا ہوا اب ان میں تمہیں کہیں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ پھر کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ آپ کبھی کسی ایسے کے پاس بیٹھ کر باتیں سنیے۔ ان کے ہاں دوسرے کے متعلق نفرت' حقارت' ذلت' تحقیر اور منافرت کے سوا کوئی خوبی نہیں ہوتی اور خود سر سے پاؤں تک سارے زمانے کے عیوب کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں باہر کسی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد اگلی ذہنیت ''لمزۃ'' کی ہے۔ اس عربی زبان کے اندر اتنی سی بات ہے کہ یہ تصورات کی نشو و نما میں کوئی اور تصورات (Concepts) نظر ہی نہیں آنے دیتی۔ یہ اس کا کمال ہے۔ اس لمزۃ کی ذہنیت میں ہوتا یہ ہے کہ یہ عیب جوئی کرتا ہے' یہ کچوکے دے دے کر' عیب جوئی کرتا ہے۔ وہ یہ جذبہ اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتا کہ کسی میں کوئی خوبی نہیں' اسے اپنے اندر تسکین نہیں ہوتی۔ وہ تو ہوس کے سانپ کا ڈسا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لمزۃ ہے۔

اس ذہنیت میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھا جاتا

صرف یہی نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی برائیاں تلاش کرتا ہے یا اُسے کسی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی' یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کو کچوکے مارتا ہے' تنگ کرتا ہے' اگر طنزاً' تشنیعاً' ویسے بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا تو زبانی تکلیف پہنچاتا ہے۔ ان کی محفلوں کے اندر بیٹھ کے دیکھ لیں' ان میں سے ہر شخص یہی کچھ کرتا ہے۔ یہ جتنے ان کے نیچے کے ہوتے ہیں وہ تو ان کے نزدیک انسانیت کی صف میں ہی نہیں ہوتے۔ بات ہی ختم ہوگئی۔ جو برابر کے ہیں ان کے ہاں بیٹھ کے دیکھیے۔ ہر ایک' ایک دوسرے کو اس طرح کچوکے مارتا چلا جائے گا۔ سارا وقت ان کی

مجلسوں میں یہی گفتگو ہو گی۔ ایک دوسرے کو کچوکے مار رہے ہوں گے۔ پھر اس لفظ لمزۃ کے معنی ہوتے ہیں ''کسی جماعت کے اندر' تفریق پیدا کرنے کی غرض سے' اس طرح کچوکا مار دینا۔'' جونہی یہ دیکھا کہ کہیں کسی قسم کا کوئی اجتماع ہو رہا ہے' کوئی یونین بن رہی ہے' کہیں کچھ متحد ہو رہے ہیں' ہر وہ ترکیب استعمال کریں گے کہ جس سے ان میں تفرقہ پیدا ہو جائے۔'' آپ دیکھیے گا کہ وہ جو مال جمع کر کے ''عددہ'' کی کیفیت ہے اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک لفظ ہے جو بتاتا ہے کہ وہ یہ کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔ ابھی آگے وہ بات نہیں آئی' قرآن کہتا یہ ہے جو بڑی اہم ہے۔

یہ ذہنیت بزدلی کی بھی شکار ہوتی ہے

سنیے، برادرانِ عزیز! یہ **لمزۃ** ہوتی ہے آنکھ مارنا' سر یا آنکھ یا ہونٹوں سے اشارہ کرتے ہوئے خفیہ بات کرنا۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر کیفیت یہ ہے کہ بزدل اتنا ہے کہ کھل کے' باہر آ کے' خود نہیں کرتا' دوسروں کو آنکھوں کے اشارے سے' اکسا کے' دوسروں کے خلاف کرتا ہے۔ مخالفت کرنی ہے تو سامنے آؤ۔ یہ کبھی سامنے نہیں آئے گا مگر کچوکے لگائے گا' عیب تراشے گا تاکہ جماعت میں انتشار پیدا ہو' دوسروں کے عیب تلاش کرے گا۔

ہر وقت دوسروں سے نفرت اور حقارت کے جہنم میں جلنا

عزیزانِ من! میں **لمزۃ** کا مطلب لفظوں میں کیا بتاؤں۔ یہ سمجھنے کی بات ہوتی ہے۔ کیا بات ہے! جہنم کی آگ! یہ ذہنیت ہو جاتی ہے۔ یہ اس میں جلتا ہے۔ نفرت' حقارت' طعن و تشنیع' کچوکے' تفرقے ڈالنے کی ساری اسکیمیں کرتا ہے لیکن بزدلی کی کیفیت یہ ہے کہ باہر نکل کے کچھ نہیں کرتا۔ کبھی اس کو کہتا ہے' کبھی اس کو یوں کرتا ہے۔ یہ ہوتا ہے لمزۃ۔ یہاں کہا ہے کہ **وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ** (1) (104:1-2)۔ یہ ہیں جن کے لیے پھرتباہی آتی ہے۔ ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ **يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ** (104:3) اس کا مال اسے ہمیشہ مصیبتوں سے بچاتا رہے گا۔ ذہن میں یہ سمجھے ہوئے ہے کہ میرے لیے کچھ ضرورت نہیں ہے کہ کسی بھی قسم کی میرے اندر کوئی خوبی' کوئی صلاحیت پیدا ہو۔ ہر وقت دوسروں سے نفرت اور حقارت کے جہنم میں جلتا رہتا ہے۔

---

(1) (اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے برملا کہہ دو کہ) وہ شخص تباہ ہو کر رہے گا جس کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہو کہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا یعنی وہ ننانوے کے پھیر میں پڑ جائے (70:18)۔ ایسے شخص کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر قوم میں کوئی مصلح پیدا ہو جو سرمایہ داری کے نظام کے خلاف کچھ کہے تو یہ اس میں ہزار عیب نکالے گا' نکتہ چینی کرے گا' طعن و تشنیع تک اتر آئے گا' کوشش کرے گا کہ اس کے ساتھیوں میں پھوٹ پیدا کر دے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دولت کی بنا پر خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے

عزیزانِ من! اس ذہنیت کا مالک سمجھتا یہ ہے کہ میری یہ دولت ہمیشہ تک کے لیے مجھے ان تمام مخالفتوں سے بچائے گی۔ وہ اس کو واحد اور محکم سہارا سمجھے ہوئے ہوتا ہے۔قرآن نے کہا تھا کہ **اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى** (96:7) وہ کہتا ہے کہ مجھے کسی کی پرواہ ہی نہیں ہے **يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ** (104:4) سمجھتا یہ ہے کہ یہ دولت ہمیشہ کے لیے مجھے ان تمام چیزوں سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے مجھے کوئی اور خوبی اور صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ بے مثل اور محکم ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! غلط معاشرے پہ نگاہ ڈال کے دیکھیے' اس میں فی الواقعہ کسی اور خوبی اور صلاحیت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی صرف دولت وجہ امتیاز رہ جاتی ہے۔قرآن کہتا ہے کہ وہ سمجھتا یہ ہے لیکن کہا کہ اس کو ذرا بتا دو کہ **كَلَّا** (104:4) اب ایسا نہیں ہو سکے گا' اب ایک دورِ انقلاب آتا ہے جس میں **لَيُنْبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ** (104:4) تمہارا یہ مال ناکارہ شے کی طرح اس تباہی کے جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی اور یوں وہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔ میں یہاں' عزیز برادران! حطمة کا وہی لفظ استعمال کرتا ہوں۔ پہلا لفظ ہے: لینبذن۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ ڈال دیا جاتا ہے لیکن پھر وہی بات ہے کہ قرآنِ کریم نے بیسیوں لفظوں میں سے یہ لفظ ہی کیوں استعمال کیا ہے۔

آخر کار اس کا انجام یہ ہوتا ہے

سنیے' عزیزانِ من! قرآنِ کریم کس طرح یہ Extract (اخذ) کرتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ وہ ایک انقلاب آنے والا ہے جس میں پھر کیفیت یہ ہوگی کہ اس مال کو راتوں کی تاریکیوں میں یوں باہر پھینکتے پھرو گے جس طرح حرامی بچے کو ماں پھینکتی ہے۔ اللہ اکبر! پھینکنے کی بات تھی۔ لفظ کا انتخاب ہے۔ سوچیے' برادرانِ عزیز! کیا کچھ اس کے اندر قیامت نہیں ڈھا گیا قرآن! اس سے زیادہ تشریح میں نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی کہا تھا کہ یہ مال کہ جس کے متعلق یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ اس کی موجودگی میں مجھے اپنے اندر کوئی اور خوبی اور خیر پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں' یہ ہمیشہ کے لیے میرے لیے مدافعت کا کام دے گا۔ اس انقلاب کا ایک چکر آتا ہے تو اس کے بعد اس مال کی کیفیت ہی یہ ہوتی ہے کہ اس کو اس طرح سے تاریکیوں کے اندر' خاموشی سے اس طرح پھینک دیا جائے کہ کسی کو علم ہی نہ ہونے پائے' پتہ نہ لگے۔ یعنی اس سے زیادہ بھی کوئی اور چیز ایسی ناکارہ ہو سکتی ہے کہ جسے باہر پھینکنا پڑے۔ بہر حال اس مال کی یہ کیفیت ہوتی ہے **وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ** (104:5)۔ کے معنی ہوتا ہے کچل دینے والی چیز' ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دینے والی چیز۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ یہ حطمة کیا ہے۔ تین آیات ہیں عزیزانِ من! جن کے اوپر ایک Thesis (مقالہ) لکھا جا سکتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کا مال' وہ دولت کہ

جس کے متعلق یہ ذہن میں ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اب مجھے کسی اور کی پرواہ نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ آ و تمہیں بتائیں کہ وہ کیا ہوتی ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6-7)۔ پہلی تو یہ چیز ہے کہ آ و تمہیں بتائیں کہ یہ جہنم جس کو تم یوں سمجھ رہے ہو' یہ کچل دینے والی' یہ ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی' کیا شے ہے؟

قلب اور فواد کا مفہوم اور فرق

یہ تباہی کا جہنم خدا کے قانونِ مکافات کی جلائی ہوئی وہ آگ ہے جو انسانوں کے دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ یہاں لفظ ہے: تطلع۔ چڑھ جایا کرتی ہے۔ ایک لفظ ہے: اَلْاَفْئِدَةِ یعنی قلوب۔ قرآن ہے صاحب! ترجمہ ان دونوں الفاظ کا یعنی اَفْئِدَة اور قلب کا' دل ہوا کرتا ہے۔ قلب وہ Mind ہوتا ہے جو سمجھنے کی کچھ صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ سمجھے یا نہ سمجھے' صلاحیت کو کام میں لائے یا نہ لائے' یہ اور بات ہے۔ یہ Mind کا وہ Face (پہلو) ہے جس میں کچھ سمجھنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ فواد Mind کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق صرف Emotions (جذبات) سے ہوتا ہے۔ اس کے معنی سوز و گداز کے ہوتے ہیں۔ یہ ساری چیز جو ہو رہی تھی یہ ساری Emotions (جذبات) کے اوپر مبنی تھی۔ یہ جمع کرنا' یہ اس کا گننا' یہ نفرت' یہ حقارت' یہ حسد' یہ دوسروں کو کچوکے دینا' ان تمام میں تو قلب (Mind) کا کچھ تعلق نہیں ہے' فہم کا' ادراک کا' سوچ کا' سمجھ کا' Reason (دلیل) کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ چیز خالص Emotions (جذبات) کے اوپر آ رہی تھی' فواد کی چیز تھی۔ قرآن یہاں تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ لایا ہے کہ یہ جو جذبات کا سرچشمہ ہے' خدا کی جلائی ہوئی آگ اس سرچشمہ جذباتِ انسانی کے اوپر چڑھ جایا کرتی ہے۔ یہاں لفظ ہے تطلع۔ اس میں بلند ہو جانے کے معنی ہوتے ہیں۔

طلوع اسلام کے لغوی معنی

برادرانِ عزیز! ضمناً یاد آ گیا کہ کئی لوگ طلوعِ اسلام پہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ صاحب! اسلام تو چودہ سو سال ہوئے طلوع ہو گیا تھا اب یہ طلوعِ اسلام چہ معنی؟ ہاں' انہیں پتہ نہیں ہے۔ عربی کے اس لفظ کا ترجمہ پنجابی میں کر دیا جاتا ہے' جو صحیح نہیں ہے۔ پنجابی اچ ترجمہ کر دے نیں اودا۔ [1] ہمارے ہاں طلوع کہتے ہی اس وقت کو ہیں جب سورج چڑھتا ہے۔ عربی زبان میں طلوع ہوتا ہے: ''کسی چیز کا سرفرازیاں اور سربلندیاں حاصل کر کے اور نمودار ہوتے چلے جانا۔'' یہاں ہے تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:7) چڑھ جاتی ہے دلوں کے اوپر۔ کہاں ہے یہ آگ؟ کہاں رکھی ہے یہ؟ کیا اُسی وقت اس کو ماچس سے جلایا جائے گا ماچس سے یا اب بھی موجود ہے؟ قرآن نے تو بیسیوں مقامات پہ یہ کہا ہے کہ تمہاری ہی آنکھیں آج بند ہیں' جہنم تو تمہیں آج بھی دیکھ رہی ہے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ [2] (82:16)

---

1. وہ اس کا پنجابی میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔
2. یاد رکھو! وہ اب بھی جہنم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں (79:36; 29:54)۔ (مفہوم القرآن ۔ پرویز)

تم ہی نہیں دیکھ پاتے۔ وہ تو آج بھی تمہیں دیکھ رہی ہے۔ لیکن یہاں دیکھیے نار کہا ہے آگ کہا ہے۔ کہاں ہے وہ آگ؟ اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۝ فِيۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (104:8-9)۔ وہ آگ تم پوچھو گے کہ کہاں ہے؟ جہاں سے یہ یوں کھول دی جائے گی تو پھر یہ دلوں کو لپیٹ لے گی۔ کہا کہ یہ انہی بلند ستونوں کے اندر بند ہوئی ہے جن کو یہ زندگی کے سہارے سمجھے گا۔ یہ ٹوٹ جائیں گے اور لاوا بہہ نکلے گا: عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (104:9) وہ بڑے بڑے لمبے ستون جس کو انہوں نے سمجھا ہوا تھا کہ اس کے سہارے (Support) پر یہ میرا قصرِ مشید ٹکا ہوا ہے، انہی ستونوں کے اندر یہ بند ہے اور ہوگا یہ کہ یہ ستون ٹوٹ جائیں گے۔ اس دن ان کے اندر جمع پگھلا ہوا لاوا بہہ نکلے گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ نہ باہر سے آگ آئے گی، نہ کوئی جلانے والا آئے گا۔ اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۝ فِيۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (104:8-9)۔ انہوں نے خود یہ بند کی ہوئی ہے۔ یہ بڑے بڑے ستون جو کھڑے ہیں مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ (104:3) سمجھے بیٹھا ہے کہ میرا یہ مال ہمیشہ کے لیے مجھے محفوظ رکھنے والا ہے۔ ان کو بڑے بڑے ستون سمجھ رکھا تھا۔ اس کی زندگی کے یہی سہارے، اس کے ستون ہیں۔ کہا کہ وہ آگ ان کے اندر بند ہے: مُّؤۡصَدَةٌ (104:8) ان ستونوں کے اندر بند ہے۔ بس ہوگا یہ کہ حطمة، ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی ہے۔ ایک انقلاب آئے گا بس وہ ان ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرے گا۔ ان کے اندر وہ پگھلا ہوا لاوا بہہ نکلے گا، اسی سے یہ تباہیاں آئیں گی۔......ویل......تباہی ہے ان کے لیے۔ یہ ہے وہ چیز جو کہا ہے کہ ساری تاریخ انسانیت اس پہ شاہد ہے کہ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِيۡ خُسۡرٍ (103:2) انسان میں جب یہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے تو پھر تباہیاں اور بربادیاں اس انسان کے لیے آجاتی ہیں۔ یہ آگ ان بڑے بڑے ستونوں میں بند کر کے رکھی ہوئی ہے جنہیں یہ لوگ اپنی غلط نگہی اور خود فریبی سے زندگی کے سہارے اور حیاتِ جاوید کے آسرے سمجھے بیٹھے ہیں یعنی ان کا مال و دولت جس پر انہیں اس قدر بھروسہ ہے، خود ہی وہ آگ ہے جو ان کی متاع کو جلا کر راکھ بنا دے گی۔ آسمانی انقلاب میں سرمایہ داروں کی تباہی ان کے مال و دولت کی وجہ سے ہو جاتی ہے جسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! آج کا وقت ختم ہوا۔ آئندہ درس ہم سورۃ الفیل سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ط

❀......❀......❀

انتیسواں باب: سورۃ الفیل، القریش، الماعون، الکوثر اور الکافرون

سورۃ الفیل (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ الفیل سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 105 ویں سورۃ ہے۔

سورۃ الفیل کے متعلق ایک افسانہ

یہ وہ سورۃ ہے جس کے متعلق ایک عام کہانی مشہور ہے۔ آپ بچپن سے ابابیلوں کی یہ کہانی سنتے آئے ہونگے۔ میں اسے چند الفاظ میں دہرا دوں۔ اس کی تفسیر یوں بیان کی جاتی ہے کہ جس سال رسول اللہؐ پیدا ہوئے یعنی نبوت سے چالیس سال پہلے اس زمانے میں یمن کا ملک حبشہ کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور وہاں عیسائی گورنر تھا۔ اس نے اپنے ہاں ایک گرجہ بنایا اور یہ چاہا کہ وہ گرجا کعبہ کی طرح عربوں کے لیے ایک مرکز بن جائے لیکن عربوں کو جو تعلق کعبہ سے تھا وہ کسی بھی دوسرے معبد سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں سوال پرستش گاہ کا نہیں تھا وہ ان کا ایک قومی مرکز تھا۔ اس کیساتھ گہرے جذباتی اور مفادات کے تعلقات وابستہ تھے۔ مختصراً یہ کہ اس کا وہ گرجہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے یہ چاہا کہ کعبہ کو مسمار کر دیا جائے پھر تو یہی گرجہ باقی رہے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک بہت بڑا لشکرِ جرار لے کر کعبہ پہ چڑھائی کرنے کی غرض سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے۔ اس اعتبار سے اسے ہاتھیوں والا کہا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب مکہ والوں نے اس کی چڑھائی کی خبر سنی تو وہ مکہ کو چھوڑ کر پہاڑیوں میں جا چھپے۔ نبی اکرم ﷺ کے دادا ابو مطلب کعبہ کے متولیوں کے سب سے بڑے بزرگ تھے۔ ان کے کچھ اونٹ یمن کی فوج والے سپاہی لے گئے، تو یہ اس کمانڈر کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ تمہارے سپاہی میرے کچھ اونٹ لے آئے ہیں، انہیں واپس دلا دیا جائے۔ وہ کہنے لگا کہ میں سمجھا تھا کہ تم یہ کہنے کے لیے آئے ہو کہ کعبہ کو نہ ڈھایا جائے، تم تو اپنے اونٹوں کے لیے آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ اونٹوں کا میں مالک ہوں، اس لیے ان کی حفاظت کے لیے میں آیا ہوں۔ کعبہ کا رب اور ہے، وہ اپنے گھر کی حفاظت خود کر لے گا۔ مجھے کعبہ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اونٹ لے کر چلے گئے۔ اس نے مکہ پر چڑھائی کی تو اللہ میاں نے یہ ابابیلیں بھیجیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی ابابیل ایک چونچ میں، دو پنجوں میں، کنکریاں اٹھاتی تھیں اور اوپر سے گراتی

تھیں۔ وہ ہاتھیوں پہ سوار سپاہیوں کے سروں پر جا کر لگتیں تھی اور ہاتھیوں کے پیٹ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھیں اور اس طرح وہ ہاتھیوں والے کی فوج بھسم ہو کر رہ گئی اور کعبہ محفوظ ہو گیا۔ یہ ہے وہ تفسیر جو اس سورۃ کے متعلق بتائی جاتی ہے۔

اس قسم کی تاریخ کے راوی عجمی تھے

پہلے تو یہ چیز نوٹ کیجیے کہ اس قسم کی تاریخ اور روایات وضع کرنے والے اہل عجم تھے۔ کفر اور اسلام تو بڑی بات ہے' انہیں تو عربوں کی خصوصیات (Characteristics) کا بھی پتہ نہیں تھا۔ عرب ایسی قوم نہیں تھی کہ کوئی چڑھائی کر کے آئے اور وہ اپنی بستیوں کو خالی کر کے غاروں میں جا گھسے۔ وہ تو کٹ مرنے والی قوم تھے۔ میں صرف اسلام سے پہلے کے عربوں کی خصوصیات بتا تا ہوں۔ اور پھر اگلی چیز یہ ہے کہ اگر دشمن ان کے اونٹ لے گیا ہے تو ان کے اس عرب سپاہی کے Character (کردار) کے خلاف تھا کہ وہ اپنے اونٹ مانگنے کے لیے دشمن کے پاس درخواست کرے۔ عرب یہ کبھی نہیں کرتا تھا اور پھر یہ چیز کہ عبدالمطلب کے نزدیک کعبہ کے مقابلہ میں اپنے اونٹ زیادہ قیمتی تھے بھی عرب Character (کردار) کے خلاف تھی۔ یہ ساری چیز تو خود عربوں کے Character (کردار) کے منافی ہے۔ کہانی بنانے والے نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ ان کی نفسیات کو ہی سامنے رکھا جائے اور پھر اگلی بات تو وہ ہے جو زیب داستان کے لیے بنائی گئی کیونکہ جب تک کچھ اس قسم کی طلسماتی چیز درمیان میں داخل نہ کی جائے' مذہب دلچسپ بنتا ہی نہیں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے ابابیلوں کے پنجوں اور چونچوں میں کنکریاں دیں' ان سے انہیں بھسم کرایا اور اس طرح کعبہ کو بچا لیا۔ یہ جاہلیت کے زمانے کے کعبہ کا ذکر ہے جس میں انہی کے قول کے مطابق 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ اس کعبہ کو تو خدا نے ایسے بچایا اور جب اس کعبہ کی تولیت خود مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی ہے تو کتنی ہی بار کعبہ جلا' نہ کوئی ابابیل آئی' نہ اس نے کنکریاں پھینکیں۔ جب تک وہ بتوں کی آماجگاہ اور مسکن تھا' اس وقت تک تو اللہ میاں کو اسے بچانے کی فکر رہی اور جب وہ خالصتاً خدا کا گھر بن گیا تو پھر جس کا جی چاہے اسے لوٹے اور جس کا جی چاہے اس کو جلائے۔ پھر اللہ میاں کو اس کی فکر نہیں ہوئی۔ وہ ایک کہانی ہے جو ہمارے ہاں چلی آتی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا جب بھی ہمارے ہاں کسی بات پہ سب کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ باطل پہ ہی اتفاق ہوتا ہے' تفسیر بھی اس کی متفق علیہ گنی جاتی ہے۔ اس کے اندر تو بات اتنی صاف ہے لیکن

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

اصل حقیقت

یہ ٹھیک ہے کہ کسی نے چڑھائی کی تھی۔ [1] اب آپ اس کے الفاظ دیکھیں گے کہ کس طرح حقیقت کو نمایاں کر کے سامنے لا رہے

---

[1] جس نے چڑھائی کی تھی' اس کا نام ابرہہ (Abrahah) تھا۔ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ ملکہ بلقیس سلطنت سباء کی ایک طاقتور حکمران تھی۔ 950 ق م میں بغیر کسی قسم کی جنگ لڑے یہ سلطنت حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں قوانین خداوندی کے زیر نگیں آئی۔ [باقی اگلے صفحے پر]

ہیں۔ بات چلی آ رہی ہے کہ قریش اسلام کی مخالفت میں، مسلمانوں کی مخالفت میں، حضور نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں، انتہا تک بڑھ گئے اور اب اس بات کی خفیہ تدابیر کر رہے تھے کہ اس فتنے کا علاج یہ ہے کہ یہ جو سر فتنہ ہے (معاذ اللہ) خود نبی اکرم ﷺ، انہیں ہی ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہجرت کا واقعہ پیش آیا۔ یہ ان کی خفیہ تدبیر تھی۔ عربی زبان میں خفیہ تدبیر کو ''کید'' کہتے ہیں۔

ان کی تمام خفیہ تدبیریں ناکام ہو جائیں گی

قرآنِ کریم نے دوسرے مقامات پہ یہ کہا ہے کہ تمہارے مصاحب، رسول اللہ ﷺ کو جان سے مار دینے کے بھی خفیہ مشورے کیا کرتے تھے۔ ہم نے بھی یہ خفیہ مشورے کیے۔ تم نے دیکھا کہ کس طرح ہم نے انہیں ناکام بنا دیا۔ اب ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ یہ جو اس قسم کی خفیہ تبدیریں کی جاتی ہیں، ان کے لیے کس طرح ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جنہیں اس وقت تم Anticipate (پیش قیاسی) بھی نہیں کر پاتے یا کم از کم وہ تمہارے ذہنوں میں اجاگر ہو کر بھی نہیں آتے اور وہ تمہاری ساری خفیہ تدابیر کو ناکام بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ تم اپنی آنکھوں کے سامنے یہ تماشا دیکھ چکے ہو۔ یہ وہ قریش تھے جو اس زمانے میں موجود تھے جب وہ چڑھائی

[گزشتہ سے پیوستہ]---

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ سلطنت 1100 ق م سے 115 ق م تک اپنے انتہائی عروج پر رہی۔ یہ سلطنت آج کے یمن، صومالیہ اور ایتھوپیا پر مشتمل تھی۔ 115 ق م میں ہمائریز (Himairis) کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ جنوبی جنگجو بہائر (Bihair) لوگ تھے (ص۔ 318)۔ انہوں نے 300 عیسوی تک اس سلطنت پر حکمرانی کی۔ ان کے بعد دوسرے قبائل نے یمن کا کنٹرول سنبھال لیا۔ بعد ازاں 525 عیسوی میں انہیں ایتھوپیا۔ ابے سینیا (Ethipoia - Abyssinia) کی عیسائی سلطنت نے شکست دی اور پھر ابرہہ (Abrahah) کو یمن کا گورنر بنا دیا۔ 550 اور 555 عیسوی کے دوران ابراہہ نے یمن میں صنعاء (San'aa) کے مقام پر ایک عظیم الشان اکلیشیا (Ekklesia) گرجا تعمیر کیا اور کعبہ کی تقدیس وشہرت کو کم کرنے کے لیے ہمسایہ ملک اور اقوام کو کعبہ میں حج کرنے کے بجائے یہاں اس گرجا میں آ کر حج کرنے کی دعوت دی۔ ناکامی پر اس نے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ 60,000 نفوس کی مضبوط نفری، ہزاروں گھوڑوں اور اونٹوں اور ہاتھیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ یہ 570 عیسوی کا واقعہ ہے۔ یہی سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا سال ہے۔ تاریخ میں اسے ''عام الفیل'' کہتے ہیں۔ ابرہہ کو 3 عربوں نے خفیہ راستے سے حملہ کرنے کا کہا تھا۔ چونکہ دھوکا اور غداری کرنے والوں کو اہل مکہ قبل از اسلام حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انہوں نے مکہ کے باہر ''منا'' کے میدان میں ان تین افراد کے تین مجسمے (Statues) بنائے اور اظہارِ نفرت وحقارت کے لیے ان پر ہر سال پتھر برسانے لگے۔ آج انہی تین غداروں کے تین ستون نصب ہیں جنہیں چھوٹا، درمیانہ اور بڑا شیطان کہا جاتا ہے اور حجاجِ کرام انہیں پتھر مارتے ہیں۔ (ص ص 521-520) تاکہ معلوم رہے کہ غداری کا یہ انجام ہوتا ہے۔

(Shabbir Ahmed (2003). The Qur'an as it Explains itself. USA, Lauderhill: Galaxy publications.

اس کی مزید تفصیل اور وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰــہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص۔ 309 (فٹ نوٹ نمبر 1)۔

کرنے والا [1] آیا ہے۔ وہ ہاتھیوں کی فوج لے کر آیا ہے۔ وہ لوگ فوج میں موجود تھے۔ انہی سے یہ کہا گیا ہے کہ اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ [2] (105:1) تم یہ خفیہ سازشیں کرتے ہو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ ایک بہت بڑی خفیہ سازش کرنے والا ہاتھیوں والا آیا تھا۔ اس کی یہ خفیہ سازش کیا تھی؟ آگے ہے کہ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَهُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ (105:2)۔ تو کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ اس کی خفیہ سازش کو کس طرح ناکام بنا دیا گیا تھا۔

سب سے پہلی کتاب قرآنِ حکیم تھی جو لکھی گئی

یہ چیزیں ان لوگوں کے ہاں کے شعراء کے کلام کے اندر موجود ہیں۔ اس زمانے میں تو عربوں کے ہاں کوئی لکھی ہوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ قرآن سب سے پہلی کتاب ہے جو ان کے ہاں لکھی گئی ہے۔ اس قسم کے واقعات میں یہ واقعہ بڑا مشہور تھا۔ ان کے شعراء اپنے شعروں میں، اپنی نظموں میں، اس قسم کے واقعات کو مرقوم کرتے تھے اور وہ واقعات زبان زدِ خلائق ہوتے تھے۔ ان سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں بھی وہاں معلوم ہیں کہ یہ کس طرح سے ہوا تھا۔

غداری کا عمل اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! وہ خفیہ سازش کیا تھی؟ مکہ ہی سے کسی نے غداری کی تھی اور وہ تین تھے۔ انہوں نے اس کو بتایا تھا کہ بجائے اس کے کہ تم سیدھے راستے سے مکہ پہ چڑھائی کرو، دیکھو پہاڑیوں کے پیچھے سے ایک راستہ آتا ہے، یہ راستہ بڑا Unfrequented (سنسان) سا ہے یعنی اس پہ بہت ہی کم لوگ آتے جاتے ہیں۔ وہ چھپا ہوا سا راستہ آتا ہے، اس میں سے اگر تم خاموشی سے آ جاؤ تو اہل مکہ کو اس وقت پتہ چلے گا جب تم اس کے سر پر آ پہنچو گے۔ یہ تھی "کید" یعنی یہ تھی خفیہ سازش۔ چنانچہ وہ شاہراہ کو چھوڑ کر ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے پیچھے سے، جو خفیہ راستہ تھا، اس میں سے آ رہا تھا اور ان کے سر پر آ پہنچا تھا لیکن آپ دیکھیں کہ کس طرح ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں آپ قبل از وقت ذہن میں بھی نہیں لا سکتے۔ اور یہی اسباب یہاں پیدا ہوئے۔

پرندوں کی پرواز نشاندہی کا باعث ہے

اس زمانے میں بھی اور آج بھی گولوں اور گولیوں کی آوازوں کے قریب پرندے نہیں جاتے۔ چیلوں اور گدھوں کی کیفیت یہ تھی

---

[1] ابرہہ (Abrahah) [2] (اگر یہ مخالفین اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ ان کی اتنی بڑی قوت کو کون شکست دے سکتا ہے، ان کی خفیہ سازشوں کو کون طشت از بام کر سکتا ہے، تو اِن سے کہو کہ) کیا تم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا کہ تمہارے نشو و نما دینے والے نے اس لشکر کا کیا حشر کر دیا تھا جو تم پر ہاتھی لے کر حملہ آور ہوا تھا؟ (2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

اور ہے کہ By Instinct (جبلی طور پر) یہ جانتے تھے اور آج بھی جانتے ہیں کہ اگر بہت بڑا قافلہ، بہت بڑا لشکر جاتا تھا تو وہ اس کے ساتھ ساتھ اوپر اڑتے چلے جاتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ قافلہ ہے اور یہ جب کہیں جا کر قیام کرے گا تو وہاں کھانے پینے کو کچھ ملے گا اور اگر یہ فوج ہے تو پھر فوج تو جب جا کر میدانِ جنگ میں لڑے گی اور اس کے بعد تو یہ گدھوں اور چیلوں کی موج ہے۔ اتنا زیادہ سامان اور اتنا بڑا ذخیرہ خوراک تو انہیں کہیں مل ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ عام کیفیت تھی کہ اگر کہیں فوج کوچ کرتی تھی تو یہ گدھیں اور چیلیں اُس کے اوپر ساتھ ساتھ منڈلاتی ہوئی چلی آیا کرتی تھیں۔ یہ چیز ان کے ہاں کے شعراء کے کلام میں موجود ہے۔ یہ خفیہ راستہ تو اس [1] نے اختیار کیا تھا لیکن یہ چیلوں اور گدھوں کو کیوں کر روکا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ اوپر سے اس کے ساتھ ساتھ چلیں۔

ان عربوں کو معلوم تھا کہ اگر کہیں اس طرح سے کسی ایک خاص راستے پہ چیلیں اور گدھیں اڑتی ہوئی آئیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ نیچے کوئی جمِ غفیر چلا آ رہا ہے۔ تو انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ان پہاڑیوں کے پیچھے سے کوئی جمِ غفیر آ رہا ہے اور وہ ان راستوں سے آ رہا ہے جو عام کھلے ہوئے شاہراہیں نہیں ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا۔ آپ نے فلموں میں دیکھا ہو گا کہ پرانے زمانے میں جہاں جہاں شہروں کے گرد پہاڑیاں ہوتی تھی وہ ان پہاڑیوں کے اوپر بڑے بڑے پتھر اکٹھے کر کے ان کے آگے لکڑیاں لگا چھوڑتے تھے۔ اگر کبھی غنیم کہیں نیچے سے آ رہا ہے تو یہ بڑا آسان تھا کہ یہ اوپر پہنچے اور ان کے سامنے جو پتھروں کو روکنے والی لکڑیاں ہیں، ان کا ایک رسہ کاٹا تو آپ سوچیے کہ پہاڑی کے اوپر دس دس ہزار من کا پتھر جب لڑھکے گا تو وہ نیچے آ کر کیا کچھ نہیں کر دے گا۔

مکہ والوں کا سامانِ حفاظت

عزیز برادران! ان مکہ والوں نے اپنی پہاڑیوں کے اوپر یہ سامانِ حفاظت بنا رکھا تھا۔ وہاں روز کی تو جنگ تھی۔ تو یہ ساری چیزیں انہوں نے ان پہاڑیوں کے اوپر رکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ جب اس طرح چیلوں اور گدھوں نے اس آنے والے کے راستے کی غمازی کی تو وہ فوراً ادھر سے ان پہاڑیوں کے اوپر چڑھے اور وہاں جا کر انہوں نے نیچے دیکھا کہ ایک لشکر چلا آ رہا ہے۔ کرنا ہی کیا تھا، انہوں نے پتھروں کو روکنے والی لکڑیوں کے رسے کاٹے تو اوپر سے یہ گرنا شروع ہوئے ہیں، تو لڑھکتے ہوئے نیچے جا کر انہوں نے بھرکس نکال دیئے اور اس طرح ان کی جو خفیہ سازش تھی، وہ ناکام رہ گئی۔ یہ تھا واقعہ۔ اور یہ دیکھیے کہ کس طرح قرآن نے یہی کہا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا: **اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ** (105:1) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے خدا نے اُس ہاتھیوں والی فوج کے ساتھ کیا تھا؟ **اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ** (105:2) کیا ان کی وہ جو خفیہ سازش تھی، اسے ناکام بنا کر نہیں رکھ دیا گیا تھا؟

---

[1] ابرہہ (Abrahah) گورنر یمن۔

وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ❶ (105:3)

یہ ابابیل کیا تھے؟

یہ ہمارے ہاں ابابیل ابابیلاں نوں کہندے نیں جیڑ یاں شام نوں نکل دیاں نیں۔ ❷ وہ مشکل ہی یہ ہے کہ لفظ عربی کے ہوتے ہیں اور ہم ان کا ترجمہ پنجابی میں کر لیتے ہیں۔ عربی زبان میں ابابیل کے معنی ہوتے ہیں: ''جھنڈ کے جھنڈ'' ان پرندوں کو' ان چڑیوں کو نہیں کہتے۔ کوئی پرندے جب جھنڈ کے جھنڈ میں' اس طرح زیادہ تعداد میں اڑیں' تو ان کو ابابیل کہتے ہیں۔

یہ عمل چڑیوں کا نہ تھا

یہ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ (105:3) یہ گدھیں اور چیلیں ایک ایک دو دو نہیں اڑتے' ان کے پورے جھنڈ کے جھنڈ' ان کے اوپر اڑتے چلے جاتے تھے تو پھر ان کے اڑنے سے تمہیں معلوم ہو گیا۔ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ❸ (105:4)۔ ان چڑیوں نے کنکریاں نہیں ماریں۔ یہاں تَرۡمِيۡهِمۡ (105:4) ہے۔ اس کا فاعل وہی ہے' جو الم تر کا فاعل ہے۔ تم نے ان پر جو بڑے بڑے پتھر تھے ان کی بارش برسا دی۔ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ❹ (105:5)۔ اور اس کے نیچے وہ جو ہاتھی لے کر چڑھ آیا تھا وہ دیکھیے کس طرح پس کر رہ گیا۔ اس کا لشکر یوں ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس قسم کے منصوبے باندھنے والے خفیہ سازشیں اپنے ذہن میں رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی چیلوں سے وہ چُوک جاتے ہیں تو وہ سازشیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ تم بھی تو اسلام کے خلاف' مسلمانوں کے خلاف' نبی اکرم ﷺ کے خلاف' یہ سازشیں کر رہے ہو۔ تو ان سازشوں کے اندر بھی ایسی چیزیں نمودار ہوں گی کہ تم دیکھو گے کہ یہ ناکام رہ جائیں گی۔

حضور کے خلاف سازش

برادرانِ عزیز! یہ جو سازش تھی کہ نبی اکرم ﷺ کو رات میں سوتے' ان کے مکان کے اندر' انہیں قتل کر دیا جائے' سازش ناکام ہوئی اور حضور ﷺ وہاں سے بالکل حفاظت سے' امن وامان سے' نکل گئے۔ مدینہ کی طرف ہجرت کر کے آ گئے تو ان سے یہ کہا گیا ہے کہ یاد

---

❶ (انہوں نے پہاڑ کی دوسری طرف ایک غیر مانوس خفیہ راستہ اختیار کیا تھا تا کہ وہ تم پر اچانک حملہ کر دیں۔ لیکن) چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ (جو عام طور پر لشکر کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں فطری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں گی) ان کے سر پر منڈلاتے ہوئے آ گئے اور اس طرح تم نے دور سے بھانپ لیا کہ پہاڑ کے پیچھے کوئی لشکر آ رہا ہے (یوں ان کی خفیہ تدبیر طشت از بام ہو گئی)۔

❷ ہمارے ہاں ابابیل ان چھوٹے پرندوں کو کہتے ہیں جو شام کو نکلتے ہیں۔

❸ چنانچہ تم نے پہاڑ پر چڑھ کر' ان پر سخت پتھراؤ کیا۔

❹ اور اس طرح اس لشکر کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ (یعنی اس کا کچومر نکال دیا۔) (1-3-4 مفہوم القرآن۔ پرویز)

رکھو! مخالفتوں میں اس قسم کی خفیہ سازشیں کام نہیں دیا کرتیں' نکھر کر' ابھر کر' سامنے آؤ۔ اگر مخالفت کرنی ہے تو یہ چیزیں ناکام ہو کر رہا کرتی ہیں۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کیسے ناکام ہوئی تھی۔ اسی طرح تمہاری یہ چیز بھی ناکام ہو گی۔ یہ ہے سورۃ الفیل برادرانِ عزیز! جس میں وہ چڑیوں کے پنجوں میں کنکریاں دے کر ہاتھیوں کے لشکر کو مروایا جاتا ہے۔ انہی سے کہا جا رہا ہے' انہوں نے ہی یہ سب کچھ کیا تھا' انہی سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے یہ پتھر مارے تھے۔ بڑے بڑے ایسے پتھر' جنہیں پنجابی میں کھینگر کہتے ہیں' تم نے وہاں سے لڑھکائے اور ان کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

ضمناً میں عرض کروں یہ جو حج میں شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ وہاں شیطان ہے اور ان کو یہ سارے آدمی جا کر سات سات کنکریاں مارتے ہیں۔ اور پھر ودھ ودھ کے مار دے نیں۔ [1] لیکن بات ہے ان تین شیطانوں کی' جن کو چودہ چودہ لاکھ' ہر سال سات کنکریاں' جوتے' یہ سارا کچھ' ان کو مارے جاتے ہیں' لیکن وہ اسی طرح سے قائم و دائم کھڑے رہتے ہیں' ویسے کے ویسے ہنستے رہتے ہیں۔ ہزار برس سے یہ ان کو مار رہے ہیں وہ اسی طرح سے کھڑے ہیں۔ ان سے شیطان مرتا ہی نہیں۔ یہ وہ تین تھے جنہوں نے غداری کر کے اس کو راستہ بتایا تھا۔ عربوں نے بعد میں جب معلوم کیا تو انہیں یہاں سنگسار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ قوم کے ساتھ غداری کرنے والوں کا یہ حشر ہوتا ہے۔ عربوں کے Character (کردار) میں غداری کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ ان کے ہاں بڑی انہونی بات ہوئی تھی۔ انہوں نے اس چیز کو اپنے ہاں یادگار بنا لیا تھا۔ وہ ہر سال حج کی تقریب پر اس کی یاد کو دہرایا کرتے تھے۔ اس مقام کے اوپر تین مجسمے کھڑے کر دیئے تھے۔ اور پھر وہ اپنے بچوں کو بتایا کرتے تھے کہ یہ تھے وہ کہ جن حرام خوروں نے قوم کے ساتھ غداری کی تھی' ہم نے پتھر مار کے ان کو تباہ کیا تھا۔ تم ان کی یاد میں انہیں پتھر مارو۔ ان کو سنگسار کیا تھا۔ وہ ان کے سنگساری کی یاد میں قوم کے بچوں کو یہ یاد دلانے کے لیے کہ جو قوم سے غداری کرتا ہے' اس کا حشر کیا ہونا چاہیے' ان بچوں سے اور آنے والی جنریشن کے دل میں اس واقعہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے حج کی تقریب پر وہاں یہ کیا کرتے تھے۔ وہ ہاتھی والوں کے قصے میں ابابیلوں نے کنکریاں مار دیں' اب یہ ہمارے حاجی جا کر وہ جو تین گڑے ہوئے پتھر ہیں' ان کو جا کر یہ کنکریاں مار آتے ہیں۔ نہ وہ قصہ ان کے ذہن میں' نہ وہ بات وہاں والی ہے۔ یہ ہے سورۃ الفیل جو آپ کے ہاں ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ تمہارے اس قسم کے خفیہ ارادے اور سازشیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی اور اسی کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ جب اتنے بڑے لشکر کو یوں شکست مل گئی تو تم کس گنتی میں شمار ہو۔ تمہاری خفیہ تدابیر بھی ناکام رہ جائیں گی۔

عزیزانِ من! سورۃ الفیل اختتام کو پہنچی۔ اب ہم اگلی سورۃ قریش لیتے ہیں۔

---

[1] ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مارتے ہیں۔

سورۃ القریش (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ قریش شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسواں پارہ ہے اور 106 ویں سورۃ ہے۔

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ o اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ o فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ o الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ (106:1-4)۔ کہا گیا ہے کہ یہ جو اسلام تمہارے خلاف اٹھا ہے یا یہ جو مسلمانوں کی جماعت تمہارے خلاف اٹھی ہے' انہیں کوئی نسلی تعصب نہیں ہے' کوئی مفادات کا تعصب نہیں ہے' کوئی منافرت کی بات نہیں ہے۔ بات اصل میں کچھ اور ہے۔ اور وہ ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ تم ہی میں سے یہ جماعت کھڑی ہو کر تمہارے ہی خلاف کیوں اس طرح سے کھڑی ہوئی ہے؟ اور یہ تصادم کیوں ہو رہا ہے؟ وجہ بڑی صاف ہے۔

حج کے وقت نوعِ انسانی کو دعوت عام

برادرانِ عزیز! دین اپنے نظام کے لیے ایک مرکز مقرر کرتا ہے' وہاں اجتماعات ہوتے ہیں' اس دین کے نظام کے استحکام کے لیے مشورے کیے جاتے ہیں۔ یہ وقت نہیں' اس سے پیشتر میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ حج سے مقصود [1] ہی یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو دعوت دی جائے کہ وہ آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ **لِیَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ** (22:28) یہ نظام ان کی یعنی نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ یہ نظام ایسا نہیں ہے کہ کسی کو اندر جانے کی اجازت ہی نہ دے۔ یہ حج مسلمانوں کا مخصوص اجتماع نہیں ہے یا نہیں تھا۔ میں کیا کہوں۔ یہ تو صرف اس اجتماع کے انتظام کرنے والے تھے۔ قرآن میں یہ چیز موجود ہے کہ تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ یہاں آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام انسانیت کے فائدے کے لیے کیا کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے' ایک مرکز قائم کیا جاتا ہے۔ بہر حال' وہ ایک محسوس مرکز ہوتا ہے۔ اسے آپ شہر کہہ لیجیے۔

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005۔

ہر نظام کا ایک محسوس قومی مرکز ہوتا ہے

جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ جب آپ نے کمیونزم کہنا ہوتا تھا تو ماسکو کہا کرتے تھے اور اب Russia (روس) کہتے ہیں۔ اسی طرح China (چین) کے لیے پیکنگ کہتے ہیں۔ نیویارک سے مراد امریکا کا نظام ہے۔ یہ ان نظاموں کے محسوس مراکز ہیں۔ اس محسوس مرکز کے لیے مکہ ہے اور مکہ کے اندر یہ توحید کا مرکز ہے جسے آپ کعبہ کہتے ہیں۔ وہ دین میں کعبہ تھا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے اور جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہی' جو آپ کے نظام کے مراکز ہیں' وہ یاترا کے لیے مندر بن جاتے ہیں۔ یہ کچھ آپ کے ساتھ ہی نہیں ہوا' اس سے پہلے بھی جتنے انبیائے کرام نے آ کر دین کے نظام کو قائم کیا' انہوں نے اس قسم کے مراکز قائم کیے تھے۔ یہ بیت المقدس کے مرکز' یروشلم کے مرکز' اسی نظام کے غماز ہیں۔ آپ یہودیوں کی تاریخ پڑھ کر دیکھیے۔ یہ ان کے ہاں کے قومی مراکز تھے۔ وہاں ان کی سلطنتیں قائم تھیں۔ یہ ان کے Capital city (دارالسلطنت) تھے۔ ان کی قوم کے اجتماع کے لیے مرکز تھے۔ جب قوم کی وہ اجتماعیت ختم ہوئی تو یہ جو نظام کے مراکز تھے' وہ یاترا اور Pilgrimage کے لیے مندر بن کر رہ گئے ہیں' ہیکل بن کر رہ گئے ہیں۔ اب ان کا نام ہی ٹیمپل ہو گیا ہے۔ یہودیوں کے بھی وہ ٹیمپل ہی ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں بھی یاترا کے مندر ہیں' یہاں بھی انبیائے کرام نے آ کر یہ چیزیں دی ہوں گی انہوں نے تو وہ دین کے مراکز بنائے تھے۔ بعد میں وہ یاترا کے مندر بن جاتے ہیں۔ وہاں جا کر کچھ رسومات ادا کر دی جاتی ہیں اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ فریضہ پورا ہو گیا۔ دین جب مذہب میں بدل جاتا ہے تو دین کے نظام کے جتنے شعائر اور ارکان ہوتے ہیں وہ سارے کے سارے مذہب کی رسومات بن جاتے ہیں۔ قریش نے کعبہ کو یہی کچھ بنا رکھا تھا۔

کعبہ تو انسانیت کا مرکز تھا

کعبہ دین کے نظام کا' انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا' عظیم مرکز تھا' ان کی منفعت کوشیوں کی جتنی بھی کوششیں ہوتی تھیں' یہ ان کے لیے ایک تجربہ گاہ تھا' یہ ان کی آماجگاہ تھا۔ اس سے یہ مقصد تھا۔ اس کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل ہوا تو یہ کعبہ عربوں کے ہاں یاترا کا مندر بن گیا اور یہ اس کے مہانت بن گئے' اس طرح کعبہ نظام کا ایک محسوس مرکز نہ رہا۔

مہانتوں کی عزت بدرجہ اتم اور آمدنی بے شمار

آپ دیکھیے! دنیا میں جہاں جہاں بھی یہ مندر اور ان کے یہ مہنت ہیں' ان کی بڑی عزت ہوتی ہے' ان کی بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ دنیا کے اندر جو سب سے زیادہ امیر ہیں وہ یہ کرسچن ہیں۔ یہ جو یورپ کا چرچ تھا اس سے بادشاہ قرضہ لیا کرتے تھے۔ مہنتوں کے پاس اب بھی کچھ کم دولت نہیں ہوتی۔ مہنت کسی قوم کا ہو' اس کے پاس بڑی دولت ہوتی ہے۔ ان کی یہ عزت اور دولت کیوں ہوتی ہے؟ وہ خدا کے گھر کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں: چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر' مندروں سے' پوجاؤں سے' مسجدوں سے اور

بڑے پیمانے پر یروشلم سے‘ مکہ سے‘ جتنی بڑی نسبت ہے اتنی ہی بڑی آمدنی کا وہ زیادہ ذریعہ ہے۔ان مراکز کے ساتھ اپنی نسبت رکھنے سے یہ سارے مفاد حاصل کرتے ہیں۔قریش کو کیا مفاد حاصل تھے؟ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ ذرا سوچو کہ **لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ o اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ** (106:1-2) قریش کعبے کے متولی ہیں‘ اس کے لیے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت وعظمت ہے۔اسی عزت واحترام کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ قبائل اور ممالک نے ان سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹے گا چنانچہ یہ سردی اور گرمی‘ سال بھر‘ اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ عرب کا وہ ملک ہے کہ دن دیہاڑے لوگوں کے قافلے لٹ جاتے ہیں اور اے قریش! تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تمہارے قافلے سردی اور گرمی میں متواتر سرگرم سفر رہتے ہیں‘ کوئی ان کی طرف انگلی اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔تمہیں ان عربوں کے اندر کس طرح یہ پوزیشن حاصل ہوئی ؟ اس کعبہ کے ساتھ نسبت سے۔

جتنا زیادہ مفاد اتنی ہی زیادہ دین کی مخالفت

یہاں کہا کہ ذرا سوچو کہ **فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ** (106:3)۔کیا پھر یہ تقاضائے انسانیت نہیں کہ جس رب کے گھر کے ساتھ نسبت رکھنے سے تمہیں یہ کچھ حاصل ہو رہا ہے‘ اس رب کے احکام کی محکومیت اختیار کرو اور اگر اس کی محکومیت نہیں اختیار کرنی ہے تو اس کے ساتھ نسبت چھوڑ دو۔ یہ کتنی بڑی دنائت اور کتنی بڑی کمینگی ہے کہ خدا کے ساتھ نسبت رکھنے سے تم مفاد تو حاصل کرو اور اس خدا کے دین کی اور خدا کے قوانین کی سرکشی اور مخالفت کرتے چلے جاؤ۔کبھی دنیا میں ایسا ہوا ہے کہ کسی آقا کے نام سے تم اتنا کچھ حاصل کرو اور اس آقا کی خلاف ورزی اور سرکشی اختیار کرو۔ دونوں میں سے ایک چیز اختیار کرو۔اگر کعبہ کے ساتھ نسبت رکھنے سے یہ مفاد حاصل کرنے ہیں تو پھر کعبہ کے جو فرائض اور ذمہ داریاں تم پہ عائد ہوتی ہیں انہیں پورا کرنا ہے اور اگر وہ تم پورا نہیں کرنا چاہتے تو اپنی نسبت اس کے ساتھ ہٹالو‘ ختم کرلو۔

یہ سب کچھ تم سے واپس لے لیا جائے گا

برادرانِ عزیز! یہ بڑی صاف اور واضح بات ہے لیکن وہ نہ یوں کرتے تھے‘ نہ وہ کرنے پہ آمادہ تھے۔اس لیے یہ کہا گیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی تولیت تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جائے اور ان کے ہاتھوں میں دے دی جائے جو اس نظام کو صحیح معنوں میں قائم کریں اور خدا کے احکام وقوانین کی محکومیت اختیار کریں۔

نسبت پیکنگ اور ماسکو سے مگر نظام سرمایہ داری کا: یہ ناممکن ہے

یہ سیدھی سی چیز ہے کہ پیکنگ ان کے پاس رہنا چاہیے جو کمیونزم پر Believe (یقین) کرتے ہیں۔تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم سارا

نظام جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ رکھتے ہو، اور نسبت پیکنگ کے ساتھ یا ماسکو کے ساتھ رکھتے ہو۔ یوں کہا جائے گا کہ وہ عہد و پیمان، جو تمام قبائل عرب میں اور دوسرے بادشاہوں نے، قریش کے ساتھ کر رکھے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے قافلے سردی، گرمی، یہاں سے وہاں تک، مسلسل ایک کے ساتھ دوسرے ملتے ہوئے چلے جاتے ہیں، یہ بہت بڑا سامانِ حفاظت ہے اور بہت بڑی رعایت تھی جو کسی قبیلے کو وہاں حاصل تھی کہ اس کے قافلے کو کوئی نہ لوٹے۔ اس سے ان کی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ لوگ اپنے اپنے سامان بھی انہی کے قافلے کے ساتھ کر دیتے تھے کہ ان کے ساتھ رہنے سے حفاظت رہے گی۔ کہا کہ جب یہ بات ہے تو فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (106:3) کیا پھر یہ لازم نہیں آتا، اس کا فکری نتیجہ یہ نہیں ہے کہ تم اس گھر کے رب کے احکام کی اطاعت کرو۔ اس گھر کی نسبت سے تمہیں یہ حاصل ہے۔ اس کے بعد دو چیزیں گنائی ہیں کہ اس سے تمہیں کیا کچھ حاصل ہے: الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ [1] (106:4)۔ یہ دیکھیے، عزیزانِ من! کہ خدا جب کسی قوم کو اپنے انعامات گنا تا ہے تو وہ انعامات کیا ہوتے ہیں؟ یہاں کہا کہ تمہیں کھانے کے لیے روٹی دی، خطرات سے محفوظ رکھا۔ بس دو ہی چیزیں گنائی گئیں۔

ایک سبق آموز مثال

عزیز برادران! اس کے برعکس، سورۃ النحل میں ایک مثال ہے کہ ایک بستی تھی، چاروں طرف سے رزق کا سامان کھنچا چلا آتا تھا۔ انہوں نے قوانین خداوندی سے انحراف کیا تو اسے خدا کا عذاب آیا اور اس عذاب کی شکل یہ تھی کہ ان پہ بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہوا۔ لہٰذا کسی قوم کا روٹی کے لیے کسی دوسرے کا محتاج ہو جانا یا اپنی حفاظت کے لیے دوسرے کا محتاج ہو جانا، خدا کا عذاب ہے اور جب کوئی قوم ان چیزوں کے لیے دوسروں کی محتاج نہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس قوم پر خدا کا انعام ہے۔ سورۃ النحل [2] میں یہی انعام گنایا ہے کہ تمہاری بھوک میں تمہیں روٹی دی، خوف کو امن سے بدلا، تو کیا اس کے بعد اور کچھ نہیں تو سپاس گزاری کا ہی یہ تقاضا نہیں ہے کہ تم اس گھر کے خدا کے احکام کی محکومیت اختیار کرو؟ تمہارے ساتھ یہ جو تصادم ہے، مخالفت ہے، وہ اس بنا پر ہے کہ تم خدا کے احکام کی محکومیت نہیں اختیار کرتے، ورنہ کوئی دوسری وجہِ دشمنی نہیں ہے۔ بات صاف کر کے کہہ دی۔

یادرکھو! خدا کے قوانین بڑے ہی اٹل ہیں

عزیزانِ من! اگر کعبے کے ساتھ نسبت رکھنے والی قوم قریش، ربِ کعبہ کے قوانین کی اطاعت اور ربوبیت نہیں اختیار کرتی، تو

---

[1] اس نے تمہیں کھانے کے لیے روٹی دی اور خوف وخطرات سے محفوظ رکھا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] ان نکات کی مکمل تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پرویز: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2003ء۔

ان کے ہاتھوں میں اس کی تولیت نہیں رہنے دی گئی اور نہ ہی کسی ایسی قوم کے ہاتھوں میں رہنے دی جائے گی، جو قریش کے ہی نقش پا پر چلنے والے ہوں گے کہ مفادات جتنے حاصل ہوں انہیں حاصل کر لیا جائے مگر ان کے لیے جو ذمہ داریاں Obligations عائد ہوتی ہوں، انہیں پورا نہ کیا جائے۔ کہا کہ دیکھو، یاترا کے لیے مندر بنا کر رکھ دینا وہی چیز ہے جو قریش نے کعبے کے ساتھ روا رکھی تھی اور جس کی بنا پر کعبے کی تولیت ان سے چھین لی گئی تھی۔ کہا کہ ہماری تمہارے ساتھ یہ وجہ نزاع ہے۔ یہ قریش کے متعلق کہا ہے۔

اب تک جو چیزیں آ رہی تھیں، برادرانِ عزیز! وہ ان مخالفین کے متعلق تھیں جو کھلے بندوں اسلام کے خلاف آ رہے تھے۔ اب سورۃ قریش یہاں ختم ہوئی۔ ہم سورۃ الماعون لیتے ہیں۔

سورة الماعون (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! سورۃ الماعون کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 107 ویں سورۃ ہے۔ یہ سورۃ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کے متعلق ہے، نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ سورۃ گروہ کے متعلق نہیں، ایک ذہنیت کے متعلق ہے اور وہ ذہنیت خود مسلمانوں سے متعلق ہے۔ مسلمانوں کے متعلق اس کی شہادت اس لیے ہے کہ اس میں انہیں مخاطب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:4-5) ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے اور تباہی کی یہ بات آگے آئے گی۔

قرآن کا خطاب براہِ راست ہم مسلمانوں سے ہے

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اب اس سورۃ میں خطاب جاہلیت کے زمانہ کے کفار سے نہیں ہے، اسلام لانے کے بعد بھی غیر مسلموں سے نہیں ہے بلکہ اب اس سورۃ کا خطاب خود مسلمانوں سے ہے۔ اس لیے یہ سورۃ بڑی ہی غور طلب ہے۔ اس کا خطاب براہِ راست ہم سے ہے۔ بات شروع کی گئی ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1) کیا تو نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ انکار نہیں کرتا، زبان سے اقرار کرتا ہے مگر اپنے عمل سے اس کو جھٹلاتا ہے۔ یہ بات یوں سمجھ میں نہیں آتی کہ اقرار کرنے والا عمل میں کس طرح جھٹلاتا ہے۔ ہر محراب و منبر سے یہ دعویٰ سنیں گے کہ اسلام دنیا کے اندر سب پہ غالب آنے کے لیے ہے، سب سے افضل اور اعلیٰ ہے، مومنوں کا ہر ایک پر غلبہ رہے گا، یہی دین فطرت ہے، اسی میں انسانوں کی تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ یہ سارا کچھ وہاں پہ ہوگا۔ اس کے بعد جب مسلمان دنیا کے سامنے جا رہے ہیں تو سب سے زیادہ محتاج، سب سے زیادہ ذلیل، یہ قوم نظر آ رہی ہے۔ یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آتا ہے۔ مغرب کے مفکر میرے پاس آتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، جب ان سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو وہ اس سے مطمئن ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ واقعی یہ Problems (مسائل) جو ہمیں درپیش ہیں، ان کا حل یہ ہے لیکن اس کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں شبہ اس میں ہے کہ نظری طور پہ تو یہ سب کچھ ٹھیک ہے عملاً یہ اپنے نتائج پیدا نہیں کر سکے گا۔ میں پوچھتا

ہوں کہ یہ آپ نے کیسے کہہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ دیکھیے تو سہی' ہزار برس سے ایک قوم چلی آ رہی ہے' جو ان قوانین کو' اس نظام کو' اپنا امام کہہ رہی ہے۔ آج بھی دنیا کے اندر ساٹھ ستر کروڑ ❶ انسان ایسے بستے ہیں' جن کا یہ دعویٰ ہے' جن پہ ان کا ایمان ہے اور اس کے بعد دیکھیے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ کمزور' ضعیف اور ناتواں ہیں۔ اگر اس نظام' اس قانون اور اس اسلام کے اندر یہ خاصیت اور صلاحیت ہوتی تو وہ اس قوم کو دنیا میں بلند ترین اور اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچا دیتا۔ تو اس کے نام لینے والے' اس کی طرف اپنی نسبت کرنے والی قوم' کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ اس لیے جسے Pragmatic Test (استنتاجی کسوٹی) کہتے ہیں یعنی نتائج سے کسی چیز کی شہادت ملنا کہتے ہیں' اپنی وہ Pragmatic Test (استنتاجی کسوٹی) یوں بتا رہا ہے کہ غلط ہے۔ اس وقت مجھے یاد آتا ہے کہ قرآن نے جو کہا تھا کہ کیا تم نے اس قوم کو دیکھا کہ جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتی ہے اور عملاً اسلام کو جھوٹا ثابت کرتی ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو ہم کر رہے ہیں۔ یہاں کہا کہ کیا تو نے اس کو بھی دیکھا جو دین کو عملاً جھٹلاتا ہے۔ دین کا دعویٰ یہ ہے اور ہم اس دعویٰ کو بڑے زور شور سے پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نوعِ انسانی تو بہت دور کی چیز ہے یہ خود جو اپنی قوم ہے اس کی مشکلات کا حل تو انہیں مل جانا چاہیے۔ اور ابھی ابھی سورۃ قریش میں پچھلا فقرہ یہ تھا کہ **اَلَّذِیٓ اَطۡعَمَھُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ وَّ اٰمَنَھُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ** (106:9)۔ ان افراد کو روٹی کی طرف سے بے فکری ہونی چاہیے اور ان کی اقوام کو خوف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ Common Sense عام فہم کی چیز ہے جو قرآن نے ابھی کہی ہے۔ کہا کہ یہ لوگ دین کو جھٹلاتے ہیں۔

دین کو جھٹلانے کی عملی شکل

عزیز برادران! اب آگے بات سنیے کہ دین کا عملاً جھٹلانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ذہنوں میں تو یہی آئے گا کہ صاحب! دیکھ لیجیے' یہ لوگ نمازیں نہیں پڑھتے' روزے نہیں رکھتے' فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ یہ نئی جنریشن بن رہی ہے' لڑکیاں ننگے سر پھر رہی ہیں۔ ٹھیک ہے ان میں جتنی چیزیں اسلام کے خلاف ہیں وہ معیوب ہیں لیکن ہم نے تو اسلام کے خدا سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ کیا کہتا ہے' اس کے نزدیک دین کو جھٹلانے کے معنی کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ دین کو جھٹلانے والا وہ ہے جو **فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ** (107:2) ہر اس فرد کو جو معاشرے کے اندر تنہا رہ جاتا ہے' دھکے دے کر نکالتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دین کی تکذیب کیسے ہو رہی ہے؟ معاشرے میں عزت اس کی ہوتی ہے جس کا جتھہ اور پارٹی ہوتی ہے۔ جو معاشرے کے اندر تنہا رہ جاتا ہے یدع الیتیم اسے دھکے دے کر نکالا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ **وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ** (107:3) اور جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جاتا ہے' وہ محتاج ہو جاتا ہے' اس کی روٹی کی فکر نہیں کرتے اور کسی کو نہیں کہتے کہ اس کی روٹی کا انتظام کرو۔ کہا: یہ ہیں وہ جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا

---

❶ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہو چکی ہے۔ (2006)

کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات آ رہی تھی کہ اس کے بعد کہا یہ جائے گا کہ یہ لوگ نمازیں نہیں پڑھتے' روزے نہیں رکھتے۔ یہی چیزیں ہیں جو دین کی بتائی جاتی ہیں۔ میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا۔ اگلی ہی آیت ہے کہ **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ** (107:4) یہ نمازیں بہت پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو جہنم' تباہی اور بربادی بے نمازی کے لیے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ** (107:4) ان نمازیوں کے لیے تباہی' بربادی اور جہنم ہے۔ یہ کونسے نمازی ہیں؟ کہا کہ **الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ** (107:5) جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے غافل ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ صلوٰۃ کیا چیز ہے۔ آپ مسجد میں نماز پڑھیے۔ اس کے بعد ہوا کا سا ایک گولا آ جائے گا کہ تیری نماز نہیں ہوئی۔ کیا ہوا؟ کہ جی! پاؤں کے درمیان تمہارا فاصلہ ایک بالشت سے کم ہو گیا تھا' تمہارے ہاتھ کانوں کی لو تک نہیں اٹھے' رکوع میں تم خاص Angle (زاویئے) پر نہیں جھکے' سجدے کے بعد قعدہ میں اس طرح سے نہیں بیٹھے اور اگر یہ ساری چیزیں ٹھیک کر لی جائیں تو الحمدللہ نماز ہو گئی۔

قرآنِ حکیم کے لفظ ساھون کا مفہوم

یہاں کہا ہے کہ ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ''ساھون'' کے معنی بے خبر ہی کے نہیں ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ یہ جو ساھون ہے' یہ ساھن سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان عربوں کے ہاں تیر کمان سب سے بڑا ہتھیار تھا اور کمان کی خصوصیت اور صفت یہ ہے کہ وہ کمان کڑی ہو' ڈھیلی نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کے ہاں ایک مشہور مصرع ہے:

تانت جیسے کڑی کمان کا تیر

کمان بہت سخت ہونی چاہیے۔ کمان جتنی سخت ہوتی ہے تیر اتنا ہی تیزی سے جاتا ہے اور نشانے پہ لگتا ہے۔ جس کمان کی تانت ڈھیلی پڑ چکی ہو' اس سے تیر چلایئے تو وہ کبھی اپنے نشانے پر نہیں پہنچ سکتا۔ ''ساھون'' اس کمان کو کہتے ہیں جو ڈھیلی پڑ چکی ہو' اس کا تیر کبھی نشانے پہ جا کر نہ لگے۔ اس کمان میں کمان کی لکڑی بھی ہوتی ہے' اس کی سیدھ بھی ہوتی ہے مگر تیر نشانے پہ نہیں لگتا، تانت ڈھیلی پڑ چکی ہوتی ہے۔ یہاں لفظ ساھون آیا ہے: **هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ** (107:5)۔ یہ جو چیز ہے کہ یہ تانت کی لکڑی بھی ہے' کمان کی تانت بھی ہے' تیر بھی ہے' ہاتھ بھی ہیں' چلانے والی بات بھی ہے۔ پھر بھی تیر نشانے پہ نہیں لگ سکتا۔ کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب ہے کہ **الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ** (107:6) یہ سمجھتے ہیں کہ صلوٰۃ و نماز اس چیز کا نام ہے جو یوں نظر آ جاتی ہے: ٹھیک کھڑا ہے' تکبیر صحیح کہی ہے' ہاتھ اپنی جگہ پہ باندھے ہیں' ہاتھ یوں اٹھائے ہیں' یوں سجدہ کیا ہے' یوں رکوع کیا ہے' یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہ چیز جو محسوس طور پر سامنے Visible (مرئی) ہے تو سمجھتے یہ ہیں کہ صلوٰۃ بس یہ چیز تھی اور اگر یہ ٹھیک ٹھیک کر لی تو یہ صلوٰۃ ہو گئی۔ یہ اتنے ہی کو صلوٰۃ سمجھتے ہیں۔ کہا کہ اس قسم کی صلوٰۃ تو ڈھیلی تانت کی کمان ہے۔ یہ اپنی صلوٰۃ کی حقیقت' اس کے مقصود اور غرض و غایت' سے واقف ہی نہیں ہیں۔

یہ رزق کے چشموں پر بند لگا دیتے ہیں

سنیے، عزیزانِ من! یہ قرآن ہے کسی چیز کو واضح کیے بغیر چھوڑتا ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہنے سے پھر بھی یہ ذہن میں آ سکتا تھا کہ وہ حقیقتِ صلوٰۃ کیا بات ہے کہ اس قسم کی نماز پڑھنے کے باوجود وہ کہتا ہے کہ یہ نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں، نمازیں یوں پڑھتے ہیں یہ ساری چیزیں صحیح صحیح ادا کرتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) رزق کے ان چشموں کو جنہیں بہتے ہوئے ہر ایک گھر کے سامنے سے گزرنا چاہیے، یہ ان کے سامنے بند لگا دیتے ہیں اور اپنے ہی لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا بات ہو رہی ہے؟ کیا اس کے بعد بھی ہمیں انکوائری کمیشن بٹھانے کی ضرورت ہے کہ ہم ذلیل کیوں ہیں؟ کیا اس کے بعد بھی سورۃ قریش جو ابھی گزری ہے، کی تفسیر کی ضرورت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کے ساتھ نسبت رکھتے ہو، اس نسبت رکھنے سے اتنے مفادات حاصل کرتے ہو اور اس کے بعد عملاً تکذیب دین کرتے ہو۔

تکذیب دین کیا ہے؟ جو فرد، معاشرے کے اندر تنہا رہ جائے، اس کی مصیبت اس کی اپنی مصیبت ہوتی ہے، کسی دوسرے کی مصیبت نہیں ہوتی، وہ اسے اکیلا ہی بھگتے گا۔ جو کہیں بیچارے کی حرکت مبدل بہ سکون ہو گئی ہے تو اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے ہو۔ یہ جو لفظ مسکین ہے، یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے۔ یہ وہ ہیں ''جن کی حرکت کسی طرح رک جائے۔'' اب یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اس کی روٹی کا کسی کو فکر نہیں ہے۔ گھر کا ایک فرد مر جاتا ہے، یہ تو ایک سیکنڈ میں مر جاتا ہے، باقی سارے تمام عمر سسکتے ہوئے مرتے رہتے ہیں، کسی دوسرے کو اس کے لیے پروا نہیں ہوتی کہ ان کا انتظام کیا جائے۔ کہا کہ اس کے باوجود تمہیں شرم نہیں آتی کہ اپنی نسبت اس اسلام کے ساتھ، اس کعبہ کے ساتھ، کعبہ کے رب کے ساتھ رکھتے ہو، مگر تم تکذیب کرتے ہو، جھٹلاتے ہو۔ ساری دنیا ہمیں بدنام کر رہی ہے کہ بھیجا تھا خدا نے ایک آخری دین اور آخری اسلام اور آخری قرآن۔ اس کے ماننے والوں کی کیفیت یہ ہے۔ سوچیے، برادرانِ عزیز! کہاں بات جاتی ہے۔ کیفیت تمہاری یہ ہے کہ اس طرح کا رکوع وسجود کر لیا جائے تو بس نماز کی حقیقت پوری ہوئی، نماز کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ عزیزانِ من! اس سے یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ اس قسم کے جو محسوس فرائض ہیں یا اس قسم کی جو شکلیں ہیں، بیکار چیز ہے، بے معنی چیز ہے۔ یہ نہ سمجھ لیجیے گا۔ وہ اپنا مقام رکھتی ہیں۔ کمان کی لکڑی، تانت اور اس کا تیر ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو آپ تیر چلا نہیں سکیں گے لیکن ان کا اس شکل میں ہونا ضروری ہے جس سے تیر چلیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ یہ جتنی چیزیں آپ کے ہاں ہو رہی ہیں یہ اس نظام کے اجزاء تھے۔ جب اس نظام کے اندر سپاہی کھڑا ہو گا اس سپاہی کے لیے تو یہ بھی ضروری ہو گا کہ اس کے بوٹ کے تسمے بھی ایک خاص شکل میں ڈلے ہوئے ہوں۔ اس کی پیٹی ایک خاص مقام کے اوپر ہو۔ جب وہ چلے تو خاص طور کے اوپر اس کا قدم اٹھے۔ کھڑا ہو تو ایک اندازِ خاص سے کھڑا ہو۔ یہ ساری چیزیں ایک سپاہی کے لیے ضروری ہیں لیکن نہ فوج رہے، نہ وہ بوٹ رہے، نہ نظام رہے اور سپاہی صبح کو اٹھ کر اپنی

وردی عین ٹھیک ٹھاک سیٹ کرتا ہوا گاؤں کی گلیوں کے اندر لیفٹ رائٹ کرتا چلا جائے اور پھر اپنے دل میں یہ اطمینان حاصل کر لے کہ یہ میری وہ فوج ہے جس کا میں سپاہی ہوں یقیناً دشمن پہ غالب آ کر رہے گی' صحیح نہیں ہے۔ یہ ہے جو قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ تکذیب ہے۔ کون تکذیب کرتا ہے؟ کون ہے وہ نمازی؟ کہ جو اسی چیز کو اپنی صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں: **وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ** (107:7) اور رزق کے ان سرچشموں پر' جنہیں بہتے پانی کی طرح' ہر ایک کی ضروریات کے لیے' کھلا رہنا چاہیے' بند لگا کر' ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں' یہ تکذیب دین کرتے ہیں اور ننگ اسلام بنتے ہیں۔ یہ بڑے ہی جامع الفاظ ہیں۔

نشو ونما کی کسی چیز پر بند نہیں لگایا جا سکتا

عزیزانِ من! قرآن نے تو یہ کہا تھا کہ **وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا** (17:20) خدا نے جتنی چیزیں انسانیت کی نشو ونما کے لیے عطا کی ہوئی ہیں' ان کے آگے بند نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ بڑی چیز ہے جہاں یہ آیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں' عزیزانِ من! بڑی عظیم چیز ہے جو کہی گئی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تم تو صرف مسلمان کے لیے کہتے ہو' کافر بھی اگر فطرت کے قانون کے مطابق کوشش کرتا ہے تو ہم اس کے راستے میں بھی بند نہیں لگاتے **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ** (17:20) مومن ہو یا کافر' فطرت کے قوانین کے مطابق جو بھی چلتا ہے ہم دونوں کو مدد دیئے چلے جاتے ہیں اس لیے کہ **وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا** (17:20) یوں نہ سمجھنا کہ انسانوں کو وہ پیدا کرے اور محض اس بنا کے اوپر کہ ایک انسان اس کو نہیں مانتا' اس کو رزق سے محروم کر دے [1] اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ان کے راستے میں آنے والے رزق پہ بند لگا کر اپنے لیے مخصوص کر دیتے ہو اور وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں اور اس کے بعد نماز پڑھ کر کہتے ہو کہ الحمد لله علی ذٰلک۔ اس لیے کہا کہ **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ** [2] (107:4-5)

---

[1] ان نکات کی مزید وضاحت وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص ص 123-117۔

[2] اپنے آپ کو ''دیندار'' ظاہر کرنے کے لیے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کی نمازیں ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی' پرہیز گار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرے کا قیام جس میں تمام افراد' قوانین خداوندی کا اتباع کریں اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچتا رہے۔ یہ اس کی غرض وغایت سے غافل رہتے ہیں۔ (2- مفہوم القرآن۔ پرویز)

حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ

صلوٰۃ کے متعلق یہی وہ غلط فہمی تھی جو قوم حضرتِ شعیب علیہ السلام کو پیدا ہوئی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم سے یہ کہا تھا کہ تم مزاحمت نہ کرو مجھے صلوٰۃ کی تو اجازت دے سکتے ہو۔ اِن کی قوم نے بھی ہماری طرح یہ سمجھا کہ یہ کوئی نماز پڑھنے کے لیے بات کر رہا ہے اس لیے انہوں نے کہا کہ ہاں اس میں تو کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ تم نے بڑا اچھا کہا۔ قرآن سارا مکالمہ تو درج نہیں کرتا، وہ تو صرف اس کی مختلف کڑیاں بیان کرتا ہے، درمیان میں سے باقی ہمارے ذہن کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ شعیب! تم نے تو ہم سے صرف صلوٰۃ کے لیے ہی بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے، اس پر وہ کہنے لگے کہ تمہاری یہ صلوٰۃ عجیب ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔ ارے! ہم تو نہیں سمجھے کہ صلوٰۃ یہ ہوتی ہے۔ ''اسیں تے سمجھ رہے سی کہ مندر دی کنٹی وجان والی گل ہیگی۔ اے وجایا کرو۔ ہن اسیں سمجھے آں۔''❶ قرآن کے کہنے کا بڑا عجیب انداز ہے۔ کہا کہ اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کریں۔ دیکھیے، عزیزانِ من! دین میں ثواب کے ڈانڈے کہاں جا کے ملتے ہیں۔

خلافت وملوکیت میں فرق کیا ہے؟

دین کی صلوٰۃ انسان کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جس طرح جی چاہے اسے سمیٹے اور جس طرح جی چاہے اسے خرچ کرے۔ دین کی صلوٰۃ کا دوسرا ترجمہ خلافت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45ء) سے پوچھا گیا تھا کہ ذرا ایک فقرے میں بتا دیجیے کہ خلافت کسے کہتے ہیں تو آپ نے کہا تھا کہ میں تو اتنا ہی سمجھا ہوں کہ ''کس طریق سے حاصل کیا اور کس مقام پر خرچ کیا'' بات ختم ہو گئی۔ برادرانِ عزیز! یہ ہے صلوٰۃ۔ قرآن کہتا ہے کہ صلوٰۃ میں مرئی یعنی Visible قسم کے جو ارکان ہیں، مثلاً قیام، رکوع، سجود وغیرہ، وہ انہیں پورا یعنی Complete کرنے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف محسوس ارکان کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کی اس قسم کی خود فریبی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف نمازیں بھی بہت پڑھتے ہیں اور دوسری طرف **وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ** (107:7) رزق کے سرچشمے کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا اس کے سامنے بند لگا کے اپنے لیے محفوظ کر لیتے ہو اور اس کے بعد الحمد للہ کہتے ہو۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ **اَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ** (107:1) تو نے دیکھا ہے اس کمبخت کو، کہ خدا کا نام لینے کا مدعی ہونے کے باوجود، وہ دین کی تکذیب کر رہا ہے۔ اس لیے **فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ** (107:4) ان مصلین کے اوپر تباہی ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ یہ کچھ کرتے ہیں۔

---

❶ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تو صرف مندر کی گھنٹی بجانے والی بات ہے اس لیے تم یہ بجاتے رہو۔ اصل بات اب ہماری سمجھ میں آئی ہے۔

صلوٰۃ قرآنِ حکیم کے مکمل نظام کا نام ہے

یہ ہے' عزیزانِ من! وہ مقام جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ غیر مسلموں سے یہ کچھ کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! آخری ٹکراؤ کا وقت آ رہا ہے۔ اور ادھر انہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ دیکھو! اب اس ٹکراؤ کے بعد کامیابیاں تمہیں حاصل ہو جائیں گی تو پھر کہیں یہی تمہاری صلوٰۃ' صوم' روزے' حج اور زکوٰۃ یہ کچھ نہ بن کے رہ جائے۔ یاد رکھو! یہ ایک نظام ہے جس کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اس میں ان کے مقصود ہیں' الگ الگ مقاصد ہیں۔ درمیان میں یہ نہ بھول جانا۔ کہا کہ وقت وہ ہے جس میں ان کا ''کید'' یعنی ان کی خفیہ تدبیریں یہاں تک پہنچ چکی ہیں کہ اب ان کو ختم ہی کر دیا جائے۔ بے کسی کا یہ عالم ہے کہ مومن اذیتوں سے تنگ آ کر مختلف مقامات کی طرف جا چکے ہیں۔ یہ باقی رہنے والے مکہ چھوڑنے پہ مجبور ہو رہے ہیں۔ خود نبی اکرم ﷺ بھی یہاں سے رات کی تنہائیوں میں' بظاہر بے کسی کے عالم میں جا رہے ہیں' بظاہر کتنا یاس و ناامیدی کا یہ عالم ہے۔ دل بیٹھ جانے کا عالم ہے۔ عین اس مقام پہ کہا جا رہا ہے کہ **اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ** (108:1) گھبراتا کیوں ہے اتنا **الکوثر** دیا جائے گا۔

عزیز برادران! سورۃ الماعون یہاں ختم ہوتی ہے۔ اب ہم سورۃ الکوثر لیتے ہیں۔

سورة الكوثر (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب ہم سورۃ الکوثر لیتے ہیں۔ یہ تیسویں پارے کی 108 ویں سورۃ ہے۔ اس کی ابتدا ہوتی ہے: **اِنَّـآ اَعۡـطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ** (108:1) اے رسول ﷺ! ہم نے تجھے قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے جو سرچشمہ ہے دنیا بھر کی بھلائیوں اور خوشگواریوں کا۔ اس میں حکمت اور بھلائی کی لامتناہی باتیں ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ابھرتی اور سامنے آتی چلی جائیں گی۔ اس خیر کثیر میں کبھی کمی واقع نہیں ہوگی۔ (25-14:24 ;13:35)۔

برادرانِ عزیز! یہاں قرآنِ کریم نے ''کثرت اور کثیر'' کے لیے ایک الگ لفظ قائم کیا ہے یعنی قاعدے کی رو سے جتنی بھی کثیر تر ہو سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ جو کچھ ان کی زبان کہہ سکتی تھی، اس سے بھی زیادہ کہنے کے لیے اس نے یہ ایک الگ لفظ ''الکوثر'' کہا ہے۔ یہ ''کوثر'' کیا ہے؟ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **وَ مَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا** (2:269)۔ جسے الحکمت دی جاتی ہے یوں سمجھو کہ اس کو خیر کثیر دیا جاتا ہے۔ ''خیر'' مال کو بھی کہتے ہیں، بھلائیوں کو بھی کہتے ہیں اور کثرت سے دیا جاتا ہے کو بھی کہتے ہیں اور قرآن کو قرآنِ کریم میں خود خدا نے الحکمت کہا ہے۔ یعنی ایک تو دینے کے لیے یہ الکوثر دیا۔ یہ خود قرآنِ کریم ہے، حکمت کثیر ہے اور اس لیے کہ اس پہ عمل کرنے کا نتیجہ خود خیر کثیر ہے، ہر شے بڑی فراوانی سے ہے، بڑی کثرت سے ہے۔ اس لیے کہا کہ یہ کچھ تمہیں ملے گا۔

اب دیکھیے، عزیزانِ من! مقام وہ ہے کہ مکہ سے ہجرت کر کے، اس بیچارگی کے عالم میں، مدینے میں پناہ لی جا رہی ہے۔ مدینہ پر یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے خود ذہن میں یہ تھا کہ یہ جو اس طرح پناہ گزینوں کی حیثیت سے مدینہ میں آ رہے ہیں تو یقیناً ہمارے غلام بن کر رہیں گے اور نظر ہی یہ آ رہا تھا کہ عین اس مقام پہ ایک بات کہی جا رہی ہے اور بڑی عظیم بات کہی جا رہی ہے۔ اس اگلی عظیم بات سے پہلے میں اس چیز پر آ جاؤں۔ کہا کہ **فَـصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ** (108:2) تم نے صرف یہ کرنا ہے۔ یہ صلوٰۃ ہی کی بات تو پہلے ہو رہی تھی۔ اس قسم کی صلوٰۃ والوں کے متعلق یہ کچھ کہا جا رہا ہے اور پھر یہ وہی صلوٰۃ ہے، فصل جو آ گیا ہے۔

فرائض منصبی کی تکمیل کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے

صلوٰۃ کے معنی یہ صلوٰۃ کیجیے یا اس کے جو بنیادی معنی ہوتے ہیں وہ لے لیجیے۔ اس کے بنیادی معنی ''فرائض منصبی کی تکمیل کرتے چلے

جانا ہوتے ہیں'' یعنی تم اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کرتے چلے جاؤ۔ اگلی بات جو کہی گئی ہے وہ یہ لفظ ہے وَانۡحَرۡ (108:2)۔ یہ ذرا تشریح طلب بات ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں یہ جو بڑی عید پہ قربانی کی جاتی ہے اس کے لیے قرآنِ کریم سے کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن کریم میں تو صرف حج کے اجتماع پہ جمع ہونے والوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہاں تم اتنی زیادہ تعداد میں جا رہے ہو اور پھر اس زمانے کو تو آپ یاد رکھیے کہ مکہ وادی غیر ذی زرع تھی' وہاں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہاں جو 14 لاکھ ❶ آدمی چلا جائے تو کھائے کہاں سے۔ اس کے لیے انتظام یہ کیا گیا تھا کہ اپنے ساتھ جانور لے جاؤ' کچھ تو سواری کے جانور ہوں گے' کچھ فالتو جانور لے جاؤ۔ ان پہ مال و اسباب جو Dispose off (فروخت) کرنا ہو وہ بھی لاد کر لے جاؤ۔ اس طرح جو فالتو جانور ساتھ لے جاؤ گے وہاں جتنے دن رہنا ہے انہیں وہاں ذبح کرو' خود بھی کھاؤ اور وہاں کے جو محتاج ہیں' ان کو بھی کھلاؤ۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں اس کے متعلق صرف اتنی بات سی ہے۔ اور یہ تو ایسی عمدہ سپلائی لائن ہوتی ہے یعنی یہ چلتا ہوا ایک کولڈ اسٹوریج ہے۔ آپ دیکھیں کہ یہ پورے کا پورا اونٹ آپ کے لیے سامانِ خوراک ہے۔ اور ایسا محفوظ ہے کہ صاحب! کہ نہ گلے' نہ سڑے' کچھ بھی نہیں۔ پھر اس کو اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے' اپنے پاؤں پر آپ چل رہا ہے۔ یہ آپ کے ہاں کا ریفریجریٹر ہے جو چلا جا رہا ہے۔ جہاں ضرورت پیش آئی آپ اسے ذبح کیجئے' کھا لیجئے' دوسروں کو بھی کھلایئے۔ قرآنِ کریم میں بس یہی ہے۔ ❷ اب یہ جو ایک ایک حاجی وہاں جا کر کم از کم دو دو کی تو قربانی دیتا ہی ہے اور زیادہ سے زیادہ کی تعداد کا تو پوچھیے ہی نہیں اور پھر ان کو گلے پہ چھری چلا کے یا چلوا کے کہتے ہیں کہ یہ قربانی دی۔ روپیہ دے کر اس کو پھر چھری چلوانی پڑتی ہے۔ ❸ اور پھر وہاں ڈھیر لگا دیئے جاتے ہیں۔ چودہ لاکھ ❹ جو حاجی جمع ہوں' کم از کم دو دو بھی ذبح کرنے لگے تو وہاں کم از کم اٹھائیس لاکھ جانور ذبح ہو کر ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ یہ قربانی پھر ساری دنیا کے مسلمان' اپنی اپنی جگہ' ہر گلی کوچے کے اندر' ہر جگہ بھی دیتے ہیں جبکہ قربانی کی اصل بات یہ تھی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے اتنی ہی بات کہی ہے۔ اس سے زیادہ کی تو قرآن میں کوئی سند نہیں ہے۔ اب آپ ان سے باتیں کیجیے تو اس میں پھر یہ آیت پیش کی جاتی ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ (108:2)۔ اپنے رب کے لیے صلوٰۃ ادا کر' نماز پڑھ' اور پھر ''وانحر'' کے معنی کہتے ہیں کہ قربانی کر۔ تو اگر یہی چیز ہے' اس کے معنی قربانی ہیں یہ تو فریضہ ایسا ہی ہو گیا جیسے صلوٰۃ کا ادا کرنا فریضہ ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ قربانی فرض نہیں ہے' واجب ہے' سنت ہے مگر یہاں وہ ''وانحر'' فرض ہے۔

---

❶ یہ 1967ء میں کہا گیا تھا۔

❷ ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء۔

❸ اسے روپیہ دے کر پھر چھری چلوانی پڑتی ہے۔

❹ یہ 1967ء میں کہا گیا تھا۔

یہ **وانحر** کیا چیز ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ''نحر'' سینے کے اس اوپر کے حصہ کے مقام کو کہتے ہیں۔ عربی استعمال میں یہ لفظ بڑے ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: سینے پہ ہاتھ باندھنا' چھاتی نکال کے چلنا' سینے تک ہاتھ لے جانا' اونٹ کا ذبح کرنا۔ وہ جو ذبح کرتے ہیں تو اسے لٹا کے گردن پہ چھری نہیں پھیرتے' وہ کھڑے کھڑے اس کے اس مقام میں اس جہت سے نیزہ چبھوتے گھونپتے ہیں۔ اس طرح اونٹ کو ذبح کرنے کے لیے بھی ان کے ہاں یہ لفظ بولا جاتا ہے لیکن یہ صرف اونٹ کو ذبح کرنے کے لیے ہے۔ گائے' بھیڑ' بکری کے ذبح کرنے کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔ اگر اس کے معنی ذبح کرنے کے ہی ہیں تو وہ صرف اونٹ کے ذبح کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور عربوں کے ہاں اسی لفظ سے یہ معنی بھی تھے کہ چونکہ یہ سینے کے اوپر کا یہ سارا مقام ہے جہاں انسان کا علم ہوتا ہے اس لیے ان کے نزدیک کسی معاملہ کے تمام پہلوؤں پہ غور و فکر کر کے اس پر حاوی ہو جانے کے بھی لیے جاتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ گھبراؤ نہیں' تم اس بیچارگی کے عالم میں جا رہے ہو' بڑا خیرِ کثیر تمہیں دے گا' فراوانی سے سب کچھ ملے گا' کرنا صرف یہ ہے کہ **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ** (108:2) اپنے فرائض کی سرانجام دہی کرتے چلے جاؤ اور جو پیش آنے والے معاملات اور امور ہیں ان کے تمام گوشوں پر نہایت عمدگی سے نگاہ دوڑا کر ان پر حاوی ہوتے چلے جاؤ۔ معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اگر ''وانحر'' کے معنی اونٹ کو ذبح کرنا ہیں تو میں نے کہا تھا کہ اس میں یہودیوں کا معاملہ آتا ہے۔ ان کے ہاں' ہندوؤں میں گائے کی طرح' اونٹ حرام تھا۔

اونٹ کو ذبح کرنے میں بھی مصلحت تھی

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاں گائے ذبح کرنا حرام ہے۔ وہاں کا مسلمان' چار ساڑھے چار کروڑ [1] کی تعداد میں موجود ہے' وہ اپنے مذہب کی رُو سے گائے ذبح کرنا حلال سمجھتا ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق' عام طور پہ' عید کے اوپر' وہ گائے بھی ذبح کرتے ہیں مگر وہاں ساڑھے چار کروڑ کی آبادی گائے ذبح نہیں کر سکتی۔ فرض کیجیے اگر کسی مقام پہ لٹے پٹے ہوئے مسلمان ہندوستان میں پناہ لینے کے لیے جا رہے ہوں اور ان سے یہ کہا جائے کہ وہاں جاؤ اور جا کر سب سے پہلے گائے ذبح کرو۔ معنی کیا ہونگے؟ معنی ہونگے کہ ان کو چیلنج دے دو کہ اب ہم تم سے قطعاً نہیں ڈرتے۔ ہم یہاں تمہارے غلام بن کر نہیں رہیں گے۔ ہم اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔

عزیزانِ من! یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ قافلہ مکہ سے ہجرت کر کے جا رہا ہے۔ یہ بے کس و بے بس بیچاروں کا قافلہ ہے بظاہر یہودی خوش ہو رہے ہیں کہ ہاں صاحب! اب یہ پناہ گزینوں کی حیثیت سے ہمارے قابو میں ہیں اور کہا یہ جا رہا ہے کہ یہودیوں کے ساتھ No compromise (کوئی مصالحت نہیں)۔ وہاں جا کر کسی قسم کی دب کر صلح کرنا اور Compromise (مفاہمت) کرنا بے معنی

---

[1] یاد رہے کہ بات دسمبر 1967ء میں کہی گئی تھی۔

چیز ہے۔ وہاں جاؤ اور وہ چیز جسے وہ حرام سمجھتے ہیں' تمہارے ہاں حلال ہے' دھڑلے سے اونٹ ذبح کرو' انہیں پتہ چل جائے کہ یہ دب کر نہیں آئے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ ایک لفظ کے اندر ساری سیاست قرآنِ کریم نے کھول کر رکھ دی۔ چنانچہ یہاں یہ ہوا۔ پہلا معاہدہ جو وہاں جا کر کیا گیا ہے' آپ حیران ہونگے کہ وہ برابری کا تھا۔ یہ پناہ گزین' یعنی Refugees تھے جو وہاں پہنچے ہیں۔ اس وقت یہودی مدینہ پہ چھایا ہوا تھا۔

ایک عظیم مقصد کے تحت باوقار ہجرت

وہاں جا کر جو پہلا اکٹھے مشترکہ Citizen (شہری) ہونے کی حیثیت سے معاہدہ کیا ہے وہ برابری کا ہے اور اس میں مسلمانوں کا ہاتھ غالب ہے۔ اس لیے کہا یہ گیا تھا کہ **اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ** (108:1)۔ یہ تمہاری ہجرت بھگوڑوں کی سی بات نہیں ہے کہ تم یہاں سے بھاگے ہوئے ہو' بیچاروں کی حیثیت سے ہو' یہ تو پینترا بدلنے کی بات ہے ساری۔ غیر موافق فضا سے موافق فضا کے اندر رہنے کی بات ہے۔ اس لیے وہاں جا کر دبنا نہیں ہے۔ مدینے کو تو تمہارے اس مرکز کا اولیں گہوارہ بننا ہے لہٰذا وہاں دبنے کی' Compromise (مفاہمت) کرنے کی' کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دھڑلے سے جاؤ۔ اور جو وہاں غالب گروہ ہے سب سے پہلے وہاں جا کے اونٹ ذبح کرو۔ یعنی اس سے ان کے دل مرعوب ہو جائیں کہ صاحب! جنہیں ہمیں بے کس سمجھتے تھے' بے بس سمجھتے تھے' ایسے کمزور سے نہیں ہیں۔ کوئی بڑی طاقت ہے ان کے پیچھے' ورنہ ان کی جرأت ہو سکتی تھی کہ ہمارے محلے میں آ کر گائے ذبح کر لیتے۔ یہ بڑی چیز تھی اور اگر ''وانحر'' کے عام معنی صرف اونٹ ذبح کرنا ہے تو عربوں کے ہاں تواضع کرنا' غریبوں کو کھانا کھلانا' سب سے بڑی چیز گنی جاتی تھی اور ان کے ہاں بہترین کھانا اونٹ کا گوشت کھلایا جاتا تھا۔ اگر یہ عام معنی بھی لیے جائیں تو یہ معنی ہونگے کہ تم جاؤ' فرائضِ منصبی کی سرانجام دہی کرو اور غریبوں محتاجوں کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے چلے جاؤ۔ وہی جو پہلے بات آ رہی تھی **وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ** (107:3) طعام مسکین کا انتظام کرو' یہ ہے تمہاری صلوٰۃ۔ وہاں جا کر یہ کرو اور پھر تم دیکھو کہ کس طرح ''الکوثر'' تمہیں مل جاتا۔ یہ اس کی تفسیر آ گئی اور کہا کہ **اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الۡاَبۡتَرُ** [1] (108:3)۔

خدا کی رہنمائی اور تمہارا عمل دشمن کی جڑیں کاٹ دے گا

یہ مخالفین کہہ رہے ہیں کہ ان کا ہم نام ونشان مٹا دیں گے جبکہ تم دیکھو گے کہ یہ جو تمہارے دشمن ہیں ان کی جڑیں کٹ جائیں گی۔ جاہلیتِ عرب کے قریش وہ باقی نہ رہے' مدینہ کے اس قدر سر پھرے یہودی' وہ باقی نہ رہیں گے۔ ایران اور روم کی اتنی عظیم سلطنتیں'

---

[1] اس وقت تو حالت یہ ہے کہ تیری جماعت کمزور سی ہے' اور مخالفین بڑی قوت اور کثرت کے مالک۔ لیکن آخر الامر تو دیکھے گا کہ جو لوگ تیرے نظام کی مخالفت کر رہے ہیں' ان کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ اور یہی نظام' جو خیر کثیر کا سرچشمہ ہے' آگے چلے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جنہوں نے اسلام کے خلاف کشمکش کی تھی، وہ باقی نہ رہیں۔ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ (108:3)۔ اور یہ اس وقت کہا جا رہا ہے جب یہ قافلہ بے چارگاں، جان بچا کر مکہ سے مدینے کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ تھی تصدیقِ دین، برادرانِ عزیز! دعویٰ ان کا یہ تھا کہ ہم حق پہ ہیں اور حق تو غالب آ کر رہا کرتا ہے۔

اس طرح خیر کثیر ملتا ہے

یہ تھی تصدیقِ دین یعنی ان حالات کے اندر اس قسم کا Attitude (رویہ) اختیار کرنا کہ وہاں کی قومِ غالب کے ساتھ کوئی Compromise (مفاہمت) نہیں ہے، اور ان حالات میں ان سے یہ کہنا کہ اتنا خیرِ کثیر ملے گا کہ تم دیکھو گے اور اس کے مقابلے میں تمہارے دشمن کی جڑیں کٹ جائیں گی۔ تیرہ سال سے ان کے ساتھ تصادم کا مرحلہ ہے۔ ان کی تعلیم و تبلیغ کے اندر 13 سال گزرے۔ مکہ کے قریش کو دعوت دی جاتی رہی، اس امید پر سمجھایا جاتا رہا کہ یہ لوگ سمجھ جائیں گے، صحیح راستہ اختیار کر لیں گے، آخر وہ وقت آ گیا جب یہ دیکھا گیا کہ ان میں سے جو آنے والے تھے وہ علی وجہ البصیرت آ گئے، یہ جو باقی ہیں یہ اپنی ضد اور سرکشی کے اندر اس قدر مدہوش ہیں کہ اب ان میں سے کسی کے آنے کی امید نہیں ہے۔ جب یہ مقام آیا تو اس وقت سورۃ الکٰفرون ہمارے سامنے آتی ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ الکوثر ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الکٰفرون لیتے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کا عظیم اعلان ہے جس میں براہِ راست ان مخالفین کو مخاطب کر کے چیلنج دیا گیا ہے۔

سورۃ الکافرون (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ الکٰفرون شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 109 ویں سورۃ ہے۔ جیسا کہ سورۃ الکوثر میں کہا گیا ہے کہ جب یہ مقام آ گیا' تو اس وقت عزیزانِ من! الکافرون ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ قرآن کا عظیم اعلان ہے۔ یہ ہے وہ سورۃ کہ جس میں براہِ راست ان کو مخاطب کر کے چیلنج دیا گیا ہے اور کہا گیا: قُلْ (109:1) اعلان کر دو۔

یہ ہے اللہ اکبر کا وہ مفہوم کہ فتح آخر کار حق کی ہوتی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں یہ اعلان کس وقت ہو رہا ہے؟ اس وقت جب مکہ سے' عام دنیا کے اندازے کے مطابق' ہر سیاست کے نقشے کے مطابق' یہ جان بچا کر بھاگے جا رہے ہیں۔ اس مقام پہ کہا جا رہا ہے کہ یٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (109:1) اے وہ! کہ جو ان اقدارِ خداوندی سے انکار کر رہے ہو اور سرکشی برت رہے ہو! تم سن لو' تم نے جو کچھ کرنا تھا اس کی انتہا کر دی' تم نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا' تم سمجھتے یہ تھے کہ میں تمہاری ان اذیتوں' مصیبتوں' تکلیفوں سے ڈر کر جھک جاؤنگا' تم نے بڑی کوشش کی کہ میں تمہارے ساتھ Compromise (مفاہمت) بھی کر لوں لیکن سن لو! لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (109:2) تمہاری اور میری منزل بھی الگ الگ ہے اور راستے بھی جدا جدا۔ مقصود بھی الگ ہے اور اسے حاصل کرنے کے ذرائع بھی الگ۔ تمہارے معبود الگ ہیں' میرا معبود الگ۔ تم ''عبادت'' سے کچھ اور مفہوم لیتے ہو' میں کچھ اور۔ تمہارے معبود' تمہارے دین کے تراشیدہ ہیں' میرا معبود خالق کائنات ہے۔ میں تمہارے ان تراشیدہ معبودوں کے احکام کی تعمیل نہیں کروں گا۔ یہ اس سورۃ میں دہرایا گیا ہے اور اگلی ہی آیات میں کہا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (109:3-5)۔ یہ عجیب الفاظ آتے ہیں لیکن یہ صیغے بدلے ہوئے ہیں۔ اور اسی میں بات سمجھنے کی ہے۔ کہا کہ لَآ اَعْبُدُ (109:2) اس بات کو مستقبل کے لیے سن لو کہ تمہارے جو جی میں آئے کر لو' میں قطعاً ان کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرونگا مَا تَعْبُدُوْنَ (109:2) جن کی عبودیت تم اختیار کیے ہوئے ہو۔ دو ٹوک فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ کان کھول کر سن لو' ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے تو ہو جانے دیجیے لیکن لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (109:2)۔ عزیزانِ من! مومن کا تو اس دنیا کے اندر ہر باطل کے نظام کے سامنے نعرہ ہی یہ ہونا چاہیے کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (109:2) جو جی

میں آئے کرلو۔ یہ مستقبل کا صیغہ عجیب ہے۔ان کی محکومیت کبھی اختیار نہیں کرونگا جن کی محکومیت تم اختیار کیے ہوئے ہو اور اب تجربے نے یہ بتادیا کہ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ (109:3) اور جس نظام کی اطاعت' محکومیت میں اختیار کیے ہوئے ہوں تم اس کی اطاعت اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ جب دوٹوک فیصلہ ہوگیا' ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا کہ جو تم سے ناآشنا رہے ہیں۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ (109:4) ہم بھی اس کی اطاعت نہیں کریں گے جن کی تم کرتے ہو۔

نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد زندگی میں ہم آہنگی

عزیزانِ من! وہاں مَا تَعۡبُدُوۡنَ (109:2) تھا یعنی جن کی تم محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو یا پرستش کر رہے ہو اور یہاں ہے مَا عَبَدۡتُّمۡ (109:4)۔ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ کبھی نہیں کروں گا' اس کی دلیل کیا ہے؟ دلیل اس کی یہ ہے کہ آج تک جو کچھ تم زندگی میں کرتے تھے میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ دیکھتے ہیں صیغوں کے بدلنے نے کیا بات پیدا کردی ہے۔ میں نے تو نبوت سے پہلے زمانے میں بھی یہ کچھ نہیں کیا تھا' چہ جائیکہ دعوت کے بعد میں یہ کچھ کرلوں۔

دین کے معنی ہیں: اعمال کا نتیجہ

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ o وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ [1] (109:4-5) اب حالات یہ بتا رہے ہیں کہ تم کبھی اس نظام کی طرف آنے والے نہیں ہو' اس لیے لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ (109:6)۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے۔ دین کے تو معنی اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد تو بات سیدھی سی ہے۔ دوسرے مقامات میں ہے کہ وَ اِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقُلۡ لِّیۡ عَمَلِیۡ وَ لَکُمۡ عَمَلُکُمۡ اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ [2] (10:41) اگر یہ نہیں مانتے' تکذیب کرتے ہیں تو ان سے یہ کہہ دو کہ میرے اعمال میرے لیے ہیں' جو کچھ تم کرتے ہو وہ تمہارے لیے ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں' تم سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی۔ اب اس کے بعد جو کچھ تم کروگے میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ کئی ایک اور مقامات میں بھی

---

[1] یہ بھی مت خیال کرو کہ ہمارا اور تمہارا اختلاف کوئی ہنگامی اور وقتی اختلاف ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ خود بخود مٹ جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ یہ اختلاف بنیادی اور اصولی ہے۔ یہ نہ اس وقت مٹ سکتا ہے' نہ اس کے بعد کبھی مٹے گا۔ تمہارے معبود الگ رہیں گے' میرا معبود الگ۔ تمہاری عبادات ان معبودوں کی پرستش ہوگی میری عبادت خدا کے قوانین کی اطاعت اور محکومیت۔ لہٰذا یہ اختلاف انمٹ ہے۔

[2] اس کے بعد اگر یہ لوگ تجھے جھٹلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ تم یونہی دھمکیاں دیتے ہو کہ ہماری روش کا نتیجہ تباہ کن ہوگا اور تمہارا نظام کامیاب ہو کر رہے گا) تو ان سے کہہ دو کہ (میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے اپنے پرگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ تمہارے پروگرام کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں گا۔ میرے پروگرام کا نتیجہ میرے سامنے آجائے گا اس کی کچھ ذمہ داری تمہارے سر نہیں ہوگی۔ بات صاف ہوجائے گی۔(109:1-6)۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے مثلاً قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ❶ (6:135) اب ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کرتے چلے جاؤ' میں اپنے پروگرام کے مطابق کروں گا۔ اور اس کے بعد ہے کہ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ (6:135) عنقریب نتائج بتا دیں گے کہ کون سچا تھا' کون جھوٹا تھا؟ یہ ہے لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ❷ (109:6)۔ یہاں دین کے معنی نتائج اعمال ہیں' جس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

دین کا لفظ نہایت ہی جامع لفظ ہے

برادرانِ عزیز! اصل میں لفظ دین کے متعلق میں کیا عرض کروں کہ یہ کتنا جامع لفظ ہے! دنیا کی کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے لیے اس دن تباہی تھی جس دن ہم نے اس دین کا ترجمہ مذہب کیا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ Religion (مذہب) ہوگیا۔ یاد رکھیے! اس کا ترجمہ Religion (مذہب) نہیں ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ ہی نہیں ہوسکتا۔ جس طرح اللہ کا ترجمہ God نہیں ہے۔ God کا Concept (تصور) ہر ایک کا اپنا اپنا ہے۔ اسی قسم کا ہمارا ہوسکتا ہے۔ تمہارا بھی ہو جائے گا اگر God کہنے لگو۔ اللہ کہنے سے اس کا ایک خاص تصور ہے جو قرآن نے دیا ہے۔ بہرحال دین کے معنی ہیں ''اعمال کے نتائج''۔ اس لیے کہا کہ اب دوٹوک بات ہوگی۔

رب کی طرف جانے کے معنی

اب دیکھیے کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ قَالَ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ (37:99) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں اپنے رب کی طرف چلا۔ وہ یقیناً میری رہنمائی ایسے ماحول کی طرف کردے گا جو اس کے نظام کے قیام کے لیے سازگار ہوگی۔ رب تو یہاں بھی موجود تھا۔ یہ رب کی طرف جانے کے معنی کیا تھے؟ کہا کہ میں چلا اس ماحول اور اس جوع کی طرف جو خدا کے نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے لیے زیادہ مساعد واقع ہوئی ہے۔ دوسری طرف کہا ہے کہ اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ ❸ (29:26)۔ اس مقام پہ یہ کہا ہے کہ لو میں چلا اب اس مقام کی طرف۔ اس لیے لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ (109:6)۔ اگر طبیب (Doctor) یہ کہہ کر اٹھ کر چلا

---

❶ ان سے کہہ دو کہ (اس باب میں کسی بحث وتمحیص' یا جھگڑے کی ضرورت نہیں)۔ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔

❷ اس لیے تمہارا پروگرام الگ ہے' میرا پروگرام الگ۔ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو' مجھے اپنے پروگرام پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ آخرالامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ (6:136; 10:41; 15:85; 42:15; 60:4; 73:10)

❸ میں اس فضا کی تلاش میں نکل کر جا رہا ہوں جو میرے خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لیے سازگار ہو۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

جائے کہ یوں تو خدا کی خدائی برحق ہے پر ہمیں تو صحت کی آس نہیں' مریض کے لیے وہ قیامت کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس قسم کا طبیب ❶ جس نے تیرہ برس تک ان کے ان امراض کے لیے' اس شفقت سے' علاج کرنا چاہا' پھر جب ان کی حالت سے' ان کی طرف سے مایوس ہو کر' وہ یوں اٹھ کر چلا جائے تو پھر اس آنے والی قیامت میں تاخیر کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا اٹھ کر جانا ہی ان کے لیے آنے والی ہلاکتوں کا پیش خیمہ ہے۔ اور پھر وہ ہلاکتیں یک بعد دیگرے آئیں۔ وہ یورشیں اور حملے پہ حملہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اُدھر ہر حملے کے بعد ایک تباہی ان کے اوپر آتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی تمام سرفروشیاں حضور ﷺ کے قدموں کے نیچے تھیں۔ سات ہی سال کے عرصے کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ **لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ** (109:6)۔ یہ ہے جو ایک مردِ مومن' عبدِ مومن دنیا سے کہتا ہے' اگر وہ واقعی صحیح قانون کے مطابق چل رہا ہے' تو اس کے مطابق نتائج کے برآمد ہونے میں تو اسے شک و شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ جن کو پورے یقین کے ساتھ' دھڑلے کے ساتھ' یہ بات کہے گا کہ ''تم اپنی روش پہ چلتے جاؤ' مجھے اپنی روش پہ چلنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون حق پہ تھا کون باطل پہ تھا۔''

عزیزانِ من! یہاں ہم نے سورۃ الکٰفرون ختم کر دی۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ النصر یعنی 110 ویں سورۃ لیں گے اور میں سمجھتا یہ ہوں کہ آئندہ درس میں قرآنِ کریم کے درس کے اس سلسلے کی تکمیل ہو جائے گی۔ ❷ کتنی خوش بختی ہے ہماری' کتنا لمبا عرصا' بڑا صبر آزما' بڑا ہمت طلب' کس طرح سے ہم نے بسر کیا!

ہاں' وہ دیکھیے کہ اب حق پہ جانے والوں نے میقات پر احرام باندھ لیے اور وہ کعبہ آپ کو سامنے نظر آ رہا ہے۔ اگلے ہی درس کے اندر خدا چاہے ہم اس کو ختم کر دیں گے اور آپ کو معلوم ہے آپ احباب نے جیسا کہ فیصلہ کیا تھا اور آپ کا تقاضا بھی ہے' اس کے بعد تین جشن اتفاق سے اس دفعہ جمع ہو گئے ہیں۔ جشنِ چودہ سو سالہ نزولِ قرآن۔ قرآنِ کریم کو نازل ہوئے اس رمضان کو چودہ سو سال پورے ہو گئے۔ اس کا بھی جشن منایا جا رہا ہے۔ میں یہ بات کسی فخر یا تصور سے نہیں کہہ رہا' بحضورِ رب العزت عجز اور نیاز سے کہہ رہا ہوں' بطور تحدیثِ نعمت' بطور سپاس گزاری کہہ رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ رمضان کی عید کو جشنِ نزولِ قرآن پہلے پہل آپ ہی نے یہاں کہا تھا۔ اس سے پہلے آپ نے یہ بات کہیں سے نہیں سنی کہ یہ عید جشنِ نزولِ قرآن ہے اور پھر یہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چودہ سو سال گزر گئے مسلمانوں نے کبھی اس کا جشن نہیں منایا۔ اب پورے عالمِ اسلام میں جشنِ نزولِ قرآن منایا جا رہا ہے۔ اگر اس کے لیے خدا کے ہاں سے بھی کچھ خوش بختیاں مل سکتی ہیں تو اس میں آپ احباب کا حصہ السابقون الاولون ہونے کی حیثیت سے یقیناً بڑا ہے کہ جشنِ نزولِ قرآن کا تصور آپ نے دیا تھا۔ آج دنیا جشنِ نزولِ قرآن منا رہی ہے اور پھر جشنِ نزولِ قرآن تو آپ ہر سال یہاں منایا کرتے ہیں۔ یہ ہوا دوسرا جشن۔ اور

---

❶ یہ اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف ہے۔

❷ 31 دسمبر 1967ء کو یہ ہفتہ واری درسِ قرآن بہ حسن و خوبی تکمیل تک پہنچا۔ (حوالہ: طلوعِ اسلام فروری 1968' ص:6)

تیسرا جشن ہے کہ حسنِ اتفاق سے یہ تکمیلِ درسِ قرآنِ کریم بھی انہوں دنوں واقع ہو رہا ہے، ❶ عین اس عید کے موقعہ پر شاید ستائیس ہی رمضان ہو، عام طور پہ جو کہا جاتا ہے: وہی تاریخیں، تین جشن، سات جنوری کی اتوار کو آپ احباب یہیں منا رہے ہیں، اسی طرح سے صبح ساڑھے نو بجے کے قریب۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اس کے لیے آپ احباب نے پروگرام یہ تجویز کیا ہے کہ آپ احباب میں سے جو صاحبِ تاثر ہیں وہ یہ بتائیں گے کہ میں نے اس درس سے کیا پایا۔ تو سات جنوری کو یہ جشن ہوگا اور آئندہ درس کو ہم سلسلۃ الذھب کی اس سونے کی زنجیر کی آخری کڑی میں پرو دیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ 7 جنوری 1968ء بروز اتوار یہ سہ گانہ جشن منعقد ہوا۔ (حوالہ: طلوع اسلام فروری 1968، ص: 6)

تیسواں باب

سورة النصر (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ گرامی قدر! ہم رہ نوردانِ وادیٔ فرقان کا قافلۂ شوق' جو آج سے سات سال قبل ❶ جھلملاتے تاروں کی شبنمی چھاؤں میں' جانبِ منزل روانہ ہوا تھا' قندیلِ آسمانی کی بصیرت افروز اور جہاں تاب روشنی میں زمزمہ سنج و نغمہ باز' جذب و کیف کی منزلیں طے کرتا' آج 1967 کے سال کے آخری دن' ❷ اس مقام تک آ پہنچا ہے' جہاں سے چراغِ منزل' روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح' سامنے نظر آ رہا ہے۔ ہمارا یہ کاروانِ شوق قرآنِ کریم کی جوئے رواں کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا' وہ جوئے رواں جو سوئے افلاک سے فاران کی چوٹیوں پر جلوہ بار اور گوہر ریز ہوئی اور وہاں سے دامنِ ارض کی وسعتوں پر ہر چہار سو پھیل گئی۔ یہ مستِ خرام جوئے بار' دشت و صحرا میں زمینِ صالحہ کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس و خاشاک کو اپنی موج کی لپیٹ میں بہا کر' آگے بڑھتی چلی گئی' گاہ اپنی سکوت افزا روانیوں سے دلوں کے سبزہ نو دمیدہ کی جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی اور گاہ کف بر دہاں طغیانیوں سے بڑے بڑے سرکش اور تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑتی' این و آں سے بے نیاز' ماحول سے مستغنی' گرد و پیش سے غیر متاثر' اپنی ذات میں مست' جانبِ منزل بڑھتی گئی۔ اس نور کی ندی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ہمارا یہ کارواں آج اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں آخری منزل تک پہنچنے میں صرف چار' پانچ قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اس زندگی بخش سفر کی تکمیل کی ہنگامہ خیز مسرت اور اس حسین و جمیل منزل کے حصول کی مسرت انگیز کیفیت نے' میرے دل میں آج وفورِ جذبات کا ایسا طلاطم برپا کر رکھا ہے کہ الفاظ میرے حلق سے باہر نہیں آتے لیکن مجھے آگے بڑھنا چاہیے کہ یہ چار قدم آج ہم طے کر کے منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں۔

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ النصر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تیسویں پارہ کی 110 ویں سورۃ ہے۔ حق و باطل کی وہ کشمکش جس کی

---

❶ ستمبر 1960ء

❷ 31 دسمبر 1967ء

داستان قرآنِ کریم کے ہر ورق پہ مسلسل چلی آ رہی تھی' اس کا آخری الٹی میٹم سابقہ سورۃ **الکافرون** میں دے دیا گیا' جہاں کہہ دیا گیا کہ اب اس کے بعد تمہارا اور ہمارا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا' اس لیے کہ **لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ** [1] (109:6) تمہاری روش کے نتائج اب تمہارے سامنے آ کر رہیں گے' میرے پروگرام کے نتائج میرے سامنے آ جائیں گے۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ کھیتی جو اس سے اتنا عرصہ پیشتر بوئی گئی تھی' جس کی تخم ریزی 23 سال پہلے سے کی گئی تھی' اب اس کے بار آور ہونے کا وقت آ گیا ہے اور دوسری طرف تمہاری وہ تباہیاں' جو غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں' ان کے لیے بھی اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی آخری شعلہ سامانیوں سے تمہارے متاعِ حیات کو خاکستر بنا کر رکھ دیں۔ فیصلہ کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ سورۃ **الکافرون** اس کا ایک الٹی میٹم تھا۔ یہ آخری اعلان تھا اور اس آخری اعلان کے بعد اب ادھر یہ کہا جا رہا ہے کہ **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا** (110:1-2)۔ ذرا سوچیے کہ وہ کسان جس نے چھ ماہ پیشتر یا نو ماہ پیشتر اتنی محنت سے اپنی زمین کو سنوارا تھا' اس میں تخم ریزی کی تھی' پھر اس کی مسلسل محنت اور مشقت کا یہ عالم تھا کہ ہر صبح درانتی اور رسی لیے کھیت میں چلا جاتا تھا' سارا دن اس کھیت میں کام کرتا تھا' شام کو اسی طرح خالی ہاتھ واپس آ جاتا تھا' ایک دن نہیں' دو دن نہیں' ایک ماہ نہیں' دو ماہ نہیں اور اس نے تو ایک سال نہیں' دو سال نہیں مسلسل زندگی کا اتنا لمبا حصہ گزار دیا' اس کی حالتِ دل کیا ہوگی؟

نبی اکرم ﷺ کی آرزو اور خدا تعالیٰ کا فرمان

عزیزانِ من! اس میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مقامات ایسے بھی آئے تھے جہاں حضور نبی اکرم ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ بارِ الٰہا! کیا میری زندگی اس تگ و تازہی میں گزر جائے گی اور میں اپنی محنت کے ثمرات کو اپنے سامنے بھی دیکھ سکوں گا؟ وہاں یہ کہا گیا تھا کہ فطرت کے قوانین اٹل ہوتے ہیں' وہ کسی کے جذبات کی رعایت نہیں کرتے۔ وہ مہلت کا عرصہ' جو ان قوانین نے متعین کر رکھا ہے' کسی کی خاطر' اس میں تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ تمہارا کام محنت کیے جانا ہے۔ یہ فصل کب پکے گی' اس کا فیصلہ ہمارے قوانین ہی کریں گے: **فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ** [2] (13:40) لیکن اس داعی انقلاب ﷺ کی کتنی بڑی خوش بختی تھی کہ آپ کی حیاتِ طیبہ ہی میں یہ فصل پک گئی۔ اس اعلان عظیم کے بعد کہا گیا کہ ہاں لو وہ وقت آ گیا لیکن یہ جو اس نظام میں آخری وقت آیا ہے' یہ بھی اپنے سامنے ایک عجیب و غریب کیفیت رکھتا ہے۔ دنیا کے ہر پروگرام میں جب کامیابی کی گھڑی آ جاتی ہے تو پروگرام ختم ہو جاتا

---

[1] تمہارا پروگرام الگ ہے' میرا پروگرام الگ۔ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو' مجھے اپنے پروگرام پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ آخرالامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ (16:136;10:41:15:85;42:15;60:4;73:10)

[2] تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطۂ حیات کو لوگوں تک پہنچاتا جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق' نتائج کب ظہور میں آتے ہیں۔ (2-1 مفہوم القرآن - پرویز)

ہے۔ جب فصل پک جاتی ہے اور اس کے بعد اناج گھر لے آتے ہیں تو فصل کی یہ مدت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور کرنا باقی نہیں رہتا لیکن یہاں تو صورت ہی کچھ اور ہے۔ یہاں تو......

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

حیات تو مسلسل کد و کاوش کا نام ہے۔ اس میں تو کوئی مقام بھی ایسا نہیں آتا جسے آپ آخری مقام کہہ سکیں۔ اس زندگی میں تو ایک طرف قرآنِ کریم کی رُو سے تو جنت بھی انسان کے سلسلہ ارتقاء کی آخری منزل نہیں ہے۔ وہ بھی راستے میں صرف ستانے کا مقام ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں اسے یوں کہا گیا ہے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

ذہنوں میں پیدا ہونے والا باطل تصور

جس مقام پر دنیا کے عام اندازے اور آئین کے مطابق اس پروگرام کو ختم ہو جانا چاہیے تھا' یہاں سے یہ نظر آتا ہے کہ وہاں سے ایک نیا پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ اس کے لیے دو الفاظ آئے ہیں: **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ** (110:1) جب خدا کی نصرت و تائید آ پہنچے' تجھے غلبہ و نصرت حاصل ہو جائے تو ہمارے ذہنوں میں تو یہ ہے کہ یہ یونہی غائب طور پر خدا کی طرف سے' کوئی مدد آیا کرتی ہے' وہ فرشتے آیا کرتے ہیں' وہ تلواریں چلایا کرتے ہیں وہ تیر چلایا کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ''فرشتے'' کا لفظ کہتے تھے' آج کے اس دور میں ہم نے کہہ دیا کہ وہ سبز پگڑیوں والے' سفید عماموں والے' پیراہنوں والے' آ کر دشمن کے بموں کو راوی دریا کے اندر بہا [1] دیا کرتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں تو نصرت کا یہی تصور ہے۔ کچھ اس قسم کی چیز جس میں انسان کی اپنی کاوش کو دخل نہ ہو لیکن عزیزانِ من! قرآن کا تو ایک ایک لفظ حقیقت کو سامنے لے آتا ہے اور ہمارے باطل تصورات کی تردید کر جاتا ہے۔ یہاں بات کہی ہے کہ **اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ** (110:1) نصر کے معنی ہم نے تو نصرت ہی کیے اور نصرت کے معنی ہم نے مدد کیے اور مدد کے متعلق تصور یہ پیدا کیا کہ وہ کچھ غائبانہ طور پہ ہوتی ہے لیکن یہ تو عربی زبان ہے یہ تو قرآن کا انتخاب ہے۔ یہاں وہ معنی اس انداز میں نہیں ہیں۔

نصرت کا مفہوم

کیا آپ کو معلوم ہے کہ نصرت کے معنی ہوتے کیا ہیں؟ یاد رکھیے ''بھرپور بارش کا برسنا''۔ بارش خدا کے قوانین کے مطابق برستی ہے

---

[1] یہ پاک و ہند 1965ء کی جنگ کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا تھا کہ یہ کام تو ان سبز پگڑیوں والوں نے کیا تھا۔ اس میں پاک فوج کا کوئی کمال نہیں تھا۔

لیکن یہ اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جس نے اپنی مہلت میں اپنی زمین کو اس کے لیے سنوارا ہو۔ جس نے اپنی زمین کو کھیتی کے لیے تیار ہی نہیں کیا' بارش اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ بارش سے کچھ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بارش اور زمین کے درمیان ایک رابطہ قائم کیا جائے تاکہ وہ آئے تو یہ اسے اپنے سینوں میں سمو دے' پھر اس کے مطابق کسان محنت کرے' پھر وہ فصل پکتی ہے۔ بارش تو اتنا ہی کرتی ہے۔

سماوی اقدار اور انسان کی محنت کا ماحصل

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسان نے زمین نہ سنواری ہو' وہ گھر میں بیٹھا رہے' بارش برس جائے' وہ پھر بھی اٹھ کر کچھ نہ کرے' اور اس کی کوٹھیاں دانوں سے بھر جائیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بارش کے بغیر بھی کھیتی نہیں اگتی لیکن محض بارش کے ہو جانے سے کھیتی نہیں پک جاتی' اس نے خود بھی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا خود نصر اللہ کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہ کیا چیز ہے جو اب آ رہی ہے۔ تم نے اپنی زمین کو تیار کیا' بڑی محنت کی' بیج ڈالا' عین وقت کے اوپر بارش ہوئی۔ بارش کے بعد پھر تم اس تگ و دو میں لگ گئے۔ اس کے بعد ہی کھیتی پکتی ہے۔ سماوی اقدار اور انسان کی ذاتی محنت کے درمیان صحیح امتزاج ہو جاتا ہے تو پھر خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ خالی اقدارِ سماوی یا قوانینِ خداوندی' جن کے ساتھ انسان کی محنت شامل نہ ہو' از خود کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتے اور اسی طرح اگر انسان کی اپنی محنت قوانینِ خداوندی کے ماتحت نہیں چلتی' پھر بھی وہ باطل ہو جاتی ہے۔ اسی کو قرآن نے کہا کہ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ [1] (2:217) لیکن جب قانونِ خداوندی کے مطابق' انسان کی سعی و کاوش' یہ دونوں چیزیں' اکٹھی ہو جاتی ہیں' پھر نتائج مرتب ہوتے ہیں اس لیے اسے خدا کی نصرت یا تائید یا مدد کہا جاتا ہے۔ اس کی بات قرآنِ کریم نے ایک مثال سے اور ایک لفظ سے واضح کر دی۔ پہلے کہا کہ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ [2] (110:1) اور اس کے بعد کہا ہے کہ وَالۡفَتۡحُ [3] (110:1)۔

فتح کا لفظ اپنے اندر بلیغ مفہوم رکھتا ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو فتح کا معنی بھی فتح لیا جاتا ہے' اس کا ترجمہ Victory کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یوں لیے جاتے ہیں کہ دشمن کے ساتھ جنگ ہوئی اور اس کے بعد ہمیں فتح حاصل ہو گئی تو گویا یہ اس جدوجہد کی فتح حاصل کر لینا' ایک آخری کڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تو کچھ اور باقی نہیں رہتا لیکن یہ تو فتح کا ہمارا تصور ہے۔ نہ یہ عربی زبان کا تصور ہے' نہ قرآنِ کریم کے انتخاب کا تصور ہے۔

---

[1] ان کے اعمال کسی کام نہیں آتے۔

[2] جب قانونِ خداوندی کے مطابق' تجھے غلبہ و نصرت حاصل ہو جائے اور......

[3] ان لوگوں کی مخالفت ختم ہو کر' دین کے دروازے ہر طرف سے کھل جائیں...... (3-2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! جیسا کہ میں گزشتہ ❶ نو برس سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں اور قرآن کا یہ انتخاب ہے۔ اگر ان الفاظ کے معانی متعین کر دیئے جائیں تو قرآن کے سارے مطالب واضح ہو جاتے ہیں۔ فتح کو اردو میں نہ لیجیے' اس کا انگریزی ترجمہ بھی غلط ہے جو ہمارے ہاں قرآنِ کریم کے ترجموں میں ہوا ہے یا کہا گیا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ یہ تو وہ پروگرام ہے جس کا سلسلہ غیر منقطع ہے' مسلسل آگے چلتا ہے۔ فتح کے معنی ہوتے ہیں ''وہ دروازے' جو اس سے پہلے بند تھے' وہ کھل گئے' اب آگے بولو''۔ کتنے عرصے تک یہ کاروانِ شوق اپنی منازل طے کرتا ہوا آگے جانا چاہتا تھا' راستے میں موانعات تھیں۔ دوسروں نے اس کے پھاٹک بند کر رکھے تھے۔ اب ہوا صرف یہ ہے کہ تمہاری اتنی مسلسل کدوکاوش سے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق کی گئی ہے یہ دروازے کھل گئے ہیں۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

آپ جانتے ہیں کہ دروازے کھلنے سے آخری منزل تو نہیں آ جاتی' اس کے بعد تو ایک نیا سفر در پے ہوتا ہے' اس کے بعد تو ایک نیا راستہ سامنے آتا ہے اور یہی چیز ہے جس کو قرآن نے سکھایا کہ زندگی کے پروگرام کی کسی مقام پہ جا کر بھی آخری منزل نہیں آتی۔ ارتقاء تو کہتے ہی اس چیز کو ہیں: بڑھتے چلے جانا' مسلسل آگے بڑھتے چلے جانا۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ نصرتِ خداوندی سے وہ جو قوانین خداوندی کے ساتھ تمہاری محنتیں ہم آہنگ ہوئیں' اس سے ہوا اتنا ہی ہے کہ یہ جو پہلے تمہارے راستے میں دروازے بند تھے' وہ دروازے اب کھل گئے ہیں۔ چلو' آگے بڑھو۔

لفظ فوج کا مفہوم

اب ان دروازوں کے کھل جانے سے کیا ہوا؟ اس کے لیے کہا کہ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ❷ (110:2)۔ دروازہ کھلا اور تم نے دیکھا کہ فوج در فوج لوگ اب اس نظامِ خداوندی کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ خود لفظِ فوج میں کثرت بھی ہوتی ہے اور تیزی بھی ہوتی ہے۔ یعنی ہجوم کر کے لوگوں کا تیزی سے اندر آ جانا۔ دروازے کھلنے سے یہ ہوا ہے۔ اس سے پیشتر موانعات کی وجہ سے کیا کیفیت تھی؟ نبی اکرم ﷺ کی تیرہ سالہ مکہ کی زندگی کی کدوکاوش' اس قدر عظیم داعی انقلاب' خدا کا آخری نبی کہ

---

❶ اپریل 1985ء میں پرویزؒ کراچی سے لاہور تشریف لائے۔ آپ نے 1955ء میں قبل از وقت پنشن حاصل کر لی تھی تاکہ وہ اپنے ہمہ اوقات و توجہات اپنی زندگی کے قرآنی مشن کے فروغ کے لیے وقف کر سکیں۔ لاہور میں جولائی 1958ء سے سلسلہ درس شروع کیا۔ ابتداً درس کے موضوعات اسلام کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات رہے جن کے بغیر مسلسل درسِ قرآن کی تفہیم آسان نہ ہو سکی تھی۔ باقاعدہ درسِ قرآن ستمبر 1960 سے شروع ہوا۔ (حوالہ: طلوع اسلام فروری 1968ء' ص۔15)

❷ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ لوگ کس طرح جوق در جوق' اس نظام میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ (19:96) (2- مفہوم القرآن۔ پرویز)

جس کے بعد کسی اور نے آنا نہیں، تئیس سالہ ساری نبوت کی زندگی اس میں تیرہ سال کے عرصہ کا ماحصل وہی تھا جو تین سو بارہ کی تعداد میں بدر کے میدان میں آ گیا تھا۔ دنیاوی اعداد و شمار کے اعتبار سے دیکھیے تو بڑی ہی سست رفتار کامیابی اس لیے کہ راستے میں بڑے بڑے دروازے بند تھے۔ اب اس کدو کاوش کے بعد وہ دروازے جو پٹ کھلے ہیں تو اب دیکھیے گا کہ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2)۔ نظامِ خداوندی میں کس طرح لوگ جوق در جوق داخل ہوتے ہیں۔ یہ کون سی چیز تھی جس کی وجہ سے لوگ اب فوج در فوج اس میں داخل ہونے شروع ہو گئے؟ یہ سوچنے کی چیز ہے۔

زبانی تبلیغ کچھ کام نہیں دیتی

ہمارے ہاں زور دیا جاتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیئے دنیا کے فلاں حصے میں اتنے لاکھ مسلمان عیسائی ہو گئے فلاں جگہ اتنے مسلم ہندو بن گئے۔ یہ ساری چیزیں ہیں۔ اس کے خلاف پھر یہ ہے کہ صاحب! تبلیغ کرنی چاہیے۔ ٹھیک ہے تبلیغ کرنی چاہیے مگر زبانی تبلیغ تو کچھ کام نہیں دے سکتی۔

برادرانِ عزیز! اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے اور میں نے اس سے پہلے بھی شاید کئی دفعہ دہرایا ہے کہ مغرب کے اچھے اچھے مفکر اکثر مجھ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ میں نے جب بھی ان کے سامنے قرآن کا اسلام پیش کیا میں نے یہ دیکھا کہ تھوڑے سے وقت میں وہ اس سے مطمئن ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ یہ چیز سامنے آنی چاہیے لیکن اس کے بعد انہوں نے ہمیشہ ایک اعتراض کیا۔ پھر جس طرح مور اپنے پاؤں دیکھ کر پر سمیٹ لیتا ہے میری بھی یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ اگر قرآن کی تعلیم یہ ہے تو قرآن کے ماننے والی قوم کی دنیا میں یہ حالت کیوں ہے؟ تعلیم تو یہ بتاتی ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ [1] (3:139)۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے

یہ قوم اقوامِ عالم میں سب سے بلند ترین مقام کے اوپر ہو گی۔ اس کی تعلیم تو یہ کہہ رہی ہے اور اس قوم کی حالت یہ ہے کہ دنیا کی اقوام میں پست ترین، ذلیل ترین درجے پر ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ اگر اس پیغام اور اس نظام میں یہ صلاحیت ہے تو پھر اس قوم کی حالت یہ کیوں ہے؟ اچھے سے اچھے مفکر بھی جو آپ کی اس تعلیم سے مطمئن ہو جائیں گے، نظری طور پر وہ آپ کی قوم میں داخل ہونا کبھی پسند نہیں کریں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ اس کے بعد ہمارا بھی حشر یہی ہو گا جو ان کا ہو رہا ہے۔ وہ آپ کے اس دین میں کیوں آئیں گے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے بعد تو دیکھے گا کہ کس طرح فوج در فوج لوگ اس کے اندر آتے ہیں۔ یہ کیسے آئے تھے؟ یہ نظام قائم ہو گیا تھا، جس نظام کے درخشندہ نتائج نے یہ بتا دیا تھا کہ دیکھیے، کس طرح ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی قوم، قیصر و

---

[1] تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔

کسریٰ کی تہذیبوں کی مالک بن گئی اور جب یہ کر کے دکھا دیا تو اس کے بعد یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (110:2) تو پھاٹک کھل جاتے ہیں، اس کے بعد کسی تبلیغ کی ضرورت ہی نہیں رہتی، کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

نظام کے محسوس، درخشندہ، مرئی نتائج ساری دنیا کے لیے وجہ کشش و جاذبیت ہو جاتے ہیں، دنیا کھنچ کر اس کی طرف آ جاتی ہے اور اگر نتائج یہ کچھ نہیں بتا رہے، آپ لاکھ زبانی کہیے کہ میرے پاس ایک چیز ہے، دیکھیے وہ کیا سے کیا کر دیتی ہے، اگر اس کے یہ نتائج نہیں بتا رہے تو کوئی شخص آپ کی باتوں میں نہیں آئے گا۔ یہ جو آج آپ کی حالت ہے کہ دنیا کی اس قدر غیر مسلم اقوام روز ہی ہم یہ چلاتی ہیں کہ اتنے عیسائی ہو گئے اور اتنے ہندو ہو گئے اس کی وجہ یہ ہے۔ آپ کے اندر کون سی کششِ جذب ہے کہ کوئی آپ کی طرف کھنچ کر آئے۔

حج کی تو پکار ہی یہ تھی

یہ جو کچھ اتنے عرصے میں ہوا تھا وہ یہ تھا کہ یہ نظام قائم ہوا جس کے مرکزی اجتماع یعنی حج کے لیے کہا یہ گیا کہ ساری دنیا کے لوگوں کو آواز دے دو کہ آؤ یہاں۔ کاہے کے لیے؟ کہا کہ لِّیَشۡہَدُوۡا مَنَافِعَ لَہُمۡ (22:28) تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ جب کوئی آ کر دیکھے گا کہ کل اس قوم کی یہ حالت تھی اور آج وہ اس قدر سرفرازیوں اور سربلندیوں کے مقام بلند پہ پہنچ گئی، جب وہ یہ دیکھے گا کہ یہ نظام اپنے ہی لیے نہیں، وہ تو نوعِ انسانی کے لیے اس قدر منفعت بخش کام کر رہا ہے، تو پھر کوئی پاگل ہی ہوگا جو اس نظام کے اندر نہ آئے پھر تو آپ کو زبان سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ نظام کے درخشندہ نتائج خود لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ یہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (110:2)۔ خدا کی نصرت آ گئی، فتح حاصل ہو گئی تو اس کے بعد تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی ہر قوم میں یہ ہوگا کہ اب باجے بجاؤ، جلسے کرو، جشن ہونے چاہئیں، راوی عیش لکھتا ہے، موج ہو گئی، یار فتح حاصل ہو گئی۔ فتح کے بعد تو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کس قدر جشن ہوتے ہیں پھر اس کے بعد تو کچھ کرنے کی بات ہی نہیں رہتی لیکن یہاں تو جیسا میں نے کہا، فتح سے تو ایک نئی منزل کا دروازہ کھلا ہے۔ کہا کہ جب یہ صورت ہو، نصرتِ خداوندی بھی آ جائے، یوں فتح بھی حاصل ہو جائے، دنیا فوج درفوج اس دین کے اندر داخل ہونا شروع ہو جائے، تو پھر کیا کرو؟ کیا عیش کرو؟ باجے بجاؤ؟ ایک انقلابی پروگرام یہ کچھ نہیں کرتا۔ سنیے، عزیزانِ من! اس مقام پہ کیا کرو، جب یہ کچھ حاصل ہو جائے؟ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ (110:3) خدا کے اس نظام کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لیے پہلے سے زیادہ سرگرمِ عمل ہو جاؤ۔ میں نے ایک دو درس پہلے بھی یہ کہا تھا کہ یہ تو عشق کی وادیاں ہی عجیب ہیں:

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اگلی منزل: فوج درفوج کی تعلیم وتربیت اوراستحکام ہے

فتح ونصرت حاصل ہورہی ہے' اس کے بعد کوئی چار دن بھی Recreation (تفریح) کے نہیں مل رہے۔ کہا کہ جب یہ ہو تو اس سے تمہاری ذمہ داریاں اوربھی بڑھ جائیں گی۔ ان سے عہدہ براہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ تم **فَسَبِّحْ** (110:3) اور بھی شدت سے سرگرم عمل ہوجاؤ۔ آپ دیکھیے یہ ''ف'' کس طرح آئی ہے۔ اس میں **فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ** (110:3) کہا ہے کہ اس کے بعد اسے اور زیادہ وجہ حمد وستائش بنانے کے لیے' زیادہ تیزی سے سرگرمِ عمل ہوجاؤ اور دیکھو پہلی گھاٹیاں بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھیں لیکن کامیابیوں اور کامرانیوں کے بعد جو گھاٹیاں آیا کرتی ہیں' وہ بھی بڑی لغزش آمیز ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا **وَاسْتَغْفِرْهُ** (110:3) ہر وقت ان خطرناک گھاٹیوں سے بچنے کے لیے سامانِ حفاظت طلب کرتے رہو۔ یاد رکھو' اب اسے تم نے Maintain (برقرار ومحفوظ) بھی کرنا ہے۔ یہ حاصل کرنا ہی کوئی بات نہیں تھی یہ تو ہوگیا۔ اس کے بعد اگلی منزل آئی ہے۔ یہ جو فوج درفوج اندر آئے ہیں' ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔ اتنی بڑی مملکت جو وسیع ہوئی ہے اس مملکت کے لیے یہ نظامِ خداوندی کہ جس کی مثال اور نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں ہے' اس کو متشکل تو تم نے کیا ہے' اس کے قیام اور استحکام کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا پڑے گی اور اس کے ساتھ ہی اب کامیابیوں کے بعد نئی قسم کی تباہیوں کی گھاٹیاں آئیں گی۔ ان سے محفوظ رہنے کے لیے اس فوج درفوج آنے والے لوگوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔

قوموں کی تباہی تو کامیابیوں کے بعد ہوتی ہے

آپ جانتے ہیں کہ جدوجہد اور کوشش کے دوران اتنی خطرناک گھاٹیاں نہیں ہوا کرتیں جتنی کامیابیاں حاصل ہونے کے بعد آیا کرتی ہیں۔ قوموں کی تباہیاں تو کامیابیوں کے بعد زیادہ ہوئی ہیں۔ کشمکش جنگ وجدل کے زمانے میں تو قوم اتنی تباہیوں میں نہیں آتی۔ اس وقت تو اس کے اندر منزل کی طرف پہنچنے کے لیے ایک جوش ہوتا ہے' ایک حرارت ہوتی ہے۔ خوف ہوتا ہے جو کام کے لیے سرگرمِ عمل رکھتا ہے' لیکن منزل پہ پہنچ جانے کے بعد وہ اپنے عناصر میں اضمحلال پیدا کرلیتی ہے تو پھر وہ قوم تباہ ہوتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کہا کہ **وَاسْتَغْفِرْهُ** (110:3) اب اپنے لیے زیادہ سامانِ حفاظت طلب کر۔ منزل وہ آگئی ہے جہاں **إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا** (110:3) تو دیکھے گا کہ اگر اب اس پروگرام میں تم نے حصہ شامل کرلیا تو قانونِ خداوندی پہلے سے بڑی زیادہ تیزی اور حرکت کے ساتھ تمہاری طرف لوٹ آئے گا۔

حقیقی کامرانی کا رازاقتدارِخداوندی میں مضمر ہے

حقیقی کامرانی کا یہ طریقہ ہے کہ نصرتِ خداوندی' قوانینِ فطرت' قوانینِ سماوی جن کو اقتدار کہا جاتا ہے' کے ساتھ انسانی جدوجہد کو ہم آہنگ کیجیے تاکہ فصل بارآور ہو۔ یہ جو نظام کے محسوس نتائج ہیں' ان کی وجہ سے تم میں اتنی کشش پیدا ہو جائے گی کہ لوگ فوج درفوج اس نظام کے اندر آئیں گے۔ جب یہ اندر آ گئے تو یہ نہ سمجھو کہ ہمارا کام ختم ہو گیا' پروگرام کی تکمیل ہوگئی' اب تو تمہارا کام شروع ہوا ہے۔ اب انہیں سنبھالنے کے لیۓ' ان کی تعلیم وتربیت کے لیۓ' اس نئے نظام کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیۓ' پہلے سے بھی زیادہ مصروفِ جدوجہد ہو جاؤ اور سامانِ حفاظت طلب کرتے رہو۔ یہ کچھ کرتے رہو گے تو قانونِ خداوندی پہلے سے بھی زیادہ تیز گام ہو کر تمہاری طرف بڑھتا چلا آئے گا کیونکہ یہاں ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا [1] (110:3)۔ دیکھا عزیزانِ من! فتح ونصرت کے بعد' کامیابیوں اور کامرانیوں کے بعد' اس انقلابی جماعت کے لیے قرآن کیا پروگرام لا رہا ہے۔ پہلے دی گئی وارننگ اور اس وارننگ کے بعد کہا کہ لو بھئی! تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (110:1)۔ معاملہ ختم ہوا اور مخالفین کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔

عزیزانِ من! سورہ النصر یہاں ختم ہوئی۔ اب ہم سورۃ الّھب لیتے ہیں۔

---

[1] (اُس وقت اس نظام میں خرابیاں پیدا کرنے کے لیے بڑی بڑی سازشیں کریں گے' تمہیں ان کی مدافعت کے لیے خدا سے سامانِ حفاظت طلب کرنا ہوگا: اِسۡتَغۡفِرۡهُ) تم یہ کرو گے تو خدا کی تائید ونصرت' اور تیزی سے آگے بڑھ کر تمہاری طرف آئے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سورة الهب (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ الھب شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 111 ویں سورۃ ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ❶ (111:1)۔معاملہ ختم ہوا' ان کے وہ ہاتھ ٹوٹ گئے جو مخالفتوں میں اس قدر آگے بڑھ گئے تھے۔آپ دیکھ رہے کہ قرآنِ کریم کے اندر کس طرح حسین ربط ہے۔عزیزانِ من! کہا کہ ٹوٹ گئے ہاتھ۔آخری شکست مل گئی۔ان سب کا انہدام ہوگیا۔ اس سورۃ میں ابی لھب ❷ کہا گیا ہے۔قرآنِ کریم نے مخالفین میں سے صرف ایک کا نام لیا ہے۔نام بھی نہیں لیا' صرف کنیت سے ہی اسے پکارا ہے اور وہ ہے ابی لھب۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سب میں سے چن کر اس کا نام کیوں لیا؟ یا اُسے اس طرح سے کیوں پکارا؟

---

❶ (تم یہ کروگے تو) خدا کی پائید و نصرت اور تیزی سے آگے بڑھ کر' تمہارا طرف آئے گی۔

❷ Historically. Abi-Lahab was an inoffensive KUNIYAH (nick name) of Abd-al- Uzza, a paternal uncle of the exalted Prophet. He was a very good looking man with a glowing face and a fiery temper, hence Known as Abu Lahab, 'Father of Flame.' Unfortunately, for them, he and his wife Arwa Umm-Jamil hint Harb bin Umayyah (who was a sister of Abu Sufyan) took a very hostile stance against Islam and the exalted Prophet and persecuted him in Makkah. They were the next door neighbors to him.

Arwa used to spread out thorny branches at the exalted Messenger`s door by night and ran defamation camplaign against him. She had a most beautiful and expensive necklace that she always was proud of. The ornament of palm-fiber in her neck probably has a subtle allusion to that in the Surah. Abi Lahab was the chief priest of the Holy Shrine of Ka`bah...... He was a wealthy and arrogant man, therefore, he could foresee that Allah`s Message of Human equality threatened his high status and special interests. In short he was the Symbol of Oppostion to the Divine Message (Shabbir Ahmed: The Quran as it explains itself, Galaxy Publications, Lauderhill, FL, USA. PP. 524-525).

اور یہیں سے یہ بات نظر آتی ہے کہ نظامِ خداوندی کی سب سے بڑی مخالفت اس کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ ابی لھب کنیت تھی۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا حقیقی چچا تھا۔ عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب اس کا نام تھا۔ عربی میں لھب کہتے ہیں: شعلہ خیز آگ کو۔ اس کے مزاج میں بڑا اشتعال تھا اور میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ کونسا گروہ ہوتا ہے جس کے مزاج میں اتنا اشتعال ہوتا ہے کہ ایک بات بھی اگر ان کے کسی نظریہ یا عقیدہ کے خلاف کہیے' پھر دیکھیے کس طرح اس کے منہ میں جھاگ آ جاتی ہے' برداشت ہی نہیں کر سکتے' Tolerance (برداشت) قطعاً نہیں ہوتی۔ مجھے تو اب بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جب میں کہوں کہ وہ شعلہ مزاج ہے' بھڑک اٹھنے والا ہے گویا کہ اس نے کسی دوسرے کی سنی ہی نہیں ہے' صاحب ہر وقت لٹھ لیے پھر رہے ہیں' یہ تھا ابی لھب۔

قرابت داری کوئی معنی نہیں رکھتی

حضور اکرم ﷺ کے والد کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے بعد یہ چچا ہی قریب ترین قرابت دار ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کر دی کہ

در یں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اگر ساتھ نہیں ہے تو وہ سامنے غرق ہو جاتا ہے' حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ساتھ نہیں ہے تو وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ساتھ نہیں دیتا ہے تو وہ اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور رسولِ خدا محمد ﷺ کا حقیقی چچا سب سے زیادہ مخالف ہے۔ اسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ختم ہو گیا۔ یہاں قرابت اور رشتہ داری کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس رشتہ داری کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو قریب ترین رشتہ دار تھا' یہ اس کی بات کہی ہے۔

مقامِ نبوت ہوتا ہی یہ ہے

جب نبی اکرم ﷺ نے کوہ صفا پہ کھڑے ہو کر مکہ والوں کو پہلی دعوت کی آواز دی تھی' ان کو بلایا تھا اور کہا تھا کہ اگر میں تمہیں' (آپؐ پہاڑ کی چوٹی پہ تھے اور یہ نیچے)' یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک فوج آ رہی ہے جو تمہیں تباہ کر کے رکھ دے گی تو کیا تم اسے مان لو گے؟ انہوں نے بہ یک زبان کہا تھا کہ کیوں نہیں مانیں گے' تم نے آج تک کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! داعی انقلاب کی پہلی زندگی بھی ایسی ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اعتماد ہے اور اس میں دوسری بات یہ تھی کہ آپ پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑے تھے' یہ اس دامنِ کوہ میں کھڑے تھے۔ وہ ایسی پوزیشن میں تھے' جہاں سے پہاڑ کی دوسری سمت بھی دیکھ سکتے تھے' اِدھر بھی دیکھ سکتے تھے مگر یہ صرف اسی طرف دیکھ سکتے' اُدھر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ نبی کے معنی ہوتے ہیں ''مقامِ بلند پہ کھڑا ہوا'' وہ اِس دنیا کو بھی دیکھتا ہے' وہ اُس دنیا کو بھی دیکھتا ہے اس لیے اس کی جو بات ہے وہ صداقت پہ مبنی ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جو ہنوز ان انسانوں کے سامنے نہیں آئی ہوتیں۔ جب وہ اپنی دعوت ان تک پہنچا دیتا ہے تو پھر یہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس سے پیشتر نبی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ

بلند مقام پہ ہوتا ہے۔ بہرحال آپ نے یہ کہہ کر ان کو کہا کہ تم پر ایک بہت بڑی آفت آنے والی ہے جو تباہ کر دے گی۔تو سب سے پہلے اسی چچا ابولھب نے یہ کہا تھا: او تیرا ستیاناس (معاذ اللہ' معاذ اللہ) تو نے یہ کہنے کے لیے ہمیں جمع کیا تھا۔ وہ اپنے ٹولے کو ساتھ لے کر چلا گیا۔اس کے بعد سب سے زیادہ سخت مخالفت اس کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہ کیوں ہوتی تھی؟ قریش تاجر تھے۔ وہ تو عام طور پہ تجارت میں لگے رہتے تھے۔ یہ کعبے کا متولی تھا۔ یہاں مذہبی پیشوائیت تھی۔اسے یہ پتہ تھا کہ یہ نظام' یہ آواز' جسے یہ لے کر اٹھا ہے' اس کی زد سب سے پہلے اس کی مذہبی پیشوائیت پر پڑنی ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جب یہ کہتا ہے کہ لا الہ الا اللہ تو اس کے معنی کیا ہیں۔عزیزانِ من! وہ لوگ جانتے تھے کہ یہ کس قدر عظیم انقلاب کی دعوت ہے جو دی جا رہی ہے۔انہیں معلوم تھا کہ اب یہ سارے الہ جن کے نمائندے بن کر ہم دنیا کو Exploit (سلب ونہب) کرتے ہیں' یہ شخص وہ سب ختم کر کے رکھ دے گا اور جب وہی نہ رہے تو پھر ہم کہاں رہیں گے۔اس پر براہِ راست زد پڑتی تھی۔کعبہ کی تولیت چھن رہی تھی' اس کی پیشوائیت ختم ہو رہی تھی اور یہ وجہ تھی کہ ان سب میں سب سے زیادہ یہ شخص تھا جو اس چیز کی مخالفت کرتا تھا۔

مذہبی پیشوائیت کا کردار

عزیزانِ من! اب سات [1] سال کے عرصے میں قرآن کریم نے جتنے انبیائے کرام علیہم السلام کی داستانیں ہمارے سامنے لائی ہیں' اس میں آپ دیکھیں گے کہ انبیائے کرام کی انقلابی دعوت کی مخالفت ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی۔نظامِ سرمایہ داری ان کی پشت پہ ہوتا تھا لیکن درمیان میں مخالفت یہی کرتے تھے' دوسروں کو مشتعل یہی کر سکتے ہیں۔قرآنِ کریم نے یہاں بھی اس ایک ابولھب کا انتخاب کر کے بتا دیا کہ سب سے بڑی مخالفت کس طرف سے ہو رہی تھی۔ وہ کون سی جماعت تھی جس کا یہ نمائندہ تھا کہ جس کی قوت کے ٹوٹنے سے یہ نظام قائم ہو سکتا ہے۔ جب تک یہ قوت نہیں ٹوٹتی' عزیزانِ من! صحیح نظامِ خداوندی قائم نہیں ہو سکتا۔نظامِ خداوندی کے راستے میں سب سے بڑا سنگِ گراں' سب سے بڑی روک' مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے۔یاد رکھیے! یہ بڑی آسانی سے فریب دے سکتی ہے۔ یہ اپنے ہاں وہی اصطلاحات استعمال کرتی ہے جو نظامِ خداوندی کے دین کی ہوتی ہیں مگر انہوں نے ان کے معنی اور ان کے تصورات کو ختم کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑا فریب ہے جو یہ عوام کو دے دیتے ہیں۔نظامِ خداوندی کی تشکیل میں سب سے بڑی روک ہوتی ہے۔اس لیے قرآنِ کریم نے خاص طور پر چن کر اس کا نام لیا کہ اس کی شکست درحقیقت نظام کی فتح ہے اور پھر ذاتی Character (کردار) کی یہ کیفیت تھی اور وہ بھی اسی ابولھب کی بات نہیں ہے' ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔

---

[1] درسِ قرآن کے ذریعہ اس سورۃ تک پہنچنے میں آپ (پرویزؒ) کو سات سال کا عرصہ لگا تھا۔ یہاں سات سال سے مراد یہ عرصہ ہے۔

کعبہ کے متولیوں کی بندر بانٹ

عزیزانِ من! وہ کعبہ کا متولی تھا۔ کعبہ میں جو چڑھاوا چڑھتا تھا' اس میں جتنی بھی قیمتی چیزیں آیا کرتی تھیں' یہ اس ایک ہی متولی کی نہیں ہوتی تھیں بلکہ جتنے بھی متولی تھے وہ ان سب کی بھی ہوتی تھی اور یہ ان متولیوں کا ہیڈ (سربراہ) تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ سونے کا ہرن چڑھاوا چڑھا۔ وہ اسے چوری کر کے لے گیا۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ روز ہوتا ہے۔ ابھی پرسوں اخبار ❶ میں لکھا ہوا تھا کہ محکمہ اوقاف نے جتنی جائیدادیں اپنی تحویل میں لی ہیں' ان سے کہیں زیادہ جائیدادیں ہیں جو ابھی تک چھپی ہوئی ہیں۔ جو لوگ اس کے متعلق انفرمیشن دیں گے' اُنہیں اتنا اتنا انعام دیا جائے گا۔ ان کو چرا کر رکھا ہوتا ہے۔ پھر بے ہمتی' بے غیرتی' بزدلی اور بے حمیتی کی یہ کیفیت بھی ہوتی تھی۔

محنت نہ کرنے والا ہمیشہ بے حمیت اور بزدل ہوتا ہے

عزیزانِ من! ہر وہ شخص جو محنت کر کے نہیں کماتا' وہ بے حمیت اور بزدل ہوتا ہے۔ عرب جن کی شجاعت اور غیرت کی یہ کیفیت ہوا کرتی تھی کہ ایک چھوٹی سی چیز پر سینکڑوں سال تک جنگ لڑا کرتے تھے' مرنے والا باپ بیٹے کو وصیت کر جاتا تھا کہ تم نے فلاں سے بدلہ لینا ہے۔ اس معاملہ میں عرب جاہلیت کا Character (کردار) یہ تھا مگر اس ابی لہب کی کیفیت یہ تھی کہ بدر کی ❷ جنگ میں جب قریش کے تمام احباب خود لڑنے کے لیے گئے ہیں تو یہ اس جنگ میں نہیں گیا۔ یہ پچھلی جنگ ❸ میں' جو آپ کے ہاں ہوئی ہے' ان سے کہا گیا تھا سرکار! ذرا فرنٹ پر بھی جائیے تو کہنے لگے تھے کہ ہم تو وقتی طور پر افسر بنے ہیں۔ اسی رنگروٹ ای افسر ہونے ہیگے آں ❹۔ یہ شخص اس جنگ میں خود نہیں گیا۔ اور اس کے بعد سنیے عزیزانِ من! بے حمیتی ہی نہیں' کس قدر درندگی تھی کہ ایک شخص نے اس ابی لہب کا قرضہ دینا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ لوگ قرضے پہ بھی روپیہ ''چلاتے'' ہیں تو اس نے اس شخص کے گلے پہ انگوٹھا رکھ دیا کہ لاؤ' وہ روپیہ جو تم نے مجھ سے قرض لیا تھا۔ اس کے پاس روپیہ نہیں تھا تو اس نے کہا کہ جاؤ' پھر میری طرف سے جنگِ بدر میں جا کر لڑو۔ اس طرح اس نے اسے مرنے کے لیے بھیج دیا۔

---

❶ یہ دسمبر 1967ء کی 31 تاریخ کو کہا گیا تھا۔

❷ جنگِ بدر سترہ رمضان 2ھ (مطابق 13 مارچ 624ء) کو بدر کے میدان میں ہوئی۔

❸ یہ جنگ رومال کی طرف اشارہ ہے جو افغانستان میں لڑی گئی تھی۔

❹ ہم تو صرف بھرتی کرنے والے افسر ہیں۔

ایسے لوگوں کے ساتھ اولاد کا رویہ

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک لفظ سے اشارہ کرکے قرآن کیا کیا چیزیں سامنے لا رہا ہے لیکن ہوا یہ کہ اس جنگِ بدر کے چند ہی دنوں بعد یہ خود ایک Infectious Disease (متعدی بیماری)' ایک موذی مرض' میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔ اس کے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ اس کے سلوک کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اسے دفنانے کے لیے بھی نہیں لے کر گئے۔ انہوں نے چند حبشی مزدور کرائے پہ لیے اور وہ اسے اٹھا کر کھڈے میں پھینک آئے۔ یہ جتنے بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں' انہیں دیکھیے ذرا! ان کی اولاد بھی ان کے ہاتھوں بڑی نالاں ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں' قرآنِ کریم نے' ایک لفظ کے اندر' ایک شخص کی طرف اشارہ کرکے سمٹا کر رکھ دیں اور کہا کہ لیجیے! اب ان کا معاملہ ختم ہوا۔ جس بل بوتے پر انہوں نے یہ سارا کچھ کر رکھا تھا' اب وہ سامنے سے ڈھے رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ختم ہو گیا یعنی یہ چیز راستے سے ہٹ گئی۔ اب یہ رکاوٹ ختم ہو گئی۔ اس لیے للکار کر کہا کہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (111:1)۔ وہ دیکھو! جماعتِ مخالفین کا سب سے بڑا نمائندہ' قریش کی معاشرتی اور اقتصادی خرابیوں کا سب سے بڑا ذمہ دار' کعبہ کا متولی' ان کے غلط نظام کا سب سے بڑا حامی' ابولہب' اس نظام خداوندی کے مقابلے سے عاجز آ گیا اور بری طرح تباہ ہو گیا۔ یہ تباہی کسی فرد کی تباہی نہیں تھی۔ یہ درحقیقت اس نظامِ معاشرت و تمدن کی شکست ہے جس کا یہ نمائندہ ہے اور اس طرح مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ❶ (111:2)۔ اس نے بڑا مال جمع کر رکھا تھا۔ اس کے بھروسے پہ وہ یہ کچھ کرتا تھا۔ اس نے بہت کچھ کمائی کر رکھی تھی۔ یہ اور قسم کی کمائیاں بھی اس لفظ کسب کے اندر شامل ہیں۔ جب یہ تباہی کا وقت آیا تو ان میں سے کوئی چیز بھی اس کو نہیں بچا سکی۔

عزیزانِ من! جتنے بھی انقلاب آتے ہیں' آپ دیکھیے گا کہ ان کے ہاں کی یہ مال و دولت یہ منصب و جاہ کبھی کسی کو اس ریلے سے نہیں بچا سکتے۔ غلط نظام' دولت کے سہارے کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے (69:27-28,92; 11:96;7)۔ اسی طرح ابولہب کو بھی یہ چیزیں نہ بچا سکیں۔ تم دیکھو کہ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ❷ (111:3)۔ وہ خود ابولہب تھا۔ دیکھو کہ یہ ابھی کس قدر شعلہ خیز آگ کی نظر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ اکیلا ہی یہ سب کچھ نہیں کیا کرتا تھا۔ قرآن نے اس کے ساتھ اس کی بیوی کے متعلق بھی کہا ہے کہ وَامْرَاَتُهٗ (111:4)۔ یہ جو اس کی برابر کی ساتھی اس کی بیوی ❸ تھی' وہ بھی اس کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتی

---

❶ اس کا وہ مال و دولت' اور ساز و یراق' جس کے بل بوتے پر وہ اتنی سخت مخالفت کرتا تھا' اس کے کسی کام نہ آیا۔

❷ وہ کس طرح جہنم کی اس آگ میں جا گرتا ہے جس کے شعلے بڑے تباہ کن ہیں۔

❸ اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی (جو اس کی سازشوں میں برابر کی شریک تھی۔ (1-2-3 مفہوم القرآن۔ پرویز)

تھی یعنی وہ بھی اس کی سازشوں میں اس کی برابر کی شریک تھی اور **حَمَّالَةَ الْحَطَبِ** [1] (111:4)۔اس کا عام ترجمہ تو یہ ہے: ایندھن کو اپنی کمر کے اوپر لاد کر لانے والی۔

انسان بیوی بچوں کی خاطر کیا کچھ کرتا ہے

قرآن کریم نے جہاں زن و فرزند کو بیوی بچوں کو وجہ زینت قرار دیا ہے، وہیں یہ چیز بھی کہی ہے کہ یاد رکھو! یہ تمہاری زندگی میں سب سے بڑا فتنہ بھی ہو سکتے ہیں۔قرآن کریم نے انہیں **عَدُوًّا لَّكُمْ** (64:14) بھی کہا ہے اور یہ تو ہم میں سے کس کا تجربہ نہیں کہ اپنی ذات تک تو انسان ہزار قسم کی Temptation (حرص و ہوس) کو Resist (مزاحمت) کر لیتا ہے لیکن جب یہ بیوی بچے آتے ہیں تو انسان ان کی خاطر کتنی بڑی خرابیاں کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ پھسلنے کی گھاٹی ہے، جہاں بڑے بڑے اولوالعزم بھی آ کر پھسل جاتے ہیں۔اس میں اولاد بیوی بچوں کو برابر کا شریک کیا ہے۔اب یہ ایندھن اٹھا کر لانے والی کیا چیز ہے؟ یہ پہلے بھی آ چکی ہے لیکن ان آخری سورتوں میں مجھے اسے دہرانا ہوگا جیسے قرآن پہلی تمام چیزوں کو دہرائے چلا جا رہا ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یہ بتایا تھا کہ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے اپنی ایک نظم لکھی ہے۔ [2] یہ بڑی عجیب چیز ہے۔

علامہ اقبال کی نظر میں جہنم کا تصور

عزیزانِ من! قرآن کے جہنم کا صحیح تصور [3] علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے دیا ہے۔اس نظم میں انہوں نے کہا ہے کہ میں آسمان پہ گیا۔ وہاں میں نے سب کچھ دیکھا۔ جنت کی بھی سیر کی۔ واپسی پہ خیال آیا کہ وہ ایک جہنم بھی ہوتا ہے، اسے بھی ذرا جھانکتا چلوں۔وہ جو گائیڈ یعنی راہنما تھا، اس سے کہا کہ بھئی! مجھے ذرا جہنم بھی دکھا دو۔وہ لے گیا۔وہاں جا کر دیکھا کہ ایک بہت بڑا گڑھا ہے اور وہ اتنا ٹھنڈا ہے کہ ٹھٹھر رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم نے تو سنا تھا کہ اس میں آگ بھڑکتی ہے۔اور اس کے برعکس یہ اتنا ٹھنڈا ہے تو وہ آگ کونسی ہے۔اس پر اس نے کہا کہ اس میں آگ نہیں ہوتی، ہر آنے والا اپنا ایندھن خود اپنی پیٹھ پر لاد کر لاتا ہے۔جہنم کی آگ کا ایندھن تو ہم خود اپنی پست پہ لاد [4] کر لیجاتے ہیں۔یہاں کہا ہے کہ **حَمَّالَةَ الْحَطَبِ** (111:4)۔وہ جہنم کے ایندھن کو اپنی پیٹھ پر

---

[1] وہ جگہ جگہ لگائی بجھائی کر کے، اس جہنم کے ایندھن کو اپنی پشت پر لادے لادے پھرتی تھی۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

[2] اس نظم کا نام ہے ''سیر فلک'' اور کتاب کا نام ہے ''بانگ درا''

[3] اس نکتے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ انبیاء، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء ص ص۔292-291۔

[4] نظم ''سیر فلک'' کا وہ شعر یوں ہے: اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں (بانگِ درا)

اٹھا کر پھرنے والی ہے۔ فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ❶ (111:5)۔ یہ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ عربی زبان میں گردن کو خلق بھی کہتے ہیں لیکن جو گردن سرفرازی کی ہو' جو اکڑ کر چلنے والی ہو' جس گردن والے کو اپنے شرف و مجد' عزت اور سرفرازی پر بڑا ناز ہو' اس کی گردن کو ''جید'' کہا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ بڑی شرف و عزت کی حامل گردن یوں اکڑ کر چلنے والی ہے۔ قرآن نے اس کے لیے حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ (111:5) کہا ہے۔ پنجابی اچ جنوں مونج دی رسی کیندے نیں ناں۔ ❷ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں غلامی کی زنجیر کے علاوہ ذلت کا کتنا پہلو ہوتا ہے۔ وہاں وہ کھجور کے پٹھے کی رسی بھی ایسے ہی ہے جیسے مونج کی رسی بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ اتنی بڑی گردن' جو آج کسی کے سامنے جھکتی نہیں' بڑی سرفرازیوں سے اٹھی ہوئی ہے' اس کی کیفیت یہ ہوگی۔ یہ لوگ ذلیل ترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اعلان کر کے بتا دیا کہ لیجیے! وہ معاملہ ختم ہوا۔ ان کی قوت ٹوٹ گئی' ان کو آخری شکست مل گئی۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کشمکش کا جو ظاہری باب اب ہمارے سامنے آتا ہے' اس میں کس حتم و یقین سے کہا جا رہا ہے کہ ان کو اب آخری ہزیمت ہو گئی' اب یہ تمہارے سامنے آ نہیں سکتے۔

اب آ رہی ہیں' برادرانِ عزیز! تین آخری سورتیں جن میں یوں سمجھیے کہ قرآن نے سارا کچھ ان میں انڈیل کر رکھ دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اتنی لمبی کشمکش ہے' اس کے بعد یہ اتنے شاندار نتائج' اتنی بڑی قوتوں کی شکست اور اتنی کمزور بے مایہ سی جماعت کی اتنی بڑی کامیابی ہوئی کس طرح سے؟ اس کی تہ میں راز کیا تھا؟ اس کے اسباب و علل کیا تھے؟ ان کے جواب کے لیے ہماری نگاہیں تو عام اسباب و علل کی طرف جائیں گی۔ اب یورپی مصنفین کو بھی دیکھیے کہ جب وہ اس مقام پہ آتے ہیں تو وہ گناتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پولیٹیکل نقشہ اس قسم کا بنایا' Strategic War (جنگی حکمتِ عملی) اس قسم کی رکھی۔ وہ تمام یہ چیزیں گناتے ہیں جس سے یہ سب کچھ ہوا لیکن قرآن کچھ اور ہی کہتا ہے۔ دراصل وہ ہیں اسباب و علل کی حقیقی بنیاد۔

عزیزانِ من! اب یہاں سورۃ اللھب ختم ہوئی۔ ہم اگلی سورۃ الاخلاص لیتے ہیں۔

---

❶ اس کی وہ سرکش گردن جو کسی کے سامنے نہیں جھکتی تھی' کس طرح ذلت و رسوائیوں کی رسیوں میں جکڑی جاتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ جسے پنجابی زبان میں مونج کی رسی کہا جاتا ہے۔

سورۃ الاخلاص (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ الاخلاص شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 112 ویں سورۃ ہے۔ اس میں اسباب وعلل کی حقیقی بنیاد کا ذکر ہے۔

اسباب وعلل کی حقیقی بنیاد

قرآن یہاں پہنچنے کے بعد نگاہوں کا رُخ ایک اور حقیقت کی طرف پھیر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ان اسباب وعلل کی ضرورت ہے، دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ان میں یہ چیزیں ہونی چاہئیں لیکن یہی چیزیں کافی نہیں ہیں۔ اس کے لیے بنیاد ایک اور ہے۔ اس بنیاد کے اوپر اگر یہ تمام اسباب وعلل اٹھیں گے تو پھر اس قسم کے نتائج پیدا ہوں گے۔ اگر وہ بنیاد باطل ہے، کمزور ہے تو یہ اسباب وعلل وقتی طور پہ تو کچھ کامیابیاں دے سکتے ہیں لیکن وہ اس قسم کا نقشہ مرتب نہیں کر سکتے جیسا نقشہ یہ نظام اب مرتب کرے گا۔ وہ بنیاد کون سی ہے؟ عزیزانِ من! جب میں وہ بنیاد ''ایمان'' کہوں گا تو ذہن میں یہ بات جلدی سے آئے گی لیکن حقیقت وہی ہے۔ یہ ساری چیز، یہ سارا نقطہ ماسکہ، یہ بنیادِ اول، یہ علت العلل، یہ خدا پر ایمان، اس حقیقت کے غماز ہیں لیکن پھر بھی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہم میں سے وہ کون ہے جس کا خدا پر ایمان نہیں ہے؟ خدا پر تو سب ایمان رکھتے ہیں، یہ اہل یورپ (European) بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ دنیا میں چند دہریوں کو چھوڑ کر ساری دنیا خدا پر ایمان رکھتی ہے، تو پھر یہ بات کیا ہوئی؟

اصل چیز خدا پر ایمان نہیں بلکہ خدا کا صحیح تصور ہے

خدا پر ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو پھر اسلام سمجھ میں آ جاتا ہے اور اسی سے مذہب کا تصور بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اور وہیں سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کس طرح سے الگ الگ ہو گئے۔ اصل چیز خدا پر ایمان نہیں ہے، اصل چیز خدا کا صحیح تصور ہے۔ اس کے متعلق جو Concept (تصور) ہے، وہ ہے کیا؟ وہ کس قسم کا خدا ہے جسے ہم مانتے ہیں؟ اور اگر کوئی پوچھے کہ عزیزانِ من! قرآن کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ کیا ہے؟ کہا جائے گا کہ اس نے خدا کا صحیح تصور دیا ہے۔ مذہب میں جس طرح خدا کا نام ہوتا

ہے۔اس کا سارا تصور (Concept) بدل دیا جاتا ہے۔قرآن اتنا ہی نہیں کہتا کہ خدا کو مانو' وہ ان سب ایمان والوں سے جو خدا کو ماننے والے ہیں' حتیٰ کہ جو اہلِ کتاب ہیں' جو کتابوں کو بھی مانتے تھے' جو رسولوں کو بھی مانتے تھے' ان کے متعلق بھی یہ کہتا ہے کہ **فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا** (2:137) اگر یہ خدا پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو' تو پھر ان کو ایمان والا کہا جائے گا' تو پھر یہ راہِ ہدایت پر ہوں گے یعنی محض کسی کا یہ کہہ دینا کہ میں خدا کو مانتا ہوں' کوئی بات ہی نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ تم کس قسم کے خدا کو مانتے ہو؟

مذہب کے ہاں خدا کا تصور

ایک خدا مذہب کے تصور والا ہے جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے' نہ کوئی قانون ہے' نہ کوئی آئین ہے' اور نہ کوئی دستور ہے۔اللہ بے پرواہ ہے بلکہ لا پرواہ ہے' جو جی چاہے کرداائے' جو جی آوے کینداائے' ہن کچھ کینداائے' کدی کچھ کر دیندا ہیگا۔ [1] یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں (معاذ اللہ) کہ اسے خاصا ایک مہاراج رنجیت سنگھ (1839-1780) بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔''اسے پھانسی دے دو' اسے گاؤں بخش دو' یہ وہی ہے جو سعدی (1291-1184) نے کہا ہوا ہے کہ مزاج شاہاں [2] ہے۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی گالی دیدے تو ان کو خلعت بخش دیدیتے ہیں' کبھی کوئی سلام کر دے تو اسے پھانسی پہ چڑھا دیتے ہیں۔

مزاج شاہاں جو ہوا صاحب! بادشاہ کا یہ تصور جو ہوا۔کہنے کو تو مذہب میں یہ کہا گیا تھا کہ **السلطان ظل اللہ علی الارض** بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں انہوں نے خدا کو اس زمین کے بادشاہ کا سایہ بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔جس قسم کا ان کے ہاں بادشاہ ہوتا ہے انہوں نے اس قسم کا بلکہ ذرا Magnify (اصل سے بڑھا) کر کے خدا بنا دیا۔ہندوؤں کے ہاں راون کے دس سر بنایا کرتے ہیں۔ان سے کہا کہ صاحب! یہ کس طرح؟ انہوں نے کہا کہ جب اس کا قد نوے فٹ کا تھا تو سر بھی تو کم از کم دس ہونے چاہئیں۔کالی دیوی کے چار ہاتھ ہوتے ہیں کہ صاحب! اس نے تو قتل عام کرنا ہے' ایک ہاتھ سے قتلِ عام ہو نہیں سکتا' اس لیے اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں۔انسانی ذہن میں اس دنیا کے اندر یہ چیز ہے کہ انسان نے جس قسم کے انسان دیکھے' جب اس قسم کا خدا بنانا چاہا تو اس کو ان سے ذرا بڑا بنا کے دکھا دیا۔مذہب کرتا ہے یہ ہے۔

---

[1] جو جی چاہے کرتا ہے' جو جی میں آئے کہتا ہے' اب کچھ کہتا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد کچھ اور کر دیتا ہے۔

[2] نازک مزاجِ شاہاں' تابِ سخن ندارد

تخت پہ بیٹھا ہوا خدا' وسیلوں' شفارشوں اور نذر و نیاز قبول کرنے والا خدا ہے

مذہب کے سامنے انسان ہوتا ہے۔ اِس میں انسان کو Magnify (اصل سے بڑا) کرتے ہیں یعنی اسے بہت بڑا سا بنا دیتے ہیں' اب یوں ہے کہ گویا وہ تختِ حکومت پہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہاں بھی بادشاہ تخت پہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد امیر' وزیر' مشیر' سارے کے سارے' بیٹھے ہوئے ہیں۔ باہر دور تک دربان ہیں۔ کوئی اس تک براہِ راست پہنچ نہیں سکتا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے وسیلے ڈھونڈ نے پڑتے ہیں پھر یہ جو اس کے قریبی ہوتے ہیں جن کو وہ مقربین کہتے ہیں ان کی سفارشیں ڈلوانی پڑتی ہیں' یہ ان کی عرضیاں جا کر پیش کرتے ہیں۔ انہیں نذرانہ دینا پڑتا ہے' اس کے حضور میں قصیدے گزارنے پڑتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بعینہٖ وہی نقشہ ہے جو کہ ایک مستبد شہنشاہیت کا تھا۔ یہ تصور تھا جو خدا کا دے دیا گیا۔ اس تصور کے ماتحت انسان کی کیفیت وہی ہے جیسے ایک Dictator (مستبد) کے سامنے رعایا کی ہوتی ہے۔ ہر وقت ڈرتے' کانپتے' ہانپتے ہیں۔ جو بات ہو اس کے لیے پہلے یہ دیکھیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں

اگر شہ روز را گوید شب است ایں

بباید گفت اینک ماہ و پرویں

سعدی (1291-1184) کہتا ہے کہ اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو کہیے سرکار! دیکھیے' چاند نکلا ہوا ہے' ستارے چمک رہے ہیں سبحان اللہ۔ یہ ہے وہ خدا جس کو ماننے سے اہلِ مذہب طبقہ لوگوں کو خدا پرست کہتا ہے۔ کتنی دور چلا گیا انسان! اور اس خدا کے ماننے میں کتنا ذلیل ترین مقام خود انسان کا رہ گیا!!

دین میں خدا کا تصور اور افراد سے لے کر اقوام تک کی موت و حیات کے پیمانے

ایک دین کا خدا ہے کہ جس کی عظمتوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتا یہ ہے کہ ہماری بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کے اظہار کے لیے ہم نے کچھ قوانین مرتب کر دیئے ہیں' یہ ساری کائنات ان قوانین کے تابع چلتی ہے اور قادرِ مطلق ہونے کے باوجود' ہم نے اپنے آپ پر اتنی پابندی عائد کر لی ہے کہ اب ہم بھی ان قوانین کے خلاف کبھی نہیں کرتے۔ اس کے مقابلے میں انسان ہے۔ اُسے کہا ہے کہ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (18:29) تم میں سے جس کا جی چاہے ان قوانین کو اختیار کرے' جس کا جی چاہے اس کی خلاف ورزی کرے۔ اسے اِن کی خلاف ورزی کرنے کا بھی اختیار دیا ہوا ہے۔ اور اپنے اوپر اتنی بڑی پابندی عائد کی ہوئی ہے کہ ہم اس کے خلاف نہیں کریں گے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ خدا کیا ہے۔ اس معاشرے کے اندر اس قدر امن ہوتا ہے' جہاں ہر فرد کو یہ معلوم ہو کہ یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوگی' نہ کسی کی شفارش چلے گی' نہ یہاں رشوت چلے گی' نہ نذرانے ہوں گے' نہ کفایت سے اس کا دل موہ سکیں گے۔ ان کا تو

سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو یہ ہے کہ ہر شے قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی چلی جائے۔ خدا کا یہ تصور ہے۔ پھر افراد ہی کی نہیں' اقوام کا عروج وزوال اور موت وزندگی بھی انہی قوانین کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو قوم ان کے مطابق یہ کچھ کرے گی' سر بلندیاں حاصل کرے گی' جو اس کی خلاف ورزی کرے گی اس کو زوال آ جائے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت' کسی ایسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی' جو ان قوانین کی خلاف ورزی کرے۔ یہ ہے خدا کا تصور اور آگے بڑھیے تو خدا اور انسان کا تعلق آتا ہے۔ انسان بھی حیوانات کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی جسمانی زندگی دیکھیے تو وہ بالکل حیوانات کی طرح ہے: اسی قسم کی مشینری ہے' وہی طبعی قوانین ہیں' انہی کے مطابق یہ چلتا ہے۔ مگر ایک فرق ہے۔

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ انسان کو اس کی ایک Personality یعنی ذات دی گئی ہے۔ حیوانات میں یہ چیز نہیں ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے یہ صاحبِ اختیار و ارادہ بنتا ہے۔ یہی چیز شرفِ انسانیت ہے۔ اب انسانی ذات کی کچھ بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ انہیں قرآن نے کس طرح بیان کیا ہے؟ سنیے! یہ کہا کہ خدا کی بھی ایک ذات ہے۔ ہم اسے ذاتِ خداوندی کہتے ہیں یعنی خدا کی ذات۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ ذات یا Personality کے کچھ Basic Characteristics یا بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ذات جہاں بھی ہوگی اس کی وہی خصوصیات ہوں گی۔ خدا کی ذات کے متعلق صرف یہ ہے کہ وہ مکمل ترین ذات ہے' اس لیے اس میں وہ خصوصیات اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہیں' انسان کو جو ذات دی گئی ہے تو حدودِ بشریت کے اندر وہ خصوصیات خود انسان کے اندر موجود ہیں۔

صفاتِ خداوندی اور ذاتِ انسانی کا باہمی ربط اور حدود

یہ انسان اس کائنات میں ایک چھوٹے سے Miniature Form (سمٹی ہوئی شکل) میں' چھوٹے سے پیمانے پر' خدائی صفات کا حامل ہے۔ قرآن میں جن چیزوں کو صفاتِ خداوندی کہا گیا ہے وہ ذات کی صفات ہیں۔ وہ صفات خدا کے اندر Perfection (تکمیل) تک پہنچی ہوئی ہیں مگر انسان کے اندر حدِ بشریت تک محدود ہیں لیکن ہیں وہی خصوصیات۔ قرآنِ کریم نے سورۃ اخلاص میں خدا کی ذات کی بنیادی تین یا چار خصوصیات گنائی ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ایک تو خدا کا تصور صحیح آ جائے اور دوسرا یہ کہ انسان کو خود معلوم ہو جائے کہ میری ذات اس وقت نشوونما یافتہ سمجھی جائے گی جب میرے اندر بھی یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی۔ پہلی خصوصیت کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (112:1)۔

''واحد'' اور ''احد'' میں بنیادی فرق ہے

ہمارے ہاں تو اس **هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** کا ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ ''کہہ دے اللہ ایک ہے''۔ بات ایک سے نہیں ہوتی۔ عربی زبان میں واحد کے لیے بھی ''ایک'' آتا ہے۔ مگر یہاں یہ لفظ ''احد'' ہے۔ اس ''واحد اور احد'' میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سینکڑوں انسانوں میں سے ایک انسان آپ کے سامنے آئے تو وہ واحد ہو جاتا ہے: ایک انسان آیا ہے۔ ان دس آدمیوں میں سے ہمارے سامنے ایک آیا لیکن ''احدیت'' کے معنی ایک ہونا ہی نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہے جسے ہم انگریزی زبان میں Unique کہتے ہیں' اسے عام طور پر ہمارے ہاں ''یگانہ'' کہتے ہیں۔

خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے' Unique ہے

Unique وہ ہوتا ہے ''جو اپنے اندر وہ کچھ ہو کہ کوئی دوسرا ویسا نہ ہو۔'' اس کے اندر اس کی انفرادیت ہوتی ہے' اس کے اندر Individuality ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ وہ Unique ہے' یگانہ ہے' اس میں انفرادیت کی بات یوں سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہر انسان میں جسے وہ اپنے آپ کو ''میں'' کہتا ہے' اس کی وہ ''میں'' یگانہ ہوتی ہے: میرے احساسات' میرے اندر کی کیفیات کسی دوسرے کی نہیں ہوتیں' کوئی دوسرا ان کو بانٹ نہیں سکتا' کوئی اِن میں شامل نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میرا درد میرا درد ہوتا ہے' کوئی دوسرا اس کو محسوس نہیں کر سکتا' ہمدردی تو اس سے کر سکتا ہے' میرے تاثرات میرے ہوتے ہیں۔ اسے انفرادیت کہا جاتا ہے' Individuality کہا جاتا ہے اور یہی Individuality ہے کہ جس پہ یہ سارا قانونِ مکافاتِ عمل چلتا ہے: میرے ہر عمل کا نتیجہ مجھے بھگتنا ہوگا' کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اسے کہتے ہیں Unique ہونا' Individual ہونا' انفرادیت لیے ہوئے ہونا۔ فلاں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے' Unique ہے' کوئی اس جیسا نہیں ہے۔ یہ تو افراد کی انفرادیت ہے۔

صفاتِ خداوندی کی حامل قوم بھی دنیا میں Unique ہوتی ہے' احد ہوتی ہے

جب کوئی قوم خدا کی اس صفت کو اپنے اندر منعکس کر لے تو وہ خود دنیا کے اندر ایک Unique قوم ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت ہے برادرانِ عزیز! کہ جس طرح سے ایک مردِ مومن انسانوں کے اندر Unique ہوتا ہے' اسی طرح سے مومنوں پر مشتمل جو جماعت ہوتی ہے وہ اقوام کے اندر Unique ہوتی ہے۔ تاریخ میں بڑی بڑی بلند تہذیبیں بھی آپ کو نظر آئیں گی' بڑی بڑی سلطنتیں بھی آپ کو نظر آئیں گی لیکن ہم سے نہیں غیر مسلموں سے پوچھو کہ نبی اکرم ﷺ اور حضورؐ کے رفقا رضی اللہ عنہم کی جو جماعت پیدا ہوئی تھی' غیر مسلم Historian (مورخین) بھی جب وہاں آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس جماعت کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** (112:1) ماننے والی جماعت کی خصوصیت ہے کہ اس جیسی جماعت من حیث کل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ❶ (112:1)۔

ذات کی دوسری بنیادی خصوصیت: صمدیت

سورۃ الاخلاص کی دوسری آیت ہے: اَللّٰهُ الصَّمَدُ (112:2)۔ذات کی دوسری بنیادی خصوصیت اس کی ''صمدیت'' ہے۔یہ ہے وہ ''صمد'' جس کا ترجمہ ''وہ بے پرواہ ہے'' کیا جاتا ہے' وہ ''بے نیاز'' ہے کیا جاتا ہے۔''صمدیت'' ایک ایسی محکم چٹان کو کہتے ہیں'' جو اپنی حفاظت کے لیے کسی کی محتاج نہ ہو لیکن جب چاروں طرف سے سیلاب آ جائے تو ہر شخص اس کے اوپر جا کر محفوظ ہو جائے۔'' یہ ہے صمدیت جو خود اپنی حفاظت کے لیے کسی کی محتاج نہ ہو' اپنے پاؤں پر جم کر کھڑی ہوئی' حوادث زمانہ کی متلاطم لہریں آئیں' سر ٹکرا کر' پاش پاش ہو کر' واپس چلی جائیں' اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور جب کسی کو کہیں پناہ نہ مل سکے تو یہ اس کو پناہ دے۔یہ ہے صمدیت' عزیزانِ من! جب کسی فرد کے اندر خدا کی یہ صفت منعکس ہو' سوچیے تو اس کے اندر کتنی بڑی حریت اور آزادی آ جائے گی: اپنے لیے کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر محتاج کے لیے یہ آسرا بن جائے' اور جب دنیا میں اس قسم کی کوئی قوم وجود میں آ جائے تو پھر حوادثِ زمانہ کے تلاطم میں ڈوبنے والے انسانوں کے لیے یہ چٹان جو کچھ کرے گی اُسے آپ سمجھ سکتے ہیں۔یہ ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ ❷ (112:2)۔

ذاتِ انسانی تولید کی پیداوار نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اس ذاتِ خداوندی کی اگلی کیفیت یہ ہے کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (112:3)۔بڑی بنیادی حقیقت اس کے اندر بیان کی گئی ہے۔حیوانات تک افزائشِ نسل کا سلسلہ تولید کے ذریعے ہوتا ہے۔یہ محض Biological Recreation (حیاتیاتی تولید) ہے' جیسے بیٹا پیدا ہوتا' جیسے جانور کے بچہ پیدا ہوتا ہے۔اسے تولید کہتے ہیں۔Recreation (تولید) تو Life (زندگی) کی Basic Instinct (بنیادی جبلت) میں سے ہے۔زندگی جہاں بھی ہے' وہ اپنے جیسا پیدا کرنا چاہتی ہے۔اسی سے اس کائنات کا

---

❶ (اس سلسلہ میں' خود اپنے لوگوں پر بھی اس بنیادی حقیقت کو واضح کر دینا چاہیے کہ تمہاری ہر فتح اور کامرانی' محض فوجی طاقت کے بل بوتے پر نہیں۔یہ کامیابی دراصل اس تعلیم کا نتیجہ ہے جسے تم علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کرتے اور دلائل و براہین کی رو سے منواتے ہو۔اس تعلیم میں بنیادی نکتہ خدا کے تصور کا ہے۔خدا کے جس تصور کو تم پیش کرتے ہو' ہو نہیں سکتا کہ انسان اس پر عقل و فکر سے غور کرے' اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔وہ تصور یہ ہے کہ خدا واحد' اپنی ذات اور صفات میں یگانہ (Unique) ہے۔اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ساری کائنات میں اسی ایک کا قانون کارفرما ہے اور اسی ایک کے قانون کے تابع تمام انسانوں کو بھی رہنا چاہیے۔اس طرح ان میں بھی وحدت پیدا ہو جائے گی۔(وحدتِ خالق کے تصور کا لازمی نتیجہ وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت ہے)

❷ وہ (خدا) خود مکتفی ہے اور باقی سب اپنی زندگی' بقا' نشو و نما اور تکمیل کے لیے اس کے محتاج ہیں۔وہ ایک بلند و بالا مستحکم چٹان کی طرح ہے جو خود ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہوتی ہے اور سیلاب سے بچنے کے لیے ہر ایک اُس کی طرف پناہ کے لیے جاتا ہے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔پرویز)

یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔انسانی زندگی کے اندر بھی نسلِ انسانی کی پیدائش تولید کے سلسلے سے ہوتی ہے۔باپ کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں انسان اور حیوان مشترک ہیں۔اس میں کوئی چیز بھی وجہ شرفِ انسانیت نہیں ہے۔خدا کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ نہ تو اس سلسلہ تولید کی تخلیق ہے، نہ اس کے بعد اس کو سلسلہ تولید سے تعلق ہوتا ہے۔انسانی ذات اس طرح سے نہیں پیدا ہوئی جیسے انسانی جسم پیدا ہوا ہے۔ انسانی جسم سلسلہ تولید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ذات یا Personailty تولید کے ساتھ نہیں پیدا ہوتی۔اگر یہ آتی تو ہر حیوان کے اندر ہوتی۔یہ خالص انسانی جذبہ ہے۔

تولید میں یہ چیز آتی ہیں اسی لیے خدا نے اس تولید کے سلسلے کو جسمِ انسانی کے لانے کے بعد کہا کہ فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا (21:91) ہم نے اپنی توانائی کا ایک شمہ انسان کو دے دیا۔

انسانی ذات جسم کا حصہ نہیں بلکہ خدا کی توانائی کا ایک شمہ ہے

ہم نے اپنی توانائی کا ایک شمہ انسان کو دے دیا۔یہ تولید کے ذریعے نہیں ہو سکتا تھا۔یہ ذات تولید کے سلسلے سے بے نیاز ہو گئی۔خدا نے اپنے آپ کو خالق کہا ہے۔جو تخلیق ہے وہ Creation ہے، تولید Recreation ہے۔Recreation (تولید) ہر حیوان کر سکتا ہے۔تخلیق کوئی حیوان نہیں کر سکتا۔یہ خالصتاً انسان کے لیے ہے: اوپر خدا کے لیے اور نیچے انسان کے لیے، اسی لیے خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے کہ خالق تم بھی ہو، تمہیں ہونا چاہیے، ہماری تخلیق حسین ترین ہوتی ہے، تمہاری ذرا نیچے کے درجہ کی ہوتی ہے۔انسان اور حیوان میں عزیزانِ من! یہاں فرق شروع ہوا کہ اگر یہ بھی اپنی زندگی کا مقصد تولید ہی رکھتا ہے، بچے پیدا کیے، ان کی پرورش کی، یہ خالص حیوانی چیز ہے۔یہ اگر تخلیق نہیں کرتا تو انسان کے درجہ پر نہیں پہنچتا۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

اس کائنات کا حسن سنورتا ہی Creation (تخلیق) سے ہے۔یہ Creative (تخلیقی) یا Creative art (تخلیقی فن) ہے۔یہ انسانیت کا شرف ہے۔اس لیے کہا کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ [1] (112:3)۔یہ ٹھیک ہے کہ حیوانی تولید کا سلسلہ افزائشِ نسلِ انسانی کے لیے ضروری ہے مگر یہ وجہ شرفِ انسانیت نہیں ہے۔

---

[1] اس نے تمام ذی حیات عملِ تخلیق (Creation) سے پیدا کیا، نہ کہ تولید (Recreation) کے ذریعے (عمل تولید میں پیدا کرنے والے کا ایک حصہ مولود میں آ جاتا ہے، اور اس طرح والد یعنی پیدا کرنے والا خود ناقص رہ جاتا ہے۔تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا) نہ اس نے اس طرح کسی کو پیدا کیا ہے، نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

شرفِ انسانیت تخلیق کے اندر ہے

شرفِ انسانیت یہ ہے کہ تم نے کیا Create (تخلیق) کیا ہے؟ سوچیے تو سہی' جو قوم تقلید کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی چلی آرہی ہو' اس میں تخلیق کا تصور ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ تخلیق تو نئی چیز پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ جس قوم میں Innovation (نئی نئی چیزوں کی اختراع) حرام قرار دی جائے' جس قوم میں ہر خطبہ کے اندر اعلان کیا جائے کہ **کل بدعة ضلالة** ہر نئی چیز گمراہی ہے' اس میں تخلیق کیسے آسکتی ہے؟ تقلید حیوانات میں ہوتی ہے۔ جس قسم کی بکری پہلے دن تھی' آج بھی اس قسم کی بکری پیدا ہورہی ہے۔ ہر بکری اپنی ماں یا باپ کی طرح ہوتی ہے' مقلد ہوتی ہے' وہ گھاس کھاتی' یہ بھی گھاس کھاتی' وہ میں میں کرتی ہے' یہ بھی وہی کرتی ہے لیکن جہاں تخلیق ہوتی ہے وہاں تو ہر آن اس سے ایک کارِ نادر وجود میں آتا ہے اور یہی وجہ ہے جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ:

گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبالؒ کا اندازِ بیاں

تو زندگی کے اندر کوئی تخلیقی کارنامہ کر جا۔ اللہ کی ''شریعت'' بقول ان کے' اگر اس کو گناہ بھی کہتی ہے تو مت گھبرا۔ یہ تخلیقی کارنامہ ثواب ہے اور اس کے بعد کہا کہ **لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ** (112:3) ہمارے ساتھ خدا کا تعلق تولیدی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے جتنے تعلقات ہیں وہ سارے تولید کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے اونچے ہو جاؤ۔ اپنے بچے کو تو بکری بھی پالتی ہے۔ اگر تم بھی اس دائرے میں گھرے رہے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو خدا کی صفت تم میں نہیں آئی۔ یہ حیوانی صفت ہے' ہمارے سارے تعلقات تولید (Recreation) کے ہوتے ہیں۔ ہم اس سے آگے جاتے ہی نہیں اور آگے بڑھے تو قرآنِ کریم نے انسانیت کے اندر Race (نسل) کے تصور کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ نسل کا تصور خالص تولید (Recreation) پر ہوتا ہے۔ ایک نسل کا یعنی ایک Race کا ہونا تولید ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے اونچے ہو جاؤ' دنیا کی جو قومیں Race (نسل) قبیلے اور خاندان کی بنیاد پہ بنتی تھیں وہ عمل تولید تھا اور اس نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ ایمان کی بنیادوں کے اوپر ایک نئی قوم بناؤ۔ یہ تخلیقی چیز ہے' Ideology (ایمان) کے Basics (بنیاد) پر قوم بناؤ' اس لیے کہ تمہارے ساتھ خدا کا تعلق تولید سے نہیں ہے' تم اس کے جنے ہوئے بیٹے نہیں ہو لیکن اس کے باوجود ربوبیتِ عالمینی اس نے اپنے لیے رکھی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے تم بھی ربوبیت کو یونہی لو۔

عالمی نظامِ ربوبیت کا تصور تولید نہیں تخلیق ہے

اپنے بیٹے کو پالنا تو ہر حیوان کر لیتا ہے دنیا کے بیٹوں کو اپنے جیسا سمجھو اور ان کو پالو۔ یہ ہے خدا کی ''صفتِ تخلیق''۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (112:3)۔ بس مختصراً یہ سمجھو، پھر اس نے کہا کہ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ (112:4) اس کا ہمسر، مثیل اور نظیر کوئی نہیں۔ اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے کسی شے میں کسی کی نظیر یا مثیل ہونے کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (42:11) اگر تم کوئی بھی تصور کرو تو یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ خدا کی کسی صفت کا پرتو تو ہو سکتا ہے لیکن خدا اس سے بڑا اونچا ہوگا۔ وہ اس کی نظیر نہیں ہوگی، مثیل نہیں ہوگا۔ وہ تو ساری کائنات میں ایسا ہے اس کے ماننے والے عبدِ مومن کے اندر بھی یہ خصوصیات ہونی چاہئیں مگر اس میں وہ خصوصیت ہے جو کسی دوسرے میں اس نظیر و مثیل کی نہیں آتیں، پھر ان خصوصیات کے حامل جن افراد پر قوم مشتمل ہو، اس قوم کی کیفیت یہ ہو کہ وہ بے مثال، بے نظیر ہے۔ دنیا کے اندر وہ قوم ہونی چاہیے۔ قرآن کریم نے کہا کہ ان سے کہو کہ یہ ہے وہ خدا جس کے تصور نے ہمیں یہ سارا کچھ عطا کر دیا جس کو تم آج دیکھ رہے ہو۔

ایمان، عزیزانِ من! یونہی چار کلمے دہرا دینے کا نام نہیں ہے۔ ایمان نام ہے قانون کی محکمیت پر Conviction (یقین)۔ جب کسی Scientist (سائنسدان) کو یہ Conviction (یقین) حاصل ہو جائے کہ یہ قانون ایسا کرے گا تو پھر اس کے لیے وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتا ہے، تجربے کرتے کرتے کسی مقام پہ رکتا نہیں ہے، جب تک کہ وہ اس کو کامیابی تک نہیں پہنچا دیتا۔ پہنچا تا اس صورت میں ہے کہ جب اسے یقین ہو اور اگر اسے یہ یقین ہی نہ ہو تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے کہ نہیں صاحب! اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ جب قانون پہ یقین ہوتا ہے تو ناکامی کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ میری کسی تدبیر میں خامی رہ گئی جو نتیجہ پیدا نہیں ہوا، ورنہ قانون نے نتیجہ پیدا کر دینا تھا۔ اسے کہتے ہیں ایمان۔ اس قسم کے خدا پر ایمان نے کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہماری ان کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز یہ ہے کہ ہم اس قسم کے خدا پر ایمان لائے ہوئے ہیں جو ''احدیت'' کا خدا ہے، ''صمدیت'' کا خدا ہے، اور ''تولید سے بلند و بالا رب العالمین'' ہے، وہ بے مثل و بے نظیر خدا ہے۔

صفاتِ خداوندی کی حامل قوم ہی قوموں کی امامت کے قابل ہوگی

اس کے ماننے والی قوم کے اندر اس قسم کی خصوصیات کا پرتو ہونا چاہیے۔ تم جو نہیں ایسا دیکھ رہے ہو تو اس لیے دیکھ رہے ہو کہ ہم اس آئینے کے عکس میں ہیں۔ جو بھی یہ بات اپنے اندر پیدا کرے گا اس کی یہی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ کہا کہ کہیں خالص مادی اسباب کے اوپر نہ رہ جانا۔ سارے مادی اسباب تو لیبارٹری میں موجود ہوتے ہیں، اگر Scientist (سائنسدان) کے پاس Law (قانون) نہیں ہوتا ہے تو مادی اسباب کچھ نہیں کیا کرتے۔ کہا کہ یہ یقین کامل ہے جس کی وجہ سے ہمیں یہ سارا کچھ حاصل ہوا ہے۔ اب یہاں پہنچنے کے

بعدامتِ مسلمہ باقی اقوامِ عالم سے منفرد ہوگئی کہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی بنیاد اس ایمانِ خداوندی کے اوپر ہے اور خدا پر ایمان بھی مذاہب کی دنیا سے منفرد ہوگیا۔ وہاں مذاہب میں خدا کا تصور کچھ اور ہوتا ہے' یہاں دینِ اسلام میں خدا کا تصور کچھ اور دیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! فتح ونصرت آ گئی' نظام متشکل ہوگیا' مخالفتوں اور عداتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اب بنیاد بتادی کہ تمہارے ہاں کی وہ بنیاد کونسی تھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد ایک اور مرحلہ آ گے آیا کرتا ہے۔ جس دن ڈاکٹر صاحب یہ بتا دیتے ہیں کہ لو بھئی' اب تمہاری بیماری بالکل چلی گئی تمہیں بالکل شفا ہوگئی' اس کے بعد کچھ اور بھی ساتھ کہا کرتے ہیں۔ کہا یہ کرتے ہیں کہ یاد رکھو! آئندہ تم نے یہ یہ چیزیں نہیں کھانی' تم نے یہ یہ کچھ نہیں کرنا۔ یہ ہوتی ہے آخری چیز۔

آخر میں حفاظتی تدابیر کی تاکید

عزیزانِ من! اب یہ دو آخری سورتیں آ گئیں کہ اب بیمار اس بیمارخانہ سے شفا پانے کے بعد جا رہا ہے اور اسے آخری وقت میں طبیب کہہ رہا ہے کہ سنو! یہ سب کچھ تمہیں حاصل ہوگیا۔ اب اس کے بعد تم نے کچھ Precautionery Measures (اقداماتِ حفظ ماتقدم) لینے ہیں' حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہیں تاکہ یہ نظام ٹوٹ نہ جائے' یہ مستحکم رہے' آگے بڑھے۔ آپ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! کہ پروگرام میں اس آخری کڑی کا پروگرام اس قدر تکمیل پہ پہنچا دیتا ہے۔ بات یہاں تک ختم ہوگئی تھی' کامیابی حاصل ہو چکی تھی' نظام متشکل ہوگیا تھا' اس کی بنیاد بتادی گئی تھی لیکن ضرورت سمجھی گئی کہ نہیں' ان چیزوں سے محتاط رہنا بھی بتایا جائے اور پیغام کے مکمل ہونے کی دلیل ہی یہ ہوسکتی ہے کہ وہ وقتی شفا نہ دے' آئندہ کے لیے احتیاطی تدابیر بھی بتائے۔

عزیزانِ من! اب وقت ختم ہوا۔ یہ آخری دو سورتیں ہم آئندہ لیں گے۔

سورة الفلق (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَعُوْذُ کا مفہوم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (113:1)۔عزیزان من! اعوذ بڑا عجیب لفظ ہے۔مرغی کے نئے بچے اس کے ساتھ چپکے پھرتے ہیں۔جونہی کہیں کسی چیل کا سایہ زمین پر پڑے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بھاگ کر کس طرح مرغی کے نیچے آجاتے ہیں۔ہر جانور کا نوازئیدہ بچہ' اگر کہیں خطرے کی آواز سنے تو بھاگ کر ماں کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔اُدھر سے ماں بھی دوڑ کر اس کو اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔اس طرح سے نوزائیدہ بچے کا خطرے کے وقت' اپنی ماں کی آغوش میں سمٹ کے آجانا' عَوَذَ کہلاتا ہے۔اسی سے تعوذ اور تعویذ کے الفاظ آتے ہیں۔

کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! دنیا میں تمہارے مخالفین کی بڑی بڑی جماعتیں پیدا ہونگی۔تم نے ایسا انقلاب برپا کیا ہے جس نے ان بڑے بڑے سرمایہ داروں کا' مذہبی پیشوائیت کا' بڑی بڑی حکومتوں کا' خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔تمہارے نظام کو نقصان پہنچانے کے لیے چاروں طرف سے یورشیں ہونگی۔جب کہیں یورش ہو' کہیں خطرہ نظر آئے تم وہی کرنا جو ایک نوازئیدہ بچہ کرتا ہے! جونہی خطرہ نظر آئے خدا کے قوانین کی طرف بھاگ کر آجانا' لپک کر آجانا۔یہ ہے تعوذ جو ہمارے ہاں رسم بن کر رہ گیا ہے کہ قرآن کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھ لیا اور کچھ پتہ نہیں کہ یہ ہے کیا جو پڑھا ہے۔اس کا ترجمہ یہ کہ ''میں پناہ مانگتا ہوں شیطان سے''یعنی اس کی عظمت وقوت کا اعتراف ہو رہا ہے۔یہاں تک تو یہ صرف ایک رسم ہے۔آگے یہ لفظ تعویذ ہے جو اسی لفظ عَوَذَ سے نکلا ہے: لکھ کر گلے میں ڈالے دیجیے' مکان کے باہر کیل ٹھونک کے لٹکا دیجیے۔آپ دیکھتے ہیں کہ حقیقت خرافات میں کھوگئی۔

سورۃ الفلق اس آیت سے شروع ہوتی ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (113:1)۔اس رب کے قانون کی طرف آؤ۔جہاں بھی کوئی مقام بوسیدہ ہو جائے' اسے آپ نے پھر سے محکم و مستحکم بنانا ہو' تو پہلے آپ اس عمارت کو گراتے ہیں' اس کی بنیادوں تک کو اکھیڑ دیتے ہیں۔بظاہر یہ تخریب ہوتی ہے۔دراصل یہ تخریب نہیں تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ ایسا کیا جائے۔

فلق کا مفہوم

جب آپ زمین میں دانہ، بیج کی طرح، بودیتے ہیں تو چار دن کے بعد دیکھیے تو وہ دانہ اس زمین میں اُس حالت میں ہوتا ہی نہیں، وہ پھٹ گیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہہ دیں گے کہ ہائے یہ تو ضائع ہو گیا اِسی بلڈنگ کو جو گرایا جا رہا ہے تو اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ یہ تخریب ہے۔ اگر قاعدے اور قانون کے مطابق یہ کچھ ہو رہا ہے تو اس بیج کا پھٹ جانا، اس مکان کا ڈھایا جانا تخریب ہے جو ایک تعمیر کے لیے ہو رہی ہے۔ ''فلق'' کہتے ہیں: اس ''قسم کا کسی چیز کو پھاڑنا کہ اس میں سے ایک نئی زندگی نکل آئے''۔ یہاں کہا ہے کہ **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ** [1] (113:1) فوراً اس نشوونما دینے والے کے قوانین محکم کی پناہ میں آجاؤ کہ جس کے ہاں جسے بظاہر تخریب کہا جاتا ہے، وہ ایک نئی تعمیر کے لیے ہوتی ہے۔ یہ جو تم نے ان سلطنتوں کو، ان تہذیبوں کو گرایا ہے تو اس سے ان کے دل میں جذبہ انتقام آ رہا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ہاں آ کر Destruction (تخریب) کی ہے۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ تخریب تو ایک نئی تعمیر کے لیے ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ تعمیر کیا سے کیا بنا دے گی۔ یہ ہے وہ خدا جس کی پناہ میں آؤ، جس کی حفاظت میں آؤ، جس کی تخریب کے اندر بھی تعمیر مضمر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کن کن چیزوں سے، خدا کی پناہ اور حفاظت میں آؤ؟ برادران عزیز! اب عجیب چیزیں آ رہی ہیں۔

لفظ خیر اور شر کی حقیقت

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ آخری درس ہے۔ آج مجھے آپ وقت کی پابندی سے اجازت دے دیجیے۔ کیا پتہ پھر یہ وقت آئے یا نہ آئے! یہ آخری سورتیں ہیں، مجھے تفصیل سے بیان کر لینے دیجیے۔ عزیزانِ من! ابھی یہ سوال اٹھایا تھا کہ کن کن چیزوں سے حفاظت میں آنا چاہیے؟ اس حفاظت کے لیے کہا کہ **مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ** [2] (113:1) اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک ''شر'' ہے اور دوسرا

---

[1] (یہ انقلاب جس نئے مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ یعنی جس مرحلہ میں اب مخالف قوتوں سے تصادم ہوگا، اس میں تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح محتاط رہنے کی جس طرح ایک نوزائیدہ بچے کو ہر وقت اپنی ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا تم اپنی جماعت سے کہہ دو کہ میں اپنے نشوونما دینے والے کے اُس نظامِ ربوبیت کے آغوشِ حفاظت میں پناہ لیتا ہوں جس کا قانون تخلیق وارتقاء یہ ہے کہ تخریبی اور تعمیری قوتوں کے تصادم سے، ایک نئی چیز کی نمود ہوتی ہے۔ دانہ پھٹتا ہے تو اس میں سے کونپل نکلتی ہے۔ (6:96)

[2] خدا نے کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اُسے اس کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے، تو وہ خیر ہی خیر ہے لیکن اگر اس کا استعمال غلط طریق سے کیا جائے تو اس سے شر پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس طرح کے شر سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ یعنی اس احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہ کائناتی قوتوں کا استعمال غلط (وحی کے خلاف) طریق سے نہ ہونے پائے۔ (2-1 مفہوم القرآن۔ پرویز)

''خلق'' ہے۔فلسفہ کا طالبعلم جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ذہن انسانی کو جس نے پیچ وتاب میں رکھا ہے' وہ خیر اور شر کا مسئلہ ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ Good&Evil (خیروشر) کیا ہوتے ہیں؟ یہ ایک جو Evil (شر) بتایا جاتا ہے اور دوسرا (خیر) Good یہ بہت پرانا الجھا ہوا سوال ہے۔فلسفے میں یہ ہے کہ اگر دنیا میں شر یا Evil خدا کی مرضی کے مطابق ہو تو خدا خیر نہیں ہوسکتا اور اگر اس کی مرضی کے خلاف موجود ہو تو وہ قادرِ مطلق نہیں ہوسکتا کہ اسے مٹا نہیں سکتا۔آپ اس پہ حیران ہونگے اور میں سمجھتا ہوں کہ فلسفے کے طالبعلم اسے جانتے ہیں۔ المار یوں کی الماریاں' کوٹھوں کے کوٹھے' اُن کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں جو کہ اس پر لکھا گیا ہے۔دو الفاظ میں قرآن نے سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے۔اس نے کہا ہے کہ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (113:2) جو کچھ تخلیق خداوندی ہے' وہ Physically (طبعی طور پر) اپنی ذات کے اندر' نہ خیر ہے' نہ شر ہے۔ان کا استعمال اُسے شر اور خیر بنا دیتا ہے۔مثلاً زہر کے دو قطرے مرنے والے میں نئی زندگی پیدا کر دیتے ہیں' اسی کے پچاس قطرے زندگی کو ختم کر دیتے ہیں۔پانی جیسی ممدِ حیات چیز کے ایک دو گلاس پیجیے تو آپ کو زندگی دیتے ہیں' اسی پانی میں آدمی ڈوب کر مر جاتا ہے۔حرارت پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے لیکن جس دن یہ 98.6 درجے فارن ہائیٹ (Fahrenheit) سے اوپر پہنچ جاتی ہے' اس دن بخار چڑھ جاتا ہے۔صبح سے شام تک ہم آگ (Fire) سے اتنے عجیب وغریب کام لیتے ہیں لیکن اسی آگ میں جب انگلی پڑ جائے تو وہ اس کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔آگ' سنکھیا' پانی اپنی ذات میں نہ خیر ہیں' نہ شر ہیں۔انہیں جس طرح آپ استعمال کرتے ہیں' اس کے مطابق ان کا نتیجہ خیر اور شر ہوتا ہے۔

یہاں کیا ہے کہ مَنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ❷ (113:2) جو کچھ تو نے کائنات میں پیدا کیا ہے' ہمیں اس سے بچا کہ ہم اسے اس طرح استعمال کریں کہ اس کا نتیجہ شر پیدا ہو جائے۔اب سلطنت ملی ہے' حکومت ملی ہے' دولت کی فراوانیاں آئی ہیں۔یہ سب کچھ آیا ہے۔یہ چیزیں انسانی زندگی' تمدن اور تہذیب کے لیے بڑی ضروری ہیں لیکن یہی تو وہ پانی ہے جہاں آ کر امتیں ڈوبتی ہیں۔یہ سب کچھ ملنے کے بعد یہ کہا کہ اب ہمیں اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم انہیں اس طرح استعمال کریں کہ اِن سے شر کا پہلو پیدا ہو جائے۔اور یہ بات بڑی آسان ہے۔خدا کے قوانین کے مطابق انہیں استعمال کیجیے تو خیر ہی خیر ہے۔اِن کی خلاف ورزی کر کے استعمال کیجیے تو ہر شے شر ہے۔تو یہ جو ''تعوذ'' ہے یہ اس کے شر کے پہلو سے حفاظت میں رکھنا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے یا حاصل ہوا اسے تیرے قانون کے مطابق صرف کریں تا کہ ''خیر'' ہی کا پہلو ہمارے سامنے آئے۔تو وہ ''تعوذ'' کس چیز سے چاہتا ہے؟ اشیاء کائنات کے استعمال کے غلط طریقے سے' کہ جس کا نتیجہ شر پیدا ہو جائے۔

برادرانِ عزیز! آپ دیکھتے ہیں کہ کیا کیا حفاظتی تدابیر ہیں۔جہاں کہیں تمہیں کوئی چیز ڈھانی پڑے تو اس لیے ڈھاؤ کہ اس سے بہتر تعمیر کر سکو۔جو کچھ حاصل ہوا اسے اس طرح استعمال کرو کہ خدا کے قانون کے مطابق نتائج ''خیر'' برآمد ہوں۔یہ تو یوں ہوا کہ جو کچھ حاصل

ہوا ہے' افراط کی طرف جا کر اس کی فراوانیاں تمہیں غرق نہ کر دیں جیسے اگر پانی زیادہ پی لیا جائے تو آدمی مر جاتا ہے' ان اشیاء کا نہ ہونا۔ یہ بھی انسان کے لیے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ جہاں پانی کی فراوانی سے آدمی مر جاتا ہے' وہاں پانی نہ ہونے سے بھی مر جاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس طرح کے شر (Evil) سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے یعنی اس احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہ کائناتی قوتوں (Cosmic Froces) کا استعمال غلط (وحی کے خلاف) طریق سے نہ ہونے پائے۔

شر کا دوسرا پہلو محتاجی ہے

اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (113:3) اور ہمیں ان چیزوں کے متعلق بھی خاص احتیاط برتنے کی ضرورت ہے جن کے نہ ہونے سے نشو و نما رک جاتی ہے۔ یہ شر (Evil) کا دوسرا پہلو ہے۔

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ قرآن کہاں لے جاتا ہے! اگر یہ استعمال' اشیاء کی فراوانی کی طرف لے جاتا ہے تو کہا کہ وہاں بھی شر کا یہ پہلو ہوتا ہے۔ دوسری طرف وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (113:3) اگر یہ استعمال' ان شیاء کی طرف لے جاتا ہے جن کے نہ ہونے سے نشو و نما رک جاتی ہے تو اس میں بھی شر کا پہلو ہے۔ آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو جاتی ہے جب وہ چیزیں نہ ہوں جن پر انسان کی نشو و نما کا دار و مدار ہے۔ ادھر افراط کے ساتھ ہونا ''شر'' تھا' اِدھر ان کا معدوم ہونا ''شر'' ہے' ان کا غائب ہو جانا شر ہے۔ کہا کہ دوسری طرف یہ کیفیت بھی نہ پیدا ہو جائے۔ سامانِ نشو و نما کے محروم ہو جانے سے انسان کی آنکھوں کے سامنے جو اندھیرا چھا جاتا ہے' وہ شر ہے۔ اس لیے وہ شر بھی کہیں نہ آنے پائے۔

دولت کی فراوانی سے بھی انسان بدمستیوں کا شکار ہو جاتا ہے

دولت کی افراط ہو تو اس سے بدمستیاں پیدا ہوں اور محتاجی ہو تو اس سے دنیا اندھیر ہو جائے۔ دیکھنا' کہیں یہ دونوں ہی نہ ہو جائیں۔ ہمارے پہلے دَور کے اندر تباہی فراوانی کی وجہ سے آئی۔ اور اس کے بعد اگلے دَور میں ہماری ساری تباہی اس چیز سے آئی کہ ہم سامانِ نشو و نما سے بھی محتاج ہو گئے۔ غور کرتے جایئے گا کہ جن جن چیزوں کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ ان کے لیے Precautionary Measures (احتیاطی تدابیر) لینا' ان کے لیے محتاط رہنا' ہم نے انہیں ایک ایک کر کے چھوڑ دیا۔

جہالت میں منافقین کا کردار

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے تو پہلے سے وارن (Warn) کر دیا تھا کہ کہیں ایسے نہ کر دینا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ (113:4) یاد رکھو! اس قسم کے منافق جماعتوں کے اندر آ جایا کرتے ہیں کہ جونہی تم نے کسی محکم چیز کا ارادہ کیا'

فیصلہ کیا کہ یہ کرنا ہے تو وہ آ کر کسی نہ کسی طرح سے ایک پھونک مارتے ہیں کہ تمہارا وہ ارادہ متزلزل ہو جائے۔ یہ باہر والے نہیں ہوتے' یہ اندر والے ہوتے ہیں۔ تمہارے عوام کی جو محکم گرہیں ہیں' انہیں ڈھیلا کرنے کے لیے ایسی جماعتیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گی جو اس قسم کی پھونک ماریں گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ خفیہ سازشوں کے لیے یہ کیا چیز کہی گئی ہے کہ بس ایک پھونک مارنے والا ہے کہ پروپیگنڈہ کی مہم شروع ہے تاکہ اس کے نفسیاتی اثرات سے تمہارے پختہ ارادوں میں کمزوری پیدا ہو جائے' ہمتیں پست ہو جائیں' دلوں میں ایسے شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں جن سے یقین محکم میں تزلزل واقع ہو جائے۔ تمہیں ایسی جماعتوں اور ان کی اس قسم کی حرکات سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب عزم صمیم میں ہی شک وشبہ پیدا ہو جائے یا اس میں کمزوری واقع ہو جائے تو اس کے بعد تو آپ ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکتے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے جو لوگ جماعت کے اندر ہیں' ان سے محتاط رہنا۔

حسد کا مفہوم اور اس کی تباہ کاریوں کے اثرات

دوسری بات یہ کہی کہ جماعت کے باہر والی قوتوں کی ایک اور چیز بھی ہوا کرتی ہے' اس سے بھی محتاط رہنا۔ اس کے لیے کہا کہ **وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ** (113:5)۔ یہ حسد عجیب چیز ہے۔ حسد یہ ہوتا ہے کہ درختوں کی کسی ٹہنی کو اس طرح سے چھیل دینا کہ وہ چھلکا اس کے کام کا نہ رہے جو کچھ کسی کے پاس ہے وہ مجھے ملے یا نہ ملے لیکن اس کے پاس نہ رہے۔ یہ ہے حسد۔ رشک تو یہ ہوتا ہے کہ جو اس کے پاس ہے وہ مجھے بھی ملے۔ اور حسد یہ ہوتا ہے کہ مجھے بیشک نہ ملے لیکن اس کے پاس نہ رہے۔

برادران عزیز! امت مسلمہ پہ جو سب سے بڑی تباہی آئی ہے وہ اس حسد سے آئی ہے۔ تفصیل میں جاؤں گا تو مجھے لمبی تاریخ سے گزرنا پڑے گا۔ وہ قومیں جو' شباشب اسلام لے آئی تھیں' جن کی تہذیبوں کو' جن کے تمدنوں کو' جن کی حکومتوں کو' آپ نے تباہ کیا تھا' باطل کی تھیں۔ ان کے دل میں آپ کے خلاف انتقام کا جذبہ تھا۔ وہ مسلمان تو ہو گئے لیکن اس کے بعد انہوں نے یہ سوچا کہ وہ اس نظام یا اسلام پہ ایمان نہیں لائیں گے' اس لیے کچھ ایسا کریں کہ آپ کے پاس بھی وہ کچھ نہ رہے جس کے بل بوتے پر آپ اس عروج تک پہنچے۔ آپ کا یہ موجودہ اسلام اس طرح سے بنا تھا۔ یہ ہے حسد کا وہ جذبہ جس نے آپ کو تباہ کیا تھا کہ ان کو چھیل کے رکھ دو۔ انہیں پتہ تھا کہ جس چیز نے انہیں ہمارے اوپر غالب کیا ہے وہ ان کا یہ قرآنی نظام ہے کہ انہوں نے رشک نہیں کیا تھا کہ جیسا نظام ان کا ہے' ہم بھی اس کو اپنا لیں۔ ان میں جذبہء انتقام تھا۔ انہوں نے میدانِ جنگ میں جو شکست کھائی تھی دین کے میدان میں آ کر انہوں نے اِس طرح ہمیں شکست دی کہ جس چیز کی بنا پہ ہم ان پر غالب آئے تھے' انہوں نے وہ چیز ہمارے پاس نہ رہنے دی۔ آپ سے قرآن چھڑا دیا۔ خود اس قرآن کو اپنایا نہیں' آپ کے پاس رہنے نہیں دیا۔ دیکھا ایک لفظ حسد نے کہاں تک بات پہنچا دی۔ دین اسلام کو اس طرح چھیل دیا کہ کسی کام کا نہیں رہا' خود

توانہوں نے لینا ہی نہیں تھا۔ یہ کیا کہ آپ کے پاس بھی اصل حالت میں نہ رہے۔

کہا کہ اگر احتیاطی تدابیر نہ لیں تو یہ کچھ ہوگا اس لیے بہت محتاط رہنا۔ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو تمہاری کامیابیوں سے جل بھن جائیں گے اور تم سے حسد کرنے لگیں گے۔ تمہیں ان حاسدوں سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جب یہ چیزیں آئیں تو اس کے لیے ایک ہی علاج ہے کہ فوراً بھاگ کر قانونِ خداوندی کے قلعہ کے اندر، اس حفاظت کے اندر آجاؤ۔ ان قوانین کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کیا کرو۔ یہ ہے طریقہ ان تمام تخریبی قوتوں سے بچنے کا۔ نظام تم نے قائم کیا ہے۔ یہ اسی صورت میں رہ سکے گا کہ تم یہ کچھ کرو۔ یہ ہیں وہ تخریبی قوتیں جن سے تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی اور اس کی شکل یہ ہوگی کہ تم زیادہ سے زیادہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرو اور اس طرح اس کی حفاظت کے آغوش میں آجاؤ۔ اس کے ساتھ دوسری حفاظتی تدابیر بھی بتائیں، جو اگلی سورۃ میں ہیں۔ یہاں سورہ الفلق ختم ہوتی ہے۔

اب ہم سورۃ الناس لیتے ہیں۔

سورة الناس (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرانِ عزیز! اب سورۃ الناس لیتے ہیں۔ یہ 114ویں سورۃ ہے اوراس کی پہلی تین آیات یہ ہیں:

نوع غلامی کے وہ تین شعبے جنہوں نے پوری انسانیت کواپنے پنجے میں جھکڑ رکھا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰـهِ النَّاسِ (114:1-2-3)۔سارے قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ ان آیات کے اندر ہے' سارا نظام اِن کے اندر ہے۔وہ کونسے تین گوشے ہیں جہاں انسانیت کوExploit (سلب ونہب) کیا جاتا ہے؟ روٹی کا گوشہ ہے' جسے اکنامکس سسٹم کہتے ہیں۔جونہی وہ انسانوں کے ہاتھوں میں آیا' دوسرے انسانوں پردنیا تنگ ہوگئی۔اب جو جی چاہے ان سے کرا لیجیے۔محتاج ہی تو غلام ہوتا ہے۔یہ پہلا مسئلہ روٹی کا ہے۔دوسرا مسئلہ سیاسی اقتدار کا ہے۔سیاسی اقتدار ہاتھ میں لے لیجیے پھر قانون کے زور پہ نچوائیے۔اور تیسری چیز مذہبی ورحانیت کا مسئلہ ہے۔عوام کواس کے فریب میں پھنسا دیجیے اوراس کے بعد جو جی میں آئے ان سے کرائیے۔یہ کم بخت پہلے دو سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔مذہبی اورروحانیت کی غلامی کی یہ زنجیریں انسان کے قلب ودماغ پر مسلط ہوتی ہیں۔غلام تو رسی تڑا کر بھاگنا چاہتا ہے مگر ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ اگر حضرت صاحب کی نگاہ بدل جائے تو گڑگڑاتا ہے' روتا ہے' معافی مانگتا ہے: ''حضور مجھے راندۂ درگاہ نہ کردیجیے۔'' یہ اتنی محکم زنجیریں ہیں۔

برادارانِ عزیز! زنجیروں کے تین ہی گوشے ہیں۔روٹی کے مسئلے میں کسی کومحتاج کرکے رب بن جاؤ' سیاسی اقتدار حاصل کرکے مالک بن جاؤ اورروحانی اقتدار حاصل کرکے الٰہ بن جاؤ۔کہا کہ یہ تینوں کے تینوں باطل ہیں۔دنیا میں کوئی اور **رَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰـهِ النَّاسِ** نہیں ہے۔عزیزانِ من! قرآن کریم کی ساری تعلیم ان میں سمٹ کرآگئی ہے۔قرآن یہی کچھ کہتا چلا آرہا تھا' پھر الناس کہہ کراس کومحیطِ کل بنادیا۔میرا تیرا اس کا یا اس قوم کا اِلٰـــہ نہیں بلکہ کہا کہ پوری انسانیت کا ہے۔اور پوری انسانیت کو ہرقسم کی نوع غلامی سے رہائی دلادی۔یہ قرآن کی تین آیتیں ہیں۔آیتیں بھی کیا ہیں' صفاتِ خداوندی ہیں۔ہرقسم کی غلامی سے نوع انسانیت کوچھڑادیا:
رَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰـهِ النَّاسِ ۔روٹی' سیاسی اقتدار اورروحانیت کی الوہیت کی جتنی بھی قوتیں ہیں' قرآن کریم

نے ان سب کی نس کاٹ کے رکھ دی۔ یہ قوم پیدا کی تھی' یہ نظام پیدا کیا تھا۔ یہ پہلی "خیر" ہے۔ اس لیے کہا تھا کہ **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ** (114:1-3) اس مقصد کے لیے جس کا ذکر سابقہ سورۃ (الفلق) میں کیا گیا ہے تمہیں اس خدا کے قانون سے اور زیادہ قریب ہو جانا چاہیے جس کے پیش نظر کسی خاص گروہ' قبیلہ' جماعت یا قوم کی نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کی نشوونما ہے۔ وہ **رَبِّ النَّاسِ** (1:1) ہے۔ یعنی اس خدا کے قانون سے قریب تر جس کے سوا' کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ ساری کائنات میں غلبہ واقتدار اسی کا ہے اور اسی کے قوانین کی محکومیت انسان کو اختیار کرنی چاہیے۔ وہ ملک الناس ہے۔ اور وہی ہے جس کا قانون حفاظت تمام نوع انسان کو پناہ دے سکتا ہے۔ اسی سے انسانیت تمام خطرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ وہ الہ الناس ہے۔ اس خدا کے قوانین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متمسک رہ کر ہمیں ایک اور چیز سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

نصابِ تعلیم کے ذریعہ وسوسہ کے خطرناک جراثیم کی گرفت

یہ ایک اور بھی اہم پہلو ہے کہ **مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ** (114:4)۔ اس آیت میں وسواس کا لفظ آیا ہے اسی سے لفظ وسوسہ ہے۔ وسوسہ یہ ہوتا ہے: "دبے پاؤں اس طرح سے کسی کا آنا کہ آہٹ نہ ہونے پائے۔ جیسے شکاری شکار کی تلاش میں جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ آہٹ نہ آنے پائے"۔ اس کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں کہا کہ اس قسم کی قوتیں آئیں گی کہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہوگا' ان کی آہٹ تک بھی تم نہیں پاسکو گے۔ یہ کیا کریں گی؟ یونہی ایک ذرا سی بات کان میں ڈالی۔ اور "خناس" ہو گئیں۔ "خناس" کے معنی ہوتا ہے: "چپکے سے دبے پاؤں واپس چل کر پوشیدہ ہو جانا۔" وہ قوتیں خواہ وہ آپ کی نفسیاتی قوتیں (Psychological Forces) ہیں' سیاسی سازشوں کی قوتیں (Forces of political conspiracies) ہیں' روحانی دنیا کی اس قسم کی قوتیں' وہ تمام شکاریوں کی طرح اس احتیاط سے آتے ہیں کہ کہیں کھڑکا نہ ہونے پائے' ورنہ شکار تو بدک جاتا ہے۔ یہ کھٹکا ہونے ہی نہیں دیتے۔ اور کرتے یہ ہیں کہ کوئی چیز ذرا اسی کان میں پھونکی اور اس کے بعد یوں واپس چلے جاتے ہیں۔ واپس جانے کے بعد چھپ جائیں کہ پتہ نہ چلے۔ کہا کہ ان قوتوں سے اپنے آپ کو حفاظت میں رکھو۔

آگے کہا کہ **الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ** (114:5)۔ جو یہ غلط قسم کی تعلیم ہے' یہ ہے وہ جس کی طرف وساوس کی یہ چیز آگئی: آہٹ نہ ہونے پائے' شکاری ہو' Exploit (سلب ونہب) کرنا چاہے' پتہ نہ چلے اور دلوں [1] کے اندر ایک چیز اتارتا چلا

---

[1] قلوب واذہان

جائے۔ کسی قوم کا نصابِ تعلیم بدل دیجیے تو قوم کی قوم بدل جاتی ہے۔ یہ وہ وساوس ہیں' جو صدور الناس کے اندر' اس طرح اتارے جاتے

ہیں کہ شکار کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ مجھے اس نے پکڑ لیا ہے۔ وہ اس کی حمد و ستائش میں قصیدے پڑھتا ہے۔ انہوں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے۔ وہ قلوب کے اندر یہ چیزیں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاں کی ساری تعلیم جو مذہبی مدارس میں ہو رہی ہے' یہ ساری کی ساری آپ کو قرآن سے بیگانہ کرنے کے لیے ہے۔ اُدھر جتنی تعلیم آپ کو مغرب کی طرف سے آ رہی ہے وہ ساری شرفِ انسانیت سے بیگانہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ ہے جو صدور الناس کے اندر وساوس ڈالے جاتے ہیں کہ پتہ نہ چلے کہ کس وقت کیا چپکے ہی چپکے کانوں میں کچھ پھونک کر پچھلے پاؤں لوٹ گئے اور دلوں میں وساوس پیدا کر کے عزمِ راسخ کو کمزور کر گئے۔ ❶ کون ہیں جو یہ کچھ کرتے ہیں؟ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (114:6) اپنے ہوں یا Foreigners (اجنبی) ہوں یہ دونوں کریں گے۔ خود اپنے ہو کے بھی یہ کچھ کریں گے کہ جن سے مانوس ہوتے ہوئے یہ بھی کریں گے' جن سے تم مانوس نہیں ہوتے ہو' وہ باہر کے رہنے والے ہوتے ہیں وہ بھی یہی کریں گے۔

برادران عزیز! ہمارے ساتھ تو ہوا ہی یہی ہے۔ اس قسم کی غلط تعلیم دی کہ جس نے ہماری امت' ہماری ملت' قوم کے نوجوانوں کے سینوں کو ان وساوس سے اس بری طرح سے بھر دیا ہوا ہے کہ ان بیچاروں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمیں کہاں لیے چلے جا رہے ہیں۔ غیروں نے بھی یہ کیا اور اپنوں نے بھی یہ کیا۔ آپ کی ہزار سال کی ساری تاریخ اسی چیز کا رونا رونے کی بات ہے۔ تو کہا کہ یاد رکھو کہ یہ چیزیں تمہیں تباہ کریں گی۔

عزیزان من! سن لیجیے۔ سورۃ الناس قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے جو آج بحمدہ تعالیٰ ختم ہو گئی۔ وہ سلسلہ دراز جو آج سے سات سال پہلے مسلسل شروع کیا تھا' سات سال کے بعد اللہ کی توفیق سے آپ حضرات کے انتظام سے اور اس کے سننے سے آج اختتام کو پہنچا۔ میرے ذہن میں تھا کہ درس کی تکمیل کے بعد اس درس کے متعلق کچھ باتیں آپ حضرات سے کروں لیکن چونکہ آپ حضرات نے یہ طے کیا ہے کہ اس درس کی تکمیل کی تقریب آئندہ اتوار کو منائی جائے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ جو کچھ میں نے آج اس درس کے خاتمے پر آپ احباب کی خدمت میں گزارش کرنا تھا' اسے اس تقریب میں اپنے خطاب کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ چیزیں تو میں آئندہ اتوار کو پیش کرونگا۔

---

❶ نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات خودی کی موت ہے یہ' اور وہ ضمیر کی موت

لیکن ان حالات میں بھی اقبال مایوس نہیں لہٰذا اس کا کہنا یہ ہے کہ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

رب العزت کی بارگاہ میں دل سے نکلنے والی دعا

اب آیئے ہم اس سلسلہ زریں کی تکمیل پر اپنی دلی آرزوؤں کو قرآن کریم کے الفاظ میں دعا کی شکل میں بحضور رب العزت یہ کہتے ہوئے پیش کریں کہ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ [286:2] ❶ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ [8:3] ❷ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ [126:7] ❸ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ [10:59] ❹ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ [127:2] ❺.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ بارِالٰہا! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے' یا نشانہ خطا ہو جائے' تو یہ چیز ہماری نشوونما کے راستے میں حائل نہ ہو۔ ہم پر ایسی ذمہ داریاں عائد نہ ہوں جن کے ہم متحمل نہ ہو سکیں (یعنی ہمیں ہر ذمہ داری کے مناسب قوت حاصل رہے)۔ اگر ہم سے کہیں لغزش ہو جائے تو ہمیں اس کی توفیق ہو کہ ہم' اپنے حسن عمل سے اس کے مضر اثرات کو مٹا سکیں' ہم تمام تخریبی عناصر کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ ہماری نشوونما کے لیے ضروری سامان وذرائع' تیرے قانون ربوبیت کے مطابق' ملتے رہیں اس لیے کہ تیرا قانون ربوبیت ہی ہمارا سرپرست اور کارساز ہے۔ اور اسی کی تائید ونصرت سے ہم حق کے مخالفین پر غلبہ اور کامیابی چاہتے ہیں۔ بارِالٰہا! ہماری ان آرزوؤں کو شرف تکمیل عطا فرما!

❷ بارِالٰہا! ہمارے قلوب (قرآن کی صحیح) راہنمائی کے بعد کسی اور طرف نہ جھک جائیں اور ہماری قلبی اور ذہنی صلاحیتیں اسی کی روشنی میں برومند ہوں اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اس کی صحیح منزل کی طرف راہنمائی تنہا عقل کی رو سے نہیں مل سکتی۔ یہ صرف وحی کی رو سے ممکن ہے جو خدا کی طرف سے (حضرات انبیائے کرام کو) وہبی طور پر ملتی تھی' کسب وہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

❸ بارِالٰہا! ہمارے دلوں کو صبر واستقامت سے لبریز کر دے اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے احکام کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔

❹ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمارے لیے بھی سامانِ حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لیے بھی جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں اور ہمارے دل میں کسی مومن کے لیے ذرہ بھر کدورت پیدا ہونے دے۔ تو سب کے لیے حالات میں نرمی پیدا کرنے والا اور سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے۔

❺ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما' کہ تو دل میں مچلنے والی ارزوؤں کو جانتا ہے اور لب تک آنے والی تمناؤں کو سنتا ہے' اس لیے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت اس مرکز کی تعمیر کے لیے کوشاں ہیں۔ (1-2-3-4-5 مفہوم القرآن۔ پرویز)

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔معراجِ انسانیت)